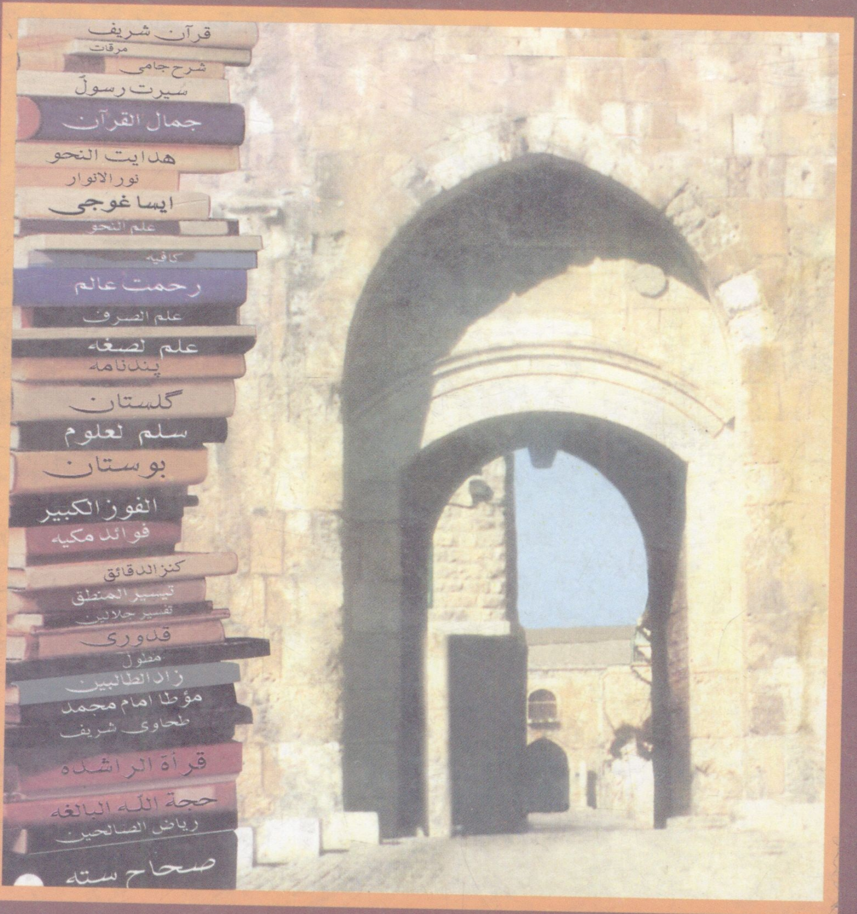
# دینی مدارس

## نصاب و نظامِ تعلیم اور عصری تقاضے




مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری

فاضل علوم اسلامی، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

# دینی مدارس

## نصاب ونظامِ تعلیم اور عصری تقاضے

ترتیب وتدوین

مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری

www.KitaboSunnat.com

فضلی سنز

**DEENI MADARIS**

Nisab wa Nizam-e-Taleem aur Asari Taqazay

*By: Maulana Dr. Hafiz Haqqani Mian Qadri*


کتاب : دینی مدارس: نصاب و نظامِ تعلیم اور عصری تقاضے

مصنف : مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری

اشاعتِ اوّل : جولائی ۲۰۰۲ء

پیش کش : ساجد رحمٰن فضلی

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

ناشر و طابع : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

تقسیم کار : **فضلی بک سپر مارکیٹ**

507/3، ٹیمپل روڈ، (نزد ریڈیو پاکستان) اردو بازار، کراچی

فون: 5-2629720 - 2212991

فیکس: 2633887

E-mails:fazlee@cyber.net.pk

sajidfazlee@yahoo.com

# عرضِ ناشر

دینی مدارس کے طلباء، اساتذہ، علمائے کرام، مشائخ عظام، اصحابِ صفہ کے امین اور علوم نبوی ﷺ کے وارث اور امین ہیں۔ یہی مدارس دینِ اسلام کے وہ قلعے ہیں جہاں سے قال اللہ قال الرسول کی پاکیزہ صدائیں دن رات گونجتی ہیں اور یہاں پڑھایا جانے والا نصاب اور دینی مدارس کا نظام تعلیم برصغیر پاک وہند میں دیگر طریقہ ہائے اور نصاب ہائے تعلیم میں ایک خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔ اس سسٹم سے فیض یاب ہونے والے حضرات آج مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نہایت کامیابی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور یہی مدارس دینی علوم کے فروغ کے ساتھ تعلیم کے فروغ اور افراد میں شعور وآگہی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ پیش نظر کتاب "دینی مدارس کا نصاب و نظامِ تعلیم اور عصری تقاضے" دینی مدارس کے نصاب اور نظامِ تعلیم کے حوالے سے ایک اہم دستاویز ہے۔ جس کو فاضل مرتب پروفیسر ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری نے پاکستان کے ذوق کے مطابق جدید انداز سے مرتب کیا ہے۔ اس ضخیم کتاب میں دینی مدارس کے نصاب و نظام پر ہونے والے سیمیناروں کی رپورٹیں، بحثیں اور مقالات شامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہمارے دینی مدارس کے کارپردازان، علماء کرام، مہتمم حضرات اور تمام مسالک کے دینی مدارس کے بورڈز کے ذمہ داران کے سامنے مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئیں گے جو کہ ان کو اپنے نصاب کی تشکیل و تدوین اور نظام تعلیم میں تبدیلی (اگر وہ چاہیں) تو ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ کتاب تمام حلقوں میں زیادہ سے زیادہ زیرِ مطالعہ رہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس دستاویز کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی فرمائیں گے۔

ساجد رحمٰن فضلی

# عرضِ مرتب

پیشِ نظر کتاب "دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے" ۱۹۶۸ء میں دہلی میں ۱۹۹۰ء میں رانچی اور دہلی میں دینی مدارس کے نصاب و نظامِ تعلیم پر ہونے والے سیمیناروں کی روداد، مقالات اور اس میں ہونے والی علمی بحث و مذاکرے کے علاوہ مشاہیر علمائے کرام، یونیورسٹیز کے اساتذہ اور ممتاز ماہرین تعلیم کے مقالات و نگارشات پر مشتمل ہے۔

## عابد رضا بیدار کے الفاظ میں

"خالص تعلیمی نقطہ نگاہ سے بھی اس سیمینار کی اہمیت تھی جس کا مقصد طالب علم کی شخصیت، بچہ کی تربیت اور بہتر تعلیم گاہوں کی تعمیر کے بارے میں اصل بحث کے پیشِ نظر عمومی طور سے بھی غور کیا گیا اور بڑے مفید مشورے سامنے آئے۔

دینی اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ اسلام کے ایک اہم ستون تعلیم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کی ایک سعی تھی جسے نامشکور کسی طرح نہیں کہا جاسکتا اور عربی زبان و ادب اور علوم عربیہ کی تعلیم کے لحاظ سے بھی اس سیمینار کی یہ اہمیت تھی کہ ہندوستان میں عربی کی روزافزوں بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیشِ نظر ان درس گاہوں کو اپنے اپنے رول کی بھی خبر دینا تھی۔ بعض امور واضح ہو گئے۔ لیکن بعض امور ہیں جو اس وقت تک مبہم رہیں گے۔

جب تک اس سیمینار کے شرکاء اور اسلامی درس گاہوں کے اکابر کے درمیان ایک نتیجہ خیز مکالمہ نہ ہو اس روداد کی اشاعت اور اس کے ان اکابر کی نظر سے گزر جانے کے بعد امید کرتا ہوں کہ کوئی ایسی مفاہمتی صورت ضرور نکلے گی کسی نمائندہ اجتماع کی صورت میں یا تحریری شکل میں جس سے کسی نتیجہ پر پہنچا جاسکے۔

پیشِ نظر کتاب میں ہمہ جہت قسم کے مقالات و مضامین شامل ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض مضامین سے کلی یا جزوی طور پر اختلاف بھی کیا جائے لیکن یک جا صورت میں اشاعت سے ہمارے ملک کے علمائے کرام، پروفیسرز حضرات، ماہرین تعلیم اور مدارس کے مہتمین حضرات کو مختلف آراء پڑھنے کا موقع ملے گا۔ فی الوقت ان مضامین کی اہمیت یوں بھی دوچند ہو گئی ہے کہ حکومتی حلقے دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم کے خواہاں ہیں اور مدارس سے

وابستہ حضرات اس حکومتی مطالبہ کو ماننے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم تاریخی اور ثقافتی اہمیت کا حامل ہے اور اس نے اپنے آغاز ہی سے خود کو تمام سطحوں پر مقبول بنادیا تھا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آج اکیسویں صدی کے آغاز میں دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم ہماری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں قدرے ترمیم و تبدل کی گنجائش تو ہمہ وقت رہتی ہے۔

لیکن فی الوقت اگر نصاب تعلیم میں تبدیلی اس انداز کی ہو کہ اس کی اصل روح مجروح نہ ہو تو ایسا ضرور کیا جانا چاہیئے۔

ہندوستان میں اگرچہ یہ چیز اشاعتی انداز میں موجود تھی لیکن پاکستان میں اِس کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ہم بھی ان علمی بحثوں اور روداد کا بغور جائزہ لیں۔ کیونکہ پاک و ہند، افغانستان، بنگلہ دیش کے علاوہ دنیا بھر میں جہاں جہاں برصغیر پاک و ہند کے علماء و فضلاء نے دینی مدارس قائم کیئے ہیں وہاں نصاب کے طور پر درسِ نظامی ہی رائج ہے۔

ان رپورٹوں، بحثوں اور مقالات سے یقیناً ہمارے تجربات کو ایک رخ بھی ملے گا اور بعض نئے گوشے سامنے آئیں گے۔

کراچی میں ایک کتاب کی تقریبِ رونمائی میں کھانے کے دوران جب میں نے ان مقالات و مضامین اور سیمینارز کی روداد کا تذکرہ وفاقی وزیر مذہبی امور جناب مولانا ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب سے کیا تو انہوں نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ چیزیں جلد اشاعت پذیر ہوں تاکہ وزارتِ مذہبی امور بھی اپنی سطح پر اُن چیزوں کو دیکھے۔

میں نے ایک سیمینار کے دوران وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال صاحبہ سے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان مقالات میں دلچسپی ظاہر کی بلکہ ان کی معقول تعداد وزارتِ تعلیم کی طرف سے خریدنے کا بھی عندیہ ظاہر کیا۔ میں ان دونوں وفاقی وزراء کا مشکور ہوں۔ مقالات و مضامین اور تمام روداد کو ہم نے من و عن شائع کیا ہے۔ اگرچہ میں خود بھی مدرسہ سسٹم کا پروڈکٹ ہوں اور بعض مقالہ نگار کی تحریرات سے اختلاف کی گنجائش تھی لیکن میں نے کسی قسم کا حاشیہ لگانے سے گریز کیا۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جن حضرات کے مشورے شامل رہے ان میں حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی، مولانا راشد الحق سمیع، لیفٹیننٹ جنرل (ر) ڈاکٹر سید اظہر

احمد، بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر فیوض الرحمان جدون، مولانا سید عزیز الرحمان، پروفیسر **مولانا ظفراللہ شفیق** اور مخدومی خصوصیت سے شامل ہیں۔

پروف ریڈنگ کے سلسلے میں مخدوم زادہ احمد خیر الدین انصاری، قاری حامد محمود قادری اور پروفیسر حافظ عبدالماجد انصاری کا بطور خاص ممنون ہوں۔

میں اپنی اہلیہ کا ممنون ہوں کہ وہ میرے کام میں مخل ہوئے بغیر میرا خاص خیال رکھتی ہیں۔

میں ان تمام حضرات کا مشکور ہوں۔

تمام مدارس کے ذمہ دار حضرات سے اس کتاب کے مطالعہ کی خصوصی گزارش ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری
ایف ار ۳۳، بلاک ایف
نارتھ ناظم آباد، کراچی
پوسٹ کوڈ۔74700
فون۔6676926

# تقریظ

بریگیڈیئر ڈاکٹر (ر) پروفیسر مولانا فیوض الرحمان جدون قادری
ڈائریکٹر تعلیمات و امور مذہبی، ڈی ایچ اے، کراچی

عزیزی پروفیسر ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری کی مرتب و مدون کردہ نئی کتاب "دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے" دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی۔ لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر اسلام کے قلعے یہی دینی مدارس ہی تھے جنہوں نے اس کے ناپاک اور مکروہ عزائم کو خاک میں ملادیا۔ آج ہمیں برصغیر پاک و ہند، بنگلہ دیش، افغانستان اور دنیا بھر میں دین کے فیوض و برکات کے جو نظارے نظر آتے ہیں وہ ان ہی علماء و مشائخ اور مدارس کے طفیل ہیں۔

پیشِ نظر کتاب میں ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری نے نہایت اہم اور نادر مقالات و مباحث کو یکجا جمع کر کے ان اہم دستاویزات کو اس موضوع پر کام کرنے والوں کی راہ آسان کر دی ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس کے ذمہ داران موجودہ وقت کے تقاضوں کو بھی سمجھیں اور اپنے نظام و نصاب تعلیم میں قدرے تبدیلی کی گنجائش پیدا کریں۔

امید ہے کہ ہمارے مدارس ڈاکٹر صاحب کے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس کی پذیرائی کریں گے۔

فیوض الرحمان قادری

جولائی ۲۰۰۲ء

# فہرست مضامین


عرض ناشر ۳
عرض مرتب ۴
تقریظ ۷

## دینی مدارس کے نصاب ونظام تعلیم پر ۱۹۶۸ء کے دہلی سیمینار کی مکمل روداد، مقالات اور علمی بحث

برقے کہ خود پیچد، میرد بسحاب اندر — عابد رضا بیدار ۱۶
قدیم اسلامی درس گاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں — مولانا محمد عبد السلام خان ۲۸
ہندوستان کے اسلامی مدارس پر ایک نظر ۳۹
مولانا محمد عبد السلام خان
پروفیسر سید مقبول احمد ۷۲
مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۸۱
وقف کونسل کے مرتبہ نصاب کا مقدمہ ۹۱
علامہ امتیاز علی عرشی ۹۷
جناب اخلاق احمد ۱۰۰
جامعہ اسلامیہ علیمیہ — موسیٰ جار اللہ ۱۰۴
ڈاکٹر ذاکر حسین
مولانا آزاد کمیٹی کا مرتبہ نصاب ۱۱۹
مدارس عربیہ کے نصاب کی اصلاح کے متعلق
مولانا آزاد کا نقطۂ نظر اور مدرسہ عالیہ رام پور کا مجوزہ خطاب ۱۲۰
مولانا محمد عبد السلام خان
مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۱۴۴

| | |
|---|---|
| بحث | ۱۵۴ |
| سید اوصاف علی | |
| عبدالرحمان کشمیری | |
| مولانا سعید احمد اکبر آبادی | |
| علی اکبر ترمذی | ۱۶۰ |
| عبدالخالق نقوی | ۱۶۲ |
| مولانا عبداللطیف اعظمی | ۱۶۴ |
| مولانا عبدالحلیم ندوی | ۱۶۷ |
| مولانا قاضی سجاد حسین | |
| نورالدین احمد | ۱۶۸ |
| مولانا سعید احمد انصاری | ۱۷۲ |
| مولانا سید عبدالدائم جلالی | ۱۸۱ |
| محمد شفیع آگوانی | ۱۸۸ |
| ڈاکٹر عبدالعلیم | ۱۹۲ |
| قدیم نصاب اور اس کی اصلاح کے بارے میں چند خیالات<br>موسیٰ جاراللہ | ۱۹۸ |


## دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم پر ۱۹۹۰ء کے رانچی دہلی سیمینار کی مکمل روداد، مقالات اور علمی بحث


| | | |
|---|---|---|
| دینی مدارس اور افادیت عامہ | بشمبر ناتھ پانڈے | ۲۰۹ |
| | یونس سلیم | ۲۱۲ |
| مدرسہ سسٹم : چند مشورے | سید شہاب الدین دسنوی | ۲۱۷ |
| | جسٹس سرور علی | ۲۲۱ |
| | پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی | ۲۲۴ |
| | مولانا نظر شاہ کشمیری | ۲۲۹ |

| | | |
|---|---|---|
| | مولانا نذر الحفیظ ندوی | ۲۳۲ |
| | مولانا سعید احمد پالن پوری | ۲۳۴ |
| دینی مدارس اور وقت کی ضرورت | تقی رحیم | ۲۴۲ |
| مدارس عربیہ کے نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح | مولانا محمد یحییٰ ندوی | ۲۵۱ |
| دینی مدارس اور عصری تقاضے | مولانا مجیب اللہ ندوی | ۲۵۴ |
| روایتی مدارس کی اصلاح کی ضرورت کیوں؟ | پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی | ۲۶۱ |
| مدارس پر ایک نظر (خدمات، حقائق، احساسات اور مشورے) | ڈاکٹر سید حسن | ۲۶۶ |
| دینی تعلیم : تجزیہ و تجاویز | پروفیسر سید حامد | ۲۷۲ |
| دینی مدارس | محمد معین الدین | ۲۸۱ |
| دینی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم | مولانا شبیر احمد خان غوری | ۲۸۳ |
| مدارس عربیہ | ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی | ۲۸۸ |
| دینی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم | مولانا محمد اشفاق سلفی | ۲۹۱ |
| دینی مدارس کے مسائل | ڈاکٹر رضی احمد | ۲۹۷ |
| دوراستے | سید محمد عابدی | ۲۹۹ |
| دینی ادارے ایک سازش کا شکار | پروفیسر ڈاکٹر نہال احمد کریمی | ۳۰۰ |
| عربی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح | مولانا محمد طاہر مدنی | ۳۰۳ |
| دینی مدارس کا نصاب | پروفیسر ڈاکٹر محمد محسن | ۳۰۸ |
| درس نظامی اور اصلاح نصاب کے اصول و مبادی | مولانا محمد سالم قاسمی | ۳۱۱ |
| نصاب مدارس کی اصلاح | مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی | ۳۱۸ |
| دینی مدارس اور ان کا نصاب | بشیر احمد | ۳۲۱ |
| اصلاحِ نصاب | مولانا محمد عبد السلام خان | ۳۲۴ |

| | | |
|---|---|---|
| مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کا ایک جائزہ | مولانا انیس الرحمان قاسمی | ۳۲۵ |
| نصاب میں ترمیم | مولانا نثار احمد قاسمی | ۳۳۵ |
| مدارس کا نصاب اور سائنسی علوم | پروفیسر ڈاکٹر اسلم پرویز | ۳۳۷ |
| مدارس اسلامیہ کا نصاب | مولانا بدر احمد مجیبی | ۳۴۰ |
| ہمارے مدرسہ کا نظام اور نصاب تعلیم | مولانا مجد القدوس | ۳۴۶ |
| عربی دینی مدارس کا نظام و نصاب تعلیم اور عصری تقاضے | سید اسد رضا رضوی | ۳۴۹ |
| دینی مدارس کا نصاب | مولانا ابو سفیان مفتاحی | ۳۵۳ |
| مدارس عربیہ کا نصاب و نظام تعلیم | پروفیسر ریاض الرحمان شروانی | ۳۵۵ |
| قدیم و جدید نصاب تعلیم | صفات احمد | ۳۵۶ |
| مدارس عربیہ کا نصاب | ڈاکٹر شفیق الرحمان خان | ۳۵۸ |
| مدارس عربیہ کا نصاب اور وقت کی ضرورت | آفتاب احمد | ۳۵۹ |
| مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم سے متعلق چند ارشادات | مولانا شاہ محمد اسماعیل | ۳۶۴ |
| دینی مدارس کا تعلیمی نظام | اقبال احمد انصاری | ۳۷۱ |
| عربی و دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری تقاضے | مولانا حبیب ریحان ندوی | ۳۹۶ |
| عربی مدارس کے نصاب کا مسئلہ | سید شہاب الدین دسنوی | ۴۱۲ |
| فارغین مدارس عربیہ کا مستقبل | مولانا حکیم سید محمد حسان نگرامی | ۴۱۵ |
| مدارس عربیہ کا نصاب : چند مشورے | مولانا عون احمد قادری | ۴۱۸ |
| ہندوستان کے اہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم (ایک تقابلی جائزہ) | ڈاکٹر عتیق الرحمان<br>مولانا محمد شاہ جہاں قاسمی | ۴۲۰ |

روداد تجاویز اجلاس رانچی ودہلی مئی جون ۱۹۹۰ء ۴۴۴
مرتبہ۔ جاوید اشرف
برصغیر کی درسی کتابیں اور مصنفین (بہ ترتیب تاریخی) ۴۷۴
مولانا محمد شاہ جہاں قاسمی
مکاتیب بسلسلہ نصاب تعلیم ۴۷۷
سوالات دربارۂ نصاب درس نظامیہ ۴۷۸
حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دارالعلوم دیوبند کا جواب گرامی ۱ ۴۸۱
حضرت مولانا اعزاز علی شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند کا جواب گرامی ۲ ۴۸۵
جواب گرامی حضرت مولانا عبدالرحمان کامل پوری مدرسہ
مظاہر العلوم سہارن پور ۴۸۷
مکتوب گرامی حضرت مولانا محمد میاں ۴۹۲
حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کا جواب گرامی ۴۹۵
جواب گرامی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ۴۹۷
جواب گرامی حضرت مولانا فاروق احمد ۴۹۹
حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا جواب گرامی ۱ ۵۰۷
حضرت گیلانی کا جواب باصواب ۲ ۵۰۸
جواب گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۵۱۰
حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں ۵۱۴
جواب گرامی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ ۵۱۶
جواب گرامی حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی
جواب گرامی از آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۵۱۷
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہم کا جواب گرامی ۵۱۸
حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا جواب گرامی ۵۱۹

| | |
|---|---|
| جواب گرامی از جماعت اسلامی | ۵۲۰ |
| تذییل (مولانا عبید اللہ سندھیؒ) | ۵۲۱ |
| حضرت مولانا ناظم ندویؒ کی رائے گرامی | ۵۲۳ |
| نصاب کے بارے میں حضرت مولانا محمد صادقؒ کی رائے گرامی | ۵۲۴ |
| جواب گرامی منجانب حضرت مولانا ابو الکلام آزاد | ۵۲۶ |
| دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا حقیقت پسندانہ تجزیہ | ۵۲۷ |


---

## دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی کے نادر و نایاب مقالات


| | | |
|---|---|---|
| قدیم تعلیم | علامہ شبلی نعمانی | ۵۵۰ |
| ملا نظام الدین (بانی درس نظامیہ) | " " " | ۵۶۱ |
| درس نظامیہ | " " " | ۵۷۰ |
| فن نحو کی مروجہ کتابیں | " " " | ۵۸۹ |
| رپورٹ متعلق اصلاح نصاب دار العلوم حیدر آباد | | ۵۹۳ |
| تعلیم قدیم وجدید | " " " | ۶۰۰ |
| دار العلوم ندوۃ العلماء کی ایک اور خصوصیت | | ۶۰۵ |
| ندوۃ اور نصاب تعلیم | " " " | ۶۰۷ |
| ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے | " " " | ۶۱۳ |
| ندوۃ العلماء کا نیا دور | " " " | ۶۱۷ |
| مصر کی یونی ورسٹی | " " " | ۶۱۹ |
| علمی گروہ | " " " | ۶۲۱ |

## دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کے حوالے سے ممتاز علماء و ماہرین تعلیم کے نادر و نایاب مقالات


| | | |
|---|---|---|
| مسلمانوں کی آئندہ تعلیم | مولانا سید مناظر احسن گیلانی | ۶۲۶ |
| میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ | " " " | ۶۲۹ |
| مدرسہ سسٹم اورنگ زیب کی نظر میں۔ | شیخ محمد اکرام | ۶۳۸ |
| مدارس اسلامیہ کے نصاب کی اصلاح۔ | مولانا سعید احمد اکبر آبادی | ۶۴۰ |
| مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحہ فکریہ | " " " " | ۶۴۵ |
| علوم دینیہ | " " " " | ۶۵۰ |
| دینی نظام تعلیم | پروفیسر نذیر احمد | ۶۵۷ |
| دینی مدارس : غور و فکر کے نکات | افتتاحی کلمات بر موقع سیمینار | ۶۶۵ |
| علی گڑھ، ندوۃ العلماء، جامعہ عثمانیہ | مولانا عبد اللطیف اعظمی | ۶۷۲ |
| دینی مدارس کے مسائل | پروفیسر محمد شریف خان | ۷۰۲ |
| ہندوستان کے دینی مدارس اور ان کے نصاب | عبد الباری علیگ | ۷۰۶ |
| عربی مدارس کے نصاب کا مسئلہ | مولانا مرزا محمد یوسف | ۷۰۹ |
| علوم قدیمہ کا تحفظ | " " " " | ۷۲۰ |
| مدارس کے نصاب میں تاریخ اسلام کا مطالعہ | ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ | ۷۳۰ |
| دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں چند اہم رائیں اور مشورے | مولانا خالد سیف اللہ رحمانی | ۷۳۴ |
| دور مغلیہ کا نصاب تعلیم | پروفیسر محمد شفیع مرزا | ۷۵۰ |
| تعلیم بالغاں کی اہمیت اور ہندوستان کے دینی مدارس کا کردار | پروفیسر ڈاکٹر محمد اکبر رحمانی | ۷۶۰ |

# دینی مدارس کا نصاب و نظامِ تعلیم
# اور
# عصری تقاضے

دینی مدارس کے نصاب و نظامِ تعلیم پر ۱۹۶۸ء کے
دہلی سیمینار کی مکمل روداد، مقالات اور علمی بحث

# برقے کہ بخود پیچد، میرد بسحاب اندر

عابد رضا بیدار
(سابق ڈائریکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)

یہ مسئلہ زیرِ بحث کیوں آیا؟

ایک تو اس لئے کہ اب یہ ایک عام خیال ہو گیا ہے کہ عربی و اسلامی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء اپنے سماج کے لئے تو فائدہ بخش عنصر بننے کے بجائے طفیلیے (Parasites) بن جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان ہی مدارس کے زائیدہ عناصر ہوتے ہیں جو ہر اس اقدام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں جو بنی نوع کی ترقی کے لئے اٹھایا جاتا ہے۔ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ اب ان مدارس سے نہ کوئی شاہ ولی اللہ پیدا ہوتا ہے نہ ابن سینا، نہ غزالی، نہ ابنِ رشد، اس مخلوق میں نہ وسعت نظر آپاتی ہے نہ جرأت افکار نہ مستی کردار! یہ ابو حنیفہ اور شافعی کو پڑھتے چلے آرہے ہیں مگر خود ان میں کوئی ابو حنیفہ کوئی شافعی نہیں پیدا ہوتا۔ نئی فکر یا ذاتی تفکر کے نام سے کانپتے ہیں اور (Initiative) لیتے ہوئے ڈرتے ہیں اور لوگوں میں تقلید جامد، غیر سائنسی خیالات اور مذاہب کے ناتربیت یافتہ تصور کو پھیلانے میں ایک وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔

یہ سب کیوں؟

ان کی اس طفیلیے پن، اس ظلمت پسندی اور اس جامد تقلید کے کچھ اسباب ضرور ہیں۔ کچھ کمی ہے اس نظام و نصاب میں، اس طریق درس و تدریس میں جو ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے اور اپنی بالکل موجودہ ہیئت میں کم سے کم عہد اورنگ زیب سے شروع ہوتا ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے مکمل اوور ہالنگ (Over Hauling) کی ضرورت ہے یا معمولی مرمت سے کام چل جائے گا؟ پچھلے اصلاحی اقدامات میں ندوۃ العلماء، یا میر عرب مدرسہ بخارا یا تازہ

ترین، جامعہ زیتون اور جامعہ ازہر اصلاحی قانون، کیسے رہنما بنایا جا سکتا ہے؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا دینی و دنیوی تعلیم کی تقسیم چلتی رہے گی؟ تہذیبِ اسلامی کے ارتقاء کے کسی دور میں جانے کس خدا کے بندے نے جان و تن کی دوئی کی غلط اندیشی کی ابتداء کر دی۔ جس نے تعلیم کے میدان میں علم الادیان اور علم الابدان کی بناء ڈال دی، ایسی کہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے بھی روادار نہیں رہے۔ کیا واقعی علوم کو مادّی اور روحانی حصّوں میں بٹا رہنے دینا چاہیئے؟ خود علم الادیان کی تفہیم کی خاطر ان ناگزیر علوم کا مطالعہ کیا ضروری نہیں ہے، جو Tools کا کام دیں گے؟

ہمارے مفکروں میں ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اس نظامِ تعلیم ہی کو مریکم پلٹ دینا چاہیے کہ یہ قطعی ناکارہ ہو چکا ہے۔ دوسرے طبقہ کا خیال ہے کہ اسے جوں کا توں برقرار رکھنا چاہیے کہ اس کی اپنی ایک افادیت ہے اور یہ کہ روزگار کا جہاں تک تعلق ہے تعلیم کو ذریعہ معاش بنانا ضروری نہیں اور....... اس تعلیم کے بعد، جیسے کسی دوسری تعلیم کے بعد...... کوئی بھی آزاد پیشہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ہنر بھی سیکھا جا سکتا ہے! وغیرہ۔

اور ایک تیسرا طبقہ ہے جو اس نظام میں اصلاح کر کے اسے برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

انسانی شخصیت اپنے اظہار کے لئے ایسی بے چین واقع ہوئی ہے کہ محض بہانے ڈھونڈتی ہے۔ یہ بہانے اسے تعلیم و تربیت میں، علوم و فنون میں مل جاتے ہیں۔ دنیا میں سب کوئی تو سب کچھ کرنے سے رہے لیکن جو جس میدان میں نکل گیا اور وہ اس کی طبیعت کے مناسب حال بھی ہو گیا۔ تو وہی اس کے جوہر چمکانے کا باعث بھی بن جاتا ہے (جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا) اس میں نہ کسی ایک کی فضیلت کو دخل ہے نہ کسی دوسرے کی حقارت کو! کوئی علم یا فن نہ بہ ذاتِ خود بڑا ہے نہ چھوٹا۔ شخصیت کے امکانات کے بقدر اس علم یا فن میں گہرائی، گیرائی یا وزن بھی ہوتا ہے۔ یعنی ہر علم اور فن شخصیت کے لئے اوپری جلا کا کام کرتا ہے کہ وہ جوہر ہے اور تعلیم محض عرض۔ اہم چیز جو ہے وہ تو شخص ہے نہ کہ اس کا لباس جو اس نے تعلیم کے نام پر پہن رکھا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص کی شخصیت ہر علم یا ہر فن میں نہیں چمک پاتی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ اس کے لئے مناسبت یا ذہنی موافقت ضروری امر ہے یا پھر شاید یہ بات ہو کہ ہر شخص کی شخصیت بھی تو نہیں ہوا کرتی۔ مکھی، مچھر بھی تو خدا ہی کی مخلوق ہیں۔ دسویں درجہ

یں اور اس سے پہلے گاندھی جی کے جو جو ہم مکتب تھے ان میں سے کتنوں کے نام آج ان کے شہر والے بھی جانتے ہیں!! ذاکر حسین کے انٹر اور بی اے کے ساتھیوں میں کتنوں کو آج علی گڑھ بھی جانتا ہے!!

غرض اس سے نہیں کہ کوئی علم و فن کی کس شاخ میں اختصاص حاصل کر رہا ہے، اصل چیز اس علم و فن کی تعلیم و تدریس کا پیرایہ اور نظام کار ہے اور اس سے بھی بڑھ کر زندگی کے ساتھ اس کا ربط ہے۔ ایلوپیتھی کو لازماً طب یونانی پر فوقیت نہیں ہے لیکن یہ اس وقت جب طب یونانی میں کسی مسیحا نفس کی بدولت نئی زندگی کی لہر دوڑ چکی ہو اور وہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو چکی ہو۔ اجمل خان نے یہی کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔ اردو ادبیات کا پروفیسر لازماً زندگی میں بظاہر کام آنے والے معتبر قسم کے مضامین کے پروفیسروں سے کم تر نہیں ہوا۔ وہ کبھی کبھی...... جب اس مضمون سے شخصیت ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو...... رشید احمد صدیقی بن جاتا ہے جو علی گڑھ کے عہد آخیر کی آبرو کا ایک پائندہ نشان بن جاتا ہے۔ عربی کا فاضل لازماً ملائے مکتبی ہی نہیں بنتا ڈاکٹر علیم بھی بن جاتا ہے اور دینیات کا حصول لازماً دو رکعت کا امام ہی نہیں بنتا پاکستانی سیاست اور اسلام کا ایک اہم نام سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ہندوستانی سیاست اور اسلام کا ایک سر کردہ نام مولانا ابوالکلام آزاد بھی بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ تعلیم کسی چیز کی ہوتی ہے اور شخصیت اپنا وسیلۂ اظہار کہیں اور ڈھونڈتی ہوتی ہے۔ طب کا فاضل براؤن، ادبیات فارسی میں! قانون کا ماہر عبدالودود ادبیات اردو میں! اقتصادیات کا ماہر ذاکر حسین تعلیمات اور اخلاقیات میں!!!

بالآخر شخص اہم ہے نہ کہ ذریعہ!...... ذریعہ تعلیم!!

اس لئے یہ قدیم مدارس عربیہ و مشرقیہ و اسلامیہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم بالکل از کار رفتہ قرار دے کر میوزیم میں بھیجنے کا سامان کرنے کی بات سوچیں۔ ان ہی مدارس نے ہندِ اسلامی کی ممتاز غیر معمولی اور عظیم شخصیتوں کو جنم دیا لیکن اب بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ان میں بعض اصلاحیں، ترمیمیں، اضافے اور تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اگر بدستور ان سے بڑی شخصیتیں ایک بڑی تعداد میں ڈھالنے کا کام لیا جانا جاری رکھنا ہے! بدلتے ہوئے حالات سے مراد نئی آگہی، علوم کے نئے افق اور تعلیم و تدریس کے نئے طریق کار ہیں۔

مقصود صرف نئے زاویوں، نئی جہتوں، نئے امکانات اور نئی بصیرتوں سے آشنا کرانا ہے۔

جن سے آپ آنکھیں موند لیں تو ان کے وجود کو جھٹلانے کا یہ کوئی معقول ثبوت تو نہیں ہوگا، وہ تو زمانے کے ساتھ سازباز کر کے آپ کے وجود کو جھٹلادیں گے...... اور کیا ایسا ہو نہیں رہا ہے !!!

قبل ازیں جو لوگ اس بارے میں سوچتے اور لکھتے رہے ہیں ان میں عہد جدید کی بات غالبًا شبلی سے شروع ہوتی ہے جنہوں نے ۱۹۱۴ء میں ایسی بنیادی حقیقتوں کو پالیا تھا جو آج بھی بہتوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس نظام میں مندرجہ ذیل نقائص ہیں :

کتابیں نہ کہ علوم، آزادانہ کے بجائے پابندِ نظر کی تخلیق اور علوم وہی اور اسی حد تک جو یونانیوں سے عربوں نے لئے تھے۔ اس کے بعد جو ترقی ہوئی اس سے قطعی ناواقفیت۔

آصف فیضی نے اپنی تنقید میں جن مضامین کو شامل کرنے پر زور دیا ہے ان میں تقابلی مذاہب کا جدید علم خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ انہوں نے سامی زبانوں اور اہم جدید زبانوں کا شمول بھی ضروری قرار دیا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس سلسلہ کی تازہ ترین فکر سمجھنا چاہئے۔ اس کی اس لحاظ سے بھی اہمیت ہے کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم بھی ہیں اور دنیائے اسلام میں درجہ اوّل کے مفکر بھی سمجھے جاتے ہیں۔

"کسی ادارے یا کسی زندہ جماعت کے لئے اپنی عمر میں صرف ایک بار حقیقت پسندی سے کام لینا، مادّی نظام کے اندر ضروری تبدیلی پیدا کرنا اور اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا کرنی کوشش کرنا کافی نہیں....... کسی ادارے کی افادیت، عملی زندگی میں اس کا مقام اور وہ رول جو وہ ادا کرتا ہے تنہا اس کی حیات کا ضامن ہے۔

تعلیم کی موجودہ ثنویت یا دوئی غیر اسلامی اقتدار کے عہد کی بدعت ہے۔ پہلے ہمارا نظام تعلیم وحدانی اور سالمیت پر مبنی تھا۔ ہمارا قدیم نصاب تعلیم جس کی درس نظامی نمائندگی کرتا ہے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ملک کا واحد نظام تعلیم اور ثقافت، ذہنی تربیت کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ جہاں محدث، فقیہہ اور مدرس تیار کرتا تھا، وہاں سول سروس کے عہدیدار اور ارکانِ سلطنت بھی مہیا کرتا۔ اس درس کی پیداوار جس طرح ملا محب اللہ بہاری اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے اسی طرح علامہ سعد اللہ وزیر سلطنت بھی تھے۔ یہی حال دوسرے

ملکوں میں بھی تھا کہ دینی و دنیوی تعلیم کے دو الگ الگ نصاب اور نظام نہیں تھے۔ چناں چہ سب کو علم ہے کہ مشہورِ ریاضی داں شاعر عمر خیام اور سلطنت سلجوقیہ کا وزیر باتدبیر نظام الملک طوسی دونوں ایک ہی حلقہ درس کے شریک اور ایک ہی تعلیم کی پیداوار تھے۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد اپنی اصلاحی تجاویز اس طرح دی ہیں :

"پرائمری اور مڈل کے مرحلے تک ایسا مشترک نصابِ تعلیم بنے جو تمام مسلمان بچوں کے لئے قابلِ استفادہ ہو اور جو ان کو اسی معیار کی تعلیم دے جس کے حصول کے لئے ان کو سرکاری مدارس اور اسکولوں کا رخ کرنا پڑتا ہے اس اضافے کے ساتھ کہ اس میں دینیات کا عنصر نمایاں ہو۔ اخلاقی اور دینی تربیت کے لئے بہتر ماحول اور تعلیمی نتائج عام سرکاری اسکول سے بہتر ہوں۔"

"اس مرحلے کے بعد ثانوی تعلیم کے ساتھ جدید ضروری مضامین سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور انگریزی وغیرہ کی تعلیم ہو۔ اس مرحلے کے بعد اب طلباء میں پوری احتیاط اور دقت نظر کے ساتھ انتخاب کیا جائے جو لوگ اس تعلیم پر اکتفا کرنا چاہیں وہ دوسرے میدانوں کی طرف رخ کر سکتے ہیں۔ اگر مزید تعلیم کے لئے اسکولوں اور کالجوں کا رخ کرنا چاہیں تو وہ ایسی حالت میں وہاں جائیں گے کہ وہ ضروری دینی واقفیت حاصل کر چکے ہوں گے۔ ان کے ذہن میں ایک بنیاد پڑ چکی ہو گی۔ عربی سے ان کو ایسی مناسبت پیدا ہو چکی ہو گی کہ وہ اگر اپنے آئندہ تعلیمی مرحلے میں عربی کو بطور زبان کے لینا چاہیں تو وہ اس میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔"

"اس مرحلے کے بعد عربی تعلیم و علوم دینیہ کو جاری رکھنے کی اجازت ان لوگوں کو دی جائے گی جن کے اندر ذہانت، عربی علوم کی تکمیل کی صلاحیتیں اور شوق و ولولہ پایا جائے اور وہ دینی علوم کی خدمت کو اپنا بنانے پر آمادہ اور تیار ہوں اور جو دلی لگن اور یکسوئی کے ساتھ اس سلسلہ کی تکمیل کر سکیں۔"

(ندوۃ العلماء کا کتابچہ ۶۷۔۶۸)

لیکن مولانا سے پہلے ایک بہت وسیع النظر عالم جس کی فراست ایمانی کی داد کچھ آنے والا زمانہ ہی دے سکے گا، اس نے اس موضوع پر ایک بیش بہا کتاب بھی لکھی ہے۔ ۵۳ء میں اس نے اپنی فکر کا نچوڑ اس طرح لکھا تھا :

"ایک نیا ہندوستان پیدا ہو چکا ہے اور پیدا ہو رہا ہے اس وقت وہی اس ملک میں محمد الرسول اللہ ﷺ کے دین کی خدمت کا فرض ادا کر سکتے ہیں جو آنے والے حالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ذرائع سے اپنے آپ کو مسلح کر رہے ہوں۔ سوچنے کی بات ہے، اسلامی علوم کو ہندی قالب اور ہندی مزاج کے مناسب بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ ضرورت ہے کہ اس سوال کی اہمیت کا اندازہ کیا جائے اور "انفرو اخفافاً وثقالاً" جس سے جیسا ممکن ہو اپنے آپ کو تعلیمی زندگی کے مغتنم دور میں تیار کر لے۔"

ہندوستان سے باہر اسلامی درس گاہوں میں جو اصلاحیں ہوئی ہیں ان میں سوویت وسط ایشیاء کی اصلاحیں اس لحاظ سے مفید مطلب نہیں ہیں کہ وہاں ان لوگوں کا مقصد امام اور موذن ہی تیار کرنا ہے تاہم قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے حدیث و تفسیر، لغت صرف ونحو، قرأت و تجوید اور اصول دین کے بنیادی مضامین کے ساتھ ساتھ تاریخ جغرافیہ، حساب، روسی زبان، مادری زبان اور سوویت دستور کے مضامین بھی چار سالہ کورس میں شامل رکھے ہیں۔

(اور نیتو مادر نو: اگ ۵۴ء)

تیونس کی مشہور اسلامی درس گاہ جامعہ زیتونہ کی کایا پلٹ البتہ قابلِ ذکر ہے۔ وہاں کے لوگوں کا اصرار تھا کہ تاریخِ قانون، تاریخِ مذاہب، عمرانیات، تاریخِ عرب، تاریخِ عالم، مسلم فلسفہ، طبیعیات، کیمسٹری اور ریاضیات کے ساتھ کوئی ایک بیرونی زبان بھی نصاب میں شامل رہے اور یہ کہ یہ سب علوم باہر سے ماہرین آکر پڑھائیں۔

معمولی پیوند کاری چلتی رہی تا آنکہ ۵۶ء میں جب آزادی ملی تو فوراً پرائمری اور سیکنڈری حصے جامعہ سے الگ کر دیئے گئے اور مسجد کے بجائے وزارت تعلیم کے تحت ان کی خود مختار حیثیت کر دی گئی۔ زیتونہ خود بھی ایک پبلک ادارہ ہو گی۔ جس کا ناظر حکومت مقرر کرنے لگی اور اس کی حیثیت دینیات کے مطالعہ کے لئے ایک فیکلٹی کی سی ہو گئی جس میں ایک زبان و ادب عربی کا شعبہ تھا۔ ایک شریعتِ اسلامیہ کا۔ پھر جب ۱۹۶۰ء میں تیونس یونیورسٹی وجود میں آگئی تو زیتونہ اس کی ۶ فیکلٹیوں کے مجملہ دینیات اور علوم مذہبی کی فیکلٹی کے نام سے نئے دور میں داخل ہوئی۔ نصاب میں تاریخِ مذاہب، تاریخِ فقہ، تاریخِ تیونس باقاعدہ داخل ہو گئے اور زبانوں میں یونانی اور فارسی اور فرنچ یا انگریزی میں سے کوئی ایک۔

اکتوبر ۶۱ء کے قانون کی رو سے دینی تعلیم کے لئے دیا جانے والا وقت تو کم کر دیا گیا لیکن مواد بڑھا دیا گیا۔ قانون کی تشریح میں تفصیل سے بتایا گیا کہ تیونس اسلامی روایات سے وابستہ ملک ہے اور یہ روایات قائم رکھنی ہیں اس لئے یہاں پہلے سال سے بچہ کو روحانی ماحول مہیا کیا جائے گا جس سے مذہب کا رول اور قدر و قیمت پہچاننے میں آسانی ہو گی۔ اسے اسلام کی بنیادی باتیں اور عمل کرنا سکھایا جائے گا۔ اب تک کی روش کے بر خلاف صرف حفظ قرآن کافی نہیں سمجھا جائے گا بلکہ تفسیر قرآن مجید بھی ہو اور اس سے بھی آگے یہ بھی کہ اسے زندگی میں کیسے برتا جانے تاکہ قرآن سے محبت بھی ہو اور لفظی کج بحثیوں سے بھی نجات ملے۔ پھر یہ کہا گیا کہ سیکنڈری مرحلے پر مطالعہ دین کے سائنسی طریقہ کار پر زور ہونا چاہئے جس میں سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی عوامل بھی زیرِ مطالعہ رہیں۔ مختصر یہ ہے کہ گویا افکارِ اسلامی کی ایک عمرانی مطالعہ ہو یعنی Sociology of religion۔

بالآخر اس بنیاد پر نظام و نصاب کی نئی تشکیل ہوئی اور ۴ سال لائسنس کورس، ۳ سالہ ڈپلوما کورس اور ۴ سالہ ڈگری کورس طے پایا۔ ڈگری کلاس کے طلباء پہلے دوسرے سال فلسفہ، لسانیات، تاریخ، ایک بیرونی زبان...... اور قرآن و حدیث اور تیسرے چوتھے سال میں قرآن و سنت کے ساتھ افکارِ اسلامی، فلسفہ، تاریخ مذاہب، فِرَقِ اسلامیہ، تصوف اور تاریخ میں تخصص یا پھر اصول فقہ و تاریخ فقہ میں تخصص جس کے ساتھ سوشیالوجی کے ادارے اور تاریخ ضروری رکھ دی گئی۔ (مسلم ورلڈ: اپریل ۶۸ء)

ان سب اصلاحوں میں ایک شعوری مقصد واضح ہے۔ یہ کہ پیوند کاری بیکار ہے، یہ کہ چند گھنٹوں کے لئے سائنس کی ابتدائی تعلیم دے کر دینیات کی فیکلٹی کو جدید نہیں بنایا جا سکتا! یہ کہ دینیات جو نئے سوال پوچھتی ہے اب تو ان کے لئے ایک نئی اپروچ درکار ہے۔ دین و دانش میں کیا رشتہ ہو؟ حدیث کے مطالعہ کے لئے روایتی اور جدید سائنسی طریق ہائے کار میں کیا ربط ہو؟ الوہیت اور وحی، مذہب اور فلسفہ دونوں کے نقطۂ نظر سے اب کس طرح سمجھ میں آتے ہیں؟ مصری، یونانی، رومی، علم الاصنام اور ہندو مذہب، بدھ مذہب، کنفیوشس کا دین اور عیسائیت کا مطالعہ........ یہ سب اس نئی آگاہی کی نشان دہی کرتی ہیں کہ نئے علوم سے اسلام کو کیسے مربوط کیا جانے! اور کیسے اس کی تشکیل جدید کی جائے!!

ازہر کا قانون اصلاح سب سے زیادہ اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔ ازہر کو عالم اسلام

میں ایک ممتاز دینی درس گاہ کی حیثیت سے جو احترام حاصل رہا ہے اس کی وجہ سے اس کے اندر کسی بھی نئی تبدیلی کا جلد یا بدیر اسلامی معاشرہ پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ یہ قانون بھی ۱۹۶۱ء ہی میں بنا۔ (مڈل ایسٹ جرنل : ۱۹۶۶ء)

ازہر کے سلسلہ میں نئے مصر کے مفکروں کا کہنا تھا کہ اس نے جو ایک عرصہ تک بیرونی دباؤ کے مقابلہ پر اپنے کو ریزرو کر کے بچائے رکھا، اب جب ریزرو رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے اور زندگی اس کے چاروں طرف پوری قوت سے ابل پڑی ہے، نئے تقاضوں سے ہم آہنگی اس کے لئے ضروری ہو چکی ہے تاکہ وہ دین کا بھی دفاع کر سکے اور اسلامی ورثہ کی بھی حفاظت کر سکے۔ مسئلہ اس طور پر سامنے آیا تھا کہ جدید یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل دنیا بھر کے بارے میں جانتے تھے، مگر مذہب کے بارے میں کورے ہوتے تھے، دوسری طرف ازہر والے دینیات کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے مگر دنیا کے علوم میں کورے ہوتے تھے، یعنی سماج سے الگ تھلگ۔ تو کیا ہو؟ تفسیر اور مثلاً میڈیسن کے ساتھ ساتھ کیسے جائے؟ سوال طالب علم کے لئے کام کے قابلِ برداشت بوجھ کا بھی تھا!

ازہر اصلاحی قانون نے مندرجہ ذیل امور کو اپنا ہدف بنایا :

(۱) ایسے اسکالر پیدا کرنا جو علوم دینی سے واقف ہوں لیکن عملی علم و تجربہ سے بھی! تاکہ آئندہ کے لئے دین ان کے لئے پیشہ یا روٹی روزی کا تنہا ذریعہ بننے سے رہ جائے۔

(۲) ازہر اور دوسری جامعات کی حد بندی ختم کرنا تاکہ ازہر والے علم و عمل کے تمام میدانوں میں مساوی طور سے متابعت کر سکیں۔

(۳) علم و تجربہ کی یکساں مساوی مقدار ازہریوں کو بہم پہنچانا تاکہ وہ دانشوری اور نفسیاتی طور سے بھی دوسرے فرزندان مصر سے کسی جگہ ہیٹے نہ ہوں۔

نئے مصر کے مصلحین کا خیال ہے کہ ازہر کی اس اصلاح کے بعد مذہب جو پیشہ بننے سے بچ گیا ہے تو اس کی تجارت بھی اب آسانی سے نہ ہو سکے گی۔ دوسرے یہ کہ سماج سے کٹے ہونے کا احساس بھی ختم ہو جائے گا اور تیسرے یہ کہ باہر کے ہزاروں طالب علم اب جب یہاں سے نکل کے اپنے اپنے ملکوں میں جایا کریں گے تو اپنے سماج کا قابلِ قدر حصہ بنا کریں گے نہ کہ ایک قابلِ نفرت بوجھ! ازہر جو عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے تعلق کھو چکی تھی، مصری قائدوں کا خیال ہے کہ تعمیر نو کے اس منصوبے سے ازہر کا قدیم مرتبہ واپس

آسکے گا اور ماضی اور حال کا رشتہ مضبوط تر ہو سکے گا۔ مشہور عالم شیخ محمود شلتوت نے اس سلسلہ میں بہت دل چسپ بات کہی ہے کہ نئے قانون کا منشا یہ ہے کہ "علماء اسلام کی خاطر جئیں نہ کہ اسلام کے ذریعہ۔" ازہر کے ریکٹر نے اس میں سلف کی علمی اور دینی روح کی بازیافت دیکھ لی اس طرح سے کہ جس طرح "عہد گذشتہ میں کوئی حاکم ایسا نہیں ہوتا تھا جسے محض عالم دین سمجھا جاتا ہو" اسی طرح اب عالم کا مطلب علوم کو جاننے والا لیا جایا کرے گا نہ کہ عالم دین۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عالم علم دین پر بھی دوسرے علوم کی طرح حاوی ہوا کرے گا۔

یہ بات بطور خاص سامنے لائی گئی ہے کہ رسول کریم ﷺ عام زندگی کا ایسا ہی کام کاج اور بوجھ بار سنبھالے ہوئے تھے جیسے کوئی بھی دوسرا شخص اور یہ کہ اسلام کبھی بھی بطور پیشہ ہمارے اسلاف کی خدمت گزاری پر مامور نہیں ہوا!

"آپ سے اپیل کی جاتی ہے کہ مسجدوں کو علم کے میناروں میں تبدیل کر دیجئے۔ مسجدوں کو صرف نمازوں کے لئے مختص سمجھنا غلط ہے۔" مصریوں کے نام اس اپیل نے اگر واقعی اثر کیا تو بہت قلیل عرصے میں کایا پلٹ جائے گی۔ اس درمیان میں مصری دانش وروں میں یہ بحث جاری ہے کہ کیوں نہ علماء کے طبقہ کو سرے سے بالکل ختم ہی کر دیا جائے! اور یہ کہ مستقبل میں علمائے دین نہیں ڈاکٹرز، انجینئر، وکیل ہوں جو دین پر بھی حاوی ہوں۔

ازہر کی تنظیم نو میں قدیم نصاب و نظام کو دو فیکلٹیوں میں بانٹ دیا ہے۔ علوم اسلامیہ..... اور علوم عربیہ، اور میڈیسن، بزنس ایڈمنسٹریشن، انجینئرنگ اور دوسرے کرافٹ اور زراعت کی مزید فیکلٹیوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ازہر مصر کی دوسری یونیورسٹیوں کے مساوی مرتبہ کی ملک کی پانچویں یونیورسٹی بن گئی ہے۔

ازہر اور زیتونہ جیسی تاریخی اسلامی درس گاہوں میں انقلابی تبدیلیاں آچکی ہیں اور پھر دنیا اس عرصہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور آخری بات یہ کہ اپنے ملک میں خود مختارانہ طور پر ہمیں اصلاح کے پورے مواقع حاصل ہیں۔ شاید بعض اعتبارات سے اسلامی ممالک سے بھی زیادہ! تو گردوپیش کو نظر میں رکھتے ہوئے دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کو دیکھتے ہوئے، عالم اسلامی میں فکر کے دھاروں کا مطالعہ کرتے ہوئے...... اور ہندوستانی مسلمانوں کو کارآمد مفید اور مہذب شہری بنانے کا نصب العین پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنی اسلامی

ورس گاہوں کے نظام ونصاب میں کچھ ضروری تبدیلیاں لانی ہیں؟

(۱) قرآن وسنت کے ساتھ تقابلی مذاہب کا مطالعہ، علی گڑھ انداز کی جنرل ایجوکیشن، کم سے کم ایک مغربی زبان کم سے کم دو اسلامی زبانیں، تاریخِ تہذیب اسلامی، تاریخِ علوم اسلامی کسی ایک علم اسلامی میں اختصاص........ یہ کم سے کم درجہ پر وہ متعلقہ علوم ہیں جن کا شمول ناگزیر ہے۔

(۲) ذریعہ تعلیم بہتر ہے کہ اردو کو بنایا جائے۔

(۳) مکتبوں کا درجہ رکھنے والے اداروں کی میں بات نہیں کرتا۔ ساری بڑی اسلامی درس گاہوں کو مفید اعلیٰ تعلیم کے اداروں کا درجہ دے دیا جائے اور ایک ایک مرکز ایک ایک علم کی اختصاصی تعلیم کے لئے طے پا جائے۔ چھوٹے درجے والے اداروں کو ہائی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے اور رائج الوقت ہائی اسکول نصاب کو اپنا کر اپنے موجودہ نصاب کے ساتھ اس طرح جوڑا جائے کہ طالب علم پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ دوسرا بدل (Alternative) یہ ہے کہ ان میں (Multi-purpose) سسٹم چلایا جائے اور انڈسٹریل ٹریننگ سینٹر کے طور سے کام میں لایا جائے جہاں ان سارے پیشوں کی تعلیم دی جائے جو دوسری جگہ سکھائے جاتے ہیں۔

ان سارے اداروں کو ایک نظام میں پرو دیا جائے اور اس کے لئے ایک کونسل بنائی جائے۔

(۴) مسلم اوقاف کا سرمایہ ان اداروں کی سقیم مالی حالت کے سدھارنے کے لئے کام میں لایا جائے۔

۱۹۵۰ء کے ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں قدیم انداز کی ۸۸ بڑی درس گاہیں موجود ہیں جن میں درس نظامی دیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم دارالعلوم دیوبند ہے جس میں ہزار، بارہ سو طلباء تعلیم پاتے ہیں، جو ایشیاء کا ازہر کہلاتا ہے۔

۱۶۱۳ء میں اورنگزیب کے زمانے میں فرنگی محل میں اس سلسلہ کی بنیاد پڑی جو معمولی ترمیم واضافے کے بعد قدیم درس کی توثیقی شکل ہے۔ ملاّ قطب الدین، ملاّ نظام الدین اور عبد العلی بحر العلوم کا یہ فرنگی محلی سلسلہ، درس نظامی، ہندوستان کا سب سے زیادہ متداول نظام تعلیم ہے جو مندرجہ بالا بڑی درس گاہوں کے علاوہ قریہ قریہ پھیلے ہوئے مکاتب اور چھوٹے

مدرسوں میں بھی جزئی طور پر یا بعض غیر اہم ترمیموں کے ساتھ جاری وساری ہے۔

دوسرا قابلِ ذکر سلسلہ ندوۃ العلماء کا ہے جس کی بنیاد انیسویں صدی کے آخر میں سرسید کی علی گڑھ تحریک کے ردِ عمل یا ایک خوش گوار اثر کے طور پر پڑی لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس اصول پر اس کی بنیاد پڑی تھی کہ قدیم و جدید کو آمیز کیا جائے۔ تو منصوبہ سازی میں قدیم ذہن اس قدر حاوی رہے کہ جدید کا کماحقہ تصور ہی پیدا نہ ہو پایا اور نتیجہ میں معمولی پیوند کاری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ عربی ادب کا ذوق زیادہ عام ہو گیا۔ عربی بولنے کی مشق زیادہ ہو گئی۔ اردو اخبار نویسی اور دینی علمی اداروں میں یہاں کے فارغ التحصیل طلباء کی کچھ کھپت ہونے لگی۔ لیکن اس کے آگے کچھ نہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ اتنا ہو گیا کہ خود علماء میں ایک Elite طبقہ پیدا ہو گیا۔ لیکن مجموعی طور سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اصنائے کہنہ کا باداں کنند، اول آں بنیاد راویراں کنند، رومی کے اس انقلابی تصور کا یہاں بھی کوئی سوال نہیں اٹھا!

تصنیفی صورت میں ہمارے مفکروں نے رائج نظام و نصاب کے سلسلہ میں اب تک جو کوششیں کی ہیں ان کو کچھ سراغ منتشر صورت میں شبلی (۱۸۹۴ء) ابوالحسنات ندوی (قدیم درس گاہیں ۱۹۲۱ء) مولانا مناظر احسن گیلانی (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۱۹۴۰ء) اور آصف فیضی (مڈل ایسٹ جنرل ۱۹۵۴ء) کے یہاں مل جاتی ہیں۔

دو غیر معروف مگر زیادہ ہمہ گیر اور اہم منتظم باقاعدہ اور شعوری کوششیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک جو جامعہ جوبلی (۱۹۴۶ء) کے موقع پر اسلامی دنیا کے مشہور عالم اور مفکر علامہ موسیٰ جار اللہ نے ذاکر صاحب کی فرمائش پر بالکل نیا نصاب مرتب کر کے اپنے تبصرے کے ساتھ پیش کیا اور دوسرا جو مدرسہ عالیہ رام پور کی مشہور عالم اسلامی درس گاہ کے پرنسپل مولانا عبدالسلام خاں نے جو قدیم نصاب کو سامنے رکھ کے اور اُس تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا اصلاحی نصاب (۱۹۴۱ء۔۱۹۵۱ء) مدلل اور مربوط فکر انگیز تبصرہ کے ساتھ پیش کیا۔

اور اس سلسلہ میں آخری کوشش سینٹرل وقف کونسل کا مجوزہ جدید نصاب تعلیم مدارس عربیہ ہند کے لئے، کے نام سے ایک کتابچہ کی صورت میں پیشِ نظر ہے جس کی ترتیب میں مولانا قاری محمد طیب، مولانا عرفان ندوی، مولانا سید علی نقی، پروفیسر آصف فیضی، پروفیسر اجمل خاں، پروفیسر عبدالوہاب بخاری، اسد اللہ کاظمی، مولانا محمد میاں فاروقی اور مولانا سعید

احمد اکبر آبادی شریک رہے ہیں۔ یہ کام ۱۹۶۶ء میں انجام کو پہنچا ہے۔ اول الذکر نادر تحریریں اور آخر الذکر کا مقدمہ اس کتاب میں شامل ہے۔

مگر بنیادی طور سے مسئلہ اب بھی بحث کا محتاج ہے۔ علماء کو زندگی کی دوڑ میں اپنے برابر کا شریک بنانا ہے اور عالم کا وہ وہ تصور اپنانا ہے جو عہد زوال سے پہلے تھا۔ یا بنیادی طور سے عالم دین پیدا کرنا ہیں اوپر کی لیپا پوتی کے ساتھ ...... یا محض عالم دین پیدا کرنا ہے، پیوند کاری کے بھی بغیر !! ہندوستان اور بیرون ہند دونوں کی کوششیں اور افکار ہمارے سامنے ہیں۔ ایک جگہ ٹھونکا پیٹی، مرمت اور پیوند کاری کا تصور غالب ہے جہاں بنیاد اب بھی مذہب ہی کو رکھا گیا ہے۔ دوسری جگہ انقلاب سے کم بات نہیں، اور بنیاد زندگی اور علم کو بنایا گیا ہے۔ کیا توازن کی مزید راہیں نہیں نکل سکتیں؟

# قدیم اسلامی درس گاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں

مولانا محمد عبدالسلام خان
مہتمم مدرسہ عالیہ رام پور

اسلام زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل کو چند سادے اور بنیادی عقیدوں کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان کے تحت ہی ان کی قدریں متعین کرتا ہے۔ مسلمان طرح طرح کے ظروف و حالات سے دوچار ہوتے رہے، کہیں ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی تو کہیں ہم آہنگ بنانے کی۔ تاہم ان کا اندازِ فکر ہر جگہ ہر زمانے میں اور ہر حال میں یکساں اور منفرد رہا۔ اس طرح ان میں ایسی ملت کی بنیاد پڑ گئی جو زمان و مکان اور نسل و قوم کے تعصّبات سے پاک تھی۔ مسلمانوں نے اپنی اس ملّی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے جو جو شعوری یا غیر شعوری کوششیں کی ہیں ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں پھر بھی ان کی اس کوشش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے ہر قسم کے اداروں کو اپنی انفرادیت کا مظہر بنا کر ہی چھوڑا۔ زندگی کے جائز اور ضروری تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کو اپنے رنگ میں پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح ماحول سے بے آہنگ بھی نہ ہوئے اور ملی انفرادیت بھی قائم رہی، انھوں نے دوسروں کو جذب کیا لیکن خود کسی میں جذب نہ ہوئے۔ مسلمانوں کا یہ ملّی شعور ان کے تمام اداروں پر ابر چھایا رہا ہے۔

امتِ اسلامیہ کا ادارۂ تعلیم ان کے ملّی شعور کا سب سے زیادہ اہم مظہر رہا ہے۔ یہ ادارہ ایک طرف اس کے مذہبی تصورات اور عقائد سے سب سے زیادہ متاثر تھا تو دوسری طرف ان کی قومی تشکیل میں سب سے بڑی اثر انداز حیثیت رکھتا تھا۔ اس ادارے کا مقصد افراد کو ان

کے ذوق اور استعداد کے مطابق زندگی کی گوناگوں وسعتوں کے لئے تیار کرنا اور ترقی پذیر گردوپیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی استعداد پیدا کرنا تھا۔ مسلمانوں کی درس گاہیں ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز رہیں۔ علوم میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز نہ تھا۔ یہ درس گاہیں حکومت کے ساتھ اور حکومت کے بغیر دونوں طرح چلتی رہیں اور اس طرح مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ مسلمانوں کی زندگی کے جزو لاینفک کی حیثیت میں قائم اور برقرار رہا۔

چونکہ مسلمانوں کی ملّی زندگی اور اس ادارہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے جوں جوں ان کی ملّی حیات میں جمود و اضمحلال آتا گیا ان کا ادارۂ تعلیم بھی ویسے ویسے جامد اور مضمحل ہوتا گیا۔ اگر ملوکیت کی پیش قدموں اور پیش پائیوں، آبادکاریوں اور تباہ کاریوں کی داستان کو ہی مسلمانوں کی مکمل داستان نہ سمجھ لیا جائے تو درحقیقت چوتھی پانچویں صدی سے ہی تاریخ کی اس بڑی اور اثر انداز ملت میں جمود اور اضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور وہ ہر جہتی اور متناسب نمو اور ارتقاء جو کسی قوم کو ہر طرح کے گردوپیش میں ترقی پذیر اور متناسب بنائے رکھتا ہے، اس کے دھارے خشک ہونا شروع ہو گئے تھے۔

یہ جمود اور اضمحلال کیسے اور کیوں کر آیا اس کی داستان طویل ہے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے تلخ بھی۔ لیکن حقیقتوں سے صرف نظر بھی کب تک مسلمانوں کا مذہبی اور علمی تنزل بلکہ میرے نزدیک تو ان کا سیاسی اور اقتصادی زوال بھی اس داستان کا الم ناک باب ہے۔ میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا تاہم کچھ اشارے بے محل ہوں گے۔

چوتھی پانچویں صدی میں بعض عارضی عوامل سے متاثر ہو کر ہمارے فقہاء نے فقہی اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے۔ ممکن ہے کہ وقت کی مصلحتوں کا یہی تقاضا ہو اور ماحول اور ماحول کی اصلاح کا بھی واحد طریقہ ہو لیکن اس کے اثرات کی دوررسی اور ہمہ گیری کو غالباً یہ بزرگ پوری طرح محسوس نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی پوری ملّی حرکت کا محور دین تھا۔ دین کے خارجی پہلو یا اس کے معاشرتی رخ سے اجتہاد کو خارج کر کے جمود کو دعوت دینا ایک طرح سے ان کی ملّی حیات کو جامد بنا دینا تھا۔ زندگی کے تمام شعبے جامد ہونے شروع ہو گئے۔ علوم و فنون کی حرکتیں سست ہو گئیں۔ اگلوں کا ضروری احترام بے جا عصبیت میں بدل گیا۔ غلطیاں کر سکنے والے تمام عملاً معصوم بن گئے۔ جدّت افکار گویا ناپید ہو گئی۔ اہل علم کی دماغی اپچوں نے فکری جولانیوں کے لئے اس قید و بند میں بھی نئے میدان تلاش کرنے شروع کر دیئے جو

پچھلوں کے لئے شمعِ راہ ہونے کے بجائے رستے کے روڑے ثابت ہوئے۔ اس کے مختلف النوع مظاہر کی تفصیل و تفتیش کا یہ موقع نہیں تاہم اس کا تعلیمی اور تصنیفی مظہر سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ جدت فکر کی بے راہ روی نے نئی پگڈنڈیاں نکالیں۔ متقدمین کے استنباط کئے ہوئے مسائل چیستان بنے اور چیستانوں کے حل دریافت ہوئے اور حلوں کو معمہ کیا گیا۔ اعتراض اور جواب، توثیق و تردید اور توجیہہ و تعلیل کی تہیں جمتی گئیں۔ اگلوں کی کلیات استقراء اور استنباط سے پچھلوں کو بے نیاز کر دیا۔ اس تاریک فضاء میں اگر کسی منچلے دماغ نے کوئی چمک محسوس کی تو معاصرین اور متاخرین کی کج بحثیوں نے اس پر دھند پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ زمانے کو قدامت سے بیر ہے لوگوں نے پچھلوں کی پذیرائی کی اور اگلوں کے کاموں کو کتاب خانوں میں بند کر کے طالبانِ فن سے اجتہادی نمونے بھی چھین لئے اور پچھلوں کی جامد تالیفات ان کی رہنمائی کے لئے رہ گئیں۔ ہمارے نصاب کی کتابوں پر نظر ڈال لیجئے قریب قریب سب کتابیں مسلمانوں کے عہد جمود کی یادگاریں ہیں۔ متن، شرح اور حاشیئے کا ایک چکر ہے جس میں نہ علم کی انفرادیت قائم ہے۔ نہ مضمون کی جامعیت، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کس کس کا کیا کیا حصہ ہے۔ کس کس کی فروگزاشتیں ہیں اور کس کس کی اصلاحیں، طرزِ تعلیم دیکھئے تو محض کتابی نہ زندگی سے مربوط نہ مقصد سے چسپاں، خود قناعتی جمود حقیقتوں سے اغماض اور کج بحثی تو ہمارے مدارس کی گویا خصوصیات ہیں۔

علوم اور فنون کے جمود نے مسلمانوں کے سب سے اہم قومی ادارے تعلیم کو جامد بنا دیا اور وہ درس گاہیں، جو زندگی کی نشوونما میں سب سے زیادہ قابلِ قدر حصہ لیتی تھیں، زندگی سے دور ہوتی چلی گئیں لیکن یہ دوری بہت دنوں تک محسوس نہ ہو سکی۔ اتفاق سے مشرق میں خود زندگی بہت دنوں تک ساکن اور جامد رہی اور ہماری درس گاہیں اپنے اپنے ڈھرے پر رہتے ہوئے بھی صدیوں تک زندگی کی ہم آہنگی کرتی رہیں۔ مغرب اور مشرق کا تصادم ہوا اور مشرق میں پہلی بار زندگی نئے افکار نئی اقدار اور نئے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ہماری درس گاہیں نہ وقت کے ان نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی تھیں نہ ان نئی فکروں اور نئی قدروں کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ چناں چہ ہماری درس گاہوں کو اپنی ہر جہتی ختم کرنی پڑی اور آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے زاویئے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ علوم و فنون میں دینی و دنیوی کی تقسیم قبول کر کے اپنے آپ کو دینی علوم کی تعلیم میں محدود کر لیا۔ اس تدبیر سے تقریباً ایک صدی سے

زیادہ عرصہ زندگی سے بچتے بچتے گزر گیا۔ لیکن جس طرح زندگی سے الگ کر کے عام علوم و فنون کی تعلیم بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح خالص دینی تعلیم کو بھی زندگی سے بچا کر باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ چناں چہ رفتہ رفتہ وہ گوشہ عافیت بھی تنگ ہونا شروع ہو گیا جس کو ہماری درس گاہیں قلعہ بند سمجھے ہوئے تھیں۔

یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہے بھی یہی کہ ماحول اور فضاء کافی مسموم ہو چکی ہے۔ لوگوں کو دین سے وہ لگاؤ نہیں ہے جیسا ہونا چاہئے۔ اسلامی مدارس کی تعلیم اور تربیت سے بُعد بڑھتا جا رہا ہے۔ دینی عقائد و تصورات میں وہ قوت باقی نہیں رہی ہے جو امت مسلمہ کو زندگی کے میدان میں منظم اور منضبط رہ سکے لیکن اس کی ذمہ داری صرف دوسروں پر ہی نہیں ہے کچھ قصور ہماری درس گاہوں کا بھی ہے۔ ہماری درس گاہوں نے زندگی کو ایک کل کی صورت میں دیکھنا چھوڑ دیا۔ زمانے کی عقل کو نا قابلِ اعتناء قرار دیا۔ عصری علم و فنون سے دیدہ دانستہ اغماض کیا اور اس طرح زندگی سے کٹ گئیں۔ ہمارے علماء کا فرض تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیتے اور حقیقی عمل و اسباب کو دریافت کرتے اور جب مرض متعین ہو جاتا تو صحیح علاج کی طرف متوجہ ہوتے اور طبیب حاذق کی طرح ہر وقت مرض اور علاج کی مطابقت پر نظر رکھتے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ بر خلاف ازیں انہوں نے محض دوسروں کی کوتاہیوں سے اپنی اور اپنے اداروں کی کمیوں کی تلافی کرنی چاہی۔

مسلمانوں کی ملّی انفرادیت کو بر قرار رکھنے کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کی انفرادیت کو قائم رکھنا ضروری ہے اور یہ بغیر اسلامی درس گاہوں کے ممکن نہیں۔ ہماری آج کی اسلامی درس گاہیں پرانے عربی کے مدرسے ہیں اور یہی ہماری اس ملّی حیات کی نمائندگی کر رہے ہیں جس کی شیرازہ بندی مذہب کرتا ہے۔ ان مدرسوں کے علاوہ مسلمانوں کے اور جتنے ادارے ہیں یا قومی اور وطنی زندگی کو پیش کرتے ہیں یا دوسرے عصری محرکات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان مدرسوں کا حال یہ ہے کہ ان کا نصاب، طرزِ تعلیم، ان کے اساتذہ کا اندازِ فکر، ان کے طلباء کا اندازِ نظر، سب کے سب زندگی سے دور اور تعمیری قوتوں سے نا آشنا معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے علماء نے یا حالات کی قوت کو محسوس نہیں کیا یا راضی بقضا ہیں۔

زندگی اپنا چولا بدل چکی۔ علوم و فنون بدل گئے۔ مسائل دوسرے ہو گئے۔ طرزِ فکر اور اندازِ نظر نیا ہو گیا۔ ہر چیز قانون ارتقاء کے تحت ماضی سے بہت آگے نکل گئی۔ دنیا کے جن

جن اداروں نے زندگی کا ساتھ دیا اور اس کی ارتقاء میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا وہ باقی رہے اور ترقی کرتے رہے، جو ادارے زندگی کا ساتھ نہ دے سکے انہیں ختم ہونا پڑا۔ کائنات کی ترقی پذیر روح حیات کو جذب کیے بغیر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری ان پرانی درس گاہوں نے بد قسمتی سے قدرت کے اٹل قانون کی خلاف ورزی کی اس لئے یا فنا ہو گئیں یا فنا آمادہ ہیں۔ ان کو ان کی موجودہ حیثیت میں باقی رکھنے کی ہر کوشش لاحاصل ہے۔ ان کا کام ختم ہو گیا۔ ان میں پڑھائے جانے والے علوم فرسودہ ہو گئے۔ طریقہ تحقیق اور طرزِ تعلیم دونوں بوسیدہ ہیں۔ نہ یہ ہماری خارجی زندگی سے ہم آہنگ اور نہ داخلی حیات سے مطابق ان میں اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں۔ زندگی کو اسلامی اصول پر متوازن بنانے کے لئے جن قابلیتوں کی ضرورت ہے ان کو پیدا کرنے سے یہ قاصر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا باقی رہنا کرامت ہو سکتا ہے۔ تاریخ کا تقاضا نہیں۔ اس بدلی ہوئی فضاء میں ان کو باقی رکھنے کی بڑی سے بڑی کوشش ان کی رفتار زوال کو کچھ سست کر سکتی ہے زندگی نہیں پھونک سکتی۔

تاہم اگر ان مدارس کو پرانے انداز پر ہی باقی رکھنا ہے تو پھر وہی تدبیر کرنی ہو گی جس کو اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے آزمایا گیا تھا۔ ان مدارس کو اور زیادہ نیچے لانا پڑے گا اور کمیت کے ساتھ کیفیت کو بھی محدود کرنا ہو گا۔ نصاب کو بہت زیادہ ہلکا کرنا پڑے گا۔ تعلیمی گھنٹوں میں کافی کمی کرنی ہو گی۔ اوقات میں تبدیلی جائے گی اور مدت تعلیم کو کم کیا جائے گا تاکہ مذہبی تعلیم کے شائق (اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں) اپنے غیر مصروف گھنٹوں میں دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ دو تین سال میں مذہبی نصاب کو ختم کر سکیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے خصوصی ذوق اور اچھی صلاحیت والے افراد نکل آئیں جو اس تعلیم کی اپنے طور پر تکمیل کر کے ہمارے موجودہ علماء کی جگہ لے سکیں۔

اس تدبیر سے ہم اپنی موجودہ درس گاہوں کو کچھ زمانے کے لئے آباد کر لیں گے اور مذہبی تعلیم کا چرچا کچھ دنوں تک مزید بر قرار رہے گا کیونکہ یہ محض عارضی تدبیر ہے جو موجودہ احول کو دیکھتے ہوئے شاید پیش رو تدبیر سے بھی کم دیرپا ثابت ہو گی اور ہمیں چاروناچار یا ان مدارس کو مستقلاً بند کرنا پڑے گا یا پھر کوئی دوسری تدبیر کرنی ہو گی۔ کیونکہ آج کل ظروف و

حالات جس تیزی سے کے ساتھ بدل رہے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ ذہنیتوں میں جس سرعت کے ساتھ انقلاب آتا جا رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی عارضی تبدیلیاں بہت زیادہ وقتی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہاں اگر ہمارا مطمح نظر انداز اور طرز نہیں ہیں اور ہم علوم و فنون کو انہیں پر منحصر نہیں سمجھتے ہیں۔ جو متاخرین سے ہمیں ورثے میں پہنچے ہیں بلکہ ہمارا مقصود اسلامی ادارۂ تعلیم کو برقرار رکھنا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کو وہ کیسے ہی حالات و ظروف میں ہو اسلامی بنایا جا سکے اور مذہبی اصول کو بنیاد بنا کر مسلم زندگی کی تنظیم کی جائے تو پھر اس کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کیا تھا۔ مدرسوں میں عصری روح جذب کرنی ہو گی۔ قدیم فرسودہ علوم و فنون کے بجائے علوم و فنون کو ان کی ترقی یافتہ شکل میں شامل کرنا ہو گا۔ تعلیم کو زندگی سے مربوط کر کے آگے بڑھنا ہو گا۔ ان درس گاہوں کا دینی پہلو یہ ہو گا کہ طلباء کو اسلام کی حرکی قوتوں سے آشنا کریں گی۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے زندگی میں کس طرح ضبط پیدا کیا جا سکتا ہے، یہ درس گاہیں اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کریں گی۔

غالباً صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ جس سے اسلام کے تعلیمی ادارے کو باقی رکھا جا سکتا ہے اور اس کو مسلمانوں اور خود اسلام کے لئے مفید بنایا جا سکتا ہے اور تنہا اسی قسم کی درس گاہوں کے فضلا سے زندگی میں رہنمائی کی توقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ درس گاہیں زندگی سے بیگانگی نہیں برتیں گی اس لئے وہ شاید زیادہ دیرپا اور مستقل ثابت ہوں۔ یہ طریقہ ایک بار کامیاب ہو چکا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب ناکام ہو اور اگر خدانخواستہ ناکام ہو تو بھی ممکن ہے کہ اس تجربے کی بناء پر ہم زیادہ بہتر اور زیادہ عملی راہوں کا سراغ پا سکیں۔ لیکن اگر کچھ بھی نہ ہو سکا اور اصلاح کے شوق میں ہماری موجودہ درس گاہیں جاتی رہیں تو یہ ایسی بات ہے جو ہونی ہے اس لئے خوف زدہ ہو کر ہمیں صحیح سمت میں کوششیں نہ چھوڑ دینی چاہئیں۔ کیونکہ تسکین کے لئے یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم نے اپنی جیسی کر لی۔

ہمارے مدارس کی اصلاح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ تحقیق کرنی ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کا وہ خاص ڈھانچہ کون سا ہے جو اسلامی مدارس میں حد فاصل ہے۔ کون سے مضامین لازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور کون سے اختیاری۔ ان مدارس کی تعلیم اور تربیت کی

امتیازی خصوصیات کیا ہے۔ ان امور کی صحیح تحلیل کر لی جائے تو ممکن ہے کہ اصلاح کے لئے صحیح رستے مل جائیں۔

تذکروں اور تاریخوں نے ہمارے مدارس کے نصاب کے بارے میں جو کچھ محفوظ رکھا ہے اس سے اور مختلف علوم و فنون کی ان تصانیف سے جو ہم تک پہنچی ہیں یہ قیاس کرنا بے جا نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ انہوں نے دین کو اساس بنا کر تعلیم کی عمارت کو استوار کیا اور ہر طرح کی فکری اور عملی کوششوں کو دین کے سانچے میں ڈھال دینے کی کوشش کی۔ اصل خاکے کو مذہبی رکھ کر اس میں علوم و فنون کی رنگ آمیزیاں کیں۔ مذہب کے تفوق کو نمایاں کیا۔ اس طرح اگر ایک طرف مسلمانوں کے علوم و فنون مذہب سے متاثر ہوئے تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ دوسری طرف مذہب نے بھی بعض اجنبی اثر قبول کئے۔ ہم مسلمانوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور اس ڈھانچہ کو جو زمانے نے ان کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا تھا کسی طرح نہ چھوڑا۔ ہماری درس گاہوں کا بھی مخصوص ڈھانچہ ہے جو ان کو دوسری درس گاہوں سے ممتاز بناتا ہے۔

مسلمانوں کے نصابِ تعلیم کے صدہا سالہ مسلسل تغیّروں پر اڑتی سی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات اور عربی کو چھوڑ کر ہمارے نصاب کے تمام دوسرے مضامین میں پیہم ردوبدل اور متواتر حذف و اثبات ہوتا رہا ہے اور یہ استثنا بھی ابتدائی اور متوسط نصاب میں ہے۔ نصاب تعلیم کے اعلیٰ مراتب میں یہ استثنا بھی نظر نہیں آتا۔ تفقہ فی الدین اور عربی کی ساری مہارت طلباء کے ذوق، مناسبت طبع اور فرصت اور حالات کی مساعدت پر منحصر رہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین سے اوسط درجے کی عام واقفیت پیدا کرانی جس سے اسلام کے عقائد و اعمال واضح ہو جائیں۔ اسلامی طرزِ زندگی کا علم ہو جائے اور معاشرے کی روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ ہمارے مدارس کا مطمع نظر تھا۔ اس سے زیادہ کی تعلیم کو یہ ادارے نہ ضروری سمجھتے تھے اور نہ مناسب۔ ان اداروں کو عربی سے جتنی دلچسپی تھی اس کی حدیں مقرر تھیں۔ یہ درس گاہیں اپنے طلباء کو اس قدر عربی سے لازماً آشنا بنا دیتی تھیں جس سے وہ قرآن و حدیث سے بطور خود اور بلاواسطہ فائدہ اٹھا سکیں، اور اسی ضمن میں فقہ و اصول اور عقائد و کلام کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کر سکیں۔ عہد جاہلی کی ادبی عربی اپنی تمام

لسانیاتی نزاکتوں اور فصاحت اور بلاغت کے نکتوں کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان 'اعجاز ادا اور تدبر معانی کے لئے ضروری سہی' مروجہ عربی اہل زبان کے اختلاط و تعلق کے لئے ناگزیر سہی 'لیکن ہماری درس گاہوں نے اپنے عام متوسط نصاب کا ان کو جزو لازم نہیں بنایا بلکہ خصوصی ذوق اور شخصی ضرورتوں پر محمول رکھا۔

اسلامی درس گاہوں کی تربیت کی امتیازی خصوصیت یہ رہی کہ وہ طلباء میں اسلامی کردار کو نشوونما دیں 'ان کے افکار' اخلاق و اعمال کو اسلامی نمونے کے مطابق ڈھالیں۔ چناں چہ صالح، ماحول اسلامی کردار کے اساتذہ اس تربیت کے لئے ضروری عناصر سمجھے گئے۔ غرض یہ کہ ہماری درس گاہوں کی تربیت کا مقصد صرف اچھے اور مفید شہری بنانا نہیں رہا ہے بلکہ اچھے اور مفید مسلمان بنانا رہا ہے اور تنہا یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے مسلمانوں کو اپنی مستقل درس گاہوں کی ضرورت ہے۔

اسلامی درس گاہوں کے امتیازی اوصاف کی اگر یہ تحلیل درست ہے تو ان کو سامنے رکھ کر ہی ہمیں اپنے ان مدارس کی اصلاح کرنی چاہئے۔ جہاں تک مقصد اور ترتیب کا تعلق ہے جب تک ہماری درس گاہوں کو ایسے اساتذہ میسر نہ آجائیں جو خود اس رنگ میں رنگے ہوں اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم اپنی درس گاہوں میں مقصد اور تربیت کے اعتبار سے سو فیصد اور تربیت کے اعتبار سے سو فیصد کامیاب ہوں گے تاہم اس سلسلے میں جو کوششیں ہو سکتی ہوں ان سے دریغ نہ کرنا چاہئے اور جو مسائل مفید ہوں ان کو اختیار کرنا چاہئے۔

ابتدائی اور متوسط نصاب میں دینیات اور عربی کو لازم قرار دیا جائے اور اعلیٰ اور تکمیلی نصاب میں ان کو اختیاری مضامین کی حیثیت میں پڑھایا جائے اور حتی الامکان ان درس گاہوں کو ہر جہتی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پرانے علوم آج اتنے ترقی کر چکے ہیں کہ جدید و قدیم میں نام کے علاوہ شاید کوئی اشتراک نہیں۔ فہرست علوم میں سینکڑوں نئے علوم کا اضافہ ہو گیا۔ ہماری درس گاہوں کو حسب مقدرت ان سب کو شامل کرنا چاہئے اور ایسے تمام علوم و فنون کو جو آج محض قدیم نظریوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور صرف تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ان کو عام نصاب سے خارج کیا جائے 'ان کی صحیح جگہ ہمارے مدارس میں کہیں ہے تو تخصص کے مرحلے میں اور وہ بھی اختیاری حیثیت میں۔

یہ سچ ہے کہ ہماری عام درس گاہیں موجودہ فنون کی تعلیم کا بار اٹھانے کے قابل نہیں لیکن ابتدائی اور ثانوی مرحلوں تک بہت سے مدرسے اگر چاہیں تو جدید تعلیم کا بار اٹھا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے بعض بڑے مدرسے کوشش کریں تو کم از کم نظری فنون کو جامعی معیار تک بھی پڑھا سکتے ہیں۔ اس طرح جب نئی منہاج کی بنیاد پڑ جائے گی اور نئے فنون ہماری درس گاہوں میں بار پالیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عملی فنون کی راہیں نہیں کھلیں گی اور خدا ان کے لئے اسباب مہیا نہیں کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم میں جذب کی ہوئی عصری تعلیم ہماری درس گاہوں کی معرفت کافی سستی اور زیادہ مفید ثابت ہو گی۔ زبان کا مسئلہ بھی اب زیادہ دشوار نہیں ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ نے کام چلانے کے لئے اردو میں کافی مسالہ جمع کر لیا ہے جس سے اگر چاہیں تو بھارت میں تنہا بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں اور یوں حکومت سے آزادرہ کر اردو کی ٹھوس خدمت بھی انجام دی جا سکتی ہے۔

پوری تعلیم کو ایک اکائی کی صورت میں ضبط کرنا نہ طلباء کے لئے مفید ہے اور نہ سرپرستوں کے لئے خالص تعلیمی زاویہ نظر بھی اس طریق کار کی تائید نہیں کرتا۔ تعلیم کو چند اور مکمل بکار آمد مرحلوں میں تقسیم ہونا چاہئے۔ ابتدائی مرحلوں کو چھوڑ کر ثانوی اور جامعی مرحلوں میں طلباء کی ضرورتوں اور مناسبتوں کے تحت اختیاری مضامین کی مجموعہ بندیاں کرنی چاہئیں۔ تخصص اور مہارت پیدا کرنے کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں۔ اس کے بغیر ہماری درس گاہیں ہر جہتی اور مفید نہیں بن سکتیں۔ مضامین کی تقسیم مجموعہ بندی اور طریق تعلیم میں عصری تحقیقوں اور ماہرین تعلیم کی رایوں اور منصوبوں سے کام لینا چاہئے۔ اس طرح ہم بہت سی کاوشوں سے بھی نجات پالیں گے اور ہمار نظامِ تعلیم خود بخود حرکی اور عصری روح سے ہم آہنگ رہے گا۔

ہماری درس گاہوں کے مروجہ دینیاتی نصاب میں قرآن مجید کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے حالاں کہ اسلام کو سمجھنے اور اس کا عام میلان و مزاج دریافت کرنے کا واحد ذریعہ قرآن مجید ہی ہے۔ قرآن مجید میں بلاواسطہ تدبر کی راہیں بڑی حد تک بند ہیں۔ آئندہ نصاب میں اس کو مرکزی مقام ملنا چاہئے اور بلاواسطہ تدبر کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ احادیث کا دورہ حنفی اور اشعری کلام کی روشنی میں پورا کر دیا جاتا ہے اور اس طرح احادیث کی تمام دوسری حیثیتیں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ احادیث کو جب تک شرح قرآن کا درجہ نہیں دیا

جائے گا ان کی تعلیم کا صحیح فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ فقہ آج تقلیدِ محض ہے۔ تعلیم کے آخری مرحلوں میں حقیقی تفقہ پیدا کرنا ہمارے نصاب کا مطمح نظر ہونا چاہئے۔ اصولِ فقہ کا درس بالکل بے مقصد ہو گیا ہے۔ اس کو بامقصد بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ عقائد و کلام میں مختلف اسباب و عوامل کی بناء پر عجیب و غریب عقائد اور دوراز کار نظری مباحث شامل ہو گئے ہیں جو ممکن ہے کبھی مفید اور ضروری ہوں مگر آج ان کی وجہ سے اسلامی عقائد کی سادگی چھپ جاتی ہے اور اس زمانے کے ذہن کے لئے طمانیت بخش ہونے کے بجائے الجھنوں کا باعث ہیں۔ دینیات کے لئے جدید نصاب پر غور کرتے وقت ان سب باتوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا نصاب اسلامی رجحانات سے مناسبت رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید ماحول کی ضرورتوں کو بھی پورا کر سکے۔

دوسرے فنون کی تعلیم میں تاریخی پس منظر کے طور پر ان خدمتوں کو جو مسلمانوں نے انجام دی ہیں نمایاں کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی تاریخِ علوم میں جو خلاء ہے بھر جائے اور اس لئے بھی کہ ہماری موجودہ تعلیم اپنے ماضی کے ساتھ مربوط رہے۔ اس طرح نہ ہم اپنے اسلاف سے بیگانے رہیں گے اور نہ ہماری ملی وحدت زمانوں اور عصروں سے پارہ پارہ ہو گی۔

ہمارے مدارس میں ابتداء سے بعض ایسے مضامین درس میں شامل ہیں جو ابتدائی موقف میں بالکل بیکار ہیں اور ان طلباء کی قوت بے جا صرف ہوتی ہے۔ ایسے مضامین کو ابتدائی مراحل سے خارج کر دینا بہتر ہے۔ ان کا درس بشرطِ ضرورت صحیح موقعوں پر ہونا چاہئے۔ معانی بیان' اصولِ فقہ' منطق اور فلسفہ اس قسم کے مضامین ہیں۔ صرف و نحو ابتدائی مرحلے کے لازمی مضامین ہیں مگر ان کی مجرد حیثیت میں تعلیم طلباء پر غیر ضروری بار ہے۔ ان کی تعلیم زبان کے ضمن میں ہونی چاہئے یوں طلباء دلچسپی بھی محسوس کریں گے اور زبان کے ساتھ قواعد کی مشق بھی ہو جائے گی۔

زیرِ درس مضامین میں اصل اہمیت علوم کو دینی چاہئے نہ کہ کتابوں کو۔ کتابوں کی حیثیت ان یادداشتوں سے زیادہ نہیں جن میں اساتذہ اور طلباء کی سہولت کے لئے متعین معیاروں کے تحت علمی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ بغیر خاص ضرورت کے کتاب کو موضوعِ درس بنانا تعلیم کو ناقص بنانے کے مترادف ہے۔

تعلیم میں اس کی خاص طور پر نگرانی کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا موضوع طالب علم رہے۔ تعلیم میں اس کی ضرورتوں' دلچسپیوں اور مناسبتوں کا خیال رکھا جائے اس کی ذہنی الجھنوں اور کشمکشوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان کو حل کرنے اور دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے۔ تعلیم کا فائدہ طالب علم کے انفرادی اور اجتماعی رجحانوں کو سدھار کر اس کو سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور بکار آمد بنانا ہے نہ کہ اس کو علوم کی کال کوٹھری بنانا اسی ضمن میں بھی یہ ضروری ہے کہ طلباء میں تعمیری نقد کی حوصلہ افزائی کی جائے اس طرح نہ صرف یہ کہ اس کی تخریبی قوتوں کی اصلاح ہوگی بلکہ اس کی داخلی الجھنوں کی بھی تسکین ہوتی رہے گی اور دماغی اپج میں ترقی بھی۔

اس سلسلے کی آخری گزارش مدارس کے ارباب انتظام سے یہ کرنی ہے کہ اگر ہندوستان کے محکمہ تعلیم کے منظور کئے ہوئے مراحل اور ان کے بنائے ہوئے نصاب کو معیار بنا کر ضروری حذف واثبات سے ان میں دینیات کو جذب کر دیا جائے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ یہ کچھ زیادہ دشوار نہیں تو بہت سی کاوشوں سے نجات مل جائے گی اور ہمارا نصاب خود بخود زمانے کے ساتھ چلنے لگے گا۔ اساتذہ کا مناسب انتخاب تعلیم اور طرز تعلیم کی نگرانی طلباء میں اسلامی روح پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

ابتدائی مراحل میں اساتذہ کی تھوڑی سی توجہ سے عربی اور دینیات کو ایک دوسرے میں جذب کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی مراحل میں عربی کو لازم کرنے کا مقصد طلباء کو ابتداء ہی سے ایسا ذریعہ فراہم کر دینا ہے جس سے وہ دینیات کے ماخذوں سے براہ راست اور بقدر استعداد فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر قرآن حدیث اور فقہ و عقائد سے الفاظ' فقروں' جملوں اور عبارتوں کا انتخاب کر کے عربی کی تعلیم دی جائے تو یہ فائدہ بدرجہ اتم حاصل ہو جائے گا' اور زبان کے اعتبار سے بھی عربی اتنی ہو جائے گی کہ آئندہ مراحل میں ادبی عربی کے لئے درجات کا کام دے۔

آخر میں مجھے ایسے تمام بزرگوں اور رفیقوں سے جن کو میری معروضات سے دکھ پہنچا ہو یا انہوں نے سوء ادب محسوس کیا ہو میں معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ میری نیت نہ دکھ دینا ہے اور نہ سوء ادب کا ارتکاب۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔

# ہندوستان کے اسلامی مدارس پر ایک نظر

مولانا محمد عبدالسلام خان

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی اسلامی مجالسِ درس قائم ہو گئیں تھیں۔ ان مجالس میں ابتدائی صرف و نحو کے بعد عام طور پر فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ قرآن و حدیث ہندوستانی مجالس درس کے لئے ایک حد تک غیر مانوس تھے۔ تبرکاً بعض اساتذہ حدیث کی دو ایک کتابیں بھی پڑھا دیتے تھے۔ علوم آلیہ میں نحو صرف اور دوسرے لسانی علوم کی بہت معمولی تعلیم ہوتی تھی۔ صوفیہ کی مجالس میں تصوف کا زور تھا مگر غالباً نظری اور عملی تصوف کی اعلیٰ اور مستند کتابوں کے چرچوں سے ان بزرگوں کی محفلیں بھی خالی ہی ہوتی تھیں۔

## ہندوستان میں علومِ دینیہ

فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم میں نہ اجتہادوں استنباط کو دخل تھا اور نہ فروع کے اصول پر انطباق کو ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر کہئے یا علماء ماورا ٔالنہر کا طرزِ تفقہ' جن کے توسط سے فقہ واصول ہندوستان میں پہنچے تھے کہ یہاں شخصیت پرستی اور اب عن جدٍ' متوارث خیالات اور اوہام نہ صرف عوام کے دماغوں پر مسلط تھے بلکہ خواص اور حاملین عوام بھی اس سے بچے ہوئے نہ تھے۔ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت میں سب سے بڑا دخل صوفیا کے اثر کو ہے۔ صوفیا کا مقدس طبقہ اپنی صلح کل اور ہر شخص کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے کی حکمت عملی پر قائم رہنے میں اور متصوفانہ خیالات اور تاویلات کی پذیرائی میں سب سے آگے رہا ہے۔ صوفیہ کی یہ عام ذہنیت منفی طور پر ایک حد تک اس بات کا سبب بن گئی کہ اسلامی عقائد اور اعمال غیر اسلامی اوہام و مراسم سے صاف نہ ہو سکے اور لوگوں میں تنقید و اجتہاد کی طرف کوئی میدان

پیدا نہ ہو سکا۔ مزید براں اسلام کے اصلِ اصول یعنی قرآن اور حدیث کی طرف نیز ان کے مقدس شارحین صحابہ و تابعین کے اعمال و اقوال کی طرف خاص توجہ نہ تھی۔ لہذا مسائل کا اصول پر پیش کرنا ممکن بھی کس طرح ہو سکتا تھا۔ اہلِ سنت کے مذاہب اربع میں سے صرف حنفی اصول و فروع سامنے رہے۔ دوسرے ائمہ کے اصول و فروع سے صرف اتنا تعلق تھا کہ ان کی تردید کرنے کے لئے حنفی کتابوں میں جستہ جستہ ان کا ذکر آیا ہے۔ ایسی حالت میں چیزوں کا یک طرفہ رہنا ناگزیر تھا۔ چناں چہ قوت انتقاد و اجتہاد کے ابھرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ معدودے چند افراد کو چھوڑ کر ہندوستان کی عام تصنیفات اس جامد اور غیر تنقیدی نقل و تقلید کی آئینہ دار ہیں۔

قرآن و حدیث اور صحابہ و تابعین کی سیرتیں اصول کی حیثیت میں ہندوستان کے علماء کی نظر میں جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔ اپنی حقیقی اہمیت حاصل نہیں کر سکی تھیں اور ان کی اس طرح کی خدمت نہیں کی گئی تھی جس طرح کی خدمت کی یہ چیزیں مستحق تھیں۔ لہذا جس طرح اسلام کی عملی فروغ کا انطباق اسلامی اصول پر نہ ہو سکا اسی طرح اسلامی عقائد بھی اپنے اصول استنباط پر منطبق نہ ہوئے چناں چہ جب علم العقائد و کلام کی طرف ان کی توجہ ہوئی تو عقائد کے نام سے ایسا مجموعہ سامنے آیا جس میں بہت سے دور از کار فلسفیانہ مبادی داخل ہو چکے تھے جن کو متکلمین نے فلسفہ یونان کے مقابلے کی ضرورت سے تعلیم کیا تھا۔ ان فروعات پر عقائد کا مدار رہا اور ان کو اصول سمجھ کر دوسری غیر اسلامی چیزیں بھی ان ہی پر قیاس کی جانے لگیں۔ اس طرح ان عقائد کے علاوہ جو ان کتابوں میں مذکور تھے بہت سے مزید خیالات نے اعتقادیاتی حیثیت اختیار کر لی۔ کلامی مباحث اور نظریے متاخرین کے توسط سے ہندوستان میں رواج پذیر ہوئے اور ان کی لفظی بحثیں اور "ان قیل قلت" کی بے معنی بھول بھلیاں سامنے آگئیں۔ نظریات و خیالات کی اصل بنیادیں اور ضرورتیں جن پر یا جن کی وجہ سے یہ نظریئے اور خیالات تسلیم کئے گئے تھے۔ آخر میں نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے۔ لہذا ان سے اگر کوئی حقیقی فلسفیانہ فائدہ ہو تا بھی تو ایسی حالت میں نہیں ہوا۔ علم کلام کی ضرورت عقائد اسلامیہ کو مخالفین سے اس طرزِ خیال کے مطابق منوانا تھا جس کے وہ عادی تھے۔ یہ ضرورت اس لئے تو مسلم تھی کہ کتابوں میں لکھی تھی لیکن چوں کہ ان سے مجتہدانہ کوئی سروکار نہ تھا اس لئے ان پر نظر ثانی کی یا از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت کا احساس نہیں

ہو سکتا تھا۔

## ہندوستان میں علوم عقلیہ

علوم عقلیہ کا داخلہ ہندوستان میں مغلیہ دور حکومت میں ایران کے راستے سے ہوا۔ اہل ہند کے لئے یہ علوم نئے تھے۔ پورے انہماک کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن یہ ان کی قسمت تھی کہ ہندوستان میں ایرانی متاخرین کی کتابیں ان کی مرعوب کن شخصیت کے ساتھ آئیں۔ چناں چہ انہیں متاخرین کی کتابیں ہندوستانی درس میں مقبول ہو گئیں اور اس طرح بجائے مختلف نظریوں سے روشناس ہونے کے ہمارے حصے میں صرف لفظی بحثیں، بے مقصد اور بے معنی نکتہ آفرینیاں رہ گئیں اور تخصیص و تشریح اور تحشیہ در تحشیہ کا بگڑا ہوا مذاق پیدا ہو گیا۔ ان علوم میں بھی اجتہادی اور انتقادی کام سے ان کی عقلی قوتیں محروم ہو گئیں۔ ان کتابوں کی بناء محض قیاسات اور اٹکل پچو کلیات پر تھی اس لئے ان کی تجربی قوتوں کو کسی قسم کی مشق نہ ہو سکی بلکہ متاخرین کے عام سلسلہ فکر کی تقلید میں تجربے کی اہمیت ہندوستانی طلباء اور علماء کے سامنے سے اُٹھ گئیں اور وہ بھی اس کو اپنے عملی درجے سے پست خیال کرنے لگے اور اس سے کام لینا اہل صنعت و حرفت کے لئے مخصوص سمجھا گیا اور علوم عالیہ کے لئے صرف فرضی اور گھڑے ہوئے کلیات کو کافی ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ ان کو ہی اہم مانا گیا۔ طبعیات' الٰہیات' منطقیات کی یہی حیثیت ہے' عقلیات میں سے وہ فنون جن کو عملی اغراض سے تعلق تھا۔ مثلاً ریاضیات وغیرہ ان میں بھی اس معنی میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی کہ مختلف مشاہدات' تجربات سے ان کے مسلمہ اصول و ضوابط میں کمی بیشی یا اصلاح و ترمیم کی جاتی یا مزید اصول کا استخراج کیا جاتا بلکہ بر خلاف ازیں اگلوں کو معصوم اور ہمہ دان مان کر محض ان کے کلام کی توجیہہ و تاویل پر اکتفا کیا گیا اور اس میں بھی تلخیص اور تشریح و حواشی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

## ہندوستان کے اسلامی عربی مدارس

بالکل جدید دور کی پیداوار بعض خاص مدارس کو چھوڑ کر ہمارے موجودہ عربی مدارس کا ڈھانچہ مذکورہ بالا علمی ماحول میں تیار ہوا اور اس فکری نہج پر نصاب تعلیم کو مرتب کیا گیا۔ اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے ڈھنگ نے اس کی کو پورا کر دیا جو اس نصاب کے تحت تکمیل

کرنے کے بعد ممکن تھا کہ رہ جاتی اور ان کو اس طرزِ تفکر سے نجات دلا سکتی جس کی پرورش یہ نصاب کرتا ہے۔ قبل ازیں کہ میں نصابِ تعلیم کا خاکہ پیش کروں مسلمانوں کے علوم کے دو ممتاز علمی دوروں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مروجہ درس کو کس قسم کی ذہنی تربیت کرنا چاہیے۔

## مسلمانوں کے علوم کے دو عہد

مسلمانوں کی علمی تاریخ پر جس شخص کی نظر ہے وہ جانتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی فتوحات کا دور اور ان کی مجتہدانہ قوتِ تصنیف کا عہد ساتویں اور زیادہ سے زیادہ آٹھویں صدی پر ختم ہو جاتا ہے۔ چناں چہ مسلمانوں کے تقریباً تمام علمی اکتشافات' خواہ فلکیات سے متعلق ہوں یا عنصریات سے 'طبعیات سے تعلق رکھتے ہوں خواہ کیمیا سے' ہندسی ہوں یا حسابی' جغرافیائی ہوں یا تخطیط الارض سے متعلق، ہیں اسی طرح تمام علوم استخراجیہ کا استخراج اور ان کی تدوین بھی' ان صدیوں کے اندر ہی اندر ختم ہو گئی۔ ان صدیوں کے بعد الا ماشاء اللہ صرف نقل و شرح' تلخیص و تحشیہ باقی رہ گیا۔

اس عہد کی تصانیف میں واضح طور پر فنی اپج اور تحقیقی اور انتقادی ذہنیت کا رنگ پہلی نظر میں ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جزیات سے کلیات کو استنباط کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ ہر فن پر اس فن کی حیثیت میں غور ہے۔ یہ نہیں کہ ایک فن کے مسائل کی ترجیح میں دوسرے فن کے اصول و ضوابط کو دخل دیا جائے۔ دلائل میں فرضی کلیات سے زیادہ استقراء کو اہمیت ہے' صحیح انتقاد و تحقیق میں اکابر پرستی اور ائمہ کی پیروی حائل نہیں۔

برخلاف ازیں متاخرین اگرچہ تہذیب اور تنقیح کے اعتبار سے متقدمین پر فائق ہیں لیکن ان میں فنی اپج کے بجائے جمود اور تقلید ہے۔ اکابر پرستی اور اجتہادی قوت کی کمی کے باعث ان کے ہاں صرف متقدمین کے کلام کی توجیہیں اور تاویلیں ہیں۔ تحقیق و تنقید اول تو ہے نہیں اور اگر ہے تو وہ فنی وجوہ اور استقرائی دلائل پر مبنی نہیں۔ ہر فن غیر فنی مباحث سے بھرا ہوا ہے۔ اعتراضات ہیں جوابات ہیں۔ لیکن ان کا تعلق اس فن سے یا اس فن کی اصولی حیثیت سے بالکل نہیں۔ مثلاً نحو و صرف یا بلاغت کے مسائل جن کی حیثیت خالص لسانی ہے اور اہل زبان سے سماع پر مبنی ہے اس پر محض عقلی اور تجریدی حیثیت میں نظر کرنا متاخرین کی خصوصیت ہے۔ لفظی کج بحثیاں' بے معنی نکتہ آفرینیاں' تخصیص اور تخلیص اس طرح کہ

کتاب ایک معمہ اور چیستان ہو جائے۔ عملاً متقدین پر ستی اور وہ بھی جانب دارانہ' ان تصانیف کا عام اندازہ ہے شرح اور حواشی ایسی توجیہوں اور تاویلوں سے پر ہیں جو مصنفین متون کے ذہن میں بھی کبھی نہ گزرے ہوں اور نہ ان کی طرف کسی پڑھنے والے کا ذہن منتقل ہو سکے۔ چناں چہ یہ حقیقت ہے کہ بجز ابتدائی رسالوں کے متاخرین کی کتابوں سے ممکن ہے کہ سب کچھ آجائے لیکن وہ جن جس میں وہ لکھی گئی ہیں کسی طرح نہیں آسکتا۔ اجتہادی قوت تو پیدا ہونا بڑی چیز ہے۔

## موجودہ اسلامی مدارس عربیہ کا نصاب تعلیم

ان دونوں عہدوں کی خصوصیات سامنے رکھنے کے بعد میں موجودہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی ایک سرسری فہرست پیش کرتا ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس فہرست کی تمام کتابیں ہر عربی مدرسہ میں زیر درس ہوں بلکہ بعض مدارس میں یہ کل زیر درس ہیں اور کہیں ان میں کا زیادہ حصہ۔ بعض مدارس میں کچھ جزوی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ یہی نصاب رائج ہے۔ بہر حال اس فہرست کو پیش کرنے سے مقصود ایک ایسا خاکہ مہیا کر دینا ہے جس سے ہمارے مدارس کا نصاب کے سلسلے میں ایک عام میلان معلوم ہو جائے گا۔

بالکل ابتدائی صرف و نحو وغیرہ کی تعلیم کے موجودہ مدارس میں مروجہ نصاب یہ ہے۔

### صرف و نحو۔

المفصل (جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری المتوفی ۵۳۸ھ)

الکافیہ (جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف بابن الحاجب المتوفی ۶۴۶ھ) مع الشرح

الفوائد الضیائیہ (نور الدین عبد الرحمٰن بن احمد الجامی المتوفی ۸۹۸ھ)

الخلاصہ' المعروف بالالفیہ (جمال الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الطائی المعروف بابن مالک المتوفی ۶۷۲ھ)

الشافیہ (ابن الحاجب)

### بلاغت۔

تلخیص المفتاح (۱) (شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن القزوینی الخطیب المتوفی ۷۳۹ھ)

---

(۱) تلخیص المفتاح "سراج الدین ابو یعقوب یوسف بن محمد السکاکی المتوفی ۶۰۲ھ کی کتاب "مفتاح العلوم" کی قسم ثالث کی تلخیص ہے۔

مع الشروح المختصر والمطول (سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی متوفی ۷۹۲ھ)

## تفسیر۔

تفسیر الجلالین (جلال الدین محمد بن احمد المحلی المتوفی ۸۶۴ھ و جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ)

مدارک التنزیل (حافظ الدین ابو البرکات عبداللہ بن احمد النسفی المتوفی ۷۱۰ھ)

انوار التنزیل (القاضی ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر البیضاوی المتوفی ۶۶۵ھ)

## اصول حدیث۔

الفکر مع الشرح نزہۃ النظر (شہاب الدین احمد بن ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ)

## حدیث۔

الموطا (الامام مالک بن انس الحمیری المتوفی ۱۷۹ھ)

الجامع الصحیح (الحافظ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری المتوفی ۲۵۶ھ)

الجامع الصحیح (الحافظ ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری المتوفی ۲۶۱ھ)

سنن ابن ماجہ (ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی المتوفی ۲۷۳ھ)

سنن ابن داؤد (ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ)

الجامع الصحیح (الحافظ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی المتوفی ۲۷۹ھ)

السنن الصغریٰ (الحافظ ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب النسائی المتوفی ۳۰۳ھ)

شرح معانی الآثار (ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی المتوفی ۳۲۱ھ)

مشکوٰۃ المصابیح (۱) (ولی الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب الترمذی۔

## عقائد النسفی۔

(نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد المتوفی ۵۳۷ھ) مع شرح (التفتازانی)

## عقائد و کلام۔

المواقف (القاضی عضد الدین عبد الرحمٰن بن احمد الایجی المتوفی ۷۵۶ھ مع شرح (السید

(۱) مشکوٰۃ المصابیح، محی السنہ ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی ۵۱۶ھ کی کتاب "مصابیح السنہ" کی تکمیل ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح کا سن تصنیف ۷۳۷ھ ہے۔

الشریف علی بن محمد الجرجانی المتوفی ۸۱۶ھ 'الحاشیہ الزاہدیہ (میرزا محمد زاہد بن محمد اسلم الہروی المتوفی ۱۱۰۱ھ)

### اصولِ فقہ۔

الحسامی (حسام الدین محمد بن محمد الاخیسکثی المتوفی ۶۴۴ھ)

منار الانوار (ابو البرکات النسفی) مع الشرح نور الانوار (الشیخ احمد بن ابی سعید المعروف بملا جیون الامیٹھوی المتوفی ۱۱۳۰ھ)

التنقیح مع الشرح التوضیح

صدر الشریعۃ الاسفر عبید اللہ بن مسعود المحبوبی المتوفی ۷۴۵ھ)

مع الحاشیہ التلویح (التفتازانی)

کتاب الخمسین فی اصول الحنفیہ المعروف باصول الشاشی (نظام الدین الشاشی)(۱)

مسلم الثبوت (القاضی محب اللہ بن عبد الشکور البہاری المتوفی ۱۱۹۰ھ)

### اصولِ جدل۔

الشریفیہ (السید الشریف) مع الشرح الرشیدیہ (شمس الحق عبد الرشید و خلاف ابن الشیخ مصطفیٰ الجونفوری المتوفی ۱۰۸۳ھ

### فقہ و فرائض۔

مختصر القدوری (ابو الحسین احمد بن محمد القدوری المتوفی ۴۲۸ھ

البدایہ مع الشرح الہدایہ

(ابو الحسن علی بن ابی بکر الفوغانی المرغینانی المتوفی ۵۹۳ھ)

کنز الدقائق (ابو البرکات النسفی)

الوقایہ (تاج الشریعہ محمود بن صدر الشریعہ احمد المحبوبی المتوفی ۶۷۳ھ)

مع الشرح (صدر الشریعۃ الاصغر)

---

(۱) مکتبہ خدیویہ کی فہرست جلد ثانی میں اور ہندوستان کے ایک قدیم مطبوعہ نسخے میں جس کا سن طبع غالباً ۱۲۸۹ھ ہے مصنف کا نام اسحاق بن ابراہیم الشاشی السمرقندی المتوفی ۳۲۸ھ بیان کیا گیا ہے لیکن اس کی سند مجھے نہ مل سکی۔

منیۃ المصلی (سدید الدین الکاشغری، من القرن السابع)
تنویر الابصار (شمس الدین محمد بن عبد اللہ الغزی المتوفی ۱۰۰۴ھ)
مع الشرح الدر المختار (علاؤ الدین محمد بن علی الحصکفی المتوفی ۱۰۸۸ھ
نور الایضاح مع الشرح مراقی الفلاح (ابو الاخلاص حسن بن عماد دالوفائی الشرنبلالی المتوفی ۱۰۶۹ھ)
فرائض السجاوندی المعروف بالسراجی (سراج الدین محمد بن محمد السجاوندی من القرن السابع)

## نثر عربی۔

مقامات البدیع (بدیع الزماں احمد بن الحسین الھمدانی المتوفی ۳۹۸ھ)
مقامات الحریری (ابو محمد قاسم بن علی الحریری المتوفی ۵۱۶ھ)
نفحۃ الیمن (الشیخ احمد بن محمد الشروانی الیمن من القرن الثالث عشر)

## عربی نظم۔

المعلقات السبع (۱) (حماد ابن سابور الراویہ المتوفی ۱۵۵ھ)
الحماسہ (ابو تمام حبیب بن اوس الطائی المتوفی ۲۳۱ھ)
دیوان المتنبی (ابو الطیب احمد بن حسین الجعفی الکندی المقتول ۳۵۶ھ)

## منطق۔

الشمسیہ (نجم الدین عمر بن علی القزوینی الکاتبی المتوفی ۴۹۳ھ) مع الشرح (قطب الدین بن محمد الرازی المتوفی ۷۶۶ھ) وحاشیہ (السید الشریف) رسالۃ التصور والتصدیق المعروف بالقطبیہ (قطب الدین الرازی) مع الشرح (میر زاہد)
التہذیب (التفتازانی) مع الشرح الملا جلال (جلال الدین محمد بن اسعد الدوانی المتوفی ۹۰۷ھ) وحاشیہ (میر زاہد) والشرح الیزدی (نجم لدین عبد اللہ بن حسین الیزدی ۹۱۱ھ اور ۱۰۱۵ھ
سلم العلوم (محب اللہ البہاری) مع الشرح (حمد اللہ بن شکر اللہ الصدیقی السندیلوی المتوفی ۱۱۶۱ھ شرح الملا محمد حسن بن القاضی غلام مصطفی المتوفی ۱۱۹۹ھ ہدایۃ الحکمۃ (اثیر

(۱) مشہور جاہلی شعرا امراء القیس طرفہ بن العبد زہیر بن ابی سلمٰی لبید بن ربیعہ، عنترہ بن شداد حارث بن حلزہ الیشکری اور عمرو بن کلثوم کے سات قصیدوں پر یہ مجموعہ مشتمل ہے۔

الدین مفضل بن عمر الابہری المتوفی حدود ۶۶۰ھ)
مع الشرح القاضی کمال الدین حسین بن معین الدین المیبذی المتوفی ۹۱۰ھ اونی حدود ۹۰۴ھ
وشرح (صدر الدین محمد بن ابراہیم الشیرازی المتوفی ۱۰۸۰ھ) وشرح الخیر آبادی (شمس العلماء عبدالحق بن فضل حق الخیر آبادی المتوفی ۱۳۱۶ھ)۔
الحکمۃ البالغہ مع شرح الشمس البازغہ (الملا محمود بن محمد الفاروقی المتوفی ۱۰۶۲ھ)
الہدیۃ السعیدیہ (فضل الحق بن فضل امام الخیر آبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ)

**ہیئت۔**

الملخص فی الہیئۃ (محمود بن محمد الچغمینی الخوارزمی، من القرن السابع)
مع شرح قاضی زادہ صلاح الدین موسیٰ بن محمود الرومی المتوفی ۸۴۰ھ تقریباً)
تشریح الافلاک (بہاؤ الدین محمد بن الحسین الاملی المتوفی ۱۰۳۰ھ) مع البشرح التصریح (امام الدین بن لطف اللہ المہندی بن احمد المعمار الاہوری الدہلوی المتوفی ۱۱۴۵ھ)

**حساب۔**

خلاصۃ فی الحساب (بہاؤ الدین محمد الاملی)

**ہندسہ۔**

تحریر اقلیدس (نصیر الدین محمد بن محمد الطوسی المتوفی ۶۷۲ھ)

مذکورہ بالا نصاب میں جیسا کہ گزر چکا ہے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے پرانے قسم کے موجودہ مراسم کی کل درسی کتابوں کا احصاء ہو جائے۔ عموماً مدارس عربیہ میں اب الفیہ اور مفصل نہیں پڑھائی جاتیں۔ نحو کی آخری کتاب شروح جامی ہے۔ شافیہ بھی عام طور پر زیر درس نہیں ہے۔ تفسیر میں صرف "جلالین" اور کہیں "مدارک" اور جلالین دو کی تعلیم کافی سمجھی جاتی ہے۔ بیضاوی کی "انوار التنزیل" کم مدارس میں رائج ہے۔ حدیث میں مشکوٰۃ اور آخر میں "صحاح ستہ" کا دور عام ہے جس پر یہ نصاب ختم ہو جاتا ہے۔ عقائد و کلام میں صرف "شرحِ عقائد" مروج ہے اور اصولِ فقہ میں "نور الانوار" اصول شاشی "اور کہیں کہیں "توضیح" اور "تلویح" بھی زیر درس ہیں۔ فقہ میں "الدار المختار" اور "مراقی الفلاح" کا رواج

بھی کم ہے۔ عربی نثر میں عموماً مقامات حریری اور "نفحۃ الیمن" کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ منطق میں عبداللہ یزدی کی شرح تہذیب، قطبی، زیادہ سے زیادہ سلم العلوم اور "ملا حسن" کا رواج ہے۔ حکمت میں "ہدیہ سعیدیہ" اور ہدایۃ الحکمۃ" یا "میبذی" مروج ہے۔ ہیئت' حساب اور ہندسہ اب قریب قریب نصاب سے خارج ہو چکے ہیں۔ تاریخ خواہ وہ اقوام و ممالک سے متعلق ہو خواہ علوم و فنون سے' نصاب کا لازمی جزو نہیں۔ بعض بعض مدارس میں عرب کی جاہلی تاریخ یا اسلام کی قرونِ اولیٰ کی تاریخ سے متعلق دو ایک مختصر کتابیں ادنیٰ طور پر پڑھا دی جاتی ہیں۔ سرکاری نگرانی میں جامعی یا تعلیمی مجالس کے تحت جو نصاب بنایا گیا ہے وہ عربی نثر و نظم اور تاریخ کے مفید اضافے کے ساتھ تقریباً انہیں کتابوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس نصاب کے تحت تعلیم حاصل کرنے کا مقصد طلباء کے نزدیک محض مقررہ امتحانات پاس کر لینا ہوتا ہے' نہ کہ علم یا ذہنی تربیت حاصل کرنا۔ گویا عملاً نصاب اپنا حقیقی مقصد کھو چکا ہے۔

جہاں تک تعلیم و تدریس کا سوال ہے' غالباً یہ نصاب کافی سمجھا جاتا ہے لیکن مطالعہ کے لئے یہ کتابیں اساتذہ اور طلباء دونوں کے نزدیک کافی نہیں۔ اساتذہ اور طلباء دونوں کے مطالعے میں' ورنہ کم از کم اساتذہ کے مطالعہ میں عموماً ان کتابوں کے حواشی رہتے ہیں۔ چناں چہ تقریباً ہر ہر کتاب کے لئے اس کے متعدد حواشی کا سامنے رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ حواشی کل کے کل متاخرین کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ ان حواشی کی تصنیف کا مقصد بالعموم نہ کتاب کا حل ہوتا ہے اور نہ فن کا احصاء بلکہ محض اپنی ذہانت طبع اور دقتِ نظر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ چناں چہ عام حالات میں حواشی کا سمجھنا اصل کتاب کے سمجھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ غالباً خود اصل فن سے حاشیہ کو بس اتنا تعلق ہوتا ہے کہ وہ اس فن کی ہی ایک کتاب کا حاشیہ ہے۔ مدارس میں عام طور داخلِ نصاب کتاب پوری نہیں پڑھائی جاتی۔ بالکل ابتدائی کتابوں کو چھوڑ کر غالباً کوئی کتاب نہ صرف یہ کہ پوری نہیں ہوتی بلکہ نصف اور بعض کتابیں ربع بھی نہیں ہوتیں۔ بعض بعض کتابوں کی مقدار درس اصل کتاب کا تقریباً دسواں اور بارھواں حصہ ہے۔ بعض کتابوں کی مقدار درس اتنی عام ہو گئی ہے کہ ہندوستانی مطابع نے بھی کل کتاب کو طبع کرنے کی زحمت گوارا کرنا چھوڑ دی ہے۔ چناں چہ تفسیر بیضاوی' و مطول' یا نفحۃ الیمن کے کامل نسخوں کا بازار سے حاصل کرنا اب مشکل ہو گیا ہے۔ بعض درسی کتابیں تو ہندوستان میں کبھی کامل طبع ہی نہیں ہوئیں اور ان کے غیر درسی حصے ابھی مخطوطات کی شکل

میں ہیں۔ جو کمیاب بلکہ نایاب ہوتے جارہے ہیں۔

## بعض درسی فنون کا سرسری خاکہ

مذکورہ بالا نصاب پر ایک عام فیصلہ کن نظر ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جن فنون پر نصاب بالا مشتمل ہے ان میں سے بعض کی عصری خصوصیات کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دیا جائے۔ اس طرح نصاب بالا کی صحیح افادیت اور اس کی حقیقی اہمیت کا اجمالی اندازہ ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا یہ کتابیں اور یا اس نوعیت کی دوسری کتابیں طلباء کی کسی قسم کی ذہنی تربیت کر سکتی ہیں۔

عربوں کو اپنی زبان کے فطری ملکہ کی وجہ سے نحوی قواعد کی ضرورت نہ تھی۔ عجمی اختلاط نے لسانی قواعد کے استخراج اور ان کی تدوین کو ناگزیر بنا دیا۔ جن قبائل کی زبان عرب میں زیادہ معروف اور متداول تھی اور نسبتاً ایک عمومی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کی بولیوں سے عربی قواعد کا استخراج کیا گیا۔ قواعد کے استخراج کے سلسلے میں دو مدارس خیالِ وجود میں آگئے۔ ایک بصرہ دوسرا کوفہ۔ بصرے کو اہلِ رائے و قیاس سے زیادہ خصوصیت تھی اور کوفے کو نقل و روایت سے۔ چناں چہ یہی فرق دونوں مقامات کے نحویوں کے نقطۂ نظر میں پیدا ہو گیا اور اس نے دو مختلف مرکز خیال پیدا کر دیئے۔ اہلِ بصرہ قیاس و مماثلت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اہلِ کوفہ سماع کو۔ ان دونوں مدرسوں کے اختلافات کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ مختلف فیہ مسئلے میں عموماً بصری علماء کسی مخصوص جزوی سماع کو اہمیت نہیں دیتے اور حتی الامکان اس کی توجیہہ و تاویل کر کے ایک کثیر الوقوع صورت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں یہ ممکن نہیں ہوتا شاذ کہہ کر ترک کر دیتے ہیں۔ مگر کوفی علماء اس جزئی مثال کو بھی اصولی اہمیت دینے سے نہیں جھجکتے۔

جب استخراج اور استنباط کا دور ختم ہو گیا تو نحو کی خالص مدرسی حیثیت میں تدوین شروع ہو گئی۔ اس کے بعد تہذیب کا دور آیا اور آخر میں آٹھویں نویں صدی سے نحو نام ہو گیا۔ ان استخراجی اصول کی محض عقلی بنیادوں پر توجیہہ کرنے کی کوشش کلیتہً عقلی توجیہیں ابتدا تو محض نکات بعد الوقوع کی حیثیت رکھتی تھیں اور کسی نہ کسی حد تک لگتی ہوئی سی تھیں۔ مگر آگے چل کر انتہائی مضحکہ خیز ہو گئیں اور خود فنی حیثیت اختیار کرنے لگیں اور نحو کی مہارت

انہیں مضحکہ خیز موشگافیوں کے جاننے کا نام ہو گیا۔ جن کو نہ فن سے تعلق تھا اور نہ اس کی غرض اور غایت سے۔

## بلاغت

کلمات کی صوتی خصوصیات' ان کے لغوی معانی اور ان کے استعمال کی نوعیت' مقام کے اعتبار سے ان کی قیمت کا جاننا' جملوں کے اصناف اور ان کا باہمی ربط اور مقام کے اعتبار سے ربط کو پہچاننا' مختلف مواقع کے اعتبار سے اسالیب کلام اور طرز ادا کی خصوصیت اور ان اثرات کا علم جن کو وہ پیدا کرتے ہیں۔ فن بلاغت کا موضوع بحث ہے۔ کلام کو بلیغ بنانے کے لئے سامع اور متکلم کی نفسی کیفیات ماحول کی خصوصیت' کلمات کلام اور طرز ادا کے تاثرات ان سب کو جاننا اور ان کے تحت کلام کو ترتیب دینا ناگزیر ہے۔ اہلِ زبان میں کسی کلام کے بلیغ ہونے کو اور اس حیثیت سے اس کی قدرو قیمت کو سمجھنے کا مادہ عموماً فطری ہوتا ہے اور بلغاء کے کلام اور ان کے اسالیب پر نظر رکھنے سے خود بھی بلیغ کلام پر قدرت ہو جاتی ہے۔ ابتدائی عہد میں فن بلاغت کی تحصیل کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا بلغاء کے کلام اور ان پر ادیبوں کے تنقیدی اور تقریظی اشارات جمع کر دیے جاتے تھے اور اس سلسلے میں مؤلف بھی جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ دیا کرتا تھا۔ اس دور کے بعد دوسرا دور آیا جس میں کچھ عام اصول جمع کئے گئے لیکن بلاغت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت خود بلغاء کے کلام کو ہی رہی۔ تقریباً چھٹی' ساتویں صدی سے حالت بدلنا شروع ہوئی اور بجائے بلغاء کے کلام کے ان مستخرجہ اصول نے اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی۔ بلغاء کے اسالیب اور جملوں نے شواہد اور امثلہ کی حیثیت اختیار کر لی اور یہیں سے اس فن میں بھی جمود پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ طویل کلام خواہ وہ نثر ہو یا نظم اس کی اسالیب پر توجہ کرنا گویا متروک ہو گیا۔ آخر میں صرف یہ اصول رہ گئے اور ان میں عقلی موشگافیاں شروع ہو گئیں۔ اس طرح یہ فن بھی اپنی حقیقی غرض و غایت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بلاغت محض جامد اصول کی تلخیص اور تشریح اور دور از کار بحثوں کا نام ہو گیا۔

## تفسیر

قرآن مجید عرب میں اور عربی زبان میں نازل ہوا۔ صحابہ کرامؓ کے سامنے نازل ہوا۔ اس

لئے وہ قرآنی زبان سے اور ان واقعات اور حوادث سے اچھی طرح واقف تھے جن کے سلسلے میں اس کی آیتیں نازل ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں پورا قرآنی ماحول بھی ان کے سامنے تھا۔ ان وجوہ سے قرآنی معنی سمجھنے میں انہیں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ اس وقت تفسیر کے معنی صرف ان واقعات اور حوادث کا بیان کر دینا تھا جن سے کسی آیت کو تعلق تھا یا اس ماحول کے مطابق کسی لفظ' فقرے یا جملے اور عبارت کا مفہوم بتانا یا کسی جزوی مثال کے ذریعہ سے اسے واضح کر دینا یا ناسخ و منسوخ کی تصریح کرنا۔ حلقہ اسلام کی وسعت کے ساتھ تفسیر میں مشکل الفاظ کی لغوی تشریح بھی داخل ہو گئی تھی۔ چناں چہ قرآنِ اول و دوم کی تفسیروں کی یہی شان ہے۔ ابتدائی تفاسیر میں ان ہی مختلف روایتوں کو جو صحابہ تک یا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتی ہیں جمع کر دیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے صحت کا التزام کیا ہے اور بعض نے ہر رطب دیا بس کو آئندہ انتخاب کرنے والوں کے لئے جمع کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے اسرائیلی واقعات اور تلمیحیں ہیں۔ عرب رفع استعجاب کے تحت ان کے متعلق اور ان کے ماسواء ابتداء خلق وغیرہ کے متعلق ان اہلِ کتاب کی طرف جو اسلام قبول کر چکے تھے' رجوع کرتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی معلومات کے بقدر جو محدود اور بڑی حد تک عامیانہ اور غیر مستند ہوتی تھیں۔ ان واقعات اور تلمیحوں کو یا دوسرے مستفسرہ واقعات کو بیان کر دیتے تھے۔ اس طرح بہت سی وہ اسرائیلی روایتیں جن کے ذکر سے بائبل کا عہد قدیم اور عہد جدید اور تالمود بھی خالی ہے۔ قرآنی تفاسیر میں آ گئیں۔ اس طرح وہ واقعات بھی جو اگرچہ مروجہ بائبل میں موجود تھے مگر قرآن مجید نے ان کی تصدیق نہیں کی تھی مسلمانوں میں آ گئے۔

دوسرے دور کے مصنفین نے اپنے مذاقِ طبع کی بناء پر قدیم تفاسیر یا قدیم تفسیری روایتوں سے جو چیزیں بلا پرکھے ہوئے انتخاب کر لیں تھیں مابعد کے مفسرین ان کو اسی طرح چھاپتے رہے۔ عقلی دور کے شروع ہونے کے بعد مختلف عقلی مفادوں کی حمایت کی بناء پر تفاسیر بھی فلسفیانہ تخیلات کی آماج گاہ بن گئیں۔ چناں چہ آج قرآن مجید کو یونانی اوہام سے جدا کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اسلام میں غیر عربی عنصر کے داخلے کے بعد تفسیریں لسانیاتی نقطہ نظر سے بھی لکھنا شروع ہو گئیں۔ ان تفسیروں میں الفاظ کی نحوی' صرفی اور لغوی حیثیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

## عقائد و کلام

عربی ذہن اپنی بداوت اور سادگی کی بناء پر خدا اور اس کی تنزیہی و تشبیہی صفات کو باریک بینی اور توجیہہ و تاویل کے بغیر اسی طرح تسلیم کرتا تھا جس طرح وہ ثابت تھیں۔ اس سلسلے میں ہر دقیقہ سنجی اور غور و خوض بدعت خیال کیا جاتا تھا۔ یہی حالت کائنات کی ان توجیہوں کے سلسلے میں تھی جو نبی علیہ السلام سے مروی تھیں یا قرآن مجید میں مذکور تھیں۔

جب مختلف قومیں اور مختلف طبقے اسلام سے وابستہ ہوئے اور دوسری طرف غالباً اول یونانی علوم و فنون اور پھر ایرانی و ہندی خیالات مسلمانوں میں جاگزیں ہونا شروع ہوئے تو اسلامی معتقدات کے متعلق اس سادہ اور بدویانہ نقطۂ نظر میں جو عجمی قوموں کا خاصہ ہے تبدیلی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ یہیں سے علم کلام کی ابتداء ہوئی اور اعتقادیات کے متعلق خالص محدثانہ طرز کی مقبولیت میں فرق آنا شروع ہو گیا۔ سوالات پیدا ہونا شروع ہو گئے جن چیزوں کو بلا تشریح تسلیم کیا جاتا تھا ان کی تشریح کرنا پڑی' اس طرح عقائد میں بہت سی تشریحات نفیاً یا اثباتاً داخل ہوئیں۔ علوم عقلیہ کی وسعت کے ساتھ عقائد کا باب بھی وسیع ہوتا گیا۔ عقائد کی عقلی توجیہوں کی وجہ سے کلامی مباحث میں فلسفیانہ قسم کی الٰہیات شامل ہو گئی اور کلام ایک تجریدی اسلامی فلسفہ بن گیا اور مختلف مدارس پیدا ہو گئے۔ ان مدارس کے متقسین نے علم کلام میں بھی خالص مدرسیت کی بنیاد ڈال دی۔ لیکن اس کے باوجود ایک جماعت ایسی بھی باقی رہ گئی جو عقائد کے باب میں سلف کی بالکل اس حیثیت میں متبع رہی اور ہر قسم کی موشگافیوں اور فلسفیانہ توجیہوں اور تفریعوں کو اثباتاً یا نفیاً تسلیم کرنے سے انکار کرتی رہی مگر اس عقلی شور و شغب میں اس کی اہمیت برابر کم ہوتی رہی۔ آخر چوتھی پانچویں صدی میں جب کلام خالص مدرسی حیثیت میں مستحکم ہو گیا اور لوگوں نے کسی نہ کسی مدرسۂ خیال سے وابستہ رہنے کو ضروری سمجھ لیا تو اس کی رہی سہی جماعتی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔

## اصولِ فقہ

اصولِ فقہ سے ایسے اصول مراد ہیں جن کی بناء پر دلائل شرعیہ' قرآن و حدیث اور یا قرآن و حدیث اور اجماع سے مسائل کا استنباط کیا جاتا ہے۔ مختصر لفظوں میں اصولِ فقہ، اصولِ اجتہاد کا دوسرا نام ہے چناں چہ جس کسی نے بھی سب سے پہلے کسی مسئلہ کا استنباط کیا

ہو گا اس کے لئے اس کے ذہن میں غیر شعوری طور پر ہی کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی اصول ہو گا۔ لیکن جب ضروریات بڑھے ،اصول شرعیہ اپنی مختلف اور متضاد صورتوں میں سامنے آئے اور ترجیح و تعارض اور مختلف محتملاتِ استنباط کی طرف مجتہدین کی نظریں پڑیں اور مختلف مدارسِ اجتہاد نے اس سلسلہ میں مختلف نقاطِ نظر پیش کئے۔ مجتہدین یا ان کے نائبین نے اپنے اپنے اصول مدون کئے اس طرح ہر دائرے کے اصول دوسرے دائرے کے اصول سے کلیتہً متضاد ہوں۔ ہاں بہت سے اصول میں باہم دیگر خاصا اختلاف ہے۔ ایسی صورت میں اصولِ فقہ ایک ایسا فن ہے جس میں ابتداء سے ہی ایک قسم مدرسیت آگئی۔ مجتہدین کے استخراجی اصول متبعین کے لئے اصولِ موضوعہ بن گئے۔

## فقہ

صحابہ بلکہ تابعین تک فقہ میں مدرسی رنگ نہیں آیا تھا۔ رواۃ احادیث عام ازیں کہ صاحبِ اجتہاد ہوں یا نہ ہوں۔ ایسے مسائل میں جن کے متعلق ان کے مرویات میں صحیح احادیث موجود ہوتیں، احادیث کی سند پر فتویٰ دیتے تھے۔ جن مسائل کے متعلق ان کی مروی احادیث نہ ہوتیں تو اپنے سے زیادہ احادیث جاننے والوں کی طرف رہنمائی کر دی جاتی اور اگر کسی مسئلے کے متعلق مستند احادیث معلوم نہ ہوتیں تو مجتہدین منصوص مسائل پر قیاس کر کے فتویٰ دے دیتے۔ سائلین کے نزدیک کسی مخصوص صحابی کی اس معنی میں کوئی اہمیت نہ تھی کہ وہ تمام پیش آمدہ قضیوں میں اس کی طرف رجوع کریں یا اگر کبھی ابتداءً کسی مسئلے میں کسی خاص صحابی کی طرف رجوع کیا ہے تو آئندہ ہر ضرورت میں اس کی طرف رجوع کیا جائے بلکہ اتفاق و سہولت کے تحت ہر اہل کی طرف رجوع کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا۔ تابعین کے آخر عہد سے مختلف مدارس اجتہاد قائم ہونا شروع ہو گئے جن میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ تیسری، چوتھی صدی میں فقہ پر جب پوری طرح مدرسیت چھا گئی اور مختلف مجتہدین کے اصول و فروع منضبط ہو گئے تو لوگ کسی نہ کسی مجتہد سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے لگے۔ تقریباً چھٹی صدی میں عام طور پر مجتہدین اربع امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کے مدارسِ اجتہاد تسلیم کر لئے گئے۔

فقہ میں مدرسیت آنے کے بعد فقہی تصانیف میں مدرسیت ناگزیر تھی۔ چناں چہ بالکل

ابتدائی تصانیف کو چھوڑ کر عموماً فقہی کتابیں کسی نہ کسی خاص فقہی مدرسے سے متعلق ہو گئیں اور رفتہ رفتہ فقہی کتابوں میں سے اجتہادی نقطۂ نظر بالکل فنا ہو گیا۔ جب تک مختلف فقہی مدارس کی ابتدائی تصانیف نہ ہوں اس وقت تک پڑھنے والوں میں اجتہادی تخیل پرورش نہیں پاسکتا۔

## منطق و فلسفہ

مسلمانوں میں منطق و فلسفہ کا داخلہ اموی دور سے شروع ہوا اور عباسی دور میں اس کی تکمیل ہوئی۔ شام کے عیسائی صائبی اطباء اور متکلمین ان کے داخلے کا ذریعہ تھے۔ یہ لوگ بالعموم فلسفی نہ تھے اس لیے ان کے ترجموں میں فلسفیانہ حیثیت سے صحت بہت ہی مستبعد ہے۔ اکثر خود ان کا ماخذ بھی ترجمے تھے یا یونانی فلاسفہ کے خیالات لیکن مخلوط۔ مزید برآں بعض کتابیں غلط مصنفین کی طرف منسوب ہوئیں یہ ذخیرہ تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور اس پر انہوں نے اپنی عمارتیں کھڑی کر دیں جو ارسطو اور افلاطون کے سر منڈھ گئیں۔ بہر حال ابتداء میں یہ فلسفیانہ خیالات ایک حقیقی اور معنوی حیثیت رکھتے تھے مگر ساتویں، آٹھویں صدی سے ان کی معنوی حیثیت بھی ختم ہونے لگی اور لفظی مباحث نے ان کی جگہ لینا شروع کر دی۔ ابتدائی مسلم فلسفیوں کے خیالات کو یونانی فلسفیوں کے خیالات کی تشریح کے طور پر بے چون وچرا تسلیم کیا جانے لگا اور لفظی دقیقہ نجیوں کا برابر اضافہ ہوتا رہا۔

## مذکورہ نصاب پر سرسری نظر

حدیث اور ادب کو چھوڑ کر پورے گزشتہ نصاب پر ایک مرتبہ نظر ڈالی جائے۔ ان کتابوں کے بڑے حصے کا عہدِ تصنیف آٹھویں صدی سے چودھویں صدی تک ہے۔ جو حصہ ساتویں صدی کی تصنیف ہے اس میں اکثر کتابیں عام طور پر نہیں پڑھائی جاتیں جو پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کی اہمیت ذاتی نہیں ہے بلکہ شرحوں کی بناء پر ہے جو بعد کی صدیوں سے متعلق ہیں۔ تین کتابیں چھٹی صدی کی ہیں ان میں سے مفصل، غیر درسی ہوتی جارہی ہے۔ عقائد نسفی، شروع کی وجہ سے اہم ہے۔ پانچویں صدی کی دو کتابیں ہیں۔

اس تقسیم سے حدیث اور ادب کو میں نے قصداً خارج کر دیا ہے۔ متونِ حدیث پر مصنفین کے زمانے کا کوئی اثر نہیں۔ نظم و نثر کی کتابیں اہم ہیں مگر محض دو عربی نثر کے تقریباً ایک ہی

عہد سے متعلق ہیں۔ نظم کو بھی اس نصاب میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں لیکن چوں کہ اس نصاب کا مقصد ادبیت کی مہارت پیدا کرنا نہیں لہذا فی الحال یہ خارج از بحث ہے گو یہ حقیقت ہے کہ ادبی مہارت کے بغیر قرآن اور حدیث سے صحیح استفادہ تقریباً ناممکن ہے حالاں کہ اس نصاب کا حقیقی مقصد اس کو قرار دیا جاتا ہے۔

ابنِ خلدون کے قول کے مطابق کسی علم میں مہارت حاصل ہونے کی معنی یہ ہیں کہ اس علم کے مبادی، قواعد اور مسائل پر حاوی ہو جانے کی قدرت اور اس کے اصول سے فروع کو استنباط کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ جب تک یہ قدرت اور یہ ملکہ پیدا نہ ہو اس فن کی مہارت پیدا نہیں ہو سکتی (۱)۔ اگر مذکورہ بالا نصاب کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ نہ صرف یہ نصاب علمی مہارت پیدا کرنے سے قاصر ہے بلکہ علم کے صحیح مذاق سے آشنا بنانے کے لئے بھی ناکافی ہے۔

نحو میں ''کافیہ'' پڑھایا جاتا ہے۔ اولاً تو کافیہ تمام نحوی مسائل پر حاوی نہیں دوسرے یہ کہ اپنے اختصار کی وجہ سے اتنا مشکل ہے کہ طالب علم کے دماغ پر محض مطلب سمجھنے میں غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے۔ اکثر طلباء اس کے نہ سمجھ سکنے کو اپنی کند ذہنی کا نتیجہ خیال کرنے لگتے ہیں جو ان کی ذہنی نشوونما میں بڑی حد تک حائل ہو جاتا ہے۔ ''کافیہ'' کے بعد شرح جامی ہے۔ شروح کی تصنیف کا مقصد ہی چونکہ مسائل کا بیان کرنا نہیں ہوتا لہذا ''شرح جامی'' اس اعتبار سے تو مفید ہے ہی نہیں کہ وہ نحو کے مسائل پر حاوی ہے۔ مزید برآں وہ اس اعتبار سے بھی مفید نہیں کہ اس سے نحوی مسائل کی تحقیق اور اخذ و استنباط میں مدد ملتی ہے۔ گویا نہ تو نحو کی غرض و غایت اور اس کے علم آلی ہونے کے اعتبار سے فائدہ بخش اور نہ فنِ نحو کی اصولی اور ذاتی حیثیت کے اعتبار سے اس میں بجائے اس کے کہ مسائل نحویہ کے دلائل کو اہلِ زبان کی بول چال سے اخذ کرنے کی اہمیت پر زور دیا جائے اور ان کی صحت اور ترجیح کے لئے اہلِ زبان کے سماع کو فیصلہ کن قرار دیا جائے عقلی توجیہیں اور موشگافیاں کی گئی ہیں۔ اس سے طلباء میں فن کا صحیح مذاق پیدا ہونے کے بجائے ایک غلط اور غیر فنی مذاق پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی صورت فن بلاغت میں ہے۔ مسائل کے لئے آٹھویں صدی کی صرف ایک کتاب

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون، الفصل السادس من الکتاب الاول فی العلوم واصناف والتعلیم وطرقہ الفصل الثانی ص ۶۰۳۔

تلخیص زیرِ درس ہے مع اپنی دو شرحوں کے اور وہ بھی نا تمام، فنِ بلاغت کا جو سرسری خاکہ میں نے پیش کیا ہے اس کو اور متاخرین کے عہد کی خصوصیات کو سامنے رکھنے سے غالباً یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ کتابیں کسی حیثیت سے بھی مفید نہیں۔

اس نصاب میں جو تفسیریں شامل ہیں وہ نہایت مختصر ہیں اور ترجمے کی حد تک مفید ہیں لیکن اصل قرآن فہمی میں جو تفسیر کا مقصد ہے ان سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔ اختصار کے باوجود بھی ان میں اسرائیلیات اور یونانی اوہام مخلوط ہیں۔ صحیح روایات کا التزام نہیں۔ اکثر مقامات پر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اگر اسرائیلی روایات سے قطع نظر کر لی جائے اور یونانی تصورات علیحدہ کر دیئے جائیں تو خالص عربی اسلوب عبارت اور لسانی اصول و قواعد کے تحت ان کا کیا مفہوم ہو گا اور قرنِ اول میں کیا مفہوم سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں صحیح تدبر اور غور کرنے کی نہ مشق ہوتی ہے اور نہ ان کے حقیقی حدود متعین ہوتے ہیں۔ بر خلاف ازیں رہے سہے راستے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

عقائد و کلام میں جن کتابوں کی تعلیم ضروری ہے ان کے ذریعہ سے اسلام کے ان حقیقی اور بنیادی معتقدات و خیالات تک پہنچنا جن پر اسلام موقوف ہے بہت دشوار ہے۔ ان عقائد اور اس کی تشریحات اور عقلی توجیہوں کا ڈھانچہ وہ ہے جو اس دور کے مختلف فرقوں کی مذہبی آویزشوں اور مختلف فلسفیانہ خیالات کی ذہنی کشمکشوں کے تحت تیار ہوا ہے لہٰذا اگر وہ کبھی مفید تھا بھی تو آج نہیں رہا ہے۔ اس لئے کہ نہ وہ مذہبی فرقے موجود ہیں اور نہ ان فلسفیانہ خیالات کی کشمکش ہے۔

فقہ واصول جس حیثیت میں مجروح ہیں اور جو کتابیں موجودہ نصاب میں شامل ہیں وہ اس اعتبار سے نہایت مایوس کن ہیں کہ ان کی نوعیت محض ایک جامد اور تقلیدی فن کی ہو کر رہ گئی ہے۔ جن سے اجتہاد اور اخذ و استنباط کا ملکہ نہ پیدا ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فقہی اصول اور مسائل ایسی مسلمہ حقیقتیں ہیں جس میں مکرر غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں۔

منطق و فلسفہ وغیرہ عقلی اور تجربی فنون میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کی کیفیت گذشتہ بیان سے اجمالی طور پر معلوم ہو گئی ہو گی۔ ان میں سے فنون تو مسائل پر حاوی ہیں جن میں سے بعض اپنے انتہائی اختصار کی وجہ سے بہت دشوار اور طلبہ کے ذہنوں کے لئے بار ہو گئی ہیں۔ لیکن شروح صرف لفظی مباحث اور نکتہ آفرینیوں سے پُر ہیں۔ علاوہ ازیں ان علوم میں

اب تک جو اضافے اور جو ترمیمیں اور تنسیخیں ہو چکی ہیں، اصول بھی اور فروعی بھی، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہیئت کلیتہً بدل چکی، طبعیات بدل چکی، منطق پر تنقیدیں ہوئیں۔ اضافے ہوئے، فلسفے کے بہت سے شعبے ہو کر مستقل فنون بن گئے۔ حساب میں بہت سے نئے قاعدوں کا اضافہ ہوا اور ان کے علموں میں بہت سی نئی سہولتیں پیدا ہوئیں مگر ہمارے مدارس ان تمام جدید تبدیلیوں سے بے خبر ہیں اور ان فنون کو ان کی قدیم جامد شکل میں لئے بیٹھے ہیں۔ گویا یہ عقلی اور تجربی علوم بھی الہامی اور منصوص ہیں جن میں ہر قسم کی ترقی اور حرکت ختم ہو گئی اور تکمیل کے اس نقطے پر پہنچ گئے جس میں صرف لفظی مباحث اور عقلی نکات ہی باقی رہ گئے ہیں۔

## طرزِ تعلیم

عربی مدارس کی تمام تر تعلیم کتابی ہے۔ جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان فنون کی کتابیں ہی پڑھائی جاتی ہیں۔ داخلِ درس کتابیں ہی اصل فن ہیں۔ بالعموم اساتذہ کی اپنی معلومات بھی فنی ہونے کے بجائے مخصوص کتابوں پر ہی منحصر ہوتی ہے اور وہ خود بھی نئی معلومات فنون کی نئی ارتقائی حرکتوں سے اتنے ہی ناواقف ہوتے ہیں جتنے طلباء، ان کی فنی بصیرت اور علمی مہارت کے معنی محض زیرِ درس قدیم کتابوں اور ان کے حواشی کا علم ہے۔ طالب علم زیرِ درس کتاب کو پڑھتا ہے اور استاد اس مقام کے مطلب کی تقریر کرتا ہے۔ اس تقریب میں کتاب کی عبارت پر نظر ڈالی جاتی ہے اور نحوی، صرفی اور بعض اوقات لغوی حیثیت سے اس عبارت پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو بیان کیا جاتا ہے۔ عموماً یہ اعتراضات اس کتاب کے حواشی میں مذکور ہوتے ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ خود اپنی طرف سے اساتذہ اعتراض کریں۔ یہ اعتراضات کبھی حقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں اور کبھی بالکل لغو۔ ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے جن کی حیثیت اعتراضات ہی کی طرح کبھی حقیقی ہوتی ہے اور کبھی کمزور تاویلیں۔ عام طور پر یہ جوابات بھی حواشی سے منقول ہوتے ہیں۔ درمیان میں طلباء کو بھی یہ حق ہوتا ہے کہ استاد کی تقریر پر یا اصل کتاب پر اعتراضات کریں۔ جن کے جوابات دینا اساتذہ کا پیشہ وارانہ فریضہ ہے۔ سمجھدار طلباء اس حق کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ کتاب کی عبارت کے نکات بیان کئے جاتے ہیں اور الفاظ، فقروں اور جملوں تک کی وجہیں

بیان ہوتی ہیں گویا مصنف نے ہر ہر لفظ اور ہر ہر تعبیر بہت سوچ سمجھ کر اور عجیب و غریب فوائد کو پیشِ نظر رکھ کر اختیار کیا ہے۔ حالاں کہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بھی عام پڑھنے والے کی نظر نہیں پہنچ سکتی اور عموماً یہ سب نکات قطعاً طفلانہ ہوتے ہیں۔ اس اثناء میں اس مقام پر جو فنی اعتراضات و جوابات ہیں ان کو بیان کیا جاتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے اور جواب دیا جاتا ہے۔ یہ فنی اعتراضات اور جوابات بھی فن کی قدیم روایات اور متاخرین کی تشریحات کے تحت ہوتے ہیں۔ ورنہ ان کی حقیقی نوعیت بڑی مشتبہ ہوتی ہے۔ دوسرے مصنفین کے بیانات سے جو تعارض واقع ہوتے ہیں ان کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ جو عام طور پر ان کی باہمی تطبیق کی کوشش پر منتج ہوتی ہے۔

کتاب کی ایک ایک سطر کے متعلق اس نوعیت کی تقریر بعض اساتذہ ہفتوں بلکہ مہینوں کرسکتے ہیں جو ان کی قابلیت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ افغانستان اور سرحد کے علاقوں کے اساتذہ جو یک فنی ہونے کے بجائے عام طور پر یک کتابی ہوتے ہیں۔ وہ تو حقیقتاً مہینوں تقریر کیا کرتے ہیں۔ ورنہ ہفتوں میں تو کوئی کلام ہی نہیں لیکن ہندوستان کے اساتذہ اتنے ماہر نہیں۔ پھر بھی تاہم بعض بعض مقامات کی تقریریں دو دو، تین تین دن تک جاری رہتی ہیں۔ اس طرح کہ ہر دن چار چار، پانچ پانچ گھنٹے تقریر کی جاتی ہے۔ اب چوں کہ مہارت کم ہوتی جارہی ہے۔ اساتذہ اور طلباء دنیا بھر کے حواشی نہیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ اتنا مطالعہ ہی کر سکتے ہیں اس لئے تقریر میں بھی اختصار بڑھتا جارہا ہے۔

اساتذہ کا روشن خیال طبقہ اس طرز سے پہلے سے ہی متنفر ہے اور یہ تنفر برابر بڑھ رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ محض کتاب کو اس کی عبارت کے پڑھانے تک محدود کیا جائے۔ گو یہ طریقہ عام طلباء کے لئے باعث دل کشی نہیں اور پرانے قسم کے اساتذہ کے نزدیک بھی علمی مہارت کے خلاف ہے۔ یہ طریقہ تعلیم اپنی اصل کے اعتبار سے متاخرین کے اس طرز تشریح اور تحشیہ سے ماخوذ ہے جس کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔

یہ طریقہ تعلیم جواب کچھ بدلتا جارہا ہے اور خدا کرے جلد سے جلد بدل جائے کسی حیثیت میں بھی مفید نہیں۔ نہ طلباء میں فنی بصیرت پیدا کرتا ہے اور نہ کتاب فہمی کی استعداد۔ نہ مسائل ہی یاد رہتے ہیں اور نہ مباحث۔ مسائل مباحث میں مخلوط ہو جاتے ہیں اور مباحث اپنے تنوع اور طوالت کی بناء پر حافظہ میں محفوظ نہیں رہتے۔

# اسلامی مدارس کے نصاب کی اِصلاح

اس سے پہلے کہ اسلامی مدارس کے نصاب کی اصلاح کا اور ان میں رائج طرز تعلیم میں ترمیم کا اصولی خاکہ پیش کیا جائے یہ مناسب ہوگا کہ خود علم کے مقصد، اسلامی مدارس کی خصوصیات اور عصری مقتضیات و محرکات کے تحت ان کی حیثیت پر ایک معمولی نظر ڈالی جائے اور اصلاح کے متعلق عام بنیادی تصور کو پیش کر دیا جائے۔ ان چیزوں کے سامنے آجانے کے بعد غالباً اصلاح و ترمیم کی ضرورت اور اس کی صحیح سمت کا تعین خودبخود واضح ہو جائے گا اور ساتھ ساتھ زیر بحث مسئلے کے متعلق عام شکوک کا ازالہ ہو سکے گا۔

## علم کا مقصد

اسلام کی اساسی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کے رخ کو خدا کی طرف پھیر کر ہر چیز میں ایک اعلیٰ قسم کی روحانیت سمودی ہے۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادی ناکامیاں نہ افراد کو ناکام بنا سکتی ہیں اور نہ جامد اور قنوطی۔ برخلاف ازیں یہ پاکیزہ تخیل ان کے اعمال کو پاکیزہ بنا دیتا ہے اور ناکامی کو کامیابی کی شکل میں صورت پذیر کر کے مزید سرگرمیوں کے لئے آمادہ کر دیتا ہے۔ چونکہ مادی طور پر دنیا کا ہر شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں تصادم و تنازع لازم ہے۔ ایک کامیاب ہوگا اور دوسرا ناکام۔ اگر ہم چیزوں کو محض مادی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کر دیں تو اس سے علیحدہ ہو کر بھی کہ ناکامی کے بعد جمود اور قنوطیت پیدا ہونا ناگزیر ہے سب سے بڑی خرابی یہ ہوگی کہ ہم جارحانہ خود غرضی میں مبتلا ہو جائیں گے اور اپنے حلقے کے لئے ایک ذلیل قسم کا خطرہ بن جائیں گے۔

اسلام کی یہی ہمہ گیر اور عملی روحانیت علم کی غرض و غایت میں بھی سرایت کئے ہوئے ہے۔ علم کا مقصد اپنے دل میں خدا کا خوف پیدا کرنا اور اس کی معرفت اور رضا کو حاصل کرنا ہے۔ گویا علم کا حقیقی مقصد اور اس کی اصل غرض کسی دنیاوی یا دوسرے لفظوں میں کسی مادی فائدے کا حاصل کرنا نہیں ہے۔ تحصیل علم کے بعد یا دوران تحصیل میں اگر ہم مادی کشمکشوں میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ علم کی اپنی حقیقی قیمت میں کوئی کمی پیدا ہو گئی۔ ہاں اگر ہم نے علم سے خدا کی ارضی اور سماوی نشانیوں پر تدبر کرنا نہ سیکھا یا ان قوانین و ضوابط پر عمل نہ کیا جو خود ہماری اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی فلاح کے لئے ہیں اگر ہم اپنے علم

سے دوسرے بنی نوع کو فائدہ نہ پہنچا سکے اور اس کو دوسروں کی اصلاح و ترقی میں صرف کرنے سے گریز کیا تو گویا ہم نے علم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور اس کی حقیقی غرض و غایت سے بہت دور جا پڑے۔

علم کا یہ مقصد ممکن ہے کہ بعض سطحی نظر کے افراد کو عجیب معلوم ہو، مگر ان کے جھٹلانے اور انکار کرنے کے باوجود بھی یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی فلاح اور افراد و اقوام کا سکون مادیت کے بجائے روحانیت میں ہے۔ خصوصاً جہاں تک علم کا تعلق ہے اس کی ترقی اور تعلیم و توسیع کے لئے تو خالص مادی نقطۂ نظر زہر سے کم نہیں۔ کیا علم کے متعلق محض مادی نقطۂ نظر رکھنے کا ہی یہ نتیجہ نہیں ہے کہ علم جس کی افادیت اتنی بدیہی ہے کہ اس کی مزید توضیح اور تشریح خود علم کی تحقیر ہے۔ ہمارے اس ہندوستان میں اس میں کمی پیدا کرنے کے ذرائع پر غور ہو رہا ہے۔ بلکہ مختلف طریقوں سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ کم سے کم لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں اور یہ محض اس لئے کہ جس علم کو مادی فوائد کا پیش خیمہ سمجھ کر حاصل کیا گیا تھا آج وہ اپنے ان فائدے کو کھو چکا۔ ہم نے علم کو سونے چاندی سے تولا تھا اور علم و فن کی اعلیٰ شہادتوں کو ڈپٹی کلکٹری جیسے عہدوں کا ذریعہ جانا تھا مگر آج خداوندانِ حکومت نہ اس وزن کو قائم رکھ سکے اور نہ اس کی شہادتوں کے ذریعہ ہونے کو۔

بہر حال اور قوموں کے نزدیک علم کا کوئی مقصد بھی ہو لیکن اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک علم کا مقصد خدا اتھایا یوں کہئے کہ انسانِ کامل بننا اور دوسروں کو بنانا۔ تاریخ جانتی ہے کہ جب تک مسلمان جماعتی حیثیت میں علم کے حامل رہے۔ انہوں نے اس مقصد کو برقرار رکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اسلامی مدارس میں ابھی تک بھی مادیت نہیں پہنچی ہے۔ ان مدرسوں میں اب بھی مادی فوائد کو سامنے رکھ کر نہ علم پڑھایا جاتا ہے اور نہ پڑھا جاتا ہے۔ اگر یہ مدرسے اپنے اس تخیل کو قائم رکھیں اور آگے کو بڑھیں تو یقین ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ بھی نہ تو علم کی توسیع و اشاعت میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ تحقیقات میں اور جہاں تک اصل انسانیت کے کمال کا تعلق ہے تو اس میں غالباً یہ بلا شرکتِ غیرے یکتا ثابت ہوں گے۔

## اسلام مدارس میں مروجہ علوم و فنون

ابتداء اسلام میں علم کا احاطہ قرآن مجید تک اور پھر حدیث اور اس کے بعد فقہ تک محدود

رہا مگر جوں جوں اجنبی علوم آتے گئے یا نئے پیدا ہوتے گئے مسلمانوں نے پوری کشادہ دلی سے ان کی پذیرائی کی اور وہ بھی ان کے تعلیمی مرکزوں کا جزوِ درس بن گئے۔ جو نئے علوم داخل ہوئے اور مسلمانوں نے انہیں قبول کیا ان پر اگر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ہر قسم کے علوم تھے۔ عقلی بھی اور نقلی بھی اور عقلی بھی اس قسم کے جن کے اصول و فروع اسلامی اصول و فروع کے صریح خلاف تھے۔ تاہم اسلامی اصول و فروع سے یہ مخالفت اس بات کا سبب نہ بن سکی کہ مسلمان اپنے تعلیمی مرکزوں سے اُن کو خارج کر دیتے۔ پھر ان میں سے جو علوم تجربوں پر موقوف تھے ان کا تجربہ بھی کیا گیا اور تجربوں کے لئے جس قسم کے آلات ضروری تھے انہیں حاصل کیا گیا، ایجاد کیا گیا اور ان سے کام لیا گیا۔

نئے نئے اکتشافات اور نئی تحقیقات سے ان میں حذف و اضافہ بھی جاری رہا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر یہ کہنا بجا ہے کہ علوم و فنون کی خصوصیت تاریخی طور پر اسلامی مدارس کی امتیازی صفت نہیں۔ یعنی اگر عربی صرف و نحو، ادب و لغت، عقائد، تفسیر و حدیث، یونانی الٰہیات، طبعیات، ہیئت، ہندسہ، ان سب کا مجموعہ یا ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد فنون نہ پڑھائے جائیں تو ہماری تعلیم گاہوں پر اسلامی مدارس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ان ہی اسلامی مدارس سے (مختلف عہدوں کے اعتبار سے ان مدارس کی عصری حیثیت کوئی بھی ہو) دینیات، لسانیات، تاریخیات، منطقیات، ریاضیات، طبعیات، الٰہیات اور دوسرے علوم کے ماہرین نکلے، عمومی بھی اور خصوصی بھی۔ لہٰذا اس زمانے میں اگر اسلامی مدارس ان علوم کی جدید عصری ترقیوں اور اضافوں کے ساتھ تعلیم دیں یا دوسرے بالکل جدید اور عصری فنون پڑھائیں تو کسی طرح بھی ان کی روایتی حیثیت سے تضاد اور تخالف نہ ہوگا بلکہ بر خلاف ازیں ان کی اپنی تاریخی خصوصیت کا تتبع ہوگا۔

## اسلامی مدارس کی تاریخی خصوصیت

یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ جہاں تک علوم و فنون کی خصوصیت کا سوال ہے اسلامی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ ان میں فرق و امتیاز بالکل دوسری نوعیت کا ہے جو نسبتاً زیادہ گہرا اور زیادہ بنیادی ہے۔ اسلامی مدارس میں اور دوسری تعلیم گاہوں میں وہ امتیاز مذہبیت اور لامذہبیت ہے۔

اسلامی مدارس کی بنیاد مذہب پر ہے۔ مسلمانوں کے جتنے بھی علوم وفنون ہیں ان میں کسی نہ کسی طرح اسلامیت شامل ہے۔ یہی حال ان کی تصانیف کا ہے۔ ان کے طرزِ تعلیم میں بھی یہ عنصر موجود ہے۔ اسلامیت کے شمول سے میرا مقصد ایک عام اسلامی روح کا شمول ہے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تمام علوم و فنون میں اسلام کی حیثیت مخدومانہ اور دوسری چیزوں کی خادمانہ رہتی ہے۔

مرحوم حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں بہت لطیف پیرائے میں فرمایا تھا کہ مسلمانوں نے ہر قسم کے علوم سیکھے مگر اس طرح کہ پہلے ان کو مسلمان کر لیا۔ علمی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے اس طریقہ تفکر اور طرزِ عمل نے ان کو علمی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رکھا۔ بلکہ وہ اپنے دورِ ترقی میں تمام معاصر قوموں سے اس مسابقت میں آگے نکل گئے۔ اس خیال کو اگر عصری محرکات کے تحت اور نئے تعلیم یافتہ طبقے کی زبان میں ادا کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے علوم وفنون میں، ان کی تعلیم میں اور بناء بریں ان کے مدارس میں ایک نصب العین تھا اور ان سب چیزوں کا رخ تھا ان کے اپنے قومی اور ملی تصوراتِ حیات کی طرف اس طرح افراد کی آزادی جماعت کے مقصد اور نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس بین الاقوامی برادری میں ذہنی افتراق و تشتت راستہ نہیں پا سکتا تھا۔

موجود اسلامی مدارس میں خوش قسمتی سے آج بھی یہ خصوصیت موجود ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم اپنی جن کوششوں کا رخ اس نصب العین کی طرف پھیرے ہوئے ہیں وہ خود اپنی ذاتی قیمت کھو چکی ہیں۔ ہماری جو آزاد انفرادی ذہنیت جماعتی ذہنیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو رہی ہے وہ ذاتی حیثیت میں خود اصلاح کی محتاج نہیں ہے۔ بہر حال اسلامی مدارس کی یہ امتیازی خصوصیت ہے جو ان کے تمام عہدوں میں یکساں مشترک ہے۔

دوسرے مدارس کی تشکیل چونکہ اسلام کی بین الاقوامی برادری کے نصب العین اور بین الملی تصورات اور اس کے جماعتی مزاج کے تحت نہیں ہوئی ہے بلکہ دوسرے نصب العینوں اور دوسرے تصورات اور دوسرے جماعتی مزاجوں کے تحت ہوئی ہے ان میں تعلیم کے مقصد دوسرے ہیں۔ بنابریں ان کے طلباء اور اساتذہ دونوں اپنی جماعتی حیثیت میں ہماری اسلامی درس گاہوں کے اساتذہ اور طلباء سے نہ صرف علوم وفنون کے اعتبار سے بلکہ اس سے

زیادہ گہری اور زیادہ بنیادی حیثیت کے اعتبار سے مختلف ہیں اور بھی فرق ان دونوں قسم کی درس گاہوں میں ہے جب تک یہ فرق نہ اٹھایا جائے دونوں میں اتحاد ناممکن ہے لیکن اس فرق کو کون اٹھائے گا۔ یہ اسلامی مدارس کا کام ہے کہ وہ ان کو اپنے آپ میں سمولیں اور اس طرح جدید و قدیم کا فرق مٹا کر دونوں ایک منبر سے دین و دنیا کی خدمت کے لئے آواز اٹھائیں اور علم و عمل میں ایک ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

## مدارسِ اسلامیہ اور عصری محرکات

موجودہ اسلامی مدارس میں زمانے کی ضرورتوں اور اہلِ زمانہ کی ذہنیتوں سے بالارادہ یا بلاارادہ تغافل برتا گیا ہے اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے علوم و فنون کی موجودہ ترقیوں اور وسعتوں سے تو گویا قصداً بے خبر رہنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی مدارس کا یہ طرز عمل جس طرح خالص علمی نقطۂ نظر سے غلط ہے اسی طرح مادی حیثیت میں بھی سخت مضر ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان کی مشین کے کسی پرزے پر بھی اسلامی مدارس کی تعلیم یافتہ جماعت کا کوئی اقتدار نہیں۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی خواہ وہ کسی شعبہ سے بھی متعلق ہو مغربی بنیادوں پر استوار درس گاہوں کے تعلیم یافتہ کر رہے ہیں۔ اگر ہماری درس گاہوں کے لیل و نہار یہی رہے تو مستقبل میں بھی کوئی امید نہیں کہ ان کو اس مشین میں کوئی دخل ہو گا۔ بلکہ جس طرح غلام ملک کے نظام کی فکری اور عملی باگ ڈور اجنبی اقتدار کی سرپرستی میں فرنگیت اساس کالجوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھ میں رہی اس طرح آزاد ملک کے نظام کی قیادت بھی بلاشرکتِ غیرے اس طبقہ کے ہاتھوں میں رہے گی۔ اس کے علاوہ سب سے اہم وجہ جو زمانے کی ضرورتوں اہلِ زمانہ کی ذہنیتوں اور علوم و فنون کی ترقیوں اور وسعتوں سے باخبر رہنے پر اور ان میں حصہ لینے پر ہمیں مجبور کرتی ہے وہ ہمارے مذہب یا اسلام کا مطالبہ ہے اور یہی چیز ہے جو ہمارے تمام اسلامی مدارس کا محور اور ان میں تعلیم و تعلم کی اساس ہے۔

یہ کہنا کہ مذہب خدا اور بندے کا ایک ذاتی روحانی تعلق ہے۔ ممکن ہے کہ عیسائیت کے متعلق صحیح ہو مگر اسلام کے متعلق یقیناً غلط ہے۔ یہ غلط خیال بازگشت ہے اس تصور کا جو مغربی علماء نے عیسائیت کے متعلق قائم کیا ہے اور دلیل ہے اس لاعلمی کی جو ہمارے جدید تعلیم

یافتہ طبقے میں اسلام کے متعلق اب تک یہ حالت قائم ہے اور نتیجہ ہے مغرب کی اس کورانہ تقلید و نقالی کا جس میں یہ طبقہ آج بھی پھنسا ہوا ہے۔ حالاں کہ جس کو اسلام سے کچھ بھی مس ہو گا اور اس نے اسلام کو معمولی طور پر بھی سمجھنے کی کوشش کی ہو گی وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اسلام جس طرح ایک فکری نظام رکھتا ہے اسی طرح ایک علمی نظام رکھتا ہے اور اس کا یہ فکری اور عملی نظام زندگی اور اس کے تصورات کے ہر ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ خالص مذہبی زاویہ نظر کے اعتبار سے اسلام کی تبلیغ فرض ہے خصوصاً علماء پر۔ اس کا ایک نظام ہے اور اس کو قائم کئے بغیر اسلام کے وجود کے کوئی صحیح معنی نہیں۔ اسلام کا دعوی ہے کہ وہ ابدی صداقتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں دنیا کی تمام ضرورتوں کی تکمیل ہے، اس کا نظام ہر دور کے پیچیدہ مسائل کا حل ہے اور یہ کہ وہ ایک مکمل اور عالم گیر دین ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم اپنے معاشرہ کی ذہنیتوں سے ان کے طرزِ تفکر سے اور ان علوم و فنون سے جن کی واقفیت روزمرہ کے تجربوں اور مشاہدوں نے ثابت کر دی ہے یا ان کے متعلق ایسا یقین کیا جاتا ہے نہ واقف ہوں بلکہ ان میں مہارت ہی نہ رکھتے ہوں اور تا وقتیکہ ہمیں دنیا کے موجودہ مسائل کا علم نہ ہو اور مختلف قسم کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی نظاموں پر گہری نظر نہ ہو جب تک ملک کی انتظامی اور قانونی مشین میں ہماری حیثیت اثر انداز پرزوں کی نہ ہو اور ساتھ ساتھ اسلام پر بھی ہر ہر زاویہ نظر سے دیکھنے کی استعداد نہ ہو ہم اسلام کی صحیح اور موثر تبلیغ کس طرح کر سکتے ہیں اور اس کے نظام کو بروئے کار لانے میں اپنے فرض کو کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے۔

آج دنیا کی زبان بدل چکی ہے۔ اس کے مفروضات اور مسلمات تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس کے تصورات میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے۔ طرزِ تفکر بالکل دوسرا ہو چکا ہے۔ اس کے مسائل دوسرے ہو گئے ہیں۔ اس کی طاقتوں میں نوعی فرق آگیا ہے۔ اس نے پرانے اسلحہ بالکل بدل ڈالے ہیں۔ سادے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا اور اس کا مزاج کلیتہً بدل گیا ہے۔ لہذا اگر آج ہم کو اس کے سامنے اسلام کی ابدی صداقت کا پیغام پہنچانا ہے تو پہلے سے مختلف زبان اختیار کرنا پڑے گی اور اس کے تفکر کے مطابق نئے طریقوں سے اسلام کو اس کے دماغ میں پہنچانا پڑے گا۔ دنیا کے نئے مسائل کے لئے ہمیں اسلام کو نئے زاویہ نظر سے دیکھنا پڑے گا۔ اس سے نبرد آزمائی کے لئے نئی طاقتیں حاصل کرنا ہوں گی اور نئی اسلحہ بندی

کرنا پڑے گی۔ اس کو متاثر کرنے کے لئے نئے اثرات استعمال کرنا ہوں گے۔ اس مادی دنیا کے سامنے اسلام کی روحانیت کو اس کی مادی سڑک سے لے جانا پڑے گا اور ان سب کی تیاری بجز ہماری اپنی تعلیم گاہوں، تربیت گاہوں اور تجربہ گاہوں کے کہاں ہو سکتی ہے۔

## اسلامی مدارس کی اصلاح کے متعلق ایک بنیادی تصور

اسلام میں دین و دنیا اور روحانیت و مادیت میں افتراق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تجربات حیات سے مستفید ہونے کی کوئی ممانعت نہیں بلکہ کائنات میں تدبر و تفکر مسلمان کی خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ دنیا میں دین سمویا ہوا ہو اور مادیت میں روحانیت سرایت کئے ہوئے۔ تجربات حیات سے استفادہ کا مقصد اور کائنات میں تدبر و تفکر کی غرض رب حیات اور خالق کائنات سے بغاوت و سرکشی کرنا نہ ہو بلکہ اس کی عظمت کا یقین حاصل کرنا اور اس کی ودیعت کی ہوئی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے منت پذیری کے جذبے کے ساتھ اس سے کام لینا ہو۔ اسلام کے اس تصور کے تحت مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی تعلیم گاہوں کے نقطۂ نظر مین اختلاف ہو جاتا ہے۔ اسی اختلاف کی بناء پر ضروری ہے کہ ہمیں مدارس میں ایک خاص قسم کا ماحول پیدا کرنا چاہئے اور خاص تربیت کا لحاظ رکھنا چاہئے اور یہ کہ ہمارے مدارس کو نہ کسی خاص علم و فن سے مختص ہونا چاہئے اور نہ مخصوص اغراض رکھنے والے طبقوں سے بلکہ تمام علوم و فنون سے اور تمام طبقات سے ان کی مختلف اغراض کا لحاظ رکھتے ہوئے یکساں تعلق ہونا چاہئے۔ اس طرح ان کے طلباء خواہ کسی علم و فن کی تحصیل کریں اور زندگی کے کسی شعبے کو اپنی جدوجہد کی جولان گاہ بنائیں سب میں ایک قسم کی وحدت خیال اور وحدت مقصد قائم رہے گی اور باہم تضاد و تخالف پیدا نہ ہو سکے گا۔ ہندوستان کے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری جدید قسم کے مغربی بنیادوں پر استوار جامعات سے تعلیم یافتہ گان کو دیکھئے ان میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین ملیں گے۔ اس طرح کہ ایک کو دوسرے کے مضامین سے نہ کوئی دل چسپی ہو گی اور نہ کوئی ادنیٰ تعلق اور ساتھ ساتھ نہ طرزِ معیشت میں یکسانی ہو گی۔ نہ معاشرتی درجات میں اور نہ ان کی عملی سمتوں میں اتحاد اور نہ جدوجہد کی جولان گاہوں میں۔ مگر ان سب عظیم اختلافات کے باوجود ان میں ایک وحدتِ خیال اور وحدتِ تفکر موجود ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے

سے کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں اور یہ اس قسم کی وحدت ہوتی ہے۔ جو ان میں اور ہمارے اسلامی مدارس کے طلبہ میں نہیں ہوتی۔

اس تصور کو سامنے رکھ کر ہی ہم کو اپنی درس گاہوں کی اصلاح کی طرف اقدام کرنا چاہئے اور اس طرح تمام علوم و فنون کو اور تمام علمی تجربات کو اور صنعتی تربیتوں کو ایک طرح سے مسلمان بنالینا چاہئے۔

میں جانتا ہوں کہ ہماری اسلامی درس گاہوں کی پشت پناہی نہ حکومت کر رہی ہے اور نہ ہماری قوم کا دولت مند طبقہ۔ بلکہ ان کا بار محض غریب اور مفلس طبقے کے کمزور کاندھوں پر ہے اور اس لئے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنی درس گاہوں کو جدید قسم کی یونیورسٹیوں کے معیار پر لا سکیں اور ہر قسم کے علوم و فنون کو ان کی نظری اور عملی حیثیت میں تعلیم دے سکیں اور اس قسم کے اساتذہ اور اس طرح کے آلات اور دوسرے ضروری سامان مہیا کر سکیں لیکن اپنی اس مکمل بے سرو سامانی کے باوجود ایک چیز کر سکتے ہیں کہ ہم اس قسم کی درس گاہوں کو ایک حقیقی نصب العین بنا کر اپنی موجودہ درس گاہوں کو اپنی نصب، یعنی درس گاہ کا ایک جزو سمجھ لیں اور اپنی حدود اور وسعت کے مطابق تدریجاً ان کو وسیع کرتے جائیں۔ فی الحال اپنی موجودہ درس گاہوں میں کم از کم کچھ مضامین کی تعلیم شروع کر دیں جن کی حیثیت خالص نظری ہے یا جن کو نظری طور پر بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔ ان علوم کی تعلیم کے لئے ہمیں اپنی ملکی زبان کو ہی اختیار کر لینا چاہئے اور اسی زبان کی کتابوں کو زیر درس کر دینا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں فی الحال ایسے اساتذہ نہیں ملیں گے جو ہمارے نصب العین سے یا ہماری تربیت سے ہم آہنگ ہوں لیکن آئندہ جب ہماری جماعت میں یہ علوم آجائیں گے تو اس قسم کی دشواری ختم ہو جائے گی۔

آج علم بہت گراں ہے کیونکہ اعلیٰ تعلیم صرف دولت مند طبقے کے افراد ہی حاصل کر سکتے ہیں اور غریب طالب علم خواہ اس کو کتنا ہی شوق ہو اور اس کی ذہنی صلاحیتیں کتنی ہی بلند ہوں لیکن اس کو جاہل رہنا پڑے گا۔ اس کے برخلاف آج علم بہت ارزاں بھی ہے۔ اس کو ہر شخص حاصل کر سکتا ہے خواہ اس کی جیب میں علم کی صحیح قیمت دینے کے لئے نہ محنت کے سکے ہوں اور نہ شوق کے، خواہ اس کے پاس ذہنی صلاحیت اور فکری استعداد و مناسبت کی

معمولی دولت بھی نہ ہو ہاں صرف سونے اور چاندی کے ٹکڑے اس کے یا اس کے سرپرست کے پاس ہوں۔

چونکہ جدید درس گاہوں کی زمام اقتدار اس طبقے کے ہاتھ میں ہے جو مغرب کی تہذیب اور تمدن سے متاثر ہے۔ اس کے سامنے وہیں کی گراں تعلیم ہے۔ لہٰذا وہ کبھی بھی علم کو مالی اعتبار سے ارزاں نہیں کر سکے گا۔ جس کا کھلا ہوا نتیجہ یہی ہے کہ علم کی دولت اس کے صحیح مستحقین کو تقسیم نہ ہو سکے گی اور نہ اس میں وسعت پیدا ہو گی لیکن اگر ہماری اسلامی درس گاہیں ان علوم و فنون کو یا ان کے کسی حصے کو اپنے نصاب میں شامل کر لیں تو پھر ان ہی چٹائیوں اور دریوں سے علم اپنے حقیقی مستحقین میں پہنچ سکے گا اور اساتذہ بھی اپنی روایتی للہیت کی بناء پر علم کو تقسیم کرنے میں نہ بخل سے کام لیں گے اور نہ مالی معاوضے کو اہمیت دیں گے۔ جب ان میں یہی علوم آ جائیں گے تو غالباً ان میں محض مغرب کی تقلید اور نقالی نہ ہو گی بلکہ وسیع النظری اور مجتہدانہ استعداد ہو گی۔

## اسلامی مدارس کے نصاب کی اِصلاح کا اُصولی خاکہ

اسلامی مدارس کی موجودہ مالی مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں تمام متداول علوم و فنون کی تعلیم جس طرح ہونا چاہئے نہیں ہو سکتی۔ مگر تاہم فی الحال بعض ضروری فنون کا خصوصاً جو زیر درس فنون سے مناسبت رکھتے ہیں اضافہ ضروری ہے۔ مثلاً حساب، ہندسہ، مساحت، جغرافیہ، ہیئت، نظری طبیعات، مغربی فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، اخلاقیات، اقتصادیات، تاریخ، فلسفہ، تاریخ، اصول قانون وغیرہ۔ بقیہ فنون کے لئے نیز ان میں سے بھی بعض فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی دوسرے وقت کا انتظار کرنا چاہئے اور حالات کے سازگار ہونے کے ساتھ ان کو بڑھاتے رہنا چاہئے کیونکہ ان فنون کی بہت سی کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں لہٰذا مدارس پر ترجمہ کرانے کا بار نہ پڑے گا۔ ان فنون کو قدیم مروجہ فنون کے ساتھ ان کی مناسبتوں کا لحاظ رکھ کے ملا جا سکتا ہے۔ انگریزی کو ثانوی زبان کی حیثیت دے دی جائے۔ مروجہ علوم میں جہاں تک عربی صرف و نحو کا تعلق ہے ابتدائی اور سہل کتابوں پر اکتفا کیا جائے اور ان کو زبان کے ساتھ اس طرح پڑھایا جائے کہ قواعد کی مشق ہو جائے اور لکھنے پڑھنے میں قواعد کی غلطیاں نہ رہیں۔ بقیہ فنون میں متقدمین کی کتابوں کو اور متاخرین کی ایسی

تصانیف کو جو مجتہدانہ تحقیقات پر مشتمل ہوں، ترجیح دی جائے۔ ابتدائی فنون کو چھوڑ کر اعلیٰ فنون میں فنون کی تاریخوں کو مطالعے کے لئے لازم کر دیا جائے۔ ان تاریخوں سے نہ صرف یہ کہ فن اجمالی طور پر سامنے آجائے گا بلکہ اس کی تدریجی ترقیوں پر اور ان وجوہ و اسباب پر بھی نظر ہو جائے گی جن کی وجہ سے ان میں کمی و بیشی ہوتی رہی ہے اور علم کی صحیح قیمت معلوم ہو جائے گی۔ اکثر علوم و فنون کی تاریخیں موجود ہیں بعض قدیم اسلامی فنون ایسے ہیں جن کی تاریخیں میرے علم میں نہیں۔ بہر حال اگر نہ ہوں تو لکھوائی جا سکتی ہیں۔

ان تمام فنون کی تعلیم ظاہر ہے کہ ہر ہر طالب علم نہیں حاصل کر سکتا اور نہ ان سب کو اوسط استعداد کا ایک طالب علم محفوظ رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا اسلامی مدارس کی تعلیم کو اگر ان تمام مضامین پر حاوی کیا جائے تو ہمیں اپنے قدیم اور آج کل کی جدید جامعات کے اصول کی پیروی کرنا ہوگی۔ بعض مناسب فنون کے جوڑ مقرر کر دیئے جائیں۔ ان جوڑوں کی ترجیح اختیاری ہے۔ ہاں بعض خاص فنون کے اعتبار سے اس کے موقوف علیہ جوڑ ضروری کر دیئے جائیں۔ ہندوستان کے موجودہ اسلامی مدارس جو اپنے بعض زیرِ درس فنون کے اعتبار سے خصوصی شہرت رکھتے ہیں وہ اپنی اس شہرت کو اصلاح و ترمیم کے بعد بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ ان فنون پر زیادہ زور دیں اور ان کے لئے خصوصی ماہرین کا انتظام قائم رکھیں اور ان مضامین میں طلبہ کی سخت جانچ کیے بغیر سند نہ دیں۔

اگر اس طریقہ اصلاح کو اسلامی مدارس کے موجودہ مقصد کے خلاف سمجھا جائے تو بھی کم از کم مروجہ نصاب میں کسی نہ کسی حد تک ترمیم کرنا ناگزیر ہے۔ مثلاً متاخرین کی کتابوں کی اس کثیر تعداد میں کمی کر کے متقدمین کی بعض اہم کتابوں کو داخل کیا جائے۔ حواشی اور شرح نے جو اہمیت ہمارے نصاب میں حاصل کر لی ہے اس کو کم کیا جائے متاخرین کی ایسی تصانیف کو داخل کیا جائے جو مجتہدانہ حیثیت رکھتی ہوں اور ساتھ ساتھ چار پانچ کتابیں جدید فلسفے اور طبیعات و ہیئت کی شامل کی جائیں۔ بعض فنون کی تاریخوں کو مطالعے کے لئے لازم کر دیا جائے۔

## مدّتِ تعلیم اور مضامین کی تقسیم

مدتِ تعلیم کے تعین، مضامین کی تعلیم کے معیار، ان کے صحیح جوڑ اور ان کی صحیح تقسیم

کے لئے ان حضرات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو ان مضامین کے ماہر ہیں اور تعلیم کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اس کے متعلق مجھ جیسے بے سواد کی رائے واقعتاً کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن ان کی ترمیم و تنسیخ کے لئے مواد فراہم کرنے کی حد تک ایک معمولی اور مجمل خاکہ غیر مناسب نہ ہوگا۔

مکمل تعلیم کا زمانہ کم از کم پندرہ سال ہونا چاہئے۔

ابتدائی تعلیم کے لئے تین سال جس میں کلام اللہ شریف ابتدائی نوشت و خواند وغیرہ حساب چاروں بسیط قاعدوں تک۔ اردو پڑھانے میں ایسی کتابیں جو اسلامیات سے متعلق ہوں رکھی جاسکتی ہیں۔

ثانوی تعلیم کے لئے پانچ سال جن میں حساب، مساحت، ہندسہ، جغرافیہ، نقشہ کشی، ابتدائی انگریزی زبان کے ساتھ عربی کی ابتدائی صرف و نحو وغیرہ کی تعلیم کو تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں سے بعض بطور تبادل اختیاری ہوں گے بعض یکے بعد دیگرے۔

جامعی تعلیم کے لئے پانچ سال جن میں سے سال اوّل میں نحو عربی، بلاغت کے ابتدائی سادے مسائل، فقہ، منطق، انگریزی، تاریخ وغیرہ اس میں بھی مضامین کی کثرت کی صورت میں بشرط ضرورت تبادل اختیاری کیا جاسکتا ہے۔

سال دوم و سوم میں عربی ادب، بلاغت و عروض، فقہ و اصول، تاریخ، منطق و مناظرہ، طبیعات، کلام، انگریزی۔ اس دوران میں چار مضامین لازم کردیئے جائیں گے۔ سال چہارم و پنجم میں عربی ادب، فقہ و اصول، اقتصادیات، اصولِ قانون، ہیئت، تاریخ و فلسفہ تاریخ، فلسفہ، کلام، سیاسیات، نفسیات، اخلاقیات، حدیث، انگریزی۔ اس دوران میں تین مضامین لازم ہوں گے۔

بعد الجامعی تکمیل کے لئے دو سال حدیث، فقہ و اصولِ فقہ، عربی ادب، اقتصادیات، تاریخ و فلسفہ تاریخ، فلسفہ مع کلام، سیاسیات، نفسیات، انگریزی تکمیل کے لئے کوئی ایک مضمون کافی ہوگا۔

ان مضامین میں سے بعض کے ساتھ بعض مناسب جوڑ لازم کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً فقہ و اصول فقہ کی تکمیل کے لئے موجودہ عہد میں کم از کم اصولِ قانون ضروری ہے۔ اس کے بعد اقتصادیات کی اہمیت ہے۔ کلام کے ساتھ فلسفہ ناگزیر ہے اور اس کے بعد نفسیات کی

ضرورت ہے۔ یا عربی ادبیات کے لئے بلاغت و عروض کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس جن قدیم مضامین میں نئی ترقیاں اور ترمیمیں ہوتی ہیں ان میں ان کی عصری تحقیقات کو حقیقی اہمیت دی جائے۔ تکمیل کی صورت میں مضامین کی تاریخوں کو کافی اہمیت ہے۔ نیز بعض مضامین کی تکمیل موجودہ عہد میں بلاانگریزی جانے ہوئے ممکن ہی نہیں۔ جامعی تعلیم کے دوران ترجمہ قرآن کو ختم ہو جانا چاہیے۔ طلبہ کی حیثیت کے مطابق اس کی لسانی اہمیت، عملی افادیت، تاریخی صحت، فلسفیانہ توثیق پر توجہ رکھی جائے۔

## طرزِ تعلیم اور تربیت

جہاں تک ابتدائی تعلیم کا یا ان فنون کی تدریس کا سوال ہے جن کی کتاب کے تعلق کے بغیر تکمیل نہیں ہو سکتی ان میں تو تعلیم کو کتاب تک محدود کرنا ہوگا۔ مگر جامعی تعلیم میں کتابوں کو غیر معمولی اہمیت دینا شاید زیادہ مفید نہ ہو۔ چناں چہ جامعی تعلیم میں کم از کم اس کے آخری سالوں میں تو فن اور مضمون کی تعلیم کی طرف توجہ منعطف رہنا چاہیے۔ اس طرز سے طلبہ میں اس فن سے دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے اور فن پر پوری نظر ہو جاتی ہے۔ مضامین کی تعلیم خالص اجتہادی اور انتقادی ہو مگر اس انتقاد کو محض تخریبی اور سلبی ہی نہ ہونا چاہیے بلکہ تعمیری اور مثبت ہونا چاہیے۔ طلبہ میں فنی اجتہاد اور انتقاد کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ حتی الامکان محض لفظی اعتراضات و جوابات سے طلبہ کے ذہن کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ جو موضوع زیرِ درس ہو طلبہ کو پہلے سے اس کے لئے تیار ہونے پر آمادہ کیا جائے اور اس پر مطالعہ کرنے کے لئے کتابیں تجویز کر دینا چاہئیں۔ اس سلسلے میں طلبہ کی اوسط استعداد اور صلاحیت کا لحاظ ضروری ہے۔

فقہ کلام اور قرآن مجید کی تعلیم میں عصری نظریوں کو سامنے رکھا جائے اور آزادانہ مقابلہ کیا جائے۔ فقہ اور کلام میں قرآن و حدیث سے اصول و ضوابط کے موافق آزادانہ استخراج و استنباط کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اصول فقہ میں نفس اصول پر نظر ڈالنا ان کی صحت کو جانچنا بھی مفید خدمت ہوگی۔ تکمیلی جماعتوں کے طلبہ کو اپنے اپنے مضامین کی تحقیق پر آمادہ کرنا مفید ہوگا۔

طلباء کا مقصد کسی بھی فن کی تحصیل ہو لیکن ان کے عادات و اخلاق کی نگرانی بہت

ضروری ہے۔ ان کے عام اخلاق و عادات کو اسلامی رہنا چاہئے۔ ان کو ان درس گاہوں کے مقصد ان کی خصوصیات اور ان کے نصب العین کا پیکر ہونا چاہئے۔ ان کی توجہ محض مادی فوائد پر مرکوز نہ ہونا چاہئے۔ اسلامی روح سے نہ یہ کہ صرف ان کو آشنا بنایا جائے بلکہ اسلامی روح کو ان میں جذب کرنے کی کوشش ہونا چاہئے۔ ان کی عملی قوتوں کو بیدار رکھنا چاہئے اور ہر شعبہ حیات میں مخصوص مقاصد سامنے رکھ کر جدوجہد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ رواداری، ایثار، خدمت خلق اور بنی نوع کی اعانت کے ملکات کی تخلیق میں ان کی مدد کرنی چاہئے۔ یہ کوشش ہونا چاہئے کہ ان کے انفرادی مفاد جماعتی مفاد سے متصادم نہ ہوں۔ ان کا انفرادی نصب العین بین الملی نصب العین سے نہ ٹکرا جائے۔ خلاصہ یہ کہ ان کی تربیت اسلامی ہونا چاہئے اور ان کے لئے ہماری اسلامی درس گاہوں کو اسلامی ماحول مہیا کرنا چاہئے۔

اس تعلیم اور طرزِ تعلیم سے جو طلبہ اس ماحول کے تربیت یافتہ نکلیں گے ان کے متعلق غالبًا یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے دماغ روشن ہوں گے۔ ان میں صلاحیت فکر ورائے ہوگی اور اجتہادی صلاحیت ان کی زندگی میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی.......... اسلامی نصب العین کی طرف ان کا رویہ نہ صرف یہ کہ ہمدردانہ ہوگا بلکہ ایک حد تک والہانہ ہوگا۔ ان میں مختلف صلاحیتیں ہوں گی۔ جن کی بناء پر وہ مختلف شعبہ ہائے حیات میں ہماری نمائندگی کر سکیں گے۔ انشاء اللہ

## پروفیسر سید مقبول احمد
ڈائریکٹر علی گڑھ سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز

اسلام نے شروع ہی سے علم کے حصول پر زور دیا(طلب العلم فریضہ علی کل مسلم و مسلمة : حدیث نبوی ﷺ) قرآنی آیت "و علم آدم الاسماء کلھا" سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علم اور حصولِ علم ہر انسان کو ورثہ میں ملا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار ذہین لوگوں اور احمقوں میں امتیاز کیا جاتا رہا ہے، عقل کا لفظ اپنی متعدد شکلوں میں قرآن مجید میں ان گنت بار استعمال ہوا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عرب بدوؤں کی غریبی، جہالت اور پسماندگی دور کریں اور تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ان کے اس قول سے بھی ہوتا ہے کہ "اطلبو العلم ولو کان یانصیبی"۔

ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں لوگ لکھنا زیادہ نہیں جانتے تھے۔ شاعری سینہ بہ سینہ چلتی تھی۔ اس لئے شروع میں پڑھنے لکھنے کی طرف بہت زیادہ توجہ دینی پڑی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ قرآن مجید کو لکھنا بھی تھا، پڑھنا بھی تھا۔ رفتہ رفتہ تعلیم پھیلتی گئی اور اموی عہد میں قرآن مجید ہی سے کئی علوم پھوٹ نکلے۔ اس وقت میں اسلام کے نفوذ کے سبب قرآن ہی کے لئے صرف و نحو کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ آٹھویں صدی میں غالباً چین سے کاغذ بھی ادھر آگیا۔ یہ صدی سیکولر علوم کی ترویج کے اعتبار سے بھی اہم ہے۔ یہی زمانہ ہے جب مسلمان، یونانی، ایرانی اور ہندوستان علوم سے آشنا ہوئے (گو ایرانی علوم سے کسی قدر پہلے سے بھی واقفیت تھی۔ اس وقت تک بعض اسلامی علوم ارتقا کے منازل طے کر کے اپنی متعین صورتیں بھی اختیار کر چکے تھے۔ تفسیر، فقہ، صرف و نحو اور منطق پہلے عربوں کے یہاں نہیں تھے۔ لیکن آٹھویں صدی کے بعد تو جغرافیہ، طب، ریاضیات، طبیعات اور دوسرے اسی قسم کے علوم بھی عربوں میں در آئے اور اگلی چار صدیوں میں عربوں نے ان علوم کو سیکھنے ہی پر اکتفا نہیں

کیا۔ ان میں بنیادی اضافے بھی کئے اور تعلیم و تحقیق کے متعدد ادارے وجود میں آ گئے۔

ابتدائی تعلیم تو مکتبوں اور مدرسوں میں دی جاتی تھی۔ مگر اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج یا یونیورسٹیاں نہیں تھیں جو طلباء اسلامی علوم کی تکمیل کے خواہش مند ہوتے تھے انہیں اساتذہ کے پاس جانا پڑتا تھا جو اپنے گھروں میں یا مساجد میں اسباق دیتے تھے۔ ہر علم کے خصوصی ماہروں سے کچھ حاصل کرنے کے لئے طلباء کو بعض اوقات خاصے لمبے سفر کرنا پڑتے تھے۔ اطمینانِ خاطر ہو جانے کے بعد اساتذہ اپنے طلباء کو اسناد بھی عطا کرتے تھے۔

عباسی عہد میں تعلیم کی اشاعت کے دوگونہ اثرات مرتب ہوئے۔ ایک طرف سماج نے ترقی کی، دوسری طرف فلسفہ و طبیعات کے نئے افکار و نظریات نے جو یونانی کتابوں کی راہ سے داخل ہو رہے تھے، مسلمانوں کے مذہبی افکار اور ان کے انداز فکر پر ایک مستقل اثر چھوڑا۔ ایسے ہی ہندو اور بدھ فلسفے نے بھی اپنے اثرات ڈالے اسی لئے اس عہد میں مسلمان دانش ور متعدد مسلکوں میں بٹے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ صورت حال گیارہویں صدی تک قائم رہی۔ پھر سکہ بند مذہبیت غالب آتی گئی، اور پھر، اگلی کئی صدیوں تک مکمل طور پر چھائی رہی۔

گیارہویں صدی تک سیکولر اور سائنٹیفک تعلیم بڑے وسیع پیمانے پر جاری تھی اور اس کا آزادانہ حصول بہت آسان تھا۔ دینیات کی تعلیم کے سلسلے میں مدرسوں کا سا نظام بھی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت تک باقاعدہ مدرسے یا اسکول وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس قسم کا پہلا مشہور اور اہم مدرسہ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے قائم کیا۔ بغداد میں پہلا مدرسہ قائم ہونے کے بعد پوری اسلامی دنیا میں ایک سلسلہ چھڑ گیا۔ ان مدارس کا مقصد دینی اور اخلاقی تعلیم دینا تھا۔ شاید یہ مقصد بھی ہو کہ اسماعیلی تبلیغ کے جلو میں جو الحاد و بے دینی نت نئے رنگ میں پھیلتی جا رہی تھی اور مصر میں ایک پوری پشت پناہ سلطنت وجود میں آ چکی تھی۔ اس سب کا کچھ ازالہ، کچھ سدباب ہو سکے اور کیا یہ تاریخ کا ایک واقعہ نہیں ہے کہ حسن بن صباح کے ایک فدائی ہی نے نظام الملک کو قتل کر ڈالا.........

نظام الملک کا جو بھی مقصد رہا ہو، لیکن تعلیم کے اس نئے نظام نے اگلی چند صدیوں میں اسلامی معاشرے کے ارتقاء پر کچھ اچھا اثر نہیں چھوڑا۔ اس کے لئے جو نصاب تیار کیا گیا جس میں قطعیت کے ساتھ دین اور اخلاق پر سارا زور تھا، امام غزالی کا اس پر دیرپا اثر رہا۔ بغداد کے

نظامیہ میں غزالی خود بھی درس دیتے تھے۔ ان کے یہاں بنیادی حیثیت اخلاقیات کو حاصل تھی۔ یہ ان کی تصنیفات سے بھی عیاں ہے۔ لبرل اور سیکولر انداز فکر کے وہ مخالف تھے۔ یہ بھی طے ہے کہ یونانی فلسفہ کے تو وہ صاف صاف مخالف ہی تھے، اسماعیلیوں کے بھی خلاف تھے، اسی طرح فاطمی خلفاء کے بھی۔ چناں چہ ان کے تعلیمی افکار میں اخلاقی تعلیم کا حصول مسلمان کے لئے ایک فریضہ زندگی قرار پاگیا۔ بقیہ ساری تعلیم (سائنٹیفک یا کیسی بھی) کو ثانوی حیثیت دے دی گئی۔ بغداد کے نظامیہ کالج کے افتتاح اور غزالی کے نئے تصور تعلیم نے مسلم معاشرے کی ساری توجہ سیکولر اور سائنٹیفک تعلیم سے ہٹا کے مذہبی تعلیم پر مرکوز کردی۔ سائنٹیفک تعلیم باقاعدہ اور منظم طریقے پر دی بھی نہیں جارہی تھی اور نہ حکمراں طبقے کی اسے حمایت حاصل تھی۔ اس لئے بھی اس کے زوال میں آسانی ہوگئی۔ اس کے برخلاف ان مدرسوں کے نظام کو بادشاہ، امراء اور رؤسا سب کی امداد و اعانت حاصل تھی، جس کے نتیجہ میں کچھ ہی عرصہ میں سلجوقیوں اور ترکوں کے سایہ عاطفت میں یہ مدرسے پوری اسلامی دنیا میں پھیلتے چلے گئے۔

امام غزالی کا فلاسفہ کی جانب جو رویہ تھا اس کے نتیجے میں مسلمان فلاسفہ بے دین قرار دیئے جانے لگے۔ اس طرح یونانی فلسفہ ناپسندیدہ اور ناجائز ٹھہرا اور رفتہ رفتہ تمام یونانی علوم اور سائنٹیفک تعلیم پر زوال آتا گیا۔ جس کے ساتھ آزادانہ جستجو، تلاش اور اور یجنل ریسرچ کے کام بھی تنزل پذیر ہونے لگے۔ بالآخر ایک مرحلہ آگیا جب تعلیم روایتی ہو کر رہ گئی، مدرسوں میں قدیم متن پڑھائے جاتے اور بجائے اس کے کہ اصل مضمون کی تعلیم ہوتی۔ متون کے نحوی اور لغوی مباحث پر ساری ذہانت صرف ہونے لگی اور اسلامی علوم میں بھی اب اس کے سوا کوئی قابل قدر اضافہ نہ ہوسکا کہ ان قدیم درسی متون کے حواشی اور شروح کا ایک انبار لگتا چلا گیا۔ مدرسوں کے نصاب میں طبیعات، ریاضی، جغرافیہ اور ہیئت قسم کے علوم کو کوئی مستقل جگہ نہیں مل سکی، بس دینی اور اخلاقی علوم داخل درس تھے اور انہیں پر سارا زور تھا۔ اگر منطق اور کلام نصاب کا جز تھے تو اس لئے کہ ان کے ذریعہ طالب علم کو ہر قسم کے الحاد و بے دینی کے خلاف اسلام کا دفاع کرنا آجاتا تھا۔ خلاصہ کلام یہ کہ گیارہویں صدی میں مسلم تعلیم میں جو تبدیلی آئی یہ اسی کا اثر تھا کہ ہمارے اپنے عہد تک

مدرسوں کا نظام تعلیم محض روایتی ہو کر چلتا رہا۔ یہ تعلیم بڑی Subjective قسم کی تھی اور انتہائی کٹر، جس میں نئے افکار و خیالات کی یا عقائد اسلامی کی سکہ بند توجیہات کے بر خلاف کچھ نئے تصورات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ انھیں الحاد اور بدعت کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ تعلیم و تعلم کے اس عہد زوال میں، یعنی گیارہویں صدی سے انیسویں صدی تک، کتنے ہی بے گناہ مسلمان اس قسم کے الحاد یا کفر کا شاخسانہ بن کر مرحلہ دار و رسن سے گزرتے رہے۔

اسلامی معاشرے میں سکہ بند مذہبیت اور آزاد خیالی کی کشمکش کوئی چار صدی چلی، آٹھویں سے گیارہویں صدی تک یہ کشمکش تھی۔ عقلیت پسندی اور سائنٹیفک انداز نظر ......... اور مذہبی معتقدات اور روایت پرستی کے درمیان تاریخ عالم میں اس قسم کی کشمکش کے نمونے دوسری جگہوں پر بھی ملتے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ میں مثلاً موریہ اور گپتا تابناک عہد کے بعد علوم و معاشرہ دونوں پر زوال آتا گیا۔ موریہ اور گپتا عہد میں ہندوستانی فلسفہ اور علوم اپنے عروج پر پہنچے ہوئے تھے۔ یہ لبرلزم اور سماجی ترقی کا زمانہ تھا۔ سیاسی اتحاد اور اقتصادی خوشحالی کا دور تھا مگر ساتویں یا آٹھویں صدی کے بعد ہندوستانی سماج کو زوال کا گھن لگ گیا۔ جو عہد جدید تک چلتا رہا۔ یہاں میرے خیال میں سبب یہ تھا کہ ساتویں، آٹھویں صدیوں میں بدھ مت زوال آمادہ ہو کر برہمنیت کو جگہ دینے لگا تھا۔ بدھ فلسفہ نسبتاً زیادہ دنیوی اور عقلیت پسندانہ انداز نظر کا حامل تھا جس نے یقیناً ہندوستانیوں میں علم اور سائنٹیفک تعلیم کے لئے بے چین خواہش پیدا کر دی ہو گی۔ مذہبی احیاء نے اس کے بر خلاف اپنی دنیا سے دوسری دنیا کی طرف منہ موڑ دیا۔ دوسرے اسباب کے ماسواء غالباً یہ ایک اہم سبب تھا جو ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستانی فکر کے زوال کے لئے ذمہ دار بنا اور ہندوستان سائنس اور تعلیم دونوں میں پسماندہ بنا رہا۔ اگر چہ مذہبی احیاء نے یوں کتنے ہی مذہبی فلسفوں اور بھکتی کے افکار کو جنم دیا لیکن عمومی طور سے ہندوستانی معاشرہ سماجی اور ذہنی طور سے عہد جدید سے قبل قطعی پسماندہ ہی رہا۔ تا آنکہ مغربی اثر سے اٹھارویں، انیسویں صدی میں نئی جاگرتی ہوئی۔ اس سے پہلے تو اسلام اور اسلام کا تعلیمی نظام بھی یہاں کے معاشرے میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں لا سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تعلیمی نظام جو یہاں رائج کیا گیا وہ جامد ہو کے رہ گیا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ اسلام اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب پہلو بہ پہلو بلا کسی

کشمکش کے پنپتے رہے۔

تاریخ میں اس قسم کی ایک مثال قرون وسطی کے یورپ کی بھی ہے۔ جہاں مذہبی عقیدے اور سائنٹیفک انداز نظر میں مقابلہ ہوا لیکن وہاں خوش قسمتی سے کلیسا نے راستہ دے دیا اور تعلیم پادریوں کے حلقہ اثر سے نکل گئی۔ جس کے نتیجہ میں لبرلزم اور عقلیت پسندی کا دور شروع ہوا اور سائنٹیفک تعلیم اور تلاش و جستجو نے سائنس کو ایسی ترقی دی جس سے وہ صنعتی انقلاب رونما ہوا جو آج بھی ہمارے سامنے ہے۔

اس قسم کی کش مکش جب عالم اسلام میں ہوئی تو گیارہویں صدی میں عقلیت پسندی ہار گئی اور اس کے بعد سے تعلیم زوال پذیر ہو گئی اور پھر اسلامی معاشرہ میں اگلی کئی صدیوں تک ترقی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکا۔ یہ بات اس سے بھی ثابت ہے کہ اسلام کے بڑے بڑے دماغ اور دیوزاد عالم، وہ فقہ دینیات اور کلام میں ہوں یا ریاضی ہیئت جغرافیہ کیمسٹری اور طب میں، تقریباً سب کے سب آٹھویں سے بارہویں صدی تک کے عرصہ میں پیدا ہوئے۔ ابن سینا، ابن رشد، البیرونی، عمر خیام اور پھر غزالی وغیرہ سب کے سب اسی عرصے کی پیداوار ہیں۔ اس عہد کے برخلاف اس قد کا کوئی عالم تیرہویں صدی سے انیسویں صدی تک کے عرصے میں نہیں ملتا اور بلکہ عہد جدید میں بھی نہیں۔ کچھ استثنیٰ ضروری ہیں۔ ابن عربی، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی، محمد ابن عبدالوہاب، شیخ سنوسی، مہدی سوڈانی اپنے اپنے زمانے کے بڑے مفکر تھے۔ مگر یہ لوگ محض مذہبی مصلح تھے اور مذہبی مفکر کچھ قابل تعریف مثالیں شاہ ولی اللہ جیسی بھی ہیں لیکن ان کے مصلحانہ افکار بھی اسلامی ہند کی روایت پرستی اور تقلید کے خلاف کامیاب نہ ہو سکے۔

سائنٹیفک تعلیم اور عقلیت پسندی کے زوال کا ایک واضح اثر یہ ہوا کہ بارہویں صدی کے بعد تمام عالم اسلامی میں مسلمانوں کے اندر پسماندگی بڑھنے لگی۔ سائنس کے زوال کے ساتھ مادی ترقی کے لئے وہ ابلتے سوت سوکھ گئے۔ اگر سائنٹیفک اور عقلیت پسندانہ تعلیم منظم اور مقبول عام بنائی جاتی جس طرح کہ گیارہویں صدی کے بعد سے مدرسوں کے نظام کو منظم اور مربوط کیا گیا تو اسلامی معاشرہ بھی یورپ کی مانند صنعتی اور تکنیکی انقلاب سے اسی عہد میں گزر چکا ہوتا۔ لیکن مشرف اسلامی میں حالات دوسرا ہی رخ لے چکے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ نظام الملک کے بغداد میں نظامیہ قائم کرنے سے پہلے بھی کچھ مدرسے موجود تھے۔ مثلاً نیشاپور کا مدرسہ جہاں غزالی نے تعلیم پائی۔ لیکن نظامیہ کے قیام کے بعد سے تو سلسلہ مدارس جنگل کی آگ کی طرح عالم اسلام میں پھیلتا چلا گیا۔ شام، عراق، مصر، عرب، وسطِ ایشیاء اور ہندوستان میں ہزار ہا مدرسے کھل گئے۔ ان مدرسوں کے نام اور ان کی تاریخیں متعدد مورخوں نے محفوظ کرلی ہیں۔ مثلاً قاضی نعیمی کی کتاب ''الدارس فی تاریخ المدارس'' میں شام کے مدرسوں کا تفصیل سے ذکر ہے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کے لئے الگ الگ خصوصی مدرسے ہوتے تھے لیکن سب سے بڑی تعداد فقہ کے لئے ہی تھی اور فقہ میں بھی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے مدرسے ہوتے تھے اور اسی طرح اثناء عشری اور اسماعیلی فقہ کے لئے۔

شروع میں کسی ایک خاص فقہی مسلک کو ماننے یا کسی دوسرے کو نہ ماننے کے سلسلہ میں کوئی بہت واضح اصول نہیں تھے۔ مصر کے قاضی اکثر مقدموں میں ایک یا ایک سے زیادہ فقہی مسلک سے مدد لے کر فیصلے کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ صرف ایک مسلک سے وابستگی پر سختی سے عمل ہوتا آیا اور بالآخر امت چار فقہی مذاہب میں بٹ گئی۔ جو شروع میں تو محض قرآن و حدیث کی قانونی توجیہہ یا تفہیم کی ایک کوشش تھی، کچھ فقہا کے ہاتھوں جو بہر حال انسان تھے۔ لیکن پھر وہی انسانی کوشش قانون اور شریعت بن گئی جسے معاشرہ کے مستقل قوانین کا رتبہ مل گیا۔ دین یا عقیدہ کو قوانین اسلام یا شریعت کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا۔ وہ شریعت جو انسانی توجیہات کا نتیجہ تھی پھر ایک مرحلہ پر فقہا کے مابین یہ طے ہوا کہ قرآن اور سنت کا اچھا خاصا مطالعہ ہو چکا ہے اور اب کسی مزید تفہیم و توجیہہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر اجتہاد یا توجیہہ کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے۔ یہ روایت پرستی یا تقلید اسلامی قانون میں ایک اہم عنصر تھی جو اسلامی معاشرہ میں زوال کا باعث بنی کہ یہ شرعی قوانین مسلمان کو کسی بھی نئی چیز سے جو شریعت سے مختلف ہوتی تھی اثر لینے سے روکتے تھے۔ تاہم اس شرعی جکڑبندی کے باوجود جو گویا دین کا درجہ اختیار کر گئی۔ شریعت، تاریخ اسلامی کی ان سارے ادوار میں مسلسل تبدیل ہوتی رہی ہے اور آج قانونِ شخصی (پرسنل لاء) کے سوا یا پھر عبادات کے قوانین کے سواء عملاً ساری کی ساری شریعت مغربی

رنگ میں رنگے ہوئے قوانین اور قانونی تصورات کے لئے جگہ چھوڑ چکی ہے۔

مدارس کا نظام جیسا کہ اوپر کہا گیا ان مختلف فقہی مسلکوں کے مطابق چل رہا تھا۔ ہندوستان میں مدارس کا نظام غزنی سے آئے ہوئے ترکوں کے ہاتھوں شروع ہوا۔ ملتان، لاہور اور دہلی میں مدرسے قائم کیے گئے اور عالم اسلام میں دوسری جگہوں پر جو نصاب چل رہا تھا وہ یہاں بھی رائج ہوا۔

کئی صدیوں تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی الآ یہ کہ کوئی مسلمان بادشاہ کچھ سیکولر عناصر کو بڑھاوا دے دیتا یا تعلیم کو کچھ اور وسعت دے کر نصاب میں طبیعی اور قدرتی علوم کو بھی داخل کرا دیتا۔ ایسی ایک کوشش علاؤالدین خلجی نے کی تھی، ایک ایسی ہی اور کوشش اکبر نے بھی کی جب اس نے ریاضی، ہیئت، فلسفہ اور بعض دیگر علوم کو نصاب کا جز بنایا۔ مگر اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد گھڑی کی سوئی پیچھے کو لوٹ گئی۔ پھر مدرسوں کے نظام میں انیسویں صدی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی.........جب لکھنو کے ملا نظام الدین نے نصاب کو سہل بنایا اور ہر مضمون کے لئے متعدد کے بجائے ایک نصابی کتاب (ٹیکسٹ بک) بطور متن کے مقرر کر دی (پہلے متن بھی کئی کئی تھے حواشی بھی کئی کئی) ملا نظام الدین کے نصاب کو ہندوستان کے اکثر مدرسوں نے اپنا لیا اور یہ درس نظامی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ آج بھی ہندوستان کے ہزاروں مدارس میں یہ سب سے زیادہ رائج نصاب ہے۔ اس کا جھکاؤ سیدھا سادا دینی تعلیم کی طرف ہے اور اب بھی ایسے مدرسوں کا قیام اور امداد خیر وبرکت کا کام سمجھا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی۔ اس چٹان کو پہلی بار علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید نے توڑا جنہوں نے جدید اور سائنٹیفک تعلیم کی ضرورت کا پسماندہ ملت کے لئے احساس کرایا۔ پھر متعدد مسلمان مفکرین اور مصلحین نے امیر علی، شبلی وغیرہ نے مدرسوں کے نظامِ تعلیم میں اصلاح پر زور دیا۔ لکھنو کا ندوۃ العلماء بھی مذہبی دیوبند اور غیر مذہبی (مدرسۃ العلوم) علی گڑھ میں توازن پیدا کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا۔ شبلی کا خیال تھا کہ مذہب کو خارج کر کے یکسر جدید تعلیم دینے کی علی گڑھ والی کوشش اور سائنٹیفک تعلیم کو چھوڑ کے قطعی مذہبی تعلیم دینے کا دیوبند والا انداز دونوں غلط ہیں۔ اسی نصب العین کو سامنے رکھ کے ندوۃ العلماء کا قیام عمل

میں آیا تھا لیکن یہ اپنے مطمح نظر میں ناکام ہو گیا اور ہندوستان کے ان گنت مدارس میں سے ایک مدرسہ ہو کے رہ گیا۔ شبلی اس کے بارے میں بہت پرامید نہیں تھے۔ وہ نظامیہ درس میں بنیادی تبدیلیاں چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اصل مضمون سیکھنے کے بجائے طلباء ان نحوی اور صرفی کج بحثیوں میں پھنسے رہتے ہیں جو شروح اور حواشی لکھنے والوں نے خوب چھیڑ رکھی ہیں۔ اس لئے وہ موجودہ نظام ہی سے قطعی نالاں تھے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ مسلمان طلباء کی بھاری اکثریت جدید یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ لیتی ہے............ مگر اب بھی ہندوستان کے طول و عرض میں چھوٹے بڑے چار ہزار کے قریب یہ مدرسے بھی پھیلے ہوئے ہیں جہاں درس نظامی دیا جاتا ہے۔ طلباء ملت کے مختلف طبقوں سے آتے ہیں لیکن اکثریت ان میں غریب یا یتیم ہوتے ہیں۔ جو اسکولوں کالجوں کی ماڈرن تعلیم کا خرچ نہیں جھیل سکتے مگر یہ تعلیم بہت سے سماجی اور اقتصادی مسائل کا سبب بنتی رہی ہے۔ وہ طلباء جو ان مدارس سے تعلیم مکمل کر کے نکلتے ہیں نہ کسی سرکاری ملازمت کے لئے اپنے کو پیش کر سکتے ہیں نہ کوئی معمولی کام انہیں مل سکتا ہے۔ مسلمانوں میں حکومت کی طرف سے ان کے لئے کسی مذہبی نوکری کا بھی انتظام نہیں ہے۔ نتیجہ میں وہ مفتی، مولوی، پیش امام، موذن، قاضی یا پھر انہیں مدرسوں کے مدرس بن جاتے ہیں۔ بہت سے واعظ کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں (محرم وغیرہ کے مواقع پر) کچھ سیاست میں شامل ہو جاتے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاسی پارٹیوں کے ممبر بن کر ازمنہ وسطیٰ کے سیاسی نظریوں کا احیاء کرنے لگتے ہیں۔ معاشرہ ان کی کوئی ضرورت پوری نہیں کرتا اور وہ معاشرہ کی کوئی ضرورت پوری نہیں کرتے............... سوائے مذہبی معنی کے اس لئے میری رائے یہ ہے کہ حکومت ہندوستانی عوام اور خاص کر مسلمانوں کو یہ کوشش کرنی چاہئے مسلم تعلیم کی یہ دوعملی ہندوستان میں ختم کر دی جائے۔ میری سمجھ میں تنہا حل یہی آتا ہے کہ جدید نصابات جن میں تاریخ جغرافیہ، سائنس، ریاضیات اور جدید زبانیں شامل ہوں ان مدرسوں میں جاری کر دیئے جائیں۔ ساتھ ہی فقہ، حدیث، تفسیر، اسلامی تاریخ اور عربی زبان وادب کو برقرار رکھا جائے تاکہ طالب علم جدید تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم بھی حاصل کرتا رہے اور یہ اندازِ تعلیم کچھ مشکل نہیں ہے۔ عیسائی کانوٹ سلسلہ تعلیم ہمارے سامنے

ہے، جہاں عیسائی اساتذہ ہوتے ہیں اور عیسائی ماحول برقرار رکھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح اسلامی ماحول ان مدرسوں میں برقرار رکھا جائے جہاں اسلامی تعلیم بھی دی جائے اور جدید تعلیم بھی۔ شروع شروع میں یہ تبدیلی کا انداز خود مسلمانوں کی کوششوں سے شروع ہونا چاہئے اور مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس کام میں دل چسپی سے بہت کچھ رضاکارانہ اور بلا معاوضہ کام نکل سکے گا۔ ساتھ ہی ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے مسلم اوقاف کو بھی آگے بڑھ کے اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہئے اور ان مدرسوں کی مدد کرنا چاہئے جو اپنے نصابات کو جدید انداز دینا چاہیں۔ رفتہ رفتہ ایسے مدارس کو جو تجدید کر چکے ہیں ریاستی حکومتوں اور متعدد تعلیمی بورڈوں کی طرف سے تسلیم کر لینا (Recognised) چاہئے۔ ان میں سے کچھ پرائمری اسکولوں کا درجہ لے سکتے ہیں کچھ سیکنڈری یا ہائر سیکنڈری کا، کچھ کالجوں کا اور............ دیوبند یا ندوۃ کی طرح............ کچھ یونیورسٹیوں کا بھی۔ اس طرح ان مدرسوں کو تعلیم و تدریس کے جدید اداروں میں تبدیل کیا جا سکے گا اور غریب مسلمان طلباء مفت تعلیم پا سکیں گے اور ہندوستان کے مفید شہری بن سکیں گے۔

## مولانا سعید احمد اکبر آبادی

ایڈیٹر برہان، صدر شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اسلام میں مجرد علم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید میں آدم کے مسجود ملائکہ ہونے کے استحقاق کی وجہ ہی علم کائنات بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں "وعلّم آدم الا سماءَ کلھا" میں کلھا کی قید خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہئیے۔ مذہب تو نیز ایک مسلمان کی زندگی اور اس کا اوڑھنا بچھونا ہی ہے جس پر اس کی دنیا اور آخرت کی بھلائی موقوف ہے۔ اس لئے دینی علوم و فنون اور اس کے ممد و معاون علوم و فنون سے دل چسپی لینا اور اس سے شغف رکھنا ایک امر طبعی تھا۔ اس کے علاوہ چوں کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ عالم کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا اور اس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر یہ بھی رمایا گیا کہ زمین اور اس کے دریا اور سمندر، جمادات، نباتات اور حیوانات اور اسی طرح عالم بالا لی مخلوقات یعنی سورج، چاند، ستارے اور سیارے وغیرہ یہ سب انسان کی خدمت اور نفع رسانی کے لئے پیدا کئے گئے اور خدا نے ان سب چیزوں کو انسان کے حیطۂ تصرف و اقتدار میں رکھ دیا ہے۔ (وسخر لکم الشمس والقمر دائبین) اس بناء پر مسلمانوں میں ان علوم و فنون کے حاصل کرنے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوا جس کے ذریعہ وہ عالم ارض و سما کی کائنات و مخلوقات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔ علاوہ ازیں اسلام ایک عالمی مذہب تھا اس بناء پر مسلمانوں کو دنیا کی مختلف قوموں اور گروہوں سے ان کی زبان، تاریخ، تمدن، فلسفہ اور ان کی ثقافت سے واقف ہونا ضروری تھا۔ بہر حال یہ وجوہ اور اسباب تھے جن کے باعث مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں کبھی کسی علم اور زبان کو اپنے لئے شجرۂ ممنوعہ نہیں سمجھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق علوم معاش و معاد کی تحصیل کو اپنے لئے فرض کفایہ قرار دیا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة" ایک اور جگہ ارشاد ہوا "اطلبوا العلم ولو کان

بالصین" حضرت زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ حضرت سلمان فارسی سے ایرانیوں کا طریق جنگ دریافت فرمایا۔ آپ کی سیکریٹریٹ میں جو حضرات کام کرتے تھے ان میں عمرو بن العاص اور عمران بن حصین جیسے متعدد اصحاب تھے جو اپنی زبان کے علاوہ متعدد زبانیں جانتے اور ان میں خط و کتابت کر سکتے تھے۔

البتہ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔"**اللھم انی اعوذ بك عن علم لا ینفع**" اے خدا میں اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نافع نہ ہو۔ اس علم سے مراد جفر و رمل اور علم طلسمات و نیز نجات وغیرہ ہیں جن کی بنیاد ظن و تخمین ہے اور جن سے انسانی معاشرہ کے ارتقاء میں کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ انسان اسیر پنجہ اوہام و ساوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس ارشاد میں آپ نے اس کی طرف اشارہ فرمادیا کہ علم کا مقصد نفع رسانی اور خدمت خلق ہے۔ اس بناء پر اگر کوئی شخص ایسا علم حاصل کرتا ہے جو بذات خود ہے تو نافع لیکن یہ شخص اپنے اس علم کے خزانہ پر سانپ بنا بیٹھا ہے اور کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا یا اس علم سے وہ تخریب انسانی کا کام لے رہا ہے تو بے شبہ اس شخص کا علم بھی "**علم لا ینفع**" کی تعریف میں داخل ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی مستفاد ہوتی ہے کہ اسلام میں تحصیل علم کا مقصد کس درجہ اعلیٰ و ارفع ہے اور اس میں کس درجہ ہمہ گیری اور افادیت ہے۔ چناں چہ احادیث میں اس شخص کی مذمت کی گئی ہے جو محض کسب زر اور دنیوی مقصد کے لئے علم حاصل کرتا ہے اور خلق خدا کی خدمت اور ان کی نفع رسائی کا کوئی جذبہ نہیں رکھتا۔

اسلام کی ان تعلیمات اور ان کی اسپرٹ کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے یونان، روم اور ہند و چین کے خزانوں کو کھنگال ڈالا۔ ان کو حیات نو بخشی اور وہ ارسطو کی گاڑی کے قُلی ہو کر نہیں رہے۔ ان کی تشریح کی۔ ان پر نقد و تبصرہ کر کے رطب ویابس کی نشاندہی کی اور ان پر اضافہ کر کے کاروان علم و تحقیق کے لئے پیش قدمی کی نئی نئی راہیں کھولیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں تعلیم قدیم و جدید کا کبھی فرق و امتیاز نہیں ہوا اور انہوں نے کسی علم اور فن کو اپنے لئے اچھوت نہیں سمجھا۔ عربی لٹریچر تو اس کے کارناموں سے پُر ہے۔ انگریزی میں بھی جارج سارٹن کی کتاب History of Science اور اس کے علاوہ Legacy of Islam اور Heritage of the Arabs اور Heritage of Persia وغیرہ جیسی کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علوم دینیہ و اسلامیہ کے علاوہ طبعی اور سماجی اور بنیادی علوم و فنون میں سے

کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جس کے میدان میں انہوں نے شہسوارانہ تگ و تازنہ دکھائی ہو اور اس کے ذریعہ انہوں نے انسانی اجتماع و تمدن کے قافلہ کو آگے بڑھنے میں مدد نہ دی ہو۔

ابتداء میں جب مسلمانوں میں بڑے پیمانہ پر اور منظم طریقہ پر مدارس یا جوامع قائم کرنے کا رواج نہیں تھا مسجدوں میں یا خاص خاص گھروں میں چھوٹے قسم کے مکتب ہوتے تھے جنہیں کتاب یا مکاتیب کہتے تھے۔ یہاں قرآن مجید، عربی زبان اور بعض دوسرے علوم و فنون کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم کو جس علم وفن سے زیادہ دل چسپی ہوتی اور وہ اس میں مہارت پیدا کرنا چاہتا تھا تو وہ مختلف بلاد و احصار کا سفر کرتا تھا جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہر اور اساتذہ شخصی طور پر مصروفِ درس ہوتے تھے۔ اس کے بعد جب مدارس قائم ہونے شروع ہوئے جن میں سب سے بڑا بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا اور اندلس میں قرطبہ غرناطہ اور اشبیلیہ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں تو ان سب علوم کی تعلیم کا یکجائی انتظام ہو گیا۔ ان مدارس یا یونیورسٹیوں میں نصاب تعلیم جن علوم و فنون پر مشتمل ہوتا تھا ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا (۱) علوم نقلیہ (۲) علوم عقلیہ (۳) اور علوم آلیہ۔ پہلی قسم میں دینی علوم وفنون شامل تھے۔ دوسری قسم منطق، فلسفہ، ریاضی، علم ہندسہ، علم نجوم اور طب وغیرہ پر مشتمل تھی۔ اب رہی تیسری قسم تو اس سے مراد وہ علوم و فنون تھے جو علوم نقلیہ اور عقلیہ کے لئے بمنزلہ آلہ یا وسیلہ کے تھے۔ مثلاً صرف و نحو، معانی و بیان وبلاغت، لغت، عروض و قافیہ، تاریخ و جغرافیہ اور شعر و ادب وغیرہ۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا پرانی داستان کا ایک ورق تھا جو گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را کی نصیحت کے مطابق محض تازہ خواہی داشتن ایں داغہائے سینہ راہ کی غرض سے نہیں۔ بلکہ صرف اس مقصد سے سنا دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو ماضی کی روایات سے غیر معمولی عشق ہوتا ہے اور جو ہر منزل میں اسلاف کے نقش قدم کی جستجو اور اس کی پیروی کی آرزو کرتے ہیں وہ اپنے حال کے عمل کو ماضی کے آئینہ میں دیکھ کر معلوم کر سکیں کہ خود اپنے نصب العین کے مطابق وہ کہاں تک صراطِ مستقیم پر ہیں۔ بہر حال مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم اس وقت تک بر قرار رہا جب تک ان میں اس حقیقت کا شعور باقی رہا کہ وہ سارے عالم کے لئے ہیں اور سارا عالم ان کے واسطے ہے۔ اجتہاد و اختراع تحقیق و اکتشافات اور حقائق نو کی دریافت کا جذبہ بے قرار ان میں زندہ و بیدار تھا۔ چناں چہ آٹھویں صدی کے بعد جب ان میں

مختلف اسباب و وجوہ کے باعث ذہنی اور علمی انحطاط پیدا ہونا شروع ہوا اور وہ تقلید و جمود فکر کا صید زبوں بن کر رہ گئے تو اب جو علوم و فنون پہلے سے ان کے نصاب درس میں شامل تھے اور جس ہیئت ترکیبی کے ساتھ تھے وہ انہیں پر قانع ہو کر بیٹھ گئے اور چوں کہ سیاسی اور سماجی طور پر بھی عالمی برادری سے ان کا رشتہ منقطع ہو گیا تھا۔ اس بناء پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں جو عظیم الشان علمی اور صنعتی انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ مسلمان ان سے بے خبر رہے اور دنیا جہان کی طرف سے آنکھ بند کئے اپنے اسی پرانے ڈگر پر چلتے رہے، اقبال نے اس صورت حال کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں کہتے ہیں......... ؎

آتی ہے دم صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح تیرا جوہر ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں — نے گرمئ افکار، نہ اندیشہ بیباک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتہ سلطانی و ملائی و پیری

پہلا دور مسلمانوں کی توسیع و ترقی Expansion and Progress کا دور تھا اور اب سمٹنے سکڑنے Shrinking and Decline کا عہد شروع ہوا تو ان کی ہر چیز دکھی ہو کر رہ گئی ہے۔ چناں چہ ان کا نظام تعلیم بھی رسمی A formality اور بے جان ہو گیا۔ یہ صورتِ حال کسی ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ پورے عالم اسلام پر محیط تھی۔ قاہرہ کا جامعہ ازہر جس نے کبھی ہر علم و فن کے آفتاب و ماہتاب پیدا کئے تھے اس کا گزشتہ صدی کے آخر میں کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ مولانا شبلی کے سفر نامہ مصر و روم و شام سے ہو سکتا ہے۔ بہر حال کہیں کچھ ہو، ہماری آج کی مجلس کا مقصد ہندوستان کے اسلامی مدارس پر گفتگو کرنا ہے۔ اس لئے اب اس سلسلے میں چند معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد جب مسلمانوں کو یہ محسوس ہوا کہ اب ان کا دین اور دنیا دونوں خطرہ میں ہیں تو اب ان میں دو تحریکیں پیدا ہوئیں۔ ایک دیوبند کی جس کو عمر کے اعتبار سے اولیت کا مرتبہ حاصل ہے اور دوسری علی گڑھ کی۔ علی گڑھ تحریک کا مقصد مسلمانوں کی دنیا کو ہلاکت سے بچانا اور محفوظ رکھنا تھا اور دیوبند کا مقصد اور نصب العین صرف ان کے دین کی حفاظت تھا اور چوں کہ ہر مسلمان کو خواہ کیسا ہی دنیادار ہو

دین سے ربط رکھنا ناگزیر ہے اس لئے علی گڑھ نے دنیا کا اہتمام کرنے کے باوجود دینیات کی تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا لیکن دین دار مسلمان کے لئے شاید "دنیا" ایسی کوئی ناگزیر ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے دیوبند نے اس طرف توجہ نہیں کی اور اس نے وہی قدیم نصاب تعلیم کسی ترمیم و تنسیخ کے بغیر اپنے ہاں رائج کر لیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا۔ جو درس نظامی جو فارسی، اردو اور حساب وغیرہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد کم و بیش آٹھ برس کی مدت پر پھیلا ہوا تھا مذکورہ بالا تین قسم کے علوم پر مشتمل تھا۔ یعنی علوم نقلیہ جس کا دوسرا نام علوم دینیہ ہے اور علوم عقلیہ و علوم آلیہ۔ اس نصاب کا مقصد ایسے علماء پیدا کرنا تھا جو اپنے درس و افتا اور تبلیغ و ارشاد کے ذریعہ مسلمانوں کو احکام و مسائل و شرع سے واقف کر سکیں۔ اسلام پر اگر اعتراضات ہوں تو اس کا جواب دے سکیں اور جہالت یا مغربی تعلیم کے باعث جن مسلمانوں کا ایمان اور اسلام خطرہ میں ہو اس کی حفاظت کا بندوبست کر سکیں جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ دیوبند تحریک کو اس میں عظیم الشانی کامیابی حاصل ہوئی۔ دیوبند کے چراغ سے ہندوستان میں ہزاروں چراغ روشن ہوئے اور اسی نہج اور انداز پر ملک کے طول و عرض میں شہر بشہر مدرسے قائم ہو گئے۔ جنہوں نے مغربی تہذیب کے سیل رواں کے بالمقابل ایک نہایت مضبوط اور آہنی دیوار کا رول ادا کیا۔ ان مدارس نے غیر منقسم ہندوستان میں جو کام کیا ہے اس کی حقیقی عظمت کا اندازہ خاکسار راقم الحروف کو الجیریا میں جا کر ہوا جب وہاں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ فرانسیسی استعمار نے اس ملک کے لوگوں کے مذہب، زبان اور کلچر کو کس طرح تہس نہس کر کے رکھ دیا تاکہ یہ لوگ فرانسیسی قومیت کا جز بن جائیں۔ ہمارے مدارس کی یہ خدمت بے شبہ بڑی اہم اور لائق افتخار ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک خاص قسم کے نصاب اور ایک خاص ماحول' فضاء اور طرز رہائش کے باعث یہ مدارس عمومی طور پر ایسے افراد کو پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں جو عہد حاضر کے علمی' سماجی اور تہذیبی مسائل و معاملات میں اپنی شان کے مطابق مسلمانوں کی مثبت قیادت کا فرض ادا کرنے کے قابل ہوں' علماء کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ عوامی سطح پر اسلام کی تبلیغ یا وعظ و ارشاد کریں۔ کتب درسیہ کی تعلیم دیں' انہیں کتابوں کے حواشی اور شرح لکھیں اور یا در مختار اور شامی اور فتح القدیر کی اساس پر فتاویٰ لکھیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ خود اپنے علوم و فنون پر ناقدانہ اور مجتہدانہ نظر رکھیں اور جدید علوم و فنون اور جدید

تہذیب کے پیدا کردہ مسائل' معاملات جن کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے ان سب میں مسلمانوں کی علمی اور ذہنی قیادت کریں۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں یہ کوتاہی خواہ کچھ ایسی زیادہ محسوس نہ ہوتی ہو لیکن اب جب کہ ہم آزاد ہیں اور اس کی ضرورت ہے کہ ہماری سوسائٹی کا کوئی جز ایسانہ ہو جو قومی دھارے سے الگ رہ کر تنہائی اور گوشہ گیری کی زندگی بسر کرے اور اس کے وجود اور شخصیت سے جو توقعات ہو سکتی ہیں ان کی تکمیل نہ کرے تو یہ صرف کسی ایک جز کا نہیں بلکہ کل کا نقصان ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم استعمار کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنے نظام تعلیم پر توجہ کرتی اور حسب ضرورت و موقع اس میں ردوبدل کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم جائزہ لیتے ہیں تو اسلامی مدارس کے نصاب میں متعدد خرابیاں اور نقائص نظر آتے ہیں۔ ان نقائص کو مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) مدت درس۔

(۲) علوم درس۔

(۳) کتب درسیہ۔

(۴) طریق درس۔

## مدت درس

مدارس عربیہ میں مدتِ درس عام طور پر آٹھ برس ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کی درجہ بندی نہیں ہوتی۔ پوری تعلیم ختم ہونے کے بعد فارغ التحصیل کو ایک سند دے دی جاتی ہے۔ اس کا نہ کوئی ٹائٹل ہوتا ہے اور نہ نام۔ اصولِ تعلیم کے لحاظ سے یہ طریقہ غلط ہے تعلیم کے مختلف مدارج ہونے چاہئیں۔ مثلاً ابتدائی' وسطیٰ' علیا' پھر طلباء کے بھی دو حصے ہونے مناسب ہیں۔ ایک علیا (الف) اور دوسرا علیا (ب) اور ان دونوں کا الگ الگ نام مقرر کرکے مثلاً عالم اور فاضل ان کی مدتِ تعلیم تعین اور ان کا ایک مستقل امتحان ہونا چاہئیے۔ علیاء کے بعد ایک درجہ تخصص کا ہونا ضروری ہے تاکہ جو طالبِ علم کسی ایک خاص فن میں درک و کمال حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کر سکے اور ہر مرحلہ کی تکمیل کے بعد یہ محسوس کرکے اس میں خوداعتمادی پیدا ہو کہ اس نے اپنے سفر کی ایک منزل طے کرلی ہے۔ تعلیم کے ان مراحل و

منازل اور ان کے مقاصد کے پیش نظر مدت تعلیم کا تعین ہونا چاہیے۔ یہ کل مدت چودہ برس بھی ہو سکتی ہے اور سولہ برس بھی۔

## علوم درس

مدارس میں جو علم پڑھائے جاتے ہیں ان میں عقلیہ بھی ہیں۔ یعنی منطق' فلسفہ اور ہیئت۔ یہ سب علوم مولانا حالی کے بقول اب یونان کا دفتر پارینہ بن چکے ہیں۔ ان کی افادیت علمی اور تحقیقی اعتبار سے غیر معتبر قرار پا چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیم پر ایک طالب علم کا بہت کافی وقت صرف ہوتا ہے ضرورت ہے کہ ان کو خارج کر کے ان کی جگہ علوم جدیدہ رکھے جائیں تاکہ مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل آج کل کے اہلِ علم سے ان کی زبان میں گفتگو کر سکیں۔ البتہ چوں کہ ہمارے اسلاف کی بعض کتابوں کا سمجھنا قدیم منطق اور فلسفہ کے جاننے پر موقوف ہے اس لئے ان دونوں علوم کا ایک مختصر نصاب جو ایک برس میں ہی پورا ہو جائے اگر شامل درس رہے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں منطق میں صغریٰ کبریٰ اور مرقاۃ اور فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ اور میبذی بہت کافی نہیں۔

## کتب درس

علوم عقلیہ کے علاوہ علوم کی باقی دو قسمیں یعنی علوم نقلیہ اور علوم آلیہ جو پڑھائے جاتے ہیں تو ان کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن ان علوم کی تعلیم کے لئے جو کتابیں نصاب میں رکھی گئی ہیں ان پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ مثلاً عربی صرف و نحو اور معانی و بیان کی تعلیم پر ایک طالب علم کا جو وقت صرف ہوتا ہے وہ بہت زیادہ ہے اور پھر بھی جو حاصل ہوتا ہے وہ بہت کم ہے اس سلسلہ میں کافیہ اور شرح جامی جیسی کتابیں نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ اصل مقصد کے لئے نقصان رساں ہیں کیوں کہ طالب علم کی ساری توجہ ان کتابوں کی ادق اور پیچیدہ عبارتوں کا مطلب سمجھنے پر مرکوز رہتی ہے۔ قاہرہ اور دوسرے ملکوں میں اب کثرت سے ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں یہ جدید فن کی تعلیم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

نظم کی کتابوں کا یہ ہے کہ یہ سب کتابیں پرانی' دقیانوسی اور از کار رفتہ ہو چکی ہیں۔ حماسہ اور دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ بیشک بہت اہم کتابیں ہیں لیکن ایک پوری کتاب کو شامل

کورس رکھنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ قدیم و جدید دواوین کے انتخابات پڑھائے جائیں تاکہ طالب علم عربی شاعری کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی یہ ہی ہونا چاہئے۔ آج عربی نثر کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اِن سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ پھر ادب کے ساتھ تاریخ ادب نہ پڑھانا ایک حد درجہ افسوس ناک کوتاہی ہے۔ اسی طرح نقد نثر و نظم پر بھی ایک دو کتابیں ہونی ضروری ہیں۔ علوم دینیہ میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ اصول فقہ اور اصولِ حدیث اور اصولِ تفسیر پر اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں دستیاب ہیں۔ اصولِ الشاشی 'نور الانوار' نخبۃ الفکر اور الفوز الکبیر پر اصرار کرنا روشن ضمیری کی دلیل نہیں ہے۔

## طریقِ درس

اب لیجئے طریقِ درس۔ تو اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مدارس میں اساتذہ اور طلباء دونوں تمام تر توجہ کتابوں پر اور ان کے ضمائر کے مراجع اور عبارتوں کا مطلب ملوم کرنے پر مرکوز رہتی ہے۔ گویا طالب علم فن نہیں پڑھتا کتاب پڑھتا ہے اور اس کو سمجھ لینے کو ہی اپنے لئے معراجِ کمال جانتا ہے۔ میں بعض ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جو اس پر فخر کرتے تھے کہ انہوں نے شرح جامی گیارہ مرتبہ اور مقامات حریری دس مرتبہ پڑھی ہے اور انہیں رٹا ہے۔ اسی طریق درست کا نتیجہ یہ ہے کہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی طالب علم کو فن نہیں آتا اور اس کا ذہن تخلیقی Creative ہونے کے بجائے محض تقلید میں Receptive ہو کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو بدل کر لیکچر دینے کا طریقہ رائج کیا جائے اور طلبہ میں خود مطالعہ اور غور و فکر کا مادہ پیدا کیا جائے۔

اسلامی مدارس کے عام نصاب میں جو نقائص ہیں اور جن کی اصلاح ضروری ہے۔ اس کا مختصر بیان تو ختم ہوا۔ اب اس سلسلہ میں مزید گزارشیں کرنا ضروری ہیں۔

اوپر کہا گیا ہے کہ علوم عقلیہ کی جگہ علوم جدیدہ یا بالفاظ صحیح تر علوم عصریہ کا اضافہ ہونا چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ علوم سب کی سب تو داخل نصاب ہو نہیں سکتے تو پھر کن علوم کا انتخاب کیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ ظاہر ہے اسلامی مدارس کا مقصد انجینئر' ڈاکٹر' سائنس

دان' قانون دان اور ماہر تجارت پیدا کرنا نہیں ہے۔ اس بناء پر مدارس کے درس نظام میں علوم جدیدہ میں سے صرف وہی مضامین داخل نصاب ہونا چاہئے جو یونیورسٹیوں میں فیکلٹی آف آرٹس اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے تحت میں آتے ہیں۔ مثلاً اقتصادیات' فلسفہ' سیاسیات' سائنس' تاریخ' ریاضی' جغرافیہ' شہریت ہے۔ ان کے علاوہ مدارس کے طلباء کو جنرل سائنس اور بلدیات سے بھی ناواقف نہ رہنا چاہئے۔ مذکورہ بالا علوم کے علاوہ انگریزی' جرمنی یا فرانسیسی زبان کا جاننا اور اس کے ادب سے واقف ہونے کی بھی سخت ضرورت ہے کیوں کہ یہ تینوں زبانیں علمی و ادبی ذخائر سے مالا مال ہیں اور آج یہ عالم ہے کہ کسی ایک اسلامی یا دینی' موضوع پر بھی ریسرچ ان تینوں میں سے کم از کم کسی زبان کے علم کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ عصر حاضر کے تقاضے کیا ہیں؟ اور دنیا کی ہوا کا رخ کیا ہے؟ اس کا بھی صحیح اندازہ کسی ایک ترقی یافتہ مغربی زبان کو جانے بغیر نہیں ہو سکتا۔

حضرات! میں نے اس مقالہ میں چند اصلاحی تجاویز پیش کی ہیں لیکن ان کا کوئی مکمل خاکہ پیش نہیں کیا۔ یعنی میں نے یہ نہیں بتایا کہ ابتدائی وسطیٰ اور علیا میں کون کون سے مضامین اور کس ترتیب سے پڑھائے جائیں۔ میرے لئے ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ نہایت مکمل اور مفصل طریقہ پر میں اپنے رفقائے کرام کی مدد و اعانت سے کر چکا ہوں اور وہ شائع بھی ہو گیا ہے۔ غالباً آپ حضرات کو علم ہو گا کہ جس زمانہ میں پروفیسر ہمایوں کبیر مرکزی وزیر اور سینٹرل وقف کونسل کے صدر تھے انہوں نے سینٹرل وقف کونسل کی ایک کمیٹی بنائی تھی جس کا کام وہی تھا جو آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے۔ اس پہلی میٹنگ سے خود پروفیسر موصوف نے خطاب کیا اور مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی ضرورت پر پُر مغز اور پر زور تقریر کی۔ اس کے بعد اس کمیٹی نے تشکیل نصاب کے لئے ایک سب کمیٹی بنادی جو صرف تین افراد پر مشتمل تھی۔ خاکسار راقم الحروف کا اس سے تعلق یہ تھا کہ وہ کمیٹی اور سب کمیٹی دونوں کا صدر تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کئی ماہ کی سخت محنت کے بعد جب سب کمیٹی نے جدید نصاب بنا کر کمیٹی کے سامنے پیش کیا تو کمیٹی کی اس میٹنگ میں تعلیم جدید کے نمائندے پروفیسر فیضی' پروفیسر محمد اجمل خان' مسٹر اسد اللہ کاظمی اور تعلیم قدیم کے نمائندے مولانا قاری محمد طیب دیوبند' مولانا محمد میاں فاروقی اور پرنسپل عبدالوہاب بخاری یہ سب موجود تھے۔ ان سب حضرات نے اس نصاب کی بڑی تعریف کی

اور اسے منظور کر لیا۔ اس کے بعد جب یہ نصاب سینٹرل وقف کونسل کی میٹنگ میں پیش ہوا جس کی صدارت مسٹر فخر الدین علی احمد کر رہے تھے تو اس موقع پر پروفیسر ہمایوں کبیر نے پھر ایک پرزور تقریر کی اور جدید نصاب کی تشکیل پر اپنی غیر معمولی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ نصاب مسلمانوں کی قدیم تعلیم کی تاریخ میں ایک نہایت اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور بڑی عجیب اور خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کو قدیم اور جدید دونوں طبقوں کی منظوری اور رضامندی حاصل ہے۔ یہ نصاب سینٹرل وقف کونسل کی طرف سے میرے قلم سے چند صفحات کا مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا گیا ہے اور ہر شخص اسے دیکھ سکتا ہے۔

حضرات! مدارس کے لئے جب نصاب جدید ہوگا تو اس کی تنفیذ کے لئے اور بھی بہت سی چیزیں کرنی ہوں گی۔ مثلاً مدارس کے لئے تعمیر' اساتذہ کی تنخواہیں' طلباء کے وظائف' طلباء کے رہن سہن کے طور طریقے' ان کے لئے کھیلوں اور ورزش کا انتظام' لائبریری وغیرہ۔ ان تمام چیزوں میں بھی حسب موقع و محل اصلاح کرنی ہوگی اور اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ جب طلباء اس نصاب کی تکمیل کر کے مدارس سے نکلیں تو سماج میں ان کی ایک وقیع حیثیت ہو اور ان کے لئے معاش کو حاصل کرنے کی بھی ایک دو نہیں متعدد اور باوقار راہیں کھلی ہوئی ہوں۔ اگر ہم یہ کر سکیں تو صرف ایک طبقہ' ایک فرقہ کی خدمت نہیں ہو سکے گی بلکہ پورے ملک کی اور اس سے بھی بڑھ کر انسانیت کی اہم خدمت ہوگی۔

# وقف کونسل کے مرتبہ نصاب کا مقدمہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

ہمارا قدیم نصاب تعلیم جو عربی مدارس میں ایک عرصہ سے رائج اور متداول ہے تین قسم کے علوم و فنون پر مشتمل ہے۔ ایک علوم دینیہ جس میں تفسیر' حدیث' فقہ اور علوم الفرائض داخل ہیں۔ دوسرا علوم آلیہ مثلاً صرف و نحو' معانی بیان و بلاغت اور عربی ادب وغیرہ۔ تیسری قسم علوم عقلیہ کی ہے جیسے منطق' فلسفہ' ہیئت و ہندسہ وغیرہ۔ ہمارے جن بزرگوں نے یہ نصاب بنایا تھا ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اصل مقصد تو علوم دینیہ کی تعلیم ہے۔ جن کی تحصیل کے بعد قوم میں علمائے دین پیدا ہوں اور اپنے علم و عمل سے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کی خدمت انجام دیں۔ اسلامی علوم و فنون کی تبلیغ و اشاعت کریں اور اگر اسلام کی تعلیمات پر کسی طرف سے کوئی اعتراض ہو تو وہ اس کا خاطر خواہ جواب دے سکیں۔

ہندوستان میں جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے اقتدار اور ان کی حکومت کے قیام کے بعد ملک کے حالات میں عظیم تبدیلی پیدا ہوئی تو اس تبدیلی کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ملک میں انگریزی اور مغربی علوم و فنون کا رواج ہوا اور اس کے نتیجہ میں جدید افکار و خیالات کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔

ہمارے عربی مدارس جو اس انقلاب عظیم کے بعد قائم ہوئے ان کا چوں کہ اساسی مقصد مسلمانوں کو مذہبی اعتبار سے اس سیاسی انقلاب کی زد سے محفوظ رکھنا تھا اس بناء پر انہوں نے افکار و نظریات کے اس تغیر و تبدل اور اس کے علمی و تعلیمی اسباب کو در خود اعتناء نہیں سمجھا اور اس بناء پر اپنے اس قدیم نصاب تعلیم پر قناعت کئے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں علوم دینیہ کے بڑے بڑے فاضل اور ماہر علماء پیدا ہوئے جنہوں نے تصنیف و تالیف' درس و

تدریس و عظ وارشاد اور افتاء کے میدانوں میں اہم اور یادگار خدمات انجام دیں۔ ایسے مشائخ پیدا ہوئے جن کی روحانی تربیت اور باطنی تعلیم و تلقین سے ہزاروں مسلمانوں نے فیض پایا۔ بہت سی جاہلانہ رسومات جو ان کی سماجی زندگی کا جزء ہوگئی تھیں ان کی اصلاح کی اور ملک میں مذہب کا وقار باقی رکھا۔ لیکن اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ کے نام سے دو مستقل گروپ پیدا ہو گئے جو باہم ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ بعض حضرات نے ملی اور قومی مفاد کے پیش نظر اس خلیج کو پر کرنے کی سعی کی لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور صورت یہ ہو گئی کہ جو حضرات کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل ہوتے تھے وہ مذہب اور اس کے علوم و فنون سے ناآشنا اور بے خبر تھے اور اسی طرح جو حضرات طبقہ علماء میں شمار ہوتے تھے انہیں نہ انگریزی زبان سے واقفیت تھی اور نہ کسی مغربی علم و فن سے۔ اس بناء پر اول الذکر طبقہ مغربی افکار و نظریات سے غیر معمولی حد تک متاثر ہونے کے باعث مذہب اور اس کی روایات سے دور ہو گیا اور دوسری جانب ہمارا طبقہ علماء وقت کے تقاضوں اور جدید مطالبات سے ناواقف رہا اور تعلیم یافتہ طبقہ پر اس کے اثرات روز بروز کمزور ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں عصر حاضر کے علمی رجحانات اور فکری امتیازات سے انجان رہنے کی باعث اس طبقہ کو فکر و نظر کے میدان میں جو رہنمائی دینی چاہیے تھی وہ نہ دے سکا۔ اس میدان میں اس کی عاجزی اس حد تک پہنچ گئی کہ نہ وہ خود عصر جدید کی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا اور نہ اپنی زبان کسی کو سمجھا سکتا تھا۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں مستشرقین کی اور بعض خود مسلمان علماء و فضلاء کی کوششوں سے اسلامی علوم و فنون کا عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور اس بناء پر آج عالم یہ ہے کہ کسی خاص اسلامی موضوع پر بھی ریسرچ اور تحقیق کا حق انگریزی، فرانسیسی یا جرمنی زبان سے واقفیت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا یہ طبقہ اس عظیم ذخیرہ سے بے خبر تھا اور جب وہ اس کا علم ہی نہیں رکھتا تھا تو اس پر نقد و تبصرہ کی توقع اس سے کیوں کر ہو سکتی تھی۔ یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہر حساس اور صاحب فکر و نظر مسلمان اچھی طرح جانتا ہے کہ اس صورت حال کے باعث نہ صرف مسلمان کو بہ حیثیت ایک فرقے کے بلکہ خود اسلام کو کس درجہ عظیم نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی عرصہ دراز کی مسلسل جدوجہد اور کوششوں کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

خوشی کی بات ہے گزشتہ جنگ عظیم دوم کے بعد سے ایشیاء اور افریقہ میں آزادی کا نیا

دور شروع ہوا اور ہر ملک میں تعمیر و تنظیم، تعلیم اور دوسرے قومی مسائل کی از سرِ نو تشکیل کی طرف عام توجہ مبذول ہوئی تو جہاں تک مسلمانوں کے معاملات و مسائل کا تعلق ہے علماء میں مدارس عربیہ و دینیہ کے قدیم نصابِ تعلیم کے نقص کا قوی احساس بھی پیدا ہوا اور اس نقص کو دور کرنے کی غرض سے اصلاحی کوششوں کا آغاز ہوا۔ چناں چہ گزشتہ چند برسوں میں مسلم ممالک میں عموماً اور عرب ممالک میں خصوصاً ان مدارس میں جو تعلیمی اور تنظیمی اصلاحات ہوئی ہیں انہوں نے ان مدارس کو ایک نئی شکل و صورت اور ایک نئی تب و تاب بخشی ہے۔ یہ سب کوششیں ایک ہی قسم اور ایک ہی نوعیت کی نہیں ہیں۔ کہیں افراط بھی ہے اور کہیں تفریط بھی۔

یہاں ان کے تفصیلی جائزہ لینے اور ان پر نقد و تبصرہ کرنے کا موقع نہیں ہے ان کے ذکر سے مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے مدارس دینیہ کی اصلاح کا مسئلہ اب کوئی ایسی مخفی حقیقت نہیں ہے جس کا احساس صرف چند اربابِ فہم و بصیرت تک محدود ہو بلکہ اب یہ احساس عالم گیر ہے اور اس سلسلہ میں ہر جگہ اقدامات ہو رہے ہیں۔

ہمارا ملک اک وسیع ملک ہے جس میں چھ کروڑ کے لگ بھگ مسلمان آباد ہیں۔ ان کے جو مدارس عربیہ ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ تقسیم سے قبل جن مدارس کو مرکزی اور نمایاں حیثیت تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس ملک کے مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی کی تعمیر و تشکیل کی راہ میں جن مدارس نے بہت اہم رول ادا کیا تھا وہ اکثر و بیشتر تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں ہیں اور اپنے فرائض با حسن وجوہ انجام دے رہے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ان مدارس کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی جائے تاکہ جدید حالات اور نئے قومی و بین الاقوامی مطالبات کے پیش نظر آج جس قسم کے علماء کی ضرورت ہے وہ ان مدارس سے پیدا ہو سکیں اور ان مدارس کی افادیت کا دائرہ وسیع تر ہو۔

جہاں تک مدارس کی اصلاح کے مقصد اور غرضِ اساسی کا تعلق ہے اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ مدارس کی غرض و غایت انجینئر، ڈاکٹر یا علوم جدیدہ کے ماہر پیدا کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد علمائے دین ہی پیدا کرنا ہے اور اصلاح سے غرض صرف یہ ہے کہ یہ علماء دین وہ ہوں جو پاک اوصاف عملی زندگی کے ساتھ ایسی علمی استعداد بھی رکھتے

ہوں کہ وہ عصر جدید کی زبان سمجھ سکتے اور اس میں اپنی بات سمجھ سکتے ہوں۔ علوم جدیدہ سے اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرنے کی صلاحیت سے محروم نہ ہوں اور شہری زندگی میں اپنی ضروریات کسی دوسرے کی مدد کے بغیر خود پوری کر سکتے ہوں۔

علاوہ ازیں ہم اپنے قدیم نصاب تعلیم پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں چند اور نقائص نظر آتے ہیں مثلاً

(۱) علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے جو کتابیں اور جس ترتیب سے رکھی گئی ہیں وہ مقصد کے حصول کے لئے کافی نہیں ہیں۔ پھر ان کا جو طریق تعلیم ہے وہ بھی ناقص ہے۔ طالب علم کا واسطہ صرف کتاب سے رہتا ہے فن سے نہیں۔ اس بناء پر کتاب کی جزئیات پر وہ حاوی ہوتا ہے لیکن فن کے اصول و فروع اور اس کے آداب و مبادی پر اس کی نظر نہیں ہوتی۔

(۲) علوم آلیہ یعنی صرف نحو' معانی' بیان و بلاغت اور عربی ادب وغیرہ۔ اس سلسلہ میں دو قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایک طریق تعلیم میں اور دوسری کتب درسیہ میں۔ اول الذکر میں اس لئے کہ ہمارے طلباء عربی ادب میں مقامات' سبعہ معلقہ اور دیوان متنبی وغیرہ پڑھ جانے کے باوجود عربی زبان میں نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں' اب رہیں کتب درسیہ تو ظاہر ہے عربی ادب پر اب بہتر سے بہتر کتابیں یا ان کے منتخبات چھپ کر آگئے ہیں۔ یہی حال صرف و نحو اور معانی و بیان کا ہے۔ تو پھر ان کتابوں سے کیوں نہ استفادہ کیا جائے جن سے علوم آلیہ کے درس کے مقصد کی تکمیل زیادہ بہتر طریقہ پر ہو سکتی ہے۔

(۳) علوم عقلیہ کے سلسلہ میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مصداق ہیں۔ ایک طالب علم کی عمر کا بہترین حصہ اس کی تحصیل و تعلیم پر خرچ ہوتا ہے لیکن ان کا فائدہ کچھ نہیں۔ اگر ان علوم کی جگہ جدید معاشرتی یا فطری علوم وفنون (Social, Natural Sciences) میں سے وہ علوم و فنون پڑھائے جائیں جن کی آج کل سخت ضرورت ہے اور جن کے بغیر آج کل کی اصطلاح میں کسی شخص کو تعلیم یافتہ کہنا مشکل ہے تو ہمارے مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل حضرات آسانی سے علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ سے بھی آشنا ہو سکتے ہیں۔

سینٹرل وقف کونسل نئی دہلی نے اپنی میٹنگ منعقدہ ۲۸/۲۷ فروری ۱۹۶۵ء میں پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب چیئرمین سینٹرل وقف کونسل سے درخواست کی کہ وہ ایک ایسی

کمیٹی بنائیں جو ملک کے مدرسوں و مکتبوں کی موجودہ تعلیمی حالت کا جائزہ لے اور ان مدارس کی اصلاح اور ترقی کے لئے سفارشات پیش کرے۔ پروفیسر موصوف نے اس تجویز کے مطابق ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی۔ کمیٹی نے موضوع زیر بحث کے متعلق تبادلہ خیالات کرنے کے بعد ایک اپنی سب کمیٹی مقرر کی جس کے لئے ممبر حضرات ذیل تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی' مولانا سید علی نقی نقوی' مولانا ابو عرفان ندوی اور کمیٹی مندرجہ ذیل نتیجہ پر پہنچی۔

ہم نے مدت تعلیم سولہ سالہ رکھی ہے۔ یہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہمارے یہاں جو طلباء آئیں گے وہ پرائمری ایجوکیشن کی تکمیل کے بعد آئیں گے ہم نے اس سولہ سالہ سال کی مدت کو چار حصوں پر تقسیم کیا ہے۔

۱۔ شروع کے ۵ سال پرائمری (مکتب)

۲۔ "ثانویہ" جس کی مدت ۵ سال ہو گی۔

۳۔ "عالیہ" جس کی مدت ۴ سال ہو گی۔

۴۔ "تخصص" جس کی مدت ۲ سال ہو گی۔

ہمارا "ثانویہ" ہائی اسکول کے برابر ہو گا۔ "عالیہ" بی اے کے مساوی اور "تخصص" ایم اے کے مساوی ہو گا۔ نصاب کی تشکیل میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے کہ "ثانویہ" کے درجہ تک سب طلباء کو دینیات اور عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید مضامین مثلاً ہندی' حساب' جغرافیہ' اردو' فارسی اور آخر کے درجات میں تاریخ و سائنس اور انگریزی بھی اس حد تک پڑھا دیئے جائیں کہ ایک ہائی اسکول کے طالب علم کو ان مضامین میں جو قابلیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ہمارے یہاں کے طلباء کو بھی حاصل ہو' ایک مضمون کے گھنٹے تدریجی طور پر مختلف سالوں میں گھٹتے بڑھتے رہے ہیں اسی بناء پر تعلیمی اوقات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے طالب علم کے دماغ پر غیر معمولی بوجھ پڑتا مگر ان مضامین سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد "عالمیت" میں بنیادی علوم و فنون تو علوم عربیہ و دینیہ ہی ہیں لیکن قدیم نصاب تعلیم میں علوم عقلیہ یعنی منطق' فلسفہ اور ہیئت وغیرہ پر جو وقت صرف ہوتا تھا اس کو ہم نے جدید علوم کی تعلیم کے لئے لیا ہے اور اس طرح اس نصاب کو پڑھنے کے بعد ایک طالب علم جب عالمیت کا امتحان پاس کرے گا تو اس کو علوم دینیہ و عربیہ میں بصیرت کے ساتھ جدید علوم میں بھی دسترس ہو گی۔ عالمیت سے فراغت کے بعد دو سال تخصص کے

ہیں۔ تخصص پانچ مضامین میں ہوگا چوں کہ اس میں پوری توجہ مضمون متعلقہ پر ہوتی ہے اسی بناء پر اس مضمون کے ساتھ کسی دوسرے مضمون کی تعلیم نہیں دی جاسکتی لیکن خود اس مضمون کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اس کو آٹھ حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ ہر حصہ کے لئے الگ الگ ایک پرچہ ۱۰۰ نمبر کا رکھا گیا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ تخصص میں تفسیر حدیث فقہ کے علاوہ عربی ادب اور تاریخ میں بھی تخصص رکھا گیا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ عالمیت کی تکمیل کے بعد ایک طالب علم کو علوم دینیہ وعربیہ ایک بڑی حد تک توآہی جاتے ہیں اب اس کے بعد اگر غیر دینی علوم میں یعنی تاریخ یا عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کا امکان پیدا کیا گیا ہے۔ یہ گنجائش اس لئے رکھی گئی ہے کہ طلبہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق علمی ترقی کرسکیں۔

# علامہ امتیاز علی عرشی

مرتبہ۔ تفسیر ثوری

پہلے انہیں تعلیم گاہوں کے نکلے ہوئے فاضل مختلف عہدوں پر کام کرتے تھے۔ وہ بات تو اب جاتی رہی کہ قاضی بھی ہو سکے' مفتی بھی ہو سکے۔ اب یہ اسلامی تعلیم والے دُنیا کی زندگی سے واقف نہیں اور دوسرے طریقہ کے پڑھنے والے دین کے بارے میں نہیں جانتے۔ ہمارے یہاں دورنگی تعلیم کا یہ سلسلہ پہلے نہیں تھا۔ اب تو گویا دو الگ طبقے بن گئے ہیں۔ اس میں خالص نئی تعلیم والوں کو یہ نقصان پہنچا کہ قدیم درس گاہوں سے نکلے ہوؤں کو انہوں نے حقیر سمجھا' تو جن فنون کے اندر وہ واقعی استعداد رکھتے تھے ان سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا اور ان لوگوں کو یہ نقصان پہنچا کہ جو کچھ وہ پڑھتے پڑھاتے آرہے تھے انہوں نے اسی کو آخری حرف سمجھ کر اکتفا کر لیا۔ اب یہ نہیں سوچا کہ وحی آنے کی تو اب گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ اب تو خود ہی پچھلوں کی دی ہوئی روشنی میں آگے بڑھنا ہوگا اور یہ طے کرنا ہوگا کہ ان علوم کو چھوڑنا چاہیے اور ان علوم کو پڑھنا چاہیے۔

مثلاً ہمارے یہاں پرانی تعلیم ہے کہ زمین ساکن ہے۔ مولانا آزاد کے والد نے ایک رسالہ اسی سلسلہ میں لکھا تھا اس میں حرکتِ زمین کے ابطال کے لئے تین سو دلیلیں ہیں۔ حتیٰ کہ شروع میں سرسیّد نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ حرکت ابطال ثابت کرنے کے لئے لکھ ڈالا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اب داستانِ پارینہ ہو گئی یا نہیں؟ تو ضرورت تھی اس کی کہ جائزہ لیتے کہ کن فنون کی ضرورت ہے۔ ان میں سے کچھ کام کے بھی نکل آتے۔

نئے نئے مسائل پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اب یہ خلاء میں انسان کے جانے سے روزے کے بارے میں' نماز کی سمت کے بارے میں' اور کتنے ہی مسائل ہیں اگر وہاں کی مخلوق کو ضرورت ہے اجتہاد کی تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے۔ یہ جائزہ لینے کے بعد کہ کس طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے' اس کی طرف زیادہ توجہ دی جائے اور جس کی

طرف کم توجہ دینے کی ضرورت ہے ادھر کم توجہ دی جائے اور یہ جو علوم غیر دینی ہیں ان میں سے اپنے یہاں جو علوم پڑھاتے چلے آرہے ہیں (جن کو دینی کہتے ہیں!) ان کو تاریخی حیثیت دے دی جائے' موجودہ تحقیقات کے اعتبار سے ان کو پڑھانا ہوگا۔

اور سب سے بڑی ضرورت تو اس کی ہے کہ......... جیسے کہ فخر الدین رازی کے زمانے تک جو علم کلام ہوتا تھا' اس میں اپنے زمانے کے مسائل سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی اب تو نیا علم کلام پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ میں ایک مثال دیتا ہوں :

میری دانست میں قرآن پاک کے کسی بیان میں اور مسلمہ حقائق میں کوئی تناقض نہیں ہے؟ کسی قسم کا! قرآن مجید جس زمانہ میں نازل ہوا ہے کچھ باتیں ایسی تھیں جو مسلمہ قوم کا درجہ رکھتی تھیں' قرآن مجید نے اپنی تعلیم پر عمل کرانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں ان میں ان مسلمات قوم کو بھی استعمال کیا اور دلیل میں پیش کیا۔ آج قرآن پاک نازل ہوتا تو اور انداز ہوتا اس کا۔ قرآن مجید میں لکھا ہوا ہے کہ سات آسمان ہیں اور کوئی پوچھے کہ سات آسمان آپ کیسے کہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن قرآن پاک کا مقصد ایسٹرونومی تھی۔ اس کی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔ وہ تو....... یہ کہنا چاہتا تھا کہ خدائے تعالیٰ ہی زمین و آسمان سب کا بنانے والا ہے' وہ ایک ہے اور اسی کو سجدہ زیبا ہے....... قرآن پاک کے اندر جو کچھ بیان کیا گیا ہے مگر ایک حقیقت نفس الامری ہے اور ایک حقیقت مسلمہ قوم ہے۔ قرآن پاک حقیقت قوم سے کام لے رہا ہے۔ اب یہ سمجھنا کہ وہ مسلمات قوم' مسلمات نفس الامری کا درجہ رکھتے ہیں' غلط ہے۔ اگر اس زمانہ میں آج کے مسئلے اٹھا دیئے جاتے تو وہ لوگ جو رسول ﷺ کو ویسے ہی دیوانہ کہتے تھے' کوئی سننے کو تیار ہوتا۔ یہ بات کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ (وغیرہ)

ایک اور مثال دوں :

آپ نے دیکھا ہوگا' نماز پڑھ کے امام شمال کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ ایک عزیز اس کی وجہ پوچھنے لگے تو انہیں بتایا گیا کہ اِدھر مدینہ منورہ ہے۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھا میں نے کہا بھائی ادھر تو نینی تال ہے' ہمالیہ ہے' تبت ہے' روس ہے' مدینہ ادھر کیسے ہو گیا۔ انہیں تعجب ہوا تو میں نے کہا نقشہ یوں ہے۔ اب دیکھئے ہم یہاں رہتے ہیں' طے ہے یہ! میں نے کہا۔ مدینہ اور مکہ کے درمیان تین سو میل کا فاصلہ ہے صرف! تو یہ تین ہزار یا چار ہزار میل پر جو آدمی کھڑا ہے اس کے لئے سمت یہی رہے گی نا! برابر ہی برابر میں ہوں گے وہ!

اور مدینہ کا آپس میں جو فرق ہے وہ ٹھیک ہے' یعنی مکہ سے شمال میں ہے مدینہ۔ اگر مکہ میں
ں آدمی ہو اور وہ یہ کہے کہ میں ادھر پیٹھ نہیں کرتا تو وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بات میں نے
ہ بنا کے سمجھا دی' یوں بھی سمجھا دی۔ مگر انہوں نے دوسرے وقت مجھ سے کہا' کہنے لگے
ئی ٹھیک کہتے ہو' مگر نسبت جو شمال و جنوب کی ہے!! اب یہ ان کی نیکی تھی ورنہ کہنے کا
مد یہ ہے کہ جغرافیانہ جاننے کا یہ سارا فتور تھا۔ اب ایک انگریزی داں کے اوپر کتنا برا اثر
ے گا۔ اس واقعہ کا۔ اور وہ آئندہ کسی اعتبار سے بھی مولوی صاحب کی کوئی بات ماننے کا
ں۔ اور یہ مسلمات میں سے ہے کہ جب تک دماغ مرعوب نہیں ہوتا' فرد کا فرد سے یا قوم
وم سے اس وقت تک آپ کسی کو کسی بات کی جانب مائل نہیں کر سکتے۔ رعب اس وقت
سکتا ہے کہ جب عربی کی تعلیم کے نظام میں خود منتہی کے درجہ پر ہوں تو وہ ان کو صحیح طور
مجھ سکیں اور ہماری زندگی سے جن حقائق کا واسطہ ہے انہیں سمجھیں اور پھر ان میں اگر
ں اسلامی مسئلہ ان سے متعلق ہوتا ہے تو وہ ایک حل نکال سکیں۔ مختصر یہ کہ جیسے کہ سرسید
ے اپنے زمانے میں ایک علم کلام پیدا کیا تھا۔ علم کلام پیدا کرنے کی اب ضرورت ہے اور اس
ں پچھلی باتوں کو جو غلط ثابت ہو چکی ہیں یہ ماننا ہے کہ غلط ہیں۔ رہا معاش اور معاد والا مسئلہ'
لر ان دونوں کو ملا دیا جائے اور اس طرح نصاب مرتب کیا جائے کہ اس میں یہ سب چیزیں
ں تو میرے خیال میں ایسا مسئلہ ہے نہیں۔ بھائی یہ عربی علوم پڑھنے کے بعد ابن سینا پیدا
سکتا ہے' بیرونی پیدا ہو سکتا ہے' میں پیدا ہو سکتا ہوں....... اس زمانے میں تفریق نہیں
ں علوم دینی اور غیر دینی کی' سب پڑھائے جاتے تھے۔

بات یوں ہے کہ مسلمان چاہتا یہ ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے معاش اور معاد دونوں کا
۔ حل کرے۔ ہمارے یہاں دینی مزاج کے جو آدمی ہیں وہاں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔
ہند میں بھی' جماعت اسلامی کی درس گاہوں سے نکلے ہوئے بعض لوگ ہیں جو نئے علوم
ے بھی اچھی طرح سے واقف ہیں' ان سے ملئے۔ ان کی صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے
سی مسجد کے امام ہیں یہ؟ لیکن اپنے فن میں نہایت عبور ہے۔

ابھی تک جو کوششیں بھی ہوئیں بالآخر وہی معاشیات کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کھائیں
. کمائیں گے کیا۔ مگر کیا تجارت اور مزدوری کے سارے راستے بند ہیں؟ آپ جو معاشرہ
چاہتے ہیں' اس میں خالی آپ کو سرکاری ملازم ہی تو نہیں چاہئیں' اس میں آپ کو تاجر بھی

چاہئیں، ڈرائیور بھی چاہئیں کارخانوں اور کھیتوں میں کام کرنے والے بھی چاہئیں۔
مسئلہ اصل میں سوچنے کا ہے اور اپنے دماغ سے سوچنے کا ہے۔ ہم پہلے اوروں کی تقلید کرتے تھے! اب یورپ کی کرتے ہیں!!!

## اخلاق احمد

منگولوں کے حملے سے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا۔ ہلاکو خان نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس تخریب کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں تعمیری کاموں میں تعمیری کوشش کافی زور پکڑتی گئی۔ وسط ایشیاء کے فاضل ہندوستان میں آنے لگے اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور کاموں کے ساتھ ساتھ درس اور تدریس کا کام بھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام پانے لگا۔ اس طرح درس نظامیہ بغداد کے اثرات ہندوستان کی فضا میں بھی پھیل گئے۔
سکندر لودھی کے عہد میں تھوڑی تبدیلی نمایاں ہوئی۔ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے آئے۔ شیخ عبداللہ نے دلی میں اور شیخ عزیز اللہ نے سنبھل میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ علم منطق کو ہندوستان میں دینی تعلیم کے اندر انہیں حضرات کے وجود سے فروغ ہوا۔ ان کے آنے سے پہلے صرف دو کتابیں رائج تھیں، اگلے دور میں فتح اللہ شیرازی نے نصاب میں کچھ اضافے کیئے اور منطق اور ریاضی پر زور دیا۔ تیسرے اور چوتھے دور میں دو ہستیاں قابل غور ہیں جنھوں نے اس سلسلہ میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ ایک شاہ ولی اللہ دہلوی جنھوں نے اہم ترمیمات کیں اور کتابوں کی ترتیب کو بھی بہت حد تک بدل دیا۔ دوسرے ملا نظام الدین ہمالوی جن کا تیار کردہ نصاب تمام شمالی ہندوستان میں رائج ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد اس میں متعدد اصلاحات کی گئیں۔ غالباً سب سے پہلے فرنگی محل کے مولانا قطب الدین نے یہ اصلاحات کیں۔ انہوں نے بعض کتب اور مضامین میں ردوبدل بھی کی۔ ان کے بعد اور تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہی درس نظامی معمولی تبدیلی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند اور ہندوپاک کے جملہ مدارس عربیہ اور دینیہ میں رائج ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف فقہ، عقائد و تفسیر اور حدیث کی کتب میں۔
پانچواں دور (اس سلسلہ کا گویا آخری دور) ایسا ہے جس میں علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق میں تبدیلی کے لئے کافی کوشش کی گئی۔ اس میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالعزیز

نظام آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر علماء کرام نے نمایاں حصہ لیا۔ خاص طور سے اہل حدیث لوگوں کے مدارس میں انتخاب حدیث اور تفسیر قرآن کے سلسلہ میں خاص اضافے ہوئے ہیں۔ ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں ترمیم شدہ نصاب رائج ہو گیا۔

## درس نظامی سے مختلف نصاب اور درس گاہیں

مدرسہ عالیہ کلکتہ ان میں سب سے نمایاں ہے اور براہ راست سرکاری ادارہ ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں گورنر جنرل وارن ہسٹنگز نے مسلمانان کلکتہ کی درخواست پر ۱۷۸۰ء میں ذاتی طور پر اس درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی دور میں اس کا اس کا ماہانہ خرچ ۶۲۵ روپے تھا۔ جو گورنر جنرل خود برداشت کرتے تھے۔ ۱۸ اپریل ۱۷۸۱ء کو مدرسہ کا معاملہ بورڈ آف ریونیو کے سامنے پیش کیا اور ایک قطعہ زمین خرید کر اس کی عمارت کی بنیاد ڈالی اور اپریل ۱۷۸۲ء میں گورنر جنرل نے انگریزی حکومت سے ادارہ کے لئے پندرہ ہزار روپیہ سالانہ اخراجات کے لئے اور زمین کے واسطے اکیاون ہزار روپیہ یکمشت کی منظوری کے بعد مدرسہ حکومت کے سپرد کر دیا۔

اس مدرسہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو عربی، فارسی کی تعلیم دلا کر ان کو دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں نیز اور دوسرے شعبوں میں جگہ دلائی جائے۔ اس درس گاہ کے سب سے پہلے مدرس مولوی مجد الدین عرف مولوی مدنی تھے۔ لیکن جب فارسی سرکاری زبان نہ رہی اور اس کی جگہ انگریزی آگئی تو مدرسہ میں عربی کے ساتھ ساتھ شعبہ انگریزی بھی قائم ہو گیا اور ۱۸۵۷ء میں اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ قائم کیا گیا جو ہائی اسکول کے برابر تھا اور اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے ہو گیا۔ بعد میں یہ الحاق بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن سے ہو گیا اور شعبہ عربی اپنی جگہ پر قائم رہا۔ جس میں فلسفہ، دینیات، فقہ، ہیئت، ریاضی، منطق، صرف و نحو کی تعلیم ہوتی رہی۔

## دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا۔ تاکہ مجلس ندوۃ العلماء کی کارروائی کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ یہ درس گاہ علی گڑھ، دار العلوم دیوبند اور فرنگی محل کی درمیانی کڑی

ثابت ہوئی۔ مجلس ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مقرر ہوئے۔ دارالعلوم کے ابتدائی محرک علامہ شبلی نعمانی، نواب علی حسن خان، مولانا حکیم عبدالحئی اور ان کے رفقاء تھے۔

اس درس گاہ کے نصاب میں جن اصلاحات کا مقصد سامنے تھا وہ یہ تھیں کہ کتابی مہارت کے بجائے فنی مہارت پیدا کی جائے۔ جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ عربی ادب میں دورِ جاہلیت کے شعراء کے دواوین کو شامل کیا جائے۔ تاریخ اور جغرافیہ نصاب میں شامل ہو۔ انگریزی بحیثیت زبان کے نصاب میں داخل کی جائے وغیرہ وغیرہ۔

درجہ عالیہ اور فضیلت میں فقہ، حدیث، تفسیر اصول تفسیر، اصولِ احادیث اور دوسرے متعلقہ علوم شامل ہیں۔ اس کے قدیم فارغ التحصیل لوگوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا ابوالحسن ندوی وغیرہ جیسے جید علماء شامل ہیں مگر اب دوسری ایسی ہستیاں پیدا ہوتی نظر نہیں آتی ہیں۔

## مدرسۃ الاصلاح، (سرائے میر)

اس مدرسہ کی بنیاد ایک مقدس ہستی مولانا محمد شفیع مرحوم کے ہاتھوں پڑی۔ کسی حد تک اس کو ندوہ کی شاخ کہا جاسکتا ہے۔ ایک وقت آیا جب علامہ شبلی کو ندوہ سے مایوسی ہوئی تو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنانا چاہا اور ان کی خواہش پر مولانا حمید الدین فراہی نے دارالعلوم حیدر آباد دکن کی نظامت اعلیٰ کو خیرباد کہہ کر مدرسۃ الاصلاح کی تدریس اور نظامت قبول کرلی اور تازیست اس سے لگاؤ رہا۔ مدرسہ کا نصاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔

یہاں ابتدائی درجہ کا کورس پانچ سالہ ہے اور عربی کا آٹھ سالہ ہے۔ ان آٹھ سالوں میں عربی صرف ونحو اور ادب سے لے کر فقہ، علم الکلام، حدیث، تفسیر اور اصول تفسیر پڑھائی جاتی ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم ایف اے کے معیار تک ہوتی ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے اصلاحی نکات یہ تھے:

قرآن فہمی پر زور دینا، قرآن فہمی کے لئے احادیث کے علاوہ ایام جاہلیت کا ادب اور اسلامی دور کے عربی ادیبوں کے کلام کا ضروری مطالعہ وغیرہ وغیرہ۔

## جامعہ دارالسلام (عمر آباد)

صوبہ مدراس میں آمبور مقام کے پاس عمر آباد ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کاکا حاجی محمد عمر نے اس کو آباد کیا۔ اس میں "جامعہ عربیہ دارالسلام" واقع ہے۔ اس کی بنیاد ۷ دسمبر ۱۹۲۴ء میں پڑی۔

کاکا حاجی محمد عمر کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ چمڑے کا کاروبار کرتے تھے مگر اہل علم کے بڑے عقیدت مند تھے اور ان سے تعلقات رکھتے تھے۔ ان میں سے خاص ہستیاں مولانا سید نذیر حسین، سر سید احمد خان، مولانا بشیر، مولانا سلامت اللہ جیراج پوری، نواب صدیق حسن خان اور مولانا عبدالجبار غزنوی تھیں۔ انہیں سے متاثر ہو کر دینی اعلیٰ تعلیم کے لئے یہ مدرسہ قائم کیا گیا۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی بھی تعلیم جاری کی گئی۔ پہلے "دارالسلام" کے نام سے ایک عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی جو بعد میں "جامعہ عربیہ دارالسلام" بن گیا۔

اس مدرسہ کا نصاب قدیم اور جدید ادوار کی خصوصیات کا حامل ہے۔ پورا نصاب نو سال کا ہے۔ دینی تعلیم کے ساتھ حساب، جغرافیہ اور انگریزی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس یونیورسٹی سے مدرسہ کا الحاق ہے۔ طلباء افضل العلماء اور منشی فاضل کے امتحانات میں شریک ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

آخر میں، میں تین سوال اٹھانا چاہتا ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ دینی تعلیم کے لئے صرف نچلا طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے جو فارغ ہونے کے بعد کسی طرح سے سوسائٹی پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔ اس کا احساس کمتری، اس کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو بھی ختم کر دیتا ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اکثر جگہ مدارس کے بجائے ان کے مہتمم اپنا بھلا کرتے رہتے ہیں؟ اور کیا یہ غلط ہے کہ ہمارے علماء کرام کی اولادیں زیادہ تر انگریزی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی چار دیواریوں کے اندر مصروف تعلیم پائی جاتی ہیں اور وہ خود دینی درس گاہوں میں اپنے فرائض انجام دیتے ہیں؟

# جامعہ اسلامیہ علمیہ

(جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جوبلی کی تقریب پر جامعہ کے شیخ ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام)

موسیٰ جار اللہ
وسط ایشیاء کے ایک عظیم عالم اور عالم اسلام کے اہم مصلح

لمثل ھذا فلیعمل العاملون (۳۷ : ۶۱)

وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون (۸۳ : ۲۶)

ایک ایسی اسلامی علمی یونیورسٹی کے وجود کی آرزو جس میں ایک طرف تمام اسلامی علوم کی تعلیم کا کامل انتظام ہو اور دوسری طرف موجودہ زمانہ کے علوم اور عمومی مصارف کی تعلیم، عالم تمدن کے کالجوں کی اور یونیورسٹیوں کے نصابات کے بقدر دی جاسکے۔ میری بہت قدیم آرزو ہے جس کو میں اپنے دل میں طالب علمی کے زمانے سے پرورش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۴ء تک میں نے تمام عالم اسلام کی سیاحت کی تاکہ میں اسلامی دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شرعی عدالتوں اور دینی مدارس کے نظام نیز ان کے نصاب تعلیم کا مطالعہ کر سکوں۔

اس چھ سال کے عرصہ میں اسلامی دنیا کے اکثر بڑے شہروں کو میں نے دیکھ لیا اور اس طرح شرعی عدالتوں کے طریق کار اور اسلامی مدارس کے نصاب تعلیم کے مطالعہ کی جو آرزو تھی وہ پوری ہو گئی۔ مدارس کے نظامِ تعلیم اور نصاب علم کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ عالم اسلام کے لئے یہ نظام اور یہ نصاب مفید اور سود مند نہیں اور اس پر قناعت کرنا کسی حال میں درست نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف میں نے یہ نظارہ دیکھا کہ شرعی عدالتوں میں اسلامی شریعت کے احترام کا کوئی اثر و شائبہ باقی نہیں رہا اور مسلمانوں کے دلوں سے ان کی اہمیت اور احترام بالکل اٹھ گیا۔ کیوں کہ یہ عدالتیں صرف مفتیوں کے

فتووں اور ان کے متضاد خیالات کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہیں جو اکثر و بیشتر غلط ہوتے ہیں۔ اسلامی مدارس کا نظام جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی ضرورتوں کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ مغربی ترکستان کا حال دینی مدارس اور شرعی عدالتوں کے لحاظ سے اور بھی خراب پایا۔ یہاں کے لوگوں نے زندگی کے اہم ترین مسائل کے لئے شریعت کے نام پر بہت ہی خوفناک حیلے تراش لئے ہیں۔ جن کے نتیجہ میں اسلام اپنی بنیاد ہی سے باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب ہیں جنھوں نے اسلامی حکومتوں میں اجنبی سیاست کی دخل اندازی کے لئے دروازے کھول دیئے ہیں۔ چناں چہ مصر میں شرعی عدالتوں کے بجائے "محاکم مخلطه" یعنی ملی جلی عدالتوں کے نام سے نئی عدالتیں وجود پذیر ہو گئیں اور ترکی میں "تنظیمات خیریه" کے نام سے جدید اصلاحات نے خلافت عثمانیہ میں اسلامی نظام پر زمین تنگ کر دی۔ رہ گئیں افغانی اور ایرانی حکومتیں تو ان میں بھی شریعت اسلامیہ کی نہ کوئی قوت باقی رہی اور نہ کوئی حرمت۔ قرآن کریم محض نام کے لئے ایک قابل احترام کتاب رہ گئی ورنہ حقیقتاً امت کے اور حکومت کے دل میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور وہ دن دور نہیں جب کہ یہ دونوں حکومتیں بھی مصر اور ترکی کے نقش قدم پر گامزن ہوتی ہوئی نظر آئیں گی۔

اس کا بنیادی سبب شرعی محاکم اور دینی مدارس کی نادرستی ہے۔ کیوں کہ ہر قوم اور ہر وقت کا عروج و زوال اس کے مدارس اور محاکم کے صلاح و فساد پر موقوف ہے۔

۱۹۰۴ء کے آخر میں میری سیاحت کا سلسلہ ختم ہوا اور پھر پیٹر برگ یعنی لینن گراڈ میں میرا مستقل قیام ہو گیا۔ ۱۹۰۵ء کے ابتداء میں میری پہلی کتاب چھپ کر نشر ہوئی۔ اس کتاب میں، میں نے اسلامی دنیا کی درس گاہوں کا حال اجمالی طور پر بیان کیا ہے۔ عالم اسلام کے امیر الشعراء ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے جب اسلامی درس گاہوں کی بابت میرا یہ بیان پڑھا تو انہوں نے اس کو شعر و ادب کے سنہری قالب میں ڈھال کر اس طرح فرمایا۔

بایں مکتب بہ ایں دانش چہ نازی     کہ ناں بر کف ندادوجاں زتن برد

دنیائے اسلام کی حالت پر اس سے زیادہ جامع اور مختصر تنقید کیا ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ایک

طرف سخت تنقید ہے تو دوسری طرف اس حکیمانہ تدبیر وحید کی طرف بھی اشارہ ہے جس کے ذریعہ سے دین حق پھر ایک بار عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کی مانند دنیا پر غالب و فیروز مند بن سکتا ہے اور اسلام کی عظمتِ رفتہ پھر واپس آسکتی ہے۔

اب ہم کس دن کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیا قیامت کے دن ہم بیدار ہوں گے؟ اور اگر قیامت کا انتظار ہے تو وہ بھی برپا ہو چکی ہے، ترکستان، روس اور ترکی میں انقلاب نے قیامت بپا کر دی اور یہاں کے اسلامی نظام، شرعی عدالتوں اور دینی مدارس کی بنیادیں منہدم ہو کر اپنے تاریخی، سیاسی اور اجتماعی گناہوں کے ملبہ میں اس طرح دفن ہو گئیں کہ ان کی اس تباہی پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین نے نوحہ خوانی کی۔ حتیٰ کہ اس حالت زار پر کو ان ملکوں کے باشندوں میں سے بھی کسی کی آنکھ پُر نم نہ ہوئی۔

## الابُعداً لِمَدْیَن کمابعدت ثمود

ان اسلامی بنیادوں کو کس نے منہدم کیا؟ کیا موجودہ انقلاب اس کا سبب بنا؟ نہیں بلکہ یہ عمارتیں معنوی طور پر برسوں پہلے گر چکی تھیں اور ان پر موت واقع ہو چکی تھی۔ مگر اہل غفلت اس وقت بیدار ہوئے جب کہ انقلاب کا سیلاب اپنی وحشت ناک موجوں میں باقی ماندہ اسلامی آثار عظمت کو بہا کر لئے جا رہا تھا۔ کاش کہ جاگنے والے کچھ پہلے بیدار ہو جاتے اور طوفان کے آنے سے پہلے اپنی نجات کا کچھ انتظام کر لیتے۔

یہ ہیں وہ خوفناک مصائب جن کا ہم آج شکار بنے۔ اور کل۔ اے ہندوستان کی اسلامی درس گاہو! تم کو یہی دن دیکھنا ہو گا۔ لہذا پہلے سے تیار ہو جاؤ اور طوفان کے آنے سے پہلے کشتی تیار کر لو۔

## وماقوم لوط منکم ببعید

ہندوستان میں اسلامی مدارس بکثرت ہیں، سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں، ان کا نظام تعلیم اور نصاب علوم یکساں ہے۔ آج ان کی حالت اس وقت سے بھی گئی گزری ہے جو اب سے پہلے میں نے دیکھی تھی۔ دینی مدارس اور عصری درس گاہوں کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے باوجود اسلامی درس گاہوں کے اولیاء و سرپرست اور ان کے تمام اساتذہ بے خبر اور غفلت میں مبتلا ہیں۔ "یمرون علیھا وھم عنھا معرضون"۔ وہ سب سے خیالی پلاؤ پکاتے اور اپنے سینوں میں طرح طرح کی آرزوئیں پرورش کرتے ہیں وہ بزعم

خولیش آسمانی کرسیوں پر بیٹھ کر کرۂ زمین پر الٰہی اور ربانی حکومتیں قائم کرتے ہیں اور خود ان کے امیر و خلیفہ بن جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان جیسے بلند مقاصد کے لئے ان کی تیاریاں کچھ بھی نہیں سچ ہے کہ وقت سے پہلے اور تیاری کے بغیر جو کسی بات کی خواہش کرتا ہے وہ ہمیشہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔ روس میں جب تمام دینی مدارس اور ابتدائی مکاتب بند ہو گئے تو میں نے از سر نو دینی اور علمی اسباق کے احیاء کے لئے کمر ہمت باندھ لی۔ مجھے نہ کوئی عمارت درکار تھی اور نہ بہت سا ساز و سامان، زمین کا فرش اور آسمان کی چھت کافی تھی۔ میں تنہا تھا میرے ساتھ کوئی کام کرنے والا بھی نہ تھا اور نہ میں نے اس سلسلے میں کسی سے استعانت لی۔ یہاں تک کہ شوقین طالب علموں کی ایک اچھی خاصی جماعت میرے گرد جمع ہو گئی۔ میں نے ان اسباق کی ترتیب و نظام سے متعلق ایک مختصر مضمون بھی لکھا اور ترکستان کے اسلامی شہروں نیز روس کے اسلامی علاقوں اور آبادیوں کا میں نے دورہ کیا۔ اس طرح میں نے اپنے اغراض و مقاصد اور اپنا تعلیمی پروگرام ہر اسلامی آبادی میں پہنچا دیا۔ اس کام کے لئے میں نے نہ تو کسی سے چندہ کا سوال کیا اور نہ غیر اللہ کے خوف کو اپنے دل میں جگہ دی۔

اسی زمانے میں میرے پاس تین طالب علم آئے جو عربی پڑھنا چاہتے تھے۔ چناں چہ میں نے روزانہ سات ماہ تک عربی زبان و ادبیات کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس مختصر مدت میں ان طالب علموں کی استعداد بہت اچھی ہو گئی۔ عربی زبان کے قواعد و اصول اور ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہو گئی۔ اب مجھ کو یقین ہوا کہ اگر استاد کی طرف سے محنت اور اہتمام اور طالب علم کی طرف سے شوق اور رغبت ہو تو نہ کوئی زبان مشکل ہے اور نہ کوئی علم۔ طالب علم ہر زبان اور ہر علم کو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ تمام زبانیں اور تمام علم برابر آسان اور برابر مشکل ہیں۔ صرف پڑھنے والے کا شوق اور پڑھانے والے کا طریقِ تعلیم کسی علم اور کسی زبان کو آسان اور مشکل بنا دیتا ہے۔

آج مدارس کے سرپرستوں اور علماء و اساتذہ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ نظامِ تعلیم کی اصلاح اور نصاب علوم کی تکمیل کی جانب متوجہ ہوں۔ بلا شبہ ہندوستان کے مسلمان، دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلہ میں مطلوبہ ''اسلامی علمی یونیورسٹی'' کی تاسیس پر زیادہ قادر ہیں۔ ہندوستان میں کئی اسلامی درس گاہیں موجود ہیں جن میں دہلی کی ''جامعہ ملیہ

اسلامیہ "ہماری آئیڈیل "اسلامی علمی یونیورسٹی" کے سانچے میں ڈھل جانے کے لئے زیادہ قریب اور زیادہ صلاحیت پذیر ہے۔

میں اپنے اس مضمون کے شروع ہی میں یہ بتلا چکا ہوں کہ جامعہ اسلامیہ اور جامعہ علمیہ سے ہماری کیا مراد ہے۔ اب میں ارباب علم اور اساتذہ مدارس کے روبرو اُس "اسلامی علمی یونیورسٹی" کے نظام اور نصابِ تعلیم کا ایک خاکہ اپنے تصور کے مطابق پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ میرا تصور اور میرا پیش کردہ خاکہ اپنی شکل و صورت میں اس نظامِ تعلیم کے ابتدائی نقش کا حکم رکھتا ہو جس کو آگے چل کر اہلِ علم دینی مدارس کی اصلاح کرتے وقت یا اسلامی علمی یونیورسٹی کی تاسیس کے موقع پر زیادہ وسیع اور زیادہ مکمل شکل میں ترتیب دیں گے۔ میں نے اس سلسلے میں رام پور کے مدرسہ عالیہ کے نظام سے متعلق ایک کتاب بھی دیکھی ہے جو قریب قریب مدرسہ دیوبند کے نظام سے ملتی جلتی ایک چیز ہے۔

## تعلیم کا پروگرام

(۱) سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم بنیادی اصول تو یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم میں ترتیب کی خاص رعایت رکھی جائے۔ علوم دینیہ کی تعلیم پر ادبیات کی تعلیم مقدم کی جائے۔ یعنی یہ کہ اصل زبان اور اس کی صرف و نحو اور بلاغت کی تعلیم۔ قرآن کریم کے معانی و مطالب اور حدیث کی تعلیم سے پہلے ہونا چاہئے اور کتاب و سنت کی تعلیم علوم فقہیہ اور علوم کلامیہ پر مقدم کی جائے۔ کیوں کہ اسلامی فقہ و عقائد اور تمام شرعی علوم کا سرچشمہ قرآن حکیم اور حدیث نبی کریم ﷺ ہے۔ لہٰذا فقہیات و عقائد ایسے طالب علموں کو پڑھانا جو نہ تو قرآن کریم کے معانی کامل طریقے پر جانتے ہیں اور نہ کتب حدیث پر ان کی نظر ہے۔ بالکل فضول کوشش ہے اور طالب علم کی عمر برابر کرنے کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں یہی وجہ ہے کہ طالب علم کسی کتاب کو بھی بغیر شروح و حواشی کی مدد سے بالکل نہیں سمجھتا۔ طالب علم کا اپنے اسباق کے سمجھنے میں شرح و حاشیہ کا محتاج ہونا اور اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ لمبے چوڑے حواشی اور دور از کار شروح میں صرف کر دینا نظام تعلیم کے فساد کا نتیجہ ہے اور اگر تعلیم کے وقت علوم کی ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے تو اس قسم کی خرابیوں کے واقع ہونے کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔

(۲) دوسرا سب سے زیادہ بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر فن اور ہر علم کے پورے پورے مسائل اپنی اپنی جگہ پر پڑھائے جائیں۔ کسی فن کے چند مسائل پر اکتفاء کر لینا یا کسی فن کی کتاب میں سے بعض فصلیں بڑھا دینا درست نہیں۔ اگر تعلیم میں ان دونوں اصولوں کی ترتیب کے ساتھ رعایت کی جائے گی تو طالب علم شروح وحواشی سے بالکل بے نیاز ہو جائے گا اور اپنے تمام درس کو ضبط واتقان کے ساتھ یاد رکھ سکے گا۔ اس کے علم میں زندگی ہو گی جس سے خود اس کا دل مطمئن ہو گا اور آئندہ کی تعلیم میں کبھی اس کا دل ودماغ پراگندگی و خلفشار کا شکار نہ ہو گا۔

(۳) مدارس میں علوم ادبیہ کی تعلیم کا اصلی مقصد چوں کہ کتاب وسنت کے مطالبہ ومعانی کا فہم وادراک ہے لہذا ادبی علوم کے پڑھانے میں سب سے زیادہ مناسب اور سب سے زیادہ مفید یہ چیز ہو گی کہ ہم اس سلسلے میں کتب سلف کو ترجیح دیں یا ایسی کتاب کا انتخاب کریں۔ جو اصول سلف کے مطابق لکھی گئی ہو۔ البتہ ایسے استاد کو جس کو مسائل کا استحضار ہو یہ حق ہے کہ وہ فن کے مسائل بطریق اجمال ایسی کتاب سے بھی پڑھا سکتا ہے جس میں تحصیل کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو۔ مثلاً علوم نحو میں کتاب الدروس النحویہ سے مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ کافیہ کا طریقِ بیان لغو اور مہمل قرار دیا جائے۔

(۴) علم صرف پڑھانے کے لئے ضروری یہ ہے کہ مختصر معلم شافیہ اور مزھر کے مسائل ایسے طریقہ پر بیان کر دے کہ طلباء کے ذہن نشین ہو جائیں۔ کیوں کہ کوئی صوفی اور کوئی قاری شافیہ کے مسائل سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جو طالب علم عربی مادوں کے تصرف اور ابنیہ اسماء وافعال کے اصول جاننا چاہتا ہے اس کے لئے شافیہ اور مزہر کے بیان کردہ مسائل کی واقفیت ناگزیر ہے۔ درحقیقت ان کتابوں کے مسائل سے ہم کو سروکار ہے، محض کتابوں کی عبارتوں سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔

علم نحو میں کافیہ کے مسائل رضی کی شرح کے ساتھ اور الفیہ کے مسائل اشمونی کی شرح کے ساتھ بہت کافی ہیں۔ ہمارا مقصد مسائل کو سمجھنا اور ان کو یاد رکھنا ہے جس نے ان مسائل کو سمجھ کر یاد کر لیا وہ صحیح معنی میں نحوی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اب آسانی سے قرآنِ کریم کے معانی اور دواوین، سنت کے مطالب کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔

علم صرف اور علم نحو کے اسباق کے دوران میں متن لغت پر بھی طالب علم کی اچھی

خاصی نظر ہو جائے گی اور وہ عربی الفاظ یعنی اسماء وافعال اور حروف کے معنی سمجھنے لگے گا اور صحیح پڑھنے، صحیح لکھنے، صحیح بولنے پر قادر ہو جائے گا۔

(۵) گزشتہ چار نمبروں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس ترتیب سے طالب علم کی تعلیم ہو گی تو اب اس میں اس قدر استعداد پیدا ہو چکی ہو گی کہ وہ "متن کافی" اور "صبان و خزرجیہ" کی مختصر نظموں سے علم عروض و قوافی بآسانی سیکھ سکے اور خلیل کے مقرر کردہ نظام کے مطابق عربی شعر کی بحروں کو یاد کر سکے۔ علم عروض میں دس ارکان اور پانچ دوائر سے جس قدر مستعمل اور غیر مستعمل بحریں استخراج کی گئی ہیں، نیز جتنے زحافات و علل ہیں ان کے لئے خلیل کا بتلایا ہوا نظام عجیب و غریب ہے۔ تمام اسلامی شعراء نے تمام زبانوں میں خلیل ہی کے طریقہ کی پیروی کی ہے اس لئے علم عروض میں خلیل کے طریقہ کا جاننا ہر مسلمان عالم کے لئے سود مند اور مفید ہے اور اس کی تعلیم مدارس میں ضروری ہے۔

علم عروض و قافیہ میں "کافی" اگرچہ ایک آسان متن ہے لیکن اس میں پھر بھی ایک قسم کا انتشار ہے۔ جس کو یاد کرنا، ہر طالب علم کے لئے آسان نہ ہو گا۔ البتہ خزرجیہ اور منظومۃ الصبان کے جس نے چالیس شعر یاد کر لئے وہ خلیل کے نظام کے مطابق علم و عروض سے اچھی طرح واقف ہو جائے گا اور اس کو کبھی فراموش نہ کرے گا۔

(۶) اب عربی شعر کے دیوانوں تک طالب علم کی رسائی آسان ہو جائے گی۔ یہ دواوین عربی ادب کا قیمتی خزانہ ہیں اور اس موضوع پر ائمہ ادب کی بہت سی کتابیں ہیں۔ ان کے مطالعہ کے لئے طالب علم کو ذرا زیادہ محنت اور کوشش سے کام لینا ہو گا۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ تعلیمی گھنٹوں میں اتنی گنجائش نہ نکل سکے کہ طالب علم ضروری کتبِ ادب کا مطالعہ کر سکے لیکن اگر طالب علم اپنے شوق اور محنت کو کام میں لائے گا تو ان میں سے کوئی چیز بھی اس سے نہ چھوٹے گی۔

عربی شعر و ادب کے یہ دیوان اس لئے ضروری ہیں کہ ان میں قرآن حکیم اور سنن نبی کریم ﷺ کی زبان و شواہد کے علاوہ عرب کی تاریخ، عرب کا نظام زندگی، سماجی اور اخلاقی حالات، نیز عربوں کے علوم و فنون، غرضیکہ سب ہی چیزیں موجود ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظہور تاریخی شواذ میں سے نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ

سمجھتے ہیں۔ کتاب الاغانی عرب کی فضیلت و علو مرتبت کے بیان میں سب سے زیادہ اہم کتاب ہے۔

(۷) اس کے بعد دواوین سنن اور احادیث ثابتہ کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔ طلباء کی جماعت جس نے گزشتہ نمبروں میں بیان کردہ ترتیب کے ساتھ تمام چیزیں حاصل کرلی ہوں تو اب ایک اچھا اور ہوشیار استاذ موطا اور تجرید بخاری سے علم سنت کی تعلیم شروع کرائے۔ اس تعلیم کے لئے چند ماہ کی مدت اور تھوڑے سے اسباق کافی ہوں گے۔ ان اسباق کی تعلیم کے دوران مدرس کو چاہئے کہ وہ اپنے طالب علموں کو علم اصولِ حدیث کی وہ تمام اصطلاحات جو نخبہ یا نزھتہ میں بیان کی گئی ہیں سکھادے۔ نخبہ مختصر اور مفید متن ہے اور اپنے مقصد کے لئے بالکل کافی ہے۔

ان دو کتابوں کی تعلیم کے بعد ائمہ اُمت کی صحاح ستہ اور امام طحاوی کی معانی الآثار طلبہ کو بطریق روایت پڑھائی جائیں۔ جہاں تک درایت کا تعلق ہے۔ درایت اب اس جماعت کو حاصل ہو چکی ہے۔ ہاں اگر استاد کچھ نئے افادات رکھتا ہو تو البتہ ان سے اپنے طلبہ کو محروم نہ کرے۔

انها لا ذكر من الرحمن محدث۔ (۳۶ : ۵)

(۸) علم سنت کے بعد قرآن حکیم کے مطالب و معانی سمجھنے کی نوبت آتی ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے سلسلہ میں استاد کو چاہئے کہ

علوم قرآنیہ میں جو مختصر متون ہیں ان سے ابتداء کرے : مثلاً امام شاطبی کا لامیہ عقلیہ اور امام جزری کا الالیفة الطیبة۔ طلباء کی اس جماعت کو جو علوم عربیہ میں دستگاہِ کامل رکھتی ہو۔ استاد چند ماہ میں ان کتابوں کی تعلیم دے سکتا ہے اور ہر طالب علم آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ ان چیزوں کے بعد استاد قرآن کریم کے معانی شروع سے آخر تک اپنے طلباء کو بتلائے۔ معانی قرآن کی تعلیم میں اس امر کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے کہ طالب علم کو ازروئے مصحف ہی معانی بتلائے جائیں یا زیادہ سے زیادہ جلالین اور بیضاوی سے امداد لی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ ہماری اس جماعت میں اب کافی استعداد و صلاحیت اور علم کی اچھی خاصی قوت

پیدا ہو چکی ہے۔ استاد کو چاہئے کہ وہ ان طلباء کو قرآن فہمی میں آزادی کو کام میں لانے دے۔ معانی قرآن کریم کی بنیاد نظم قرآنی ہے۔ نظم قرآن جن معانی پر دلالت ورہبری کرتا ہے وہی ہمارے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمیں کسی کی رائے سے کوئی سروکار نہیں اور نہ اس سے کچھ بحث کہ کتب احادیث میں کیا وارد ہوا ہے خود نظم قرآنی کا افادہ ان سب سے بالاوبرتر ہے اور اپنے ثبوت ووسعت کے لحاظ سے بھی نظم قرآنی کا درجہ کہیں زیادہ ہے۔ اسباب نزول جو بیان کئے جاتے ہیں اول تو ہر ایک کا ثبوت نہیں اور اگر ثبوت بھی ہو تو اس سے نہ تو نظم قرآن کی عمومیت میں خصوصیت پیدا ہوتی ہے اور نہ افادہ نظم کی وسعت کو ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔

(۹) اس کے بعد علم عقائد، علم کلام اور فلسفہ و منطق کا درجہ آتا ہے۔ علم العقائد کی تعلیم امام طحاوی کی کتاب "بیان السنته" یا امام محمد عبدہ مفتی مصر کے "رسالته التوحید" سے دی جائے۔ علم کلام کے لئے "مواقف" سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ قدیم فلسفہ الہیات کتاب "حکمة العین" سے پڑھایا جائے اور منطق کے لئے کوئی مختصر سی کتاب یا "تهذیب" کافی ہوگی۔ یہ چاروں درس دو سال کی مدت میں سابقہ دروس کے ساتھ ساتھ ختم کرادیئے جائیں۔

(۱۰) اس کے بعد مذہبی فقہ کی تعلیم کسی مختصر متن سے دی جائے "تنویر الابصار" زیادہ مفید ہوگی۔ اور ایک کتاب اصول فقہ میں پڑھائی جائے۔ "توضیح" یا "المستصفی" میں سے ایک کتاب منتخب کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد ہدایہ اور "مجلة الاحکام العدلیه فی الفقه" درس میں آنا چاہئیں۔

(۱۱) سیرت نبی کریم ﷺ کے موضوع پر "زاد المعاد" سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ اس میں سیرت کے علاوہ فقہی، اجتماعی اور سیاسی احکام بھی آنحضرت کی سیرت اور سنن ثابتہ سے استنباط کئے گئے ہیں۔ اگر طالب علم ان چیزوں کو پڑھ لے گا تو اس میں اجتہاد کی قوت اور استنباط مسائل کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔

قانون سازی کے فلسفہ اور اصولِ شرع کو سمجھنے کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی "حجته الله البالغه" بہترین کتاب ہے۔ درحقیقت اس کتاب کا موضوع اصولِ فقہ ہے۔

اس کے مطالعہ سے موجودہ زمانے کے اقتصادی اور مدنی قوانین کے مقابلہ میں شریعتِ اسلامیہ کی فضیلت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱۲) قرآن حکیم نے آداب اسلامی اور فرائض دین سے زیادہ تمام کائنات کا ذکر کیا ہے۔ نجوم و کواکب اور افلاک و سماوات سبھی کا بیان کتاب اللہ میں موجود ہے اور جگہ جگہ ان تمام چیزوں پر تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ کتب تفاسیر، ستاروں کی دنیا کے تفصیل حال سے قاصر ہیں۔ اس لئے اسلامی علمی یونیورسٹی کو اپنے نصابِ تعلیم میں قدیم وجدید ہیئت کا داخل کرنا ضروری ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ ایسے فلکیاتی اٹلس کا درس و مطالعہ بھی لازمی قرار دیا جائے، جو یورپ یا امریکا میں صحت و صفائی کے ساتھ طبع کیا گیا ہو۔ فلکیاتی اٹلس میں ثوابت و سیارات اور نجوم و کواکب کی تمام تفصیل مل جاتی ہے۔ اس میں ہمارے اس نظامِ شمسی کے علاوہ ہزاروں دوسرے نظامِ شمسی اور لاکھوں ستارے دکھائے گئے ہیں۔

اس لحاظ سے فلکیاتی اٹلس کا مطالعہ ہر مسلمان عالم کا دینی اور علمی فرض ہے۔ تاکہ قرآن کریم کی ان آیات کے معانی و مطالب کی زیادہ سے زیادہ وضاحت ہو سکے۔ جن میں نجوم و سماوات کا ذکر آیا ہے۔

میر آلامی عبدالرحمٰن ایک ترکی عالم ریاضیات و فلکیات نے اس موضوع پر تین بڑی بڑی جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "المصاحبات الفلكية في الآيات القرآنية" ہے۔ میں نے اس کتاب کو نہایت ذوق و شوق اور روحانی کیف و سرور کے ساتھ چند روز میں پڑھا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کے مطالعہ میں کوئی بھی نہ اکتائے گا۔ جب جرمنی عالموں کو اس کتاب کا پتہ لگا تو انہوں نے اس کی خریداری کے لئے ہزاروں پونڈ کی رقم پیش کی لیکن مصنف کی غیرت مند فطرت نے یہ سودا گوارا نہیں کیا۔ وہ بھی پسند نہیں کرتے کہ ان کی کتاب ترکی کے مطابع میں لاطینی حروف سے چھاپی جائے۔ ان کی خواہش یوں ہے کہ یہ کتاب اسلامی عربی حروف میں طبع ہو۔

میں مصنف کتاب سے، انقرہ میں ان کے دفتر میں جاکر ملا ہوں۔ وہ مجھے اپنے گھر بھی لے گئے اور ہماری اس مجلس میں مصنف کی بیگم اور ان کی لڑکیوں نے بھی شرکت کی۔ مصنف نے اپنی کتاب میری طرف بڑھائی اور میں نے ان کے سامنے کتاب کا دیباچہ پڑھا جو مصنف

نے وجود باری تعالیٰ اور اس کی وحدت کے اثبات پر ایک انوکھے ریاضی استدلال کے ساتھ لکھا ہے۔ مصنف کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ میں نے ان کا یہ جدید ریاضی استدلال صحت کے ساتھ پڑھا اور ان کو زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ میں صرف پڑھ ہی نہیں رہا ہوں بلکہ اچھی طرح سمجھتا بھی جاتا ہوں اور مجھے حیرت یہ تھی کہ میرے اور مؤلف کتاب کے مابین آیات کریمہ کے معانی اور علمی مسائل پر جو گفتگو ہوتی رہی اس میں ان کی بیوی اور لڑکیوں نے برابر شرکت کی۔

اگر مصنف نے ابھی تک اپنی کتاب طبع نہیں کرائی ہے تو میری دلی آرزو ہے کہ انشاء اللہ اگر میری زندگی نے کچھ دن اور ساتھ دیا تو ایک روز اس کو میں چھپواؤں گا۔

ہیئت قدیمہ اگرچہ قرآنِ کریم کی تمام تر مخالف ہے لیکن اجرام فلکی کی حرکات کو ضبط کرنے میں اس کا نظام بہت ہی عجیب، بہت ہی خوب صورت اور بہت ہی دقیق ہے۔ ہیئت قدیمہ کے اس نظام کو فلاسفہ کے سب سے بڑے دماغ نے وضع کیا ہے اور حکماء اسلام کے بڑے بڑے دماغوں نے اس سے دھوکا کھایا ہے۔ فارابی، ابن سینا اور نصیر الدین طوسی سب ہی اس سے مرعوب ہوئے ہیں۔ چناں چہ کتب تفسیر نے بھی مطالب قرآنی کے بیان میں اسی نظام ہیئت کی پیروی کی ہے۔ ان اسباب کی بناء پر، جامعہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں ہیئت قدیمہ کا ہونا ازبس ضروری ہے اور ہماری جامعہ کے طلباء کو قدیم نظام ہیئت سے لاپرواہی برتنا کسی حال میں ٹھیک نہیں۔

(۱۳) علماء اسلام نے فلسفہ، تصوف اور ادب پر جو کچھ لکھا ہے اور اسلامی عہد میں دنیا کے بزرگ ترین شعراء نے جو کچھ کہا ہے اس کا بہت بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں ہے۔ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ "جامعہ اسلامیہ" میں فارسی زبان کا درس بھی لازمی قرار پائے جو سعدی اور جامی کی زبان ہے۔ حکماء و شعرائے اسلام کے علمی و فنی آثار کو داخل نصاب قرار دیا جائے یعنی مولانا روم کے دفاتر مثنوی، خاقانی، نظامی اور جامی کی کلیات بر ان الشعراء کے آثار جو اس طبقہ میں شمار کیے جاتے ہیں، سب ہی پر ایک مسلمان عالم کی نظر پڑنا ضروری ہے۔

(۱۴) اور اگر مجھے اختیار ہوتا تو عربی شعر وادب کے درس کے ضمن میں یونان کے مشہور شاعر ہومر کی مشہور ترین نظم الیڈ (الیاذہ) کا عربی ترجمہ مع اس کے قیمتی مقدمہ کے داخل

نصاب کرتا۔ عربی ادب میں الیاذہ کا ترجمہ ایک بہت ہی مفید اضافہ ہے اور اس کا مطالعہ، عربی شعر و ادب کے منتہی کے لئے بہت سے علمی اور ادبی وجوہ کی بناء پر قریب ضروری ہے۔

(۱۵) اگر مجھے اختیار دے دیا جائے تو میں جامعہ کی اسلامی شاخ کے سلسلہ میں عہدِ عتیق (اولڈ ٹیسٹامنٹ) اور عہد جدید (نیو ٹیسٹامنٹ) کے علمی درس کا بھی اضافہ کر دوں۔ عہد عتیق اور عہد جدید کا درس علماء اسلام کے لئے ازبس ناگزیر ہے۔ لہذا جامعہ اسلامیہ اس مضمون سے خالی رہنا اور ہمارے طلبہ کا اس طرف سے غفلت برتنا مناسب نہیں۔ قرآن کریم نے ہر دو عہد کے بہت سے قصص کا ذکر کیا ہے اور بہت سی آیات میں تورات و انجیل کے بہت سے احکام بیان فرمائے گئے ہیں اور بہت سے ان قصص و احکام کی تردید و تغلیط کرتی ہیں جو عہد قدیم اور عہد جدید میں وارد ہوئے ہیں۔

**ان هذا القرآن يقص على بني اسرائيل اكثر الذى هم فيه يختلفون**(النحل۔۸۶)

کیا علماء سلف نے تورات و انجیل میں بحث و تحقیق اور ردو استشہاد کو اپنا موضوع (Subject) بنایا ہے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں عہدِ عتیق و عہد جدید سے کئی چیزیں نقل کی ہیں اور ان کے بارے میں جو کچھ امام رازی نے کہا ہے اس میں کچھ باتیں اگر قابل قبول ہیں تو کچھ چیزیں قابل رد بھی ہیں اور امام رازی کا یہ طریقہ ہے کہ ان کے اعتراضات بہت قوی اور ان کے جوابات جو اپنی ہی طرف سے پیش کرتے ہیں بہت ضعیف ہوتے ہیں۔ امام قرانی نے اپنی کتاب۔ "**الاجوبة الفاخرة**"۔ میں کتب عہدین سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ سب کا سب صحیح ہے۔ تورات و انجیل کی چھان بین کرنے والوں میں امام قرانی کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ اسی موضوع پر امام آلوسی کی کتاب "**القول الفصيح في مالفقه عبدالمسيح**" بھی نہایت ہی نفیس اور مکمل کتاب ہے۔ امام رحمت اللہ ہندی کی کتاب "اظہار الحق" بھی ایک علمی اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مصنف نے نصرانی مبلغین کو لاچار و لاجواب کر دیا ہے۔ "**منهاج السنته النبويه**" بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے جس میں اس موضوع پر کافی اہم مواد جمع کیا گیا ہے۔

اکثر علمائے اسلام تورات و انجیل میں نسخ و تحریف کا دعویٰ کرتے ہیں، حالاں کہ اس

دعویٰ کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ کتب عہدین میں ایک نہیں، ہزار تحریفات کی گئی ہوں لیکن آج ہمارے لئے یہی چیز مفید ہے کہ ہم عہد قدیم و جدید کو اسی طرح قبول کرلیں جس طرح تمام تراجم کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ ہم اس کو اس طرح تسلیم کریں کہ کتب عہدین ہمارے اور اہلِ کتاب کے مابین ایک مانا ہوا اور تسلیم شدہ مقدمہ ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ قرآن کریم کی فضیلت و بزرگی کس طرح کتب عہدین پر غالب آتی ہے۔

قرآن کریم تورات کی کئی جگہ ثناء خوانی کرتا ہے۔ "ولقد آتینا موسی الکتاب من بعد مااھلکنا القرون الاولی بصائر للناس وھدی ورحمۃ لعلھم یتذکرون" (القصص ۴۳)۔

"قل فاتو ابکتاب من عند اللہ ھوا ھدی منھما اتبعہ"۔ (القصص ۴۹)

"وآتینا ھما الکتاب المستبین o وھدینا ھما الصراط المستقیم"۔ (الصافات ۱۱۸)۔

میں نے اپنی کتاب "یاجوج" میں عہد قدیم و جدید کا اجمالی بیان پیش کیا ہے اور بتلایا ہے کہ انجیل حضرت مسیح کی کتاب نہیں تھی بلکہ انجیل کی حقیقت وہ ہے جو سورۂ صف میں بیان کی گئی ہے۔ "واذقال عیسیٰ ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لمابین یدی من التورٰۃ و مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ، احمد" حضرت مسیح نے تورات کے سوا کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا اور اگر ان کے پاس تورات کے علاوہ کوئی اور کتاب ہوتی تو اس کا ضرور ذکر کرتے۔

میری رائے میں یہ .............. اس لئے نہیں کہ اہلِ کتاب سے ہم مجادلہ کریں بلکہ اس لئے کہ قرآن کریم کی سینکڑوں آیات کے سمجھنے میں ہم کو مدد مل سکے۔

(۱۶) مندرجہ بالا نمبروں میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ جامعہ اسلامیہ کے نصابِ تعلیم میں صرف علوم اسلامیہ کے شعبے سے متعلق میرا تصور ہے باقی رہا جامعہ اسلامیہ کا علمی شعبہ تو اس کی بابت کسی طویل و عریض بیان کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ جامعہ اسلامیہ کے علمی شعبہ کا نظام تمام عالم متمدن کے ثانوی مدارس کے معیار کے مطابق ہونا چاہئے اور طبیعات و ریاضیات نیز دیگر معارف عمومیہ (Popular Sciences) کا نصاب

ہماری جامعہ اسلامیہ میں مہذب دنیا کی درس گاہوں سے کم نہ ہونا چاہئے۔

جامعہ اسلامیہ علمیہ اپنے اس نظام اور اس نصاب تعلیم کے ساتھ اسلامی دنیا کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی باقاعدہ اور منظم درس گاہ نہیں ہے جہاں تمام اسلامی علوم کامل طریقے پر پڑھائے جاتے ہوں اور جب یہ نہیں ہے تو علوم اسلامیہ میں ایک مسلمان کی انتہائی اور مکمل تعلیم کی امید سوائے ہماری مطلوبہ اسلامی علمی یونیورسٹی کے کسی دوسری درس گاہ سے نہیں ہو سکتی۔

پوری اسلامی دنیا میں اپنے قسم کی واحد درس گاہ یہی جامعہ اسلامیہ علمیہ ہو سکتی ہے۔ اس میں پڑھنے کے لئے فرزندان و دختران اسلام میں سے وہی لوگ لئے جاسکتے ہیں جو اپنی پوری زندگی اسلام اور اسلامی علوم کے لئے وقف کر سکتے ہیں۔ باکمال بننے کے لئے یورپ و امریکا میں بہت سی درس گاہیں موجود ہیں اور جب اسلامی دنیا اپنے تعلم کے دور سے گزر رہی ہے اس کو چاہئے کہ زندگی کے دوسرے ضروری علوم و فنون کو مہذب دنیا کی درس گاہوں سے حاصل کرے۔ بہت ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ مسلمان طلباء اور طالبات کو ایسی توفیق بخشے کہ وہ دنیائے تمدن سے ہر علم و فن کے خزانے حاصل کر سکیں اور کچھ دنوں کے بعد نہ صرف یہ کہ علوم و فنون میں مغربی ممالک کے برابر آجائیں بلکہ کچھ اور آگے بڑھ کر قدم رکھ سکیں۔ "وماذلك علی الله بعزیز" عالم اسلام کا روشن مستقبل ہماری قریب ترین آرزو ہے۔

رہ علم است از سر کردہ پابایددید این جا　　　　که پا از سر نداند ہر که از خود پاکشید این جا

"ولاتیأسوا من روح الله، انه لاییا س من روح الله الاالقوم الکافرون۔"
(۱۲: ۸۷)۔ یہ چیز ہے جو ارباب علم اور صاحبان بست و کشاد کی خدمت میں ایک مدت سے میں عرض کرنا چاہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بے خبر نہیں ہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔

## ڈاکٹر ذاکر حسین

اگر آپ اپنی قومی زندگی کی موجودہ پستی پر مطمئن ہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ

آپ کے مدرسے ہی کیا آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں ذرا تبدیلی نہ کیجئے، وہ معاشرت میں نری تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں محکومیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوق تحقیق اور فنون میں ذوق تخلیق سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے اور کمزور جسم، بے نور دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ہیں۔

مسلمان ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہو اور اسی کے دنیاوی اور سیاسی مفاد کے ادھیڑ پن میں لگا رہتا ہو۔ مسلمان پر ساری دنیا کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اپنے ملک کی ذمہ داریاں بھی ہیں، مسلمان ہونے کے معنی ہیں ذہنی زندگی کا ایک مطمح نظر رکھنا، اقدار کا کوئی نظام ماننا، اخلاق کے کچھ معیار تسلیم کرنا، پست و بلند، خوب و زشت کے کچھ پیمانے برتنا، صالح انفرادی اور صالح اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ، فرد اور جماعت کے ربط کا کچھ تصور ذہن میں رکھنا.............

ایک ایسی دنیا جو نسل و وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے، پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہے جو ایک امی نبی ﷺ نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملتِ اسلامیہ اس تقدیر، اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روپیوں کے بدلے بیچ دے گی؟

# مولانا آزاد کمیٹی کا مرتبہ نصاب

نصاب مجوزہ برائے مدارس عربیہ و فارسیہ۔ مرتبہ عربی و فارسی کمیٹی مقرر کردہ "یوپی گورنمنٹ" کے نام سے ۱۶/۳۰x۲۰ سائز کے ۱۸۵/۳۲ صفحات پر مشتمل یہ نصاب غالباً ۱۹۵۱ء کے آس پاس چھپ گیا تھا۔ لیکن مولانا کی دوسری مصروفیات کے باعث یوپی گورنمنٹ کو مولانا کے سفارشی خط کے ساتھ بھجانہ جا سکا۔ اس لئے عمل در آمد کا کوئی سوال پیدا نہ ہوا۔ اس میں کل مدت تعلیم ۱۶ سال رکھی گئی تھی۔ درجہ اولیہ پانچ سال' درجہ ثانویہ تین سال' درجہ عالیہ (مولوی: ۳ سال' عالم: ۳ سال' فاضل : ۲ سال اور علامہ: ۲ سال) ۱۰ سال۔

خصوصیت اس نصاب کی اگر کچھ تھی تو یہ کہ فلسفہ' ریاضیات اور اقتصادیات جیسے علوم کے ساتھ ایک ایک پرچہ اس علم کی مسلمانوں کے ہاتھوں پرورش کی تاریخ پر بھی مشتمل ہوتا تھا۔ یعنی فلسفہ اسلامی' اسلامی ریاضیات' اسلامی سیاسیات اور اسلامی اقتصادیات اور جغرافیہ میں "جغرافیہ عالمِ اسلام" کا ایک مزید پرچہ شامل ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ فاضل کے درجہ میں فاضل عقلیات' فاضل دینیات' سنی' شیعہ اور فاضل ادبیات' یہ ۴ اختیارات دیئے گئے تھے اور علامہ کے درجہ میں تفسیر' حدیث اور فقہ تین علوم کے اختیارات تھے۔

مجموعی حیثیت سے یہ اب تک کی ساری کوششوں میں سب سے زیادہ مفید کار آمد اور اہم کوشش تھی۔

# مدارس عربیہ کے نصاب کی اصلاح کے متعلق مولانا آزاد کا نقطہ نظر اور مدرسہ عالیہ رام پور کا مجوزہ نصاب

مولانا محمد السلام خان
(سابق پرنسپل' مدرسہ عالیہ رام پور)

حضرت مولانا آزاد اپنے عہد کے عبقری تھے' ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت خود قدرت کے ہاتھوں ہوئی تھی تاہم چوں کہ ان کی ابتدائی اور متفرق جزوی اعلیٰ تعلیم قدیم مکاتب و مدارس کے روایتی نصاب کے مطابق ہی تھی' اصلاً وہ مدارس کے مروجہ قدیم نصاب کی پیداوار اور پرانے اساتذہ کے حلقہ درس کے تربیت پائے اور قدیم فضلاء کے صحبت یافتہ تھے چناں چہ مدارس اور ان کے درسی مضامین سے ان کی دل چسپی قدرتی تھی اور برابر قائم رہی جو ملک کے دوسرے اہلِ فکر میں عموماً مفقود تھی اور آج تک ہے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر سے کچھ پہلے سر سید مرحوم نے علوم جدیدہ کی تحصیل اور سائنس اور مذہب کی تطبیق کی جو آواز اٹھائی تھی اس سے ملک میں ہمہ گیر بیداری کی لہر پیدا ہو گئی تھی' وقت کا ہر دانش مند اور دور اندیش اس سے متاثر تھا' مولانا جو رسمی اور روایتی مذہب سے بیزار سے ہو چکے تھے اور شک و ارتیاب کے شکار تھے' علی گڑھ تحریک سے کیسے متاثر نہ ہوتے' وہ متاثر ہوئے اور خوب خوب ہوئے' شک و ارتیاب کی دلدل سے سر سید کی تصانیف ہی نے ان کو نکالا اور طمانیت سے ہم کنار کیا۔ غالباً یہی زمانہ ہو گا کہ انہیں مدارس

---

"ابو الکلام" از عرش ملسیانی ص ۱۷۰ میں ہے: اپنے متعدد مضامین میں جو مدارس اسلامیہ عربیہ کے نصاب اور طرز تعلیم کی اصلاح کے متعلق لکھے ہیں اپنے طور پر ان کے مروجہ نصاب اور روایتی طریق درس کی خامیوں پر روشنی ڈالی ہے نیز مسلمانوں کی درس گاہوں کی تاریخی خصوصیت اور وقتاً فوقتاً بدلتے اور

کے مروجہ نصاب اور طریق درس کی خامیاں نظر آنے لگیں اور ان کی اصلاح کے خیال کے ساتھ ہی صحیح معنی میں "اسلامی یونیورسٹی" کا تصور ان کے ذہن میں جاگزیں ہو گیا۔ لیکن صحافتی اور پھر سیاسی مصروفیتوں نے انہیں موقع نہ دیا کہ وہ مروجہ نصاب اور روایتی طرزِ تعلیم پر نقد کرتے' ان کی خامیاں اجاگر کرتے اور ان کی اصلاح کے لئے اقدام کرتے۔ علاوہ ازیں اس درس سے انتساب کے باوجود مولانا کا نہ کسی مدرسے سے درسی تعلق رہا نہ اس کے اساتذہ یا ارباب اختیار سے کوئی علمی یا انتظامی رابطہ پھر مولانا اور اہل مدارس کا فکری بعد' اس پر ان کا اختلاط اور عوامیت سے گریز ایسے اسباب تھے کہ اگر مولانا مروجہ نصاب اور طرزِ تعلیم کی اصلاح کے لئے آواز اٹھاتے بھی تو غالباً صدا البحر اثابت ہوتی بلکہ قدیم مدارس کے تربیت یافتہ علماء کی بدظنی میں اضافہ ہی ہوتا جو مولانا کی سیاسی مصلحتوں کے خلاف تھا۔

مولانا آزاد مسلمانوں کے لئے یونیورسٹی کے تو سخت حامی تھے لیکن ان کا اپنا مطمح نظر محض مسلم یونیورسٹی نہ تھی' ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر واقعی مسلمان ایک آزاد اور صحیح معنوں میں اسلامی یونیورسٹی بنا سکیں تو یہ ان کے تمام امراض کا نسخہ وحید ہے۔ چناں چہ مولانا ایم او کالج کو اس کی اس وقت کی حالت کی بناء پر مسلمانوں کے امراض کا صحیح مداوا نہیں جانتے تھے اور شاید اس لئے کہ وہ دینیات کی اوپری پیوند کاری کو جیسا کہ ایم او کالج میں اس کو اسلامی بنانے کے لئے کی گئی تھی اور جس کو بعد میں یونیورسٹی میں برقرار رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں اور اسلام کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے۔

اسلامی یونیورسٹی کے متعلق مولانا کے تصور کو جاننے اور یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ یہ تصور وقتی نہ تھا بلکہ بہت پہلے سے ان کے ذہن کے گوشوں میں پڑا ہوا تھا۔ عربی' فارسی مدارس کے اصلاحی نصاب مرتب کرانے کے لئے کانگریس کے برسر اقتدار آتے ہی کمیٹی کی تشکیل کی تھی۔ جس کے صدر خود مولانا مرحوم تھے لیکن ۱۹۴۷ء کی تشکیل دی ہوئی کمیٹی کی

---

اضافہ ہوتے مضامین درس کو بھی واضح کیا ہے' یہ مضامین بریلی کے ماہنامہ "الفرقان" اور دہلی کے "برہان" میں شائع ہو چکے ہیں' برہان میں مسلم ذہن کے ہمہ گیر جمود کی تعلیل کی بھی کوشش کی ہے' فی الوقت ملاحظہ ہوں میرے مقالے مطبوعہ "عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم" از ڈاکٹر سید ارحس ۲۵۔۴۷ "الہلال جلد نمبر ا مورخہ ۴ اگست ۱۹۱۱ء بحوالہ مقالہ ضیاء الدین انصاری مولانا آزاد اور علی گڑھ ۲۴ عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم ص ۱۵۳۔۱۵۴ ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم کی تقریر کا اقتباس

کارکردگی کی تکمیل نہ ہو سکی۔ دوسری بار ۱۹۴۷ء کے بعد پھر ایک کمیٹی کی کارروائی کئی سال تک چلتی رہی' اپنی وزارتی مصروفیتوں کی بناء پر اگرچہ مولانا بذات خود اس کی کارروائیوں پر زیادہ توجہ نہ دے سکے تاہم آخر میں اس کی ایک نشست ان کی کوٹھی پر بھی ہوئی اور اس میں کمیٹی کے سب ہی ارکان شریک ہوئے۔ کمیٹی کی آخری روداد تیار ہو چکی تھی اور مدارس عربیہ کا تفصیلی نصاب مرتب ہو گیا تھا مگر چوں کہ مولانا کو اسے اپنی تحریر کے ساتھ یوپی کی حکومت کو بھیجنا تھا لیکن اپنی غیر معمولی مصروفیتوں کی وجہ سے مولانا اس کو حکومت یوپی کو نہ بھیج سکے۔ چناں چہ باوجود ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ اس کے طبع ہو چکنے کے اس کا نفاذ نہ ہو سکا نہ پوری طرح اشاعت۔

مدارس عربیہ وفارسیہ کا یہ مجوزہ نصاب جو یقیناً مولانا کے ایماء پر بلکہ غالباً ان کے دیئے ہوئے اصلاحی خطوط پر بنایا گیا تھا شانزدہ سالہ تھا۔ یہ نصاب مرحلہ ابتدائیہ اور عالیہ پر تقسیم ہے۔ مرحلہ ابتدائیہ 'اولیہ اور ثانویہ پر مشتمل ہے۔ اولیہ کی مدت تعلیم پانچ سال اور ثانویہ کی تین سال ہے۔ مضامین کو لازمی اور اختیاری میں تقسیم کر کے ان میں کثرت پیدا کی گئی ہے۔ اس میں عربی' فارسی' اردو اور دینیات لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرحلہ عالیہ 'مولوی' عالم' فاضل اور علامہ پر مشتمل ہے۔ پہلے دو کی مدتِ تعلیم تین' تین سال اور آخری دو کی دو' دو سال ہے۔ فاضل کے چار شعبے ہیں۔ فاضل دینیات' فاضلِ ادبیات' فاضلِ عقلیات اور فاضل تاریخ اسلام' مرحلہ تخصص یا علامہ میں علامہ تفسیر' علامہ حدیث اور علامہ فقہ ہیں۔

ان درجات کے تفصیلی نصاب کا احاطہ یا اس پر مفصل تبصرہ تو مقالے کی حدود وسعت سے باہر ہے۔ پھر بھی اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ عربی زبان اور اسلامیات کو اس نصاب میں مرکزی حیثیت دی گئی ہے اور درجہ فاضل کے آخری تین شعبوں کو چھوڑ کر سب میں دینیات کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ تخصص کے تینوں شعبے تو خالص دینیات ہیں۔ ساتھ ساتھ کلیہ فنون کے قریب قریب سب ہی مروجہ فنون گریجویشن کی حد تک شامل ہیں اور گنجائش ہے کہ فنون کے ساتھ علوم حکمی کو بھی فنون میں کمی کر کے شامل کر دیا جائے اور اس طرح مولانا مرحوم کا خواب "صحیح معنی میں اسلامی یونیورسٹی" خارجی حقیقت بن جائے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مجوزہ نصاب اپنی تمام تکمیلوں کے ساتھ عملی سے زیادہ نظری ہے۔ اس کے تمام مرحلے سب ہی مروجہ نصابوں کے مرحلوں سے بہت بھاری

ہو گئے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کا عملی نفاذ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے غیر معمولی مشکلات کا باعث ہو گا اور بغیر ترمیموں کے اس کی تکمیل ممکن نہ ہو گی۔ اس نصاب کی گرانی پر میری یادداشتوں میں جو غیر مطبوعہ ہیں خاصا تبصرہ ہے۔

مولانا کے نقطۂ نظر کی دوسری تعبیر مدرسہ عالیہ رام پور کا مجوزہ نصاب ہے۔ یہ نصاب چوں کہ مولانا مرحوم کے بعد مرتب ہوا اس لئے اگرچہ ان کی نظر سے تو نہیں گزرا لیکن اس کے اصول ترتیب کو مولانا کی منظوری حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ مدرسہ عالیہ رام پور کی گرتی ہوئی حالت اور اس کے نصاب کی 'زندگی سے ناآہنگی اور موجودہ علمی عہد اور سائنسی دور میں اس کی اپنی مقصد تربیت و تسکین میں ناکامی کے پیشِ نظر میں اواخر ۱۹۵۲ء یا اوائل ۱۹۵۳ء میں حضرت مولانا کی خدمت میں باریاب ہوا اور مولانا کو مدرسے کی حالتِ زار کی طرف متوجہ کیا اور اُن سے اس کی اصلاح کے لئے مناسب اقدام کی درخواست کی۔ مدرسے کے اصلاح نصاب کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور عرض کیا کہ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ دیناتی عربی جو ہماری دیناتی کتابوں اور ہمارے مروجہ فنون کی زبان ہے اس کو اور دینیات کو قدیم نصاب کے ایک خاص مرحلے تک لازم اور مرکز بنا کر ملک میں مروج جدید نصاب سے اس کو جامعی مراحل تک اختیاری اور لازمی مضامین میں تقسیم کر کے ممتزج کر دیا جائے۔ یہ ایک طرح سے خود مولانا کی رائے کی ہی نمائندگی تھی۔ مولانا نے اس خیال کی تصویب کی اور نواب صاحب رام پور کے شدید اختلاف کے باوجود مجھے مدرسے کی پرنسپلی کے لئے نامزد فرمادیا۔

مدرسے کے لئے جدید مجوزہ نصاب کی ترتیب مولانا کی زندگی میں تو نہ ہو سکی۔ مولانا کے بعد میری ذاتی کوششوں سے ۷ مئی ۱۹۵۹ء کو حکومت یوپی نے مدرسے کے لئے ڈائریکٹر تعلیمات یوپی کی زیر صدارت ایک عارضی بورڈ کی تشکیل کر دی جس کا پہلا اجلاس ۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ہوا جس میں ایک نصاب کمیٹی کی تشکیل کر دی گئی۔ نصاب سب کمیٹی نے نصاب مرتب کر کے ۱۵ مئی ۱۹۶۰ء کو صدر بورڈ کو پیش کر دیا لیکن یوپی گورنمنٹ کی طرف سے دو توسیعیں ملنے کے باوجود اس بورڈ کا دوسرا اجلاس نہیں بلایا گیا۔ بار بار کی یاد دہانیوں پر بورڈ کے صدر اور تعلیمات کے ڈائریکٹر مسٹر چک نے جھلا کر انسپکٹر مدارس عربیہ و فارسیہ سے جو بورڈ کے سیکریٹری تھے، کہہ دیا کہ چور دروازے سے مدرسے کو یونیورسٹی نہیں بنا سکتا۔

درمیانی باتوں کو چھوڑ کر اتنا اور کہہ دوں کہ ۱۹۷۵ء میں یوپی گورنمنٹ نے اس نصاب کو ثانوی مرحلے (انٹر) تک منظور کر لیا۔ میں جولائی ۱۹۷۵ء میں ریٹائر ہو گیا اور مدرسے میں گورنمنٹ آرڈر دبا دیا گیا اور اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

اس نصاب کی مدت تعلیم تخصص کے دو سال شامل کر کے اٹھارہ سال ہے۔ اس نصاب کے تحت مدرسے کے مختلف شعبوں کو ختم کر کے ایک مسلسل وحدت کی صورت میں ابتدائی' وسطانی اور عالی تین خود بکار آمد مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لازم اور اختیار میں تقسیم کر کے مضامین میں کثرت پیدا کی گئی ہے' اس کو زندگی کے مختلف شعبوں میں مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور مدرسے کی تاریخی خصوصیت کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔ عربی اور اسلامیات میں مدرسے کی قدیم درسیات کو اس نصاب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ مجوزہ نصاب کی مرحلے وار تقسیم یہ ہے۔

☆مرحلہ ابتدائی ۵ سال ☆مرحلہ وسطانی ۳ سال ☆مرحلہ عالی ۸ سال

یہ مرحلہ پانچ موقفوں پر حاوی ہے۔ ☆لائق ۲ سال ☆ مولوی ۲ سال ☆ عالم ۲ سال ☆فاضل ۲ سال۔ تخصص (علامہ تفسیر' علامہ حدیث اور علامہ فقہ) ۲ سال۔

اس نصاب میں بھی فنون کے ساتھ علومِ حکمی کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

# نصاب برائے مدرسہ عالیہ
## (گورنمنٹ اورینٹل کالج) رام پور

### مدرسہ عالیہ :

مدرسہ عالیہ رام پور جس کا بقول مرتبین سر رادھا کرشنا یونیورسٹی ایجوکیشن رپورٹ غیر منقسم ہندوستان کی ۱۸۵۷ء سے قبل کی یونیورسٹیوں میں شمار ہے۔ ۱۷۷۴ء میں بعہد نواب فیض اللہ خاں قائم ہوا۔ اپنے زمانہ قیام سے اب تک یہ مدرسہ ہند اور بیرون ہند کی جو تعلیمی خدمات انجام دیتا رہا ہے اور اطراف و جوانب کے ایشیائی ممالک اور ہندوستان میں جس ثقافتی داد و ستد کا ذریعہ بنا رہا ہے اس نے رام پور کی چھوٹی سی ریاست کو افریشیائی ممالک میں خاصی شہرت اور اہمیت کا مالک بنا دیا ہے۔ چناں چہ سابق ریاست بھی انضمام کے وقت مدرسہ کی اس اہمیت سے صرف نظر نہ کر سکی اور اس کو رام پور کی زندگی کا تعلیمی طرۂ امتیاز قرار دیتے ہوئے اس کی بقاء کے لئے معاہدہ انضمام میں ایک خصوصی دفعہ رکھی۔ خود حکومت ہند بھی افریشیائی روابط کا ایک اہم حلقہ ہونے کی وجہ سے ہی غالباً اپنی سرکاری ڈائریکٹری میں اس کا تذکرہ ضروری سمجھتی رہی ہے۔ مدرسے کی ان ہی اہمیتوں کے پیش نظر غالباً اتر پردیش کی حکومت نے بھی اس کو نہ صرف قائم رکھنے کا فیصلہ کیا بلکہ اس کے لئے ایک بورڈ آف اسٹڈیز بنا کر اس کو ترقی دینے کی طرف بھی ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔

### نصاب سب کمیٹی :

اس بورڈ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں اس کے نصاب کا مسودہ مرتب کرنے کے لئے جو سب کمیٹی بنائی تھی اس سے مدرسے کی تاریخی اہمیتوں، ماضی کی شان دار روایتوں اور مستقبل کی متوقع ترقیوں کے پیش نظر اس کے شایان شان ایک نصاب تجویز کیا ہے جو کہ بروئے کار آگیا تو غالباً بر عظیم ہندوستان کا یہ سب سے قدیم تعلیمی ادارہ آزاد بھارت

کی قومی حکومت کے تحت نہ صرف یہ کہ قدیم مشرقی علوم کا سب سے بڑا مرکزی ادارہ ہوگا بلکہ ہندوپاک مشرقی مراکز تعلیم کے لئے قابل تقلید نمونہ بھی ہوگا اور اس طرح مشرقیات کی تاریخ تعلیم میں ایک اہم موڑ ثابت ہوگا۔

## مدرسے کے موجودہ شعبے:

مدرسہ عالیہ رام پور نام ہے چار شعبوں کے مجموعے کا شعبہ نظامی' شعبہ درجات تحتانیہ' ابتدائی و وسطانیہ' شعبہ غوثیہ' شعبہ درجات الہ آباد بورڈ برائے امتحانات عربی و فارسی۔

شعبہ نظامی میں دہ سالہ وحدانی درس نظامی مروج ہے۔ اس میں داخلہ کے لئے اُردو' فارسی کی کافی استعداد اور نوشت وخواند کی پختہ لیاقت ضروری سمجھی جاتی رہی ہے۔ چناں چہ مدرسے کے تحتانی درجات میں جس طرح اعلیٰ فارسی کی تعلیم کے لئے ضروری تھے۔ اسی طرح شعبہ نظامی کے لئے بھی موقوف علیہ سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح گویا درس نظامی سے فراغت کے لئے کم از کم ۱۵'۱۶ سال درکار تھے اور ہیں گو حالات کے تحت درس نظامی کے لئے اب ابتدائی تعلیم کی ضرورت پر اصرار نہیں کیا جارہا ہے۔

مدرسہ کا شعبہ تحتانیہ اصلاً سات اور منشی سال اول کو شامل کر کے آٹھ درجات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مستقل نصاب کا معیار اواخر عہد ریاست میں ہی ضروری حذف واثبات سے مروجہ اسکولوں کے ساتویں درجے کے مساوی قرار دے دیا گیا تھا۔ اس طرح اس سے نکلنے والے طلباء جہاں مروجہ اسکولوں کے آٹھویں درجہ میں داخلہ لے سکتے تھے وہاں الہ آباد بورڈ کے منشی کے لئے بھی طلباء مہیا کرتے تھے اور درس نظامی کے شائق شعبہ نظامی میں داخلہ بھی لے سکتے تھے۔

شعبہ غوثیہ چھ درجوں کا مجموعہ ہے۔ اصلاً یہ قرآن مجید کے حفظ وناظرہ کا مکتب ہے۔ جس میں قرأت اور اردو' ہندی' حساب وغیرہ ضروری مضامین کا ریاست کے عہد میں ہی اضافہ ہو چکا تھا۔

شعبہ درجات' امتحانات' عربی و فارسی اتر پردیش منشی کا اور عالم' فاضل' ادیب چار درجات کا مجموعہ ہے۔ ہر درجہ کا درس دوسالہ ہے۔ اس کا نصاب اتر پردیش کا بورڈ آف

عربک اینڈ پرشین اگزامینیشن طے کرتا ہے اور اسی کے تحت ان کے امتحانات ہوتے ہیں۔

## مجوزہ نصاب :

پیش نظر مجوزہ نصاب مدرسہ عالیہ کے سابق تین شعبوں کو حاوی ہے۔ آخری اور چوتھے شعبے کا نصاب خارج از بحث ہے۔ اس نصاب میں شعبوں کے اختلاف اور تعداد کو ختم کر کے ایک مسلسل وحدت کو متعدد تدریجی و خود بکار آمد مرحلوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ لازم اور اختیاری میں تقسیم کر کے مضامین میں کثرت بھی پیدا کی ہے اور نصاب کو زندگی کے مختلف شعبوں میں مفید بھی بنا دیا گیا ہے۔ یوں تو اثناء تجویز نصاب میں قدیم مشرقی اور مروجہ جدید مکاتب و مدارس اور کلیات کے متعدد نصاب سامنے رکھے گئے ہیں اور ان سے حتیٰ الامکان فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن کافی غور و فکر کے بعد یوپی گورنمنٹ کی مقرر کردہ عربی و فارسی کمیٹی کے مجوزہ نصاب کو صرف اس ترمیم کے ساتھ کہ اس کے دو سالہ مراحل کو تین دو سالہ مراحل بنا کر اس نصاب کے مراحل کی اساس قرار دے دیا گیا ہے۔ تعین مضامین اور ان کے لازم و اختیاری میں تقسیم اور تشخیص کتب میں بھی اس نصاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ آٹھویں درجہ تک کے نصاب میں یوپی کے درجات ابتدائی مدارس عربی و فارسی کے سرکاری نصاب تعلیم نے بھی کافی رہنمائی کی ہے۔ یوپی عربک اینڈ پرشین اگزامینیشن بورڈ کے درجات عربی کے نصاب سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ تاہم عربیات کے قدیم درس میں کافی غور و خوض کے بعد مدرسہ عالیہ کے مروج نصاب کو بنیاد بنا لیا گیا ہے اور بعض جزوی حذف و اثبات سے نصاب کے موجودہ خاکے میں اس کو کھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نئے مروجہ مضامین اور ان کے معیار میں یوپی کے بیسک 'جونیئر' ہائر سیکنڈری مدارس اور جامعی و بعد الجامعی درجوں میں آگرہ یونیورسٹی کے نصابوں کو اساس بنا لیا گیا ہے۔ مدرسے کی روایات اور ضرورت کے پیشِ نظر محض بعض مضامین کا حذف اور بعض کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اختیاری اور لازمی کی تقسیم اور ان کی تعیین سے نصاب کو متنوع المقاصد بنانے کے ساتھ ساتھ مدرسے کے تاریخی مطمحِ نظر سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

## درجات غوثیہ :

مدرسے کے قدیم شعبہ غوثیہ کو مجوزہ نصاب میں بنیادی مکتب کی حیثیت دے کر

مدرسے کے وحدانی سلسلہ کا ابتدائی مرحلہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی روایتی تعلیم ناظرہ خوانی اس کے نصاب دینیات کا جز ہے اور حفظ تین مضامین کا بدل بنا کر اس کے عام نصاب میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ زبان (اردو' ہندی) ریاضی، ورزش جسمانی اس مرحلے کے ضروری مضامین ہیں اور چوں کہ مروجہ جونیئر اسکولوں میں داخلہ کا امتحان ان ہی مضامین میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس مرحلہ تعلیم سے نکلنے والے طلباء جہاں مدرسہ کے وسطانی درجات میں داخلہ لے سکیں گے۔ وہاں عام جونیئر کلاسز میں بھی جا سکیں گے۔ اس کے ابتدائی تین سالوں میں اردو ہے اور آخری دو سالوں میں فارسی جس کے تفصیلی نصاب میں یہ شرط ہو گی کہ فارسی کے مفردات اور فقروں میں وہی الفاظ انتخاب کئے جائیں جو اردو میں مستعمل ہوں اور قواعد میں اضافی اور توصیفی ترکیبوں پر ہی زور دیا جائے۔ فارسی کا درس بحیثیت خود اردو کا ہی تکملہ ہے۔ ساتھ ہی آئندہ درجات کی فارسی کے لئے معاون بھی اس طرح ایک معنی میں اردو کا درس پنج سالہ ہو جائے گا۔ مزید بر آں دینیات کا نصاب بھی اردو کتابوں میں مستعمل ہے اور آئندہ درجات میں بھی اردو اور فارسی یا عربی درس ہے اس لئے بطور لازم اردو کی تعلیم پر مزید زور دیتے رہنا زیادہ مفید نہیں سمجھا گیا۔ مروجہ بیسک مکاتب میں حرفت کی تعلیم لازم ہے۔ مجوزہ نصاب میں "سررشتہ تعلیم اتر پردیش" کے نصاب تعلیم برائے درجات ابتدائی مدارس عربی و فارسی کے تتبع میں اس مضمون کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور دینیات نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اس طرح مروجہ بنیادی مکاتب کے مضامین میں عدداً بھی زیر نظر نصاب کے برابر ہیں۔

## درجات وسطانیہ :

مدرسہ کا شعبہ درجات وسطانیہ جو اصلاً فارسی کی اعلیٰ تعلیم اور عربی کے درس کے لئے مدارج کا کام دیتا تھا اور پھر اس کے مستقل نصاب میں ترمیمیں کر کے اس کورس کو جونیئر کلاسز کے معیار تک پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی' مجوزہ نصاب میں اس کو پوری تعلیم کا وسطانی مرحلہ بنایا گیا ہے۔ عربی اور دینیات تو اس میں لازم مضمون کی حیثیت سے ہیں ہی لیکن فارسی کو اختیاری قرار دے کر فارسی کی اعلیٰ تعلیم یا درجات و کامل الہ آباد بورڈ کے لئے اس کی سابقہ حیثیت کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ عربی لازم ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ عربی کی تعلیم

کے لئے مدارج کا کام دیں گے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مرحلہ بحیثیت خود مکمل ہو ساتھ ساتھ اس سے نکلنے والے طلباء حسب سابق مروجہ ہائر سیکنڈری اسکولوں میں داخل ہو سکیں۔ اس میں جتنی عربی اور دینیات ہے کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنی جگہ بطور خود زندگی میں مفید و بکار آمد رہے۔ تمام جونیئر کلاسز کے مضامین کے ساتھ یہ تعداد میں مطابق ہیں۔ اتر پردیش کے مدارس میں عربی و فارسی کے درجات ابتدائی کے سرکاری نصاب کی تقلید میں صرف حرفت کو لازم مضامین کی فہرست سے نکال دیا گیا ہے۔ ورنہ اس کے مضامین ان کے مضامین کے ساتھ لازم و اختیاری دونوں قسموں میں یکساں ہیں۔ مدرسے کی روایات اور اس میں برابر پڑھائے جاتے رہنے والے مضامین کا لحاظ کر کے جونیئر کلاسز کے بعض اختیاری مضامین کو مجوزہ نصاب کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے اور اختیاری مضامین کے سلسلہ میں قرأت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ حرفت کے ذیل میں خطاطی کا جو مدرسے کا ہمیشہ سے اختیاری مضمون رہا ہے اور نقاشی کا جو خطاطی کے متعلقات سے ہے اور ابھی تک رامپور میں قدیم روایات کے ساتھ اس کو جاننے والے موجود ہیں' اضافہ کر دیا گیا ہے۔ صحافی یا جلد بندی جو جونیئر کلاسز کا ایک حرفہ ہے مدرسے کا ہمیشہ سے پیشہ ورانہ مضمون درس رہا ہے' اس لئے مدرسہ عالیہ کے زاویہ نظر سے یہ تین پیشہ ورانہ مضمون خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

## درجات عالیہ :

شعبہ نظامی جو فی الحال دو سالہ نصاب پر مشتمل ہے' اس کا عام درس ہشت سالہ کر دیا گیا ہے اور دو سال تخصص کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں اور اس طرح دس سال پورے کر کے اس کو مستقل مرحلوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

لائق کو میٹرک سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ صرف ایک استثنا ہے کہ میٹرک میں ریاضی لازم ہے۔ لائق میں اس کو طلباء کے رجحانات کا لحاظ کرتے ہوئے اختیاری بنا دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ۱۹۵۲ء کے الہ آباد ہائر سیکنڈری اور انٹرمیڈیٹ بورڈ کے سلیبس میں سے لیا گیا تھا' اس کے لازم مضامین کی دینیات جو عربی کتب کے ذریعہ سے پڑھائی جائے گی اور عربی ادب' جو ہمارے مدرسے کی تاریخی خصوصیت ہیں بحیثیت مجموعی عربی مضمون ہی ہیں ان کو لازم قرار دینا گویا میٹرک کے نصاب کے اختیاری مضمون عربی کو بذیل

قدیم زبان لازم قرار دینا ہے۔ دوسرا لازم مضمون ہندسی ہے۔ ریاضی جو عام صورت میں اختیاری ہے سائنس لینے والوں کے لئے اس کو لازم کر دیا گیا ہے۔ اس کے مضامین اختیاری کی فہرست میں طب کا اضافہ مدرسہ کو زمانہ ماضی کے ایک اختیاری مضمون کا اسی حیثیت میں احیاء ہے۔ مزید بر آں طب کی ایک حیثیت پیشہ ورانہ بھی ہے جو عربی کے طلباء کا ہمیشہ سے ترجیحی پیشہ رہا ہے۔ حرفہ کے ذیل میں خطاطی اور نقاشی کا بوجوہ مذکورۃ الصدر اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نصاب مضامین کی تعداد' معیار اور مقاصد سب کے اعتبار سے میٹرک سے مطابق ہو گیا۔ پرانے درسیات میں سے منطق و فلسفہ' معانی و بیان اور اصول فقہ کو اس مرحلے کے نصاب میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا ہے کہ یہ مضامین اس مرحلے کی حد تک مفید نہیں ہوتے۔

مولوی کو انٹر میڈیٹ سے تطبیق دی گئی ہے۔ دینیات اور عربی ادب کا لزوم اگر ان کو مجموعی طور پر عربی ہی سمجھا جائے تو انٹر میڈیٹ کی قدیم زبان' عربی اختیاری کا ہی لزوم ہے۔ منطق بھی انٹر کا اختیاری مضمون ہے۔ مجوزہ نصاب میں اس کو فلسفہ کے ساتھ ملا کر لازم کر دیا گیا ہے۔ مضامین اختیاری کی فہرست میں طب کا اور بذیل حرفہ خطاطی اور نقاشی کا اضافہ ہے۔ انٹر کے بعض اختیاری مضامین کو روایات مدرسہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک مقاصد' تعداد معیار مضامین کا تعلق ہے انٹر کے بالکل مطابق ہے۔ قدیم درسیات میں سے اصول فقہ کی اس مرحلہ میں بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ معانی بیان اور بدیع کو متعارف کر دیا گیا ہے۔

عالم بی اے کا مقابل ہے۔ اس میں دینیات کا لزوم گویا محض بی اے کے اختیاری مضمون عربی کا ضروری قرار دے دینا ہے۔ مدرسے کی ضرورتوں اور روایتوں کے پیش نظر مجوزہ نصاب میں منطق و فلسفہ کا فہرست مضامین میں لازم ہونا بھی بی اے کے اختیاری مضمون فلسفے کو لازم بنانے سے زیادہ نہیں۔ اس مرحلے سے عربی ادب کو لازم سے اختیاری کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ عربی میں استعداد بہم پہنچانے کے لئے نیز آئندہ عربی ادب کو اختیار کر لینے کے لئے اور اس میں مزید مہارت و تخصص حاصل کرنے کے لئے جس حد تک عربی کی ادبی استعداد ضروری ہے پہلے مراحل میں اس کا لحاظ رکھ لیا گیا ہے۔ اب اس کی حیثیت حسب ضرورت و مذاق اختیاری ہے۔ طب کو بھی اس مرحلے کے اختیاری مضمون کی فہرست سے

نکال دیا گیا کیونکہ سابقہ دو مرحلوں کی طبی تعلیم کے بعد فن میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کے لئے طبی جامعوں کے آخری درجات ہی ضروری ہیں۔ بی اے کے اختیاری مضامین کی فہرست سے مجوزہ نصاب میں مضامین لئے گئے ہیں ان میں مدرسے کی روایات اور تاریخ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور تعداد' مضامین اور ان کے معیار و افادیت میں مجوزہ نصاب کو بی اے کے برابر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فاضل کا درجہ موجودہ یونیورسٹیوں کے معیار سے ایم اے کا درجہ سمجھنا چاہئے۔ سابقہ مرحلوں میں درسیات عربی کی عام تعلیم ختم کر دی گئی ہے۔ اس مرحلہ کا مقصد طلباء کے ذوقوں اور ضرورتوں کے پیش نظر مختلف فنون کی حسب پسند تکمیل ہے اس طرح اختیاری حیثیت میں مدرسے کے زیر درس فنون میں سے قریب قریب ہر فن کی تعلیم پہلے کی نسبت سے بدرجہا زائد مکمل صورت میں شامل کر دی گئی ہے۔ اس مرحلے پر قدیم درسیات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

علامہ یا تخصص کے لئے دو سال مزید ہیں تاکہ طلباء اگر چاہیں تو مدرسے کی علمی فضا میں ہندوستان کے عربی' فارسی' اردو کے سب سے بڑے خزانے رضا پبلک لائبریری سے فائدہ اٹھا کر قابل اساتذہ کی نگرانی میں کسی خاص موضوع پر محققانہ نظر پیدا کر سکیں اور اپنے تحقیقی نتائج سے ارباب علم کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔ اس کے تحت جو موضوعات مقرر کئے گئے ہیں وہ متعلقہ فن کے اہم موضوعات ہیں لیکن تحقیق کا میدان انہیں پر محدود نہیں ہے۔

## مجوزہ نصاب کے درس قدیم کی نوعیت :

مجوزہ نصاب کے درس قدیم کا جہاں تک تعلق ہے تو اصولاً یہ نظامی درس سے اور بالعموم اسی کی مروجہ درسی کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ قدیم مدارس کے اعتبار سے اگر کہیں کہیں غیر مروج کتابوں کو شامل کیا گیا ہے و مقصد تسہیل یا اختصار یا فن کا زیادہ بہتر طور پر احاطہ ہے۔ چناں چہ مجوزہ نصاب میں درجہ علامہ سے قطع نظر کر کے بطور لزوم و اختیار درسیات قدیم اور ان سے متعلق کل تقریباً ۸۱ کتابیں ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۵۰ کتابیں بطور اختیار یا بدل ہیں۔ ان میں سے فاضل کے چار متبادل شعبوں میں تقریباً ۱۰ کی اوسط سے ہر ایک کے لئے لازم ہی رہیں گی۔ اختیاری طب کی تین اور اختیاری ادب کی ۵ کتابیں ذوق و ضرورت پر منحصر ہیں۔

اس طرح قریب قریب ۳۴ کتابیں ہر فارغ التحصیل کے لئے لازم وضروری ہیں۔

مدرسہ عالیہ کا مروج نصاب چھوٹی بڑی تخمیناً ۸۴ کتابوں پر مشتمل ہے ان میں سے مجوزہ نصاب میں ۲۸ کے قریب آگئی ہیں۔ بقیہ میں سے قریب قریب دس کتابوں کے بدل کچھ قدیم اور کچھ جدید ۸ کتابوں کی صورت میں آگئے ہیں۔ حضرت ملا صاحب کے مرتب کئے ہوئے قدیم نظامی درس میں شامل کتابوں کی تعداد حساب' ہندسہ اور ہیئت کو شامل کر کے ۳۸ اور خارج کر کے ۳۲ ہے۔ ان ۳۲ میں سے مجوزہ نصاب میں ۱۵ کتابیں شامل ہیں اور ۱۱ کے بدل مگر مروج اور بعض غیر مروج کتابوں کی شکل میں موجود ہیں جہاں تک کتابوں کی مجموعہ بندی' ترتیب اور اختیار کا سوال ہے۔ نظامی درس کے اصول کا ہی بشدت لحاظ رکھا گیا ہے۔

بتقاضائے حالات فرق صرف اتنا ہے کہ مجوزہ درس وحدانی ہے اور موجودہ درس کو خود مختلف مراحل میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور اس تجدید کے تحت ایسی کتابوں کو یا مضامین کو جن کو ایک خاص مرحلے میں بحیثیت خود مفید نہیں سمجھا گیا ہے حذف کر دیا گیا ہے اور ایسی کتابوں کے بجائے ان کے زیادہ سہل یا زیادہ حاوی بدل شامل کر دیئے گئے ہیں۔

## نظامی درس کی تعلیمی خصوصیات :

نظامی درس کا انداز تعلیم بھی جدید مدارس کے انداز تعلیم سے جدا ہوتا ہے۔ کتاب کا حل' مسائل کی تحقیق و تنقیح استیصاب' آموختہ مسائل و مباحث پر نظر اور یہ امور وقت چاہتے ہیں۔ مجوزہ نصاب کے تمام مضامین کے نظام الاوقات مرتب کرا کر ان کا اچھی طرح جائزہ لے لیا گیا ہے۔ چناں چہ غیر عربی درسیات کے لئے پورے ساڑھے پانچ گھنٹوں میں سے جن میں ۳۰ منٹ راحت کے شامل ہیں۔ اتنا وقت مل جاتا ہے کہ مشمولہ کتابوں کی ان کے قدیم انداز سے تعلیم ہو سکے اور نصاب تجویز کرتے وقت عربی درسیات کے اساتذہ سے توقع کی گئی ہے کہ وہ قدیم انداز تعلیم ہی اختیار کریں گے۔

## مجوزہ نصاب کی مدت تعلیم :

بظاہر مجوزہ نصاب کی مدت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی پنج سالہ تعلیم کو جو عنقریب ہی لازم ہونے والی ہے اگر خارج کر دیا جائے تو تخصص کو الگ کر کے پورا

درس گیارہ سال کا ہے جس میں مروج مضامین کے ساتھ ساتھ قدیم فنون کی تکمیل ہو جاتی ہے اور موجودہ مدت درس پر جودہ سال ہے صرف ایک سال بڑھ جاتا ہے۔ جو دیگر مضامین کو دیکھتے ہوئے قابل لحاظ نہیں اور فی نفسہ بھی یہ مدت تعلیم زائد نہیں بلکہ ملک میں مروج جامعی اور بعد الجامعی تعلیم کی مدت سے مطابق ہے۔

نوٹ۔ آئندہ صفحات میں پہلے کالم پر مدرسہ کا مجوزہ نصاب مضامین ہے اور دوسرے کالم پر مقابلے کی سہولت کے لئے یوپی کے جدید اسکولوں اور کالجوں کے مضامین کا نصاب ہے۔

## مجوزہ نصاب (مدت تعلیم و مضامین نصاب) "مراحلہ ابتدائیہ"

۱۔ مدرسہ عالیہ (گورنمنٹ اورینٹل کالج) رام پور کے ابتدائی مرحلہ کی مدت تعلیم آٹھ سال ہوگی۔

۲۔ یہ ہشت سالہ مدت تعلیم دو موقفوں پر تقسیم ہوگی۔ غوثیہ پانچ سال۔ درجات وسطانیہ تین سال۔

| ۳۔ غوثیہ میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی | نصاب بیسک مکاتب ۱۹۵۴ء |
|---|---|
| **(ا) لازم مضامین**<br>۱۔ اردو مع ہندی (اردو ابتدائی تین سالوں میں اور ہندی آخری تین سالوں میں)۔<br>۲۔ ریاضی (حساب)<br>۳۔ ورزش جسمانی۔<br>**(ب) اختیاری مضامین (کوئی تین)**<br>۱۔ حفظ قرآن (تین مضامین کے برابر)<br>۲۔ دینیات<br>۳۔ ابتدائی فارسی (صرف دو سالوں میں)<br>۴۔ معاشرتی علوم (تاریخ، جغرافیہ، بلدیات)<br>۵۔ عام سائنس | ۱۔ حرفہ (ابتدائی کھیتی و باغبانی معہ متعلقات، کتائی اور دستکاری مع متعلقات)<br>۲۔ زبان (ہندی اور کوئی مادری زبان اگر مادری زبان ہندی نہ ہو)<br>۳۔ حساب<br>۴۔ معاشرتی علوم (تاریخ، جغرافیہ، بلدیات)<br>۵۔ زراعت اور عام سائنس<br>۶۔ ورزش جسمانی۔ |

| ۴۔ درجات وسطانیہ میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی | نصاب جونیئر اسکول درجات ۶۔۸، ۱۹۵۴ء |
|---|---|
| (ا) لازم مضامین | لازم |
| ۱۔ عربی و دینیات (مخلوط) | ۱۔ حرفہ (زراعت یا تجارتی یا صحافی یا دباغی یا....) |
| ۲۔ ہندی مع سنسکرت | ۲۔ ہندی مع سنسکرت |
| ۳۔ ریاضی (حساب ہندسہ جبر ومقابلہ) | ۳۔ ریاضی (حساب ہندسہ جبر ومقابلہ) |
| ۴۔ عام سائنس | ۴۔ معاشرتی علوم |
| ۵۔ معاشرتی علوم (تاریخ، جغرافیہ، بلدیات) | ۵۔ عام سائنس۔ |
| ۶۔ ورزش جسمانی | ۶۔ ورزش جسمانی |
| (ب) اختیاری مضامین (کوئی دو) | اختیاری (کوئی دو) |
| ۱۔ فارسی | ۱۔ انگریزی |
| ۲۔ قرأت | ۲۔ ہندوستانی زبان ہندی کے علاوہ (اردو، بنگلہ وغیرہ) |
| ۳۔ حفظ صحت | ۳۔ قدیم زبان (عربی، فارسی، سنسکرت) |
| ۴۔ مبادی تجارت | ۴۔ موسیقی |
| ۵۔ حرفہ (خطاطی، نقاشی، صحافی، خیاطی یا تجاری میں سے ایک) | ۵۔ مبادی تجارت |
| ۶۔ انگریزی | ۶۔ فنون لطیفہ۔ |

## مرحلہ عالیہ

۵۔ مدرسہ عالیہ (گورنمنٹ اورینٹل کالج) رام پور کے عالی مرحلے یا نظامی درس کی مدتِ تعلیم آٹھ سال ہوگی۔ درجہ تخصص کے دو سال مزید ہوں گے۔

۶۔ یہ ہشت سالہ تعلیم چار موقفوں پر تقسیم ہوگی۔ لائق دو سال، مولوی دو سال، عالم دو سال، فاضل دو سال۔

| ۷۔ لائق میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی | نصاب ہائی اسکول درجات ۹۔۱۰ ۱۹۵۹ء |
|---|---|
| (ا) لازم | لازم |
| ۱۔ دینیات | ۱۔ ہندی |
| ۲۔ ہندی | ۲۔ ہندوستانی زبان ہندی کے علاوہ یا غیر ملکی زبان (انگریزی وغیرہ) |
| ۳۔ عربی ادب | ۳۔ ریاضی |
| (ب) اختیاری (کوئی تین) | اختیاری (۳ مضامین) برائے ادبی گروپ |
| ۱۔ ریاضی (لازم برائے طلبہ سائنس) | ۱۔ تاریخ مع متعلق جغرافیہ |
| ۲۔ تاریخ | ۲۔ جغرافیہ |
| ۳۔ جغرافیہ | ۳۔ بلدیات |
| ۴۔ بلدیات | ۴۔ قدیم زبان (عربی یا فارسی یا سنسکرت) |
| ۵۔ طب | ۵۔ غیر ملکی زبان بشرطیکہ لازم کی حیثیت سے نہ لی ہو (انگریزی وغیرہ) |
| ۶۔ اقتصادیات | ۶۔ ڈرائنگ یا موسیقی |
| ۷۔ سائنس (طبیعات و کیمیا، نباتیات و حیوانات: ۲ مضمون) | ۷۔ اقتصادیات |
| ۸۔ مبادی تجارت: ۲ مضمون | سائنس گروپ: |
| ۹۔ حرفہ (خطاطی، یا نقاشی، یا صحافی یا خیاطی یا نجاری: ۲ مضمون) | ۱۔ سائنس (طبیعات و کیمیا) |
| ۱۰۔ انگریزی | ۲۔ حیات (نباتیات و کیمیا) |
| | ۳۔ اختیاری ادبی میں سے کوئی |
| | کامرس گروپ: |
| | ۱، ۲ کامرس (برابر دو مضمون) |
| | ۳۔ اختیاری ادبی میں سے کوئی ایک |
| | تعمیری گروپ: |
| | ۱، ۲ حرفہ (نجاری یا صحافی یا.....) برابر دو مضمون |
| | ۳۔ اختیاری ادبی میں سے کوئی ایک |

| ۸۔ مولوی میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی | نصاب انٹرمیڈیٹ (درجات ۱۱۔ ۱۲' ۱۹۵۸ء |
|---|---|
| (ا) لازم<br>۱۔ دینیات<br>۲۔ ہندی<br>۳۔ مبادی منطق و فلسفہ (بشرطیکہ اختیاری مبادی تجارت یا سائنس یا حرفہ نہ ہو)<br>۴۔ عربی ادب (بشرطیکہ اختیاری میں سائنس نہ ہو)<br>(ب) اختیاری (کوئی ایک)<br>۱۔ تاریخ<br>۲۔ جغرافیہ<br>۳۔ ریاضی<br>۴۔ بلدیات<br>۵۔ اقتصادیات<br>۶۔ نفسیات<br>۷۔ اصول تعلیم<br>۸۔ انگریزی<br>۹۔ طب<br>۱۰۔ سائنس (طبیعاتی کیمیا' حیاتیات' ریاضی' فنون حرب میں سے تین)<br>۱۱۔ مبادی تجارت (اقتصادیات جغرافیہ ریاضی' تاریخ میں سے کسی ایک کے ساتھ)<br>۱۲۔ حرفہ (خطاطی یا نقاشی یا صحافی یا خیاطی یا نجاری) | لازم<br>۱۔ ہندی<br>۲۔ ہندوستانی زبان ہندی کے علاوہ یا غیر ملکی زبان (انگریزی وغیرہ)<br>اختیاری (۳ مضامین) برائے ادبی گروپ<br>۱۔ ہندوستانی زبان ہندی کے علاوہ بشرطیکہ لازم کی حیثیت سے نہ ہو۔<br>۲۔ تاریخ<br>۳۔ جغرافیہ<br>۴۔ بلدیات<br>۵۔ ریاضی<br>۶۔ اقتصادیات<br>۷۔ قدیم زبان (عربی' فارسی' سنسکرت وغیرہ)<br>۸۔ نفسیات یا اصول تعلیم<br>۹۔ منطق (قیاس و استقرائی)<br>۱۰۔ ڈرائنگ یا موسیقی<br>سائنس گروپ کیلئے ذیل کے مضامین سے کوئی تین<br>۱۔ طبیعات<br>۲۔ کیمیا<br>۳۔ حیاتیات<br>۴۔ ریاضی<br>۵۔ فنون حرب یا ڈرائنگ یا......<br>کامرس گروپ :<br>۱و۲ کامرس (یہ ۲ مضمون)<br>۳۔ اقتصادیات یا جغرافیہ یا ریاضی یا تاریخ<br>کانسٹرکٹو گروپ :<br>۱'۲ حرفہ (نجاری یا صحافی یا خیاطی یا دباغی)<br>۳۔ اختیاری ادبی میں سے کوئی ایک۔ |

| ۹۔ عالم میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہوگی | نصاب بی اے آگرہ یونیورسٹی ۱۹۵۸ـ۵۹ء |
| --- | --- |
| (ا) لازم<br>۱۔ دینیات<br>۲۔ منطق و فلسفہ قدیم<br>۳۔ ہندی<br>(ب) اختیاری (کوئی ایک)<br>۱۔ فلسفہ (جدید)<br>۲۔ تاریخ<br>۳۔ ریاضی<br>۴۔ جغرافیہ<br>۵۔ سیاسیات<br>۶۔ اقتصادیات<br>۷۔ اجتماعیات<br>۸۔ نفسیات<br>۹۔ اصول تعلیم<br>۱۰۔ انگریزی ادب<br>۱۱۔ عربی ادب<br>۱۲۔ اردو | لازم<br>اے۔ عام ہندی<br>بی۔ عام انگریزی<br>اختیاری (کوئی تین)<br>۱۔ انگریزی ادب<br>۲۔ عربی یا فارسی یا عبرانی یا......<br>۳۔ اردو یا ہندی یا مراٹھی یا......<br>۴۔ ریاضی<br>۵۔ فلسفہ<br>۶۔ اقتصادیات<br>۷۔ سیاسیات<br>۸۔ تاریخ<br>۹۔ جغرافیہ<br>۱۰۔ اجتماعیات<br>۱۱۔ نفسیات<br>۱۲۔ اصول تعلیم<br>۱۳۔ فنون حرب<br>۱۴۔ وغیرہ |

۱۰۔ فاضل میں دینیات، عربی ادب، عقلیات، تاریخ اسلام وغیرہ میں سے کسی ایک مضمون کا لینا ضروری ہوگا۔

۱۱۔ علامہ کی سند کے لئے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام وغیرہ میں سے کسی ایک مضمون میں تخصص حاصل کرنا ہوگا۔

نوٹ۔ مدرسہ عالیہ (گورنمنٹ اورینٹل کالج) رام پور کے تمام درجات کے شامل نصاب مضامین کا معیار بجز اس کے کہ اہم یا خصوصی مضامین (مثلاً دینیات، مبادی، منطق و فلسفہ

قدیم' عربی ادب' قرآت' حفظ قرآن' خطاطی و نقاشی وغیرہ) کے وہی ہوگا جو اتر پردیش کے بیسک اسکولوں' جونیئر ہائی اسکول' بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن یوپی آگرہ یونیورسٹی کے مقابل درجات کا ہے۔ وقتاً فوقتاً جو ترمیمیں ان کے معیار میں ہوں گی ان کے مطابق مدرسہ عالیہ کے ان ہی مضامین کے معیار میں بھی ترمیم لازم ہوگی۔

درجات غوثیہ کے خصوصی مضامین دینیات' اردو' فارسی کا تفصیلی نصاب بعض ناگزیر اور جزئی ترمیموں کے ساتھ وہی ہوگا جو یوپی گورنمنٹ کی مقرر کی ہوئی عربی فارسی کمیٹی نے مدارس اولیہ کے لئے تجویز کیا ہے اور جو بڑی حد تک مطابق ہے۔ سررشتہ تعلیم اتر پردیش کے نصاب تعلیم درجات ابتدائی مدارس عربی و فارسی اتر پردیش کے درجہ اول تا پنجم کے مضامین مذکورہ کے نصاب کے۔

## تفصیلی نصاب خصوصی و اہم مضامین درجات وسطانیہ

### دینیات و عربی مخلوط (لازم)

درجہ ششم : قرآنی ریڈر حصہ اول (عقائد مخلوط) قواعد اور ترجمتین کی مشق کے ساتھ۔ مأۃ عامل منظوم (حفظ) (رحمت عالم)۔

درجہ ہفتم : قرآنی ریڈر حصہ دوم (عقائد' مخلوط) قواعد اور ترجمتین کی مشق کے ساتھ۔ کتاب النحو' کتاب الصرف منتخبہ مباحث' درس التاریخ الاسلامی حصہ دوم۔

درجہ ہشتم : انتخاب پارۂ عم قواعد' ترکیب و ترجمتین کی مشق کے ساتھ۔ شرح مأۃ عامل' کتاب الصرف (بقیہ حصہ) درس التاریخ حصہ دوم' نورالایضاح (اردو ترجمہ)۔

### قرأت (اختیاری)

درجہ ششم : اصول مخارج' مخارج' حروف' صفات حروف (عارضہ' لازمہ' متضادہ غیر متضادہ' ممیزہ) مشق۔

درجہ ہفتم : تفخیم و ترقیق' تنوین ونون ساکن' میم ساکن' غنۃ' اخفاو اظہار' ادغام' ہمزتین متحرکتین ہمزہ وصل حرکات واجتماع ساکنین' متن۔

درجہ ہشتم : وقف' امالہ' لزوم واشمام' سکتہ' لحن وزلۃ القاری' مشق' قرآن مجید کا دور باجراء قواعد۔

خطاطی (اختیاری بذیل حرفہ)

درجہ ششم : مفردات کی مشق۔

درجہ ہفتم : جلی مرکبات کی مشق۔

درجہ ہشتم : خفی مرکبات کی مشق اور کاپی نویسی۔

نقاشی (اختیاری بذیل حرفہ)

درجہ ششم : معمولی پھول پتی اور بیلوں کی پنسل سے نقل۔

درجہ ہفتم : پھول پتی اور بیلوں میں مناسب رنگ بھرنا بیل بوٹے اور پھول پتیاں از خود بنانے کی مشق۔

درجہ ہشتم : رنگ' ان کا امتزاج اور ان کے مناسب استعمال کی مشق۔

## تفصیلی نصاب خصوصی و اہم مضامین مرحلہ عالیہ دینیات و

عربی (ادب)

لائق :

درجہ نہم : قرآن مجید (منتخب سورتیں) عقیدۂ حسنہ' قدوری (بحذف ابواب منتخبہ) ازھار الادب۔

درجہ دہم : ہدایۃ النحو' ترجمتین۔

طب (اختیاری)

موجز۔ کتاب الادویہ از حکیم کبیر الدین' تشریح کبیر (حصہ اول) منافع کبیر (نصف اول)۔

خطاطی (اختیاری بذیل حرفہ)

کاپی نویسی اور خط نسخ کی تعلیم اور مشق۔

نقاشی (اختیاری بذیل حرفہ)

کتابوں کے حاشیئے' محرابیں اور لوحیں بنانا' اعلیٰ اور پیچیدہ بیل بوٹوں کی مشق اور معمولی خوش نما نمونوں کا اختراع اور ان میں رنگ بھرنا۔

## دینیات و عربی ادب و مبادی منطق و فلسفہ (لازم)

### مولوی :

درجہ یازدہم : تفسیر جلالین (نصف اول) عقائد النسفی' کنز الدقائق (بحذف ابواب منتخبہ) انتخاب نظم و نثر عربی۔

درجہ دوازدہم : کافیہ (بحث فعل و حرف) دروس البلاغۃ' ترجمتین' المنطق الحدیث و القدیم' زبدۃ الحکمۃ شریفہ (بامداد رشیدیہ)

طب (اختیاری)

کلیات نفیسی' تشریح کبیر (حصہ ثانی) کبیر (نصف ثانی) کتاب الادویہ' شرح اسباب۔

خطاطی (اختیاری بذیل حرفہ)

نسخ و نستعلیق کتابت کی مشق اصول خطاطی کے ساتھ۔

نقاشی (اختیاری بذیل حرفہ)

نمونوں کی اختراع اور مشق' مناظر بنانا اور رنگ بھرنا' پرانے کام کی مشق اور سونا گھولنا اور اس کا استعمال کرنا۔

## دینیات و منطق و فلسفہ قدیم (لازم)

### عالم :

درجہ سیزدہم : تفسیر مدارک (نصف آخر) مشکوٰۃ شریف مع رسالہ عبدالحق" شرح عقائد النسفی' شرح وقایہ اولین۔

درجہ چہاردہم : نورالانوار' سلم العلوم' میبذی (مایعم الاجسام الا الھیات)

عربی ادب (اختیاری)

المتنبی دیوان ابو العتاہیہ (انتخاب) ابن عقیل (ابواب منتخبہ) مختصر المعانی۔ الوسیط۔

## فاضل دینیات :

درجہ پانزدہم : تفسیر بیضاوی (سورۃ بقرہ) بخاری شریف' مسلم شریف' ترمذی شریف' شرح ابوداؤد شریف۔

درجہ شانزدہم : شرح نخبۃ الفکر' شرح فقہ اکبر للماتریدی' توضیح تلویح' (از ابتدا تا بحث عام' ذ مقدمات اربعہ' ہدایہ)۔

## کتب برائے مطالعہ

ارض قرآن' تاریخ تدوین حدیث' قصص القرآن' تاریخ اصول فقہ' مذاہب اسلام' دین و دولت' سائنس اور اسلام' رسالہ اہل السنۃ الجماعۃ' بستان المحدثین' الفوز الکبیر' حجۃ اللہ البالغہ۔

## فاضل ادبیات :

درجہ پانزدہم: مقامات بدیع (۷ مقامے) البیان والتبیین (انتخاب) مختار النقد (انتخاب)

درجہ شانزدہم : الکامل (انتخاب) معلقات سبعہ' کتاب الحماسہ (باب الحماسہ) مختارات (از ص ۱۶۰ تا ص ۲۰۲) مجموعۃ النظم (شوقی و حافظ) کتاب الصناعتین الکافی' تاریخ آداب اللغۃ العربیہ للزیات۔

## کتب برائے مطالعہ

الادب الجاہلی' تاریخ اللغات السامیہ' محیط الدائرہ' اصول النقد الادبی لاحمد الشائب۔

## فاضل عقلیات : 

درجہ پانزدہم : حمد اللہ' قاضی مبارک۔ شمس بازغہ (از ابتدا تا باب ثانی و بحث زمان)

درجہ شانزدہم : مباحث مشرقیہ (بحث مکان و حرکت) کتاب المعتبر الجزالثانی (جزء رابع و خامس) شرح اشارات للطوسی (نمط رابع و خامس و سادس) شرح ہیاکل النوع (منتخب مباحث) المدخل الی الفلسفہ' علم الاخلاق از میکنزی' نفسیات از جیمس' تاریخ فلسفہ یورپ

از دیبر تہافتہ الفلاسفہ۔

## کتب برائے مطالعہ

فلاسفہ اسلام از لطفی جمعہ۔ سیرت النبی جلد ثالث (بحث امکان معجزہ) رسالہ مذہب و عقل از عبدالباری نظریہ خیر وشر از برشیڈول۔ تاریخ فلسفہ جدید از سکندر، الملل النحل للشہرستانی معانی، علم الکلام، الرد علی المنطقین، کتاب صریح المعقول بیان المنقول، اخلاق وفلسفہ اخلاق۔

## فاضل تاریخ اسلام :

درجہ پانزدہم: سیرۃ النبی جلد اول ودوم۔ محاضرات التاریخ الاسلامی، مقدمہ ابن خلدون۔

درجہ شانزدہم : تاریخ الاسلام السیاسی، ڈاکٹر حسن ابراہیم، النظم الاسلامیہ، ڈاکٹر حسن ابراہیم، ضحیٰ الاسلام جلد دوم۔ احمد امین، تاریخ ایران پر کوئی مناسب کتاب۔ تاریخ دولت عثمانیہ دارالمصنفین اعظم گڑھ تاریخ سندھ : ابوظفر ندوی، تاریخ اندلس دارالمصنفین اعظم گڑھ، تاریخ گجرات ندوۃ المصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میدان جنگ: ڈاکٹر محمد حمیداللہ۔ تاریخ ہند: سید ہاشمی فرید آبادی۔

## کتب برائے مطالعہ

مسلمانوں کا عروج وزوال: سعید احمد اکبر آبادی، تاریخ اسلام حصہ دولت بنی امیہ وبنی عباس از شاہ معین الدین احمد ندوی، تمدن عرب: از موسیو لیبان، فتوح البلدان بلاذری۔ آئینہ حقیقت نما اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔ ہندو عرب کے تعلقات: سید سلیمان ندوی۔

علامہ تفسیر : کے لئے موضوعات ذیل کا خصوصی مطالعہ کسی استاد کی نگرانی میں ضروری ہوگا۔

تاریخ القرآن و تاریخ علم التفسیر لغات القرآن و اعرابہ و مشکلاتہ و متشابہاتہ، احکام القرآن عقائد والقرآن و حججہ، اخبار القرآن وارضہ، اعجاز القرآن وتریہہ عن المطاعن، الانموذجات من التفسیر بالروایۃ والدرایۃ والکلام واللغۃ المعانی والبیان۔

**علامہ حدیث** : کے لئے موضوعات ذیل کا خصوصی مطالعہ کسی استاد کی نگرانی میں ضروری ہوگا۔

تاریخ تدوین علم الحدیث' سیرۃ صاحب الحدیث علیہ السلام' تاریخ رجال الحدیث وطبقاتہم' علوم الحدیث و مبادیہ' مزایا مجامع الاحادیث المتداولۃ و قیمتہا عند اصحاب الحدیث' الاحادیث' والمصباح السنۃ مع شرح معانی الآثار للطحاوی) الکلیات الاستقرائیۃ لبیان الوضع من الروایۃ والدرایۃ الاحادیث الموضوعۃ المشتہرۃ علی الالسنۃ۔

**علامہ فقہ** : کے لئے موضوعات ذیل کا مطالعہ کسی استاد کی نگرانی میں ضروری ہوگا۔

تاریخ الفقہ و تاریخ اصحابہ و طبقاتہم' اصول الفقہ و تاریخ التشریع الاسلامی' العبادات و المعاملات والحدود والسیر' الخلافیات و مناہا۔

# مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہے وہ اپنے لڑکوں کو اس طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔"

یہ جنرل سلیمان کی رائے ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب جن کی کتاب ........ کے دیباچہ سے میں نے مذکورہ بالا فقرہ نقل کیا ہے۔ وہ جنرل موصوف کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں :

"ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یوروپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہتا ہے۔"

اسی ملنے جلنے اور قریب سے دیکھنے کا یہ اثر ہے کہ تعلیمی ذوق میں بیس روپیہ ماہوار پانے والا ہندوستانی مسلمان ان کو انگلستان کے وزیر اعظم کا ہم رُتبہ نظر آتا ہے۔ جنرل مذکور نے اس کے بعد لکھا ہے :

"جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں، وہی یہ لوگ (ہندوستانی مسلمانوں کے بچے) عربی اور فارسی میں سیکھتے ہیں۔"

بیان ان ہی الفاظ میں ختم نہیں ہو جاتا ہے، آگے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے میں نہیں جانتا کہ ایک انگریز مبصر کے ان الفاظ کو سن کر ان بے چاروں کا کیا حال ہوا ہو گا۔ جنہوں نے ہزارہا ہزار روپے خرچ کر کے اپنے ناموں کے پیچھے آج ہندوستان میں آکسن اور کینٹب کے لاحقوں کے استعمال کا حق حاصل کیا ہے۔ جنرل سلیمان لکھتے ہیں :

"سات سال کے درس (یعنی درجہ فضل) کے بعد ایک (ہندوستانی) طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے، دستار فضیلت

باندھتا ہے اور اسی طرح روانی سے سقراط' ارسطو' افلاطون' بقراط' جالینوس اور بو علی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کا طالب علم۔" (دیباچہ: ۱۴)

شیخ صاحب نے اسی جنرل کی کتاب کی دوسری جگہ سے یہ فقرے بھی نقل کئے ہیں:

"ایک تعلیم یافتہ مسلمان (یعنی وہی جس کا نام ملا' مولوی وغیرہ ہے) فلسفہ اور ادبیات اور دوسرے علوم و فنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔"

آخر میں بالکل صحیح حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں سمجھنے کا بہت خواہش مند ہوتا ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ اگر دینی تعلیم کے نظام کو دنیوی تعلیم کے اداروں سے الگ نہ کر دیا جاتا تو تعلیم کی دنیا میں یہ ثنویت نہ پیدا ہوتی' بلکہ دینی عناصر کو باقی رکھتے ہوئے وہی فقہ' حدیث و تفسیر کی تین کتابوں کو قائم رکھتے ہوئے بتدریج عقلی اور ذہنی علوم میں اسی قسم کی تبدیلیوں سے کام لیا جاتا، جس طرح مسلمان ہزار بارہ سو سال سے کام لے رہے تھے۔ تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ تعلیم کا جو نظام ہندوستان میں جاری تھا، وہ تمام عصری ترمیموں کو علم کی تمام شاخوں میں جذب نہ کر لیتا۔ جنرل موصوف نے بالکل تجربہ کی بات لکھی ہے کہ:

"موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں، انہیں سمجھنے کا بہت خواہش مند ہوتا ہے۔"

لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مغرب کے جدید نظریات سے ہندوستان جب شروع شروع میں روشناس ہوا ہے۔ اس وقت اس کے چرچوں سے مسلمانوں کے مدارس جس طرح گونج رہے تھے شاید یہ کیفیت ان تعلیم گاہوں میں بھی اب تک پیدا نہیں ہوئی ہے، جہاں ان کی مستقل تعلیم دی جاتی ہے۔ زمین کی گردش، آسمانوں کے جرمی وجود سے نکار، بطلیموسی نظام کی جگہ شمسی نظام پر علم ہیئت کی بنیاد، آج تو ان کے تذکرے کبھی کبھی سننے میں آتے ہیں۔ لیکن پرانے مدرسوں میں بحث و مباحثوں کے جو سلسلے ان مسائل کے متعلق جاری تھے، اس کا اندازہ کچھ ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے، جنہوں نے اس زمانہ کو دیکھا تھا۔ مختلف کتابیں ریاضی کی جو اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سب سے ضخیم کتاب فارسی زبان میں جامع بہادر خانی ہے، جو تین فنون ہیئت، حساب، علم المرایا والمناظر پر مشتمل ہے۔ آپ کو جگہ جگہ اس کتاب

میں ان جدید نظریات کا ذکر تفصیل سے ملے گا، جو اس وقت تک یورپ میں مختلف مسائل کے متعلق پیدا ہو چکے تھے۔

عربی زبان میں علامہ تفضّل حسین خان نے مختلف کتابیں علوم ہندسہ کے متعلق لکھیں، جن میں حکماء یورپ کے خیالات کا تذکرہ تائید کے ساتھ کیا گیا تھا۔

ان ہی پرانے طرز کے مولویوں کو دلی کے عربک کالج کے زیرِ اثر جدید علوم وفنون سے روشناسی کے جو مواقع ملے تھے، کاش ان میں تھوڑی سی وسعت برتی جاتی، تو ہندوستان کے علم کی دنیا اور ہوتی۔ حیدرآباد میں جس شان دار طریقے سے علوم جدیدہ کا استقبال قدیم مذاق کے امراء اور علماء نے کیا تھا، اس کا اندازہ آپ کو شمس الامراء بہادر کی دارالاشاعت کی کتابوں اور ان کے مدرسہ فخریہ کے نصاب سے ہو سکتا ہے۔ ایک صدی پہلے طبیعات و ریاضیات میں شمس الامراء مرحوم اول وثانی نے اردو زبان میں مختلف کتابیں تصنیف کرائیں۔ خود پریس قائم کرکے ان کو شائع کیا۔ بہر حال ہندوستان میں کام کی ابتداء ہو چکی تھی کہ بعض فاسد اغراض کے تحت حکومت کو غلط مشورہ دیا گیا، اور اس کے بعد جو ہونا تھا سو ہوا!

غریب مولویوں کو بدنام کیا گیا، ان پر جھوٹے الزام تراشے گئے جن میں سب سے بڑا افترائی الزام انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کا فتویٰ تھا۔(۱)

اور لطف یہ ہے کہ پھیلانے والوں نے ایک بات پھیلا دی۔ تقریباً ایک صدی سے وہی رٹایا ہوا سبق رٹا جا رہا ہے۔ اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بغیر کسی شرم وحیاء کے اعلانیہ کوچہ وبازار میں اسی سبق کو دہرائے چلے جا رہے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ آخر یہ فتویٰ کس کتاب میں

---

(۱) حالاں کہ کہ معاملہ بالعکس ہے، شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق تو خیر سر سید احمد خان وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا تھا، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے فتاویٰ عزیزیہ میں ایسا کوئی فتویٰ یقیناً یا نفیاً یا اثباتاً نہیں ہے مگر شاہ صاحب کے سوا دوسرے علماء مثلاً حضرت مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کے فتاویٰ میں دیکھیے، ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں آپ کو جواز کا فتویٰ ملے گا، ایک موقعہ پر ارقام فرماتے ہیں: "فی الواقعہ نفس تعلیم انگریزی کا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے زید بن ثابتؓ کو زبان یہود سیکھنے کا حکم دیا، جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ میں مروی ہے۔ ملا علی قاری مکی کی شرح مشکوٰۃ میں ہے۔ لا یعرف فی الشرع تحریم علم لغة من اللغات سریانیت کانتا وعبرانیة، هندیه کانت، اوترکیة اوفارسیة کانت اوغیرها۔ یعنی شریعت میں کسی لغت کے سیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہو ایسی بات کسی دلیل سے معلوم نہیں ہوتی، خواہ لغت سریانی ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا ترکی یا فارسی وغیرہ ہو، کوئی ہو مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئ مرحوم (ص ۸۰ ج ۱)۔

ہے، کس مولوی نے کب، کہاں، کس بنیاد پر کس کو یہ فتویٰ دیا تھا، انیسویں صدی کے علماء کے فتووں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ان میں ڈھونڈا جاتا۔ لیکن اتنی فرصت کس کو ہے "دیوانہ گفت وابلہ باور کرد" کی مثال اس سے زیادہ شاید ہی کسی چیز پر کبھی صادق آئی ہو۔ مولویوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ہمارے تعلیم کے نظام کو نہ توڑا جائے، اس کی قدر و قیمت نہ گھٹائی جائے۔ لیکن جو چیزیں نہیں تھیں اس میں بھی وہ کسی ترمیم کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ یہ کس نے کہا؟ جس قوم نے اسی یورپ کے ایک حصہ یونان کے سارے علوم پر قبضہ اور ایسا قبضہ کر لیا کہ آئندہ دنیا کو یونانیوں کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوا، مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا۔ کیا اسی یورپ کے علوم سیکھنے سکھانے سے وہ محض اس لئے انکار کر سکتے تھے کہ وہ یورپ کے علوم وفنون ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو فانی کر کے محض دوسروں کے ساتھ باقی رہنے سے ان کو انکار تھا۔ خود ہی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ انکار ان کا کس حد تک بے جا تھا۔

اگر تعلیم معلومات کی گرداوری کا نام ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ فنون میں سے کسی ایک فن کے لئے بھی طالب علم کی پوری عمر وفا کر سکتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی ایک فن کی دو تین کتابوں کو درساً درساً پڑھتے ہوئے لحد تک پہنچ جائے گا، بشرطیکہ مہد ہی سے اس نے پڑھنا شروع کیا ہو۔ لیکن اگر تعلیم کا وہی مقصد ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا، یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کو جاننے کی انسان میں جو قدرتی صلاحیت ہے، اس صلاحیت کو اُبھارا جائے طلبہ میں ایک ایسی استعداد اور اس کا راسخ ملکہ پیدا کیا جائے۔ تعلیمی زندگی سے الگ ہونے کے بعد اپنے متعلقہ فنون کے حقائق و مسائل تک اُستاد کی اعانت کے بغیر اس کی رسائی ہونے لگے، خود سوچنے کی اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی خواہ وہ کسی قسم کی پیچیدہ اور رقیق تعبیر میں پیش کی گئی ہوں۔ تنقیدیا صحیح کو غلط سے جدا کرنے کی صلاحیتوں کو مدرسے لے کر باہر نکلے۔ اگر پڑھنے پڑھانے کا یہی مطلب ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ چیزوں کو دکھانے پر زیادہ زور دینا مقصود نہ ہو، بلکہ دیکھنے کی قوت بڑھائی جائے، جہاں تک بڑھ سکتی ہو، تعلیم صرف اس کا نام ہو اور دیکھنے، سیر کرنے کا کام تعلیم کے بعد کیا جائے، تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں نے اسلامی علوم کی تعلیم کی جو راہ بنائی تھی اس سے بہتر راہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ آپ سن چکے ہیں کہ عربی تعلیم مدارج کے لحاظ سے دو درجوں میں تقسیم تھی، ایک ضرورت کا درجہ تھا، دوسرا فضل کا۔ ضرورت کے درجہ تک مذہب کی تعلیم حاصل کر کے جو تعلیم کو ختم کر دینا چاہتے تھے، ان کی غرض فقط یہ ہوتی تھی کہ اپنی شخصی زندگی میں معمولی مذہبی اور دینی ضرورتیں جو ان کو پیش آئیں گی، ان ضرورتوں کی حد تک دین کے سمجھنے کی ان میں لیاقت پیدا ہو جائے، اس کے لئے صرف و نحو کی معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد قدوری وغیرہ جیسی فقہی متن کی کوئی کتاب پڑھا دی جاتی تھی اور یہ اتنا مختصر نصاب ہوتا تھا کہ کوشش کرنے والے چاہتے تو چھ مہینوں میں اسے ختم کر سکتے تھے، حضرت سراج عثمان رحمتہ اللہ علیہ کے ذکر میں مولانا فخر الدین رازی......... نے ذمہ داری لی تھی کہ چھ مہینے میں قدر ضروری والے علم تک پہنچادوں گا، اور جو انہوں نے وعدہ کیا تھا، پورا کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ذاتی ضرورتوں کے لئے مذہب کی اتنی تعلیم کافی نہ تھی۔

میں اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو چاہتا ہوں کہ مسلمان بنالیا جائے۔ رہے عربی مدارس، عام عربی مدارس کو ہائی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے جن میں دینیات کی تعلیم میں صرف قرآن ہو، بڑے مراکز کو علوم کی تکمیل کے لئے کر لیا جائے۔ مثلاً تفسیر کے لئے ندوہ، حدیث کے لئے دیوبند فقہ کے لئے فرنگی محل کوئی ادارہ اور کلام و تصوف کے لئے اجمیر میں کوئی انتظام کر دیا جائے۔

قدیم نصاب میں دینیات کے مضامین (قرآن، حدیث، فقہ) محوری اور اساسی قرار دے کر درس کے لئے ہر مضمون کی ایک ایک ٹھوس، جامع، حاوی، مختصر کتاب کا انتخاب کر کے دینیات کے لئے پورے نصاب میں (مشکوٰۃ، ہدایہ اور وقایہ) صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا دیا گیا اور اس کے بعد پڑھنے والوں کے لئے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا گیا، جس میں جب ضرورت تھی تو فارسی کی نظم و نثر کی بیسیوں کتابوں مکتبی زندگی میں اور منطق، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، اصول کلام، ادب عربی کی تقریباً ساٹھ، ستر کتابوں کی اعلیٰ عربی تعلیم میں کافی گنجائش نکل آئی۔ پھر جب تک موقع تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی، اور جیسے جیسے زمانے کا مطالبہ بڑھتا گیا، ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی، انہیں لازم قرار دے دیا گیا اور یوں ہی مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے منطقی ملا، فلسفی ملا، مہندس ملا، ادیب ملا، شاعر ملا الغرض باوجود ملا ہوتے کے جس

جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن بن کر نکلتے رہے۔

کیا بہ سہولت تمام آج بھی بزرگوں کے اسی تعلیمی منہاج کو سامنے رکھ کر ہم حقیقی اور خالص دینیات کے ان اساسی مضامین کی ان ہی تین کتابوں کو باقی رکھتے ہوئے وہی فارسی جو کچھ دن پہلے ہندوستان کی حکومت کی زبان تھی اور وہی معقولات جن کی مغل دربار میں قیمت ملتی تھی بجائے ان غیر دینیاتی مضامین کے عصر حاضر میں حکومت کی جو زبان ہے اور موجودہ حکومت جن علوم و فنون کے پڑھنے والوں کا اپنی ضرورتوں کے لئے مطالبہ کر رہی ہے ہم زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ٹھیک اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر، اپنے نصاب میں ان جدید مضامین کو شریک کر کے بجائے فلسفی ملا کے سائنٹیسٹ ملا اور بجائے منطقی ملا کے سائیکلوجسٹ ملا وغیرہ ملاؤں کی مختلف قسم نہیں پیدا کر سکتے؟

ملائیت کہئے یا دینی علوم، ان کے لئے جب صدہا سال تک وہی تین کتابیں کافی سمجھی گئیں تو پھر آج بھی اسی ملائیت کے لئے یا ایک دینی عالم ہونے کے لئے یہی تین کتابیں کیوں کافی نہ ہوں گی۔

میں نہیں سمجھتا کہ اگر اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی جو مدت اس وقت مقرر ہے یعنی بی اے ہونے کے لئے کم از کم چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن، مشکوٰۃ، ہدایہ و وقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی۔

اور بالفرض ضروری، غیر ضروری مضامین کی اسکولوں اور کالجوں میں جو کثرت ہے یعنی وہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جو استاد کے بغیر طلباء کو نہیں آسکتے، اور ان مضمونوں کو بھی پڑھایا جاتا ہے جنہیں استادوں کے بغیر یوں ہی ہر پڑھا لکھا آدمی پڑھ سکتا ہے اور پڑھتا ہے۔ اگر بد تمیزی کے اس طوفان میں ان تین کتابوں کے لئے جگہ نہ نکل سکتی ہو تو کیوں نہیں ہم اپنے سارے دینی اور دنیاوی تعلیمی نظام کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں اور اپنا نصاب خود بنائیں تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اس عجیب و غریب نمونے پر جب سے مجھے تنبہ ہوا ہے، یعنی دینیات کی کل تین کتابوں کے سوا ملائیت کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا جو محسوس ہوا تو حقیقت یہ ہے کہ اسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان کو قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر بآسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق والے مضامین کے لئے پوری قوت

اور کافی وسعت دلی کے ساتھ ہم جگہ نکال سکتے ہیں۔ مثالاً میں آپ کے سامنے ابن سینا کے تعلیمی نصاب کا ایک حصہ ابن خلکان سے نقل کرتا ہوں اگر اسی نمونے کو سامنے رکھ لیا جائے اور ابتدائی تعلیم کی بنیاد اسی نمونہ پر رکھی جائے۔

ابن خلکان نے لکھا تھا کہ :

"دس سال کی عمر تک ابن سینا نے قرآن عزیز اور ادب پڑھا، کچھ عقائد کے مسائل یاد کئے، حساب الہند و جبر و مقابلہ سیکھا۔"

حساب الہند سے وہی ہندوستان کے علم حساب کا قدیم طریقہ مراد ہے۔ جس میں پہاڑے وغیرہ یاد کرا کے آئندہ جمع، تفریق، تقسیم اور اس کی مختلف قسمیں سکھائی جاتی ہیں۔ آج کل کا نام "میتھ میٹکس" ہے۔ ممکن ہے ان سارے مضامین کے لئے دس سال کی عمر آج ناکافی ہو اور یہ بھی یہی بات کہ ابن سینا کو ہر بچہ پر قیاس کرنا بھی غلط ہے۔ اب بجائے دس کے وہی سولہ سال کی عمر رکھ لیجئے۔ جو کہ آج میٹرک پاس کرنے کی ابتدائی عمر ہے۔ یعنی اس عمر سے کمسن بچوں کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی مکتبی تعلیم کے نصاب میں حسب ذیل امور کو مد نظر رکھ لیا جائے۔

(۱) صرف وہی چیزیں پڑھائی جائیں جو استادوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جاسکتیں۔

(۲) اردو میں ترقی کرنے کے لئے اردو ہی کتابوں کا مسلسل سالہا سال تک پڑھے چلے جانا کوئی مفید نتیجہ پیدا کرتا، بلکہ اردو میں قوت پیدا کرنے کے لئے فارسی اور فارسی میں بچوں کو قوی کرنے کے لئے عربی سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

(۳) عربی زبان کے صرف اسی حصے کو مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھا جائے جس میں ان کی دینی معلومات ہیں۔ باقی عربی کے دوسرے حصے کو اعلیٰ تعلیم میں بطور اختیاری مضامین کے چاہا ہمارے تو رکھا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کے اختصاصی علماء بھی اختصاصی درجوں میں اگر پیدا کئے جائیں تو وہ ایک دوسری ضرورت ہے۔ لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کو جس عربی کی حاجت ہے، وہ صرف اسلامی ادبیات والی ہی عربی ہے۔

(۴) اس عربی کو قصہ کہانی کی کتابوں ہی کے ذریعہ سکھانے کی جگہ خود قرآنی پاروں اور فقہی و حدیثی متون کے ذریعہ سے سکھانا زیادہ مفید اور ضروری ہے کہ یہ یک کرشمہ درکار

ہے۔

(۵) اسلامی ادبیات والی عربی کے لئے نحوی و صرفی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں کی حاجت نہیں جو کسی زمانہ میں دماغی تمرین اور ذہنی تشحیذ کے لئے پڑھائے جاتے تھے۔

ان پنج گانہ اصول کو پیشِ نظر رکھ کر اگر نصاب بنایا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال میں میٹرک تک کی انگریزی و حساب کے ساتھ بچوں کے اندر اس کی صلاحیت کیوں نہ پیدا ہو جائے گی کہ آئندہ کلیاتی تعلیم کے نصاب میں قرآن و حدیث و فقہ کی ان تین کتابوں کو بی اے تک کے چار سال میں دوسرے اختیاری و متناسب مضامین کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیں جو قدیم درس نظامیہ میں دینیات کی آخری درسی کتابیں ہیں۔ تجربہ بتائے گا کہ انگریزی ادب اور جدید علوم میں سے متناسب علوم کا کوئی گروپ لطائف درس نظامیہ کے ان تین دینیاتی کتابوں کے ساتھ بخوشی جمع ہو سکتے ہیں، پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا بی اے کے بعد ایم اے کے اختصاصی درجہ میں اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے طلبہ جس فن میں خصوصیت پیدا کرنا چاہیں، پیدا کر سکتے ہیں۔ ان خصوصی فنون میں جہاں جدید علوم و فنون میں سے کسی فن و علم و زبان وغیرہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ وہیں باآسانی فقہ و حدیث، تفسیر، ادب عربی، بلکہ جی چاہے تو کوئی قدیم معقولات منطق، کلام، فلسفہ، اصول وغیرہ کے مضامین بھی اختیار کر سکتا ہے۔ یہ ایسا نصاب ہو گا جو طلبہ کے لئے قدیم و جدید علوم والسنہ میں سے ہر ایک کے اندر خصوصیت پیدا کرنے کا ذریعہ فراہم کرتا ہے اور سب سے اہم اصولی نفع نظام تعلیم کی اس وحدت کا وہی ہے کہ ملا و مسٹر، علماء و لیڈر کی باہمی کش مکش کا سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے، اب جو بھی ملک میں پڑھا لکھا یا صاحب علم و فضل ہو گا وہ پہلے ملا ہو نگے۔ اس کے پھر جس مضمون کو اختیار کیا ہو گا اس کا ماہر قرار پائے گا۔ انشاء اللہ اس کے بعد ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا ہوں گے، علماء ہی لیڈر ہوں گے اور لیڈر ہی علماء ہوں گے۔ جیسا کہ بارہ ساڑھے بارہ سو سال تک، یعنی نظام تعلیم کی ثنویت (دوئی) سے پہلے مسلمانوں میں عموماً یہی ہوتا رہا۔ ابنِ رشد ارسطو کی کتابوں کی شرح بھی کرتا تھا اور اسی کے قلم کی علم فقہ میں وہ قیمتی یادگار ہے جس کا نام "بدایۃ المجتہد" ہے۔ فقہ کے ہر باب میں ائمہ امصار و مجتہدین امام ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد وغیرہ رحمتہ اللہ علیہم کے مسالک پر قرآن و حدیث و آثار صحابہ کی روشنی میں اتنی اچھی بحثیں کی ہیں کہ مشکل سے اس جوڑ کی کوئی کتاب فقہ جامع میں مل سکتی ہے۔ امام رازی ابن سینا

کے فلسفہ کی تشریح بھی کرتے تھے اور وہی قرآن مجید کی معرکۃ الآراء تفسیر بھی کرتے ہیں، جو تفسیر کبیر کے نام سے امت میں مشہور ہے۔ نہ صرف علماء اہل سنت بلکہ شیعی علماء کا بھی یہی حال ہے۔ میر باقر داماد فلسفہ کے میدان کا یکہ تاز سمجھا جاتا ہے لیکن کوئی باور کر سکتا ہے کہ جس نے "الافق المبین" جیسی پیچیدہ الہیاتی کتاب لکھی ہو، وہی شارع النجاۃ نامی کتاب فقہ شیعی کی بھی لکھ سکتا ہے۔ وہی شیعوں کی حدیث کی مشہور کتاب الکافی پر حاشیہ نگاری کا کام کر سکتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں دینی اور دنیوی علوم کے مرکب نصاب کو جاری کر کے تعلیمی نظام میں ایسی وحدت پیدا کر دی تھی کہ اسی ہندوستان میں ایک زمانہ وہ بھی گزرا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی بھی پڑھنا چاہتا تھا، تو اسے بھی اسی نصاب کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں........ حکیم کامراں، دستور، وغیرہ........ نے اسلامی مدرسہ سے درسی کتابیں پڑھیں۔ حکیم کامراں ان کتابوں کا درس بھی دیتا تھا۔ ان کے سوا اس ملک کے ہندو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عربی نصاب کو ختم کرتے تھے، بدایونی نے عہد سکندری کے ایک برہمن کا ذکر کیا ہے۔

"یکے از شعراء عہد سکندر لودی، برہمن بودمی گویند کہ باوجود کفر علوم رسمی را درس می گفت"۔ (ج ا ص ۳۲۴)

حالاں کہ سکندری عہد میں گو دینیاتی کتابوں کے ساتھ معقولاتی عناصر کا اضافہ ہونا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنا اضافہ تو قطعاً نہ ہوا تھا جتنا کہ فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ہوا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ اس زمانہ میں "علوم رسمی" کی کتابیں جو پڑھاتا ہوگا کیا وہ بزوری اور ہدایہ وغیرہ نہ پڑھاتا ہوگا۔ آخر جب حکیم کامراں سے مسلمان طلبہ تفسیر بیضاوی پڑھتے تھے تو کیا تعجب ہے کہ مسلمانوں کے "علوم رسمیہ" کا یہ پڑھانے والا برہمن ان کتابوں کو نہ پڑھاتا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں سے دینیات کا جو کورس بطور متروکہ کے ہم تک پہنچا ہے وہ اتنا مختصر اور چند گنی چنی کتابوں پر مشتمل ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانہ کے تعلیمی نظام میں اس عہد کے مروجہ علوم و فنون کی کتابوں کو ہم ان کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں اور ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک ہم نے ان کو غیر دینی علوم کے ساتھ جوڑے رکھا۔ اسی بنیاد پر میرے نزدیک دین کی تعلیم کے لئے کسی مستقل جداگانہ نظام کو قائم کر کے مسلمانوں میں علمی انتشار اور دو عملی پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دینیات کے اسی نصاب کے

ساتھ جب مغلیہ عہد کے درباری علوم وفنون، منطق و فلسفہ، ریاضی فارسی ادب کے نثر و نظم وغیرہ کی کتابوں کو جوڑ کر ہم نے تعلیمی نظام کی وحدت کو پوری قوت کے ساتھ باقی رکھا، کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ آج دینیات کے اسی مختصر کورس کو محور بنا کر عہدِ حاضر کے ٹکسالی علوم و فنون یا زبانوں کی تعلیم کو اس کے گرد ہم گردش نہیں دے سکتے۔ جوں ہی کہ زمانہ بدلا تھا، بزرگوں کے اس نمونے کو پیشِ نظر رکھ کر دینیات کے محور کو قائم رکھتے ہوئے ذیلی مضامین کو ترک کر دیا جاتا۔ یا یہ نہ بھی کیا جاتا تو مغلیات کو بھی اختیاری مضامین کا ایک گروپ قرار دے کر عصریاتی علوم کا بھی نصاب میں اضافہ کر دیا جاتا، کاش ایسا ہو جاتا تو آج بدتمیزی کے جس طوفان میں مسلمان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، غالبًا یہ صورت پیش نہ آتی۔ ولکن ماقدر اللہ فسوف یکون۔

لیکن وقت اب بھی باقی ہے۔ تعلیم کی اس (ثنویت) اور دو عملی کو اب بھی توڑا جا سکتا ہے اور توحیدی نظام کو اب بھی اس کی جگہ جاری کیا جا سکتا ہے۔ لوگ مصارف کے سوال کو درمیان میں لاتے ہیں۔ حالاں کہ اولاً یہ حکومت ہی کا فرض تھا، جہاں دنیوی علوم وفنون پر وہ کروڑہا کروڑ صرف کر رہی ہے، ہر صوبہ میں تھوڑی رقم دینی علوم کے معلمین کی تنخواہوں کے لئے بھی منظور کر سکتی ہے اور اب تو تقریباً تمام صوبوں میں مشرقی تعلیم و امتحان کے نام سے سرکاری مصارف سے ادارے جاری ہو چکے ہیں اور فرض کیجئے کہ اگر حکومت اس پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمان اس رقم کو جو آج وہ ان تعلیم گاہوں پر صرف کر رہے ہیں جن میں ان کی دینیات کے ساتھ مغلیہ عہد کے السنہ و علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی رقم کو حکومت کی جامعات دیونیورسٹیوں کے حوالے کر کے اپنی تعلیم میں وحدت پیدا کر سکتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہر ہر صوبہ میں مسلمانوں کے جو اوقاف ہیں، حکومت اگر چاہے یا مسلمان حکومت پر زور دے کر اس چاہنے پر اس کو مجبور کریں تو اوقاف کی اس مدد سے...... اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کے قدیم نصاب کو جاری کر کے ثنویت کی اس لعنت سے مسلمانوں کو نجات مل سکتی ہے۔

# بحث

## سید اوصاف علی

ابھی تک ہم یہ نہیں طے کر پائے کہ ہماری تعلیم، عربی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کی غرض وغایت اور مقصد کیا ہے؟

## عبدالرحمٰن کشمیری

یہ بات واضح کر دی جائے کہ یہ جو نصاب عربی درس گاہوں میں رائج ہے۔ بحث اس حد تک محدود رہے گی، یا ایک جامع نصاب تعلیم اور پورا مقصد تعلیم جو قرآن کی روشنی میں اُمتِ مسلمہ معین کرے اور اس کی منہاج، جو نبوت نے مقرر کی ہے، اس کی روشنی میں Discussion ہو گی؟

## مولانا سعید احمد اکبر آبادی

بات یہ ہے کہ سیمینار کے لئے جو موضوع رکھا گیا ہے تو وہ تو یہی ہے کہ "اسلامی مدارس کا نصاب و نظام اور جدید تقاضے"۔ اب اس میں ضمنی طور پر یہ بحث ہو سکتی ہے کہ مقصد کیا ہے، اسلامی مدارس کا، اگر وہ فقط ضمنی پس منظر، بیک گراؤنڈ کے طور پر۔ اس لئے کہ جب آپ کو نصاب کے متعلق گفتگو کرنی ہے تو پہلے تو آپ کو یہ بتلانا ہو گا کہ اس کا مقصد کیا ہے جس کے لئے آپ کو نصاب درکار ہے، تو مقصد پر گفتگو آجاتی ہے۔ پھر نظام کا لفظ بہت کافی وسیع ہے، وسیع معنوں کے اندر مستعمل ہوتا ہے۔ اس میں عالمی نظام بھی آجاتا ہے، تدریسی نظام بھی آجاتا ہے، تربیتی نظام بھی آجاتا ہے، اور بہت سارے نظام آجاتے ہیں تو اس طرح کی ہمہ جہتی گفتگو کے لئے تو وقت کم ہے۔

اس وقت مولانا عبدالسلام خاں کا مقالہ جو آپ کے سامنے پڑھا گیا ہے اس میں بھی

انہوں نے مختلف چیزوں کو لیا ہے' لیکن بہتر یہ ہے کہ نصاب اور مقصد تعلیم' ان دو کے اوپر گفتگو ہو جائے۔

عبدالرحمٰن کشمیری : مقصد کی نوعیت سے نصاب متعین ہوتا ہے۔

سعید احمد اکبر آبادی : گویا پہلے مقصد کے اوپر گفتگو کر لیجئے' اس کے بعد........

بیدار : الگ الگ بانٹنا مناسب نہیں۔

عبدالرحمٰن کشمیری : بحث بہت پھیل سکتی ہے' اس لئے اگر اس کو اور محدود کر دیں تو اس حد تک رکھئے کہ عربی مدارس جو اس وقت قائم ہیں' وہ کیا مقاصد لے کر قائم ہیں اور انہیں کی حد تک اس نصاب میں تھوڑی بہت اصلاح وترمیم پر گفتگو کر لیجئے۔

علی اکبر ترمذی : تقاضوں کا مسئلہ ہے' وہ رہ جاتا ہے' جو سب سے اہم ہے۔

عبدالخالق نقوی : جو سب سے اہم ہے۔

علی اکبر ترمذی : مسئلہ جو ہے' وہ یہ ہے کہ جدید تقاضوں کے پیشِ نظر نصاب تعلیم ترتیب دینا ہے۔ اگر صرف یہی رکھا جائے کہ مقصد کیا ہے اور نظام کیا ہے' اس کو رہنے دیا جائے' تو پھر تقاضوں کا مقتضا پورا نہیں ہوتا۔ تو تقاضوں کے ماتحت وہ مقصد بھی آجاتا ہے' تقاضوں کا جب ذکر کرتے ہیں تو مقصد یقیناً آجاتا ہے' کیوں کہ تقاضے جب ہی ہوتے ہیں' جب مقصد ہوتا ہے اور نظام تعلیم میں جیسا کہ مولانا نے ابھی کہا' مالی تنظیم' نصابی تنظیم سب آجاتی ہے۔

عبدالسلام قدوائی : مقصد کا جہاں تک تعلق ہے اسلامی علوم کا سمجھنا' سمجھانا اور اسلامی علوم کا تحفظ' یہ مقصد ہے ان کا۔ اس کے لئے کتابیں۔

عبدالعلیم ندوی : جہاں جہاں تبدیلیاں اور اصلاحیں ہوئی ہیں اگر وہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو گفتگو میں آسانی ہو جائے۔

عبدالخالق نقوی : بھوپال میں بھی نواب حمید اللہ خاں کے زمانے میں ایک ایسی کمیٹی بنی تھی جس کے ممبروں میں مولانا میمن' سید سلیمان ندوی' شبیر احمد عثمانی' مفتی کفایت اللہ' خلیل عرب اور مقامی علماء تھے۔ مقصد اوور ہال کرنا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اب پرانی Outmoded کتابوں کے رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کو بھی منگوایا جائے۔

شبیر احمد خاں غوری : اس سلسلہ میں ایک کوشش مولانا آزاد کمیٹی کی تھی اور ایک کوشش

رام پور کے مدرسہ عالیہ کے ذیل میں بھی ہوئی تھی۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۲ء تک' جب میں سبکدوش ہوا۔ میں بڑی بڑی امیدیں لے کر گیا تھا' مگر بڑا تلخ تجربہ ہوا۔

اصل میں طالب علم کے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ جب ۱۹۴۶ء میں اس سلسلہ میں کمیٹی بنی تو میں نے مولانا آزاد کے سامنے سب سے پہلے یہی سوال رکھا کہ طالب علموں کا کیا حشر ہونا ہے اور یہ کہ اس مادی دنیا کے اندر وہ کیا کریں؟ مولانا کے پیشِ نظر یہ تھا کہ حکومت کی سرپرستی میں یہ اصلاح ہو جائے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ حکومت سے یہاں کے فارغ طلباء کو کیا امداد مل سکے گی۔

۶۰ کے قریب ایسے مدارس تھے جن کو حکومت سے امداد ملتی تھی۔ ان کے بارے میں مولانا کی خدمت ایک نقشہ پیش کیا گیا تھا کہ ان کی کس طرح امداد کی جائے۔ مگر مولانا ہم سے دور ہوتے گئے اور یہ مسئلہ یوں ہی پڑا رہا۔ اصل مسئلہ بہر حال طلباء کے مستقبل کا مسئلہ ہے' اگر ان کی دنیا درست نہ ہو گی تو کوئی اصلاح کارآمد نہ ہو گی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی : میں جب کلکتہ جا رہا تھا تو مولانا آزاد نے کہا تھا یہ نصاب اپنے یہاں رائج کرنا۔ کئی سال تو مجھے مدرسے کو ٹھیک کرتے لگ گئے' پھر میں نے نیا نصاب اسی کی بنیاد پر بنا کے دیا مگر جیسے کہ گورنمنٹ کے کام ہوتے ہیں' وہی ہوا' پڑا رہا' اور وہاں بھی نافذ نہ ہو سکا۔

مولانا زید ابوالحسن فاروقی : ان اصلاحات کو بنیاد بنا کر کوئی ایسا مدرسہ قائم ہو یا کوئی پرانا مدرسہ انہیں نافذ کر کے چلے اور اس کے فارغ التحصیل طلباء نکل کے سامنے آئیں تو امید ہے دیگر مدارس بھی اصلاح کر لیں گے۔ مدارس عربیہ بہر حال ضروری ہیں تاکہ قرآن مجید وغیرہ پر عبور رہے۔

محمد اجمل خاں : قرآن کی نزولی ترتیب پر تقریر کے بعد ہمارے ہاں شمس بازغہ تو ہے "انزل من قبلك" کی بھی کوئی کتاب پڑھائی جاتی ہے؟ خود قرآن' اصل اللہ کا مصحف پڑھنے کے بجائے' ہم عثمان کا مصحف پڑھتے ہیں۔

کس دور میں کیا حصہ نازل ہوا' یہ کچھ پتہ نہیں۔ آخر میں "لكم دينكم ولي دين" پڑھتے ہیں' کب یہ نازل ہوا یہ معلوم نہیں۔

عبدالسلام قدوائی : ہم تو آخر میں یہ پڑھتے ہیں " من شر الوسواس الخنّاس "۔

محمد اجمل خاں : اور یہ جانے بغیر کہ "خنّاس" کیا چیز ہے؟

عبدالرحمن کشمیری

اصلاح کا عمل نیا نہیں، تمام مدارس میں ردوبدل ہوتے چلے آئے ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں اس سلسلہ میں ہماری سب سے پہلی آواز اٹھی۔ تو تقاضوں کے تحت اصلاح ہوتی رہنی چاہئے۔ مگر یہ اوپر سے ٹھونسی نہیں جاسکتی البتہ یہ تجویز مشورے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔

اس وقت پورے عالم اسلامی میں Sacred اور سیکولر کی ٹکر ہے۔ نئی یونیورسٹیاں جو Production دے رہی ہیں وہ انہیں دوسرے راستے پر لے جارہی ہے۔ عالم اسلامی کی نئی نسل میں تشکیک پیدا ہو رہی ہے۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
........ خلل از بغاوت خود است

اس لئے ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ کس قسم کا انسان پیدا کرنا اور انسان سے کیا کام لینا ہے۔ دوسری طرف اسلامی تقاضے ہیں غور و فکر کرنا ہے۔ قرآن مجید نے جو کائنات اور انسان کا تصور پیش کیا ہے، اس کے پیشِ نظر انسان کی ذات سے تعلق رکھنے والے سارے علوم کو نہیں لینا پڑے گا۔ اس کے لئے ایسے ادارے ہی کام دے سکتے ہیں۔ جیسے مثلاً جامعہ ملیہ یا علی گڑھ، اس سلسلہ میں وہاں کے قواعد اور ملک کا دستور جس حد تک اجازت دیں، ہمیں کچھ کرنا چاہئے تاکہ عربی درس گاہوں کے طلباء ان سے استفادہ کر سکیں۔

........................................

کسی قوم کا مقصدِ تعلیم جو ہے وہ اس کے ملّی مقصدِ حیات سے پیدا ہوتا ہے، اور اس سے علیحدہ کسی قوم کا نصابِ تعلیم نہیں بنایا جاسکتا۔ اُمّت مسلمہ دنیا کے اندر خود اسلام پر قائم رہنے اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے دُنیا میں آئی ہے، اور اسی مقصد سے اس کا نظام تعلیم بنتا ہے۔ ہمارے مدارس عربیہ کے اندر جو نصاب ہے اس میں صرف اتنا ہو کے رہ گیا ہے کہ کچھ مدرسین پیدا کر لئے، کچھ امامت اور خطابت کے لئے۔ اس لئے نصابِ تعلیم میں جو اصلاحِ خیال کا اظہار فرمایا گیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن میں یہ گزارش کرنا چاہتا

ہوں کہ جتنی بھی Physical Sciences لازمی طور پر نصاب میں داخل کی جائیں اور اس کے ساتھ ہی "سائیکالوجی" جو Logic سے پہلے ہے اور Biology پھر اس کے بعد منطق اور اس قسم کی جو چیزیں ہیں سب آئیں۔ طبعی علوم سے ان علماء نے جنہوں نے فلسفہ یونانی پر سخت تنقیدیں کی ہیں انہوں نے بھی کبھی انکار نہیں کیا۔ چناں چہ آپ حافظ ابن تیمیہؒ کی کتابیں اُٹھا کر دیکھئے الٰہیات پر ان کی تنقید ہے لیکن جہاں تک ریاضی کا تعلق ہے اور طبعی علوم کا جہاں تک تعلق ہے "الرد علی المنطق" میں اور اپنی تمام کتابوں میں اس کی تائید اور توثیق کی ہے۔

اور پھر اس کے ساتھ انسان کے مطالعہ کے لئے پوری کائنات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ انسان بجائے خود ایک Microcasm ایک عالم صغیر ہے۔ چھوٹی سی کائنات اس کا مطالعہ کرنے کے لئے پورے کائناتی علوم کو پڑھنا پڑتا ہے۔ تو جیسے بچے کو اپنے طبعی ماحول سے واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے نصاب میں طبعی سائنس کی کتابیں ضروری ہیں اسی لحاظ سے اس کے نصاب میں سماجی علوم کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب داخل کئے جائیں' اسی کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ قرآن مجید کو مرکز مان کر Direct method پر قرآن کی عربی سکھائی جائے۔ لغت سکھائی جائے تو صرف قرآن کے الفاظ Root Wise ارینج کر لئے جائیں' جیسا کہ کتابیں مرتب ہو گئی ہیں' کہ ایک مادہ کے جتنے بھی الفاظ ہیں ان سب کو اسباق میں لا کر بچہ کی Vocabulary اس طرح سے قرآنی Vocabulary پہلے تیار کی جائے اور پھر قرآن ہی سے صرف و نحو اور معانی اور بیان کے استقرائی طریقہ سے اسباق تیار کئے جائیں' اس طرح سے ان کو عربی زبان بھی آجائے گی اور قرآن سے بھی واقفیت پیدا ہو گی۔ دوسرے درجہ میں آپ انہیں عربی ادب پڑھا سکتے ہیں' اور پھر قرآن و سنت کا تعلق قائم کر کے اس طرح سے حدیث کا مطالعہ بھی آپ کرا سکتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ فقہ اور جتنے بھی علوم اسلامیہ اس سے پیدا ہوتے ہیں' وہ سب کے سب درجے قائم کرنے پڑیں گے۔ بنیادی تعلیم Basic Education اور پھر بنیادی تعلیم کو آگے جا کے پھیلا دیا جائے۔ مثلاً ایک بچہ نے قرآنی عربی پڑھی' دوسرے درجہ میں جا کر آپ اس کو عربی نثر و نظم سے واقف کرتے ہیں یا پھر اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے کہ آپ شعرائے جاہلیت کے کلام سے اور نثر کے نمونے سے واقف کرتے ہیں۔ اس قسم کے مدارج قائم کر کے بنیادی تعلیم کو پھیلا کر کے آگے بڑھاتے چلے

جائیں اور ہر علم کو قرآن مجید کے ساتھ Corelate کرتے چلے جائیں۔ قرآن مجید کو Subject wise ترتیب دے کر بچہ کو قرآن مجید سے واقف کیجئے۔ پھر قرآن کا سنت سے تعلق اور پھر اسی طرح تفصیلات کرتے چلے جائیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم بہت حد تک مفید ہو سکے گی اور پرانے علوم عقلیہ کی جگہ اس وقت کے سارے علوم داخل کئے جائیں' البتہ Meta Physics فلسفہ' الہیات جسے کہتے ہیں تو جب تک قرآن و سنت اور ان علوم میں بصیرت نہ پیدا کی جائے اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ کا بھی ایک درجہ آئے گا۔

تو ایک بچے نے بیسک تعلیم حاصل کر لی ہے۔ اس کے لئے وہی کافی ہے۔ آگے پڑھایا ہے تو اس کے لئے وہ کافی ہو گا۔ پھر جس بھی زندگی کے میدان میں جانا چاہے۔ انجینئر بنا چاہے' ڈاکٹر بنا چاہے' آسانی سے جا سکتا ہے۔ البتہ دین کی تبلیغ کے لئے جن علماء کو تیار ہونا پڑے گا' ان کے لئے.......

محمد اجمل خاں : مولوی صاحب! انجینئری اور ڈاکٹری میں داخلہ نہیں ہوتا جب تک فرسٹ کلاس پری انجینئرنگ یا پری میڈیکل نہ ہو۔ عربی پڑھ کے انجینئرنگ میں کیسے چلے جائیں گے۔

عبدالرحمٰن کشمیری : میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں' میں کسی مکتب میں پڑھا ہوا نہیں ہوں' میری "الف" سے لے کر "ی" تک ساری تعلیم کنڈر گارٹن سے لے کر........ اب تک وہی ہے' تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تبلیغ کے لئے ان کو انبیاء کی منہاج سیکھنی ہو گی۔ موجودہ سائنٹیفک میتھڈ سے واقفیت پیدا کرنی ہو گی پھر یہ اور نٹیلسٹ لوگوں کی جو کتابیں ہیں' یورپ میں جو تحقیقات کر رہے ہیں' ان سب سے واقفیت پیدا کرنی ہو گی۔ تو عصری تقاضوں کا مطلب اگر کوئی یہ سمجھے کہ اسلام موم کی ناک ہے کہ جس طرح چاہیں زمانے کے ساتھ اس کو موڑ دیا جائے' اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو تو میں اس کو دور کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام دین ہے اور دین Permanent Values کا حاصل ہے۔ اس کی مستقل اقدار ہیں' وہ زمان و مکان کے تغیر کے ساتھ نہیں بدلتی ہیں۔ زمان و مکان کے اندر جو تغیر ہوتا ہے وہ اور چیزوں میں ہوتا ہے۔ ان چیزوں اور تقاضوں سے کسی کو انکار نہیں۔ اس لئے عربی مدارس کے اندر علوم عقلیہ کا جہاں تک تعلق ہے ان طبعی اور سماجی علوم کو ضرور داخل کیا جانا چاہئے اور اسی کے ساتھ ساتھ یورپ کی زبانیں' جن جن چیزوں کو مدارس والے ضروری سمجھیں وہ سب

داخل کی جائیں۔

## علی اکبر ترمذی

کچھ ہم بحث سے ہٹ گئے ہیں۔ غرض و غایت اس سیمینار کی موجودہ زمانے کے جو تقاضے ہیں ان کے پیشِ نظر ہمیں غور کرنا ہے کہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام جو ہے کس حد تک ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اگر ہم اس سے ہٹ جائیں اور یہ سوچیں کہ یہ جو نظام ہے ٹھیک ہے' اسی کو رہنے دیا جائے' اس میں معمولی سی تبدیلی کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم اپنے موجودہ زمانے کے تقاضوں پر غور نہیں کر رہے۔ سب سے پہلی چیز جو ہے' میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ تعلیم برائے تعلیم کوئی چیز ہے۔ تعلیم جو ہے وہ زندگی کے لئے ہوتی ہے' ایک اچھا مسلمان بنانا۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہوتا ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹے صرف مسلمان نہیں رہتا۔ یہ دو حلقے ہیں جو آپس میں ٹکراتے نہیں ہیں' بلکہ جو مساوی ہیں گویا مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک شہری بھی ہوتا ہے' ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے تو ہمیں یہ بھی کوشش کرنی ہے کہ ایک طالب علم کی جو شخصیت ہے وہ بھی اُبھرے' تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچہ کی شخصیت کو اُبھارنا' اس کو مواقع بہم پہنچانا۔ جب ایک شخص تعلیم پاتا ہے تو اس کا کچھ مقصد ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی طالب علم کی صلاحیتیں ایک اچھے انجینئر بننے کی ہوں' ایک اچھے ڈاکٹر بننے کی ہوں' تو کیا ضروری ہے کہ ہم اسے ایک دینی تعلیم کا (Theologian) بنا کے رکھ دیں۔ تو ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ بچے کا Aptitude کیا ہے۔ موجودہ تعلیم کا مقصد بھی یہ ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا میلان طبع کیا ہے' اس کا رجحان کیا ہے' اگر ہم اسے اس پر زبردستی ٹھونس دیں کہ نہیں تمہیں تو مولوی بنانا ہے یا واعظ بنانا ہے یا ذاکر بنانا ہے' تو میں سمجھتا ہوں بچہ کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ دوسری بات جو ہمیں غور کرنی ہے یہ ہے کہ دوسری قومیں کیا کر رہی ہیں؟ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے بھی مذاہب ہیں ہندوستان میں' وہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ ایک موٹی مثال ہمارے سامنے عیسائیوں کی ہے۔ آخر عیسائی تو مسلمانوں سے زیادہ گویا کہ عیسائی ہوتے ہیں' وہ اپنا تعلیمی نظام کیسے چلاتے ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ Convent Schools میں جس طرح تعلیم دی جاتی ہے وہ دینی تعلیم بھی ہوتی ہے اور دنیوی بھی اور وہاں جو صاحب کہ پڑھاتے ہیں چوں کہ میں خود

کانونٹ اسکول میں پڑھا ہوں اور کچھ عرصے تک پڑھایا بھی ہے' جیسے کہ مولانا فرمارہے تھے آکسفورڈ کے ڈی فل ہوتے ہیں' کیمرج سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں' اور وہ ڈھائی سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کا ایک مشن ہوتا ہے' ان کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ بچوں کے ساتھ وہ کھیلتے بھی ہیں' تماشے بھی کرتے ہیں' اور ان کے ساتھ اپنے آپ کو ملا لیتے ہیں' اس وجہ سے وہ بچوں کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ وہ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں کئی مرتبہ مدرسوں میں دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب جو ہیں وہ صرف ان کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی غرض سے پڑھاتے ہیں بچوں کو۔ تو ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ وہاں جو مدرس ہیں' ان کے سامنے کوئی مشن ہے یا نہیں۔ اگر مشن ہے تو یقیناً کامیاب ہوں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی بہت ضروری ہے' کیوں کہ اگر ہم ایک شخص کو صرف ماہر دینیات بنادیں تو وہ ہمارے معاشرے میں' ہماری سوسائٹی میں کس حد تک مفید ثابت ہوگا؟ آج جو فارغ التحصیل ہوتا ہے دیوبند سے یا کسی اور ادارے سے' وہ سماج اپنے آپ کو کس حد تک Adjust کر لیتا ہے؟

میں کئی مرتبہ اس سلسلہ میں اپنے دوستوں سے بحث کر چکا ہوں' وہ اس کا اظہار کھلے بندوں کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں' لیکن وہ دل میں یقیناً سوچتے ہیں۔ وہ اس معاشرے میں' اس سوسائٹی میں Misfit ہیں اور اگر وہ تعلیم پانے کے بعد بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ Misfit ہیں تو یقیناً ہمارے نظام میں کسی قسم کی تبدیلی ضروری ہے تو کیوں ہم یہ کوشش نہ کریں کہ یہ جو Convent Schools ہیں' انہیں کے پہلو بہ پہلو یا اس سے کچھ قریب قریب ایسا نظام ترتیب دیں کہ بچے کی مذہبی تعلیم بھی ہو اور اسے دنیوی تعلیم بھی ملے۔

سکھوں کے یہاں جو خالصہ اسکول ہیں' ان کے یہاں ایک پیریڈ ہوتا ہے۔ جسے وہ کہتے ہیں "دھارمک شکشا کا پیریڈ" اس میں گرنتھ صاحب پڑھاتے ہیں' اور دوسری کتابیں پڑھاتے ہیں' وہ لازمی ہوتا ہے۔ آریہ سماجیوں کے یہاں بھی دھارمک شکشا کا ایک ایک پیریڈ ہوتا ہے' جس میں وہ مختلف مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر ہم بھی اسی قسم کا نظام ترتیب دیں تو یقیناً میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسے پورا کر سکیں گے۔ کیوں کہ اگر ہم یہ نہیں کر سکیں گے' تو دوسرا پہلو مالی مشکلات کا ہمارے سامنے آتا ہے۔ کئی مدرسے چندوں پر چلتے ہیں۔ آخر یہ چندے کب تک ہم حاصل کرتے رہیں گے! لوگوں پر بار ہوتا ہے۔ اگر

کانونٹ قسم کے اسکول ہم قائم کر دیں اور ہمارے یہاں جو اوقاف ہیں ان کا روپیہ ہم اس طرف لگا دیں....... بہت سے مسلمانوں کے اوقاف ہیں۔ ایک نظام بنایا جائے اور کانونٹ بالکل اسی طرح ہم جاری کریں اور چلائیں تو مجھے یقین ہے کہ اور اسکولوں کے بچے بھی' دوسری قوموں کے بچے...... آپ کوشش کیجئے۔ گورنمنٹ اسکول میں بچے نہیں جاتے' سینٹ کولمبس میں' سینٹ زیورس میں کانونٹ آف جیمس اینڈ میری میں جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے آخر؟ انہوں نے اپنا نصاب تعلیم اتنا اونچا کر لیا ہے' ان کے یہاں کے جو فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہ سوسائٹی میں اتنے کامیاب ہوتے ہیں....... آپ ان بچوں سے باتیں کیجئے' وہ بڑے ذہین معلوم ہوتے ہیں' تمام معلومات انہیں حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے اسکولوں کے بچے جو پڑھ کر نکلتے ہیں تو وہ معلومات کے لحاظ سے تو سوسائٹی میں گویا بالکل صفر ہوتے ہیں۔

## عبدالخالق نقوی

ترمذی صاحب نے جو ارشاد فرمایا چھوٹے بچوں کی تعلیم کا انتظام' میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بہت اہم اور ضروری پہلو ہے۔ اس لئے کہ اگر ہمارے بچے اچھی تربیت نہیں پائیں گے تو وہ آئندہ چل کر بھی اچھے شہری نہیں بن سکتے۔ اچھا مسلمان بننا تو بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ کانونٹ میں غیر عیسائی بھی اپنے بچوں کو بھیجنا پسند کرتے ہیں' یہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ وہاں سے بچے نکل کر گالیاں نہیں بکتے' بیہودگیاں نہیں کرتے' بدتمیزی نہیں کرتے۔ لیکن ہم اپنے بچوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ........... مثلاً میں جس محلہ میں رہتا ہوں' وہاں ایک اسکول ہے مظہر الاسلام اسکول' میں سمجھتا ہوں بچہ کو اگر غارت کرنا ہو اور اس کی زندگی برباد کرنا ہو تو وہاں بھیج دیجئے۔ تو یہ بہت اہم پہلو ہے اور کچھ عجیب بدقسمتی رہی ہے ہم لوگوں کے ساتھ کہ ہمارے یہاں مثلاً علی گڑھ کی درس گاہ ہے' دیوبند ہے اور جامعہ ملیہ ہے نمائندہ درس گاہیں عرض کر رہا ہوں۔ میں معذرت کے ساتھ ایک صاحب کا ایک مقولہ یہاں پیش کرنا چاہتا تھا کہ جس کو دین سے غافل کرنا ہو' علی گڑھ بھیج دو جس کو دنیا سے غافل کرنا ہو تو دیوبند بھیج دو' جس کو دین اور دنیا دونوں سے غارت کرنا ہو اسے جامعہ ملیہ بھیج دو۔ تو میرے خیال کے مطابق اس وقت یہ ہمارا جو سیمینار ہو رہا ہے بہت اہم ضرورت کو پورا کر رہا ہے اور اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہماری تعلیم کا مسئلہ ہے' اور تعلیم کے مسئلہ کے ساتھ دینی تعلیم بھی

اس کے اندر شامل ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے' دینی تعلیم ضروری چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ ایجوکیشن کے اپنے اس مسئلہ کو حل کر سکے تو غالباً ہماری زندگی کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ آج سب سے بڑی اہمیت اسی مسئلہ کو حاصل ہے کہ ہم تعلیم یافتہ نہیں ہیں' ہمارے بچے تعلیم یافتہ نہیں۔ میں جس محلہ میں رہتا ہوں وہاں میں نے یہ سُنا ہے لوگوں کو کہتے ہوئے کہ صاحب یہ لوگ تو ہیں پردیسی' اس لئے ان کے بچے پڑھتے ہیں' ہم لوگ ہیں دلّی والے' ہمیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ دہلی جو تہذیب اسلامی کا ایک بڑا مرکز رہا ہے' یہاں ہم لوگ کرختداری کرتے ہیں کہ زوال و اضمحلال کی یہ صورت پیدا ہو چکی ہے کہ ماں باپ ایسی باتیں کرتے ہیں' بچوں کو ایسی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ کبھی مہذب اور مفید شہری نہیں بن سکتے۔ اصل میں تو انہیں سب سے زیادہ اخلاقی تعلیم کی ضرورت ہے۔

ہمیں تاریخ سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ جب کبھی لوگوں نے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا تو تبدیلیاں آئیں تو وہ Resist کر سکے' نہ مقابلہ ہی کر سکے' اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ابھی سے تیاری شروع کر دیں' اور اپنے لوگوں کو بتلائیں کہ بھائی جو تبدیلی آ رہی ہے کس قسم کی ہے' اور ہم جس چیز کے اوپر قائم ہیں یہ کیا ہے۔

جدید نصاب تعلیم کے سلسلہ میں' میں سمجھتا ہوں کہ جس طریقے سے ہماری یونیورسٹیوں میں تخصص کے علاوہ ریسرچ کا بھی انتظام ہے' تو ہماری دینی درس گاہیں کیوں محروم رہیں۔ اس لئے وہاں بھی اس کا انتظام ہونا چاہئے کہ وہاں سے لوگ ریسرچ کریں' اور بحث و تدقیق سے کام لیں' کتابیں ایڈٹ کریں' نئی کتابیں لکھی جائیں' سب ریسرچ کا کام جو ہے وہاں پر ہونا چاہئے اور اگر اس طریقے سے ریسرچ کا کام شروع کریں گے تو دوسرے لوگوں کے لئے بہت کچھ ملے گا' ان کی ہمت بڑھے گی کام کرنے کی۔

ایک چیز یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا ایک فیشن یہ رہا ہے کہ ہماری درس گاہوں میں منطق فلسفہ کی جو تعلیم دی جاتی رہی' ان کی ہمیشہ ہم تطبیق دیتے رہے کہ دیکھو قرآن مجید کے اندر یہ ہے' اور فلسفہ یہ ہے۔ تو ہم نے فلسفہ کو قرآن کے مطابق یا قرآن کی تعلیم کو فلسفہ کے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ یہ فلسفہ اور سائنس جو کچھ ہے انسانی معلومات کے اوپر اس کی بنیاد ہے' انسانی معلومات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور آئندہ بھی بدلتی رہیں گی۔ جس نقطہ کے اوپر

جس مقام کے اوپر ہم ہیں اب سے دو سو برس کے بعد آنے والے لوگ ہمیں سمجھیں گے کہ ہمارے بزرگ جو تھے وہ بہت جاہل تھے' بہت ہی تاریک خیال تھے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ کبھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کبھی نہ لایا جائے۔ قرآن کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ہم کو کوئی مورخ بنادے' یا سائنٹسٹ بنادے' یا ڈاکٹر بنادے' یا انجینئر بنادے۔ قرآن کا مقصد تو صرف یہی ہے کہ وہ ایک شریف اور مہذب انسان بنائے اور ہم کو اس سوسائٹی کا ایک مفید اور ایک صالح رکن بنادے۔

میں سمجھتا ہوں' اگر ان چیزوں کی روشنی میں ہم غور کریں گے تو ہم کو اپنے نصاب کے مرتب کرنے میں اور اس کا خاکہ تیار کرنے میں شاید زیادہ مدد ملے گی۔

## عبداللطیف اعظمی

اس لطیفہ کا ذکر ہمارے یہاں جامعہ میں بھی ہوتا ہے' یہ اس کی علامت ہے کہ ہم تبدیلی کے خلاف ہیں۔ ہندوستان کے عربی مدارس میں اگر کوئی ہے تو وہ ہے مدرستہ الاصلاح۔ یہاں ابتدائی تعلیم کے بعد جب میں ندوہ میں گیا تو یہ دوسرا اقدم ہے جہاں مولانا شبلی کی کوششوں سے اصلاح کا کام ہوا ہے۔ تو یہ جو آپ نے بات سنائی (مولانا نقوی نے) کہ جسے دین حاصل کرنا ہو دیوبند جائے اور جسے دنیا......... یہ سب سے پہلے میں نے ندوہ میں سنی۔ چوں کہ ندوہ میں یہ بھی کہ دین حاصل کرنا ہو تو دیوبند جاؤ۔ یہاں تو نہ دین ملتا ہے نہ دنیا ملتی ہے۔ یہ میں پہلے ندوہ میں سن چکا تھا' اور وہاں پر بھی یہ کش مکش بہت تھی کہ ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد کیا ہے' اور بڑے طنز آمیز جملے قدیم مدارس پر وہاں استعمال کئے جاتے تھے' اپنے بارے میں فخریہ انداز اختیار کیا جاتا تھا اور زیادہ تر تصنیف و تالیف' جو ندوہ کا امتیاز رہا ہے' اس کو بیان کیا جاتا تھا کہ دیکھو' دیوبند نے......... پھر جب میں یہاں آیا ہوں جامعہ میں' تو یہاں یہ بات بہت مشہور تھی۔ ابھی چند روز کی بات ہے ہمارے یہاں میلہ کے موقع پر ایک مباحثہ تھا کہ جامعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی یا نہیں؟ تو اس میں ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے یہ مقولہ بیان کیا تھا۔ تو میں نے اس کا جو جواب دیا وہ ہیں ڈبیٹ میں کہ محرومی کا جو احساس بیان کیا جاتا ہے تو اس زمانے میں جب میں جامعہ میں آیا تھا یہ واقعہ ہے کہ مقصد ہمارا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہے؟ نہ بظاہر وہاں دین تھا نہ دنیا تھی۔ تو ہم لوگ اس پر

بہت بحث کیا کرتے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ واقعی مستقبل اس وقت اتنا تاریک نظر آتا تھا کہ آدمی سمجھتا تھا کہ نہ یہاں دین ہے نہ دنیا ہے۔ مجیب صاحب نے اس کا بہت فلسفیانہ جواب دیا۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ اصل کامیابی اسے ہوتی ہے جسے محرومی کا احساس ہو اگر ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے دنیا حاصل ہو گئی ہے تو پھر کوئی مزید کوشش نہیں کرے گا' جس کو احساس ہو گیا کہ مجھے دین اور دنیا دونوں حاصل ہو گئی۔ اسی پر قانع ہو جاتا ہے ہم خوش ہیں کہ ہمیں محرومی کا احساس ہے اور ہم میں رہا ہے' اسی لئے ہم نے کوشش کی' نئی نئی راہیں پیدا کیں' اور اب بھی محرومی کا احساس ہے اور کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اصلاحِ نصاب کے سلسلے میں جتنی باتیں کہی ہیں' وہ سب میں نے پڑھا ہے اور دیکھا ہے اور اب جو کوشش ہو رہی ہے' میں دونوں میں بہت بڑا فرق محسوس کرتا ہوں۔ اس زمانے میں شبلی بھی جو کوشش کرنا چاہتے تھے یا مدرستہ الاصلاح میں جو کوشش ہوئی تھی کچھ کچھ کتابیں کم کر کے' جس سے نصاب ہلکا ہو جائے اور طالب علم پر زیادہ بار نہ پڑے۔ لیکن اب زمانہ ہی نہیں بدلا ہے بلکہ ہندوستان کے مخصوص حالات بدلے ہیں۔ زمانہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم ان پرانی کتابوں میں پڑے رہیں گے تو ہم اس دور میں کسی کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ بلکہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں ہندوستان میں جو سیاسی تقسیم ہوئی ہے.......... ہمارا سماج کدھر جا رہا ہے' عربی مدارس میں اگر ایسے ہی لوگ پیدا ہوئے جن کا مستقبل کوئی نہیں.......... ایک زمانے میں لوگ کہتے تھے کہ نہیں اور جگہ نہیں ملے گی تو کہیں پیش امامی تو کم از کم مل ہی جائے گی' لیکن وہ میدان بھی بہت محدود ہو گیا ہے' تعلیمی کام بھی محدود ہو گیا ہے اور معاشی میدان میں اس قدر کش مکش ہے' اس قدر مقابلہ ہے کہ ہمارے اچھے انگریزی خواں مسلمان تو اس میں مقابلہ نہیں کر سکتے' عربی مدارس کے لوگ کیا کریں گے' اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بہت بنیادی طور پر ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم تعلیم کا کیا مقصد سامنے رکھیں۔ ایک تو بہت ہی واضح ہے' مذہب اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا مذہب اسلام کی تعلیم صرف عربی ہی میں دی جا سکتی ہے' عربی کی تعلیم میں جب آپ پڑھاتے ہیں تو پھر واقعہ یہ ہے کہ صرف و نحو اور دوسرے علوم میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ جدید علوم کا جو لوگ اضافہ کرتے ہیں' میں ندوہ میں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ انہیں جدید علوم قطعی نہیں آتے' ٹھیک اسی طرح سے جس طرح

سے علی گڑھ یونیورسٹی یا جامعہ ملیہ میں دینیات نہیں آتی' عربی نہیں آتی' دونوں! یہاں پر محض عوام کو دکھلانے کے لئے یا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے عربی علوم اور دینیات کا اضافہ کیا گیا ہے' وہاں جدید علوم کا نہ انہیں جدید علوم ملتے ہیں نہ یہاں دینیات ملتی ہے' تو ہمیں بہت ہی بنیادی طور سوچنا ہے کہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ پھر ممکن ہے کہ ہندوستان میں آئندہ ترقی کرتے ہوئے ایسا موقع آنے پر محض تعلیم حاصل کئے ہوئے...... آدمی کو ملازمت مل جایا کرے' یہ نہ ہو کہ گورنمنٹ کے منظور شدہ ادارے کا ہو' یونیورسٹی یا کالج ہی کا تعلیم یافتہ ہو تو اسی کو ملازمت ملے۔ جس طرح حالات روبہ اصلاح ہیں' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جگہ تعلیم یافتہ شخص کو ملے' تو تعلیم یافتہ شخص کیا اسی کو کہیں گے جو معاشیات سے ناواقف ہو' تاریخ سے ناواقف ہو؟ جتنے علوم ہیں' سب سے ناواقف ہو تو کیا اسے تعلیم یافتہ کے شمار میں وہ لے آئیں گے؟ میں سمجھتا ہوں کہیں بھی اس کا داخلہ بھی نہیں ہو سکے گا۔ جامعہ ملیہ نے ایک تجربہ کیا تھا' اس تجربہ میں بہت زیادہ ناکامی ہوئی ہے اور وہ تقریباً ختم ہو گیا۔ تجربہ بہت شروع سے یہ تھا کہ عربی مدارس کے پڑھے ہوئے لوگوں کو درجہ خاص میں داخل کر کے کالج کی تعلیم دلا دیتے تھے' اور بی اے ہو جاتا تھا۔ پھر اس کے لئے ایم اے کے اور آگے کے سب دروازے کھل جاتے تھے۔ لیکن عربی مدارس کے لوگ جب آتے ہیں تو ایک تو عمر زیادہ ہوتی ہے' پھر یہ جدید علوم سے بہت ہی ناواقف ہوتے ہیں اور ایک تیسرا فیکٹر یہ ہوتا ہے کہ ایسے طبقہ سے آتے ہیں کہ جب تک انہیں کافی وظیفہ نہ ملے وہ چل نہیں سکتے' اب جب سے گورنمنٹ کی امداد پر ہمارا انحصار رہ گیا ہے' ہمارا اور کوئی فنڈ نہیں ہے۔ وظائف کا انتظام نہیں ہے تو ہم ان کو داخل نہیں کر پاتے۔ تو جو طبقہ ہے جو غریب ہے' جو کہیں تعلیم حاصل نہیں کر پاتا' وہ عربی مدارس میں چلا جاتا ہے اور بعد میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس وقت چاہے کتنے ہی جوش میں وہ کہے کہ مذہب اگر ہے تو سب کچھ ہے' لیکن بعد میں وہ پریشانیاں ہوتی ہیں کہ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ تعلیم کا مقصد ہمارا یہ قرار پانا چاہئے کہ ایک اچھا مسلمان بنائیں گے' دین اسلام سے واقف کریں گے' اس کے ساتھ دنیاوی علوم جتنے ہیں ان سے بھی ہم انہیں بہرہ ور کریں گے' تاکہ اس مقابلہ کی دنیا میں وہ مسلمانوں کے سماج کو اونچا اٹھا سکیں اور یہ جو کش مکش پیدا ہے جس میں ہم بہت پیچھے جا رہے ہیں اس میں ہم کچھ آگے بڑھ سکیں۔ یہ مقصد نہیں ہو گا تو

ہم کچھ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

## مولانا عبدالحلیم ندوی

عربی مدارس کچھ مقاصد لے کر قائم ہوئے تھے۔

اب نظام و نصاب میں آپ جو اصلاح کرنا چاہتے ہیں' اس کا حل یہی ہے کہ آپ ایسے ادارے قائم کر کے دکھایئے' ندوہ یا دیوبند ہیں تو یہ ناممکن ہے۔ اگرچہ ندوہ کی بنیاد عصر حاضر کے تقاضوں پر ہے' مگر وہ تقاضے جنہیں وہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس زور بھی تو نہیں۔ پیسے وہ آپ سے لیتے نہیں۔ ان کا اپنا ایک نظریہ ہے جس پر سارا تعلیمی نظام بھی قائم ہے۔

تو بجائے ان عربی مدارس میں اصلاح لانے کے جو ممکن بھی نہیں' آپ کی یہ جو یونیورسٹیاں ہیں' جامعہ ملیہ ہے' علی گڑھ ہے' یہ کیوں نہیں تبدیلیاں لاتیں۔ ایسی کہ ان مدرسوں کے لوگ یہاں آکر عصر حاضر کے تقاضے پورے کریں۔

عربی مدارس کے یہ طلباء اکثر تو دینیات کی طرف جائیں گے' کچھ ایسے ہوں گے جن کو عربی آتی ہو گی۔ اس وقت ہندوستان کو عربی کی ضرورت ہے۔ موجودہ یونیورسٹیاں کم سے کم یہ تو کر سکتی ہیں کہ جن کا رجحان ایسا ہو انہیں عربی اور اسلامک اسٹڈیز میں داخل کر لیں۔ قاعدے ایسے بنائے جائیں کہ وہ طلباء ادھر آسکیں۔ اس طرح ہم ایک صاف ستھرا عالم پیدا کر سکیں گے۔

کچھ ایسی ہی بات ان عربی مدارس میں بھی کی جا سکتی ہے کہ موجودہ عربی زبان ہندوستان کے لوگ سیکھ سکیں۔ اس کے لئے انگریزی کا مساوی نصاب ضروری ہو گا کہ اس زمانے میں صرف عربی سے کام نہیں چلتا تو دونوں کا ایسا معیار ہو کہ دونوں زبانوں سے دونوں زبانوں میں ترجمہ کر سکیں۔

اور مدرسے یہ کام نہ کر سکیں تو یونیورسٹیوں کو تو کرنا ہی چاہئے۔ اس طرح معاش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

## مولانا قاضی سجاد حسین

جب تک کوئی مقصد نہ ہو' جس کی طرف لوگ لپکیں' اس وقت تک کوئی نصاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک وقت تھا جب دین مقصد اعلیٰ قرار دیا گیا تھا تو اسی نصاب کو پڑھنے

سے اچھے اچھے لوگ پیدا ہوئے۔

رہا اصلاحوں کے نفاذ کا مسئلہ تو ایک مثالی درس گاہ بنا دیجئے اور اس میں اپنا اصلاحی نصاب رائج کر دیجئے تو خود مثال بن جائے گی۔ بنجر زمین میں آپ صندل لگا کے گلاب کی توقع رکھیں یہ کہاں تک مناسب ہو گا۔ شمس بازغہ پر بحث کرنا'صدرا'اور مولویوں پر اعتراض کرنا اور کہنا کہ وہ بات نہیں رہی'تو راہیں کھولیئے پھر دیکھئے وہی بات پیدا ہو جائے گی۔

ان مدرسوں کی جو کیفیت ہے ظاہر ہے وہ زکوٰۃ کے پیسوں پر چلنے والے مدرسے' جہاں نچلے طبقے کے غریب لوگ پڑھنے آتے ہیں'غزالی کیسے پیدا کریں گے۔ اگر آپ اس کی طرف توجہ کریں تو اعلیٰ صلاحیتیں اور اعلیٰ کمال بھی پیدا ہونا ممکن نہیں۔ کوئی ایک مدرسہ اس کے لئے مقرر کر کے ایک مثالی درس گاہ کے طور سے چلائی جائے۔ اک معقول نصاب اس کے لئے تیار ہو'پھر یہ مثال بن سکتا ہے' پورے ہندوستان کے لئے۔

## نور الدین احمد

تعلیم کا مقصد کیا ہے ؟ معاش یا کچھ اور ؟ میرے خیال میں معاش کسی تعلیم کا مقصد نہیں رہا' یہ میں ایک تاریخی بات پیش کر رہا ہوں۔ آپ کے جتنے کروڑ پتی لوگ ہیں' یہ وہ ہیں جنہوں نے تعلیم کم پائی ہے۔ تعلیم سے کچھ قدریں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر آدمی کمائی کے جائز ناجائز ہر طریقے استعمال کرے' یہ اس سے نہیں ہوتا' تو معاش تعلیم کا مقصد نہیں۔

پھر ہمارے جتنے بڑے بڑے عالم تھے' وہ کچھ ہنر بھی جانتے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ معاش کے لئے ہنر حاصل کرتے تھے۔ جولاہے' خیاط وغیرہ۔ معاش ایک بہت ذلیل اور ادنیٰ چیز سمجھی جاتی تھی' یہ ہمیں اب بھی سامنے رکھنا چاہئے اور مسئلہ مدرسوں کی ڈگریاں Recognise کرانے کا نہیں۔ اس سے کام نہیں چلے گا۔ اصل مسئلہ تو انسان کے ذہن کی نشوونما ہے۔ جتنے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ ریاضی' فلسفہ' طب تو اس لئے نہیں کہ طب پڑھا کر حکمت کی جائے گی' بلکہ صرف اس لئے کہ ہر پڑھا لکھا طب سے واقف ہوتا تھا... تو دماغ کی نشوونما اصل مقصد ہے۔ اس کے لئے نصاب ایسا بنایئے کہ جس سے یہ مقصد پورا ہوتا ہو۔ تعلیم ایک راستہ ہے جس سے سوچنے کی عادت ہوتی ہے۔

تعلیم کا مطلب ہے تہذیب۔ تو ہمیں اصلاح بھی اسی نقطہ نظر سے کرنا چاہئے اور یہ

جاہلیت جو طاری ہو گئی ہے خاص درس نظامی کے طلباء میں جن میں' میں نے ایسے بکثرت دیکھے ہیں تو اب یہ دیکھئے کہ ان کی یہ حالت ایسی کیوں ہے؟

دوسرے یہ کہ آپ کوئی نصاب بنانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو اسے نافذ کیسے کریں گے' قبول کیسے کرائیں گے۔ اس میں ایسی کیا بات ہو گی کہ لوگ آپ کی طرف لپک کے آئیں۔ روپیہ کی کشش ہو' دماغی نشوونما کا پہلو ہو' یا پھر دین' تو یہ غور کیا جائے کہ Implementation کیسے ہو۔ جامعہ ملیہ جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے اسی Implemention کے لئے قائم ہوئی۔ ندوہ بھی۔ اب آپ اس پر غور کیجئے۔ میرے خیال میں آپ ایسے کر سکتے ہیں کہ Country wide تبلیغ کیجئے۔ ایسے آدمی پیدا کیجئے کہ مسلمان بچوں' بلکہ سارے ہندوستان کے بچوں کو تعلیم کے ایسے رستوں پر چلا سکیں' مسلمان جو اپنے لئے کرتے ہیں تو صرف ان کے لئے نہیں ہوتا ہے' بلکہ ہر فرد بشر کے لئے۔ ہم کو' اپنے کو ترقی دے' مثال پیدا کرنا ہو گی دوسرے کے لئے۔

اور اصل مسئلہ تو سامنے کا ہے۔

ایسا نظام بنائیں کہ قصائیوں کے بچے' دماغ جن کی کند ہیں' دن بھر گالیاں اور شام کو بائیسکوپ (سنیما) کی کھڑکیوں پر لائن میں لگ جانا جن کا روز کا دستور ہے......... ادھر توجہ کریں۔

تو تعلیم کا مقصد معاش نہیں بلکہ اصلاح ہے۔

## سید اوصاف علی

غالباً تمام حضرات اس بات پر متفق معلوم ہوتے ہیں کہ ہمارے دینی عربی مدارس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو سمجھا جائے اور سمجھایا جائے یا بالفاظ دیگر استحکام اسلام۔ اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کی طرف ڈاکٹر عبدالعلیم نے اشارہ کیا تھا اور وہ یہ کہ کیا ہندوستان میں کثرت سے پھیلے ہوئے تمام عربی اور دینی مدارس کو وہی درجہ دیا جائے جو ہم دیوبند کو دیتے ہیں' جو ندوۃ العلماء کو دیتے ہیں۔ جو مظاہر العلوم کو دیتے ہیں' اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں کچھ ادارے ہندوستان میں مخصوص کر دینے چاہئیں۔ دس ہوں' پندرہ ہوں' بیس ہوں' پچیس ہوں' جہاں خالص دینی تعلیم دی جائے' اس نقطہ نظر سے کہ وہاں سے اچھے

اچھے عالم نکلیں' اور وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہوں۔ باقی رہے یہ ہزاروں مدارس جہاں ہمارے بچے جاتے ہیں اور جہاں نہ انہیں عربی آتی ہے۔ عربی ٹھیک سے پڑھ کے نکلتے ہیں' نہ انہیں تحریر پر قدرت ہوتی ہے نہ تقریر پر' نہ کسی کام کے ہوتے ہیں' ان تمام مدارس میں سیکولر ایجوکیشن یعنی دنیوی تعلیم دی جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ترمذی صاحب نے فرمایا تھا کہ آخر بہت سے مشنری کالج اور اسکول ہیں ہندوستان میں' وہاں بائبل پڑھائی جاتی ہے۔ خود میں نے ایک کرسچین کالج میں تعلیم حاصل کی ہے' وہاں ہم لوگوں کو صبح بائبل کا کورس دیا جاتا تھا۔ اسی طریقہ سے ہم ان مدارس کو سیکولر اسکولوں میں تبدیل کر دیں جہاں پر دنیوی تعلیم دی جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک یا دو گھنٹے روز اس کے لئے علیحدہ کر دیئے جائیں کہ قرآن و حدیث اور فقہ وغیرہ جو اہم بنیادی چیزیں ہیں ان پر انہیں کتابیں پڑھادی جائیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ گورنمنٹ سے ہم کو کافی امداد مل سکے گی۔ بعض حضرات نے یہ کہا کہ آخر چندوں پر یہ مدارس کب تک چلیں گے؟ ان کی مالی حالت نہایت خراب ہے اور وہاں بچے جس طریقے سے جن حالات میں' تعلیم پا رہے ہیں اس کا تصور........ ناقابل بیان ہے' وہ بات۔ تو اس میں ہمیں گورنمنٹ سے امداد مل سکتی ہے۔

محمد اجمل خان : گورنمنٹ سے ایڈ مل سکتی ہے؟ نہیں!

اوصاف علی: یہ دستور ہند میں صاف لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی اقلیت اس قسم کے مدارس یا کالج قائم کرے جہاں معیار تعلیم' دنیوی معیار تعلیم اتنا ہی ہو' جتنا گورنمنٹ کے کالجوں اور اسکولوں میں ہے' چاہے وہ اسکول میں علیحدہ سے ایک دو پیریڈ دینیات کے لئے علیحدہ کر دیں' ان کو گورنمنٹ ایڈ دے گی۔

عتیق صدیقی : مگر دینیات لازمی نہیں کر سکتے۔

علی اکبر ترمذی : گورنمنٹ ایڈ ضرور دے گی' اگر سیکولر ایجوکیشن ہو۔ لیکن جو دینی تعلیم کا مدرس ہوگا' اس کی تنخواہ ادارے کو دینی ہوگی' کیوں کہ گورنمنٹ جو ایڈ دیتی ہے نوے فیصدی ہوتی ہے۔ دس فیصدی تو ادارہ دے گا ہی۔ بلکہ اس سے فائدہ یہ ہوگا........ دیکھئے ڈی۔ اے۔ وی اسکول جتنے ہیں یہاں پر دلی میں آپ دیکھئے۔ وہاں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے مذہبی اور وہ باقاعدہ گورنمنٹ سے ایڈ لیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے مذہبی تعلیم کا ایک پیریڈ رکھا ہے۔ مگر اس مذہبی تعلیم کے پیریڈ کے لئے جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ گورنمنٹ

ایڈ سے نہیں' بلکہ اس ادارے کی جانب سے دی جاتی ہے۔ تو آخر ہم اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں' جب ہمارے مدارس بری حالت میں ہیں' روپیہ نہیں ہے' چندہ اکھٹا کیا جارہا ہے' گورنمنٹ جو ایڈ دے گی ہم اس کو سیکولر لائن پر چلائیں گے۔ اس کو' تو میں سمجھتا ہوں زیادہ مناسب ہوگا۔

اور دوسری چیز میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ ابھی نقوی صاحب نے فرمایا کہ آزاد ہندوستان میں Competition بہت بڑھ چکا ہے مگر یہ صرف ہمارے ہی بچوں کے لئے نہیں بلکہ اور جو Minorities ہیں ان کے سامنے یہ مسئلہ آتا ہے کہ تعلیم پانے کے بعد بھی ملازمتیں نہیں ملتیں۔ ملازمت کیا تجارت میں بھی آپ Competition نہیں کر سکتے۔ تو آخر ہمیں Specialization کرنا چاہیئے۔ ایسے Fields میں جو Scarcity fields کہلاتے ہیں جہاں پر دوسرے لوگ کم جاتے ہیں' اس فیلڈ کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہیئے تاکہ ہمارے بچے اس طرف بڑھیں اور Specialize کر کے ان ملازمتوں یا اس تجارت یا اس Technology کی فیلڈ میں بڑھ سکیں۔ اگر اس طرف ہم نے توجہ نہیں کی اور صرف Graduates نکالتے رہے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ ہمیں یہ سوچنا ہے Minority کی حیثیت کہ ہمارے لئے کون سے ایسے Scarcity fields ہیں! سپلائی اور ڈیمانڈ کا سوال ہے۔ خسرو جو دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں انہوں نے Economics of Communalism کے نام سے آرٹیکل لکھے تھے جو بہت دل چسپ تھے' بڑا دل چسپ تجزیہ کیا تھا انہوں نے کہ آخر یہ فرقہ پرستی اگر Minority Community کرتی ہے تو اس کے لئے زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے۔ یہ نسبت Majority Community کے۔ انہوں نے باقاعدہ Statistics سے یہ ثابت کیا تھا کہ اگر اقلیتیں فرقہ واریت کی طرف جاتی ہیں تو ان کو زیادہ نقصان ہوتا ہے کیوں کہ اگر دس فیصدی وہ Bias ہو تو ادھر نوے فیصدی Bias ہو جاتا ہے۔ تو ہمیں اس نقطہ نظر سے بھی سوچنا ہے' معاشیات کے نقطہ نظر سے کہ ہمیں کتنا نقصان ہوتا ہے' اگر ہم سوچیں اگر ہم مدرسے سیکولر لائن پر چلائیں جیسے اوصاف صاحب نے فرمایا اور ساتھ ساتھ ہم مذہبی تعلیم بھی دیں' میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مذہبی تعلیم دی جائے بچوں کو۔ مثلاً میرے بچے پبلک اسکول میں پڑھتے ہیں ان کی مذہبی تعلیم کوئی نہیں ہوگی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ انہیں مذہبی تعلیم دی جائے لیکن دقت یہ ہوتی ہے کہ ان

کے پاس وقت نہیں ہے۔ اتنا بوجھ ہوتا ہے کہ نصاب کا اتنا ٹائم صرف ہوتا ہے........ مگر اس کے لئے بہتر حل یہ ہوگا کہ جیسے یورپ میں Sunday Schools ہوتے ہیں اتوار کو کچھ مدرسے لگتے ہیں۔ ان میں ان بچوں کو جن کی دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہوتا ان کے لئے انتظام کیا جاتا ہے۔ تو کیوں ہم Sunday Schools جاری نہ کریں' اور ایسے نصاب ترتیب دیں جس کی وجہ سے سال بھر میں یا دو سال میں سنڈے کے حساب سے وہ نصاب مکمل ہو جائے۔

عبدالخالق نقوی : بات پھر گویا اپنی جگہ پر رہ جاتی ہے! یہ کچھ موجودہ زمانے کے تقاضے پورے ہوں گے' لیکن دینی مدارس جس طریقے سے چل رہے ہیں ان میں ان کا نصاب' ان کا نظام تعلیم اور اسلام کا استحکام اور جو اس وقت موجودہ ہوائیں چل رہی ہیں مادیت کی' ان کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا' یہ تو سب ختم ہو جائے گا۔ اگر ہم صرف یہی رکھیں کہ بھئی اپنے آپ کو اپنے اسکولوں کو ہم سیکولر اسکولوں میں تبدیل کر دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر خود کھودی' اور اپنے آپ اس کو ختم کر دیا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں۔

محمد اجمل خان : دیوبند نے اس سے انکار کر دیا۔

سید اوصاف علی : وہ تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس قسم کے ادارے جو خالص دینی تعلیم دیں ان کی ایک تعداد متعین ہو جائے۔ بس' پچیس جو مشہور ادارے ہیں وہ اپنی جگہ پر رہیں' ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

علی اکبر ترمذی : دیوبند کو رکھا جائے اور دوسرے بڑے بڑے ادارے ہیں ہم Utilize کرنا چاہتے ہیں۔

زید ابوالحسن فاروقی : ضرورت اس کی ہے وہاں سے قابل افراد بھی پیدا ہوں۔ ان میں ایسی اصلاح ہونی چاہئے کہ اچھے ہونہار طالب علم نکلیں۔

## مولانا سعید احمد انصاری

اصلاح کے لئے پہلے بھی بیچ کی راہیں نکالی گئیں۔ ندوۃ اور جامعہ یہ اس کی دو مثالیں ہیں' لیکن یہ کبھی کچھ کامیاب نہیں ہوئیں۔

اصل میں اب تک ہم نے گھوڑے کو گاڑی کے پیچھے لگایا ہے۔ پیوند کاری یا کم و بیش پر قناعت کرنے کے بجائے ہمیں فن تعلیم کی روشنی میں از سر نو غور کرنا چاہیئے تھا۔ اب تک وہی کتابوں کا ردوبدل اور معمولی ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی ہے۔ جب کہ فنِ تعلیم یہ کہتا ہے کہ مواد تعلیم کے سلسلہ میں مقاصد کا تعین ضروری ہے' یعنی یہ کہ طلباء کن قدروں کو لے کر نکلیں گے۔ کتابی ترمیم کا حصہ ثانوی ہوتا ہے۔ مقدم کو مقدم سمجھنا چاہیئے۔ موخر الذکر کو موخر۔ میں تو قدیم وجدید کے فرق کو بھی نہیں لانا چاہتا' یا یہ کہ وہ افضل ہے' اور یہ از کار رفتہ وغیرہ۔ مقاصد کی تعیین کے بعد ان کی روشنی میں آپ طے کر سکتے ہیں کہ کتنے علوم عصریہ نصاب میں رہیں۔ کتنے قدیم علوم اور پھر ان میں کتنے معقولات اور کتنے منقولات۔

پھر ہمارے یہاں تو کتابیں اصل ہو کر رہ گئی۔ بعض کتابیں میں مانتا ہوں کہ لاثانی ہوتی ہیں لیکن آپ ان کتابوں کی سفارش کر سکتے ہیں کہ ان سے اس فن میں مدد مل سکتی ہے۔ ویسے استاد کسی بھی کتاب سے اس فن کو سکھا سکتا ہے۔

نظامِ تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان سب مدارس کو واقعتاً ایک نظام میں پرونے کی ضرورت ہے۔ خود جدید تعلیم کے سلسلہ میں ایسی بہت سی تنظیمیں ہیں۔ اداروں کے ادغام کا خطرہ پیدا ہوئے بغیر یہ تنظیمیں قائم ہیں۔

ایک مسئلہ اور ہے' کیا پڑھائیں' اس پر تمام زور صرف کیا جاتا ہے اور اس امر کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کہ متعلم کے علاوہ ایک اور فریق بھی ہے یعنی معلم۔ اس بے زبان مخلوق کو بالکل الگ رکھا جاتا رہا ہے۔

سعید احمد اکبر آبادی

جو کچھ بھی تعلیم کے متعلق کہا جائے' میں جہاں تک سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کو ایک لفظ کے اندر جمع کیا جا سکتا ہے' اور وہ لفظ وہ ہے جس کو کہ خود علامہ اقبال نے بار بار استعمال کیا اور وہ ہے تکمیل شخصیت' علم کا مقصد در حقیقت شخصیت کی تکمیل ہے۔ یا خودی کی تکمیل یا خودی کو معلوم کرنا۔ خودی کا تعین پیدا کرنا' شخصیت کی جو تکمیل ہوتی ہے وہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ شخصیت ان چیزوں سے واقف ہو جن سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور ان چیزوں سے واقفیت کے بعد وہ اپنی نظریں فکر میں عمل میں اور کردار میں وہ اوصاف اور کمالات پیدا کرے جو کہ ان روابط اور علائق کا مقتضا ہوتی ہیں۔ تو انسانی شخصیت کا رابطہ اور علاقہ ایک طرف تو

خدا کے ساتھ ہوتا ہے' دوسری طرف کائنات کے ساتھ ہوتا ہے' اور تیسری طرف خود اپنے نفس کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو ایک مکمل شخصیت درحقیقت اسی وقت میں ہو سکتی ہے جب کہ ایک طرف اس کو خدا کی ذات اور صفات کا علم ہو' اور خدا کے ساتھ جو اس کا ربط اور تعلق ہے اس تعلق کا اس کو یقین حاصل ہو جس کو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

تو ایک طرف تو یہ چیز ہے' دوسری طرف کائنات کا علم ہے' وہ اس وقت تک آپ معلوم نہیں کر سکتے' جب تک کہ کائنات کا علم نہ ہو۔ پھر خود آپ کو جب تک اپنے نفس کا علم نہیں ہو گا' معرفت نفس نہیں ہو گی۔ تو اس وقت تک آپ اپنی شخصیت کی تکمیل علیٰ احسن الوجوہ اور خاطر خواہ طور پر نہیں کر سکتے ہیں۔ تو قرآن کے نقطۂ نظر سے علم کا جو مقصد ہے وہ ہے تکمیل شخصیت۔ یعنی یہ کہ ایک طرف انسان کے اندر اللہ کے ساتھ تعلق کی وجہ سے عبدیت تامہ اور عبدیت کاملہ آئے' دوسری طرف کائنات کا اس کو علم حاصل ہو' وہ کائنات جو اس کے لئے مسخر کی گئی ہے' جس کی غرض و غایت تخلیق انسان کی نفع رسانی اور انسان کی خدمت ہے' اور دوسری طرف پھر معرفت نفس ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں ان تینوں چیزوں کو بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خدا نے اپنی صفات کو جگہ جگہ بیان کیا ہے' اور پھر کہا ہے کہ "ء اله مع الله" کیا اب بھی تم اللہ کے ساتھ معبود کرو گے؟ "فبأی آلاء ربکما تکذبان" کیا اب بھی تم اللہ کی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ایک طرف تو یہ۔ پھر دوسری اس نے کہا" وفی انفسکم افلا تبصرون" کیا تم اپنے نفس کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے؟ پھر اس کے علاوہ انفس و آفاق کے متعلق بھی وہ کہتا ہے' ان تمام چیزوں کو دیکھو' ان تمام مخلوقات کو دیکھو۔ تو اس بناء پر علم کی تحصیل کا جہاں تک تعلق ہے تعلیم قدیم اور تعلیم جدید کا کوئی تصور اسلام کے اندر نہیں ہے۔ اسلام کے اندر تعلیم کا مقصد تکمیل شخصیت ہے۔ مگر تکمیل شخصیت کے مدارج اور مراتب ہوتے ہیں' چناں چہ قرآن نے خود کہا ہے" کل یعمل علٰی شاکلته" ہر شخص اپنی استعداد اور اپنی وسعت کے مطابق سعی و کوشش کرتا ہے۔ ایک شخص جو ہے اس کے اندر

قوتِ نظر کمال کی ہے۔ تو آپ اس سے توقع کریں کہ وہ مزدور بن جائے اور Manual work کرے۔ نہیں! ایک آدمی جو ہے اس کے جسمانی قوی بہت عمدہ ہیں۔ وہ سپاہی بن سکتا ہے، معمار بن سکتا ہے، مزدور بن سکتا ہے۔ آپ اس سے توقع کریں کہ وہ فلسفی بن جائے، وہ فلسفی نہیں ہو سکتا! پھر اس کے مختلف شعبے ہیں کہ قوتِ نظر جن میں مصروفِ تگ و دو ہوتی ہے، وہ ایک میدان نہیں، بلکہ ہزاروں میدان ہیں۔ وہ میدان طبیعات کا بھی ہے، اخلاقیات کا بھی، نفسیات کا بھی ہے، حیوانیات کا بھی، نباتیات کا بھی ہے، شریعت کا بھی ہے، طریقت کا بھی ہے اور تمام سب ہیں۔ تو جس طرح آپ اس کو محدود نہیں کر سکتے، اور کسی کے اوپر آپ Im-pose نہیں کر سکتے۔ یعنی آپ یہ کہیں کہ ہر شخص کے لئے ان تمام کا حاصل کرنا ضروری ہے، ہر شخص کو خدا کی ذات اور صفات کا علم مکمل طور پر حاصل کر ضروری ہے۔ ہر شخص کے لئے معرفت نفس مکمل طور پر ضروری ہے یہ آپ نہیں کہہ سکتے؟ کیوں کہ اگر آپ یہ کہیں گے تو "لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا" یہ اس کے خلاف ہو جائے گا تو لہٰذا اسلام یا قرآن اس کا تو آپ کو مکلّف نہیں کرتا۔ البتہ وہ ایک بات کا مکلّف کرتا ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف تو ہے معرفت اور رب کے ساتھ تعلق۔ تو اتنا تعلق تو ہر مسلمان کے لئے وہ لازمی قرار دیتا ہے جو کہ اس کی ایمانی زندگی میں جتنا کہ اس کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح علوم دنیوی کے اندر اپنی زندگی بسر کر سکے، اپنی معاش حاصل کر سکے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنتہً وفی الاخرۃ حسنۃوقنا عذاب النار

اسلام کا تعلیم کا جو تصور ہے اس کا مقصد دو لفظوں کے اندر یہ ہے کہ ایسے مسلمان ہوں جو کہ ایک طرف تو علوم دینیہ کے ماہر ہوں۔ مگر ساتھ میں علوم دنیویہ بھی جانتے ہوں۔ نمبر دو، ایسے ہوں کہ علوم دنیویہ کے ماہر ہوں، مگر ساتھ میں دین بھی جانتے ہوں، چوں کہ اسلام دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر کے چلتا ہے، البتہ کی بیشی......... اگر آپ کے اندر استعداد ہے۔ علم دین میں زیادہ ترقی کرنے کی، تو وہ کہتا ہے آپ عالم بنیئے چوں کہ ہمیں علماء کی بھی ضرورت ہے۔ مگر ساتھ میں آپ اپنی دنیا کو بھی نہ چھوڑیئے اور دنیا حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں اور علم ہے، ان کو آپ حاصل کیجئے۔ اور اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص کے اندر علم دین سے مناسبت نہیں ہے تو اس کے اوپر وہ لازمی نہیں قرار دیتا کہ نہیں صاحب آپ دیوبند کے مدرسہ کے اندر داخل ہوں....... یہ بالکل نہیں۔ لیکن ایک مسلمان کو اسلامی زندگی بسر

کرنے کے لئے جتنا علم دین ضروری ہے' وہ ضروری ہے گویا دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں علمِ دین کی تحصیل جو ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے فرض عین' اور ایک ہے فرض کفایہ' نفس دین' اتنا دین جس سے کہ مسلمان کو یہ معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہے اور بحیثیت مسلمان کے اس کو یہ کرنا چاہئے' بس اتنا دین جو ہے وہ تو فرض عین ہے' باقی اس کے علاوہ دین کے اندر مہارت اور ترقی' یہ تمام چیزیں جو ہیں اس کے لئے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی کے اندر ایسے لوگ موجود رہنے چاہئیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ سماج کا ہر آدمی اس قسم کا ہو جائے۔ چناں چہ قرآن نے کہا کہ تم میں کچھ ایسے لوگ ہونے چاہئیں کہ ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون۔ اسی کے بالمقابل وہ یہ نہیں کہتا کہ تم میں سے ہر شخص کہ انجینئر ہونا چاہئے' ڈاکٹر ہونا چاہئے' سائنٹسٹ ہونا چاہئے' بلکہ یہ لوگ ہی ایسے ہی ہونا چاہئیں' جیسے علماء ہونے چاہئیں' مگر علماء کی شان وہ کہ دنیا سے بھی واقف اور دوسری طرف وہ لوگ انجینئر' ڈاکٹر دین سے بھی واقف ہوں۔ اس طرح وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لئے چلتا ہے اور اس کے مدارج اور مراتب جو ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے یہاں جو ایک خاص قسم کا نظام فکر پیدا ہو گیا ہے' تعلیم جدید اور تعلیم قدیم کے نمائندوں کے ٹکراؤ اور تصادم سے تو اس سے بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس غلط فہمی کی میں آپ کو ایک مثال دوں۔

تقسیم ہند سے بہت پہلے کی بات ہے کہ میں نے ایک مرتبہ برہان میں ہندوستان کی اسلامی درس گاہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان میں درس گاہیں چار قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو خالص دینی ہیں' یعنی جیسے دیوبند۔ ایک وہ جو خالص دنیوی ہیں یعنی جیسے علی گڑھ۔ ایک وہ جو دینی ہیں مگر دنیوی ندوہ اور ایک وہ جو دنیوی ہیں مگر دینی یعنی جامعہ ملیہ۔ اس پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا بھائی حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے ایک سفر میں شکایت کہ سعید نے ندوہ کی بڑی سخت توہین کی ہے۔ تو میں نے کہا وہ "مگر" کا مطلب غالباً یہ سمجھے جو عربی میں لکن کے معنی ہوتے ہیں۔ استدراک کے لئے کہ میں نے دینی کہا اور اس کے بعد رجوع کر لیا' یعنی دینی نہیں دنیوی! حالاں کہ مطلب اس کا یہ تھا کہ دینی ہے مگر ساتھ میں دنیوی علوم و فنون کو بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اسی طرح میں نے جامعہ کے متعلق

کہا کہ جامعہ جو ہے وہ دنیوی درس گاہ ہے مگر دینی یعنی دینی علوم وفنون کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ تو آپ دیکھیں تو یہ چاروں ہماری درس گاہیں جو ہیں........یوں تو اسلام کے نقطۂ نظر سے اگر آپ پوچھیں کہ آئیڈیل درس گاہ کیا ہے تو اسے آپ چھوڑ دیجئے کہ اس وقت دیوبند کیا ہے اور علی گڑھ کیا ہے لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ خالص دینی ہے یہ خاص دنیوی ہے' اور وہ ایسے ہیں۔ یہ مان لیں آپ کہ یہی ہے واقعی........اسلام کے نقطۂ نظر سے اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو یہ کہنا پڑے گا کہ صحیح Islamic Idealogy کے مطابق جو درس گاہیں ہیں وہ ایک ندوہ ہے اور ایک جامعہ۔

**محمد اجمل خاں :** جزاک اللہ!

اس کی وجہ کیا ہے۔ وہ وجہ یہی ہے۔ اصل میں کہ وہ کسی طرح بھی دین کو دنیا سے منقطع نہیں کرتا۔ تو چوں کہ مقصد تکمیل شخصیت ہے اور تکمیل شخصیت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں' مختلف مراتب اور مظاہر ہوتے ہیں' مختلف ذرائع ووسائل ہوتے ہیں' اس بناء پر جس طرح سے ایک مسلمان عالم اپنی شخصیت کو ایک خاص راہ پر چل کر مکمل کرتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سائنٹسٹ' ایک مسلمان انجینئر' ایک مسلمان ڈاکٹر بھی تکمیل شخصیت کرتا ہے اگر اس نے وہی راستہ اختیار کر رکھا ہے جو اسلام نے تعلیم کے لئے مقرر کیا ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ اسلام جو سماج پیدا کرتا ہے وہ یک جہتی سماج نہیں ہے، یک فنی نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر ہمہ جہتی ہے، اس کے اندر تو ہر قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔

دوسرا مسئلہ معاش اور معاد کا ہے۔ جس پر یہاں کافی گفتگو ہوئی۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ علم کو لوگ تین اغراض سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک وہ جو علم کو کسب زر کے لئے حاصل کرتے ہیں اور ایک وہ جو علم کو حاصل کرتے ہیں دین کے لئے۔ تو سب سے زیادہ اخص الناس جو ہیں وہ وہ ہیں، جو علم کو حاصل کرتے ہیں زر کے لئے۔ یعنی واحد مقصد ان کا کسبِ زر ہی ہوتا ہے۔ حظ النفس اور اپنے آپ کو فائدہ پہنچانا۔ تو یہ چیز ظاہر ہے کہ اس کے خلاف ہے۔ اس واسطے کہ قرآن نے کہا:

"وفی اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم"

آپ اگر مال بھی کما رہے ہیں، تجارت بھی کر رہے ہیں، یا تنخواہ لے رہے ہیں، صرف اس لئے کہ اپنے بال بچوں کے واسطے عیش و آرام کا انتظام کریں، اور باقی آپ کا فرقہ اور آپ

کی امت کتنی ہی غریب ہو، اس کی کوئی پرواہ نہیں، تو یہ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن اگر آپ دنیا کمار ہے ہیں اور اس میں آپ سمجھتے ہیں کہ سائل کا اور محروم کا بھی حق ہے تو وہی چیز عین اسلام کے مطابق ہو جاتی ہے۔ تو اس بناء پر فقط کسبِ زر اور حصول دنیا کے لئے جو لوگ علم حاصل کر رہے ہیں وہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ ایک بہت اعلیٰ درجہ کے دوشالہ آپ استعمال کریں جوتوں کو صاف کرنے کے واسطے، جب کہ اس کا ایک بہت اعلیٰ اور اونچا مقصد ہے۔

نمبر ۲ کے اوپر وہ ہیں جو علم کو علم کے لئے حاصل کرتے ہیں، وہ بھی وہ ہیں جو "مِمّا یتحمل" یعنی ان کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ سب سے اونچے وہ لوگ ہیں جو علم کو حاصل کرتے ہیں دین کے لئے۔ مگر دین کا Conception فقط یہ نہیں ہے کہ نماز، روزہ بتلادیں۔ پوری زندگی جو ہے وہ دین ہے۔ زندگی کی ہر حرکت، ہر سکون، ہر سانس، ہر جنبش، اٹھنا بیٹھنا، آپس کے ازدواجی تعلقات، عائلی تعلقات، خاندانی تعلقات، قومی تعلقات، زندگی کی ہر حرکت دین کے ماتحت ہے تو دین کے لئے علم کا مطلب یہ ہے کہ علم کو آپ..... سائنس آپ حاصل کر رہے ہیں۔ مگر یہ سائنس آپ دین کے لئے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ دین کے معنی کیا ہیں۔ کیا اللہ کے حکم کے ماتحت، اللہ کی رضامندی کے معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک پروانہ لکھ کر بھیج دیں گے۔ اللہ کی رضامندی کے معنی یہ ہیں کہ خلق خدا کی آپ خدمت کریں، انسانیت کے قافلہ کو آپ آگے بڑھائیے، انسانی اجتماع اور تمدن کو آپ ممکن فائدہ پہنچائیے۔ اگر آپ بم بھی بنائیں Atomic Energy کے اوپر اگر آپ ریسرچ کر رہے ہیں، تو یہ بھی عبادت ہے، یہ بھی ایک دین ہے۔ فرق صرف اتنا ہو جاتا ہے Atomic Energy کے اوپر اگر آپ اس لئے ریسرچ کر رہے ہیں کہ آپ کو بم بنا کر انسانی آبادی کو تباہ کرنا ہے تو بس وہی کفر ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے بلکہ Atomic Energy سے آپ کو انسان کی تعمیر و ترقی اور سماج کی ترقی کا فائدہ لینا ہے تو وہی دین ہے۔ اصل میں مغالطہ اور Confusion جو پیدا ہوتا ہے وہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہم دین کو بہت ہی محدود کر دیتے ہیں۔ اگر ہم دین کا اتنا بڑا وسیع مفہوم لیں، قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ دین اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے اور بخاری میں جو آتا ہے۔ "انما الاعمال بالنیات" یہ تمام چیزیں، ہر حرکت ہماری دین ہے۔

**نقوی :** انسان کی Eternity کا آپ نے جو فرمایا ہے، وہ کیا ہے؟

وہ نہیں سمجھ میں آئی بات، کہ آپ کے عبدیت کے تصور کا کیا مفہوم.......؟

اکبر آبادی : عبدیت ؟انسان کی۔

نقوی : ابدیت!

اکبر آبادی : عبدیت! عبدیت! عبدیت!!

.....................................................

بیدار : مجھے ایک بات پوچھنی تھی سعید صاحب سے اور وہ اس وجہ سے کہ علی گڑھ کے تھیالوجی ڈپارٹمنٹ کے آپ صدر ہیں............ یہ سارا سلسلہ جو عام عربی مدارس کی تعلیم کے بارے میں چل رہا ہے اس سے بالکل ہٹ کے..........اس نصاب میں جو آپ کے یہاں رائج ہے، کوئی ترمیم یا کوئی اضافہ ،یا کوئی ایسی چیز سوچی گئی ہے یا آپ کے ذہن میں ہے ؟یا کچھ کرنا چاہیئے ؟یا جیسا کہ چل رہا ہے۔ویسے کا ویسا ہی آپ کے خیال میں مناسب ہے ؟

اکبر آبادی : بات اصل میں یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جو مدرسہ بنایا تھا، کالج اور ایک تعلیمی نظام انہوں نے رائج کیا تو ان کی تمام تحریروں کو دیکھنے سے اور ان کی تقریروں کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ درحقیقت ان کے سامنے جو اصل مقصد تھا وہ انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو لانا تھا تاکہ مسلمان انگریزوں کے اقتدار کے بعد جس ذلت کا شکار ہو گئے ہیں اس سے بچ جائیں اور نکل آئیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے دماغوں میں یہ بدگمانی تھی سر سید کے متعلق، بدظنی تھی، ان سے اور ان کو کہتے تھے کہ یہ کرسچین ہیں، اور کرسچین بنانا چاہتے ہیں۔ نیچری بنانا چاہتے ہیں۔ تو اس قسم کی باتوں کی وجہ سے سر سید کو مسلمانوں کا کچھ اعتبار بھی حاصل کرنا تھا۔ نمبر ایک، نمبر دو یہ کہ بہر حال وہ مسلمان بھی تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمان تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ مسلمان خواہ کچھ ہو جائے، سائنٹسٹ ہو، انجینئر ہو، ڈاکٹر ہو، علم جدیدہ کا ماہر ہو لیکن بہر حال اس کو اپنے مذہب سے واقف ہونا چاہیئے، دینیات سے واقف ہونا چاہیئے۔ تو اس بناء پر انہوں نے دینیات کو لازمی قرار دیا تھا اور ابھی تک، حالاں کہ اب زمانہ بہت کافی آگے نکل گیا۔ بہت ترقی ہو گئی ہے، اور بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں اور اس کا چہرہ بہت کچھ بدل گیا ہے، اور جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی بدل جائے گا، کیوں کہ زمانہ کی طاقت کا مقابلہ بہت مشکل ہے، اس کے باوجود وکٹوریہ گیٹ کے اوپر محراب میں جو عربی عبارت لکھی ہوئی ہے جسے منشور کہنا چاہیئے سر سید کا، اس میں صاف طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ "یہ مدرسہ، کالج، اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ یہاں کے بچے

ایک ہاتھ میں دین اور ایک ہاتھ میں دنیا رکھیں۔" تو سر سید یقیناً بہت مخلص، بڑے سچے اور بڑے پکے مسلمان تھے، لیکن بعد میں جو تبدیلیاں ہوئیں، اور جو معاشرہ پیدا ہوا..... خود میرے بچپن کی بات ہے کہ میرے ایک بچازاد بھائی علی گڑھ میں پڑھتے تھے، یہاں سے جب وہ گئے تو ان کی حالت یہ تھی کہ وہ اردو میں بولنا اپنی توہین سمجھتے تھے، بعد میں جب خلافت موومنٹ پیدا ہوئی اور قومی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں تو پھر بعد میں رنگ بدلا ہے، ورنہ اس زمانہ میں رنگ یہی تھا کہ انگریزوں کی پیروی کرو۔ انگریزوں کا اتباع کرو۔ انگریزوں کے نقش قدم پر چلو، ان کی طرح کھاؤ، ان کی طرح پیو، اٹھو بیٹھو۔ تو اس دور میں دینیات محض دکھاوے کے لئے رہ گئی۔ باقاعدہ اس کا ڈپارٹمنٹ کوئی نہیں تھا۔ ناظم دینیات کی حیثیت سے مولانا سلیمان اشرف صاحب تھے، مولانا عبدالرشید صاحب تھے، لیکچرر ہوتے تھے، مگر اس کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ کبھی کسی عنوان پر دے دیئے، کبھی کسی پر۔ یہ حالت چلی آئی اس کی۔ یہاں تک کہ سن ۵۸ء جب ہمارے بشیر زیدی صاحب وائس چانسلر تھے، تو انہوں نے مجھ کو بلایا اور مولانا علی نقی صاحب کو بلایا اور اس میں ریڈر شپ پیدا کی، پہلی مرتبہ۔ پہلے ریڈر شپ نہیں تھی، اور ڈپارٹمنٹ ہی نہیں تھا۔ اس کی فیکلٹی الگ تھی۔ لیکن ڈین اس فیکلٹی کا ہمیشہ پی۔ وی۔ سی ہوتا تھا۔ کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جس ڈپارٹمنٹ کے اندر ریڈر کوئی نہ ہو تو اس کا براہ راست تعلق پی۔ وی۔ سی سے ہوتا ہے، تو جب میں آیا تو میں سینئر تھا تو میں ڈین بھی ہو گیا۔ تو مجھے بحیثیت ڈین کے زیادہ اختیارات تھے، اصلاح کے، ترقی کے، تو میں نے یہ دیکھا کہ "بی ٹی ایچ" اور "ایم ٹی ایچ" کا کورس محض دکھاوے کے لئے ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں "بی ٹی ایچ" کے اندر نور الانوار بھی پڑھائی جاتی ہے، اصول شاشی بھی، ہدایہ بھی، سراجی بھی، حجۃ اللہ البالغہ بھی۔ پڑھنے والے وہ ہوتے ہیں، جو عربی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب ہدایہ پڑھا رہے ہیں، اور لڑکوں کو لکھا دیا کہ لکھ لو اس کا ترجمہ۔ وہ لکھ لیا انہوں نے، اور اپنے پاس ہو گئے، اللہ اللہ خیر صلا۔ میں جب گیا میں نے کہا کہ یہ چیز بالکل غلط ہے۔ عربی کو میں نے Compulsory کر دیا ہے۔ مگر ظاہر بات ہے کہ اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ "بی ٹی ایچ" کے اندر، تو وہ بالکل ابتدائی عربی پڑھتے ہوئے ہوتے ہیں، "تو بی ٹی ایچ" میں اب تک محض اردو کے سہارے گزارہ ہوتا ہے، اردو کے سہارے پڑھتے ہیں اور اردو ہی کے نوٹ ووٹ لکھ لیتے ہیں، اور عربی پڑھتے رہتے ہیں۔ البتہ دو سال کی عربی

کے بعد وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ "ایم ٹی ایچ" کے اندر جو کتابیں، ان کو بھی وہ عربی کے اندر پڑھ سکیں۔ میں چاہتا تھا کہ اور مزید اس میں ترمیم ہو۔ لیکن حالات ایسے............ ہیں کہ اس کے اندر اور کچھ زیادہ اصلاح ہو نہیں سکتی ہے۔ اس واسطے کہ عام طور پر جو لڑکے داخلہ لیتے ہیں، وہ وظیفہ کے لئے لیتے ہیں۔ پچانوے فی صدی۔ کیوں کہ ۲۵ روپے پہلے وظیفہ تھا، اب ۳۰ ہو گیا ہے۔ اس کے لئے اور ہوتا ہے ڈبل کورس ان کا۔ یعنی ادھر ایم اے کے اندر بھی داخل ہوتے ہیں، ایم ایس سی کے اندر بھی ہوتے ہیں۔ تو ادھر سے جو کچھ بھی تھوڑا بہت وقت ملتا ہے وہ اپنے "پی ٹی ایچ" میں آگئے۔ تو ہم، "پی ٹی ایچ" کو جیسا کہ ہم چاہتے ہیں پڑھانا، ترقی کرنا، وہ ہم نہیں کر سکتے، اور اسی وجہ سے زیدی صاحب جب وائس چانسلر تھے تو میں نے یہ تجویز کی تھی کہ جس طرح آپ کے یہاں طبیہ کالج ہے، اسی طرح سے ایک دینیات کالج آپ بنائیے، جس کے اندر بالکل ایک نیا نصاب ہو۔ جس کے اندر وہ تمام چیزیں ہوں اور آٹھ سال کا کورس ہو.......... تو، بہر حال پہلے سے تو کافی ترقی ہو گئی ہے اب۔ "مذاہب کا تقابلی مطالعہ" اس کا بھی ایک مستقل پرچہ ہے سو نمبر کا........

بیدار : تو تقریباً فضول ہے، موجودہ صورت میں ؟

اکبر آبادی : نہیں، فضول تو خیر نہیں ہے بھئی۔ لیکن بہر حال ابھی ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اس درجہ میں ہے لیکن ہماری خاطر خواہ نہیں ہے...... ہمارے شبیر احمد غوری بھی "پی ٹی ایچ" کئے ہوئے ہیں۔ ان کو اندازہ ہو گا ضرور کہ اس میں کیا ہوتا ہے۔

غوری : جی، میں نے ۳۸ء کے اندر کی اس زمانے میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اس زمانے کے اندر وہی طالب علم آتے تھے جن کے پاس کچھ علم ہوتا تھا۔

## مولانا سید عبد الدائم جلالی

عربی مدارس ہیں کیوں ؟ اور کیوں ہوئے ؟ ہندوستان کے اندر، پاکستان کے اندر، افغانستان کے اندر، ترکستان کے اندر، یہ ہوئے کیوں ؟ اور کب سے ہوئے ؟ اور اس میں کیا پڑھایا جاتا تھا ؟ اور اب کیا پڑھایا جاتا ہے ؟

بنی امیہ کے آخری دور سے جب ترجمے شروع ہوئے یونان کی کتابوں کے، یونان

کیوں کہیئے، ارسطو کی کتابوں کے! کہیں افلاطون کی کتابوں کا، تو نام نہیں آتا، فلسفہ اشراق کا الا ماشاء اللہ ایک آدھ جگہ، تو ارسطو کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ اور عربی میں لوگوں نے ان کو پڑھا۔ وہ کیا تھے؟ کچھ طبیعیات تھے، مکان کی بحث تھی، زمان کی بحث تھی، حرکت کی بحث تھی، علت العلل کی بحث تھی، علت العلل سے خاص ساری کائنات کا صدور تھا۔ صدورِ اول کس کا ہوا تھا؟ اس قسم کی بحثیں تھیں۔ تو بعض بحثیں تو ایسی تھیں جو اسلام کی نہ موافق تھیں، نہ مخالف تھیں۔ اسلام کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی تھیں جن کا ٹکراؤ ہوتا تھا اسلامی عقائد سے۔ مثال کے طور پر مادہ کا قدم تھا جو ابن سینا نے کہا ہے مادہ کی بحث میں "ومنها نظائر ثلاث نكات"۔ یہیں سے تین نکتے ظاہر ہو گئے، قدم عالم ثابت ہو گیا۔ اب اس سے ٹکراؤ پیدا ہوا۔ ان کو حاصل کیا۔ حاصل کرنے کے بعد علم العقائد کی بحث چھڑ گئی۔ کچھ مسلمان فلسفہ کی رو میں بہہ گئے۔ کچھ مسلمانوں نے ان علوم کو حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ پر غور کیا، قرآن پر غور کیا، حدیث پر غور کیا اور عقل پر اور زیادہ غور کیا عقل سے۔ اور پھر، انہیں فلسفیوں کے اسلحہ سے انہیں کا مقابلہ کیا۔ یوں چلتا رہا قصہ، ایک مدت تک۔ اس کو آپ جبریہ کہہ لیجئے اور اس کو قدریہ کہہ لیجئے، معتزلہ کہہ لیجئے، کچھ اور کہہ لیجئے۔ بہر صورت یوں چلا سلسلہ ابن ندیم کا، ابن طفیل کا۔ ان لوگوں کا قصہ چلتا رہا۔ یوں منتقل ہوتے ہوئے اب آیا دور ترکستان کا۔ ترکستان میں علم کلام اور فلسفہ اور طبیعیات کی کتابیں جو پہلے ترجمہ عربی میں ہو چکی تھیں، وہ بھی آئیں اور کچھ مسلمانوں کی تصنیفات بھی ان کے ساتھ ساتھ شامل ہوئیں۔ بطور تردید یا بطور تائید دونوں طریقہ سے آئیں۔ ہمارے متقدین تو فلسفہ ارسطو کو پڑھنے کے بعد بالکل اس کے حامی بن گئے' آستین چڑھا کر اس کی طرف داری کرنے لگے' جیسے البہری کے بعض لوگوں نے تردید کے طور پر اس کو حاصل کیا۔ یہ دور گزر گیا۔ اب ہمارے پاس ہندوستان میں جتنا ذخیرہ آیا وہ ترکستان سے آیا۔ یہ ہدایہ جو آپ کے درس میں داخل ہے' تالیفاتِ حدیث بیشتر ہماری اسی جگہ سے آئیں' بخاری آئی' ترمذی آئی' قزوینی کی آئی' ابی داؤد سجستانی کی آئی' یہ تمام کتابیں جو صحاح کی ہیں یہ ہماری ترکستانی تالیفات ہیں۔ فقہ بھی ہماری انہیں راستوں سے آئی اور ساتھ ساتھ منطق کی کتابیں اسی راستے سے آئیں اور چوں کہ ترجمہ صرف ارسطو کی کتابوں کا ہوا تھا............ اس لئے ارسطو ہی کی کتابوں کے تراجم آئے۔ باقی جو یونانی فلاسفہ تھے ان کے کہیں کہیں چیدہ اقوال ملتے

ہیں' اور کوئی مرتبہ فلسفہ نہیں ملا۔ اور اب آ گئے ہندوستان میں اور ہم نے ان کو پڑھنا پڑھانا شروع کر دیا۔

ہندوستان میں وہ کتابیں داخل کر لی گئیں' تو دو گروپ بن گئے یہاں پر ایک معقولاتی' دوسرا منقولاتی۔ معقولاتی (شاہ ولی اللہ)' منقولاتی (فرنگی محل) کچھ علماء نے دیکھا دونوں علیحدہ علیحدہ تو چل نہیں سکے' توانہوں نے ایک درس گاہ بنائی کسی درخت کے نیچے بیٹھ کے' چھوٹی سی' جسے آپ کہتے ہیں درس گاہ دیوبند۔

یہ اس زمانہ کے لحاظ سے بہت مفید چیز تھی لیکن وہی مضر بھی کہ اب وہی قدیم طریقہ قائم ہے اور قوتِ اجتہاد و تفکر مفقود۔ نتیجہ وہ ہے جو آپ کے سامنے ہے' ہم زمانے سے تصادم نہیں کر سکتے' اور جو ایسا کریں ہم انہیں اہلِ علم نہیں کہہ سکتے۔

اس بناء پر آپ کو ضرورت پڑی کہ اصلاح کریں۔ وقتاً فوقتاً یہ قدیم مدرسے خود بھی ترمیمیں کرتے رہے۔ مثلاً فرنگی محل' جہاں سلم' قطبی اور میبذی رہ گئیں' باقی شمس بازغہ' شرح تجرید وغیرہ ختم۔ تو یہ کچھ تو زمانے کے ہاتھوں ہی ہوتا چل رہا ہے' زمانے نے خود ہی ان کے ہاتھوں ختم کرادیا ہے اور یہ بھی ناکارہ ہیں۔ میبذی بھی تو ایک تاریخ فلسفہ ہے' فلسفہ کہاں' فلسفہ تو زندہ کو کہتے ہیں' مردہ فلسفہ' فلسفہ کہاں ہے۔ اس کو اگر ہم پڑھیں تو تاریخ فلسفہ کی حیثیت سے پڑھ سکتے ہیں' نہ کہ علمی حیثیت سے۔ علم تو وہ اب رہا نہیں۔ اب تو دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ وہ تو ایک جہالت رہ گئی۔ تاریخ جیسے ہوتی ہے ویسے ہی تاریخ فلسفہ بھی' ان میں کوئی فرق نہیں۔ منطق کیا ہے؟ منطق چند مختصر اصولوں کا نام ہے' اس کے آگے کوئی منطق نہیں ہے۔ جتنی منطق کی کتابیں' وہ سب فلسفہ کی لڑائیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ الٰہیات قاضی اُٹھا کے دیکھ لیجئے۔ ملا حسن کی بحثیں دیکھ لیجئے' علم واجب کی ساری کی ساری الٰہیات کی بحثیں ہیں۔ منطق سے کیا تعلق ہے ان کا۔ کوئی مسئلہ ان میں ایسا نظر نہیں تاکہ منطق کا ہو۔ کیوں کہ منطق کو تو ایک مرقات کافی ہے' اور منطق تو ایک بدیہی چیز ہے' ہر قوم میں' ہر زبان میں منطق ایک ہی رہے گی۔ کوئی فرق نہیں رہے گا۔ کوئی فرق اس کے اندر ہے ہی نہیں۔ آپ استقراء پر بنا کریں یا برہان پر' رہے گی ایک ہی چیز۔ وہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔ امام ابو حنیفہؒ نے منطق نہیں پڑھی تھی لیکن تمام کلام ان کا مبنی ہے منطق پر' باوجود یہ کہ منطق کا ترجمہ بھی ان کے زمانے میں نہیں ہوا تھا۔ جن لوگوں نے منطق پڑھی تب اور نہیں پڑھی

تب ' فطرت نے انہیں اصول کی طرف ان کی ہدایت کی ' اور آج بھی انہیں اصول کی طرف فطرت ہدایت کر رہی ہے ' وہ ایک فطری چیز ہے۔ ہماری بحث یہ ہے کہ مدارس عربیہ کیوں قائم ہیں اور کیوں قائم ہوئے ؟ قائم ہونے تھے فقط استحکام دین کے واسطے ' بقائے دین کے لئے ' دنیا کمانے کے لئے نہیں قائم ہوئے تھے ' اس کو خوب سمجھ لیجئے۔ وہ بحثیں جو فلسفہ نے لا کر داخل کر دی تھیں اور وہ اسلام شکن تھیں ' ان کی تردید کے لئے ہمیں ضرورت پڑی تھی کہ ہم درس گاہیں قائم کریں۔ کتابیں ہمارے پاس شروع میں نہیں تھیں ' ہمارا طریقہ املاء کا تھا ' فقط لکھوانے کا تھا ' لیکچر کا تھا ' یہ کتابیں بعد کو بنیں۔ اب ہم ان کتابوں میں جامد منجمد ہو کے رہ گئے ' اب ہمارا املاء کا طریقہ بھی جاتا رہا۔ ضرورت ہے اس چیز کی کہ جس طرح ہم نے ارسطو کے نفس ناطقہ کی بحث کی تردید کی تھی ' اسی صورت سے ہم تردید کریں۔ ان چیزوں کی جو روح کا انکار کرتے ہیں ' اور روح کو روحِ طبی میں منحصر سمجھتے ہیں ' اور روح کو مادیت سے علاوہ کوئی شے نہیں سمجھتے۔ آج ہمارے واسطے ضروری ہے کہ ہماری درس گاہوں کے اندر استحکام ہو اسلام کا ' اور استحکام اسلام کا کیسے ہو ؟ چند فقہ کے مسائل جاننے سے اسلام کا استحکام نہیں ہوتا ہے۔ ضرورت ہے اس چیز کی کہ ہم علوم جدیدہ حاصل کریں۔ اب عربی میں بھی علوم جدیدہ آچکے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کیپٹل یا کارل مارکس ' انگریزی یا فرنچ یا کسی اور زبان ہی میں ہے ' نہیں ' عربی میں بھی موجود ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ عربی میں ترجمہ ہو کے نہیں آئی ہے آپ اگر غور کریں گے ' اور اس کو پڑھیں گے اور پڑھائیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ اسلام کی کس طریقہ سے جڑیں کھودی گئی ہیں۔ روٹی کا مسئلہ تو حقیقتاً بہت ہی ذلیل مسئلہ ہے ' صنعت و حرفت میں روٹی ہے ' تجارت میں روٹی ہے ' اور بہت سارے روٹی کے ذریعہ ہیں ' ملازمت تو بہت حقیر ذریعہ ہے روٹی کا ' ہمیں قائم رکھنا چاہئے ان مدارس کو استحکام اسلام کے لئے ' استحکام اسلام ہمارا جب ہی ہو گا جب اسلام پر دنیا میں جو اعتراض کئے گئے ہیں ہم ان کا علم حاصل کریں ' پھر ان کی تردید کریں۔ ورنہ یاد رکھیئے کہ مادیت جیسے کہ عیسائیت کو بہا کر لے گئی ' جیسے اشتراکیت عیسائیت کو بہا کے لے گئی ' آدھی دنیا تو برائے نام بھی عیسائی نہیں رہی ' اور آدھی جو برائے نام عیسائی رہ گئی ہے وہ نہیں ہے ' حقیقت میں ایک فرقہ ہے اس کو عیسائی کہا جاتا ہے ' عقائد عیسائیت اس کے اندر نہیں ہیں۔ اگر آپ بھی اپنا برائے نام فرقہ اسلام رکھنا چاہتے ہیں تو بالکل ٹھیک ہے ' اس کو رکھ دیجئے یا اس کو رکھ دیجئے '

سب برابر ہیں اور اگر آپ واقعی ایک اسلام قائم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو غور کرنا پڑے گا کہ درس گاہیں کیسے قائم رکھیں' اور ان میں کیا پڑھائیں؟

ابتدائی بنیادی تعلیم اگر دینا ہے آپ کو اسلام کی' تو شروع کے درجوں میں انہیں ابتدائی تعلیم دے دیجئے۔ پھر بچوں سے کہہ دیجئے کہ جاؤ اسلام کے ابتدائی معلومات حاصل ہو گئے۔ اب کوئی صنعت سیکھو' کوئی پیشہ سیکھو' تمہارا اور کام نہیں آگے بڑھنے کا۔ لیکن جو اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں اور پیسوں کے تمنائی نہیں ہیں' فاقے مرنا چاہتے ہیں' لیکن استحکام اسلام چاہتے ہیں' ان کو آنا چاہئے ان مدارس کے اندر۔ ہم نے اب جب کہ استحکام اسلام کو اپنی زندگی کا موضوع بنایا ہے تو ہم کو بوریا پر بیٹھنے میں ساری عمر کوئی تکلیف نہیں ہے' کوئی ضرورت نہیں ہے' موٹر کی اور کوٹھی کی۔ اور اگر موٹر اور کوٹھی لینا ہے تو اس کے واسطے تو صنعت و حرفت ہے اور تجارت ہے' اور بڑا میدان ہے اس کا۔ یہ راستہ نہیں ہے' دولت حاصل کرنے کا۔ ہم میں سے کوئی کوئی اتفاق سے جو جو آگے بڑھ گیا' ہمارے مولانا اکبر آبادی مثلاً ابتداء میں فتح پوری میں مدرس تھے' اس کے بعد انہوں نے علوم جدیدہ حاصل کیئے' کچھ انگریزی پڑھی' ایم اے ہوئے' کیا ہوئے' اچھا بڑھ گئے' دو ہزار اور تین ہزار تک بڑھ گئے' مگر ہماری نظر کے اندر ہماری بوریا نشینی سے آگے نہیں بڑھے' یہ میں آپ سے عرض کئے دیتا ہوں ہم جس جس جگہ پر بیٹھے ہیں' اپنی جگہ پر خوش ہیں بالکل۔ اب ہمیں بتائیے کہ کون سا ذریعہ ہو استحکام اسلام کا۔ ہمارے دماغ میں جو کچھ آیا ہے وہ یہی آیا ہے کہ پرانے فلسفہ کی کتابیں ہٹادو' کیوں کہ ان میں تاریخِ جہالت ہے' منطق کو ختم کردو' مرقات کا ابتدائی رسالہ کافی ہے' یا کوئی اور بھی رسالہ رکھ لو۔ پھر فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دو' اصول تفسیر کی تعلیم دو' اور صرف املاء کی تعلیم! اتنے لمبے چوڑے اس جھنجھٹ میں مت پھنسو۔ البتہ جو تخصص حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے واسطے ضروری ہے کہ نظر اس کی بہت ہی زیادہ وسیع ہو۔ لیکن ابتدائی معلومات کے واسطے تو ابتدائی املاء کی تعلیم ہی کافی ہے۔ ہمارے متقدمین املاء سے تعلیم دیا کرتے تھے۔

## عبد الخالق نقوی

ابھی مولوی سعید احمد صاحب نے اپنے مقالے کی ابتداء میں کہا کہ میں نے چلتے چلتے یہ

تحریر لکھ لی۔ جیسے ہمارے شعراء معاشرے میں غزل پڑھتے وقت کہتے ہیں۔ یہ طریقہ ٹھیک نہیں' پھر موضوع کچھ اور تھا اور انہوں نے ابتداء ذکر آدم سے کی۔ اگر بات وہاں تک پہنچانا ہے تو پھر ادھر تو یہ بھی سوال اٹھ سکتا ہے کہ فرشتوں پر آدم کو ترجیح اسی طرح دی گئی کہ سارے اسماء آدم کو بتلا دیئے اور پھر فرشتوں سے پوچھا تو اس میں آدم کی فضیلت کیا ہوئی۔ پیپر تو پہلے ہی آؤٹ کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

دوسرے "طلب العلم فریضہ" اچھی حدیث ہے۔ لیکن علماء کہتے ہیں یہ موضوع حدیث ہے۔ بہت سی حدیثیں ہیں جن کے مضمون بہت مقبول ہیں۔ لیکن اسناد کی رو سے وہ ضعیف ہوتی ہیں۔ مثلاً یہی حدیث ہے اگرچہ بات بہت اچھی ہے' دوسری "ولو کان بالصین" کے بارے میں نہیں جانتا' لیکن دیکھنا اسے بھی چاہیئے۔

پھر مولانا نے ایک جگہ "علم ہندسہ و علوم ریاضیہ" لکھا ہے۔ ہندسہ سے علوم ریاضیہ کا جزو ہے' اس طرح اسے الگ لکھنا مناسب نہیں۔

جامعہ ازہر کے سلسلہ میں مولانا نے لکھا ہے کہ اس میں انیسویں صدی میں جمود کی حالت تھی' لیکن سعد زغلول' مفتی محمد عبدہ اسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اصل میں جمود کا زمانہ اس سے پہلے کا تھا۔ نپولین کے حملہ کے بعد ہوش آگیا اور ان لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

مولانا نے ایک شخص سارٹن کا حوالہ دیا ہے۔ ان لوگوں کے طرزِ فکر میں بنیادی کجی ہے۔ ان کے بیانات کو اس طرح اہمیت دینا ٹھیک نہیں۔

اصلاح نصاب کے سلسلہ میں بعض اقدامات کا ذکر ہوا۔ ایک کمیٹی اس سلسلہ میں بھوپال میں بھی بنائی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی ہو رہی تھی۔ اس موقع پر موسیٰ جار اللہ نے بمبئی سے ذاکر صاحب کو ایک نصاب تعلیم مرتب کر کے بھیجا تھا۔ انہوں نے اس میں یہ بتلایا تھا کہ سب سے پہلے یہ فیصلہ ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔ انجینئر اور ڈاکٹر بنانا ہو تو ابتدائی اسلامی تعلیم دے کر مثلاً علی گڑھ بھیج دیں۔ لیکن اگر اسلام کے مبلغ بنانا چاہتے ہیں اور اس کی تعلیم کو ان کی زندگیوں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے یہ نصاب ہے۔ انہوں نے یہ نصاب عربی میں لکھا تھا میں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے شافیہ کافیہ از کار رفتہ ہوں۔ ٹھیک ہے انہیں نہ پڑھایئے۔

لیکن جو مسائل ان کتابوں میں ہیں انہیں تو پڑھانا ضروری ہی ہے۔ اپنے طریقے سے پڑھایئے۔ عربی زبان کے لئے یہ علم تو ناگزیر ہے۔

اور اصل میں ہمارے اساتذہ کی یہ کمزوری بھی رہی کہ صرف پڑھانا مقصود نہیں رہا۔ بلکہ شافیہ استاد خود شرح دیکھتے ہیں' حاشیہ دیکھتے ہیں تو طالب علم میں اجتہادی کیفیت کہاں سے آئے۔ ایک طالب جس نے بارہ سال دینی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ مجھ سے کہنے لگا بارہ سال میں ہم جو چیز حاصل کرتے ہیں وہ آپ اپنے اسکول میں بارہ مہینے میں کیسے سکھا دیتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر ہم اپنے طالب علم کو کم سے کم اتنا ضرور کر دیتے ہیں کہ عربی کے بارہ مہینوں کے نام بتا سکے اور یہ کہ کہاں الف لام لگے گا' کہاں نہیں۔ ہم کم سے کم انہیں حروف ہی کے ناموں میں غلطی کرتے نہیں سنتے۔ کیا تم یہ نام صحت کے ساتھ بتا سکتے ہو؟

تو مسئلہ اساتذہ کا بھی ہے۔

کسی بھی شہر میں جہاں تھوڑی بہت مسلم آبادی ہے' وہاں کچھ نہ کچھ ایسے مدرسے ضرور قائم ہیں۔ تو اچھا ہے اگر ہم ایک نصاب بنائیں اور اسی راستے پر چلنے کی کوشش کرائیں کہ سب مشترک ہوں' اور ان مدارس کو ایک نظم میں پرونے کی کوشش کی جائے۔

یوں ہمیشہ دنیا میں ہوتا یہ آیا ہے کہ کوئی سر پھرا دیوانہ آدمی اٹھتا ہے اور وہ کوئی کام انجام دیتا ہے۔ کام کرنے والا کوئی ایک ہی ہوتا ہے۔

تعلیم کے مقصد کو بہر حال سامنے رکھنا ضروری ہوگا اور اس تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ کہیں نوکری مل جائے' آل انڈیا ریڈیو میں یا وزارت خارجہ میں' بلکہ جہل و تاریکی و غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا' یہ کہ فکر کے دریچے کھلیں اور آزاد قوم کی اُمنگیں پیدا ہوں۔

وہ جو اقبال نے کہا ہے

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اب وہ یقیں کہاں ہے!!

اچھے سے اچھا نصاب بتایئے' تعلیم دینے والے میں جذبہ اور اسپرٹ نہ ہو تو کوئی کامیابی

نہیں ہو سکتی۔ سعید انصاری صاحب کے بقول ہمارے دینی مدارس میں علی گڑھ اور جامعہ کو چھوڑ کے ایسا کوئی انتظام نہیں کہ ان اساتذہ کی تربیت ہو اور وہ بھی فنِ تعلیم سے واقف ہوں۔ حدیث و فقہ وغیرہ کو کیسے پڑھایا جائے' اس سب کے لئے ایک تربیت یافتہ گروہ کی یقیناً ضرورت ہے۔

مگر سب سے بڑھ کے یہ کہ ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مدارس عربیہ یا مدارس دینیہ کا مقصد کیا ہے؟

سب سے پہلے تو یہی کہ طلبہ مذہب اسلام سے واقف ہوں' ٹھیک ہے۔ مگر قدیم طرز کی کتابیں اب اس کے لئے زیادہ سود مند نہیں۔ لیکن یہاں میں ایک اور پہلو کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس وقت یہ بھی دیکھنا ہے کہ کوئی بھی مذہب ہو وہ کس حد تک سوسائٹی کے لئے مفید ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک اہم رول اور کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم سب کا یہ بھی فرض ہے کہ اسلام کے اس پہلو کو نمایاں کریں اور اگر واقعی ایسا نہیں اور ہم سمجھتے بھی نہیں ہیں تو پھر منافقت برتنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مثلاً آپ نے ابھی سنا کہ ہمارے علماء جو پیسہ صرف کر سکتے ہیں' اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجتے ہیں جو جدید تعلیم دیتے ہیں۔ اس کا مطلب صاف طور سے یہ ہے کہ وہ خود ایک کو پسندیدہ اور دوسرے کو ناپسندیدہ سمجھتے ہیں۔

تو اگر ضرورت نے ثابت کر دیا ہے اور اگر ہم اس نظام تعلیم کو غیر ضروری سمجھتے ہیں تو اس سے بڑی کوئی منافقت نہیں۔ روپیہ' پیسہ اور انرجی ایسی جگہ صرف کریں' کیا بہتر نہ ہو گا کہ مناسب مصرف نکالیں۔

اور اگر یہی نظام رکھنا ہے تو پھر کم سے کم یہی سوچنا چاہئے کہ دینی تعلیم کیسے مکمل ہو سکتی ہے۔ جب تک اس زمانہ کے وہ ادیان' خاص کر وہ جن کا تعلق اسلام سے ہے' ان کا بھی مطالعہ نہ کریں۔ عیسائیت' ہندو مت' بدھ مت وغیرہ یا اس وقت کا اہم نظریہ کیمونزم کہ وہ بھی ایک دین ہے' یہ معلوم ہونا چاہئے ان طلباء کو کہ کیا چیز کیا ہے؟ کس کی اہمیت ہے۔ اس طرح سے ہمارے طلباء کو جمود سے بھی آزادی مل سکے گی۔

پروفیسر محمد شفیع اگوانی

مدرسوں کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود اسلامی تاریخ' لیکن اس سے مراد آپ مدرسوں کا وہ نظامِ تعلیم نہ لیں جو آج ہندوستان میں رائج ہے۔

اول الذکر اس ابھرتی ہوئی تہذیب کی پیداوار تھے' جو انسان کی روحانی اور مادی دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جن میں علم کا افق وسیع تر کرتے رہنے کی لگن تھی۔ ثانی الذکر اس ہمہ جہتی زوال کے آئینہ دار ہیں جس کے جلو میں سیاسی خلفشار تھا اور علم و دانش کا انتشار بھی اور درس نظامی جو ہندوستانی مدارس کی اکثریت قبول کئے ہوئے ہے ملا نظام الدین (م ۱۷۴۸ء) نے مرتب کیا ہے' جو مغل عہد کے آخری دنوں کی بات ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ہندوستانی مدرسے' ان کے نصاب اور ان کا طریقہ تعلیم' ان میں قدیم مدارس کی روش سے قطعی انحراف ہے۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں علوم اسلامیہ کو علوم طبعیہ اور علوم نقلیہ میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عمومی تقسیم علم لدنی اور علم عقلی کی بھی تھی۔ علوم عقلیہ میں ریاضیات' طب' طبیعیات' کیمسٹری' ہیئت اور زراعت کے علوم شامل تھے۔ علوم دینی میں تفسیر' حدیث' فقہ اور کلام شامل تھے۔ اس روش سے قطعی انحراف کرتے ہوئے درس نظامی میں علوم تقلید بھرے پڑے ہیں اور دنیوی علوم تقریباً صفر کا درجہ رکھتے ہیں۔

ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں کوئی بھی تعلیم یافتہ مسلمان ایک بھرپور ہمہ جہت نظامِ تعلیم کا پروردہ ہوتا تھا' اور کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ وہ ایک اچھا مسلمان نہ بن جائے' اور ساتھ ہی اپنے کو معاشرے کا ایک مفید رکن ثابت نہ کر پائے' اس نظام تعلیم نے بڑے بڑے فقیہہ' متکلم' طبیب' سائنس داں' ماہرِ ریاضیات' سیاستداں اور ادیب پیدا کیئے' انہیں میں ابو حنیفہ' غزالی' ابن سینا' البیرونی' خیام' ابن خلدون' امیر خسرو' ابوالفضل اور فیضی جیسے مشاہیر بھی ہیں۔ یہ بات آج ہم اپنے مدرسوں سے نکلے "تعلیم یافتہ" مسلمان کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ وہ دین کے بارے میں تو کچھ جان لیتا ہے لیکن خود اپنے طبیعی اور معاشرتی ماحول کے بارے میں اس کا علم تقریباً نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہنر بھی ہاتھ میں نہیں آیا تاکہ وہ سماج کا منفعت بخش رُکن بن سکے اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہی وہ معتمد اور دانش ور قرار پاتا ہے۔ جس سے ناخواندہ مسلمان رہنمائی اور مشورہ کے لئے رجوع کرتے ہیں!!

دوسرے یہ کہ خالص مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان مدرسوں نے اسلامی فکر کی توسیع و

ترقی میں مدد بہم پہنچانے کی جگہ کچھ رکاوٹیں ہی ڈالی ہیں۔ اٹھارویں' انیسویں صدیوں میں جب مغل روبہ زوال تھے' مسلمان نے اپنے چاروں طرف سے زمین کھسکتی پائی' کچھ اور بچا نے کی نہ سکت تھی نہ عزم' اس لئے اس نے سوچا لم سے کم مذہب ہی بچالو۔ ایسے بحرانی دور جب بھی آتے ہیں لوگ سکہ بند یا ڈھلے ڈھلائے مجموعہ عقائد (DOGMA) کو زندہ عقیدہ سمجھ بیٹھتے ہیں' سائے کو وجود خیال کر لینے لگتے ہیں۔ مدارس کا نظام تعلیم منجملہ ان بہت سی تدابیر کے ایک تدبیر تھا' جو علماء نے سکہ بند عقیدہ کی حفاظت اور اس کی تبلیغ کے لئے اختیار کیا۔

یہ سب سمجھ میں تو آتا ہے' یہ اور بات ہے کہ تاریخ اسے معاف نہ کر سکے' لیکن یہ تو عام سمجھ سے بھی فروتر رہ جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہر طرف پچھلے سو سال میں' اتنی ساری تبدیلیاں ہو رہی ہیں' لیکن اپنی کھال میں مست نظام مدارس پر ان کا مطلق اثر بھی نہیں' یہ کیا قصہ ہے؟ مسلمانوں میں سماجی اور دینی اصلاح کی متعدد تحریکیں چلیں' دارالعلوم دیوبند نےہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا۔ یہ سچ ہے لیکن مدارس کے بارے میں بالعموم یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ خود دیوبند نے اس امر کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی کہ ان لبرل اور انسانی اصولوں پر جو تمام مہذب' متمدن اور پیش بیں امتوں میں مشترک ہیں' مسلمانوں کی سماجی اور معاشی زندگی کی کس طرح تعمیر نو کی جائے۔ عہد جدید کے مسلمان مفکروں ...... جمال الدین افغانی' شیخ محمد عبدہ' سید احمد خاں نے اپنی تحریروں اور اپنے عملی کاموں سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اسلام کسی طرح جدید علوم اور انسانی معاملات کی عقلی ترتیب و تنظیم سے غیر ہم آہنگ نہیں ہے۔ روایتی طریقہ تعلیم تو اسلامی افکار کے اس حرکی حصہ سے محض بے خبر رہا یا خوفزدہ (Allergic)۔

ہمارے مدارس کا یہ رجحان بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں ہے کہ علوم اسلامیہ کو ان از کار رفتہ اور پارینہ دفتروں کی مدد سے پڑھایا جاتا ہے جو نصاب کی کتابیں کہلاتی ہیں۔ مدرسوں کا نصاب دیکھ کر قطعی طور سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جب سے قدماء ان موضوعات پر کچھ لکھ گئے ہیں' اس کے بعد سے دنیا میں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ یہ فقہ اور دینیات ہی پر موقوف نہیں' ادبی تنقید' میڈیسن' ہیئت اور ریاضیات تک کا یہی حال ہے۔ قدماء کے ساتھ اسی سادہ لوح وابستگی کا نتیجہ ہے کہ جدید عربی ادب اور جدید فارسی ادب کا بھی قطعی مطالعہ نہیں کیا جاتا یا تو

ان پر قدغن ہے یا محض سرسری تذکرہ ہو جاتا ہے۔

یہ سب کچھ تصویر کی بے رنگی کو بڑھاتا جا رہا ہے۔ نظام مدارس نہ تو مذہبی روشنی دے پاتا ہے نہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو روزانہ زندگی کے مسائل کو گرفت میں لینے کے قابل بناتا ہے' اس کے بر خلاف' یہ مسلمان کی ایک بڑی اکثریت کے لئے جو ہنوز اس کے ارادت مند ہیں' مذہبی' معاشرتی اور ذہنی ترقی کی راہ میں ایک دیوار بن جاتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ حاضر و موجود سے آنکھیں بند کرا کے اور اس پر لعنت بھیج کر' مسلمانوں کو اس کے خیالی ماضی کی طرف لوٹا رہے' یہ نہ اس کی روحانی زندگی کو ثروت مند بنا پاتا ہے' نہ اس کی دنیوی فلاح کو ملحوظ رکھتا ہے۔

میری حقیر عرض ہے کہ تمام سوچنے والے مسلمان نظام مدرسہ کی تنظیم نو اور اس کے نصب العین کی تعریف نو پر سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچیں!

جہاں تک نصب العین کی بات ہے کوئی تعلیمی نظام' مذہبی ہو یا عمومی' مفید اور اثر انداز نہیں ہو سکتا' جب تک کہ وہ اپنے متعلموں میں آزاد فکر اور خود اعتمادی پیدا نہیں کرتا۔ اگر کلامِ خداوندی کو انسان کی زندگی میں ایک زندہ اور توانا حقیقت بنتا ہے تو انسان کو خدا ہی کی عنایت کی ہوئی صلاحیتوں کی مدد سے اسے سمجھنے اور تاویل و توجیہہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ معاصرین یا قدماء کی اندھی تقلید' خواہ وہ کیسے ہی امتیاز کے حامل ہوں' عقیدہ کی روح کو کھا جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ بھی جو محض دینی عالم اور مبلغ بننا چاہتے ہیں' انہیں بھی معاشی طور سے خود کفیل ہونا چاہیئے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ بے تعداد مولوی اور مسجدوں کے امام محض اپنے روحانی مزارعوں سے حاصل کی ہوئی حقیر کمائی پر پلتے ہیں۔ گاؤں میں یہ زیادہ ہے جہاں اکثر لوگ ناخواندہ ہوتے ہیں اور مولویوں کے آگے سہمے رہتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے معیوب ہونے کے علاوہ مولویوں کی زیست کا یہ طور عام ذہنوں پر کچھ اس قسم کا افسوس ناک اثر چھوڑتا ہے کہ پھر وہ بھی خدا کی خدمت گزاری اور خود کفالتی کو دو متضاد اور مخالف حلقے سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اِن مقاصد کی کامیابی کی بس یہی ایک صورت ہے کہ نصاب اور طریقہ تعلیم دونوں پر

نظر ثانی کی جائے۔ نصاب میں اس طور پر توسیع ہو کہ مذہبی علوم کے ساتھ دنیوی علم بھی شامل رہیں۔ نئی نصابی کتابیں ایسے موزوں لوگوں سے تیار کروائی جائیں جو کلاسیکی اور ماڈرن دونوں انداز کے علوم سے واقف ہوں۔

مولانا شبلی نعمانی نے اک بار مدرسوں کے حفظ و تکرار والے طریقے پر سخت اظہار افسوس کیا تھا جو مدرسوں کے اساتذہ کا تنہا طریقہ تعلیم ہے' اور مولانا کے زمانے سے بظاہر کوئی افاقہ تو ہوا نہیں ہے۔

آخر میں! ہمیں اس کا اندازہ ہو جانا چاہیئے کہ وہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں' اس دنیا سے جس میں ہمارے اجداد بستے تھے' غیر معمولی مختلف دنیا ہے۔ پہلے سیاسی حکمرانوں کا عام قاعدہ تھا کہ اپنے ذاتی مذہب کو اس پورے خطے کا مذہب قرار دے دیتے تھے' جس کے وہ حاکم ہوتے تھے۔ ہمارے زمانے کا رجحان یہ ہے کہ ریاستیں مذہبی امور میں دخل اندازی سے بچی ہیں یا پھر تمام مذاہب کو ایک سطح پر برتتی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ مذہب اب ریاست کی مداخلت ہونے سے بچ گیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔ لیکن تمام مذاہب کے پیرووں پر کچھ نئی ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے۔ ملے جلے ہم آہنگ سماجی' سیاسی اور معاشی اطوار کی ترقی کے لئے ہر مذہب کے پیرووں کو اپنے ساتھی شہریوں کے عقائد کے بارے میں بنیادی باتوں کا علم تو ہونا ہی چاہیئے۔ اسی لئے' مذہبی علوم کے تمام اداروں کے لئے مذاہب کا تقابلی مطالعہ (Comparative Religions) اہمیت رکھتا ہے۔ مغرب کے عیسائیوں کو اس نکتہ کے سمجھنے میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اگر ہم اس معاملے میں اس بیش قیمت مثال کی پیروی کریں تو یہ اسلام کی اور خود اپنی بڑی خدمت ہوگی۔

## ڈاکٹر عبدالعلیم ندوی

حضرات! مجھے بہت خوشی ہے کہ مجھے اس صحبت میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس موضوع کی اہمیت کا آپ سب لوگوں کو اندازہ ہے' زیادہ تفصیل سے تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمارے وہ مدارس جنہیں عام طور پر عربی مدارس کہا جاتا ہے'

انہوں نے پچھلے زمانے میں بہت خدمات انجام دی ہیں' اور ان سے وہ لوگ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے ہماری تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ موجودہ زمانے میں ضرورت ہے (اس جائزے کی) کہ وہ جو نصاب پڑھائے جاتے ہیں ان کی افادیت کس حد تک ہے' اور وہ کتابیں جو پڑھائی جاتی ہیں۔

میں اس سلسلہ میں کچھ کام کر چکا ہوں۔

مولانا آزاد نے جو کچھ کیا تھا' اس کی پوری تاریخ شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔ ۱۹۳۷ء میں جب یو۔ پی کانگریس حکومت بنی تو دو کمیٹیاں بنائی گئیں' ایک سنسکرت مدارس کے نصاب کے لئے' دوسری عربی کے لئے۔ عربی کمیٹی کے صدر مولانا آزاد تھے۔ اس زمانہ میں وہ وزیر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن کچھ حالات ایسے رہے کہ اس کمیٹی کی کارروائی مکمل نہ ہو سکی۔ پھر دوبارہ جب کانگریس حکومت قائم ہوئی تو پھر وہ کمیٹی بنی' اور اس میں کچھ توسیع بھی کی گئی۔ اس میں مولانا حسین احمد مرحوم' مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم بھی تھے۔ شیعہ علماء میں سے بھی ایک دو تھے۔ میں بھی اس میں تھا۔ یہ سلسلہ میرے خیال میں کئی سال چلا۔ اب مولانا وزیر ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ مصروفیات کی وجہ سے پوری توجہ نہ دے سکے۔ ایک جلسہ آخر میں ان کے مکان پر ہوا تھا۔ جس میں سب لوگ شریک ہوئے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جس کے دوسرے دن دہلی میں فساد ہو گیا۔ جب کہ ہم لوگ واپس جا بھی نہیں پائے تھے۔ بہر حال اس کمیٹی کی رپورٹ تیار ہو گئی' اور نصاب بھی تفصیل سے تیار ہو گیا' لیکن وہ نافذ نہیں ہو سکا۔ کیوں کہ مولانا مرحوم نے کہا تھا کہ وہ ایک نوٹ لکھیں گے جو یوپی گورنمنٹ کو جائے گا۔ یہ ایک سرکاری کمیٹی تھی' سرکاری حد تک تو نافذ ہو ہی جاتا۔

آزاد مدارس پر یہ لازمی طور سے نافذ نہیں ہوتا۔ ندوہ والوں کے سامنے مولانا آزاد کمیٹی کا مرتبہ نصاب رکھا گیا تو انہوں نے کہا ہم اسے پورے طور سے قبول نہیں کریں گے لیکن اپنے طور سے اسے استعمال کریں گے۔ لیکن جب وہ سامنے آتا اور اس پر سرکاری مدارس میں عمل ہوتا تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی' بہر حال وہ چیز بھی نہ ہو سکی۔ حالاں کہ وہ نصاب چھپ گیا تھا' اگرچہ تقسیم نہ ہو سکا۔

جو بحث آج ہوئی ہے۔ اس کو ایک طور پر ختم کرنے کے لئے صدر کے فرائض میں سے یہ ہے کہ جو کچھ لوگوں نے کہا ہے اس کا خلاصہ پیش کرے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کی گفتگو میں کچھ خلط مبحث ہو گیا ہے۔ اس سیمینار کا مقصد جو میں سمجھا تھا وہ یہ تھا کہ بہت بڑی تعداد میں ہمارے یہ مدارس موجود ہیں اور موجود رہیں گے' اگر کوئی ایسی صورت سمجھ میں آئے کہ موجودہ زمانے کے جو تقاضے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھ کر ان مدارس اور بالخصوص ان کے نصاب میں کوئی اصلاح ہو سکے تو اس کے بارے میں غور کیا جائے۔

یہ سوال کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے کیا مقصد ہو' اور مجموعی اصلاح کا کام کیا جائے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے' اس کے لئے دوسری بحث کی ضرورت ہے۔ کچھ اور لوگوں کو بلانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی تعلیم کا آپ ذکر کریں گے تو ان اداروں پر بھی بحث کرنی ہوگی جن کے نام کے ساتھ مسلم لگا ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ آج کا مقصد یہ ہے کہ ایسے مدارس موجود ہیں جن میں دینی تعلیم ہوتی ہے اور جن کا بنیادی مقصد ہی دینی تعلیم ہے' تو ان کے بارے میں کچھ غور کیا جائے۔ اگر یہ محدود مقصد پیشِ نظر رکھ کر ہم گفتگو کریں تو زیادہ مفید ہوگا۔

یہ چیز تو ظاہر ہے کہ دینی مدارس' مدارس عربیہ دینیہ' ان کا مقصد دین کی تعلیم ہے۔ اور ان کا بنیادی مقصد یہ نہیں کہ ذریعہ معاش فراہم کریں۔ اس حد تک تو اتفاق رائے ہے۔ اب یہ کہ ان مدارس میں کچھ ایسی بھی تعلیم دی جائے کہ جو طلباء وہاں سے فارغ ہو کے نکلتے ہیں ان کے لئے دنیا میں معاش حاصل کرنا بھی ممکن ہو جائے' ان کا موجودہ دنیا سے ربط رہے' اگلا قدم ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ترمیم و اصلاح کی جو کوششیں کی گئی ہیں اور جن کا احساس تمام مشہور مدارس کو ہو گیا ہے' یہ کہ جو علوم پڑھائے جاتے تھے' ان کے ساتھ ساتھ کچھ جدید علوم بھی ہوں.......... مگر مقصد وہی 'دین' رہے۔ اس کے لئے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہندسہ' ریاضی' فلسفہ یونان وغیرہ' ان میں اب ترمیم کی ضرورت ہے۔ فلسفہ میں جدید فلسفہ کی ضرورت ہے۔ اگر سائنس کا کچھ علم ہمیں حاصل نہیں ہوتا۔ تو ہم موجودہ زمانہ میں مکمل نہیں

کر سکتے۔

اس کا احساس پہلے بھی ہوا اور کم و بیش اب بھی ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ندوہ کی مثال سامنے ہے۔ یہاں تک کہ دیوبند میں بھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ خالص دینی تعلیم کا ادارہ ہے۔ وہاں بھی یہ احساس ہوا کہ کم سے کم اتنی انگریزی ضرور آجائے کہ اسلام پر جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں یا جن لوگوں تک اسلام کو پہنچانا ہے (اس میں مدد ملے)۔

تو اس حد تک جو گفتگو ہوئی ہے اور جو ایک نصاب وقف کونسل کی طرف سے آیا ہے اس پر کچھ زیادہ تفصیل سے اگر بحث ہو تو مقصد........ محدود سہی، مگر میں سمجھتا ہوں مفید ہو گا۔ اور اگر بنیادی مقصد اٹھائے جائیں تو میرے خیال سے نہ تو ہم نے تیاری کی ہے نہ........ اس لئے خط مبحث ہو جاتا ہے۔

یہ کہ ان دینی مدارس کی سندیں سرکاری ملازمتوں کے لئے تسلیم کی جائیں، یہ صحیح نقطہ نظر نہ ہو گا۔ آپ کچھ بھی کوشش کریں اب تو صورت حال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں بھی طلباء کا رجحان ان مضامین کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جن سے معاش (میں سہولت ہو) سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن وغیرہ تاریخ، فلسفہ، ادب وغیرہ کی طرف رجحان کم ہو رہا ہے تو یہ توقع کرنا کہ دینی مدارس سے ایسے لوگ نکلیں گے جو دنیا والوں سے سرکاری یا نجی اداروں میں مقابلہ کر سکیں گے۔ یہ کوشش میرے خیال سے کامیاب نہیں ہو گی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ یہ مختلف مدارس جو پھیلے ہوئے ہیں ان کو چلنا چاہیئے یا نہیں؟ اور چلیں تو کیسے؟

آپ کو دینی تعلیم دینا ہے کہ تو کچھ مرکز ایسے ضرور قائم کرنے ہوں گے جن میں اعلیٰ دینی تعلیم دی جا سکے۔ باقی بہت سے مدارس پھیلے ہوئے ہیں ان میں کمی کرنا ضروری ہے۔ اور زمانہ خود ہی کم کر رہا ہے۔

لیکن یہ بھی ہے کہ آپ کے کہنے سے وہ بند تو نہیں ہو جائیں گے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ........ پھر ان مدارس میں ایسی اصلاح ہو کہ وہاں کے فارغ تعلیم کے موجودہ دھارے میں آجائیں، اسی لئے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مختلف سندوں (کے مستقل مرحلے قائم) ہو جائیں۔ کوئی ابتدائی کے بعد چھوڑنا چاہتا ہے چھوڑ دے۔ کوئی فارغ التحصیل ہونے کے بعد

چھوڑے گا۔

مثال کے طور پر یہ کہا گیا ہے کہ دیوبند یا ندوہ سے فارغ کے لئے یونیورسٹیوں میں کیا انتظام جائے۔ مولانا آزاد کمیٹی میں اس سے بھی بحث ہوئی تھی۔ آپ کو خیال ہو گا مصر میں ایک ادارہ کلیہ دارالعلوم قائم ہوا تھا' جس کا مقصد ازہر اور جامعہ فواد کے درمیان ایک پل کے طور پر کام دینا تھا۔ یہ اب بھی قائم ہے مگر اب اصلاح کے بعد ازہر میں کیا صورت ہے پتہ نہیں۔ تو ہمیں یہ بھی سوچنا ہے۔ ترجمے کر کے ضروریات کے تحت تعلیم یہ بھی ایک عملی مسئلہ ہے۔

اور اگر بہت اونچے مقاصد ہوں اور عمل کچھ نہ ہو تو بے فائدہ ہے۔ اپنی جگہ پر یہ بحث جاری رکھیئے کہ مسلمان کے فرائض کیا ہیں اور تعلیم کے مقاصد کیا ہیں۔ لیکن جو عملی بحث میرے خیال میں ہے وہ یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں جو ان مدارس کے طلبہ نکلتے ہیں انہیں آپ بنیادی کش مکش میں حصہ لینے کے قابل بنانا چاہتے ہیں یا نہیں؟

اس لحاظ سے یہ کوشش ٹھیک ہے کہ ان مدارس میں انگریزی' جدید علوم' جدید تاریخ' جغرافیہ اور سائنس وغیرہ کے مبادی داخل نصاب کے جائیں اور اس کی کوشش کی جائے کہ ان مدارس میں تعلیم کے سلسلہ میں یہ احساس پیدا ہو جائے۔ محض تبلیغ کے لئے بھی تو بہت ضروری ہی ہے۔

اگر آج ہم یہ کرتے کہ کسی ایک نصاب کو لے کر' یا مثلاً کتابچے کو جو وقف کونسل نے مرتب کیا ہے سامنے رکھ کر اس پر تفصیل سے بحث ہوتی تو شاید زیادہ فائدہ ہوتا' تو آج یا پھر کبھی اس پر تفصیل سے بحث ہونی چاہیئے کہ نصاب کیا ہونا چاہیئے۔ اور کیا نہیں' کتابیں تو خیر بحث میں آئیں گی ہی' مگر اس سے زیادہ ضروری یہ کہ علوم کون سے ہوں۔

میں سمجھتا ہوں یہ محدود مقصد سامنے رکھ کے' ایک اور سیمینار ہو' جس میں ہمارے جو مشہور مدارس ہیں' ان کے نمائندے ہوں۔ یہاں دیوبند کے پڑھے ہوئے لوگ تو ہیں۔ دیوبند کے نظام تعلیم کا نمائندہ کوئی نہیں۔ ندوہ کا کوئی نہیں' جامعہ عمر آباد کا کوئی نہیں۔ یہ سب نمائندے ہوں اور بیٹھ کر یہ غور کریں کہ کس حد تک ترمیم کے لئے تیار ہیں۔ ان کے خیالات بھی تو معلوم ہوں۔ ہم اپنی جگہ نصاب بنا کر یہ سمجھیں کہ فرض ادا ہو گیا۔ تو یہ ٹھیک

ہیں' وہ جو یہ نظام چلا رہے ہیں' ان سے تبادلہ خیال کی ضرورت ہے تاکہ کوئی ایسی راہ نکل سکے۔

پھر کوئی ضروری نہیں کہ ہر مدرسہ ایک چیز پڑھادے' نہ ضروری ہے کہ ٹیکسٹ بک یکساں ہوں۔

اپنے مقاصد اور خیالات کو پیشِ نظر رکھ کر ترمیم ہو تو یہ اچھا قدم ہوگا۔

مولانا آزاد کمیٹی میں دیوبند' ندوہ اور شیعہ حضرات بھی تھے' جو مدارس چلا رہے ہیں۔ وقف کونسل والی کمیٹی میں بھی ایک شیعہ عالم موجود تھے۔ اگر اس کوشش کو اور آگے بڑھایا جائے تو ضرور فائدہ ہوگا۔

اور یہ بات کہ ایک ایسا نمونہ کا ادارہ قائم ہو جس میں نیا نصاب چلا کے نمونہ کے لوگ پیدا کر کے دکھادیں' ان سے ایسے طلباء نکلیں' جو ہندوستان میں انقلاب پیدا کردیں۔ یہ محض وِش فُل تھنکنگ ہے۔ ضرورت تھی ایسے مدارس کی جہاں اُردو ذریعہ تعلیم ہوتی۔ ایسے ادارے تک بنانا مشکل رہا کہ لوگ تیار نہیں ہوتے۔ تو یہ نیک خواہش کہہ لیجئے۔ عملی بات نہیں ہے۔ عملی بات یہی ہے کہ اس وقت جو مدارس قائم ہیں' ان میں جس حد تک اصلاح ہوسکے (ہو جائے)۔

# قدیم نصاب اور اس کی اصلاح کے بارے میں چند خیالات

علامہ موسیٰ جار اللہ

ترتیب و ترجمہ: عبدالحمید برایشق

یہ علامہ موسیٰ جار اللہ (م ۱۹۴۹ء) کی ایک نادر تحریر ہے جو انہوں نے الموافقات کے مقدمے کے طور پر شائع کی تھی۔ یہ تحریر مدت سے نایاب تھی۔ اب ۱۹۹۰ء میں امام شاطبی کی الموافقات کے ترکی ترجمے کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی ہے۔ ہم جناب عبدالحمید برایشق کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کا ترکی سے اردو میں ترجمہ کر کے اردو قارئین کو الموافقات کی اہمیت اور علامہ موسیٰ جار اللہ کے افکار سے روشناس کرایا۔

علامہ موسیٰ جار اللہ بیسویں صدی کی ایک نہایت ہی دردمند اور فعال شخصیت تھے۔ بہت سی باتوں میں ان کی جمال الدین افغانی سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ عالم اسلام کی سیاحت نے ان کے زاویہ نظر کو مزید وسعت دی تھی۔ افغانی کی طرح اصلاح و تجدید اور علوم اسلامی کی عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کے لئے ساری عمر کوشاں رہے۔ اپنے زمانے کے فکری جمود کو توڑنے کے لئے انہوں نے تحریر اور استدلال میں ایک خاص اسلوب اختیار کیا جو قاری کو جھنجھوڑ کر اسے نئے مسائل پر غور کے لئے مجبور کرتا تھا۔ زیرِ نظر تحریر اسی اسلوب کا نمونہ ہے۔

روس کے مسلمانوں کی فکری اصلاح اور دورِ جدید میں ان کے نئے کردار سے آگاہی کے لئے انہوں نے تصانیف کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ترکی زبان میں لکھی گئیں اور عصری مسائل پر جدید نقطۂ نظر کے لئے دعوت فکر دیتی تھیں۔

آپ کی تصانیف کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نئے دور کے تقریباً تمام اہم سیاسی، معاشی، قانونی اور سماجی مسائل کا آپ نے اسلامی نقطۂ نظر سے حل پیش کیا۔ آج پاکستان میں تقریباً وہی مسائل زیرِ بحث ہیں۔ اگر علامہ کی تصانیف اردو میں ترجمہ ہو جائیں تو جدید مسائل پر تحقیق کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی۔

جو شخص بھی علوم اسلامیہ کی تاریخ کا بنظر عمیق غیر جانبدارانہ مطالعہ کرتا ہے تو وہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اہلِ اجتہاد کے اجتہادات کتنے ہی لائق تحسین ہوں لیکن شریعت کے بنیادی علوم پر اربابِ تالیف کی تصنیفات پوری طرح تسلی بخش نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں، میں یہاں عربی زبان کے ادبی و بلاغی پہلو کا جائزہ لوں گا نہ قرآن حکیم کی ادائیگی (تجوید و تلاوت) کے متعلق علوم کا، بلکہ میں تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ جیسے اسلامی شرعی علوم کے متعلق اپنے خیالات کا مختصراً اظہار کروں گا۔

عالم اسلام میں مفسرین نے بے شمار تفسیری سرمایہ چھوڑا ہے مگر ان کی کوششیں عربی زبان دانی یا تفسیری روایات کے "طرق" تک ہی محدود رہیں، جب کہ ایسی کوئی تفسیر موجود نہیں جو عالم بشریت کی تمدنی زندگی کا رہنما ہونے کی حیثیت سے منزل من اللہ قرآن کریم کے علمی اسلوب پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیمات کے معاشرتی پہلوؤں پر بھی زور دے۔ میرے اس دعویٰ کا ثبوت طبری 'کشاف' بیضاوی اور رازی جیسی تفاسیر کے مندرجات ہیں جو عالمِ اسلام کی سب سے معتبر تفاسیر ہیں۔

یہ باتیں میں ان مفسرین کی تنقیص کے لئے نہیں کہہ رہا، میں تو ہمیشہ **مافرطنا فی الکتاب من شیئی**۔ جیسی صفات سے متصف قرآن حکیم کی غیر محدود وسعتوں کا داعی رہا ہوں۔ عالم طبیعیات سے متعلق بہت سی آیات جن کا مفہوم ابھی تک حل نہیں ہوا، میرے اس دعویٰ کا ثبوت ہیں۔ ان آیات کے ذکر سے قطع نظر متعدد آیات اور بھی ہیں جن کے فقہی احکام کی تفسیر کماحقہ نہیں کی گئی۔

آیات کے واضح عربی زبان میں اور اس کے ساتھ ساتھ آسان ہونے کے باوجود، ان کی تفسیر میں جس قدر اختلاف موجود ہے کیا وہ میرے اس دعویٰ کو ثابت نہیں کرتا؟

سود جیسے اقتصادی مسائل، شوریٰ اور انتظام سلطنت جیسے سیاسی معاملات، تحریم خمر کی

طرح انسانی زندگی کے نفع و نقصان سے تعلق رکھنے والے مسائل اور نکاح و طلاق جیسے عائلی مسائل سے متعلق آیات کی تفسیر میں مفسرین کی کوتاہیوں کی بہتات کیا میرے دعویٰ کا قوی ثبوت اور دلیل نہیں ہے؟

عقائد سے متعلق قابل احتمال آیات پر متکلمین کی بے باکانہ طبع آزمائی، ایک آیت سے زیادہ تر دو متضاد دلائل لے کر آنا "کیا معدوم شئے کا وجود ہے؟" جیسے غیر اہم مسائل پر بے شمار دلائل دینا لیکن "غایت وجود" جیسے اہم مسائل سے تعلق رکھنے والی آیات پر باوقار سکوت، کیا میرے دعویٰ کی تائید نہیں کرتا؟

یہ سب باتیں کسی کی ملامت کے لئے نہیں بلکہ حقیقت کو آشکار کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ آخر ہماری تفاسیر اس طرح کیوں ہوتی ہیں؟

تفسیر کے بعد عالم اسلام میں سب سے اہم علم، علمِ حدیث ہے کیوں کہ حدیث ایک طرف تو ہمارے لئے قرآن حکیم کی تعلیمات کو واضح کرتی ہے اور دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان افعال، اقوال اور احکام کو ہم تک پہنچاتی ہے جو انسانی زندگی کی فلاح کے ضامن ہیں۔ علمائے اسلام نے اس اہم ترین علم کی جس طرح خدمت کی ہے، آیئے حقیقت کو آشکار کرنے کے لئے اس کا ایک غیر جانبدارانہ جائزہ لیتے ہیں۔

بے شک علمائے اسلام نے احادیث کی اسناد کے بارے میں گراں قدر اور اہم خدمات سرانجام دی ہیں یعنی انہوں نے روایات کی کیفیت، راویوں کے تقویٰ اور عدالت جیسی خصوصیات کو زیادہ اہمیت دی۔ ظاہر ہے کہ محدثین نے جمع احادیث میں کوتاہی نہیں کی۔ صحیح اور ضعیف یا موضوع حدیث کی تمیز میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس پہلو سے اگر کوئی شخص علمائے حدیث کی خدمات کا جائزہ لے تو وہ اسے تسلی بخش پائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص انسانی زندگی میں حدیث کی اہمیت اور عملی میدان میں اس کے اثرات پر نظر دوڑاتا ہے اور اسے اس میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو ہم اس کی تردید نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جو شخص کتب حدیث کا مکمل طور پر مطالعہ کرتا ہے اور ابواب اور احادیث سے مستنبط استدلال کا موازنہ کرتا ہے تو اسے بہت اہم معلومات کے ساتھ ساتھ جو تعداد میں بہت کم ہیں، بے شمار غیر اہم اور معمولی چیزیں نظر آتی ہیں۔ معاشرتی زندگی کے مسائل کے اصل الاصول یا علمی

سوچ بچار کے ارتقاء کے لئے رہنما حیثیت کے حامل اہم مسائل، کتب حدیث کے ابواب میں مفقود ہیں البتہ ان احادیث میں ''ابتداء وحی کی کیفیت'' جیسے مسائل اور اخلاقی فضائل سے متعلق مباحث اس مذکورہ بالا عموم سے مستثنٰی ہیں۔

مزید برآں کتب احادیث کے مولفین نے بہت مبالغہ سے بھی کام لیا ہے۔ ان لوگوں کے پیش نظر احادیث سے زیادہ سے زیادہ مسائل کے استنباط کا رجحان تھا چناں چہ اس غرض کے لئے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے فرمودات سے بہت سی غیر اہم اور معمولی چیزوں کا بھی استنباط کیا۔ احادیث سے اہم اور ضروری مسائل اخذ کرنے کے ساتھ اس کام کی ثانوی حیثیت ہوتی تو زیادہ سودمند ہوتا لیکن متاخرین نے احادیث کے اہم اور ضروری پہلوؤں پر تو سکوت کیا ہے لیکن غیر اہم مسائل پر بہت توجہ دی اور ان کے بارے میں بہت جدوجہد کی ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ کسی کی غلطی تلاش کرنے کی بجائے اس غلطی کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری ہے، لہذا غور طلب پہلو یہ ہے کہ ہماری کتب حدیث کیوں اس طرح ہیں ؟

تفسیر اور حدیث کے بعد تیسرا درجہ علم فقہ کا ہے۔ چوں کہ یہ علم، قرآنی آیات اور احادیث رسول سے استدلال کرتا ہے، اس لئے اس کا درجہ ان دونوں کے بعد ہے مگر انسانی زندگی میں اہمیت کے اعتبار سے متقدم ہے کیوں کہ تمام مسلمانوں کے دعویٰ اور ایمان کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن کریم قیامت تک تمام انسانیت کے لئے مقدس کتاب ہے۔ یہ دعویٰ بلاشک وشبہ صرف علم فقہ کی تکمیل اور اس کی انسانی زندگی سے مطابقت ثابت کرنے سے حاصل ہوگا۔

جب تک اسلام کے اصول دنیا کے تمام اصولوں سے اعلیٰ ثابت نہیں ہوتے اور فقہ اسلامی انسانی زندگی کے لئے عادل اور مکمل حقوق دینے والا نظام نہیں مہیا کرتی تو ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان بے بنیاد اور ہمارا دعویٰ زبانی، کلامی رہے گا۔

رسالت کا ثبوت معجزہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن یہ اعجاز صرف قرآن کے ربط و نظم سے ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ حقیقی اعجاز قرآن مجید کے مطالب میں ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم کے اعلیٰ ترین اصول اور شرعی فقہی علوم، انسانی زندگی کے لئے مناسب ترین اور مکمل ترین قانون ہونا چاہئیں ورنہ قرآن حکیم میں معنوی لحاظ سے بھی اعجاز ثابت نہیں ہو سکتا۔

کیا ہماری کتابوں میں مدون فقہی علوم، قرآن حکیم کی اس معجزانہ حیثیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں ؟ کیا ان میں پوری انسانیت کے لئے قیامت تک مناسب ترین اور منصفانہ قانون کی وسعت پذیری اور لچک موجود ہے ؟

کیا انسانی زندگی کے روزمرہ مسائل اور ہر صدی میں پیش آمدہ مسائل کا حل اور جواب ہماری مسلکی کتابوں میں موجود ہے ؟ اسلام سے بے حد محبت اور عقیدت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ ان سوالات کا جواب "نہیں قطعاً نہیں" کہہ کردوں۔ اس جواب کا محرک علوم فقہ پر تنقید اور اسے ہدف ملامت ٹھہرانا نہیں، بلکہ اسلام سے محبت ہے۔

علوم فقہ میں "عبادات" پر ایک حد تک مکمل اور مفصل کام کیا گیا، مگر معاملات میں معاشرتی و انفرادی حقوق اور اس کے ساتھ ساتھ انتظامی امور سے متعلق خصوصیات اور احکام پر مدون شدہ فقہی علوم میں ابھی اتنا کام نہیں ہوا ہے، یہی نہیں بلکہ کتب فقہ کے بعض ابواب میں جو کچھ ہے اسے عملی جامہ پہنانا بھی ناممکن ہے اور اسلام کے نظریہ عدل سے بھی متصادم ہے۔

میرا عقیدہ ہے......... اور یہی سارے مسلمانوں کا عقیدہ ہے...... کہ اسلامی فقہ انسانی زندگی کے لئے مناسب ترین قانون اور اس کے ساتھ ساتھ خالص عدل پر مبنی نظریہ پر تشکیل دیا گیا مکمل ترین نظام ہونا چاہیئے تھا۔

لیکن ہمارے علوم فقہ اس طرح کیوں ہیں ؟

تفسیر، حدیث اور فقہ جو کہ آپس میں اصل اور فرع کی حیثیت رکھتے ہیں، عملی طور پر ان کے غیر تسلی بخش ہونے کی کیا وجہ ہے ؟

اس میں شک نہیں کہ نعوذ باللہ یہ خامی قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ جیسے شرعی مصادر میں نہیں ہے بلکہ یہ ان سے بالکل الگ چیز میں ہے۔ حقیقت میں ہر مومن کا ایمان ہے کہ قرآن حکیم اور سنت نبوی ﷺ شریعت کی اساس ہیں۔

پھر آخر یہ خامی کہاں سے آئی ؟ میرے نزدیک یہ خامی قرآن حکیم اور سنت نبوی ﷺ سے اخذ کردہ شریعت کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس خرابی کی بنیاد "اصول فقہ" کے بارے میں ہمارا طریق فکر ہے۔

جب بنیادی فقہی اصولوں پر بحث کی جاتی ہے تو شرعی ادلہ کا دو پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ ایک حصے میں منزل من اللہ احکام اور دوسرے حصے میں لوگوں کا ان کو قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا دیکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصول فقہ دو قسموں یعنی قسم ادلہ اور قسم احکام پر مشتمل ہیں۔ پہلی قسم میں اکثر مولفین عموماً اربعہ، یعنی کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ، اجماع اور قیاس پر بحث کرتے ہیں۔ کتاب اللہ کی بحث میں بنیادی امور عربی لغت اور اس کے متعلقہ موضوعات یعنی کلمہ کی وضع، دلالت، استعمال اور فہم مد نظر ہوتے ہیں۔ اس بناء پر کتاب اللہ سے متعلق بحث میں موضوعات صرف ''دلالۃ الایہ'' اور فہم معانی ہوتے ہیں۔ جبکہ مولفین کتب حدیث کے نزدیک سنت کی بحث میں عموماً عربی عبارت اور الفاظ کو اتنی بھی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ کتاب اللہ میں اس پر کی گئی بحث کی وجہ سے یہاں اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ یہاں بنیادی بحث سنت اور روایت کی سند پر کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تعارض الحدیث پر بھی بحث ہو جاتی ہے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس سے سنت کی دلالت میں لچک اور وسعت نہیں آتی۔

اس کے بعد اجماع پر بحث ہوتی ہے۔ اس حصے میں اجماع کے معنی اور اس کی حجیت اور اس کے درجات پر بحث کی جاتی ہے۔ اجماع کسی مسئلہ کے حل اور ثبوت کے لئے خود حجت نہیں ہے بلکہ ایک حکم اور مسئلہ کے بارے میں اختلافات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اس کے باوجود علمائے اصول، اجماع کو ایک دلیل (ماخذ) بلکہ سب سے اہم دلیل کی حیثیت دیتے ہیں۔ قانون وضع کرنے میں اجماع ایک بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے مگر اہلِ اصول اسے چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ اہلِ اصول کی اس کوتاہی کے سبب انسانی زندگی کی ترقی سے مناسبت رکھنے والا اسلام لچک اور وسعت حاصل کرنے سے کوسوں دور رہتا ہے۔ چناں چہ ہمارے اصولِ فقہ جیسے ایک ہزار سال پہلے تھے اب بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں۔

کتب فقہ میں اجماع کے بعد قیاس کا درجہ ہے۔ قیاس کی بحث میں، کسی مسئلہ کو کتاب اللہ، سنت یا اجماع سے ثابت شدہ احکام اور دوسرے مسائل کے ساتھ پرکھنے کی شرائط کا ذکر کیا جاتا ہے، تاہم فقہی مسالک کے اختلافات اور قیاس کی شرائط و حجیت کے بارے میں مکمل اتفاق رائے موجود ہیں۔ اگر شارع نے کسی حکم کی علت بیان نہ کی ہو تو اس حکم سے

دوسرے مسئلہ کے لئے مشترکہ علت (العلة المتعدية) تلاش کرنا بے حد مشکل ہے۔ علاوہ ازیں علت پائے جانے کی شکل میں علیت وصف کی دلیل پیش کرنا بھی اسی طرح مشکل ہے اور اگر علت کے احتمال ایک سے زیادہ ہوں تو اس وقت قیاس سے ہمیں سوائے اختلاف کے کچھ نہیں ملتا۔ نتیجتاً قیاس کی حجیت سے بھی اسلام لچک اور وسعت حاصل نہیں کر سکا۔ بہر حال اصول فقہ کا موضوع ادلہ شرعیہ میں صرف عربی زبان کی خصوصیت اور روایات کی اہمیت اور فوقیت ہی ہے۔ میرا گمان ہے کہ اہلِ اجتہاد کے اجتہادات بھی اکثر ان دو پہلوؤں تک ہی محدود ہیں۔ ایسے اصولوں پر قائم کئے گئے تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے اہم شرعی علوم میں مذکورہ خامیوں اور کوتاہیوں کی بنیادی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ مفسرین، تفسیر قرآن میں اپنا اپنا اسلوب اپناتے ہیں اور تشریح واستدلال کتب اصول سے اخذ کرتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کے معانی کو عربی لغت اور روایت کے دوجہتی ڈھانچے تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اگرچہ فکر و عقل اور تدبر سے مزید معانی لئے جاسکتے ہیں لیکن وہ اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ چناں چہ کچھ آیات جو کہ شرعی احکام پر دلالت کرتی ہیں اور ان سے انسانی زندگی کے اصول و قواعد اخذ کئے جاسکتے ہیں، ان کی تشریح میں مفسرین صرف عموم، خصوص، عبارہ، اشارہ، محکم، مجمل جیسے عبارتی نظم کے طرق استدلال کو اہمیت دیتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ان احکام کی اہمیت اور اثرات کو مدنظر رکھا نہیں جاتا۔ شریعت اسلام کے جمود اور ترقی نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

مفسرین کی طرح محدثین نے بھی اپنے استدلال اور استنباط کی بنیاد کتب اصول میں مروی اصولوں پر ہی رکھی ہے۔ احادیث میں عربی لغت کی بجائے روایت کے پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور اہم ترین شرعی احکام کے لئے، جو کہ عبودیت بشری کا سب سے اہم مسئلہ بھی ہے، احادیث کی مختلف روایات سے دلیل لاتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو یہ غلطی کی جاتی ہے کہ جو دلیل نہیں ہے، اسے دلیل بناتے ہیں اور دوسری طرف اس کے ذریعے قانون جیسی چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ الفاظ کے اختلاف کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور چھوٹے مسائل میں سے ہر ایک مسئلہ کے لئے بہت سی احادیث اور روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ زیادہ اہم مسائل کے لئے حدیث موجود بھی ہو تو اس کا ذکر

نہیں کرتے۔ اس روش کی وجہ شرعی ادلہ کو پرکھنے کا طریق کار ہے۔ انسانی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

محدثین نے احادیث اور مفسرین نے آیات کی تشریح میں اپنے افکار کو ہمیشہ کتب اصول میں مذکور اصولوں کے مطابق رکھا ہے مگر قرآن نیز سنت کے اصل مقاصد اور انسانی زندگی کے لئے قانون کی حامل چیزوں کو اہمیت نہیں دیتے، کیوں کہ ان کے اخذ کردہ اصولوں کی حدود اتنی وسیع نہیں ہیں۔

نظم کی دلالت اور روایت کی موجودگی خواہ کیسی ہی ہو علوم فقہ میں فقہاء اسے ہی زیادہ سے زیادہ مد نظر رکھتے ہیں اور ان پر شرعی علوم کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اگر تلاش بسیار کے بعد روایت ملتی ہے یا کتب اصول میں بیان کئے گئے کسی اصول سے تاویل کرنا ممکن ہو تو گویا اس وقت نص کی دلالت مسئلہ کے اثبات پر ہوتی ہے مگر احکام کی دوسری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کے اکثر مسائل کے عملی پہلو کو بے حد اندھیرے میں رکھا جاتا ہے۔ ضروریات زندگی کے انتظامات اور تمدنی زندگی کی حاجات کو عموماً ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دی جاتی۔

ربا اور سود جیسے مسائل جو ابھی تک حل طلب ہیں، حلالہ اور متعہ جیسے مسائل جن کے رواجی پہلو اسلام کے چہرہ پر شرمناک دھبے ہیں اور شرعی حیلے جیسے مسائل جو اسلام اور اس کے ساتھ ساتھ قانون کا مذاق اڑانے والی چیزیں ہیں۔ کیا یہ میرے دعوے کی تائید نہیں کرتیں؟

کتب فقہ میں بڑی کاوش سے فرضی مسائل تشکیل دیئے جاتے ہیں لیکن معاشرتی نقطۂ نظر سے اہم ترین مسائل پر چپ سادھ لی جاتی ہے یا بیان کرتے وقت ان کا حل نہیں پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا یہ سب چیزیں میری باتوں کی شاہد نہیں ہیں؟

تہذیب و تمدن کے داعی اسلامی ممالک میں سے کسی میں بھی انتظامی امور کا شریعت اسلامیہ کے مطابق بندوبست کیوں نہیں ہو سکتا؟

پوری زندگی آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ کا مطالعہ کرنے والے، پانچ پانچ، دس دس جلدوں پر مشتمل کتب فتاوی کے حافظ فقہاء، ملک و ملت کے انتظام کے لئے ضروری

قوانین اور اصطلاحات تیار کرنے کی استطاعت سے کیوں محروم ہیں؟

اسلامی ممالک، شریعت اسلامیہ کو پس پشت ڈالنے اور یورپی قوانین کو گلے سے لگانے کی ذلت کیسے برداشت کر رہے ہیں؟

کیا یہ اپنی زبان حال سے پکار پکار کر نہیں کہہ رہے "ان (یورپی) جیسے مناسب قوانین شریعت اسلامیہ میں نہیں ملتے۔" اگر واقعی یہ حقیقت ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے علوم فقہ نے ہمیں ان جیسے قوانین تیار کر کے نہیں دیئے اور نہ ہی اب دے رہے ہیں؟

میرے خیال میں ایسے تمام سوالات میں سے ہر ایک میرے دعویٰ کا ثبوت ہے، میں نیک نیتی، خلوص قلب اور پورے یقین سے اپنے دعویٰ کا دفاع کرتا ہوں۔ لیکن........ اللہ جانتا ہے...... اسلامی علوم کی مذمت کے لئے نہیں بلکہ اس کے برعکس میں بے حد محبت اور پورے یقین سے اسلامی شریعت کی مدافعت کرتا ہوں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ ہمارا قرآن حکیم مقدس ہے اور ایک معجزہ ہے۔ یہ ایک آسمانی کتاب ہے۔ اس کا اعجاز صرف اس کے نظم میں ہی نہیں بلکہ یقینی طور پر اس کے معنی میں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر قرآنی اعجاز سے مطابقت رکھنے والی اعجازی شریعت اسلامیہ عالم تمدن میں ایک بے مثل اور مکمل قانون کی حیثیت کی حامل کیوں نہیں؟ علوم فقہ کو عالم اسلام میں کیوں قبول عام نہیں ملتا؟

میرے خیال میں علوم شرعیہ خصوصاً علوم فقہ کی خامیاں ادلہ شرعیہ اور احکام شرعیہ کو مخصوص نقطۂ نظر پر پرکھنے کی وجہ سے یعنی اصول فقہ کے ایک خاص انداز کی وجہ سے ہیں کیوں کہ عالم اسلام میں مروجہ اصول فقہ کی کتابوں کا اسلوب عموماً وہی ہوتا ہے جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی، کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے سب سے اہم شرعی مقاصد کا اجمالاً اور تفصیلاً تذکرہ نہیں کیا۔ اسلامی شریعت اور انسانی زندگی کے درمیان رابطہ اور تعلق کا ذکر مفقود ہے اور ضروریات زندگی کا مفصل اور عمیق تو کیا، اجمالی طور پر بھی بیان نہیں ہے۔ چناں چہ اصول فقہ کا دائرہ کار بے حد تنگ رہا ہے اور آج بھی فقہی علوم جوں کے توں ہیں جیسے ہزار سال پہلے تھے۔

اگر ہمارا ایمان ہے کہ علوم فقہ کی جامع اور وسیع ترین تدوین اسلام کی رفعت و عظمت کے مطابق ہونی چاہیئے تو ہمیں سب سے پہلے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

اولاً : مخلص اور آزاد فکر فقہاء جو کہ لازمی علوم اور معاصر فنی علوم سے بہرہ ور ہوں۔

ثانیاً : اصول فقہ جو کہ :

کتاب اللہ اور سنت کے تشریعی مقاصد

انسانی زندگی کی لازمی اور دوسرے درجہ کی ضروریات

حقوق اسلام کے مصادر اور نص کی دلالت

شریعت اسلامیہ اور انسانی زندگی کے بارے میں ائمہ اربعہ اور ان جیسے مجتہدین کے نقطۂ نظر کی کسی تفریق و تحدید کے بغیر مکمل طور پر تشریح اور تفصیل بیان کر سکے۔

اگر ہمیں یہ دو چیزیں یعنی مخلص اور آزاد فکر فقہاء اور مذکورہ بالا صفات کے حامل اصول فقہ مہیا ہو سکتے تو ہم اعجاز اسلام کے مطابق شریعت کے حامل ہوتے یعنی عالم تمدن میں ایک بے مثل مکمل ترین قانون کے مالک ہوتے اور اس وقت ہم اس عالم تمدن میں قرآن مجید کا اعجاز ثابت کر سکتے اور اسلام پر ہمارا خوف اور ڈر والا نہ ہوتا بلکہ بصیرت پر مبنی ہوتا۔

(قازان ۲۳ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ)

# دینی مدارس کا نصاب و نظامِ تعلیم
# اور
# عصری تقاضے

دینی مدارس کے نصاب و نظامِ تعلیم پر ۱۹۹۰ء کے
رانچی، دہلی سیمینار کی مکمل روداد، مقالات اور علمی بحث

# دینی مدارس اور افادیت عامہ

## بشمبھرناتھ پانڈے

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ہزاروں برس سے ساتھ ہی ساتھ رہتے ہیں۔ پڑوسی کی طرح رہ رہے ہیں۔ ایک ہی شہر میں ایک ہی محلے میں رہ رہے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے اتنے ناواقف ہیں یہ ناواقفیت کیسے دور ہو اور اگر دس کروڑ آدمی ایک جماعت کے جس ملک میں ہوں ان لوگوں کے متعلق' ان کے مذہب کے متعلق' ان کے رسول ﷺ کے متعلق' ان کے دین کے متعلق' قرآن مجید کے متعلق اگر غلط فہمیاں ہوں لوگوں میں یہ کوئی بہت خوبی کی بات تو نہیں ہے' اس پر کسی کو فخر تو نہیں ہو سکتا۔

تو اس خیال نے مجھ کو بہت پریشان کیا اور مجھے بے حد اطمینان ہوتا ہے کہ میں نے ہزاروں ہندوؤں کے دلوں سے اسلام کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو غلط فہمی تھی اس کو دور کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ مجھے خود تعجب ہوتا ہے کہ جب میں اپنے مسلمان بھائیوں سے بات کرتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھ کو قرآن مجید سے جو روشنی ملی وہ ان کو کیوں نہیں ملی؟ میں قرآن مجید کو ایک انسانیت کا مذہب سمجھتا ہوں۔

کن واقعات کو لے کر قرآن مجید کی کون سی آیت نازل ہوئی۔ اگر اس روشنی میں قرآن مجید کی ان آیتوں کو نہ پڑھا جائے اور نہ سمجھا جائے تو غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہندو صاحبان ذکر کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاد کی بات آتی ہے' کہتے ہیں کہ قرآن اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ کافروں کو قتل کرو' جہاد کرو ان کے خلاف۔ میں ان کو سمجھاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جہاد دو طرح کا ہوتا ہے ایک جہاد اصغر اور دوسرا جہاد اکبر۔ جہاد اصغر کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بے شک اجازت دی گئی ہے کہ اگر کوئی تم پر حملہ کرے' اگر کوئی تمہاری جائیداد سے تم کو محروم کر دے' اگر کوئی تمہارے بال بچوں کو ایذا پہنچائے' اگر کوئی تمہاری زندگی پر

زوالات لانے کی کوشش کرے تو بے شک اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے کہ جہاد اصغر سے جہاد اکبر زیادہ سخت ہے۔ اپنے دلوں کو قابو میں رکھو' اپنے نفس کو قابو میں رکھو۔ یہی جہاد اکبر ہے۔

میں ان کو جزیہ کی بات سمجھاتا ہوں۔ میں ان کو اور چیزیں بتاتا ہوں۔ ان سے نئی روشنی ہمارے ہندو بھائیوں کو ملتی ہے۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ اگر آپ نے وقت لگایا دینی تعلیمات حاصل کرنے کے لئے اور ان کا فائدہ آپ کو تو ہوا لیکن آپ کے پڑوسی کو نہیں ہوا۔ آدمی جو چیز حاصل کرتا ہے اسے اخلاقی طریقے سے اور Spritual طریقے سے اگر دوسروں کو بھی بانٹے تو اس سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ تعلیم میں بھی بڑی بات یہ ہے کہ جیسا کہ امام غزالی نے ایک مثال دے کر سمجھایا ہے کہ دینی تعلیم کے لئے کیا چیز ضروری ہے۔ انہوں نے ایک مثال دی ہے کہ کسی بادشاہ نے چینی پینٹروں کو اور اٹالین پینٹروں کو بلایا کہ آپ آکر ایک تصویر بنایئے' جن کی تصویر اچھی ہو گی ان کو انعام ملے گا۔ بیچ میں انہوں نے ایک پردہ لگا دیا۔ ایک طرف چینی تصویر کھینچنے والے' ایک طرف اٹالین تصویر کھینچنے والے' بیچ میں پردہ' ان کو ایک وقت دیا گیا کہ مہینے بھر کے اندر تم اپنی تصویر تیار کر لو۔ مہینہ بیتا (گزرا) بادشاہ پہلے اٹالین مصور کے یہاں گئے اور پوچھا کہ آپ نے کیا کیا تو انہوں نے بے حد خوب صورت رنگ برنگ کی تصویریں دیوار پر بنائی تھیں۔ بادشاہ اسے دیکھ کر خوش ہوئے پھر چینیوں کی طرف گئے وہاں دیکھا کہ بھلی دیوار اور دیوار میں بے حد خوب صورت پالش کیا ہے۔ تصویر کہاں ہے تمہاری تو انہوں نے بیچ میں جو پردہ پڑا ہوا تھا اس پردہ کو ہٹایا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اٹالین مصور نے جو تصویریں بنائی تھی تو اس کا عکس اس پالش کی ہوئی دیوار پر جو پڑا تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورتی اس میں آگئی۔ تو امام غزالی نے سمجھایا کہ پہلے اپنے دلوں کو اپنے نفس کو مانجھ گھس کے ایسا پالش کر لو کہ جو بھی تعلیم تم کو ملتی ہے وہ اور زیادہ اجاگر ہو کر کے تمہارے قلب میں داخل ہو۔ اگر وہ نہیں ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ سادھنا نہیں ہے تو پھر کتنی ہی دینی تعلیمات آپ حاصل کیجئے لیکن اس سے جو روح کو سکون ہوتا ہے وہ سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو گا۔ زندگی بھری ہوئی ہے ہزاروں صوفیوں کی فقیروں کی سنتوں کی کہ جنہوں نے بے حد تکلیفیں اٹھا کر اور بڑی تپسیا کر کے وہ خوبیاں حاصل کیں۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ قلوب میں جو روحانیت نہ پیدا کرے تو پھر وہ دینی تعلیم ہی کیا ہے۔

دوسری بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں جیسا اور بہت سے صاحبان نے فرمایا کہ دنیا بدل رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی لازم ہو جاتا ہے کہ ہم بھی بدلیں۔ آپ آج اگر بیل گاڑی لیں گے' اگر ریل سے سفر نہیں کریں گے' آپ حج کو جانے کے لئے ہوائی جہاز سے سفر نہیں کریں گے' تو آپ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ کرنا پڑتا ہے' مجبور ہیں۔ تو اس دور میں جب کہ بہت سی چیزیں ہماری زندگی میں داخل ہو گئی ہیں۔ تو ہم اس سے شرکت نہ کریں اور اس سے ہم اپنے بچوں کو دور رکھیں تو کیسے کام چلے گا۔ میری طبیعت کو بہت تکلیف پہنچتی ہے جب میں فہرست دیکھتا ہوں آئی اے ایس کی' آئی پی ایس کی' تو اس فہرست میں سب سے پہلے نام ڈھونڈتا ہوں کہ ان میں مسلمان نام کتنے ہیں اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اس میں مسلمانوں کے ایک یا دو نام ہیں تو مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ ایسا کیوں؟ ایک ایسی بڑی قوم' ایک اتنی بڑی تہذیب اور تمدن کے جو علمبردار تھے' اس ہندوستان میں آ کے ان کو کیا ہو گیا۔ ہندوستان میں ایسے ادارے تھے کہ جہاں باہر سے چل کے لوگ آتے تھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایسے لوگ تھے کہ جن کو عباسی خلفاء کے دربار میں باعزت بلایا جاتا تھا اور ان کی چیزوں کے ترجمے ہوتے تھے۔ عربی زبان میں' تو کہاں چلے گئے وہ لوگ؟ تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے تکلیف ہوتی ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کا حال اور مستقبل دونوں اسی طرح سے چمکے جس طرح سے ان کا ماضی۔ اسی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ جو ڈاکٹر ہیں ان میں آپ کا بھی شمار ہو جو انجینئر ہیں ان میں آپ کا بھی شمار ہو' جو ٹیکنیشن ہیں ان میں آپ کا بھی شمار ہو' جو سائنس والے ہیں ان میں آپ کا بھی شمار ہو۔ آخر دینی تعلیم تو اس وقت بھی ملتی تھی جب خلافت تھی۔ جب عباسی تھے' جب حضرت امیر معاویہ کے خاندان کے لوگ تھے۔ اس وقت بھی دینی تعلیم ہوتی تھی۔ لیکن انہوں نے تو سمندر کو ناپا' دنیا کو ناپنے کی کوشش کی۔ انہوں نے طرح طرح کی ایجادیں کیں۔ الجبرا کی بات آپ کرتے ہیں۔ الکحل نے تو آج کل کی جو ماڈرن میڈیکل سائنس ہے اس کی بنیاد انہوں نے ہی رکھی۔ طرح طرح کی انہوں نے ایجادیں کیں۔ میتھمیٹکس کی' دوسری چیزوں کی' ان سائنسز سے انہوں نے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھا۔ جتنی ترقی اس وقت دنیا حاصل کر سکتی تھی اتنی ترقی انہوں نے حاصل کی۔ تو آج ہم دینی لحاظ سے اگر آج کل کی سائنس اور تیکنیک سے اپنے کو بالکل علیحدہ کر لیں تو کیسے کام چلے گا۔ قوم پچھڑی رہ جائے گی' بہت پیچھے رہ جائے گی اور پھر آگے آنے والی جو نسلیں

ہیں وہ آپ کو معاف نہیں کریں گی۔ وہ آپ سے جواب طلب کریں گے کہ کیوں ہمیں اس دوڑ میں پیچھے رکھا گیا' کیوں ہم کو شامل نہیں کیا گیا۔ وہ یہ سوال آپ سے کریں گے۔ تو ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں کا ایک تال میل بٹھایا جائے دونوں کا تال میل بٹھا کر کے ایک ایسی شکل نکالی جائے کہ جس سے دین اور دنیا دونوں ہی حاصل ہو سکے۔ میں آپ سے زیادہ لمبی بات نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ آپ بھی سویرے سے بیٹھے ہوئے ہیں تھک گئے ہیں۔ آگے کبھی موقع ملا تو' اس سلسلے میں' میں نے کیا کیا کیا اور کیا نہیں کیا' بتاؤں گا۔ اس وقت مجھے آپ کو صرف اتنا ہی کہنا تھا' شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔

## یونس سلیم

میرے عزیز محترم بھائی بشمبھر ناتھ پانڈے کے ارشادات سننے کا مجھے موقع ملا۔ یوں برسوں سے مجھے ان کی خدمت میں نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔ اور بہت سے امور پر ان سے وقتاً فوقتاً تبادلہ خیالات ہوتا رہا ہے۔ اس لئے ان کے جو عالمانہ خیالات ہیں میرے لئے کوئی زیادہ نئے نہیں ہیں۔ انہوں نے اس ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے احیاء کے لئے جتنی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ اس دور میں عنقا ہیں۔

صبح سے یہاں جو مذاکرات ہو رہے ہیں۔ ان کو میں نے غور سے سنا اور سمجھا۔ شاید میں غلطی نہ کروں تو میں یہ عرض کروں کہ بعض اہم امور جن کی طرف توجہ ہونا چاہیے' کماحقہ نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مونس رضا صاحب نے جو سوالات اٹھائے ہیں' ان حضرات سے ان علمائے کرام سے جو مدرسے کے اساتذہ ہیں علماء ہیں اور مدرسہ کے طرزِ تعلیم کے علم بردار ہیں' ان سے مجھے یہ توقع تھی کہ وہ ذرا وضاحت سے اس پر روشنی ڈالیں گے۔ ڈاکٹر مونس رضا صاحب نے سب سے بڑا سوال آپ کے سامنے رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ قدیم طرزِ تعلیم کے جو تعلیم یافتہ حضرات تھے' چاہے وہ پاٹھ شالہ کے ہوں چاہے وہ مدارس کے 'دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء ہوں' انہوں نے دنیائے علم کو اتنا بڑا سرمایہ دیا ہے اور مثالی علوم و فنون میں ہندوستان کو اتنی بیش بہا ترقیاں دی ہیں کہ دوسرے ممالک میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ لیکن آج یہ ترقی رک گئی ہے۔ ایک قسم کا رکاؤ' جماؤ' ٹھہراؤ آگیا ہے۔ علم کے دریا میں۔ اس کا کیا سبب ہے ؟ اور صاحبانِ درس و تدریس اس انجماد اور

ٹھہراؤ کو رفع کرنے کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا تشفی بخش جواب کم سے کم میری سماعت میں نہیں آیا' یا میری سمجھ میں نہیں آیا۔

رانچی میں جو گفتگوئیں ہوئی تھیں' جو تقریریں ہوئی تھیں' جو مقالے پڑھے گئے تھے' عام طور پر سب کا رجحان یہ تھا کہ موجودہ مدارس میں جو درس' درسی کتابیں ہیں اور جو طریقہ تعلیم ہے اس میں یقیناً اضافے کی اور تبدیلی کی ضرورت ہے اور گنجائش ہے۔ آج بھی بہت سے حضرات نے اسی بات کو دہرایا۔ اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ یہ تحریک اور یہ داعیہ اور یہ تقاضا خود اہلِ مدرسہ کے ذہنوں میں پیدا ہونا چاہیئے کہ وہ آج کل کے تقاضوں کو سامنے رکھیں اور خاص کر کے درس میں ایسے مضامین اور ایسی کتابیں بھی شامل کریں جن سے وقت کے تقاضے پورے ہوں۔

میں نے رانچی میں یہ بات کہی تھی ایک صاحب نے آج یہاں بھی اشارتاً وہ بات دہرائی۔ اس وقت جیسا کہ مولانا پالن پوری صاحب نے اشارتاً فرمایا کہ دینی تعلیم کا مقصد اور نصب العین دینی تعلیم ہے۔ دینی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے جو دین ہم کو پہنچا ہے اس کا تحفظ کیا جائے اور آئندہ نسلوں تک وہ امانت منتقل ہوتی رہے۔ سینہ بہ سینہ اس جدوجہد میں چودہ سو برس سے ہم لوگ لگے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی پیمانے پر ہر جگہ یہ فرض انجام دیا جا رہا ہے۔ فرض کفایہ کے طور پر لیکن کیا ہمارا نفس' ہمارا ضمیر مطمئن ہے کہ جس طرح کے فلاسفہ' علماء' ادباء' فقہاء' مفسرین ہم پہلے مدرسوں سے پیدا کرتے تھے آج بھی ویسے ہی پیدا ہو رہے ہیں اور اگر نہیں پیدا ہو رہے ہیں تو کہاں پہ جھول ہے کہاں پہ نقص ہے؟ کہاں پہ کمی اور کجی ہے؟

آج دنیا میں علوم و فنون کی جو کثرت ہے رسل و رسائل کے آسان ذرائع فراہم ہو جانے کی وجہ سے آج جو اختراع یا جو ایجاد دنیا کے کسی ایک گوشے میں ہوتی ہے تو دوسرے دن اس کی گونج ہندوستان میں اور ہر ملک میں سنائی دیتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شخص نے کوئی نیا کام کیا تو ہندوستان میں پہنچتے پہنچتے اس کو نصف صدی یا پون صدی لگ جائے۔ کل اگر کوئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو آج ریڈیو' ٹیلی وژن کے ذریعہ ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ آپ اس کا ساتھ کہاں تک دے رہے ہیں؟ ہم نے جو مطمحِ نظر اپنایا تھا دینی تعلیم کا' ہم کہاں تک اس مطمحِ نظر پر قائم رہے؟ کہاں تک ہم دین کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں؟ اور کہاں تک

ہمارے ساتھ دنیا شامل ہو گئی ہے اور ہم نے ترجیح دنیاوی مفاد کو دینی امور پر دینا شروع کر دی ہے؟ ہمیں اس کا جائزہ لینا چاہیئے۔

آج جو مدرسے کے طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں' ان میں یہ جذبہ نہیں ہوتا ہے کہ ہم فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں تو ہمارا کام یہ ہے کہ ہم دین کی خدمت کریں اور دینی دعوت کو ہم ان لوگوں تک پہنچائیں جو علم سے محروم ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہوتا ہے کہ ہم کہاں سے ملازمت حاصل کریں۔ کہاں سے معاش حاصل کریں۔ ہم دنیا کے پیچھے مبتلا ہو گئے ہیں' دین کے راستے سے' دین کے ذریعہ سے یہ نصب العین ان مراحل پر نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جیسا کہ ایک صاحب نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اصحاب صفہ اور دوسرے صحابہ کرام علم دین حاصل کرنے کے ساتھ پیٹ اور بھوک اور تنگ دستی کے ضروریات سے بھی فارغ نہیں تھے اور رسول اکرم ﷺ کو صحابہ کرامؓ کو' اس کی طرف سے کبھی تغافل برتتے ہوئے نہیں پایا گیا۔ لیکن اس کے باوجود ہم جو اس وقت مدرسہ سے لوگ پیدا کر رہے ہیں' وہ کیسے ہوتے چلے جاتے ہیں میں ایسے فارغ التحصیل طلباء سے واقف ہوں جو ہماری ان درس گاہوں سے فارغ ہو کر نکلے ہیں' جو ہمارے لئے باعث فخر رہی ہیں۔ نام نہیں لوں گا' لیکن آج اگر ان کے سامنے عربی کی کتاب رکھ دی جائے تو صحیح پڑھ نہیں سکتے' صحیح عبارت اعراب کے ساتھ وہ پڑھ نہیں سکتے ہیں۔ اور فارغ التحصیل ہیں اور عالم و فاضل کی سندیں ان کے پاس موجود ہیں۔

تو یہ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا تعلیمی نقطۂ نظر میں فرق آیا ہے یا ہمارے دینی فیض میں فرق آیا ہے یا ہماری دانش مندی میں کچھ فرق آیا ہے۔ ہم نے جو بھی اپنے اکابر سے سیکھا تھا وہ سب ہم نے دنیاداری' دنیا پرستی اور دنیا کی نام و نمود اور شہرت کے لئے قربان کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کو ہم نے اپنا محبوب بنالیا ہے۔ دین کو اپنا مخالف اور دین سے ہم نے مخالفت کر لی ہے۔ ایک عالم شاعر کا شعر مجھے یاد آیا اگرچہ وہ شاید پوری طرح سے منطبق نہ ہو فرماتے ہیں کہ

حاصل مدرسہ برپائے تو قرباں کردم
آنچہ تعلیم خرد بود' مکن آں کردم

جو تقاضے دانش مندی اور دور اندیشی کے تھے' جو اس امت کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس سے ہم خارج ہو گئے۔ ہم آج دور اندیشی اور حکمت سے بالکل دور پڑ گئے جو ہمیں ان ہی مدرسوں سے ملتی تھی۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے نہیں ملتی تھی۔ حکمت اور دانش مندی ہم کو کبھی یونیورسٹی کے اساتذہ سے نہیں ملتی تھی' ان مدارس سے ملتی تھی آج ہم کہاں تک ان تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں' اور کہاں تک ہم مطمئن ہیں کہ ہم اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

خدا بخش لائبریری نے ایک کوشش اس سمت میں شروع کی ہے کہ کیا یہ نقص یا یہ کمی پیدا کرنے کے لئے نصاب میں کچھ تھوڑا بہت' اس کو ردوبدل کا لفظ استعمال کیجئے یا ترقی کا لفظ استعمال کیجئے یا اضافے کا لفظ استعمال کیجئے' ایسا کرنے سے' کچھ جو فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں' ان کی اس میں تلافی ہو سکتی ہے اور آج سائنس و ٹیکنالوجی کے دور میں ہمارے علماء بالکل جاہل تو نظر نہیں آتے ہیں؟ ان کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ پوچھا جائے کہ تنزانیہ کہاں ہے تو وہ یہ بتادیں کہ آسٹریلیا میں ہے۔ اگر آپ کسی فارغ التحصیل لڑکے سے پوچھئے جغرافیہ تو اس کو صحیح معلوم نہیں کہ کون سا شہر کہاں پہ ہے۔ صحیح نہیں معلوم۔ اس کو صحیح تاریخ' صحیح تاریخ اسلام تک نہیں معلوم۔ یورپ کی تاریخ اور ہندوستان کی قدیم تاریخ تو بہت دور کی چیز ہے۔ ناواقف ہیں ہمارے لڑکے۔ کسی سے بات کیجئے وہ واقف نہیں ہیں۔ یہ جہل مرکب جو ہم پیدا کر رہے ہیں کیا اس پر ہم فخر کر سکتے ہیں اور اگر نہیں کر سکتے ہیں تو اس میں ہمیں غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں کہاں کہاں پر اصلاح کر سکتے ہیں اور یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ داعیہ' یہ تحریک' یہ اشاعت خود اکابر مدرسہ کے مرکز سے پیدا ہونا چاہیئے۔ ہم نے صرف ان کی خدمت کرنے کے لئے ان کا تعاون کرنے کے لئے اور ان کو اس راستے پر اکھٹا کرنے کے لئے یہ کوشش شروع کی ہے۔ جیسا کہ بیدار صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگوں کو زحمت دینے کا مقصد یہی ہے کہ کم سے کم بیٹھ کے ایک دوسرے کے خیالات تو سمجھنے کا موقع ملا۔ یونیورسٹی کے لوگ' نئے فارغ التحصیل' ذہن رکھنے والے لوگ علمائے کرام اور مدرسوں کے چلانے والے اور جو مدرسوں کی عزت و آبرو بنے ہوئے ہیں وہ لوگ اور ہم سب مل کر بیٹھیں اور جیسا کہ آپ کے سامنے عرض کیا گیا ہم اس کوشش کو جاری رکھیں گے اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں جاکر اس طرح کا اجتماع کریں گے کہ جو ہم تک نہیں پہنچ سکیں ہم ان تک

پہنچیں اور ان سے تبادلہ خیال کریں اور ان کو متحرک کریں۔ انگریزی میں ایک مثل کہی جاتی ہے۔

ہم اپنی تمنا اپنے دل کی تڑپ' اپنی پیاس اور اپنی بے چینی آپ تک پہنچا سکتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ شاید ہم اپنا کچھ جذبہ آپ کے دلوں میں منتقل کریں اور اس کے بعد اگر کوئی راستہ نکلے تو اس پر ہم اجتماعی طور پر غور کریں۔

ہمارے سامنے ایک منصوبہ ہے۔ اور میں آپ لوگوں سے یہ عرض کر دوں کہ رانچی کے اجلاس کے بعد اس منصوبے کا تذکرہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ سے ہوا تھا اور انہوں نے اپنی نوازش سے اور اپنی کرم فرمائی سے اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے کہ وہ ندوے میں ایک اجتماع ایسے لوگوں کا بلائیں گے جو صاحبان مدرسہ ہوں' مدرسے کے علماء فضلا ہوں اور یونیورسٹی کے لوگ ہوں اور وہاں پر بیٹھ کر تفصیل سے گفتگو ہو' ایک کنونشن کے طور پر کہ اس سے پہلے جو ہمارے اکابرین نے تحریکیں چلائی تھیں' چاہے مولانا شبلی نعمانی ہوں' چاہے مولانا نانوتوی ہوں یا مولانا ابو الکلام آزاد کی فکر ہو' جو کچھ بھی ہو بہر حال اس طرح وقتاً فوقتاً اس پر غور کیا جاتا رہا ہے' اس پر بھی بحث کی جائے' اور کیا ایسا کوئی لائحہ عمل جو متفق علیہ ہو ہر مکتبہ خیال ہر مذہب فکر کے لئے قابل قبول ہو' فراہم ہو سکتا ہے کہ نہیں اور اس پر فکر کر کے پھر عملی اقدام شروع کیا جائے۔ یہ منصوبہ ہے اور انہوں نے الحمد للہ ہم سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انشاء اللہ پورا ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔ میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا میں شکر گزار ہوں کہ آپ ہم لوگوں کی گزارش پر اتنی دور تشریف لائے۔ گرمی کے موسم میں۔ اور ہم لوگ آپ کی راحت کا' آپ کی آسائش کا خاطر خواہ انتظام نہیں کر سکے۔ لیکن بہر حال جو کچھ بھی ہو سکا ہم نے کوشش کی کہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھ کر آپ کے افکار سے فائدہ اٹھائیں اور آپ سب لوگ اس بات کے لئے ہمارے ساتھ تعاون کا وعدہ کریں کہ ہم جب کبھی کہیں دوسری جگہ اجتماع کریں گے تو آپ میں سے اکثر حضرات جن کے پاس وقت ہوگا' فرصت ہوگی ہمارے پاس تعاون کرنے کے لئے وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین۔

# مدرسہ سسٹم' چند مشورے

## سید شہاب الدین دسنوی' پٹنہ

اس میں صاف طور پر دو قسم کے مدرسوں سے ہم ذکر شروع کر رہے ہیں' ایک تو وہ مکاتب یا مدرسے ہیں جن کا جال سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے اور جس میں اچھے بھی ہیں اور معمولی بھی ہیں' وہ دینی تعلیم بھی اپنے طور پر دے رہے ہیں۔ حکومت سے Recognised بھی ہیں اور بغیر ریکاگنیشن کے بھی ہیں اور دوسری حیثیت ان مدرسوں یا دار العلوم کی ہے' جیسے دار العلوم دیوبند ہے' مظاہر علوم سہارن پور ہے یا ندوۃ العلماء لکھنو ہے اور بھی اس قسم کے بہت سارے ایسے دار العلوم ہیں جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں اعلیٰ پیمانے پر اور اعلیٰ معیار کی دینی تعلیم دی جا رہی ہے۔ تو ہمیں ان دونوں میں فرق کرنا چاہیئے اور ہماری تجویزیں ایسی ہوں جو الگ الگ ان دونوں مدرسوں سے متعلق بھی ہوں' جن کا غذات کا میں نے مطالعہ کیا ان میں سے جو باتیں میرے سامنے آئی ہیں' ان میں' میں اس تجویز سے ابتداء کرتا ہوں جو اس سے پہلے جناب قاضی سجاد صاحب نے فرمائی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ ان تمام مدرسوں کو ایک تنظیم میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں کیوں کہ آپ ان مدرسوں کو کوئی چیز دے نہیں رہے ہیں' اور جب تک آپ کوئی چیز دے نہ پائیں' اس وقت تک آپ کا کوئی اثر ان پر ہوگا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک ایسی تنظیم قائم کرنا جو ہندوستان کے سارے مدارس کو اپنے ساتھ شریک کرے اور ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ان طلباء کا امتحان بھی لے' یہ ناقابل عمل بات ہے۔ اس کے اخراجات اتنے وسیع پیانے پر ہوں گے کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے اور دوسری بات جو بہت ہی اہم ہے' وہ یہ ہے کہ جیسا کہ مولانا سالم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ مدرسے اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک دار العلوم کا تعلق ہے وہ انفرادیت اور وہ مقاصد جن کی خاطر

وہ قائم کئے گئے ہیں ' ان کا ہمیں احترام کرنا چاہیے اور ان کو اپنی جگہ پر قائم رکھنا چاہیئے اگر پورا نظام تعلیم ایسا ہوتا جو تمام مدارس' تمام کالجز' تمام یونیورسٹیز کے لئے یکساں ہوتا تو اتنی یونیورسٹیز کا وجود عمل میں نہیں آتا۔ نہ اتنے مدرسے ہوتے' نہ اتنے کالج ہوتے' نہ اتنے اسکول' کیوں کہ ساری دنیا کا نظام ایک ہی جیسا ہے' لیکن جب کوئی ادارہ قائم کیا جاتا ہے تو کچھ بنیادی مقاصد لے کر قائم کیا جاتا ہے اور ان مقاصد کو بڑھایا جاسکتا ہے' ان کو رد نہیں کیا جاسکتا' ایک بات اس سلسلے میں یہ تجویز البتہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ہماری یہ آواز' یہ تجویزیں جن پر آج ہم گفتگو کر رہے ہیں' غور کر رہے ہیں' ان کو مدرسوں تک پہنچانے کا ذریعہ کیا ہونا چاہیئے؟ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے۔ بجائے کوئی تنظیم قائم کرنے کے اگر ہم ایک ایسا بورڈ قائم کر سکیں' ایک ایسا ادارہ قائم کر سکیں' جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ ان تجاویز کے متعلق جو ہمارے سامنے آئے ہیں یا آئیں گے ان کے متعلق اگر ہم کچھ ان مدرسوں کو مشورے دے سکتے ہوں' تو وہ البتہ ممکن ہے اور بلا اس کے متعلق یقین کئے ہوئے کہ ہمارا ہر مشورہ قابل عمل ہوگا' یہ ضروری نہیں' میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس قسم کی تحریک شروع ہوگئی جس سے ہم تمام مدرسوں تک پہنچ سکیں اور ہم یہ انہیں بتا سکیں کہ اس وقت تقاضے یہ ہیں' دینی علوم کو کس طرح پڑھایا جائے' دنیاوی عصری علوم کس طرح جاری کئے جائیں' طریقہ تعلیم کیا ہو وغیرہ جیسا کہ ہمارے فاروقی صاحب نے فرمایا" ان تمام چیزوں کو مدرسوں تک پہنچانے کے لئے کوئی ایک مرکزی ادارہ تو ممکن ہے آپ قائم کر سکیں اس ملک میں جس سے اس قسم کا لٹریچر تیار ہو اور کوئی مقصد نہیں' نہ ہم ان پر کوئی حکم جاری کرنا چاہتے ہیں نہ ان پر کسی قسم کا کوئی تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً امریکا میں ایجوکیشن ایسوسی ایشن ہے جو صرف اپنا لٹریچر تیار کرتا ہے طرح طرح کی باتوں پر' طریقہ تعلیم پر' اس کا ایک رسالہ بھی نکلتا ہے اور اس رسالے اور لٹریچر کے ذریعہ تمام امریکن اسکول اور کالجز مستفید ہوتے ہیں۔ ہم بھی یہ کر سکتے ہیں اور یہ کرنا چاہیئے بھی۔ ایک بات جو ابھر کر سامنے آئی ہے' مختلف مقرروں کی تقاریر سے اور ان کا غذات سے بھی جو مجھے کل دیئے گئے تھے کہ مدرسوں کی تعلیم میں عصری علوم کو شامل کیا جائے اس سلسلے میں تو اتفاق ہے کوئی اختلاف نہیں ہے' البتہ ایک بات ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنے مدرسوں میں بعینہ وہی کورس تاریخ' جغرافیہ' سائنس' ریاضی اور سماجیات کا وہی معیار قائم

رکھیں۔ جو دوسرے ہائی اسکول اور کالجز میں ہیں۔ تعلیم میں ہر موضوع اور مضمون کے پڑھانے کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ ہم حساب پڑھاتے ہیں' ظاہر ہے پرائمری اسٹیج میں ہماری جو آرتھمٹک ہوگی۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ روزمرہ کے کام کاج میں وہ حساب کام آسکے کوئی ضروری نہیں کہ وہ تمام چیزیں جو ارتھمٹک اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں وہ ہم بھی پڑھائیں' اسی طریقے سے دوسرے مضامین' چاہے سائنس کے بھی ہوں تو کوئی ضروری نہیں کہ ہماری ٹیکسٹ بک وہی ہو جو سائنس کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے' ہم اپنی ٹیکسٹ بک اپنی کتابیں خود شائع کر سکتے ہیں یا کم از کم اس کا نصاب ہم مرتب کر سکتے ہیں' پھر چاہے مدرسے خود اپنے طور پر شائع کریں یا لکھوائیں۔ ایک کتاب تھی کسی زمانے میں مدرسہ شمس الہدیٰ میں ''عصری تقاضے'' یا کچھ اور لکھی گئی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ سائنس کی جو موجودہ تحقیقات ہیں اور علوم کی جو موجودہ ترویج و اشاعت ہو رہی ہے' اس کو بالکل پاپولر انداز میں سہل زبان میں ان مدرسوں میں رائج کیا جا سکے۔ تو جب مقاصد ہم متعین کر لیں گے تو دوسرا سوال ہمارے سامنے یہ آئے گا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ تاریخ جو ہم نے اپنے نصاب میں داخل کیا ہے۔ تیسری جماعت سے لے کر آخر تک اس کا سلسلہ جاری رہے۔ انگریزی اگر ہم نے اپنے نصاب میں داخل کیا تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا سلسلہ دس سال تک جاری رہے۔ ہم نے غالباً اپنے اسکولوں میں بھی ایک عجیب شکل دے دی ہے کہ جو چیز پہلی جماعت میں پڑھائی جا رہی ہے وہ اخیر جماعت تک پڑھائی جائے' یہ دنیا میں کہیں نہیں ہوتا ہے۔ آپ اگر اس کا اچھا نصاب مرتب کر لیں' پڑھانے کے طریقے پر غور کر لیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ سال دو سال کے اندر اس کا ایک اچھا خاص علم طلباء تک نہ پہنچا سکیں۔ اس کے بعد اگر آگے ضرورت ہوئی تو وہ آگے پڑھے گا۔ لیکن اس کو کہتے ہیں Symple Moditum of knowledge ایک مقدار آپ اس کی مقرر کر لیں اور اس مقدار کے مطابق آپ اس کو پڑھائیں۔ انگریزی کے متعلق ایک عجیب بدقسمتی ہے کہ ہمارے اسکول میں وہی ٹیکسٹ بک شارٹ اسٹوریز......... یہ انگریزی کا لٹریچر ہے اسے ہم اپنے مدرسوں میں کیوں پڑھائیں' ہمارا مقصد کیا ہے؟ یہ ہے کہ ہمارا طالب علم جب یہاں سے نکلے تو وہ انگریزی اخبار پڑھ سکے' انگریزی رسالہ پڑھ سکے۔ اسلام کے متعلق چھپی ہوئی کتابیں پڑھ سکے' وہ شکسپیئر یا ملٹن یا اس قسم کا لٹریچر جو عام اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے اس سے ہماری انگریزی کی کتاب الگ ہونی

چاہیے لازمی طور پر۔ اسی طرح ہندی کا معاملہ۔ ہندی میں کوئی ضروری نہیں کہ ہم ونگمر اور بچن اور اس قسم کے لٹریچر پڑھائیں' ہندی میں ہمیں وہ ہندی پڑھانی چاہیئے جس سے وہ ہندی میں اخبار پڑھ سکے' رسالے پڑھ سکے یا اس طرح کے مذہبی لٹریچر' ہندوستانی لٹریچر' چاہے ہندو مذہب کا ہو یا اسلام کا ہو پڑھ سکے۔ تو ان مقاصد میں ان مضامین کو پڑھانے میں ان باتوں کا خیال ضروری ہے کہ ہم اپنے مقصد کو صاف اور واضح کریں کہ انگریزی کیوں پڑھا رہے ہیں' کیا معیار حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے کتنا وقت درکار ہوگا۔

دوسری بات ایک فکر آئی ہے جو بیشتر پیپرز میں تقریباً مشترک ہے کہ اپنے طلباء کو کسی ایک ٹیکنیکل مضمون سے واقف کرایا جائے' اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ کوئی ٹیکنیکل شعبہ یا ہنر ایسا نہیں ہوتا ہے جس کے لئے کافی مشق کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ مشق کے معنی یہ ہیں کہ کافی وقت اس کو دیا جائے' اور اتنا وقت آپ اس کو دے نہیں سکتے ہیں کیوں کہ آپ کے سامنے دوسرے مضامین اتنے ہیں کہ اس کا تقاضہ یہ ہوگا کہ اس کے لئے اتنا وقت نہ دیا جائے۔ میری تجویز یہ ہے کہ......... ایک سال تک صرف جب کہ بچے کی عمر تقریباً تیرہ چودہ سال ہو' اور چاہے جس کلاس سے اس کا تعلق ہو' ایک سال کے لئے اگر ہم مدرسے میں ایک نہیں بلکہ ایک سے زائد دو' تین' چار مختلف قسم کے فنون یا ہنر کا صرف انتظام کر سکیں اور اپنے ہر طالب علم کو تین ماہ کے لئے ایک ہنر' اس کے بعد دوسرا' اس کے بعد تیسرا' سال میں چار جہاں ممکن ہو اور تین تین ماہ اس میں سے وہ گزارے تو اس کو ایک اندازہ ہوگا کہ ہماری افتاد طبع کیا ہے اور کون سی چیز ایسی ہے جس میں مجھے دلچسپی ہو سکتی ہے اس سے وہ اس میں ہنر مند نہیں بن گیا۔ وہ ٹیکنیشن نہیں بن گیا بلکہ اس کو ہم کہتے ہیں کہ Techni-cal Bias ہو گیا۔ اس کو ایک موقع ہم دیتے ہیں' اپنی صلاحیت کو سمجھنے کی اور اس سمجھنے کے بعد پھر آگے چل کر اس میں دلچسپی رکھتا ہے وہ تو اپنے پیشے کے اعتبار سے مولانا نے فرمایا کہ ہمارے امام جوتی بھی ٹانکتے تھے۔ بزاز کا بھی کام کرتے تھے اور امامت بھی کرتے تھے' تو ایک پیشے کے اعتبار سے کام کا انتخاب وہ خود کر سکتا ہے' اور اس کے بعد وہ اپنی روزی روٹی اس طرح سے کما سکتا ہے' اور جن کا علمی ذوق ہے' جن کا ادبی ذوق ہے' وہ ادبی ذوق کے مالک ہو سکتے ہیں۔ اس میں ایک جو سب سے بڑا نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو عام طور سے چاہے وہ علماء کا درجہ ہو یا عام آدمیوں کا ہو ہاتھ سے کام کرنے کی جو ہمیں عادت نہیں ہے اور

ہم اس لئے چھوٹی اور حقیر چیز سمجھتے ہیں یہ حقارت کا جذبہ یوں ہی ٹوٹ جائے گا۔ تیرہ چودہ سال کی عمر وہ عمر ہوتی ہے جب کہ بچہ بلوغت کی منزل پر آرہا ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہے کہ اس کے اندر یہ خوبیاں یہ صلاحیتیں پیدا کی جاسکتی ہیں اس کے بعد نہیں۔

ان شعبہ علوم وفنون میں بعض تو ایسے ہیں کہ جن میں زیادہ خرچ بھی نہیں ہے اور وہ مدرسے جہاں وہ کام کر سکتے ہیں جو بڑے بڑے مدرسے ہیں وہ اگر چاہیں تو زیادہ خرچ والے ہنر کو اپنے نصاب میں داخل کر سکتے ہیں۔ مثلاً ٹائپ کا کام کرنا، لکڑی کا کام سکھانا، بجلی کا کام، موٹر میکینک کا کام سکھانا، پرنٹنگ کا کام سکھانا، خطاطی، فلنگ، درزی کا کام، سائیکل کی مرمت، یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر تین تین ماہ بچے نے گزارے تو وہ سمجھ جائے گا اس کی دل چسپی کس میں ہے اور کس فن میں وہ زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ تجربہ اگر کیا جائے، بڑے بڑے مدرسوں میں یا چھوٹے مدرسوں میں تو وہاں کے طلباء کو خود کفیل بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک اور تجویز میں نے دیکھی کسی پیپر میں....... وہ یہ ہے کہ "جو طلباء داخل ہیں مدرسوں میں وہ تو خیر دینی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں، لیکن اب بہت بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو انگریزی اسکول سے پڑھ کر نکلے اور پھر وہ اپنی ملازمت میں لگ گئے اور ان کے اندر اب بھی یہ جذبہ قائم ہے کہ ہم کاش کچھ سمجھ سکیں۔ خاص خاص مضامین مثلاً قرآن کی تفسیر یا حدیث ہے، ان کے لئے ہم نے کوئی انتظام اب تک نہیں کیا ہے۔ ہمارے یہ بڑے بڑے مدرسے دارالعلوم جو ہیں ان کے لئے ایک شارٹ ٹرم کورس ایک خاص موضوع کو لے کر ان کے لئے اگر قائم کر دیں تو بہت سے لوگ تو ایسے ہوں گے جو تبلیغی جماعت کے چلے میں جاتے ہیں، وہ اپنی چھٹی لے کر، ایک مہینہ گزاریں، ان کے لئے آپ یہ کام کیجئے اور ان کو تعلیم دیجئے، اس سے ایک بہت بڑا طبقہ جو محروم رہا ہے اور محروم ہوتا جارہا ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔

## جسٹس سرور علی، پٹنہ

بہت سے بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں، چند باتیں :

۱۔ ایک بات جو رانچی اور یہاں دیکھنے میں آئی کہ مدرسوں کے نصاب میں کچھ ترمیم کی

ضرورت ہے اور اس پر قریب قریب اتفاق ہے تو اس پر غور کیا جائے کہ ایک ایکسپرٹ کمیٹی ایسی بنائی جائے، تمام نصاب، ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے دستیاب کیے جائیں پھر ایک ماڈل نصاب تیار کیا جائے جو چاہے اس کو مانے جو نہ چاہے اس کو تکلیف کے ساتھ مانے۔ جیسا کہ یہ صحیح ہے کہ سب کے سب نہیں ماننے کو تیار ہوں گے۔ ان کی روایات ہیں اور اس سلسلے میں ایک پرابلم کی طرف توجہ دینا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی نصاب بنے گا اس کے لئے کتابوں کی تصنیف بھی ایک بڑا مسئلہ رہے گا، اس لئے کہ دیکھا گیا ہے کہ جو کتابیں ہیں جیسے بہار کا اس وقت جو نصاب ہے اس میں کافی ماڈرن علوم شامل ہیں، لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کتابیں وہ Sub Standard ہیں اور اس کا یہ حال ہے کہ یونیورسٹیوں کی جو کتابیں ہیں ہندی کی خاص طور سے اس میں "ہسٹری آف دی ورلڈ" ہے۔ یہ وہ کتاب تھی کہ گورنمنٹ کو خاص طور پر اسے Prescribe کرنا پڑا۔ وہ کتاب تھی..... اور اس نے چیلنج کیا ہے کورٹ میں بھی اتفاق سے اس کورٹ میں تھا، جس میں وہ Decide ہوا۔ ایک کو تو سبھوں نے کہا ٹھیک Prescribe ہوئی ہے، دوسرے میں اختلاف ہو گیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود اختلاف رائے کے گورنمنٹ نے........ دے دیا..... خیر یہ دوسرا قصہ ہے۔ اس پرابلم پر بھی خاص توجہ ہونی چاہئیے کہ ظاہر ہے جو نصاب ہو گا اس میں درجہ بدرجہ تجویز کرنا ہو گا کہ دینی علوم کس حد تک اور کہاں تک رکھے جائیں اور کس لیول تک رکھے جائیں، یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم جو مدرسے کا ہے اس میں دینی علوم کا زیادہ حصہ ہو گا۔ بہ نسبت اس کے کہ جو پیچھے کے درجے، جسے ہم میٹرک ہائر سیکنڈری یا ۱۰ + ۲ (ٹین پلس ٹو) کہتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ہم کو اس کا احساس ہونا چاہئیے کہ مدرسے میں جو ہمارے لڑکے پڑھیں گے ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جو مڈل تک پڑھ کر چھوڑ دیں گے جیسے کہ پرائمری اسکول میں ہوتا ہے۔ ہر اسکول میں ہوتا ہے، کچھ ایسے ہوں گے جو میٹرک تک پڑھ کر چھوڑ دیں گے اور کچھ ایسے ہوں گے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ہر لیول کے لوگوں کے لئے نصاب ہم مرتب کریں اور یہ کوشش کریں کہ وہ جب یہاں سے نکلیں تو زندگی میں کامیاب ہو سکیں اور اس چیز پر میں بہت زیادہ زور دیتا ہوں کہ مدارس میں کچھ نہ کچھ ہنر ضرور سکھانا چاہئیے کہ ایسے لڑکے جو اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کر پاتے ہیں۔ وہ ہنر کے ساتھ زندگی میں داخل ہوں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جب گورنمنٹ آف انڈیا کی نئی تعلیمی پالیسی کا

خاکہ بن رہا تھا تو اس وقت یہ بات بھی آئی تھی کہ اس میں یہ چیز ہونی چاہیئے، جب پالیسی بنے تو شاید اس میں یہ شامل ہونا چاہیئے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ہمارے لڑکے جو میٹرک کا اکویلنٹ پڑھتے ہیں، جہاں تک بہار کا تعلق ہے مثلاً فوقانیہ میٹرک کے برابر ہے تو فوقانیہ کے لڑکے میں کم از کم یہ صلاحیت ہو کہ ہم Compete کر سکیں۔ ہر اس چیز میں جس میں میٹرک Compete کرتا ہے، مان لیجئے کہ کلرک کی نوکری ہے، اس میں فوقانیہ پڑھ کر وہ ایسے پوزیشن میں نہ آئے کہ وہ پیچھے رہ جائے تو نصاب کا ایسا توازن ہونا چاہیئے، ایسا امتزاج ہونا چاہیئے کہ کوئی بھی لڑکا جس کا لیول کا ہو، اس میں تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ ہر مقابلے میں کامیابی کی صلاحیت اس میں رہے۔ اگر ایسا رکھیں کہ وہ میٹرک کے برابر کمپلیٹ نہ کر سکے تو یہ ہماری کوتاہی ہوگی۔

تیسرا یہ کہ اعلیٰ تعلیم میں یقینی اور دوسرے نیچے درجوں میں بھی ایک سبجیکٹ Comparative Religion کا ہونا ضروری ہے اور میرا تو یہ مستحکم خیال اور عقیدہ ہے کہ اگر اپنے مذہب کی خوبیوں کو سمجھنا ہے تو دوسرے مذاہب کو جاننا ضروری ہے، اور انگلینڈ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں تو تمام پیپرز ہیں Comparative Religion کے اسلامک ریلیجنس کے پیپرز ہیں، بہت سی یونیورسٹیز میں انگلینڈ کے، میں نے خود کتاب پڑھی ہے۔ میں نے کوٹ بھی کیا ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں۔ دنیا کا تو مزاج یہ ہے کہ دوسرے مذہب کے لئے پیپرز تیار کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کم از کم ایک سبجیکٹ ایسا ہونا چاہیئے کہ از کم کم اعلیٰ سطح پر اور کسی سطح پر بھی واقفیت ہونی چاہیئے دوسرے مذاہب کی۔

آخر تعلیم کا صحیح مقصد کیا ہے۔ عام طور پر دو ہی مقصد صحیح سمجھا جاتا ہے۔ ایک تو دماغ کی کشادگی ہونی چاہیئے Widening of the Mind ہونی چاہیئے، دوسری یہ کہ Character Making ہونی چاہیئے اور کیریکٹر میکنگ کی تعلیم اب نہیں ہو رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں ہوتی تھی۔ اس وقت جو اساتذہ پڑھاتے تھے ہمیں یاد ہے سوائے ایک ٹیچر کے کوئی ایسا نہیں تھا جس کی زندگی اور رہنے کا طریقہ قابل تتبع ہو۔ اب اگر ہم اس کی کوشش کریں کہ ہمارے مدارس میں جو لڑکے پڑھیں انہیں رائٹ ویلیوز آف لائف کی کیریکٹر بلڈنگ کی بھی صلاحیت آجائے تو اس کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے اساتذہ بھی صحیح اساتذہ ہوں۔ یہ بڑا بھاری پرالم ہے۔ کیسے حل ہو یہ سوچنا مشکل ہے، لیکن کوئی سینٹر یو کرڈ ایجنسیز سے اگر

ہمارے اساتذہ لئے جائیں تو شاید یہ حل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک بہار کا تعلق ہے تو اب مدرسہ اسپیشل اور پاٹھ شالہ اسپیشل۔ اسٹیٹ اسپونسرڈ ہیں۔ سات کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں ہے، سات کروڑ روپیہ صرف مدارس کی تعلیم میں بہار گورنمنٹ کا خرچہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اسی طرح پاٹھ شالوں میں ۷ کروڑ، ۱۰ کروڑ، ۱۵ کروڑ اتنا ہی سرکار کا خرچہ ہے۔ توفائنانشیل Crux کچھ جگہ زیادہ ہو سکتا ہے۔ بہار میں اتنا زیادہ خرچ نہیں ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی صورت نکل سکے کہ مدارس میں ایسے لوگ معلم ہو سکتے ہیں جن کی زندگی، جن کا طور طریقہ ایسا ہو کہ ہمارے لڑکے صحیح ویلیوز آف لائف سمجھ سکیں۔ یہ بہت اچھا ہو۔

## ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، علی گڑھ

افسوس ہے کہ میں رانچی کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکا، یہاں ابھی حاضر ہوا۔ لہٰذا وہاں جو تجاویز پیش کئے گئے ان کا ہمیں انداز نہیں تھا البتہ علمائے کرام کی تقریروں اور جدید ماہرین تعلیم کی تجاویز سے جو باتیں سامنے آئیں ان کی روشنی میں چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

جن حالات میں یہ مدارس قائم کئے گئے تھے اور جو ان کے سامنے مقاصد تھے، ان کے سامنے جو چیلنج تھا اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ان مقاصد کی تحصیل کو بحسن خوبی انجام دیا ہے اور ان چیلنجوں کا جو سامنے تھے بھرپور مقابلہ کیا ہے۔

آزاد ہندوستان میں خاص طور سے اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کے درمیان اگر علم موجود ہے، اگر خانگی کی کوئی شرح بنتی ہے، اگر اسلامی تہذیب سے ان کی واقفیت باقی ہے تو غالباً اس کا بہت بڑا حصہ ان ہی مدارس اور مکاتب کی مرہون منت ہے۔ اگر جائزہ لیں کہ کتنے مدارس، کتنے مکاتب اور کتنے دارالعلوم ہندوستان میں اپنی تمام تر مسلمانوں کی کسمپرسی اور زبوں حالی کے باوجود ان کی اپنی کوششوں سے ان کی چاہے جیب کے بل بوتے پر ان کے عوام و خواص کے چھوٹے چھوٹے چندوں کی بنیاد پر چل رہے ہیں اور ان میں کتنے طلباء تعلیم پا رہے ہیں اور پھر ہم یہ دیکھیں کہ ہماری جو جدید درس گاہیں ہیں، جامعات ہیں، کالجز ہیں ان میں مسلمانوں کی کتنی تعداد تعلیم پا رہی ہے اور دونوں کا تناسب کیا ہے۔ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یقیناً وہ لوگ جو مدارس سے فیض یاب ہو رہے ہیں ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں عام طور پر گاؤں میں، دیہاتوں میں، دور دراز کے علاقوں میں جہاں جدید

تعلیم کی سہولیات نہیں پہنچی ہیں وہاں کا شرح خانگی کچھ باقی ہے اور کچھ علوم سے واسطہ باقی ہے تو انہی مدارس اور مکاتب کا طفیل ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ مولانا قاسمی صاحب نے فرمایا کہ واقعہ ہے کہ یہ ایک اعجاز ہے اور یہ میں سمجھتا ہوں کہ قوم کی زندگی کا ایک ثبوت بھی ہے۔

دوسری بات اس سلسلے میں یہ کہ نصاب تعلیم کے سلسلے میں عام طور پر سب ہی لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ نصاب تعلیم کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی ہے کہ جو جامد ہو، مستقل ہو، جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ آئے، نصاب تعلیم کسی مخصوص زمانے کے حالات کے پیشِ نظر کچھ مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر وضع کیا جاتا ہے۔

ہمارے مدارس میں عام طور پر جو نصاب رائج ہے، وہ نصاب تعلیم وہ ہے جو بڑی حد تک عہدِ وسطیٰ سے آرہا ہے۔ اس کے اندر کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ ہم جانتے ہیں کہ عہدِ وسطیٰ میں صورت حال یہ تھا کہ جو نصاب تعلیم تھا، اس کے فارغین بھی سرکاری ملازمین بن جاتے تھے، وہی مدرسوں میں بھی جاتے تھے، وہی قاری بنتے تھے، عالم بھی بنتے تھے، مدرس بھی بنتے تھے، اسی میں سرونٹ بھی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں اس میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ مسئلہ اب آگے پڑا ہے کہ جب دونوں میں تفریق ہوگئی کہ سول سروس کے لئے، گورنمنٹ کی ملازمت کے لئے، دوسری چیزوں کے لئے یہ علوم ہمارے لئے کافی نہیں سمجھے جارہے ہیں، تو زمانہ بدلا ہے، حالات بدلے ہیں، ان ہی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے غالباً اس ضرورت سے انکار اب ممکن نہیں ہے کہ ان نصاب تعلیم میں کس قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اب یہ ضرورت دو سطحوں پر ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ علوم اسلامیہ جو پڑھائے جاتے ہیں جو اصل علوم ہیں جن کی خاطر مدارس قائم کئے گئے، جو ہمارے علوم قرآن مجید، حدیث، فقہ اور دوسری چیزیں ہیں۔ ان علوم کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ان کے علاوہ جو علوم ہیں ان کی تعلیم کا مسئلہ ہے، دو الگ مسائل ہیں۔

علوم عصریہ کی تعلیم کے سلسلے میں بھی بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں، میں بھی ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں ہمارے یہاں جو نصاب رائج ہے، اس میں بھی کسی حد تک تبدیلی ضروری ہے، جو کتابیں ہم پڑھا رہے ہیں ان کے بجائے نئی کتابیں کچھ ایسی دستیاب ہیں جو شاید ان سے بہتر ہوں۔ بعض علوم جو ہم پڑھا رہے ہیں جن کو کسی زمانے میں ہم نے

دوسروں سے اخذ کیا تھا اب غالباً اسی جگہ پر دوسروں سے اخذ کر کے کچھ دوسرے علوم کے پڑھانے کی ضرورت ہے، تو ان کتابوں میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے، ان میں Emphesis تاکید کا جو مسئلہ ہے، یہ کس پر زیادہ، کس پر کم ہو آج کل بھی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے دینی علوم میں بنیاد قرآن مجید پر ہونی چاہئے اور قرآن مجید کے تابع دوسرے علوم پر ہونا چاہئے۔ قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلے میں کوئی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم تفاسیر سے ابتداء کریں۔ پہلے طالب علم کو ترجمے سے روشناس کرائیں، جب کچھ شدھ بدھ ہو جائے اس کے بعد ہی ہم تفاسیر میں بھی قدیم اور جدید دو طرح کے تفاسیر ہیں، ان کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فقہ میں بھی لازمی طور پر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فقہ کی ایسی کتابیں شامل کی جائیں، جیسا کہ مولانا سالم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ اس میں آپس کے اختلافات کے بجائے رواداری کا اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ فروغ پائے، اور اس طرح ہمارے درمیان اس طرح کی بات آئی ہے کہ کبھی کبھی ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے مسالک کے سلسلے میں کسی قدر ہم زحمت محسوس کرتے ہیں اپنے طرزِ عمل میں تو وہ چیز پیدا نہ ہو، اس کی بھی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں علماء کی رائے اولیٰ ہوگی۔ لیکن میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ آج کل جو مختلف حلقوں میں یہ بات محسوس کی جا رہی ہے اس میں کسی حد تک ترمیم کی ضرورت ہے۔ کتابوں کے بدلنے کی، طرزِ تعلیم کو بدلنے کی، طریقہ تعلیم میں جو Text Oriented ہمارے یہاں تعلیم ہے جس میں ایک کتاب ہوتی ہے اس کے متن کو دیکھ کر ہم پڑھتے ہیں، جیسا کہ دوسرے مقررین نے اس پر گفتگو کی اور فاروقی صاحب نے بھی فرمایا کہ ........"املا کا طریقہ، لیکچر کا طریقہ رائج کیا جائے، یہ بہت ہی اچھا طریقہ ہوگا، اس سے استاد کم وقت میں زیادہ معلومات طلباء تک پہنچا سکے گا، اور اپنے مطالعے کا نچوڑ ان تک پہنچا سکے گا، اور غالباً یہ زیادہ مفید بھی ہوگا اور یہ طریقہ پہلے ہمارے یہاں رائج بھی تھا۔"

دوسری چیز، عصری علوم کا جہاں تک مسئلہ ہے تو ظاہر ہے کہ فلسفہ، منطق، اس طرح کی دوسری چیزیں جب رائج کی گئی تھیں عباسی دور میں تو بھی عصری علوم اپنے وقت کے تھے اور اسلام نے کبھی بھی عصری علوم سے انحراف نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اب اس زمانے میں سائنس کے مورخین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ بیچ کی کئی صدیاں

مسلمان سائنس دانوں کی مرہون منت ہیں۔ ورنہ یہ علم اور ترقی کا سلسلہ غالباً ٹوٹ چکا ہوتا۔ نہ صرف انہوں نے پہلے کی چیزوں کو محفوظ رکھا، بلکہ ان کو بہت آگے بڑھایا، تو وہ بھی ہم نے دوسری جگہ سے لیا تھا۔ اب کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ہے کہ اس کے بدلے میں ہم کوئی دوسری چیز نہ لیں، لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ اس کی مقدار کیا ہو اور کن چیزوں کو لیا جائے۔ میں اس سلسلے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ سائنس کی تعلیم جنرل سائنس کی حد تک اصطلاحات و مبادی کے جاننے کی حد تک ضروری ہے۔ جنرل سائنس کی تعلیم طلباء کو ضروری دینی چاہیئے تاکہ ان کے سامنے موٹے موٹے، حوالوں سے جب کوئی بات آئے تو وہ بالکل لاعلم نہ ہوں۔ لیکن ظاہر ہے ایک چیز ہوتی ہے کمال، ایک چیز ہوتی ہے واقفیت، تو سائنس کے سلسلے میں کمال پیدا کرنا مدارس کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔ واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت غالباً ہے۔ تو کمال پیدا کرنے کے لئے یونیورسٹیز موجود ہیں، وہاں پڑھائیں اور سائنسدان پیدا کریں۔ لیکن بنیادی چیزوں کو واقفیت پیدا کرا دینا غالباً ضروری ہے اور اسی طرح ارتھمٹک بھی، اور میں سمجھتا ہوں اس سے زیادہ توجہ سوشل سائنسز کی طرف کرنی چاہیئے۔ تاریخ، اسلامی تاریخ اور دنیا کی تاریخ کی طرف، فلسفہ کی طرف، جدید فلسفے کی طرف، معاشیات، سیاسیات کی طرف۔ اس لئے کہ جو اسلام کو، مسلمانوں کو جو اس وقت چیلنجز درپیش ہیں مستشرقین کی طرف سے، نئے زمانے کے تقاضوں کی طرف سے نئے ماحول میں طرح طرح کے جو سوالات اُبھر کر آرہے ہیں ان کا جواب علماء کے سوا اور کون دے گا لیکن وہ جواب کیسے دیں گے جب ان کو ان چیزوں کے بارے میں واقفیت ہی نہیں ہو گی کہ سوال کیا ہے؟ دوسری چیز کہ آج کا لب ولہجہ کیا ہے، آج کا طرز ادا کیا ہے، آج کا اسلوب کیا ہے، آج کس انداز میں بات کی جاتی ہے، آج تحقیق کا معیار کیا ہے؟ یہ سب چیزیں اسی صورت میں ہم جان سکیں گے جب ان چیزوں کو ہم مدارس میں داخل کریں گے، لیکن یہ بات بہر حال میں تاکید کے ساتھ عرض کروں گا۔ یہ سب چیزیں اسی حد تک داخل کی جا سکتی ہیں اور کی جانی چاہیئے، اس حد تک کہ اصل مقاصد متاثر نہ ہوں، اگر اصل مقاصد متاثر ہوتے ہیں تو پھر اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا، گویا بنیادی بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ سائنس کی واقفیت ضرور حاصل کرنی چاہیئے لیکن اس سے زیادہ سوشل سائنس کی طرف زیادہ زور دینا چاہیئے، اس لئے کہ یہ بات کرنے کا طریقہ اور بات کو موثر طریقے سے پہنچانے اور ابلاغ و ترسیل کا طریقہ ہے وہ اس میں زیادہ بہتر طریقے سے

سیکھ سکتے ہیں اور تیسری چیز جس میں یہ ہوگی کہ انگریزی زبان تو بہر حال مدرسوں میں پڑھائی جارہی ہے۔ انگریزی زبان میں کسی حد تک مہارت ضروری ہے اس کے لئے کیا طریقے اپنائے جائیں، یہ تفصیلات جب طے ہوں گی تو اس وقت اس پر سوچا جائے گا۔ بہر حال انگریزی زبان جو انٹر نیشنل زبان ہے اس میں ساری دنیا کے کام ہورہے ہیں۔ اسلام سے متعلق بھی دنیا بھر کے کام ہورہے ہیں، اس کے حق میں بھی اس کے خلاف بھی، اس سے واقفیت کے بغیر چارہ کار نہیں ہے اور یہ بات ہم غالباً بہت پہلے تسلیم کر چکے ہیں کہ بہت سارے مدارس میں ان چیزوں پر توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ تو انگریزی زبان کی طرف توجہ ضروری ہے۔ ہندی زبان کے متعلق تو ظاہر ہے، ہندوستان کی قومی زبان ہے، اس کے بغیر سڑکوں پر جانا، دکانوں میں جانا، دفتروں میں جانا، شاید ممکن نہیں، اس کا جاننا تو ضروری ہے ہی۔

ہمارے نصاب کا جو مسئلہ ہے اس سلسلے میں غالباً وہی بات ہوگی جو ابھی مسلسل سرور علی صاحب نے کہی کہ کوئی ماڈل چاہئے ہمیں۔ ایک ماڈل کی ضرورت ہے، وہ ماڈل کس طرح بنے، کوئی کمیٹی بنائے یا علماء کی کوئی مجلس بنائے۔ اس لئے کہ اب تک تو صرف باتیں ہیں۔ ظاہر ہے مولانا آزاد نے ایک خاکہ پیش کیا تھا۔ مولانا شبلی نے اس سے پہلے خاکہ بنایا تھا۔ اس سے پہلے بھی الگ، الگ انفرادی خاکے پیش کئے جاچکے ہیں۔ لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اب نئے سرے سے جو کوشش شروع ہوئی ہے۔ وہ بہت مسرور کن ہے اور وہ وقت کا تقاضا بھی ہے تو ایک ماڈل ضرور تیار ہو، جس میں دونوں اسکیم کے ماہرین ہوں تب ہی وہ تیار ہوسکے گا اور اس ماڈل کے سلسلے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہوسکتی ہے۔ وہ دستیاب ہو، جو چاہے اختیار کرلے، کوئی چاہے تو اس سے مستفید ہولے، کوئی چاہے تو اس میں ترمیم کرلے، کوئی چاہے تو اس میں کوئی حصہ لے لے یا نہ لے۔ یہ ممکن بہر حال نہیں ہے کہ تمام مدارس میں یکساں نصاب نافذ کردیا جائے، مختلف مدارس، مختلف مقاصد سے قائم کئے گئے ہیں، ان کے اپنے مختلف ترجیحات ہیں اور ان سب سے توقع کرنا کہ یکساں نصاب نافذ کردیں گے۔ بروقت حالات کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ تو ایک ماڈل تیار ہو جسے اپنی ضرورت کے مطابق لوگ اختیار کرسکیں۔ اس کے ساتھ کتابوں کی تیاری کا مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسے بھی بالکل معمولی مسئلہ نہ سمجھا جائے۔ اگر کوئی نصاب تیار ہوگیا تو کتابوں کی تیاری کا مسئلہ اس کے لئے

بہت بڑا مسئلہ ہو گا۔ وہ کتابیں مختلف علوم وفنون کی مختلف یونیورسٹیز میں رائج ہیں۔ یعنی وہی نصاب آپ رائج نہیں کر سکتے۔ مختلف اسباب کی وجہ کر، ان کا ایک الگ پس منظر ہے، ان کی ایک الگ ترجیحات ہیں، ان کے تمام معاملات الگ ہیں، بعینہ ان کو نافذ نہیں کر سکتے، اس میں افرادی قوت بھی بہت زیادہ چاہیے۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے مصارف کا بھی کوئی حساب نہیں ہے۔ غالباً یہ دیر سے کام ہو گا اور دھیرے دھیرے کام ہو سکے گا۔

جہاں تک مدرسوں کے وفاق کا مسئلہ ہے وہ بھی غالباً یہی ہے کہ اگر کوئی Loose قسم کا آرگنائزیشن ہو تو غالباً یہ بہت آسان صورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جونیئر سائنٹسٹ جو سلام صاحب کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ جینیوا میں علی گڑھ کو ریپریذنٹ کر رہے ہیں، ایک ہمارے سینئر موسٹ سائنٹسٹ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن صاحب جو ایجوکیشنسٹ سائنٹسٹ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے چانسلر ہیں، پھر ہمارے علماء ہیں جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب، جناب مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب، جناب مولانا محمد سالم قاسمی صاحب، ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی صاحب جو دونوں کا میل ہیں۔ ہمارے قومی رہنما ہیں، جناب ٹی۔ این پانڈے صاحب، جناب کرشن کانت صاحب، جناب مولانا انظر شاہ کاشمیری شاہ صاحب۔

## مولانا انظر شاہ کشمیری، دیوبند

ہمارے سامنے تین اپنے بزرگوں کے واقعات ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں نصاب کا مسئلہ بار بار زیر بحث آیا۔ ایک مرتبہ بڑے زور و شور کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب مداہنت فرمارہے تھے اور چاہتے تھے کہ قدیم کتاب میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ حضرت کی مداہنت تقریباً ناکام ہو گئی۔ تو مولانا کے پاس اس کے سوا کوئی اور آخری حربہ نہ تھا یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ میرے مرنے کا انتظار کیا جائے تاکہ حضرت نانوتویؒ جب مجھ سے یہ سوال کریں کہ تم نے دارالعلوم کو کس حال پر چھوڑا تو یہ جواب دے دوں کہ جس حال پر آپ چھوڑ کر آئے تھے اسی حال پر دارالعلوم کو چھوڑ کر آیا۔ دوسری مرتبہ پھر یہ مسئلہ اٹھا ہمارے بڑے ذکی اور ذہین دارالعلوم کے بعد میں صدر مدرس حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ تھے۔ ان کی باتیں بڑی حقیقت آمیز لیکن ان کا اسلوب اور انداز بڑا

عجیب و غریب ہوتا تھا۔ علامہ کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو علامہ سنتے رہے۔ سننے کے بعد فرمایا کہ تین باتیں ہیں، ایک اساتذہ ہیں، ایک طلبہ ہیں، ایک کتابیں ہیں۔ اگر آپ اساتذہ کو چھیڑیں تو وہ آپ کے گریبان پھاڑ دیں گے، اگر آپ کبھی طلباء کی طرف متوجہ ہوں تو وہ بھی آپ سے دست و پا ہونے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ کتابیں بے چاری بے زبان ہیں۔ ان پر آپ جب چاہئے حملہ کر دیجئے۔ تو میں یہ سمجھتا تھا کہ دونوں بزرگ ہیں اور دونوں کے دونوں جمود پسند ہیں اور اپنی سلامتی کے رشتے توڑنے کے لئے تیار نہیں۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے متعلق یہ خیال تھا کہ جدید تقاضوں سے بھی واقف ہیں اور قدامت سے بھی ان کا رشتہ بڑی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ ان کے دور میں پھر نصاب کا یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سنتے رہے اور سننے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ بھائی تمہارے پاس یونیورسٹیاں ہیں، اسکول ہیں، کالج ہیں جگہ جگہ مدارس ہیں، آپ نصاب کے اوپر تجربے اپنے خیالات اور افکار کے مطابق وہاں کرلیں۔ ہمیں یہ مدرسے دے دیجئے، ہم یہاں اپنے انداز اور اپنے طریقے کے مطابق دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن بہر حال اس کے باوجود دو چار چیزیں ہیں۔ ابھی ایک صاحب یہ فرما رہے تھے جو قابل توجہ ہے۔

ایک مسئلہ ہے مقاصد کی حفاظت کا، یہ سمجھنا پڑے گا کہ دینی نصاب کے مقاصد کیا ہیں۔ دوسرا مسئلہ ہے کتابوں کا۔ مقاصد کی حفاظت کے بعد کتابوں کا مسئلہ کوئی اہم نہیں ہے۔ ان میں تغیر اور تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ خود مولانا انور شاہ کشمیریؒ صاحب نے ڈابھیل میں جانے کے بعد جو نصاب بنایا تھا، شرح جامی کی جگہ پر ابن عقیل، شرح وقایہ کی جگہ پر شرح نقایہ، اصول الشاشی کی جگہ پر تعقید النظر......... کی جگہ پر حب المرتضٰی وغیرہ، بہت ساری تبدیلیاں لائی تھیں۔

پھر دوسرا دور آیا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک نصاب کی تشکیل کی اور اس ضرورت کے پیش نظر کہ وقت کم سے کم درکار ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے مقاصد اور اپنی تعلیم کی روح سے لوگوں کو مطلع کر دیں۔ حضرت کا وہ نصاب بھی موجود ہے اور یہ بھی ہم سمجھتے ہیں کہ جدید علوم کا اضافہ ہونا چاہئے۔ بات بڑی پکی وہ ہے جو ابھی آپ نے فرمائی۔ ایک ہے واقفیت اور ایک ہے کمال۔ کمال تو ہونا چاہئے، دینی علوم اور دینی مقاصد کے لئے جہاں تک واقفیت کا معاملہ ہے تو واقفیت کے ہم بہر حال محتاج ہیں۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ

ضرور ہونی چاہئے، اور اس کے لئے یہ ہے کہ کتابوں کی فراہمی اور کتابوں کا دستیاب ہونا اور کس انداز کی کتابیں مطلوب ہیں، وہ کہاں ملیں گی اور کس طریقہ پر ملیں گی اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ شاید ہمیں طریقہ کار کے اوپر بھی غور کرنا چاہیے۔ پہلے آپ مدارس کے متعلق تو دریافت کریں، ان کے ذمہ داروں سے کہ آپ نصاب میں کوئی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یا نہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ جب وہ اپنے مدارس میں بیٹھ کر جواب دیں گے تو اس وقت وہ بالکل مخلا بالطبع ہو کر آسانی کے ساتھ جواب دیں گے، وہ جواب ان کا وہاں کا اور یہاں کے جواب میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا، پھر اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ نمائندگی یہاں پر موجود ہے۔ مدارس کی اہم شخصیتیں یہاں پر موجود ہیں۔ جب تک وہ موجود نہیں ہوں گے کوئی ایسا نصاب بنا کر ان کے اوپر لاد دینا، انتہا سے زیادہ دشوار ہے۔ مزاحمت شروع ہو جائے گی۔ پہلے دریافت کیجئے ذمہ داروں سے کہ کیا خیال ہے، وہ تبدیلی چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ بیشتر لوگوں کو اس پر متفق پائیں کہ واقعی وہ تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، نمائندگی بھر پور ہونی چاہئے۔ آپ کی، حکومت کی اور ان لوگوں کی جو مدرسے لئے ہوئے ہیں اور صدیوں سے مدرسوں کو چلا رہے ہیں، اور مدرسوں کو چلانے کا ان کو تجربہ بھی ہے۔ لیکن اتنی بات بہر حال ہم بھی جانتے ہیں کہ نصاب علوم جدیدہ کی چیزیں چھپ سکتی ہیں۔ واقفیت ہونی چاہئے، عنوانات میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ تبدیلی نصاب کے اوپر بولیں گے تو شاید کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ اسی عنوان کو بدل کر نصاب علوم جدیدہ کا عنوان اختیار کر لیں تو بات جلد قبول کر لی جائے گی۔ اور یہ بھی سوچنا پڑے گا، مولانا ابوالکلام آزاد آپ کی تمام ذکاوت و ذہانت، دقت نظری، ان کی دوراندیشی سب کچھ مسلم ہے، لیکن جو کچھ انہوں نے نصاب بنایا تھا وہ بھی ۷۵ سال پہلے کا ہے اور ۷۵ سال کے اندر دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ خود آپ کا ہندوستان کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ تو مولانا آزاد کے پیش کردہ نصاب کے اوپر تعویذ کھڑا کرنا آسان نہیں، بلکہ بہت مشکل ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے جو خطوط متعین کئے انہیں سامنے رکھ کر ہم مزید غور و فکر کریں، لیکن خود مولانا کے بنائے ہوئے نصاب کے اوپر ہم جم جائیں یا جماؤ کے لئے ہم لوگوں کو دعوت دیں، صحیح طریقہ کار نہیں ہوگا۔

## مولانا نذر الحفیظ ندوی، ندوۃ العلماء لکھنو

نصاب تعلیم میں تبدیلی برابر ہوتی رہی، اس کی تفصیلات یہاں ہیں، اس کے بعد جب حالات اور تیزی سے بدلنے لگے اور جہاں انگریزوں کی عمل داری شروع ہوئی اس کے بعد سے مدارس کے نصاب میں جمود سا رہا۔ حالاں کہ حالات تیزی سے بدلتے رہے۔

نصاب تعلیم کا تعلق ماحول اور حالات کے تقاضوں سے بنیادی طور پر ہوتا ہے اور نصاب تعلیم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جو معاشرے کے چیلنج ہوتے ہیں، جو مشکلات ہوتی ہیں نصاب تعلیم ان کو حل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح سے دعوتی تقاضے ہوتے ہیں، کبھی دعوتی تقاضا یہ تھا کہ فارسی زبان میں دعوت کو پہنچایا جائے، اس کے بعد پھر حالات ایسے ہوئے کہ انگریزی زبان کا سیکھنا بنیادی ضرورت میں شامل ہو گیا کہ بغیر اس زبان کے سیکھے ہوئے ہم اپنی دعوت کو وسیع دنیا تک نہیں پہنچا سکتے۔ بہت سے مدارس نے بھی انگریزی زبان کو اپنے نصاب میں داخل کیا اور ان کا بنیادی مقصد اور نیت ادا ہوئی۔ اب جو حالات سامنے ہیں ان میں ایک چیلنج تو یہ ہے، عربی مدارس کو جس کا سامنا ہے کہ ایک نئی نسل ایسی نکل رہی ہے جو جدید تعلیم گاہوں سے آرہی ہے اور جو نصاب وہ پڑھ رہی ہے، اس نصاب نے ان کو دین کے قابل نہیں رکھا ہے۔ یعنی اسلامیت یا مسلمانیت سے وہ خارج ہو رہے ہیں۔ تقریباً، اور ہم عربی مدارس کے ذمہ دار حضرات ان کی ضروریات سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ یعنی سمندر میں جزیرے کا تصور ہوتا ہے لیکن خشکی میں جزیرے کا تصور نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نے یہ فیصلہ لیا جس طرح ہم گاڑی چلا رہے ہیں وہ چلتی رہے گی اور ہم کو اس نسل سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ جو جدید تعلیم گاہوں سے نکل رہی ہے۔ ہم کو اس کے اسلام اس کے دین کی فکر نہیں تو اس بنیادی بات سے تجاہل برتنا ہوگا۔ مدارس کا بنیادی کام ہی جب ٹھہرا کہ ملت کی رہنمائی کریں اور تمام انسانوں کی رہنمائی کریں تو ان ہی مدارس کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نسل کو بچانے کی فکر کریں۔ وہ نسل جو چالیس سال کے اندر ایسی ہو چکی ہے کہ اسے لفظ اللہ لکھنا نہیں آتا اگر اس سے پوچھا جائے "کعبہ شریف کہاں ہے" تو وہ کہتی ہے "کراچی میں ہے"، "مکہ کہاں ہے تو پاکستان میں ہے۔" اس نسل کا جب یہ جواب ہے تو ہم عربی مدارس والے کیسے اس سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں، اور کیسے ہم یہ کہہ

سکتے ہیں کہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے اور جس مقصد کے لئے ہماری بناء پڑی تھی، اس مقصد میں ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور بڑی اچھی بات کہی ڈاکٹر مونس رضا صاحب نے کہ مقاصد میں اضافے ہونے چاہئیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہمارے مدارس کے بنیادی مقاصد میں اضافے ہونے چاہئیں اور حالات بہت بدل گئے ہیں اسی طرح ہماری بنیادی ضرورت یہ بھی ہے کہ غیر مسلم حضرات کو جو ملک میں ہمارے ساتھ رہتے ہیں ضرورت ہے کہ ان کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں یا کوئی ایسا طریقہ تعلیم وضع کریں کہ کم از کم ان کے ذہن میں کچھ ایسی بنیادی باتیں پڑ جائیں۔ مسلمانوں سے متعلق، اسلام سے متعلق کہ وہ اس سے بے خبر نہ ہوں، اور ہمارے محترم پانڈے جی اس بات سے سب سے زیادہ واقف ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے نصاب تعلیم میں ایسی کتابیں داخل کر دی گئی ہیں جنھوں نے مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کر دی ہیں، ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ اس نصاب تعلیم کو پاک کرنا ہے اور اس زہر کو اس سے ختم کرنا ہے اور اس کے لئے ایسی کتابیں تیار کر کے ہمیں دینی ہیں کہ ان درس گاہوں میں یونیورسٹیز، کالجز میں وہ کتابیں پڑھائی جائیں جو بنیادی ضرورت پوری کریں اور مختلف فرقوں کے درمیان انگریزوں کی تخریب کاری کی وجہ سے جو خلیج حائل ہو گئی ہے وہ ختم ہو جائے۔

یہ مختلف باتیں ہیں جن کا ہمیں سامنا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کام کرنا ہے کہ اگر اس پر اصرار ہے وہ کوئی اصلاح نہیں کریں گے تو ٹھیک ہے وہ نہ کریں مگر کم از کم اتنی بات ضرور ہونی چاہیئے کہ اپنے نصاب تعلیم میں ایسے عناصر داخل کریں، ایسے اضافے کریں کہ دینی علوم کو وہ آگے بڑھا سکیں، مثلاً اسلوب جدید انداز کا ہو، دعوت پیش کرنے کا انداز حالات سے ہم آہنگ ہو، اسی طرح ان کا ذہن ایسا بنے کہ وہ موجودہ حالات سے بے خبر نہ رہیں۔ اس وقت جن حالات کا سامنا ہے ہم ان سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ اگر ہم سمجھیں ہمارا اس سے کوئی مطلب نہیں اور ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے تو یہ سوچنا غلط ہے اور باہر کے تھپیڑوں سے ہم کب تک بچا سکیں گے، پچھلے سالوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہماری نسل دین سے اور زبان سے پوری طرح بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں جہاں تک چیلنجز کا سوال ہے ہمیں اس کا جواب دینا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں رہنا ہے۔ اور یہاں کے حالات کو سمجھ کر اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنا ہے اور اپنے اسلامی تشخص

کو زندہ رکھنا ہے۔ اسی کے ساتھ ابنائے وطن سے، برادران وطن سے ہمیں تعلقات نبھانے ہیں۔ ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے۔

## مولانا سعید احمد پالنپوری، دیوبند

آج صبح سے اب تک اس معینہ موضوع پر ہم جو طویل گفتگو سنتے آرہے ہیں، اس نے موضوع کے مختلف گوشے نہایت وضاحت کے ساتھ سب کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا اب میرے لئے کچھ باقی رہا نہیں، لیکن جناب انظر شاہ کشمیری صاحب نے اس گفتگو کا خلاصہ بھی نکال دیا تو میرے لئے سوائے تکرار کے کچھ رہا نہیں۔

درمیان میں ایک بات آئی تھی کہ مدارس عربیہ سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں واضح کر دوں کہ دو قسم کے ادارے ہیں، ایک وہ جو عربی زبان لینگویج کی حیثیت سے پڑھاتے ہیں وہ مدارس عربیہ نہیں کہلاتے، دوسرے وہ ادارے ہیں جو دینی علوم پڑھاتے ہیں، اس دینی ادارے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک ابتدائی مرحلہ وہ مدارس دینیہ کہلاتے ہیں اگرچہ اس میں بھی عربی پڑھائی جاتی ہے۔ کسی درجے میں قرآن شریف تو پڑھایا ہی جاتا ہے اور کچھ عربی کی تھوڑی بہت شروع کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، یعنی جو دین اسلام پڑھانے والے ابتدائی مرحلے کے مدارس ہیں وہ اصطلاح میں مدارس دینیہ کہلاتے ہیں۔ پھر دین اسلام کے پڑھانے والے جو اعلیٰ درجے کے مدارس ہیں، یہ مدارس عربیہ کہلاتے ہیں۔ یہ مخصوص اصطلاح ہے۔ یونیورسٹیز میں بھی تو عربی پڑھائی جاتی ہے، اسے مدارس عربیہ کیوں نہیں کہتے۔ اصطلاحات میں کوئی مناقشہ نہیں ہوا کرتا۔ یہ ایک اصطلاح ہی ہوتی ہے۔

آپ حضرات جانتے ہیں کہ تعلیم کے تین مرحلے ہوا کرتے ہیں۔ ابتدائی، ثانوی اور عالیہ، لیکن ہمارے مدارس دینیہ کی جو تعلیم ہے اتفاق سے ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم میں تو خط امتیاز ہے مگر ابتدائی ختم ہو کر ثانوی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور ثانوی کہاں سے ختم ہو کر آخری کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں کوئی واضح خط امتیاز نہیں، اور یہ خط امتیاز ہونا ضروری ہے۔ اس کا فائدہ کیا ہے مثلاً اسکولوں میں پرائمری تعلیم ایک مقصد ہے، اور اس مقصد کے مطابق نصاب بنتا ہے۔ پھر جب سیکنڈری تعلیم ہوتی ہی، اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور اس کا نصاب بنتا ہے۔ پھر جب ہائر ایجوکیشن آتا ہے تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے اور

اس کا نصاب بنتا ہے۔ یہاں بھی تینوں درجے واضح طور پر اگر الگ الگ ہو جائیں تو تینوں کا ایک نصاب بنتا ہے۔ ہاں یہ بات تو ہے کہ ابتدائی مرحلے واضح طور پر متعین ہیں اور ان کو مقصد بنا کر ان کا نصاب بنایا گیا ہے۔ وہ مدرسے مکاتب اسلامیہ کہلاتے ہیں جو ابتدائی درجے کے مدارس دیجیہ ہیں، ان کا نام ہے مکاتب اسلامیہ۔ مکاتب اسلامیہ میں مقصود دو چیزیں ہیں۔ ایک تو دین ہر مسلمان کی ضرورت ہے اور دین ضرورت ہے اور دنیا ہر مسلمان کی دنیوی ضرورت ہے۔ کوئی بھی مسلمان دینی ضرورت سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اس لئے مکاتب اسلامیہ کا نصاب دونوں چیزوں کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا گیا ہے، کہ اس میں قرآن شریف، ناظرہ بھی ہے، حفظ بھی ہے، دینیات، فقہ، تاریخ کی کتابیں بھی ہیں، حساب بھی ہے، جغرافیہ بھی ہے، لینگویجز بھی ہیں، تنقید بھی ہے، انگریزی بھی ہے، فارسی بھی ہے۔ سب چیزیں اس کے اندر سموئی جاتی ہیں کیوں کہ بچے کو بڑا ہو کر سب چیزوں سے اس کا واسطہ پڑے گا۔ ان سب چیزوں کا لحاظ کیا جاتا ہے، بعض صوبے ایسے ہیں کہ اسکول کی تعلیم اس طرح وسیع پیمانے پر ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی آبادی ایسی نہیں ہے جہاں اسکول نہ ہوں۔ ہمارے گجرات میں چھوٹی آبادی میں بھی سرکاری اسکول ہے اور سرکاری اسکول میں ہر بچہ لازماً جائے گا۔ اب مدارس اسلامیہ کے پاس ایک تو ٹائم کم رہ گیا، چوں کہ چھ سات آٹھ گھنٹے وہاں رہے گا تو یہاں کے لئے وقت کم رہ گیا تو ان مدارس نے ایسا کیا کہ اپنے یہاں محض دینی مضامین رکھے اور بقیہ دنیوی مضامین اسکول کے حوالے کئے کہ ہندی، حساب، جغرافیہ، سائنس، تاریخ یہ سب اسکول پڑھائے گا اور ہم فقط قرآن، حدیث، فقہ اور دینیات کی تعلیم دیں گے، لیکن ہندوستان کے جن خطوں میں اسکول کی تعلیم Available نہیں ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جہاں اسکول کی تعلیم اتنی وسیع نہیں ہوئی تو ان صوبوں میں جہاں مکاتب اسلامیہ ہیں، مدارس دینیہ ہیں، یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ دین کے ساتھ وہ بچوں کی دنیوی ضرورت کو بھی نصاب میں شامل کریں، کیوں کہ بچہ بڑا ہو کر صرف نماز نہیں پڑھے گا۔ اسے سائنس بھی پڑھنا پڑے گا، وہ بڑا ہو کر صرف روزہ نہیں رکھے گا۔ اسے لین دین میں پیسوں کا حساب بھی کرنا پڑے گا۔ وہ صرف اپنے گاؤں اور گاؤں کی حدود نہیں دیکھے گا۔ بلکہ صوبے اور ملک کی صورت حال کو بھی دیکھنا پڑے گا، اس لئے وہ مقامات جہاں اسکول کی تعلیم عام نہیں ہے، وہاں مدارس اسلامیہ کا نصاب اور ہوگا، جہاں اسکول کی تعلیم موجود ہے تو وہ دنیوی تعلیم اسکول کے حوالے کی جائے۔ مدارس

اسلامیہ کے پاس تو کل دو گھنٹے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ان دو گھنٹوں میں صرف دین ہی کی تعلیم وہ دے سکتے ہیں اور دوسری دینے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ کیا حاصل ہے جب اسکول انہیں وہ تعلیم دے رہا ہے مگر جن جگہوں پر اسکول کی تعلیم نہیں ہے وہاں مکاتب اسلامیہ میں بچے کی دنیوی ضرورت کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ پھر جب ابتدائی مرحلے کی تعلیم ختم کر کے ثانوی مرحلے کی تعلیم شروع ہو تو ثانوی مرحلے کا ایک بنیادی مقصد ہونا چاہیے اور ہوتا ہے اور اس کے پیش نظر نصاب بنتا ہے وہ مقصد کیا ہے۔ اس میں دین بھی ہے اور دنیا بھی ہے، اور دین میں غالب حصہ دین کا۔ اگر یہ بچہ ثانوی تعلیم مکمل کر کے ہائر ایجوکیشن میں جانا چاہے تو اس کے لئے راستے کھلے ہوں۔ اتنی استعداد ہو کہ وہ درجات عالیہ میں شریک ہو سکے اور وہ جو دنیوی تعلیم اس نے پیچھے حاصل کیا ہے، اس کی وہ ثانوی درجے میں تکمیل کرے۔ ہمارے یہاں مدارس عربیہ میں اتفاق سے ابتدائی مرحلے اور ثانوی مرحلے کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں ہے اور خط امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے ہم ثانوی مرحلے میں دنیوی تعلیم کا لحاظ نہیں کر سکتے۔ کہاں سے ثانوی تعلیم شروع ہوتی ہے، ہمیں یہ نہیں معلوم اور کس جگہ پر ثانوی ختم ہو کر عالیہ شروع ہوئی یہ ہمیں نہیں معلوم۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارا بچہ ذہین نہیں، یہ ہے کہ عربی چہارم تک ثانوی تعلیم اور پنجم سے عالیہ کی تعلیم شروع ہوئی تو مگر ہم عربی اول، دوم، سوم، چہارم ان چار سالوں کے اندر بچے کی دنیوی ضرورت کا کوئی علم نہیں رکھتے، بلکہ ہم نے ایسا نصاب بنایا ہے کہ وہ جو درجات عالیہ کی تعلیم شروع ہوگی تو وہاں کے وہ قابل ہوگا اور شاندار طریقے سے اس میں چلے گا، لیکن فرض کیجیے کہ ایک بچہ درجات ابتدائی کی تعلیم کے بعد چھوڑ دیتا ہے، آگے نہیں پڑھتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ درجات ثانویہ کی تعلیم حاصل کر کے چھوڑ دے آگے نہ پڑھے۔ آج اگر ہمارا بچہ چہارم کر کے چھوڑ دیتا ہے تو اس کے چار سال بے کار ہو گئے۔ کیوں کہ وہ چار سال تو تمہید ہے اگلے درجوں کے لئے اور وہ اگلے درجوں میں پڑھا نہیں۔ تو ہم ان چار سال کو ایک مقصو دبنائیں۔ جیسا کہ مولانا سالم قاسمی صاحب نے اپنے مقالے میں تقسیم کی تھی۔ اس تقسیم کے مطابق ہم ثانوی درجے کو مکمل حیثیت دیں اور اس درجے کے اندر ہم دو چیزوں کا لحاظ کریں۔ ایک تو ہمارا طالب علم اگر ہائر ایجوکیشن میں جانا چاہے تو اس کی پوری صلاحیت پیدا ہو اور وہ جو دنیوی تعلیم ابتدائی مرحلے میں اس نے حاصل کی۔ اس لئے اگر اس کے اندر کمی رہ گئی

ہے تو وہ کمی پوری کی جائے۔ ہندی میں کمی رہ گئی ہے تو وہ مزید ہندی پڑھ لے، حساب میں کمی رہ گئی ہے تو مزید حساب پڑھ لے، سائنس کا مضمون اگر اس نے نہیں پڑھا ہے تو اب سائنس کا سبجیکٹ اس میں شامل کیا جائے۔ یہ دنیا کے اندر کام آنے والے مضامین ہیں جو سیکنڈری اسٹیج میں ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد آخری مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ حقیقت میں مدارس عربیہ نہیں ہے جو تعلیم کا عالیہ درجہ ہے۔ یہ جو مدارس عربیہ کا آخری درجہ ہے اس سلسلے میں یہ گھر کی بات ہے اور آدمی اپنے گھر کی بات بہتر جانتا ہے تو گستاخی تو ہوگی، مگر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے مدارس عربیہ کی آخری تعلیم جو ہے اس کا بنیادی مقصد کیا ہے ثانوی مقصد اور ذیلی مقاصد کیا ہیں؟ کوئی بھی اصلاح یا تبدیلی کی بات شروع کی جائے گی تو جب تک بنیادی مقصد اور ثانوی مقاصد کو پیش نظر نہیں رکھا جائے گا، تبدیلی کی ضرورت ہے یا نہیں یہی طے کرنا مشکل ہوگا۔ پہلے ہمیں بنیادی مقاصد دیکھنے ہوں گے پھر یہ دیکھنا ہوگا ہمارے موجودہ مدارس کا جو نظام ہے اور اس سے جو پروڈکشن تیار ہو رہا ہے وہ ہمارے بنیادی مقاصد کو پورا کر رہا ہے یا نہیں اور وہ ثانوی ذیلی مقاصد پورے کر رہا ہے یا نہیں۔ نہیں کر رہا ہے تو ہمیں تبدیلی کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے ہم خواہ مخواہ کے لئے ایک لکیر پیٹ رہے ہیں اور اگر وہ تکمیل کر تو رہا ہے مگر اس میں کچھ کمی آئی ہے تو اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہ جو مدارس عربیہ کے بنیادی آخری درجے جو ہیں درجہ پنجم سے آخری درجہ تک ان کا بنیادی اور ثانوی مقصد کیا ہے۔ مدارس عربیہ کا بنیادی مقصد ہے ماہرین قرآن و حدیث اور مختصر لفظوں میں ماہرین شریعت نبویہ، شریعت اسلامیہ تیار کرنا، ایسے افراد تیار کرنا جو قرآن و حدیث پر ماہرانہ بصیرت رکھتے ہوں اور اس کے اندر وہ مکمل قرآن کریم اور احادیث کو سمجھے ہوئے ہوں۔ اس بنیادی مقصد کے لئے ہم جو علوم پڑھاتے ہیں وہ علوم دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ یہ علوم تو کہلاتے ہیں ہمارے یہاں ہمزہ سے علوم آلیہ اور ایک علوم کہلاتے ہیں "ع" سے علوم عالیہ یعنی یہ علوم وہ ہیں جن کو مقصود بنا کر پڑھا جاتا ہے اور ایک وہ علوم ہیں جنہیں وسیلہ اور ذریعہ بنا کر پڑھا جاتا ہے وہ مقصود بالذات نہیں ہیں اور ایک وہ علوم ہیں جو مقصود بالذات ہیں۔ علوم عالیہ یعنی وہ علوم جو مدارس میں مقصود بالذات بنا کر پڑھائے جاتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر اللہ کی کتاب ہے اور اس کو مزید تفصیل کریں تو اللہ کی کتاب اور رسول کی حدیثیں ہیں اسے پھیلائیں تو دونوں سے کھینچا ہوا عطر فقط اسلامی ہے اور ان تینوں علوم کو پڑھانے کے

لئے قرآن، حدیث، فقہ پڑھانے کے لئے ہمیں تین اور بنیادی علوم پڑھانے پڑتے ہیں، فقہ کے لئے اصول فقہ، حدیث کے لئے اصول حدیث اور تفسیر کے لئے اصول تفسیر۔ تو گویا چھ علم ہیں جو ہمارے بنیادی علوم ہیں۔ ہم اس کی پوری کوشش کریں کہ ان چھ علوم میں حسب استطاعت مہارت پیدا کرے۔

جامعات، یونیورسٹی ہو کالجز ہوں، آپ جانتے ہیں ان میں علم تفصیلی نہیں پڑھایا جاتا بلکہ علم حاصل کرنے کی استعداد بنائی جاتی ہے کہ اس سے وہ آگے علم کی تعمیر کرنا چاہے تو پوری زندگی پڑی ہے، اس کے لئے یونیورسٹی میں میڈیکل پڑھایا جاتا ہے تو سارا تھوڑے ہی پڑھایا جاتا ہے، صرف استعداد بنادی جاتی ہے۔ بنیادی باتیں بتائی جاتی ہیں، پھر وہ طالب علم پوری زندگی اکسپیرینس کرتا ہے اور اس کے بعد اسٹیڈی کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے، اور پوری زندگی گزر جاتی ہے تب بھی ماہر ڈاکٹر بعض مرتبہ نہیں بنتا۔ اسی طرح مدارس عربیہ کے اندر قرآن وحدیث میں ماہرانہ نظر سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ جو طالب علم فارغ ہو کر نکلا اسی وقت اس میں ماہرانہ استعداد ہو اور تین چار سال میں قرآن وحدیث میں کون ماہرانہ نظر پیدا کر سکتا ہے۔ یہ تو مدارس عربیہ نے استعداد بنائی ہے، اب وہ اس استعداد کو لے کر نکلے گا اور پوری زندگی وہ محنت کرے گا تب اس کے اندر ماہرانہ نظر پیدا ہو گی، میں اپنے طالب علموں سے ایک بات کہا کرتا ہوں کہ تمہیں ہم مدرسوں میں قرآن و حدیث نہیں پڑھاتے بلکہ ہم قرآن فہمی کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں اور مدرسوں سے فارغ ہو کر پورے دس سال اس طریقے سے مطالعے میں لگاؤ گے کہ تمہیں اپنے کھانے اور کپڑے کا ہوش نہ ہو تب تمہیں علم آنا شروع ہو گا اور تمہیں محسوس ہو گا کہ ہاں اب قرآن سمجھ میں آرہا ہے، حدیث سمجھ میں آرہی ہے۔

مجھے مولانا آزاد کی وہ بات بہت پسند آئی جو دوران گفتگو شاید مولانا اخلاق حسین صاحب نے فرمائی تھی لوگ مولانا کی بات کی حقیقت نہیں سمجھے۔ حضرت مولانا نے یہ مشورہ دیا تھا لڑکوں کو کہ اللہ کے بندوں! دین کو مقصود بنا کر پڑھو، ذریعہ بنا کر نہ پڑھو۔ آج ہمارے مدارس عربیہ کی سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ جو ہمیں کھلتی ہے، جو ہمارے نتیجوں کو ختم کر دیتی ہے، ہماری محنتوں پر پانی پھیر دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے طلبہ دین کو مقصود بنا کر نہیں پڑھتے ہیں ذریعہ بنا کر پڑھتے ہیں، اگر وہ مقصود بنا کر دین کو پڑھیں تو وہ فارغ ہو کر اس دین کو

چھوڑ کر کسی اور دھندے میں نہیں لگ جائے گا۔ کاروبار، کھیتی، تجارت میں لگ گیا، یہ نہیں کرے گا، کیوں لگ گیا دوسری جگہ، اس لئے کہ دین کو مقصود بنا کر نہیں پڑھا اور اگر دینی تعلیم میں لگا تو کتنے دن لگا، پانچ سال اور بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تو دس سال اور دس سال ہوتے ہوتے آدمی کو کمانے کی اور راہیں نظر آنے لگتی ہیں۔ جب اور راہیں اسے نظر آنے لگیں تو پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس میں لگ گیا تو آٹھ سال ہم نے محنت کی اور پانچ دس سال اس نے محنت کی اور پھر وہ سب چھوڑ کر دوسری لائن میں لگ گیا تو اس نے دین کو مقصود بنا کر کہاں پڑھا، مولانا نے شاندار بات کہی، اور یہ شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔

آپ جانتے ہیں جب حضور ﷺ نے طائف کے لئے ایک صحابی کو گورنر بنا کر بھیجا اور جب وہ جانے لگے تو حضور ﷺ نے ان کو جو آخری ہدایت دی تھی تو یہ دی تھی۔ "ایسا موذن رکھیو جو اذان پر تنخواہ نہ مانگے۔"

اتخذ موذناً لایا خذ علی اذانہ اجراً

یہیں سے مسئلہ بنا تھا۔ تمام طاعت، یعنی جتنے عبادت کے کام ہیں، اس پر اجرت لینا جائز نہیں۔ قرآن شریف پڑھانا، حدیث پڑھانا، اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ یہ تو مقصود بنا کر پڑھنے کی چیز ہے۔ اجرت کے لئے پڑھنے پڑھانے کی چیز نہیں ہے۔ ایک آدمی نماز پڑھا رہا ہے تنخواہ کے لئے، ایک آدمی اذان دے رہا ہے تنخواہ کے لئے، یہ حدیث شریف نے منع کیا ہے۔ لیکن جب حالات بدلے اور حالات بدلنے سے احکام بدلتے ہیں، جو دین کو مقصود بنا کر دین کی خدمت کر رہا ہے، پیٹ تو اس کے ساتھ بھی ہے، اس پیٹ کو کیسے بھرا جائے، تو کچھ حضرات وہ تھے جو اپنا سائیڈ بزنس رکھتے تھے، جیسے امام ابو حنیفہؒ کپڑا بیچتے تھے، امام خصافؒ کے بارے میں بتایا کہ وہ موچی تھے، جوتے گانٹھتے تھے اور زیادہ تر علماء وہ تھے جو دین اسلام کو مقصود بنا کر خدمت کرتے تھے اور حکومتِ وقت انہیں وظیفے دیتی تھی، جس سے ان کی ضروریات پوری ہوتی تھیں، اور فتویٰ یہ تھا کسی بھی دینی عبادت، نماز پڑھانے پر تنخواہ نہیں لے سکتے تھے۔ اذان دینے پر تنخواہ نہیں لے سکتے تھے، مگر جب حالات بدلے۔ ابھی اسلامی حکومت باقی تھی، ختم نہیں ہوئی تھی، دور عباسی باقی تھا مگر اس کے حالات بگڑ گئے، اس کا مالی نظام کمزور پڑ گیا، نتیجے میں اس کی توجہات دینی خدمات کی سمت بھی کم ہو گئیں اور صورت حال یہ ہوئی کہ لوگ دین کے کام چھوڑ کر دنیا میں لگے۔ اب مسئلہ آگیا اس طرح لوگ دینی کام

چھوڑ چھوڑ کر دنیا میں لگیں گے تو دین کی گاڑی کیسے چلے گی۔ وہ مرحلہ آیا جن مرحلوں میں فقہا نے حالات کے پیش نظر فتوی دیا کہ اب دین کا نظام چوں کہ اس پر موقوف رہ گیا ہے۔ لہذا جو طاعتیں ضروری ہیں جن سے دین کے نظام کی وابستگی ہے ان پر تنخواہ لینا جائز ہے، فتوی آج تک چلا آرہا ہے۔

لیکن ان موجودہ حالات میں اگر دین کو مقصود بنا کر سب لوگ پڑھنے لگیں اور دینی کام پر کوئی تنخواہ نہ لیں تو کیسے دین کی گاڑی چلے گی، اور کتنے اس لائن کے اندر لگے رہیں گے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے دین کو ذریعہ بنایا۔ ذریعہ بنانے تک تو کوئی حرج نہیں، لیکن ذریعہ بنانے تک اتنے دنوں تک جہاں تک لائن اچھی لگنے لگی۔ اس نے دینی تعلیم کو نقصان پہنچایا۔ تو یہ چھ علوم ہمارے یہاں مقصود بنا کر پڑھائے جاتے ہیں۔ ان چھ علوم کے علاوہ آٹھ، دس علوم ایسے ہیں جو ان کے لئے خاتم بنا کر پڑھائے جاتے ہیں مثلاً کوئی آدمی عربی زبان نہیں جانتا تو قرآن وحدیث کیسے سمجھے گا اور ایک عجمی آدمی عربی زبان اس وقت سیکھ سکتا ہے جب وہ صرف پڑھے، نحو پڑھے، لغت پڑھے، ادب پڑھے، اشتقاق پڑھے، ان کو پڑھے بغیر زبان نہیں آسکتی۔ اس لئے بہت سے علوم ایسے خاتم علوم ہو گئے جن کا پڑھنا ضروری ہے۔ ان کے بغیر دین کو نہیں سمجھ سکتے تو یہ علوم بڑھائے گئے۔ تو یہ تو تھے بنیادی علوم اور ثانوی علوم جو اس کے لئے مددگار کے طور پر تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے مدارس اسلامیہ کا ثانوی مقصد تھا کہ جب ایک آدمی دین میں ماہر تیار ہوا ہے تو دنیا کے اندر جب وہ دین لے کر دوسروں تک پہنچے گا تو اس کو مختلف چیزوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یعنی باطل ازم ان کے سامنے آئیں گے تو ان باطل ازم کی کیسے وہ تردید کریں گے، تو ایک سبجیکٹ ہمارے یہاں یہ پڑھایا گیا اور تقریر دل میں یہ بات آتی ہے کہ فلسفہ قدیمہ اور فلسفہ جدیدہ۔ ہمارے یہاں کوئی فلسفہ نہیں پڑھایا جاتا ہے بلکہ ردّ فلسفہ پڑھایا جاتا ہے۔ فلسفہ یعنی یونان کا فلسفہ ایک پورا ایک کمپلیٹ آئیڈیل ہے یعنی اس میں الٰہیات کی، عنصریات کی، فلکیات کی بحثیں ہیں اور مابعد ام الاجسام کی بحثیں ہیں۔ یعنی پوری دنیا و آخرت کے تمام معاملات پر وہ فلسفہ حاوی ہے۔ یہ جو یونان کا فلسفہ تھا اس میں کچھ صحیح باتیں ہیں اور کچھ غلط ہیں۔ چوں کہ ان کی تمام باتیں اسلام کے مطابق نہیں ہوں گی۔ ہمارے مدرسے میں ایک یا دو کتابیں ہیں۔ ہدیہ سعیدیہ ہے، بدایۃ الحکمۃ ہے۔ یہ بطور تمہید ہم پڑھاتے ہیں تاکہ ہمارا طالب علم اس فلسفہ یونان کو سمجھے اور جب اس نے سمجھ لیا تو آخر میں

ہم دیگر کتب پڑھاتے ہیں۔

ایک کتاب ہے کہ جو بھی غلط بات ہو گی، فلسفہ قدیمہ کی ہر بات کو توڑ کر برابر کر دے گی۔ یعنی اتنے اعتراض کرے گا کہ دلیل سے کسی درجے میں اسے باقی نہیں رکھے گا۔ تو ہم یہ فلسفہ رد فلسفہ پڑھاتے ہیں، اور جب ہمارا یہ طالب علم پوری تیاری کر چکا ہے کہ یہ ایک فلسفہ ہے جس کی یہ بات اسلام سے ٹکراتی ہے تو ہمیں یوں رد کرنی ہے تو اب جب ہمارا طالب علم نکلتا ہے اور دنیا کا کوئی بھی فلسفہ اس کے سامنے آتا ہے۔ تو وہ جو اس نے ریہرسل کر رکھی ہے اس کی روشنی میں وہ ہر جگہ رد کرتا ہے۔ آج دنیا میں بہت سے ازم ہیں، کمیونزم ہے، مارکسزم ہے، کیپٹلزم ہے، لیکن یہ جتنے ازم ہیں یہ تمام گوشوں پر حاوی نہیں ہیں، کسی کا ایک اکانومک نظریہ ہے، صرف الٰہیات سے کوئی تعلق نہیں اگر الٰہیات سے کوئی تعلق ہے تو عنصریات سے کوئی تعلق نہیں تو ہمارے لئے دشواری یہ ہے کہ اگر فلسفہ جدیدہ پڑھائیں تو فلسفہ جدیدہ پڑھانے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم فلسفہ قدیمہ پڑھاتے ہوں، ہم تو ان کی تردید پڑھاتے ہیں اور اگر باطل ازم کی تردید میں کوئی ایسی کتاب لکھی گئی ہو تو ہمیں پہلے یہ پڑھانی چاہئے کیوں کہ پرانے فلسفے کو رد کرنا سکھایا جا رہا ہے اس کے بجائے اگر باطل نظریئے کو رد کرنا سکھایا جائے تو یہ اور اچھی بات ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسی کتابیں نہیں ہیں، اور کتابیں نہ ہونے کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا باطل ازم نہیں ہے جو دنیا کے تمام گوشوں پر حاوی ہو، ایسا ازم تو فلسفہ قدیمہ ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں منطق جو پڑھائی جاتی ہے تو اس کا کوئی مقصود نہیں ہے ہمارے یہاں یہ طے ہے کہ اس کے ذریعہ تشخیص، اذہان، ذہن کو ہائی کرنا، بلند کرنا مقصد ہے۔ جب یہ مقصد ہے تو آپ کوئی ایسا علم رکھیں، جس سے طالب علم کے ذہن کا معیار بڑھے۔ منطق فی نفسہ، کوئی علوم اسلامیہ میں نہیں ہے، مقصد فقط طالب علم کا ذہنی لیول بڑھانا ہے۔

تو یہ درجات عالیہ کی تعلیم پر غور کریں گے تو توحید مطلب ہے۔ پیشِ نظر قرآن و حدیث اور فقہ ہے اور اسی کے پیشِ نظر تمام چیزیں پڑھائی جاتی ہیں۔

# دینی مدارس اور وقت کی ضرورت

محمد تقی رحیم' (پٹنہ)

مولانا آزاد صدی تقریبات کے سلسلے میں خدا بخش لائبریری کی جانب سے منعقدہ آخری تقریب ۷ مئی سے ۹ مئی تک رانچی میں منائی گئی۔ دنیا بھر میں صرف رانچی کے شہر ہی کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہاں مولانا آزاد کو مسلسل چار برسوں تک نظر بند رہنا پڑا تھا۔ ورنہ سن شعور کے بعد تو مولانا کو کسی ایک مقام پر کبھی دو چار مہینے بھی دم لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ غالبًا کلکتہ میں بھی نہیں' اس کے ماسوا رانچی میں ان کا اپنا قائم کردہ ایک ادارہ مدرسہ اسلامیہ آج بھی قائم اور محفوظ ہے۔ اس طرح کی ان کی کوئی دوسری یادگار کسی اور جگہ پر موجود نہیں۔ چناں چہ ان نسبتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے آزاد صدی کے سلسلے میں ایک تقریب مولانا کی یاد میں رانچی میں منعقد کرنا انتہائی ضروری تھا۔ ملک و ملت پر عائد اس فرض کفایہ کی طرف خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ڈائریکٹر عابد رضا بیدار صاحب کا دھیان گیا اور انہوں نے اس تقریب کو اس شان اور سلیقے سے انجام دیا کہ آزاد صدی رانچی کی یہ تقریب وہاں کی شہری زندگی پر دور رس اثر ڈالنے والا ایک تاریخی واقعہ بن گیا۔

مولانا آزاد کے قائم کردہ ادارہ مدرسہ اسلامیہ رانچی اور اس کے تدریسی نظام کے متعلق ان کے خیالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے خدا بخش لائبریری کے سربراہوں نے اس تقریب کے موقع پر مدرسوں کے نظام تعلیم اور ان کی اصلاح پر غور و فکر کرنا ضروری سمجھا چناں چہ خاص طور پر اسی کو بحث کا موضوع بنایا اور اس سلسلے میں انہوں نے ملک بھر کے جدید و قدیم ماہرین تعلیم اور مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے خیالات سے دل چسپی رکھنے والے مدیروں اور دانش وروں کو اس تقریب میں شریک کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی۔

مدبرین میں سے بہار کے گورنر عزت مآب یونس سلیم صاحب نے تینوں دن اس کے ہر اجلاس کی صدارت بڑی ہی تن دہی اور مستعدی کے ساتھ کی اور ہر سیشن میں اپنے خطبہ صدارت کے ذریعہ مفید مشوروں سے بحث کو مثبت اور صحت مند رخ پر قائم رکھا۔ وہ تو خیر خدا بخش لائبریری کی ایڈوائزری کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ آندھرا کے گورنر عزت مآب کرشن کانت نے بھی اس تقریب میں پورے ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ حصہ لیا۔ یوپی کے گورنر ریڈی صاحب صرف پہلے دن کے دونوں اجلاسوں میں شرکت کر سکے لیکن دونوں اجلاسوں میں حاضرین کو اپنے مشوروں سے فیض یاب کیا۔ کرشن کانت جی تینوں دن شریک رہے اور ہر اجلاس میں بحث میں پوری دل چسپی سے حصہ لیا۔ ان کے علاوہ پنڈت سندر لال کی زندہ مثالی تصویر جناب بی این پانڈے سابق گورنر اڑیسہ و پنجاب و جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی سابق گورنر بہار بھی اس تقریب میں شریک تھے اور انہوں نے تینوں دن ہر اجلاس میں ایوان کو اپنے خیالات سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ پانڈے جی تو خاص طور پر ماضی کو یاد دلا کر ہر نشست میں خود بھی روئے اور حاضرین کو بھی رلایا۔ ان کے علاوہ پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس سید سرور علی اور مشہور مجاہد آزادی کرنل محبوب احمد سابق سفیر حکومت ہند و انڈونیشیا بھی تینوں دن اس مجلس میں شریک رہے اور ہر نشست میں گرم جوشی کے ساتھ بحثوں میں حصہ لیا۔ بہر کیف! یہ بات بڑی ہمت افزاء اور مستقبل کے لئے بڑے نیک شگون کی حامل ہے کہ مدرسوں کے نظام تعلیم جیسے موضوع پر مباحثہ میں جسے صرف مسلمانوں کا دینی مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ تین گورنروں اور دو سابق گورنروں نے کھل کر اور دل جمعی کے ساتھ حصہ لیا۔ جن میں تین ہندو اور دو مسلمان تھے۔

ماہرینِ تعلیم جدید میں سے انور جمال قدوائی سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ کے علاوہ بہار کی تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی تقریب میں شریک تھے۔ اس کے ساتھ بہار کی کئی یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں کے متعدد حالیہ اور سابق صدر بھی شریک تھے۔ بیرون بہار کی یونیورسٹیوں کے نمائندوں نے بھی مباحثوں میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیا۔ اس تقریب کا افتتاح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو کرنا تھا مگر وہ علالت کے باعث تشریف نہ لا سکے تھے پھر بھی ایک نہایت ہی جامع اور پر مغز خطبہ افتتاحیہ انہوں نے بھیج دیا تھا جسے ان

کی طرف سے بیدار صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ قدیم علوم کے ماہرین تعلیم میں سے بہار اور بیرون بہار خصوصاً یوپی کے بھی ملتب خیال کے علماء اس تقریب میں شریک تھے اور سبھوں نے بڑے ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ اس کی کارروائیوں میں حصہ لیا۔ خانقاہوں میں سے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، خانقاہ ابوالعلائیہ پٹنہ سٹی، خانقاہ منعمیہ قمریہ پٹنہ سٹی، خانقاہ حسینیہ پٹنہ سٹی کی نمائندگی بھی اس تقریب میں تھی۔ انسان اسکول کشن گنج کے ڈائریکٹر اور حکومت ہند کے تعلیمی ایڈوائزری بورڈ کے ممبر اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے نمائندے بھی یہاں موجود تھے۔ غرض یہ کہ قدیم و جدید علوم کے ماہرین اور مدبرین قوم کا اتنا بڑا اور ایسا اچھا اجتماع اس موقع سے رانچی شہر میں ہو گیا تھا کہ اسے صحیح معنوں میں ایک تاریخی اجتماع کہا جاسکتا ہے اور اس میں شریک تمام نمائندوں نے تعلیمی نظام میں اصلاح جیسے نزاعی سوال پر جس سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ کھل مل کر اور پوری آزادی سے آپس میں بحث کی اسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کا اجتماع آزادی کے بعد اب تک غالباً کہیں پر بھی نہیں ہوا تھا۔ موجودہ دور میں بہار کے مسلمانوں کو عوامی زندگی سے متعلق کئی معاملوں میں پہل کرنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی تعلیمی پسماندگی دور کرنے میں پہل کرنے کا فخر بھی ان ہی کو حاصل ہوگا۔ کہنے کی حاجت نہیں کہ اس اجتماع کو ایسی شاندار کامیابی مولانا آزاد کے نام کی برکت اور خدا بخش لائبریری کے سربراہوں اور کارکنوں کی لگن اور مستعدی کی کرامت کی بدولت حاصل ہوئی لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کے اندر پیدا اس عمومی بیداری کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے جو ان میں اپنے آپ کو حالات کے مطابق تبدیل کرنے اور وقت کے تقاضوں کا صحیح جواب دینے کے متعلق پیدا ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخی اجتماع کو کامیاب بنانے میں مسلمانوں کے اندر پیدا بیداری کے اس جذبے کا بڑا اہم رول تھا۔

نظام تعلیم پر مباحثہ کے دوران گرچہ علماء میں سے کچھ ایک نے بحث کے رخ کو درس نظامیہ اور درس عالیہ کی طرف موڑ دینے کی کوشش کی لیکن مجموعی طور پر بحث درس نظامیہ اور درس عالیہ بلکہ دیوبند، ندوہ، بریلی اور فرنگی محل کے تنگ دائرے سے اوپر اٹھ کر علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کے نظام کو سمیٹتے ہوئے زیادہ بلند تر اور وسیع تر جہت میں ہوئی۔ بلکہ خود جناب صدر یونس سلیم صاحب گورنر بہار نے جامعہ ملیہ اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے نظام تعلیم

سے متعلق واقفیت فراہم کرتے ہوئے اس بحث کو ہندوستان گیر جہت عطا کرنے میں خاصی مدد کی اس کے ساتھ ہی اس بحث سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ہمارے علماء کو اس بات کا بڑا مضبوط احساس ہے کہ اس دور زوال میں دینی تعلیم اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا اصل کام ان کے مدارس ہی انجام دے رہے ہیں۔ پھر بھی ہمارے نفس بدبیں کو ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے علماء کرام کو اپنے نظام تعلیم کے ان کارناموں کا بھرپور احساس نہیں ہے جو اس نے دنیا کی اندر بلالحاظ مذہب وملت علم کی روشنی پھیلانے میں انجام دیا۔

اگرچہ مدرسہ تاج المساجد بھوپال کے مولانا حبیب ریحان ندوی نے اپنے مقالہ کا خلاصہ پڑھتے وقت یہ فرمایا تھا کہ اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یورپ میں علم کی روشنی پھیلانے میں مسلمانوں نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس جلسہ میں شریک دوسرے علماء کرام کو بھی یقیناً اس کا بڑا مضبوط احساس ہوگا کہ ہم ان بزرگوں کے علم ودانش کے وارث ہیں جنہوں نے اپنے دور میں ساری دنیا کو علم کے نور سے منور کردیا تھا لیکن اس کوتاہ نظر کو مدرسہ کے نظام تعلیم کی اصلاح پر بحث کے دوران کہیں پر اس عزم و احساس کی کوئی جھلک بھی نہیں دکھائی دی کہ ہمیں اپنی درس گاہوں کے نظام تعلیم میں ایسی اصلاح کرنی ہے کہ ان سے کافر ومشرک اور ملحد غرض یہ کہ تمام غیر مسلم بھی اسی طرح سے فائدہ اٹھا سکیں جس طرح سے قرون ماضی میں ان کے اجداد ہمارے نظام تعلیم سے فائدہ حاصل کرتے تھے۔

مدرسوں کے نظام تعلیم پر گفتگو کرتے وقت ہمیں اس بات کو برابر دھیان میں رکھنا چاہئے کہ اس نے ہمارے عروج کے دور میں اگر ایک طرف رازی' غزالی' علامہ ابن تیمیہ' مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ جیسے متقی اور پرہیزگار علماء کو پیدا کیا تو دوسری طرف معری' ابن رشد' ابن خلدون' بو علی سینا' خیام' البیرونی' فیضی اور محب اللہ بہاری جیسے آزاد خیال محققین اور مفکرین نیز نظام الملک طوسی' شیر شاہ' ابوالفضل اور اورنگ زیب جیسے باصلاحیت حکمراں اور ایڈ منسٹریٹر بھی پیدا کئے' یہاں تک کہ ہندوستان کے اندر مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بھی جب آپس میں خانہ جنگی اور طوائف الملوکی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم بے نہایت کے باعث پورے ملک میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا تو اسی نظام تعلیم نے علم کے چراغ کو روشن رکھتے ہوئے اگر ایک طرف سید احمد شہید' شاہ اسماعیل شہید' مولوی ولایت

علی و عنایت علی صادق پوری، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی جیسے متقی، پرہیزگار اور کٹر عدم تعاونی علماء کو پیدا کیا تو دوسری طرف سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی چراغ علی نواب محسن الملک اور وقار الملک جیسے آزاد خیال مفکرین و محققین اور پکے تعاونی علماء کو بھی پیدا کیا جنھوں نے اپنی ساری علمی وذہنی قوت مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے میں لگادی اور اس میں سے بیشتر خود بھی بڑے ذی صلاحیت ایڈمنسٹریٹر ثابت ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سارے ملک کے براہ راست برطانوی سامراج کے تسلط میں آجانے اور اوپری طبقہ کا انگریزی تعلیم کی طرف عام جھکاؤ پیدا ہو جانے پر بھی اس نظام تعلیم نے ہمارے درمیان سے ایسے بلند پایہ علماء پیدا کئے جن کے اندر صرف دینی ہی نہیں دنیاوی معاملات میں بھی رہنمائی کی بھرپور صلاحیت تھی۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمود الحسن، حکیم اجمل خان، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سجاد حسین، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ ان علماء میں سے تھے جن کی علم و دانش اور فہم وبصیرت کا سکہ ملک کے انگریزی داں حلقوں پر بھی پوری طرح سے جما ہوا ہے گرچہ اپنے اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق انہوں نے اپنے کام کے میدان جدا جدا منتخب کئے تھے لیکن اپنی علمی صلاحیت اور اعلیٰ قیادت کا انگریزی داں حلقوں سمیت سارے ملک کو قائل کر دیا تھا۔ ان میں سے مولانا محمود الحسن، حکیم اجمل خان، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے برطانوی سامراج کو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر اس کے خلاف جہاد کرنے پر زیادہ زور دیا اور اس طرح سے قومی سیاست میں اتنا اونچا مقام حاصل کیا جہاں اونچے سے اونچے درجے کے انگریزی دانوں کے لئے پہنچنا بھی مشکل تھا بلکہ مولانا آزاد نے تو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے اس ملک کے اندر جدید ٹیکنالوجی اور سائنس کو فروغ دینے کی ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کر دی کہ آج ہندوستان اس معاملے میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی ہمسری کا دعویٰ کر رہا ہے۔

مگر اس معاملے کا اس سے بھی زیادہ اہم دوسرا پہلو یہ ہے کہ آج ہندوستان کے دوسرے فرقوں خصوصاً ہندوؤں کے اندر علم کی جو روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بھی اصل میں اسی مدرسہ کے نظام تعلیم کا فیضان ہے۔ یہ بات ہندوستان کے سب ہی پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم ہے

کہ ہندو نشاۃ ثانیہ کے باوا آدم راجہ رام موہن رائے اسی نظام تعلیم کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو آسانی سے پتہ چل جائے گا کہ انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جن بزرگوں نے بھی ہندوؤں یا اس ملک کے دوسرے فرقوں کے درمیان تعلیمی اور اصلاحی کاموں کو شروع کیا ان میں سے اگر سب نہیں تو بیشتر مدرسہ ہی کے تعلیم کی پیداوار تھے۔ تحقیق کے جھیڑوں میں پڑے بغیر بھی ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی جب زمام کار کلی طور پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ شمالی ہندوستان کے اندر صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ اونچے مرتبہ پر پہنچنے والے زیادہ تر ہندوؤں کی تعلیم و تربیت بھی مولوی صاحبان کی زیر نگرانی مکتبوں اور مدرسوں ہی میں ہوئی تھی انہوں نے انگریزی تعلیم بعد میں حاصل کی اور پھر اپنے پیشوں میں نام پیدا کیا۔ ملک کے عظیم سیاسی رہنماؤں میں سے لالہ لاجپت رائے' پنڈت موتی لال نہرو' سرتیج بہادر سپرو' چتنا نند سنہا اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا شمار تو اردو اور فارسی کے فضلا میں ہوتا ہے۔ ملک کے مشہور کسان رہنما سوامی ہیمانند سرسوتی بھی اسی نظام تعلیم کی پیداوار تھے اور مشہور کمیونسٹ رہنما ایس اے ڈانگے کو بھی فارسی کا اسکالر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بہار کے پہلے ہندوستانی انسپکٹر جنرل آف پولیس الکھ بابو اور بہار کے گورنر کی ایگزیکٹو کونسل کے پہلے ہندوستانی ممبر بابو کشن سہائے کی تعلیم بھی کریمایا مقیماں ہی سے شروع ہوئی تھی۔ جے پرکاش بابو کی والدہ محترمہ ہندی نہیں جانتی تھیں اس لئے رامائن کا پاٹھ اردو رسم الخط میں چھپی تلسی کرت رامائن سے کرتی تھیں۔

اصل میں ہندو سماج کے اندر عام تعلیم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ غیر برہموں میں تعلیم مسلمانوں کے اثر اور کوشش سے پھیلی کیونکہ پنڈتوں کے برخلاف مولوی صاحبان کے مکتبوں اور مدرسوں کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے تھے اور خاص کر مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جب ابتدائی تعلیم کا کوئی انتظام حکومت کی طرف سے نہیں رہا تو علم کے پیاسوں کے سامنے مکتبوں اور مدرسوں کی طرف رخ کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ بہر کیف ہمارے علماء کرام کو سب سے پہلے تو اپنے اندر یہ احساس پیدا کرنا چاہیئے کہ ہمارے ملک کے اندر اس وقت علم کی جو کچھ اور جتنی روشنی بھی ہے اسے یہاں پھیلانے میں ہمارے بزرگوں کی تعلیمی خدمات کا بہت بڑا رول رہا ہے اور انہوں نے اپنے اس

فرض کو بڑے ہی کٹھن اور ناموافق حالات میں انجام دیا تھا۔ تب اس کے بعد مدرسوں کے نظام تعلیم میں اصلاح کے متعلق غور و خوض کرنا چاہیئے۔ مگر اس سلسلے میں بلاامتیاز مذہب و ملت اپنے ملک سے جہالت کو ختم کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کا جو فرض ہم پر عائد ہوتا ہے اس پر دھیان دینا بھی بہت ضروری ہے۔ ماضی میں ہمارے نظام تعلیم نے اس ملک کے غیر مسلموں کو جو فیض پہنچایا ہے اسے دھیان میں رکھے بغیر ہمارے اندر یہ خیال پیدا ہی نہیں ہو سکتا ہے کہ آج بھی اس ملک سے عمومی جہالت کو ختم کرنے میں ہمارے نظام تعلیم کو اہم رول انجام دینا ہے۔

اس اجتماع میں یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کے متعلق جو بحث ہوئی اور جس میں جدید تعلیم کے خاصے اونچے درجہ کے ماہرین نے حصہ لیا۔ اس سے تو یہی معلوم ہوا کہ جدید نظام تعلیم بھی ناکام ہی ثابت ہو رہا ہے اس میں بھی بنیادی تبدیلیوں کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہاں پر ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی بات چھوڑ کر صرف ابتدائی تعلیم سے متعلق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کا سرکاری نظام کم از کم ہمارے بہار میں تو کلی طور پر ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ ملک کے دستور اساسی کے بموجب حکومت کو پندرہ برسوں کے اندر یعنی ۶۵ء تک ہر بچے اور ہر بچی کے لئے مفت ابتدائی تعلیم کا انتظام لازمی طور پر کر دینا تھا مگر آج تک پچاس فیصد بچوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام بھی حکومت نہیں کر سکی ہے اور جو انتظام اس نے کیا بھی ہے اسے عوامی سطح پر کلی طور سے رد کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ خود حکومت کے چپراسی سے لے کر چیف سیکریٹری تک اور ایک معمولی شہری سے لے کر چیف منسٹر تک کوئی بھی اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم کے لئے سرکاری اسکولوں میں نہیں بھیجتا ہے۔ سرکاری پرائمری اسکولوں میں صرف نادار، غریب اور بے وسیلہ عوام الناس کے بچے جاتے ہیں جہاں کسی طرح کی بھی پڑھائی نہیں ہوتی۔ اس کا اقرار خود ہمارے حکمرانوں کو بھی ہے۔ اس کے برخلاف اس گئی گزری حالت میں بھی مکتبوں میں تعلیم بھی اچھی ہوتی ہے اور بچوں کی اخلاقی تربیت بھی بہتر ہوتی ہے۔ اس کا احساس صرف مسلمانوں ہی کو نہیں غیر مسلموں کو بھی ہے۔ لیکن ہم نے ان کے بچوں کے لئے اپنی تعلیم گاہوں کے دروازے بند کر رکھے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنے نظام تعلیم میں اصلاح کر کے غیر مسلم بچوں کی تعلیم کے لئے بھی گنجائش نکالیں تو کم از کم ابتدائی تعلیم کے حصول کے لئے ہندو بچے اور بچیاں بھی بڑی تعداد میں ہمارے مکتبوں میں

داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ نادار اور پس ماندہ ہندو عوام کے بچوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام سرکار ابھی تک نہیں کر سکی ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں علماء کرام کے سامنے ہم نے یہ رائے پیش کی تھی کہ فی الحال ابتدائی تعلیم کو ٹھوس بنانے کے لئے مکتبوں کے نظام کو وسیع اور درست کیا جائے اور تجربہ کے طور پر پہلے بہار میں اس کام کو ہاتھ میں لیا جائے۔ یوں تو جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا۔ بہار میں ابتدائی تعلیم کا سرکاری انتظام گویا پوری طرح سے ناکام ثابت ہو چکا ہے اس کے ماسوا سرکاری پرائمری اسکولوں کے اندر اردو میں تعلیم دینے کا حسب خواہ اور حسب ضرورت انتظام بھی نہیں جبکہ مسلمان ابتدائی تعلیم اردو ہی میں حاصل کرنا چاہتے ہیں اس معاملے میں ایک دوسری دقت مسلمانوں کے سامنے یہ بھی ہے کہ سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام ممکن نہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے مرحلے ہی پر ہمارے بچے نماز' روزہ اور قرآن خوانی سے آشنا ہو جائیں۔ لہذا مسلمان مجبور ہیں کہ اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مکتبی نظام تعلیم کو باقی اور جاری رکھیں۔

چناں چہ بہار میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم حقیقتاً مکتبوں کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ سرکاری پرائمری اسکولوں کے ذریعہ نہیں' ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ریاستی انجمن ترقی اردو کی جدوجہد کی بدولت یہاں کے ثانوی اسکولوں میں اردو کی تعلیم جاری رکھنے کا موقع حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ دوسری ریاستوں کی بہ نسبت بہار میں اردو تعلیم کا زیادہ رواج ہے۔

اب تو خیر اردو کو یہاں دوسری سرکاری زبان کا درجہ بھی مل گیا ہے اس لئے اردو زبان کے ساتھ مکتبی نظام تعلیم کو فروغ دینے کے لئے بھی یہاں زیادہ مواقع اور سہولتیں حاصل ہیں اس لئے یہاں بہار میں ہمیں پوری خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے اور ایک ایجوکیشن بورڈ بنا کر مکتبی نظام تعلیم کو باقاعدگی کے ساتھ ریاست گیر پیمانے پر قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مکتبوں اور سرکاری پرائمری اسکولوں کے نصاب میں بھی اس کے سوا اور کوئی فرق نہیں کہ مکتبوں میں ابتدائی مذہبی تعلیم کا کورس بھی ہے۔ جسے مسلمان ہر حال میں ضروری سمجھتے ہیں یہاں تک کہ سرکاری ماڈرن پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو بھی گھروں پر یا دوسرے طریقوں سے مقدور بھر مذہبی تعلیم سے آشنا کر دینے کی عام طور پر ضرور کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے اگر سرکاری پرائمری اسکولوں کے نصاب تعلیم کو دھیان

میں رکھتے ہوئے مکتبی نظام تعلیم کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس سے غیر مسلم بچے بچیاں بھی فیض یاب ہو سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مکتبوں کی بہتر تعلیم کو دیکھتے ہوئے ہندو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ کہنے کی حاجت نہیں کہ ہندو عام طور پر ہندی پڑھنا چاہیں گے اس لئے مکتبوں میں ہندی پڑھنے کا انتظام بھی کرنا ہوگا اور خوشی کی بات ہے کہ علماء اپنے نصاب میں ہندی کو شامل کر لینے پر بالکل آمادہ ہیں۔ بہر حال مکتبوں میں ہندی پڑھانے کا انتظام کرنے میں کوئی خاص دشواری نہ ہو گی۔ ہاں مذہبی تعلیم کی جگہ پر ہندوؤں کے لئے اردو کی حروف شناسی کو لازمی قرار دینا ہوگا۔ اسی طرح سے مسلمان بچے بچیوں کو جو عموماً اردو پڑھیں گے دیوناگری رسم الخط سے واقف کرادیا جائے گا۔ باقی حساب وغیرہ دوسرے مضامین سبھوں کے لئے ایک ہی رہیں گے۔ ہاں مسلمان بچوں کو صرف ابتدائی مذہبی تعلیم الگ سے دینی ہوگی۔

اگر اپنے سماج کے اندر پھیلی عمومی جہالت کو ختم کرنے کے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے اپنے مکتبی نظام تعلیم کو وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے اس طرح مرتب کر لیا اور علم کی روشنی کو عام کرنے کی غرض سے اسے بہار میں لے کر پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں ہم حکومت کی مدد حاصل نہ کر سکیں بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس کار خیر میں ہمیں یونیسکو اور اسی طرح کے دوسرے بین الاقوامی اداروں کی مدد بھی ملے گی۔ بہار پر ہم اس لئے زور دے رہے ہیں کیونکہ آزادی کے بعد بہار کے مسلمانوں نے دوسری ریاستوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ جان داری کا ثبوت پیش کیا ہے اور خاص کر اردو کے معاملے میں تو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے بار بار حکومت سے ٹکر لے کر یہاں اسے اردو آبادی کے حقوق و مطالبات کو ماننے پر مجبور کیا ہے۔

# مدارس عربیہ کے نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح

مولانا محمد یحییٰ ندوی
(بیگو سرائے، بہار)

عربی دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح پر یہ سیمینار ہو رہا ہے جو وقت کے اہم تقاضوں میں ہے۔

مولانا آزاد نے فروری ۱۹۴۷ء میں عربی و فارسی کے علماء کے سامنے خطبہ دیا تھا اس کے اقتباس سے اپنے خیالات کی ابتداء کر رہا ہوں۔

سب سے بڑا بنیادی انقلاب جو پڑھنے کے طریقے میں ہم کو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت قدما یعنی پچھلوں کے طریقہ تعلیم کا ایک خاص ڈھنگ تھا، وہ طریقہ تعلیم آہستہ آہستہ بدلنے لگا ہے۔ ہندوستان میں باضابطہ طور پر اصلاح نصاب و تعلیم کے لئے ایک انجمن قائم ہوئی تھی جس کا نام ندوۃ العلماء ہے جس نے اصلاح نصاب و تعلیم پر ایک مدرسہ قائم کیا تاکہ لوگوں کو بتایا جائے کہ نئے نصاب تعلیم سے کیا کیا فوائد ہوں گے۔ ہمارے علوم کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ ایک فنون آلیہ، ایک نفس علوم، نفس علوم، تفسیر، حدیث فقہ و عقائد کے ضروری مسائل۔

نفس علوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی کیوں کہ انہیں علوم پر مذاہب اسلام سے واقفیت منحصر ہے۔ ہاں طریقہ تعلیم میں کمی و زیادتی کر سکتے ہیں۔ حدیث کے ابواب فقہ پر بہت زور دیا جاتا ہے انہیں کم کر کے اخلاقیات اور حالات حاضرہ کے پیش شدہ حالات پر احادیث کی بھی تعلیم ہونی چاہئے۔

تفسیر کے سلسلہ میں زیادہ عرض کرنا نہیں ہے صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید کے

ترجمہ کو بنیاد بنا کر اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ تفسیر جلالین کے نصف یا مکمل پڑھانے اور اس کے بعد تفسیر بیضاوی کے سورہ بقرہ تک پڑھانے سے تفسیر و متعلقہ علوم قرآن سے کماحقہ فائدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ متعلقہ علوم قرآن کی تشریح کرنے سے یہ مضمون پھیل جائے گا۔ اس لئے مختصراً عرض کر دیا۔

فقہ کی تعلیم کا نصاب ہمارے یہاں مکمل ہے' اب کچھ ابواب کی زیادتی ہونی چاہیئے کہ جن سے ہماری زندگی دوچار ہو رہی ہے اور پرانی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

## اصول فقہ

**عقائد** ہمارے مذہب میں اس کی حیثیت بنیادی ہے۔ ایسی کتاب درس میں جس میں مسائل ضروریہ ہوں ان میں اختلافی مباحث کا ذکر نہ ہو۔

دراصل اصلاح کی ضرورت علوم آلیہ میں ہے۔

صرف' و نحو منطق و فلسفہ' ہیئت' ریاضی' ان علوم میں اصلاح کی ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ میں قدرے تفصیل سے عرض کر رہا ہوں مولانا آزاد نے اپنے خطبہ میں اسی کا ذکر کیا ہے صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں مادری زبان میں ہوں تاکہ طلبہ فارسی کے بوجھ سے بچ جائے۔

درس نظامی میں صرف کی بہت زیادہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ میزان و منشعب' پنج گنج' علم الصیغہ اور فصول اکبری اتنی کتابیں نہ ہوں' عربی ممالک کے یہاں صرف کا جو نصاب ہے ان کو رائج کیا جائے۔ زیادہ تمرینیات پر ہو لڑکوں کے بار بار ذکر کرنے سے مسائل کا استحصال ہوتا ہے۔ یہی حال نحو کا ہے۔ تمرینیات پر زیادہ زور ہو کیونکہ عبارتوں کا صحیح پڑھنا قواعد نحو پر منحصر ہے۔ ہمارے دینی مدارس میں ہندی تعلیم کی کمی ہے۔ طلبہ کے اندر ہندی لکھنے پڑھنے کی پوری صلاحیت پیدا کی جائے تاکہ یہ کمی نہ رہے۔

قدیم منطق و فلسفہ کی ایک ایک کتاب ضرور ہو۔ ہمارے کچھ متقدمین و متاخرین کی کچھ کتابیں اس طرز کی ہوں کہ مطالعہ کرنے میں دقت محسوس نہ ہو۔

حالات کے تحت علم معاشیات و سماجیات' حساب' فلسفہ جدید اور سائنس کی کتابیں ہوں جو نہایت ہی ضروری ہیں۔

دینی مدارس کا دروازہ ہندو طلبہ کے لئے کھلا رہنا چاہیے' ان کو پڑھانے کی کوشش ہونی چاہیے۔

دینی مدارس میں ہندو مذہب کی پوری واقفیت کرائی جائے۔

ہماری باتیں اس وقت تک کامیاب نہیں جب تک یہ دو باتیں نہ ہوں۔

(۱) اصلاح نصاب کے لئے علماء کا ایک بورڈ ہو' ایسے علماء کا جن کی نظر سے درس کے ساتھ ہر فن کی کتابیں گزر چکی ہوں۔ اصلاح شدہ نصاب اس وقت کامیاب ہے جب کہ اس کا مظہر ہو اور اس کے مظہر کے لئے اس طرح کے مدارس قائم کئے جائیں اور لوگوں کو بتایا جائے کہ موجودہ نصاب کے پڑھے ہوئے طلبہ کامیاب ہیں۔

انجمن ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب کا ایک مدرسہ کھولا جو ان ہی تک محدود رہا یا رکھا گیا ملک میں اس کا نصاب تعلیم پھیل نہیں سکا۔ جو نصاب تعلیم مرتب ہو اس کو پھیلانے پر پورا زور صرف کیا جائے تب ہی اس کی کامیابی ہے۔

# دینی مدارس اور عصری تقاضے

مولانا مجیب اللہ ندوی

عربی مدارس کے نصاب تعلیم کا مسئلہ محض نظری ہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہماری رواں دواں عملی زندگی سے بھی ہے۔ اس لئے ہمیں دونوں پہلوؤں سے اس پر گفتگو کرنی ضروری ہے۔ ہندوستان میں یوں تو عربی مدارس کے نصاب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مگر یہ تبدیلی عموماً تفسیر و حدیث کی کتابوں کے اضافہ کے سلسلہ میں ہوتی رہی ہیں۔ مگر یونانی علوم یعنی فلسفہ و منطق وغیرہ کا سکہ ہندوستان میں ہمیشہ سکہ رائج الوقت بنا رہا یونانی علوم کو کم کرنے اور اس کی جگہ عربی ادب وانشاء اور جدید علوم اور انگریزی زبان کو داخل کرنے کی آواز ایک صدی پہلے ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اُٹھی مگر ندوۃ العلماء کے قیام سے اب تک جو باتیں کہی اور لکھی گئی ہیں وہ اب بھی دہرائی جارہی ہیں' جہاں تک عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا سوال ہے اب وہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں رہا۔ اس لئے کہ ندوہ کی تحریک اور بعض دوسرے اسباب کی بناء پر ہندوستان کی دو چار درس گاہوں کو چھوڑ کر سب نے اسے قبول نہیں تو تسلیم ضرور کرلیا ہے۔ اب ضرورت اس کے عملی پہلو کی طرف توجہ کی ہے اس سلسلہ میں زبان کے ساتھ مکان کا لحاظ بھی ضروری ہے یعنی نصابِ تعلیم پر غور کرتے وقت ہمیں اپنے ملک کے حالات اور وہاں کی دینی ضرورتوں کا جائزہ لینا بھی بہت ضروری ہے ہمیں صرف آزاد اسلامی ملکوں کی ریس یا تقلید میں یا معاشی استحصال کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

آزاد اسلامی ملکوں میں قدیم طرز کے مدرسے ہوں یا جدید و قدیم دونوں علوم کے حامل ادارے ہوں۔ بہر حال وہاں اس نصاب کو پڑھنے کے بعد طلبہ کے سامنے اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک میدان بھی موجود ہوتا ہے اس لئے ان کے لئے جو بھی نصاب تعلیم بنایا جائے گا

وہ شعوری یا غیر شعوری طور سے اسے یکسو ہو کر پڑھیں گے اس لئے کہ اس سے ان کا معاشی مستقبل بھی وابستہ ہوتا ہے مگر ہندوستان اور ایسے تمام ممالک میں جہاں مسلمان تعلیمی پالیسی بنانے میں آزاد نہیں ہیں وہاں دینی درس گاہوں کے سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے مقصد اور ضرورت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ پڑھنے والوں کے لئے مستقبل میں ان کی عملی زندگی کے لئے کیا میدان ہو گا جسے وہ اپنی جولان گاہ بنا سکیں گے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد سے اب تک ان کا سب سے بڑا مسئلہ دین اور علم دین کا تحفظ رہا ہے تاکہ مسلمان نسل ایمان کی روشنی اور توحید کی حرارت سے محروم نہ ہونے پائے اور آزادی کے بعد اس مسئلہ نے اور زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے اسی ضرورت اور مقصد کی تکمیل کے لئے ہمارے اسلاف نے آزاد دینی مدارس کے قیام کی پوری کوشش کی اور اس کے لئے اپنے جسم و جان کی پوری صلاحیت لگا دی ان کی کوششوں کے نتیجہ میں نہ صرف دین اور علم دین کا چشمہ صافی غیر اسلامی عناصر سے مکدر نہیں ہونے پایا بلکہ اسلام کی وہ اخلاقی اور روحانی زندگی جس کی تعمیر توحید خالص پر ہوئی تھی۔ یہاں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہی اور الحمد للہ وہ آج تک زندہ و تابندہ ہے اس ضرورت اور مقصد کے تحت ہم جب ہندوستان کی درس گاہوں کے نصاب تعلیم پر غور کرتے ہیں تو موجودہ درس نظامیہ کا نصاب تعلیم ہمیں سب سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے اس لئے کہ ہندوستان میں دین اور علم دین کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں ہر سطح کے آدمی ان درس گاہوں سے مل سکیں ہمیں قرآن پاک و حدیث نبوی کے اچھے مدرسین کی بھی ضرورت ہے اور فقہ و افتاء کے لئے اچھے فقیہہ اور مفتی کی بھی ضرورت ہے ہمیں نحو و صرف اور ادب عربی پڑھانے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ اور ہمیں امام و موذن کی بھی ضرورت ہے۔ مکتب کی چٹائی پر بیٹھ کر پڑھانے والے کی بھی ضرورت ہے۔ تحریر و تقریر اور خطابت کے لئے بھی ہمیں افراد درکار ہیں' ان ضرورتوں کے لحاظ سے جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں درس نظامیہ کے مطابق چلنے والے مدرسے اور وہاں کے فارغین زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں اور ان کے ذریعہ زیادہ تر ہماری ملّی ضرورتیں پوری ہوئی اور بہت سی خرابیوں کے باوجود اب تک پوری ہو رہی ہیں۔

اس کے برخلاف جہاں قدیم و جدید دونوں کے حاملین پیدا کرنے کی کوشش کی گئی یا کی جارہی ہے وہاں سے قدیم و جدید کے ماہر تو اب تک بہت کم پیدا ہو سکے البتہ کچھ انگریزی

اسکولوں کے لیکچر ادب وانشاء سے کچھ واقفین کچھ اچھے مصنفین اور میدان صحافت کے کچھ شہسوار تو ضرور مل گئے مگر ہماری ہر سطح کی ملّی ضرورتیں ان سے پوری نہ ہو سکیں' راقم الحروف کے نزدیک ان کی ناکامی کے چند اسباب یہ ہیں۔ ایک یہ کہ ہم جس طرح کے مزاج و صلاحیت والے افراد تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے لئے وسیع پیمانہ پر اس ملک کے اندر کوئی میدان نہیں ہے اس لئے ان درس گاہوں کے فارغین جدید تعلیم گاہوں کے فارغین کی طرح ایسے میدانوں کو اپنی جولان گاہ بناتے ہیں یا اس کے لئے کوشش کرتے ہیں جو ذاتی طور پر تو ان کے لئے تو مفید ہوتی ہے مگر ملت کے لئے اس کی کوئی افادیت نہیں ہوتی بلکہ اس سے دوسری درس گاہوں کے فارغین کے مزاج میں بھی بگاڑ پیدا ہونے لگا ہے۔
دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم ان کے اندر کسر نفسی' تواضع' قناعت پسندی کے بجائے جو اک فرضی بلندی' احساس برتری بلکہ پندار پیدا کرتے ہیں اس کی وجہ سے ہندوستان میں وہ کسی عربی درس گاہ کی مدرسی کو بھی آسانی سے پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ ٹوٹی چٹائی اور پھٹے ٹاٹ والے مدرسوں کی پٹہ ماری والی زندگی کے لئے وہ تیار ہوں۔ ہم نے ان مدرسوں کے ماحول کو خود ایسا بنایا ہے کہ ان کے فارغین ٹھوس علمی کام سے زیادہ سستی صحافت سطحی مشاغل' معیار زندگی کی بلندی اور شہرت و عزت کی اچھل کود کو طرۂ امتیاز بناتے ہیں۔ ایک جگہ بیٹھ کر کسی ایک چھوٹے یا بڑے کام میں زندگی کھپا دینے کا جذبہ ہمیں نایاب نظر آتا ہے۔ میں ان مدارس کی اہمیت گھٹا نہیں رہا ہوں بلکہ یہ بات ملت کی وسیع ضرورت کے پیش نظر عرض کر رہا ہوں ورنہ ان کے ذریعہ بھی دین و علم دین کے بہت سے کام انجام پائے ہیں اور پا رہے ہیں' خود جامعۃ الرشاد بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔
راقم الحروف یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ درس نظامیہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے یعنی یونانی منطق و فلسفہ کی کتابیں کم کر کے ان کی جگہ ہیئت' جغرافیہ اور سائنس کی عام معلومات انہیں اتنی ضرور کر دی جائیں جن سے قرآن پاک کی وہ آیات جن میں آفاق و نفس پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ انہیں وہ وسیع طور پر سمجھ سکیں اور ساتھ ہی عربی ادب وانشاء کا اضافہ بھی کر دیا جائے تاکہ وہ تحریر و تقریر سے بے بہرہ نہ رہیں' رہی انگریزی زبان تو اس کی سارے طلبہ کو ضرورت نہیں ہے البتہ جو طلبہ اس کو اپنی عملی یا دعوتی زندگی کا میدان بنانا چاہیں ان کو اختتام تعلیم کے بعد خصوصی طور پر اس کے لئے تیار کیا جائے یوں ہندی و

انگریزی کے لئے ایک آدھ گھنٹہ مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر یہ کسی مقصد اور ضرورت کے تحت ہونا چاہئے صرف قدامت پرستی کا داغ چھڑانے یا ماڈرن بننے کی غرض سے ہم اسے قطعی قبول نہ کریں ہمارے مدارس میں انگریزی ونگریزی تو آتی نہیں البتہ دل و دماغ میں بلاوجہ کی سطحیت پیدا ہو جاتی ہے اور دینی علوم کی ٹھوس صلاحیت پیدا کرنے سے ان کی توجہ قدرے ہٹتی ہے۔ البتہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ سائنس کی عام معلومات اور ہیئت اور جغرافیہ اور تاریخ ہند و تاریخ اسلام کا اضافہ سب کے لئے ضروری ہے۔

یہاں یہ بات بھی سب سے زیادہ قابل غور ہے کہ کیا نصاب تعلیم کی تبدیلی سے عربی درس گاہوں میں کوئی انقلاب آجائے گا؟ یا اس کے لئے طلبہ اساتذہ اور منتظمین مدرسہ میں بھی کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک سب سے زیادہ ضرورت اساتذہ اور منتظمین میں مقصدیت پیدا کرنے کی ہے۔ جب تک ان کے ذہن میں یہ بات نہ بیٹھے گی اور اپنے عمل سے وہ اس کا ثبوت نہ دیں گے کہ دینی درس گاہوں کا مقصد اور ان کی غرض کیا ہے اس وقت تک نصاب تعلیم کی تبدیلی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا' بے چاری بے جان کتابوں پر سب کا نزلہ گرتا ہے اور اسی کے ردوبدل کی بات کہی جاتی ہے مگر مدرسہ کے زندہ اساتذہ اور منتظمین میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے یا اس کے لئے بھرپور کوشش نہیں کرتے اس سے پہلے درس نظامیہ کے مدرسوں کے فارغین علم دین کے تحفظ کے ساتھ گاؤں گاؤں علم دین کی روشنی اسی وجہ سے پھیلا سکے کہ خود ان کے اساتذہ ایک گاؤں یا چھوٹے سے مدرسہ میں بیٹھ گئے تو پھر پوری زندگی گزار دی اور علم کے ساتھ انہوں نے اپنے عمل سے پوری پوری آبادی کو متاثر کر دیا پہلے منتظمین مدرسے کے کام کو اپنے ذاتی کام کی طرح شوق سے کرتے تھے اور دوسرے بہت سے جذباتی کاموں کے مقابلے میں اسے بنیادی کام سمجھتے تھے ان کا سینہ رشک و حسد اور اعزاز و اکرام کی خواہشوں سے پاک ہوتا تھا وہ مدرسے کا کام کر کے بھی اپنے کو سراپا تقصیر سمجھتے تھے اساتذہ اور منتظمین کے اس خصوصی للہیت اور مقصدیت کا اثر طلبہ پر بھی پڑتا تھا اور وہ بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر دینی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوتے تھے مگر اب اس لحاظ سے ہر طرف سناٹا دکھائی دیتا ہے دینی درس گاہیں جن مقاصد کے لئے قائم ہوئیں ان کی تکمیل چند کتابوں کی تبدیلی سے نہیں ہو سکتی بلکہ کتابوں کے بدلنے سے پہلے خود اساتذہ اور منتظمین اپنے کو بدلنے کی کوشش کریں

اگر ہمارے اندر اسوۂ نبوی اور اصحاب صفہ کی زندگی کا ہلکا سا اثر بھی آجائے تو مدرسوں کی دنیا بدل جائے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مدرسے ہی نہیں بلکہ مدرسہ میں جتنے اساتذہ ہوتے ہیں ان کی الگ الگ ریاستیں قائم ہوتی ہیں جہاں آسائش پسندی کے سامان کے ساتھ خدم وحشم کی ایک فوج بھی موجود ہوتی ہے۔ ان میں بہت کم اساتذہ ہوتے ہیں جو خادم دکھائی دیں' زیادہ تر مخدوم ہی نظر آتے ہیں' جو اپنے ہاتھ سے وضو کا ایک لوٹا پانی بھی نل سے لینے کو اپنی مخدومیت کے منافی سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کے طرزِ عمل کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ فارغ ہونے کے بعد طلبہ بھی ایسا ہی گوشہ عافیت تلاش کرتے ہیں نہ اساتذہ میں مطالعہ و تحقیق کا ذوق نظر آتا ہے اور نہ خدمت کا کوئی جذبہ دکھائی دیتا ہے اور نہ طلبہ میں یہ خوبیاں نظر آتی ہیں بس وہ چند کتابوں کے امام بن کر رہ جاتے ہیں۔

کہنے کی غرض یہ ہے کہ کتابوں سے زیادہ زندہ افراد میں تبدیلی کی ضرورت ہے اس راستے کو اختیار کرنے میں نہ تو بہت زیادہ شور و غوغا نظر آئے گا اور نہ بھیڑ بھاڑ مگر ہندوستان میں دین اور علم دین کا تحفظ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ بزرگوں کا خاموش اور خادمانہ طریقہ اختیار کیا جائے یہی احساس تھا جس نے امام غزالیؒ سے مدرسہ نظامیہ کی صدارت چھوڑوادی تھی۔

پھر نصاب تعلیم میں تبدیلی کی بات جب آتی ہے تو سب سے زیادہ یونانی فلسفہ و منطق کی کتابوں کی تبدیلی کی بات ہوتی ہے اور یہ ہونی بھی چاہئے اور پھر ادب وانشاء کے اضافہ کی بات آتی ہے اور آنی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ فقہ و حدیث میں کوئی تبدیلی تو ہو گی نہیں اور نہ اس میں تبدیلی کے لئے کوئی کہتا ہے لیکن یہ بھی افسوسناک بات ہے کہ قرآن مجید اور حدیث نبوی کی تعلیم کو نہ تو بنیادی اہمیت درس نظامیہ میں دی گئی ہے اور نہ تو قدیم وجدید علوم کے ساتھ چلنے والے مدرسوں میں' کہیں قرآن پاک کی منتخب سورتیں پڑھائی جاتی ہیں' کہیں جلالین کا دورہ ہوتا ہے اور بیضاوی کا ایک آدھ پارہ پڑھا دیا جاتا ہے اور جہاں قرآن پاک پر زور بھی دیا جاتا ہے۔ وہاں بھی کسی خاص نقطۂ نظر سے اسی طرح حدیث کی کتابوں کا یا تو دورہ ہوتا ہے یا پھر اس کی چند کتابیں تبرکاً پڑھائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ قرآن و حدیث کو مرکز بنا کر سارے علوم کو اس کے گرد گردش دی جائے اور قرآن پاک کی ایک ایک آیت کی معنویت کو ذہن و دماغ میں اتارا جائے اور حدیث نبوی کی تعلیم فقہی نقطۂ نظر کے ساتھ فنی اور اخلاقی اور

تربیتی لحاظ سے بھی دی جائے اور کم از کم پانچ سال مسلسل اس کے گھنٹے ہوں' بحمد للہ جامعۃ الرشاد میں اس کا اہتمام ہے۔

اس لئے راقم الحروف کے نزدیک نصاب تعلیم میں قدرے تبدیلی کے ساتھ معیار تعلیم پر بھی غور کرنا ضروری ہے اس لئے کہ سلیبس سے زیادہ ضروری معیار تعلیم ہوتا ہے اور کریکولم کا تعلق منتظمین اور اساتذہ سے ہوتا ہے' آج ہماری نظریں نصاب تعلیم کی خامیوں پر تو اٹھتی ہے لیکن معیار تعلیم کی تبدیلی پر ہم بہت کم غور کرپاتے ہیں۔

اوپر میں نے عربی درس گاہوں کے لئے مستقبل کے میدان کی بات جو کہی ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مدرسہ بورڈ بہار اور الہ آباد بورڈ یوپی کے امتحانات کو اہمیت دے رہے ہیں۔ بلکہ ان امتحانات نے تو عربی درس گاہوں کی اخلاقی و روحانی حیثیت کو بالکل مجروح کر ڈالا ہے۔ الا ماشاء اللہ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی دینی و اخلاقی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے وہ ملت کے لئے مفید بن سکیں اور ملت کے ساتھ اس ملک کو اپنی خدمت سے علم و اخلاق کی کوئی روشنی دے سکیں۔ چند سال پہلے دلی کا مشہور اخبار پیٹریاٹ کا ایک وفد عربی مدارس کا دورہ کر رہا تھا اور ہر جگہ وہ یہ سوال رکھ رہا تھا کہ اس ملک میں عربی مدارس کی کیا ضرورت ہے یہ تو ملک کے اوپر بوجھ ہیں مختلف مدرسہ کے لوگوں نے جو جوابات دیئے اس سے وہ مطمئن نہیں ہوئے آخیر میں وہ جامعۃ الرشاد آئے اور راقم الحروف سے بھی یہی سوال کیا میں نے ان سے سوال کیا آپ بتائیں اس ملک میں سب سے زیادہ کمی کس چیز کی ہے جس کی وجہ سے ہر طرف فتنہ و فساد اور لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے' رشوت خوری عام ہو گئی ہے' انصاف اب ملتا نہیں بلکہ بک رہا ہے' ہر طرف شراب کا دریا بہہ رہا ہے۔ انسان کی جان و مال و عزت و آبرو کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ بولے کہ آپ ہی بتائیں میں نے عرض کیا کہ اس ملک میں سب سے زیادہ کمی اچھے اور دیانت دار شہریوں کی ہے۔ آپ کے اسکول' کالج اور یونیورسٹیاں اچھے' پرامن اور دیانت دار شہری نہیں پیدا کر رہی ہیں' بلکہ یہ ساری خرابیاں انہیں درس گاہوں کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذریعہ پھیل رہی ہے۔ عربی مدارس اس ملک میں یہی کام کر رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے لئے اچھے اور دیانت دار شہری پیدا کر رہے ہیں۔ کیا یہ ملک کی سب سے بڑی خدمت نہیں ہے؟ ان کو یہ بات اپیل کی اور دلی جا کر اس کے ایڈیٹر نے ایک موٹی سرخی کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔

عربی مدارس کے نصاب میں تھوڑی ترمیم و تبدیلی کے ساتھ ایک عملی اضافہ کی بھی ضرورت ہے۔ وہ اضافہ یہ ہے کہ ہم کو اپنے طلبہ کو کچھ چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا انتظام کرنا چاہیے مثلاً جلد سازی' موم بتی سازی' کتابت' ٹائپنگ' اسکیل پنسل بنانے کا کام وغیرہ وہ بھی ہر لڑکے کو نہیں بلکہ یہ پروگرام ان لڑکوں کے لئے ہونا چاہیے جو تعلیمی لحاظ سے بہت اچھے نہ ہوں یا تعلیم مکمل کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں انہیں چند سال تعلیم دینے کے بعد رجحان کے اعتبار سے تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی ہنر میں لگادیا جائے تاکہ وہ کسی غلط راہ پر لگنے کے بجائے تعلیم کے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور آزاد رہ کر دین کی خدمت کر سکیں مگر وہ طلبہ جو پڑھنے میں اچھے ہوں اور شوقین بھی ہوں انہیں تعلیم کی لائن میں زیادہ سے زیادہ باصلاحیت بنانے کی کوشش کی جائے لیکن اس کے لئے مدرسہ کے منتظمین اور اساتذہ کو دردمندی کے ساتھ جائزہ لینا ہوگا اور اس کے مطابق پوری دل جوئی اور خلوص کے ساتھ ان کو تعلیم و تدریس یا دعوت و تبلیغ کے لئے تیار کرنا ہوگا جس کی اس وقت بے حد کمی ہے بہت سے ذہین لڑکوں کی تھوڑی سی شوخی کی وجہ سے ہم ان کو ضائع کر دیتے ہیں اور دوسرے اور تیسرے درجہ کے خوشامدی یا اپنے قریبی طلبہ کو تعلیمی لائن میں داخل کر لیتے ہیں جس سے نصاب تعلیم تو پورا ہو جاتا ہے مگر معیار تعلیم اونچا نہیں ہو پاتا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ چند باتیں کسی دراز نفسی کی خاطر نہیں کہی گئی ہیں بلکہ اپنے چند ذاتی تاثرات و تجربات کا اظہار مقصود ہے اس سلسلہ میں دوسرے اہلِ علم کی رائے آجانے کے بعد کوئی لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا ہے۔

وما ابری نفسی ان النفس لامارة بالسوءِ الا مارحم ربی۔

# روایتی مدارس کی اصلاح کی ضرورت کیوں؟

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
(صدر شعبہ عربی' دہلی یونیورسٹی)

مدارس عربیہ کا نظام تعلیم و تربیت ایک مسلسل اور مضبوط روایت ہے۔ قدیم زمانے میں اس کے دائرہ کار میں تمام عقلی و نقلی علوم تھے اس لئے اعلیٰ تعلیم کے مرکز کلیہ کہلائے۔ کالج اسی کلیہ کی تبدیلی شدہ شکل ہے۔

جب سے مغربی نظام تعلیم نے مشرق پر شب خون مارا ہے' مدارس کا مقصد صرف تبلیغ دین اور تحفظ شریعت ہو کر رہ گیا۔ یہ بھی بلند اور لائق احترام مقصد ہے' مگر دنیوی تعلیم کو اپنے ہاتھوں سے مغربی اداروں کو سونپ دینا بھی کچھ دین کی خدمت نہ ہوئی۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ روایتی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی علمی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں مگر فکر کا دائرہ محدود رہ جاتا ہے' یونیورسٹی سے پڑھ کر نکلنے والوں کی بنادیں اکثر کمزور ہوتی ہیں اور دائرہ فکر وسیع ہوتا ہے اس لئے ان کے علم کا کوئی واضح مقصد نہیں بن پاتا۔ اگر صرف روزی کمانا تعلیم کا مقصد ہو تو اس سے پست تر کوئی اور نظریہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر خدمت دین کے لئے علم حاصل کرنے والے خود کو امور دنیا میں ناکارہ بنا کر رکھ لیں تو اس سے بھی علم کی سبکی ہوتی ہے۔

ہمارے مدارس کا نصاب پہلے تین درجوں میں بٹا ہوا تھا۔ (۱) تعلیم' (۲) افادیت' (۳) فضیلت۔ تعلیم کی سطح پر تو نوشت و خواند سیکھ لینا اور روزمرہ کے کاموں میں لکھنے پڑھنے کے لئے دوسروں کا محتاج نہ ہونا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ افادیت کا مرحلہ یہ تھا کہ اتنی تعلیم حاصل کر لیں جو دوسروں کو بھی پڑھا سکیں' یا دفتر کچہری کا کاروبار چلا لیں اور فضیلت کا درجہ یہ کہ تصنیف و تالیف اور خطبات و مقالات کی اہلیت پیدا ہو جائے اس کے بعد ایک سیڑھی

اختصاص کی اور سب سے اونچی منزل اجتہاد کی تھی۔ جس طرح قطب مینار کی دو منزلیں زلزلوں سے گر گئیں اسی طرح زمانے کی گردش نے اختصاص اور اجتہاد کی منزلوں کو زمین بوس کر دیا۔ اس لئے ان کا تذکرہ بے کار ہے۔

مدارس کے نصاب تعلیم میں افادیت کی منزل تک دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیئے تھا' آخر دنیا کو "مزرعة الآخرة" (آخرت کی کھیتی) کہا گیا ہے! میں نہیں سمجھتا کہ مدارس سے پڑھ کر نکلنے والا کچہری میں' پولیس میں' انکم ٹیکس میں اور دنیا جہاں کی دوسری تکنیکی کمپنیوں اور دفتروں میں کیوں نہ جائے۔ اس طرح تو تبلیغ دین کا بھی اچھا اور وسیع میدان ملتا ہے' صالح افراد اور اخلاقی تعلیم کے زیور سے آراستہ لوگ محکموں میں جائیں تو کرپشن اور بدعنوانی بھی کم ہو گی۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ حکومت ان مدارس کی سندوں کو تسلیم نہیں کرتی یا بے وقعت سمجھتی ہے۔ یہ مدارس خود اپنی اسناد کو تسلیم کرانے کے لئے کوشش نہیں کرتے اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ بعض بڑے مدارس اگر اپنے نصاب کو بی اے یا ایم اے کے مساوی تسلیم کرانے کی کوشش کرتے تو اس سے ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو بہت سے دوسرے فوائد حاصل ہو سکتے تھے مثلاً فوج میں ہر مذہب کے عالم کو ملازم رکھا جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ جو اپنی مذہبی تعلیم روایتی اداروں سے حاصل کر کے آئے ان کی سندیں تو گورنمنٹ میں تسلیم شدہ تھیں انہیں وہ گریڈ مل گئے جو مثلاً بی اے یا ایم اے پاس ملازم کو مل سکتے ہیں۔ سوال مولوی صاحبان کا تھا کہ ان کی سند کو ہم کیا سمجھیں؟ میں نے کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے کہا کہ مدارس عربیہ کے فاضل تقریباً ۷۔۸ سال کا کورس پڑھتے ہیں اور آخری دو برسوں میں انہیں وہی کتابیں پڑھنا ہوتی ہیں جو ہم ایم اے میں پڑھاتے ہیں اس لئے فاضل اسلامیات کو بھی ایم اے کے مساوی سمجھا جانا چاہیئے۔ متعلقہ افسروں نے کہا کہ ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں' مگر ہم کسی کے گھر یہ کہنے نہیں جائیں گے کہ ہم آپ کی ڈگری کو ایم اے یا بی اے کے برابر سمجھتے ہیں۔ وہ ادارہ ہم کو لکھے کہ ایسا نصاب ہے اور اتنے دنوں تک پڑھایا جاتا ہے تو ہم اسے تسلیم کرنے پر غور کر سکتے ہیں۔ بات معقول تھی۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے ایک ایسے جلسے میں شرکت کا اتفاق ہوا جہاں بڑے بڑے دینی مدارس کے ذمہ دار حضرات بھی مدعو تھے۔ میں نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا اور یہ درخواست کی کہ وزارت

تعلیم کو ایک خط مدرسہ کی طرف سے جائے اور اس کے ساتھ نصاب کی نقل بھی نتھی ہو تو ان کی سند تسلیم کر لی جائے گی اور اس سے بعض ان مولویوں کو فائدہ تو فوراً ہی ہو جائے گا جو فوج میں معمولی گریڈ پر کام کر رہے ہیں۔ مگر میری یہ گزارش ایک بزرگوار نے حقارت کے ساتھ رد کر دی اور کہا کہ "ہم تو دین کے لئے سپاہی پیدا کر رہے ہیں ہم انہیں دنیا کی چاٹ لگا دیں گے تو دین کا کام کون کرے گا؟"

میری موٹی سی عقل یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہے کہ خدمت دین کے لئے فقر و فاقہ اور تنگی ترشی کو ایک لازمی عنصر کیوں سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ کوئی بوریا نشیں ہو' زاہدانہ زندگی گزارتا ہو' دنیوی عیش اور لذات و تنعّمات کی ہوس اس کے دل میں نہ ہو اور وہ علم و فن کی یا دین کی یا سوسائٹی کی مخلصانہ خدمت کرے۔ لیکن کیا یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ جو فارغ البالی سے بسر کر رہا ہے۔ وہ خدمت دین نہیں کر سکتا؟

آج ہندوستان میں چھوٹے بڑے مکاتب و مدارس ہزاروں کی تعداد میں ہیں دیہات و قصبات میں بھی مسجدوں میں مکتب کھلے ہوئے ہیں۔ اوسط درجے تک تعلیم دینے والے مدارس سینکڑوں ہوں گے اور موقوف علیہ تک پڑھانے والے ادارے بھی درجنوں ہیں۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جن کے پاس اپنے سالانہ بجٹ کی تکمیل کے لئے مستقل ذرائع آمدنی موجود ہوں۔ تھوڑے بہت اوقاف ہیں۔ بینک کے سود پر گزر کر نہیں سکتے اس لئے عموماً اور بلا استثنیٰ چندے اور عطیات سے یہ ادارے چلتے ہیں اور یہ کاروبار اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے کہ اس پر کوئی فخر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محصل زکوٰۃ کا روپیہ بھی وصول کر لاتے ہیں حالاں کہ یہ جائز نہیں اور اس طرح زکوٰۃ ادا بھی نہیں ہوتی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی جن علاقوں میں مدارس ہیں وہاں جو خام مال پیدا ہوتا ہے اور اس کی مدد سے جو گھریلو صنعتیں یا Small scale industries چلائی جا سکتی ہیں وہ قائم کی جائیں اور ان کی آمدنی سے مدارس کے مصارف پورے ہوں' یہ بہت مفید اور حکیمانہ تجویز تھی اس سے گھریلو صنعت و حرفت اور مختلف فنون کو بھی فروغ ملتا اور مسلمانوں کا صنعت و حرفت کے میدان میں تناسب بڑھنے لگتا۔ مگر سب نے ان باتوں کو ایک کان سے سنا دوسرے سے اڑا دیا۔

تعلیم یا Education اب ایک پورا فن Discipline بن چکی ہے۔ دنیا میں ہزاروں

لاکھوں ادارے اس موضوع پر اور اس کے Methods پر کام کر رہے ہیں۔ مگر ہمارے مدارس نے Methods of teaching میں کوئی اضافہ یا اصلاح کرنے کی کبھی نہیں سوچی۔ اسی طرح نصاب میں جو کتابیں شامل کر لی ہیں بس وہ ابد الآباد تک کے لئے ہیں اور سنتہ اللہ کی طرح ان میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ مثلاً زبان کی تعلیم کے اب نئے Methods نکل آئے ہیں۔ گرامر سے زبان پڑھانا غیر ضروری اور غیر مفید سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ زبان سے گرامر کو سمجھایا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے قواعد پر نظر کئے بغیر اپنی مادری زبان خود بخود سیکھ لی ہے اور اس میں تذکیر و تانیث یا واحد و جمع یا غائب و حاضر کے قواعد کا غیر شعوری طور پر ہمیں احساس رہتا ہے اسی طرح عربی کو بھی سیکھا جاسکتا ہے۔ قواعد سے سیکھنا ایسا ہے جیسے اندھے کے ہاتھ میں لاٹھی دے دی۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر چلتا رہے گا اور سائنٹک گرامر سے زبان سیکھنا گویا راستے کو آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ مگر ہمارے مدارس آج بھی کتاب الصرف 'کتاب النحو' میزان منشعب 'کافیہ اور شرح ملا جامی وغیرہ کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی قدر و قیمت میں کلام نہیں' مگر طلبہ کے لئے اس سے زیادہ آسان اور سائنٹیفک لٹریچر پڑھانے کو موجود ہو تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ افسوس کہ میری ناقص عقل اس کو سمجھنے سے قطعاً انکار کر دیتی ہے۔

مدارس میں علم و تحقیق کا شعبہ ہوتا تو یہاں سے ایسے کام ہو سکتے تھے جن کی ساری دنیا میں پذیرائی ہوتی۔ بیروت کا کیتھولک مشن چند کتابوں کی فروخت سے چل رہا ہے جو لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں پھیل گئی ہیں' ان میں سے ایک لغت کی کتاب المنجد بھی ہے جو ہر عربی داں کے گھر میں ملے گی' ان مولوی صاحب کی کتابوں میں بھی ہوگی جو رد عیسائیت کو خدمت دین متین سمجھ کر جی جان سے اس میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی المنجد کو وہ اٹھا کر دیکھیں تو طلقاء کے معنی لکھے ہیں۔ الذين أدخلوا الاسلام كرها۔ یہ ایک ہی مثال کافی ہے۔ وقت نہیں ہے ورنہ دوسری مثالیں بھی پیش کرتا۔ غير المغضوب عليهم ولا الضالين۔ آپ ہر نماز میں پڑھتے ہیں۔ مغضوب کے معنی المنجد کی مدد سے سمجھنے کی کوشش فرمایئے! اس کو کہتے ہیں کہ ہماری جوتی اور ہمارا سر! میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کے کام ہمارے دینی مدارس میں کیوں نہ ہو سکتے تھے اور طباعت اشاعت کتب سے ہمارے مدارس کیوں نہیں چلائے جاسکتے تھے۔

اسی طرح ان مدارس و مکاتب کی کوئی مرکزی تنظیم نہیں ہے۔ اس میں اختلاف عقائد مانع آتا ہے۔ جس کا جو عقیدہ اور جو مسلک ہے وہ اس کے مطابق پڑھائے مگر یہ اس کے لئے کیوں مانع ہے کہ کوئی مرکزی تنظیم مدارس وجود میں آئے۔ اگر ایسی تنظیم ہوتی تو اس کے فوائد اتنے تھے کہ حدو حصر سے باہر۔ مگر آہ! جنہیں اپنے مسلک کی پچ نے اس منزل تک پہنچا دیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو بھی اپنے عقائد سے مشرف کرنے میں بے باک ہیں ان سے کیسے توقع کی جائے کہ وہ دینی مدارس کی مرکزی تنظیم بننے دیں گے اور بن جائے تو اسے چلنے دیں گے؟

ان مدارس کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ انہوں نے دوسری زبانوں کی اہمیت' قوت اور گرفت کو نہیں سمجھا۔ اگر یہ ہر علاقے کی زبان کی قدر کرتے اور اس میں اپنا لٹریچر اور مواعظ پھیلاتے تو آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ فی الحال تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے عربی جاننا ضروری ہے حالاں کہ اصولی طور پر یہ بات درست نہیں۔ اس کی تفصیل فی الحال خارج از مبحث ہو گی۔

ان مدارس کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ ایسے لوگ تیار کئے جاتے جو غیر مسلموں تک اسلامی تعلیمات کو اس انداز سے پہنچائیں کہ اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں دشمنوں کی پھیلائی ہوئی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ غیر مسلموں تک اسلام کی صحیح تصویر پہنچی ہی نہیں ہے اور آج بھی اگر کہیں اس کا موقع ملتا ہے تو وہ متاثر ہوتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ کیا واقعی اسلام یہ ہے جو آپ کہہ رہے ہیں؟

جب حفاظت دین اور تبلیغ دین مدارس کا مقصد وجود ہے تو یہ کام کرنے والے بھی مدارس ہی سے پیدا ہونے چاہئیں....... باتیں تو خدا جانے کیا کیا ذہن میں آتی ہیں مگر پھر یہ شعر پڑھ کر بیٹھ رہتا ہوں کہ

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

# مدارس پر ایک نظر

## خدمات، حقائق، احساسات اور مشورے

ڈاکٹر سید حسن
(انسان اسکول، کشن گنج)

آج نظام مدارس پر ہم آپ تبادلہ خیالات کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اس موقع پر آپ نے مجھے بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا ہے۔ اس کے لئے میں آپ سب کا اور خاص طور سے خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے ذمہ دار حضرات و منتظمین کا شکر گزار ہوں۔

میں کوئی عالم، محقق یا مصنف نہیں ہوں۔ بس تعلیم و تربیت سے دل چسپی ہے اور آج بھی اس دل چسپی کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے ہوں۔ چناں چہ اپنی اس دل چسپی کے نام پر ہی آج آپ سب کی خدمت میں حاضر ہوں۔

اس وقت اپنی تعلیم و تربیت اور اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اپنے خیالات کو "مدارس پر ایک نظر" کے عنوان سے خدمات، حقائق، احساسات اور مشورے کے زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خدا کرے میں اس شرکت کا حق کسی طرح ادا کر سکوں۔ السعی منی والا تمام من اللہ۔

### ا۔ خدمات:

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ مدارس کے نظام نے، علم کی روشنی کو پھیلانے میں اور جہالت کی تاریکی کو دور کرنے میں مدد دی ہے۔ اس طرح ملک میں ناخواندگی کو کم کیا ہے اور خواندگی میں اضافہ کیا ہے۔ عربی اور فارسی زبانوں کو اپنے نصاب میں جگہ دے کر اس ملک

میں انہیں مقبولیت اور عمومیت بخشی ہے۔ اردو کے استعمال سے اس زبان کو ترقی دی ہے اور اسے تقویت پہنچائی ہے۔ ہمیں اسلامی تعلیمات، معلومات اور روایات کے معلم دیئے ہیں۔ ہمارے درمیان عالم دین، فقیہ، مفتی، قاضی، محدث، مفسر، حافظ، مفکر، مبلغ، مصنف اور مصلح جیسے مخصوص فیض رساں ہستیوں کو پیدا کیا ہے۔ ہمارے مذہبی فرائض اور رسومات کی ادائیگی میں ممد و معاون ہونے والے حضرات ہمیں دیئے ہیں۔ نادار اور بے سہارا بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری قبول کر کے نہ صرف ان کی کفالت کی ہے بلکہ ان کو تعلیم سے فیض یاب کیا ہے۔ آزادی وطن کی جدوجہد کے لئے ایسے افراد تیار کئے ہیں جو دوسرے ہم وطنوں کے قدم بقدم اور دوش بدوش چلے ہیں، دارورسن کی سختیوں سے گزرے ہیں اور ایثار و قربانی کے بے بہا نمونے چھوڑ گئے ہیں۔ وطن کی محبت اور اس کی سالمیت کے جذبوں کی آبیاری کی ہے۔

## ۲۔ حقائق :

ان خدمات کے اعتراف کے ساتھ ہی اس حقیقت کا احساس بھی اب بڑھتا جارہا ہے کہ ہماری نظر میں مدارس کو جو مقام ملنا چاہیئے وہ ہم انہیں نہیں دے سکے ہیں۔ اس ضمن میں چند بنیادی حقیقتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ مدرسہ بمعنی اسکول ہے۔ یعنی درس و تدریس کی ایک جگہ یا یوں سمجھا جائے کہ پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کی ایک جگہ۔ تحتانیہ، وسطانیہ، فوقانیہ، کلیہ اور جامعہ کو درجات کے اعتبار سے بطور منازل مانیئے۔ اس طرح مدارس تعلیم وتربیت کے سماجی گہوارے اور ادارے ہیں جہاں مقاصد کے اعتبار سے علم و عمل کے ذریعے ہر طرح کی تعلیم اور تربیت ممکن ہے۔ جب مقصد کے تعین کا سوال اٹھتا ہے، تب یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ علم برائے علم ہو یا علم برائے زندگی، تعلیم وتربیت کسی عنوان سے ہو، بنیادی مسئلہ مقصد کا ہے۔ مقصد کی روشنی میں ہی کسی نظام کے خدوخال اور رہ نما خطوط طے ہوتے ہیں۔ علم واقفیت ہے، معلومات ہے، مواد ہے، ساتھ ہی علم کا حاصل کرنے والا طالب علم اور اسے دینے والا معلم دونوں ہی انسان ہیں۔ ان کے سامنے ایک زندگی ہے۔ یہ دونوں ہی اپنی اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ لہذا اس کامیابی کے لئے علم کو برائے زندگی ہونا ہے۔ زندگی میں کامیابی علم کے استعمال سے ملتی ہے۔ استعمال عمل کا دوسرا نام

ہے۔ اس کے اندر عمل کی خواہش کا ہونا پایا جاتا ہے۔ بار بار کے استعمال سے مہارت اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ آدمی اس علم کا ماہر اور فن کار بن جاتا ہے۔ اس کے بر خلاف علم کا استعمال نہ ہو تو بھولنے کا قدرتی خاموش عمل اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ منزل بھی آسکتی ہے کہ ہم بے علم ہو جائیں۔ علم کو عمل میں لانے کے لئے تربیت چاہیے۔ تربیت سے مراد کیا، کیوں، کیسے، کہاں اور کب کی "سمجھ" ہے۔ زندگی علم کی روشنی میں اس کے استعمال کی تربیت کے ذریعے کامیاب بنائی جاتی ہے۔ تربیت سے ہی سیرت اور شخصیت بنتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔ ہر پیغمبر ایک معلم اور مربی تھے۔ ہر پیغمبر کی طرح ہمارے رسول آخر الزماں ﷺ نے بھی تعلیم دی اور تربیت بھی فرمائی۔ آپ نے اس تعلیم و تربیت کا انداز یہ اپنایا کہ آپ نے جو علم دیا خود اس علم کو برت کر اور استعمال کر کے دکھایا۔ آپ کے اس عمل کو ہم آپ "سنت" کہتے ہیں۔ گویا کہ سنت علم کو عمل میں لا کر زندگی گزارنے کا طریقہ ہے اور یہ ہمارے لئے ہر معاملے میں ایک مشعل راہ ہے۔ اسے ہم آپ تعلیم و تربیت اور کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ایک بہترین نمونہ تسلیم کرتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا معاملہ ہو یا انسانی سماج کا کوئی شعبہ اور زاویہ نگاہ و فکر، ہم زمان و مکان کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے فیصلے نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے فیصلوں کو زمانے، وقت اور جگہ سے تال میل پیدا کرنا ہے۔ تعلیم و تربیت کے خطوط کو بھی اس آئینہ میں دیکھنا ہے لہذا ہمیں ان خطوط کو جگہ اور وقت کے نئے مسائل، نئے مصالح، نئے علوم نئی ترقیات اور نئے تجربات کی روشنی میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ زندگی ایک متحرک عمل ہے۔ جمود اس کے لئے زوال یا موت کا سبب بن جاتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال اس حقیقت کی ترجمانی اور عکاسی کرتا ہے زندگی تغیر پذیر ہے۔ جگہ بھی تغیر پذیر ہے اور پھر خود علم بھی جمود سے مبرا ہے۔ اس خزانے اور سرمائے میں وقت وقت سے گاہے گاہے تبدیلی اور اضافے کی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ہمیں زندگی، جگہ اور سرمایہ علم کے اس متحرک اور تغیر پذیر عمل کو اپنے لئے سود مند بنانا ہوتا ہے۔

## ۳۔ احساسات :

ان حقائق کی روشنی میں جب ہم اپنے مدارس کا جائزہ لیتے ہیں تو ذیل کے خیالات اور

احساسات ابھرتے ہیں۔ دین کو دنیا سے الگ تسلیم کرتے ہوئے صرف دین بمعنی مذہب کی تعلیم دی جارہی ہے۔ علم برائے علم ہے۔ علم برائے زندگی نہیں ہے۔ تعلیم پیشِ نظر ہے۔ تربیت زیرِ بحث نہیں ہے۔ تعلیمی معیار اور اخلاقی کردار دونوں ہی پریشان کن ہیں اور توجہ کے محتاج ہیں۔ مضامین کے مواد کو اہمیت حاصل ہے۔ طریقہ تعلیم، اسلوب منہاج نظر انداز ہورہے ہیں۔ قاری اور راوی نکل رہے ہیں۔ عامل، محقق، مفکر، مدبر اور مصلح سامنے کم آرہے ہیں۔ سماجی اور معاشی تقاضوں سے بے نیازی برتی جارہی ہے۔ معاشرہ بگڑ رہا ہے۔ اصلاح کی صورتیں پیدا نہیں ہورہی ہیں۔ مادیت کے اثرات پھیل رہے ہیں۔ روحانیت اور جذبوں کی پرورش نہیں ہورہی ہے۔ پاکیزہ خیالات اور اقدار عالیہ کی آبیاری نہیں کی جارہی ہے۔ مدارس (دینی ادارے) اور اسکول، کالج و یونیورسٹی جیسے (عصری ادارے) ایک دوسرے کو غیر سمجھتے ہیں۔ دونوں قسم کے تعلیمی اداروں میں کسی قسم کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ دینی ادارے ایک طرف کام کے اعتبار سے احساس برتری اور حالات کے اعتبار سے احساس کمتری رکھتے ملتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہ عصری اداروں کو دنیاوی تعلیم کے مراکز مان کر بہت اونچا مقام نہیں دیتے ہیں دوسری طرف یہ عصری ادارے خود کے لئے احساس برتری اور دینی اداروں کے لئے احساس کم تری کا جذبہ یا خیال رکھتے پائے جاتے ہیں۔ نفسیات اور مذہب کے اصولوں کی روشنی میں احساس برتری اور احساس کم تری دونوں ہی مسائل حل نہیں کرتے ہیں بلکہ انہیں بڑھاتے ہیں اور پے چیدہ بنادیتے ہیں۔ فن تعلیم و تربیت یعنی اساتذہ کی ٹریننگ کی اہمیت اور ضرورت نہیں سمجھی جارہی ہے۔

## ۴۔ مشورے :

ان احساسات کی روشنی میں ذیل کی گزارشات مشورے کی شکل میں پیش ہیں۔ تاکہ ہمارے مدارس کی اہمیت اور افادیت بڑھے اور یہ ادارے اپنا صحیح مقام پاسکیں۔ تعلیم برائے زندگی ہو۔ تعلیم کے ساتھ تربیت پر زور دیا جائے۔ علم کو عمل میں لایا جائے۔ قاری اور راوی ہونے کے ساتھ ساتھ عامل (عالم باعمل) محقق، مفکر، مدبر اور مصلح پیدا کرنے کی کوشش ہو علم کو تربیت اور استعمال کے ذریعے اسے زندگی کا ایک حصہ بنادیا جائے۔ خود

قرآن پاک میں ہے کہ کیوں کہتے ہو ایسی باتیں جو تم کرتے نہیں ہو۔ جگہ جگہ اس نسخہ کیمیا میں سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ خیر کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کے لئے کہا گیا ہے۔ فراست اور حکمت کو مومن کی میراث سمجھا گیا ہے۔ بصیرت اور چشم بینا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دین اور دنیا کو لازم و ملزوم مان کر نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی جائے۔ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کو خاص طور سے انگریزی اور ہندی زبانوں کو بھی نصاب میں جگہ دی جائے۔ مقامی، ملکی اور بین الاقوامی رائج الوقت زبانوں کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز کرنا حکمت اور مصلحت کے منافی ہے۔ خود قرآن پاک کا عربی زبان میں نازل ہونا ہمارے لئے ایک سبق ہے۔ سماجی اور معاشی تقاضوں کی روشنی میں عصری علوم یعنی سائنس، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، سیاسیات، نفسیات، سماجیات اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مختلف مضامین کی گنجائش بھی پروگرام میں رکھی جائے۔ ساتھ ہی دیگر مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا موقع بھی دیا جائے۔ ہر طالب علم کو ایک ہی مجوزہ نصاب سے نہ گزارا جائے بلکہ لازمی، اختیاری اور خصوصی خطوط پر طالب علم کی خداداد صلاحیتوں کی روشنی میں جگہ، وقت اور درجے (تحتانیہ، وسطانیہ، فوقانیہ، کلیہ اور جامعہ) کے معیار کے مطابق مواد اور تربیت کو سامنے رکھ کر اس کے لئے نصاب ترتیب اور تجویز کیا جائے۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ لازمی سے مراد وہ نصاب ہے جو عام مسلمان انسان کو بحیثیت ایک عام شہری کے چاہئے۔ ہم پہلے ایک مسلمان انسان اور ایک شہری ہیں۔ بعد میں کچھ اور۔ اختیاری مضامین کا تعلق طالب علم کی خداداد صلاحیتوں، اس کے رجحانات اور اس کی پسند سے ہے۔ خصوصی نصاب اختیاری مضامین میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وسعت اور گہرائی حاصل کرنے کی سہولتیں پیش کرتا ہے۔ یعنی یہ تخصص کا موقع دیتا ہے۔ ان اداروں میں گائیڈنس (رہنمائی) کا انتظام ہو تاکہ طلباء کی خداداد صلاحیتوں کو معلوم کیا جائے اور انہیں مناسب مشورے دیئے جاسکیں۔ غیر درسی مشغلوں کی اہمیت اور افادیت کو سمجھا جائے۔ اس روشنی میں ورزش، کھیل، تحریر، تقریر، مباحثے، صحافت (رسالے، خبرنامے)، انتظام، مختلف قومی اور ملکی تقریبات کو ان اداروں کے پروگرام کا حصہ بنایا جائے۔ بین المدارس مقابلوں کے ذریعے آپس کی ہم آہنگی کو تقویت دی جائے۔ ان درس گاہوں کا

ماحول مردم ساز اور تاریخ ساز افراد کے لئے سازگار بنایا جائے۔ ان اداروں کے طلباء، فارغ التحصیل اور اساتذہ نہ تو احساس برتری میں مبتلا ہوں اور نہ ہی احساس کمتری کے شکار ہوں۔ بلکہ یہ سب دونوں احساسات سے آزاد ہوں۔ سماج اور ملک کے دھاروں کو سمجھا جائے اور ضرورت کے تقاضوں کے مطابق عملی اقدامات کئے جائیں۔ مدارس کو سماج کا ایک حصہ تسلیم کرتے ہوئے ان کو سماج، جگہ اور وقت سے وابستہ رکھا جائے۔ فلاحی کاموں میں حصہ لیا جائے۔ جس عنوان سے بھی جو تبدیلیاں کی جائیں وہ تدریجی ہوں نہ کہ انقلابی۔ ساتھ ہی یہ تبدیلیاں مستقبل کی روشنی میں جزوی، وقتی اور عارضی نہ ہوں۔ اساتذہ کی تربیت کو لازمی قرار دیا جائے اور اس کا انتظام کیا جائے۔ ان اداروں کو اسلام اور اسلامی معاشرہ کا ترجمان بنانے کی کوشش ہو۔ اس طرح ہم اپنے لئے اور دوسروں کے لئے گویا کہ انسانیت کے لئے اس عالم انسانی میں باعث رحمت بن سکیں۔

# دینی تعلیم
## (تجزیہ و تجاویز)

سید حامد
(سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

دینی تعلیم کے موجودہ نظام میں بہت سی خامیاں ہیں، حیرت اس بات پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ نامساعد حالات اور موجودہ رفتار زمانہ کے باوجود یہ نظام چل کیوں کر رہا ہے۔ دینی مدارس نے ذرائع کی کمی کے ہوتے ہوئے دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے جو کام کیا ہے وہ گراں قدر بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ ان مدارس کا جو تخمینہ بھی کیا جائے، جو جائزہ بھی لیا جائے اس کا آغاز ان کے معلموں اور منتظموں کی خاموش اور بیش بہا خدمات کے اعتراف سے ہونا چاہیئے۔ انہوں نے یہ سب کچھ اللہ کے سہارے، اپنے بل بوتے پر کیا۔ ٹوٹے سے ٹوٹے مدرسے اور ان کے خستہ حال معلم ارتداد کے فتنے اور بے دینی کے سیلاب اور بداخلاقی کی باڑھ کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ یاد کیجئے ہم میں سے کوئی کبھی بھی ان کی دستگیری کے لئے آگے بڑھا؟ اس لئے اب ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ان مدارس کی طرف ترحم یا تحقیر سے دیکھیں یا اونچائی پر بیٹھ کر ان کی اصلاح یا نقل ہیئت یا تنظیم نو اور تجدید کا بیڑا اٹھائیں۔

اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ ہمارے مدارس کی حالت میں بہتری آئے تو ہمیں پہلے ہی کچھ باتوں کو پلو میں باندھنا پڑے گا۔ ناواقفیت یا لاعلمی میں کوئی قدم اٹھانے سے نفع کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہے۔ اگر ہم ان مدرسوں کے نظام کو ناکارہ سمجھتے ہیں اور ان کی ہمہ جہت اصلاح کے درپے ہیں تو ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ متبادل نظام تعلیم کیا ہو، اور کیا اس

متبادل نظام کو چلانے کے لئے مالی، افرادی اور تنظیمی وسائل موجود ہیں، یا فراہم کئے جاسکتے ہیں اور کیا ہمیں یقین ہے کہ ہم نئے نظام کو فراہمی وسائل کے بعد سلیقہ، لیاقت، اتحاد اور مستعدی کے ساتھ چلا سکیں گے۔ اس بات کا اعتراف شروع میں ہی کر لینا مناسب ہوگا کہ فی زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر کسی بڑی مہم کو سر کرنے یا کسی بڑے ادارہ یا نظام تعلیم کو ڈھنگ سے چلانے کی صلاحیت ہے ہی نہیں جس شئے کی صلاحیت ہم میں سرے سے ہے ہی نہیں، اس کے خواب دیکھنے سے کیا حاصل۔ فی الحال ہمیں مرکزیت سے گریز کرنا چاہئے۔ چھوٹی سے چھوٹی مقامی کوششوں کو جڑ سے پکڑنے اور بار آ ہونے دیجئے۔ ابھی ان مدرسوں اور مکتبوں کو نہ چھیڑیئے کہ ایک بار ان میں فساد آگیا تو پھر کسی کے روکے نہ رُکے گا۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کام بننے کی جگہ بگڑ جائے گا۔

اس ضرورت سے البتہ انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دینی مدارس کے بارے میں ایک جگہ اطلاعات اکھٹی ہوتی جائیں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی نے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے ملک گیر سروے کی تکمیل کے بعد دینی مدارس کا سروے شروع کیا تھا مگر اس میں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں اور آخر میں یہ محسوس ہوا کہ سوال نامے کے جواب میں جو اطلاعات آئی ہیں وہ نتیجہ خیز نہیں ہیں نہ ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ ادھوری اور غیر معتبر رپورٹ کو شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اچھا ہو کہ مجوزہ سیمینار میں اس مسئلہ پر پھر غور کر لیا جائے۔ اگر ان مذاکرات سے کچھ ایسی آہٹیں اور روشنیاں ملتی ہیں جو سروے کے احیاء، تجدید اور تکمیل کا تقاضا کرتی ہیں تو غالباً ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کو ایسا کرنے میں ہچکچاہٹ نہ ہو۔

راقم سطور نے علی گڑھ میں اپنے قیام کے دوسرے دور میں اپنی بساط کے مطابق دینی مدارس کے نصاب کی تجدید کے محتاط قدم اٹھائے تھے۔ سید ہاشم علی صاحب کے دور میں اور ان کے زیر ہدایت پروفیسر اسرار احمد صاحب نے مرکز برائے فروغ سائنس کے ذریعہ اس کام کو آگے بڑھایا۔ اس مرکز کے تحت ایک بڑا سیمینار منعقد کیا گیا جس میں دینی مدارس کے نمائندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اس تجویز سے اتفاق کیا کہ نصاب کی تجدید کی ضرورت ہے کہ اس میں ریاضی، سائنس اور انگریزی جیسے جدید مضامین شامل کئے جاسکیں۔ "تہذیب الاخلاق" نے اپنا ایک شمارہ مذکورہ سیمینار کی روداد اور متعلقہ مضامین کے لئے

وقف کر دیا۔ مرکز نے ان مضامین کا نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی اور اس جانب کچھ قدم اٹھائے بھی۔ راقم سطور لاعلم ہے کہ یہ کام پورا ہو پایا ہے کہ نہیں۔ یہ کام بہر حال کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اچھا ہو اگر حالیہ سیمینار مسئلہ کے اس پہلو کی طرف خصوصی توجہ دے۔

محسوس کیا گیا تھا کہ ہمارے بڑے دینی مدارس بالعموم تجدید و توسیع نصاب کی تجویز کا خیر مقدم نہیں کر رہے ہیں ممکن ہے کہ وہ اسے ان لوگوں کی دخل در معقولات سمجھ رہے ہوں۔ جنہیں دینی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ ان رہنما مدارس سے مشورہ کی ضرورت بہر حال رہے گی۔

یہ بات بھی اوائل تجویز میں ہی واضح ہو چلی تھی (۱) رہنما دینی ادارے آوازۂ تجدید پر کان دھرنے والے نہیں (۲) ہمارے چھوٹے چھوٹے دینی مدارس اپنی تنگ دستی اور تنگ دامانی کے کارن اس حالت میں نہیں ہیں کہ نصاب میں ترمیم کی بات سوچیں۔ اب رہ گئے درمیانی حیثیت اور وسعت کے مدارس، ابتدائی کوششوں میں تخاطب انہیں سے ہونا چاہئے کہ وہ تجدید نصاب کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور متعلقہ تجاویز پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہاں مشکل یہ آپڑی کہ اس قبیل کے بیشتر مدارس کی مالی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے اور وہ باوجود خواہش اور کوشش کے انگریزی، ریاضی اور سائنس کے اساتذہ کی شرح مشاہرہ کی تاب نہ لا سکیں گے اور ان میں سے جو کفالت کر بھی سکے ان کے سامنے یہ پر خار سوال سر اٹھائے گا کہ معلّموں کو تنخواہ کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم کرنا کس حد تک جائز ہے اور کہاں تک قابل پذیرائی۔ اس دور میں جب کہ تیزی کے ساتھ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور قدریں گھٹ رہی ہیں، یہ امید بے سود ہے کہ کوئی معلم مذکورہ بالا تین مضامین میں سے کسی ایک کو پڑھانے کے لئے کسی عنوان بھی ایثار کو دل میں راہ دے گا یا اسے ایسے مطالبات اور توقعات میں منعکس کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی ادارہ میں ایک بڑا طبقہ ایسے معلموں کا دکھائی دے گا جنہیں انگریزی، ریاضی یا سائنس پڑھانے والے استادوں سے نصف سے کم تنخواہ ملے گی۔ یہ بات فی نفسہ ناروا ہے اور اس میں ان علوم کی تخفیف و تحقیر ہوتی ہے جن کو پڑھانا ان مدارس کا بنیادی اور ابتدائی مقصد ہے۔ یہ واضح اختلاف یہ شان امتیاز دیکھ کر شاگرد استادوں کے دو گروہوں کا موازنہ جس انداز سے کریں گے وہ ہم سب کی طمانیت کو

برہم کردے گا۔ دینی مدارس کو یہ نصیحت کرنا یا یہ مشورہ دینا آسان ہے کہ وہ جدید مضامین اپنے نصاب میں شامل کر دیں لیکن ان مضامین کے تقاضوں کے بعد افرادی اور مالی وسائل فراہم کرنا بہت دشوار ہے۔ اس کا حل صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستانی مسلمان دینی تعلیم کو فراہمی وسائل کی حد تک اہمیت دینا شروع کر دیں۔ موجودہ روش سے اس قسم کی امید نہیں باندھی جاسکتی۔ دوسری شکل یہ ہے کہ مدارس کی کفالت سرکار اپنے شانوں پر لے لے۔ بہار میں ایسا ہوا ہے۔ اس کے نتائج کے بارے میں متضاد خبریں آتی رہی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرکار کے سایہ عاطفت میں آنے کے بعد مدارس کے معلمین نے وہی سبق سیکھ لئے جو عام اسکولوں کے استادوں کو ازبر ہیں۔ مشاہروں نے نتیجتاً جو جست لگائی ہے اسے وہ تمکین کے ساتھ جذب نہیں کر سکے۔ خود یوپی میں بھی بعض مدارس حکومت کے زیر نگیں ہیں، ان کا کیا حال ہے، اس کی تفصیل میں جانا پڑے گا۔ دوسری ریاستوں میں جہاں بھی مدارس کو سرکاری امداد ملتی ہے اس نوع کی کھوج لگانی پڑے گی۔ لیکن وہ مدارس جہاں دین کی تعلیم دی جاتی ہے، سرکاری امداد کے بہر کیف مستحق نہیں ہوں گے۔ علاوہ بریں دینی مدارس بالعموم سرکار کی امداد قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے، کیونکہ یہ امداد اپنے ساتھ ڈوریاں لے کر آتی ہے، اور جا و بے جا مداخلت کا خطرہ۔

ہم شاید سوچتے بھی نہ ہوں کہ دینی مکاتب و مدارس کا خرچہ چلتا کیسے ہے۔ زکوٰۃ اور چرم قربانی اور وہ رقوم جو مدرسہ کے بھیجے ہوئے سفیر دربدر کی ٹھوکریں کھانے اور نفس کشی کے بعد جمع کر کے لاتے ہیں۔ تنخواہوں کے درمیان وقفہ کی مدت ان کی مقدار کے برعکس ہوتی ہے۔ محصل جب لوٹ کر آتے ہیں تو رزق کا دروازہ کھلتا ہے اور تنخواہیں بانٹی جاتی ہیں۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں ہے کہ بعض مکاتب و مدارس کی حالت سقیم ہے، بعض ان میں سے چندہ فراہم کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی یہ ٹوٹے پھوٹے، خستہ حال، تنگ دامن مکاتب و مدارس اپنا کام بے نفسی، خاموشی، نظم و ضبط، سادگی اور قناعت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اور اگر لاگت اور نفع کا تناسب نکالا جائے تو شرح بہت اونچی نکلے گی۔ صرفہ کم اور نتائج زیادہ۔

مدارس کو مشورہ دینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ حرفتی یا ٹیکنیکل تعلیم بھی دینی چاہئے۔ اس تجویز کو ارباب مدارس نے کئی بار اس اعتراض کے ساتھ رد

کیا ہے کہ دینی تعلیم کو چھوٹے موٹے پیشوں کا سہارا چاہئے ؟ کیا انسان دینی تعلیم پر قناعت نہیں کر سکتا عصری تعلیم کو ٹیکنیکل اور ووکیشنل ( حرفتی اور پیشہ ورانہ ) تعلیم سے لیس کیوں نہیں کیا جاتا، صرف دینی تعلیم کے ساتھ اس کارشتہ جوڑنے میں کیا وہ تحقیر کار فرما تو نہیں جو ہمارے عصری تعلیم کے فارغین دینی تعلیم کے ساتھ روار کھتے ہیں ؟ یہ رد عمل فاصلے اور بدگمانی کی بناء پر ہے ورنہ دوران تعلیم اگر ہاتھ میں کوئی ہنر آجائے تو وہ زندگی میں زاد راہ کا کام کرتا ہے۔ ہنر ہاتھ میں آجائے تو وہ اعتماد اور سرافرازی اور آزادی فکر اور صلابت کردار کے برگ وبار لاتا ہے۔ اس اعتراض میں البتہ وزن ہے کہ عربی مدارس کا نصاب یوں ہی اتنا بھاری اور گنجان ہے کہ اگر اس میں پیشہ ورانہ تعلیم کا اضافہ کیا گیا تو اصل نصاب کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔ لیکن بنیادی بات ترجیح اور رضامندی کی ہے۔ اگر یہ حاصل ہو گئی تو مل بیٹھ کر سر جوڑ کر نصاب میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ نصاب کی مدت میں اضافہ کوئی ایسی دشوار یا نزلہ انگیز بات نہیں ہے کہ وہ غور سے خارج ہو، علاوہ بریں متداول نصاب میں اجمال و اطناب کے بہت سے اجتماعات جن کے مدتیں مختلف ہوں، طالب علموں کی سہولت کے مطابق وضع کئے جاسکتے ہیں۔ عصری تعلیم میں متبادل اجتماعات کی بہت کچھ گنجائش پہلے سے تھی۔ اب اس وصف کو اور شہ دی جارہی ہے، ان ممالک میں بہت زیادہ جو تعلیم کے اعتبار سے آگے ہیں، وہاں یہ خیال پھیل رہا ہے اور یہ رواج زور پکڑتا جارہا ہے کہ ہر نصاب میں ایک بنیادی کورس ہو، اور اس کے بعد بہت سے "موڈیول"۔ بنیادی یا فاؤنڈیشن کورس طالب علموں کی ایک کثیر تعداد کے لئے کافی ہوگا۔ اسے پورا کرنے کے بعد جو طلبہ تعلیم آگے جاری رکھنا چاہتے ہیں وہ بہت سے "موڈیولوں" یا سرپوشوں میں سے اپنی ضرورت اور سہولت اور ذوق اور بساط کے مطابق کچھ چن سکتے ہیں۔ ہمارے علماء اور دینی تعلیم کے ماہرین اگر اس وضعِ تعلیم کو اصولاً تسلیم کرلیں تو مدارس کے نصاب ونظام میں اتنی لچک اور طالب علموں کے لئے اتنی سہولت اور انتخاب میں ایسی وسعت ور خصت راہ پاسکتی ہے جو دینی تعلیم کی توسیع اور تاثیر میں اضافہ کا باعث ہو۔

آج کل دنیا بھر میں غیر رسمی جزوقتی، فاصلہ سے اور، اپنی فرصت کے مطابق، تعلیم کا چلن تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس نظام کے پیچھے دو تصورات کار فرما ہیں (۱) ان طالب علموں کو بھی پڑھنے اور اپنی لیاقت بڑھانے کا حق حاصل ہے جو اپنے حالات، وسائل اور فرصت کے

اعتبار سے اسکولوں، کالجوں یا مدرسوں میں داخلہ نہیں لے سکتے۔ سماج کا فرض ہے کہ ان کے لئے گھر بیٹھے ان کی فرصت کے اوقات کے مطابق تعلیم کا انتظام کیا جائے تا آنکہ تعلیم سے محروم رہ جانے کا کسی کے پاس عذر باقی نہ رہے۔ (۲) تعلیم گاہوں میں جو کچھ حاصل کیا گیا ہے اس پر زنگ نہ لگنے پائے۔ اور ہر وہ شخص جس نے رسمی طور پر یا باضابطہ کچھ بھی تعلیم حاصل کی ہے اپنی کاروباری مصروفیتوں کے دوران اپنے علم کو بڑھاتا اور چمکاتا رہے۔

اس نوع کا انتظام اگر دینی تعلیم کی قلمرو میں رائج کر دیا گیا تو یہ ایک انقلاب آور اقدام ہوگا۔ اس کے زیر سایہ دین سے آگاہی اور شغف بڑھے گا۔ ہمارے بڑے مدارس اور جامعات اگر سر جوڑ کر بیٹھیں اور قدم ملا کر چلیں تو دینی تعلیم کو مراسلاتی نظامِ تدریس کے ذریعہ غیر معمولی توسیع دی جاسکتی ہے، اور اس کا چلن گھر گھر ہو سکتا ہے۔ جو کچھ باضابطہ پڑھا ہے اسے دہرا سکتے ہیں، تازہ کر سکتے ہیں، تاب دے سکتے ہیں اور جنہیں دینی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، توفیق نہیں ہوئی وہ بھی اس سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔

اب ہم باضابطہ یا رسمی طرز تعلیم کی طرف واپس آتے ہیں، وہ جامعات کے پاس وسائل ہیں وہ اپنے یہاں تین دھاراؤں کا اہتمام کر سکتی ہیں۔ (۱) صرف دینی (۲) دینی، جدید مضامین کے ساتھ (۳) دینی، حرفتی، ٹیکنیکل یا پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ۔

طالب علم ان تینوں دھاراؤں میں سے کسی ایک کو چُن سکتا ہے۔ اس طرح علماء کی اس تشویش کا ازالہ بھی ہو جائے گا کہ دینی تعلیم کی تحلیل نہ ہو جائے۔ جے پور کی جامعہ ہدایت نے دینی تعلیم کے ساتھ حرفتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو داخل نصاب کر لیا ہے۔ یہ شاید پہلا تجربہ تو نہیں لیکن غالباً سب سے منظم تجربہ ہے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب محترم اس اقدامیت کے لئے سپاس و ستائس کے مستحق ہیں۔

"کس طرح پڑھایا جائے" یہ بات "کیا کیا پڑھایا جائے" سے کم اہم نہیں ہے۔ طرزِ تعلیم کی تجدید پر تو کسی زاویہ سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔ طرز تعلیم، مواد تعلیم کے تعلق سے غیر جانب دار ہوتا ہے۔ گزشتہ دو سو سال میں خصوصاً پچھلے سو سال کے اندر طریق تدریس یعنی پڑھانے کے ڈھنگ میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کا ساتھ دینے کی کوشش کیجئے تو سانس پھولنے لگے گا۔ کچھ بے اعتدالیوں سے قطع نظر، یہ تبدیلیاں موزوں اور صحت مند ہیں اور انسان کے ذہنی نشو و نما کی ضروریات کو ملحوظ رکھتی ہیں۔ زور یاد کرنے سے زیادہ

سمجھنے پر دیا گیا ہے۔ حافظہ کی سخت گیری کی اپنی جگہ ہے۔ لیکن ذہن کی کشودگی اس سے افضل ہے۔ یوں تو دونوں باہم گتھے ہوئے ہیں۔ جو بات یاد ہو گئی وہ حافظہ سے محو بھی ہو سکتی ہے۔ یہ یاد رکھئے کہ جو بات سمجھ لی گئی اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ حافظہ کی گرفت میں پورے مکان کا نقشہ آجاتا ہے۔ سمجھ یا فہم یا ذہن بنیاد راک ردے پر رذار کھتا ہوا چلتا ہے، اور جب تک کہ اسے پتہ نہ چل جائے کہ مکان کیوں بنایا گیا، کیسے بنایا گیا اور اس کے بنانے کے کیا کیا طریقے ممکن ہیں، وہ آگے نہیں بڑھتا۔ حافظہ سے مفر تو ہرگز نہیں کیونکہ ذہن کی عمارت ہی حافظہ کی بنیاد پر کھڑی کی جاتی ہے۔ لیکن بنیاد کو بنیاد کی حد ہی تک رکھنا چاہئے، اُسے دیوار اور چھت، صحن اور چمن سب کچھ سمجھ لینا خود حافظہ کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ حافظہ کی شبیہہ اس طرح بجُوتی ہے۔

جس طرح کہ انسانیت بٹوارہ قبول نہیں کرتی اسی طرح علم بھی ناقابل تقسیم ہے۔ علم نے اگر صدیوں کے تجربے کی روشنی میں تعلیم و تدریس کے نئے نئے طریقے ڈھالے ہیں تو ان طریقوں کا چلن اور ان کی افادیت دینی اور عصری تعلیم دونوں کے لئے برابر ہے۔ دینی تعلیم کو ان سے محروم کرنا صریح کفرانِ نعمت ہے اور دینی تعلیم کے ساتھ زیادتی۔ طرزِ تدریس یا "پے ڈاگوجی" کی دریافتوں سے منہ پھیر لینا خود اپنا نقصان کرنا ہے۔ آپ ان کو تحتِ نظر لائیے، ان پر غور کیجئے، انہیں اپنی ضروریات، موضوعات اور مقاصد کے مطابق ڈھالئے، ان میں ضروری ترمیم کیجئے اور اس کے بعد انہیں وسیع پیمانے پر اختیار کر لیجئے۔

دینی تعلیم کو مہر بند رکھنے سے کام نہ چلے گا، ہم اس طرح اس کی افادیت کو محدود کر دیتے ہیں، اور اسے نظر کی اس تازگی سے محروم کر دیتے ہیں جس کے بغیر علم مرجھانے لگتا ہے۔ دینی تعلیم کے غیر دینی عناصر کو صدیاں پھلانگوا کر عہد حاضر میں لانا ہے۔ ان میں نئے مضامین کی خاطر کانٹ چھانٹ بھی کرنی ہے۔ غور فرمائیے اگر ہماری دینی تعلیم عالمی آگاہی کے دروازے اپنے اوپر بند کر لے گی تو اس کے فارغین اپنے گرد و پیش اور ان مسائل سے جو عہد حاضر نے پیدا کئے ہیں، کتنے بے خبر رہ جائیں گے۔ وہ اسلام کی نہ توضیح کر سکیں گے، نہ اشاعت، نہ اس بات کو عملی جامہ پہنا سکیں گے کہ اسلام دین فطرت ہے، اسلام ضابطہ حیات ہے۔ حیات سے اور اس کے گوناگوں اور ہر آن بدلتے ہوئے مسائل سے تو آپ نے منہ موڑ لیا پھر ضابطہ کا اطلاق آپ کا ہے پر کریں گے۔ ہمارے بہت سے گھروں میں قرآن کریم کو خیر و برکت کے لئے جزدان میں لپیٹ کا طاق پر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی روش

ہم نے اس کی تعلیمات کے ساتھ بھی روا رکھی ہے۔ اگر ایسا ان مذاہب کے ماننے والے کرتے جہاں مذہب کا ایک ستون رہبانیت ہے اور جہاں دنیا سے کنارہ کشی کار ثواب گنی جاتی ہے تو یہ بات کچھ کچھ سمجھ میں آجاتی، لیکن یہاں تو یہ طریق ایک ایسی شریعت میں اختیار کیا جارہا ہے جہاں ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرنا ممنوع اور مذموم ہے۔ نتیجہ کیا ہوا، روزمرہ کی زندگی سے مذہب کے نقوش اثر مٹتے چلے گئے۔ مذہب ظواہر عبادات سے عبارت کیا جانے لگا۔ افکار و اعمال و اخلاق و اطوار میں سرایت ہونا درکنار ان پر اس کی پرچھائیں پڑنا بھی کم ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔ وہ فارغین مدارس جنہیں عصری آگہی سے کوئی سروکار نہیں رہا، وہ دوسروں کے لئے اسلام کی نہ تشریح کر سکیں گے نہ تبلیغ، اور اس پر آئے دن جو حملے ہوتے رہتے ہیں ان کا دفاع بھی ان کے بوتے کی بات نہیں ہے۔

دینی مدارس کی تعلیم، مواد، موضوع اور طریق تدریس کے تعلق سے انقلاب اور عہد آفریں تبدیلیوں کی طالب ہے۔ ان کی ضرورت سے اگر آنکھ موند لی گئی تو ٹوٹے میں نہ صرف دینی تعلیم رہے گی بلکہ عام مسلمانوں کا فہم دین مجروح ہوگا، اور دین کے بارے میں جو الزامات لگائے جا رہے ہیں اور غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلائی جارہی ہیں ان کے سیلاب کے آگے ہم پسپا ہوتے چلے جائیں گے۔ دینی تعلیم کے نصاب کے بارے میں عالم اسلام کو مل کر ورزش اور کوشش کرنی چاہیئے۔ نئے طریق تدریس کو اپنانے کے لئے تو اس کی ضرورت بھی نہیں۔

لیکن سیل اصلاح کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں اس طرح بہالے جائے کہ دینی تعلیم کی بناء جیسی بھی وہ فی الوقت ہے خلل پذیر ہونے لگے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ پہلے تو ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم دینی تعلیم کے لئے ضروری وسائل فراہم کرنے کی حیثیت میں ہیں یا نہیں۔ اگر ہم وسائل فراہم نہیں کر سکتے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا اس سے بہتر ہوگا کہ ترمیمات کی باڑھ اور توقعات کا سیلاب ان کے انتشار اور انہدام کا باعث بن جائے۔ مشورہ دینے کا حق انہی کو ہے جو اس کو عمل میں لانے کے لئے ساز و سامان فراہم کر سکیں۔ ان مدارس کو افرادی، استشاراتی اور مالی وسائل کی شدید ضرورت ہے اور ایسے حضرات کی جن کو تاریخ کا شعور ہو اور امکانات پر نظر رکھنا جن کا شعار ہو اور جن کی دینی حمیت اور ملی بصیرت کو یہ گوارہ نہ ہو کہ دینی تعلیم عصری تعلیم کے بہت پیچھے گھسٹتی ہوئی

چلے۔

یہ خیال بھی ذہن میں بار بار آتا ہے کہ دینی مدارس کی کفالت مقامی اوقاف اپنے ذمے لے لیتے۔ لیکن تعلیمی اور تعمیری کاموں کا جہاں تک تعلق ہے، چھوٹتے ہی وقف کا دوسرا مفہوم کارفرما ہونے لگتا ہے۔

دینی مدارس نے بلاارادہ اور ضمناً ایک اور بڑا کام کیا ہے۔ ان کی بدولت یوپی جیسی ریاستوں میں اردو کا رسم خط جزئی طور پر ہی سہی، محفوظ ہوگیا ہے۔ ورنہ اتر پردیش کے اردو والوں کو یہ شان امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے ۴۳ سال کی قلیل مدت میں اردو زبان کو اپنے گھروں سے بڑے موثر انداز سے نکال باہر کیا۔ یوپی میں اردو تھوڑی بہت جو باقی ہے وہ ان ہی مدارس کی وجہ سے ہے۔

مختصر یہ کہ دینی مدارس اپنی ظاہری فلاکت اور زبوں حالی کے باوصف ہمارا بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہوں نے دینی، اخلاقی، لسانی، ادبی اور ثقافتی میدانوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان پر زنگ نہ لگنے دیں، انہیں نئے اسالیب تدریس سے مستفید ہونے کا موقع دیں اور ان کے نصاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کر کے انہیں ملک و ملت کے لئے سرمایہ افتخار بنادیں۔ اس کے لئے شہر شہر، گاؤں گاؤں، محلے محلے، مقامی سطح پر موثر کوشش ہونی چاہیے۔

# دینی مدارس

محمد معین الدین
(مدھوپٹن' کٹک)

۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء میں صوبہ یوپی کے گورنر سر جان اسٹریچی نے اپنے ایک معتمد جان پامر کو اس غرض سے دارالعلوم دیوبند بھیجا کہ وہ خفیہ طور پر تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرے کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصد کیا ہے اور علمائے اسلام دارالعلوم کے پس پردہ کس فکر و عمل میں مصروف ہیں۔ جان پامر نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو رپورٹ تیار کی اور جو تاثرات اس نے پیش کئے وہ دارالعلوم کے بنیادی موقف کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ لکھتا ہے کہ میری تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ 'نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہوتے ہیں۔ کوئی ضروری علم ایسا نہیں جو یہاں پڑھایا نہ جاتا ہو۔ جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرفہ سے بھی نہیں ہوپاتا وہ یہاں کا مولوی چالیس روپے کی معمولی تنخواہ میں کررہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہوسکتی اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلم بھی یہاں تعلیم حاصل کرے تو نفع سے خالی نہ ہوگا' انگلستان میں اندھوں کا اسکول سنا تھا مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کف دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید۔

عصری علوم کو مدارس دینیہ میں داخل نہ کرنے کی نہایت ہی حکیمانہ و بلیغانہ علت استاذ الملک حضرت مولانا یعقوب صاحب دیوبندی نور اللہ مرقدہ' نے بتلائی۔ فرماتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جب نقد و ادھار جمع ہوں تو ہر شخص نقد کو ترجیح دیتا ہے ادھار پر راضی نہیں

ہوتا' اب سمجھ لیجئے کہ علوم دینیہ و فکر آخرت موخر بلکہ غیر مقصود بن کر رہ جائیں گے اور عصری علوم کا اوخال مفید ثابت نہ ہوگا بلکہ مضر ہوگا اور جو عظیم کام مدارس دینیہ میں ہو رہا ہے وہ بھی نہ ہوگا۔ بلکہ مدارس کی شکل ایک معجون مرکب کی ہو جائے گی اور جس کا نتیجہ نہ وصال خدا نہ وصال صنم کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہم خدا خواہی وہم دنیاے دوں — ایں خیال است و محال است وجنوں

چناں چہ مدرسہ دیوبند کی بابت بڑے بڑے انگریزوں کی تحریر ہے کہ اگر مدرسہ کی مذہبی تعلیم میں دنیوی تعلیم شامل ہوگئی تو اس کا مذہبی خالص رنگ باقی نہ رہے گا جو مدرسہ کی مایہ ناز اور طرۂ امتیاز اساس ہے۔

# دِینی مدارِس اور اُن کا نصابِ تعلیم

جناب شبیر احمد خاں غوری (علی گڑھ)

۱۹۳۰ء میں جب یوپی میں پہلی کانگریسی سرکار بنی تو نیشنلسٹ علماء کی تحریک پر حکومت یوپی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ان عربی مدرسوں کے نصاب کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی بنائی۔ جنہیں سرکار سے امداد ملی تھی۔ کمیٹی بن تو گئی مگر نو سال اجلاس نہ ہو سکا۔

۱۹۴۵ء میں انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی کی آسامی پر "قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند" میرے لئے نصاب کی اصلاح سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ جب تک ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے سامنے کوئی روشن مستقبل نہ ہو' خود ان مدارس کا وجود "شے ماند شے دیگر نمی ماند" سے زیادہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔ نصاب میں جو چاہیئے اصلاح کر دیجئے' پڑھنے کون آئے گا۔ ہاں نصاب میں جدید علوم اور سائنس ہی نہیں' ہندی اور سنسکرت بھی ٹھونس دیجئے' طلبہ یہ سب لوہے کے چنے چاب جائیں گے۔ بشرطیکہ انہیں یقین ہو کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں بھی وہی حقوق و مراعات حاصل ہوں گے جو یونیورسٹی کے گریجویٹس کو حاصل ہوتے ہیں یعنی یہ طلبہ بھی جملہ سرکاری ملازمتوں پر فائز ہونے کے اہل ہوں' نیز ٹیکنیکل ٹریننگ جیسے انجینئرنگ اور میڈیسن کے کالجوں میں بھی انہیں داخلے کا حق حاصل ہو۔

بہر حال نو سال بعد مولانا آزاد عربک کمیٹی کے تن بے جان میں حرکت ہوئی۔ اسی عرصہ میں ضیاء الحسن علوی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ کمیٹی کے محرکین کو مجھ سے ذاتی طور پر پرخاش نہیں تھی' اس لئے مجھے بھی کمیٹی کا ممبر بنالیا گیا۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں مولانا آزاد کی

سرکاری رہائش گاہ پر کمیٹی کا پہلا اجلاس ہوا۔ بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ جب دیگر حضرات بول چکے تو میں نے مولانا کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔ شاید مولانا اس سے پہلے اسی انداز پر سوچتے رہے ہوں گے۔ بمصداق "متفق گردید رائے بو علی با رائے من" میرے اس خیال سے سو فیصدی متفق ہو گئے۔ اب میں نے ایک اور گستاخی کی اجازت چاہی۔ ظاہر ہے مجوزہ Integrated Syllabus کے پڑھانے کے لئے جو علوم دینیہ اور علوم جدیدہ کا ممزوجہ ہو' ایسے اساتذہ درکار ہوں گے جو اس کڑی کمان کو زہ کر سکیں اور اس کی توقع ہمیں ان اساتذہ سے نہیں کرنا چاہئے جو دس دس' پندرہ پندرہ روپے پر صبح سے شام تک پڑھاتے تھے۔ پھر حسب تجویز مولانا آزاد عربی ادب اور حدیث کی تعلیم کے لئے مصر و شام اور حجاز سے ماہرین فن بلا کر رکھے جائیں گے جنہیں پروفیسر کا گریڈ دیا جائے گا تو پھر گھر کے پیروں ہی کو تیل کا مالیدہ کیوں؟ یہ معروض بھی شرف قبولیت سے نوازی گئی۔ لہٰذا دو سب کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ایک فائنانس سب کمیٹی مولانا کے پرسنل سیکریٹری اجمل خاں صاحب کی زیر صدارت اور دوسری نصاب کمیٹی استاذ مرحوم ڈاکٹر عبدالعلیم کی زیر صدارت۔

میں اس سے پہلے امتحانات عربی و فارسی یوپی کے نصاب کو از سر نو تشکیل دے چکا تھا مگر وہ نصاب اس اساسی مقصد کے پیش نظر بنایا گیا تھا کہ ان امتحانات کے پاس کرنے کے بعد امیدوار ہائی اسکولوں میں پرشین ٹیچری کا اہل ہو جائے۔ میں نے اس کے افق ذہنی کو کچھ زیادہ وسیع بنانے کی تدبیر کی۔ مثلاً فاضل دینیات سنی کے اصول فقہ کے نصاب میں تلویح توضیح تا مقدمات اربعہ اور مسلم الثبوت تا تمام درس مقرر تھیں۔ یہ کتابیں حنفی مسلک کی ترجمان ہیں۔ ضمناً دوسرے مذاہب کے مواقف کی تردید پر بھی مشتمل ہیں۔ اس سے مزاج میں مناظرانہ بحاثی کا ملکہ تو راسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسروں کے افکار و خیالات کے ہمدردانہ یا کم از کم غیر معاندانہ افہام و تفہیم کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ حالاں کہ ایک متمدن سماج کی تعمیر کے لئے یہ صلاحیت شرط اولین ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ طالب علم نور الانوار یا حسامی میں دوسرے مذاہب کے مواقف سے واقفیت اس عزم مبہم کے ساتھ حاصل کرے کہ صحیح ہو یا غلط مجھے اس کی تردید ہی کرنا ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ طالب علم دوسروں مثلاً شوافع کے نقطۂ نظر سے انہیں کے انداز میں واقفیت حاصل کرے۔ اس لئے تقابلی مطالعہ کے طور

پر کم از کم بیضاوی کی "منہاج الاصول" بھی فاضل، دینیات کے اصول فقہ کے پرچہ میں داخل کر دی گئی۔

اس اصول کو مولانا آزاد عربک کمیٹی کے نصاب میں ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔ یعنی طالب علم شوافع کے ساتھ مالکیہ اور حنابلہ کے نقطۂ نظر پر بھی علی وجہ الکمال بصیرت حاصل کرے اور اس طرح ان دونوں مذاہب کے اصول فقہ کا ایک ایک متن متین اصول فقہ کے مجوزہ نصاب میں داخل کر دیا گیا۔ میں تو یہاں تک چاہتا تھا کہ سنی نصاب دینیات میں اثنا عشری مذہب کا اور اثنا عشری نصاب میں سنی مذہب کا ایک مختصر متن مزید داخل کر دیا جائے۔ مگر نواب سید مہدی حسن اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

لیکن اصل مسئلہ نصاب مجوزہ میں علوم جدیدہ کے شمول کا تھا' کیوں کہ اسی کی بنیاد پر ہم اپنے طالب علموں کے لئے یونیورسٹی کے طلبہ سے برابری کا حق مانگ رہے تھے۔ اس سلسلے میں یہ جدت کی گئی کہ یونیورسٹیوں میں ان علوم مثلاً فلسفہ' معاشیات' سیاسیات' ریاضیات وغیرہ کا جو نصاب مقرر ہے اسے اصولی طور پر تو اپنالیا گیا مگر اس کے ساتھ اسلامی مسلک کی ترجمانی کے لئے متعلقہ مضمون کی تقسیم میں کچھ اضافہ کر دیا۔ مثلاً اس زمانہ میں معاشیات میں بی اے کے اندر نصاب دو پرچوں پر مشتمل تھا۔ ایک Principles of Economics اور دوسرا Indian Economics۔ ہم نے تین پرچے تجویز کئے۔ تیسرا پرچہ اسلامی معاشیات Islamic Economics کا تھا' جس پر اس وقت تو کوئی معیاری کتاب نہیں ملی۔ مگر جدید معاشیات کے جو اہم اور غیر اہم مباحث ہیں' ان میں سے تقریباً ہر مبحث پر فقہ کی کتابوں مثلاً ہدایہ' مبسوط وغیرہ نیز دوسری کتابوں جیسے احکام السلطانیہ الماوردی' کتاب الخراج' امام ابی یوسف' کتاب الاموال' مقدمہ ابن خلدون' حجتہ اللہ البالغہ وغیرہ میں ضروری مواد مل سکتا ہے۔ یہ مواد منتشر طور پر پھیلا ہوا ہے۔ اب یہ اس مضمون کے معلّم کا کام ہے کہ اسے تلاش کر کے جدید انداز میں مدون کرے۔

کچھ اسی قسم کا انداز ریاضیات میں اختیار کیا گیا۔ اس زمانہ میں بی ایس سی Mathematics کے تین پرچے ہوتے تھے۔ دو Pure Mathematics کے اور تیسرا Applied Mathematics کا تجویز یہ کیا گیا کہ ہر ذیلی مضمون میں جدید ریاضی کے

ساتھ قدیم ریاضی سے بھی طالب علم کو واقف کرادیا جائے۔ مثلاً اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہائر الجبرا بھی تھا۔ جس کا ایک اہم مبحث Cubic یا تیسرے درجہ کے مساواتوں پر مشتمل تھا۔ جنہیں کارڈان کے بتائے ہوئے خالص الجبرائی انداز میں Solve کیا جاتا تھا۔ میری تجویز یہ تھی کہ خیام نے اپنے "الجبر والمقابلہ" میں تیسرے درجہ کی مساواتوں کو جس طرح Conic Sections کی مدد سے حل کیا ہے۔ طالب علم کو اس سے بھی واقف کرایا جائے۔ جیومیٹری کے اندر "مخروطات" کا فن Coordinate Geometry کے ضمن میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ "مخروطات اطبونیوس" میں سے کم از کم پہلے دو مقالوں ہی سے واقفیت کرادی جائے۔ کیوں کہ اس فن کے اندر مسلم عبقریت نے بنو موسیٰ کے زمانے سے خان تفضل حسین خاں اور مولوی غلام حسین جونپوری کے زمانہ تک جو جگر کاویاں کی ہیں' ان کا زندہ رکھنا ان کے اخلاف کا ملی فریضہ ہے "میراث پدر خواہی علم پدر آموز"۔ اس کے ساتھ ہیئت جولاہ کے دوش بدوش قدیم علم الہیئت سے فی الجملہ واقفیت بھی ضروری ہے۔ مولانا آزاد خود اس فن کے سلسلے میں "تریاکئ قدیم تھے دود چراغ کے"۔ اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی سعی و کاوش سے "قانون مسعودی" زیور طباعت سے آراستہ ہو کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

اس نصاب میں خامیاں اور کوتاہیاں ضرور ہوں گی جن کا مجھے صمیم قلب سے اعتراف ہے' مگر مجھے شکوہ ہے اپنے ہم نفسان ست قدم سے جنہوں نے اس پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے کی بھی زحمت نہیں فرمائی۔ کسی نے اسے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ اس کی افادیت و عدم افادیت سے قطع نظر یہ کہاں تک قابل عمل ہے اور اس سائنٹیفک تبصرہ کے بغیر ہر مدح تحسین ناشناس اور ہر دم سکوت قدر شناس سے زیادہ ساقط الاعتبار ہے۔

مولانا آزاد کے سامنے یہ نصاب رکھ دیا گیا۔ شاید وہ اس کوشش کی خاموش تحسین بھی فرمارہے ہوں گے۔ کیوں اس کے اندر انہیں دیرینہ خواب کی تعبیر مل رہی تھی کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کا Fateful دن آپہنچا اور ماؤنٹ بیٹن کے اعلان نے نہ صرف برصغیر بلکہ اس "عاجز سخن" کے خیال میں عربی مدارس کے مستقبل کا بھی فیصلہ کر دیا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو چاہتا تھا اسے مل گیا۔ اس کے بعد مجھے اور شاید مولانا کو بھی یہ آواز اٹھانے کا حق کہاں رہ گیا تھا

کہ اس نصاب کی تکمیل کے بعد مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو ملازمت اور ٹریننگ کے وہ جملہ حقوق ملنے چاہئیں جو یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ کو حاصل ہوتے ہیں۔

لہذا ۱۸ نومبر ۱۹۴۸ء کو کمیٹی کا اختتامی جلسہ ہوا۔ مولانا نے اس سلسلے کے جملہ کاغذات سیکریٹری کمیٹی سے اور نصاب کا مسودہ مجھ سے یہ کہہ کر لے لیا کہ اب میں خود اس پر رپورٹ لکھوں گا۔ اس سے آگے کی خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ اتنا سنا ہے کہ یوپی کے وزیر تعلیم کئی سال تک شکوہ کرتے رہے کہ مطلوبہ رپورٹ ابھی تک نہیں آئی۔

مضی ماضی۔ اب بھی جو جواں ہمت مصلحین "لاتقنطوا من رحمة الله" پر یقین محکم رکھتے ہیں' وہ اصلاح نصاب کے کام کو پھر وہاں سے شروع کریں' جہاں مولانا آزاد عربک کمیٹی نے اسے چھوڑا تھا۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

# مدارِس عربیہ

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی
(دینی تعلیمی کونسل، لکھنو)

مدارس عربیہ کا تشخص دینی علوم کی تعلیم سے قائم ہے۔ بہت سے بہی خواہوں کو بعض اسباب کی بنیاد پر یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ان علوم کے فارغین کی اقتصادی اور معاشی حالت کمزور ہو رہی ہے۔ اس لئے ان کو کوئی ہنر سکھانے کا انتظام کیا جائے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ سائنس جس تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے۔ اس سے بھی انہیں واقف کرایا جائے۔ جذبہ تو اچھا ہے، لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ دوسری چیزوں پر توجہ ہو جانے کے بعد یکسوئی قائم نہیں رہتی، اور اکثر اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے ہمیں ملک کے حالات اور ان تمام ضرورتوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہو گا، جس سے مسلمانوں کو سابقہ ہے۔

اوّل تو مسلمانوں کا بحیثیت تعلیمی تناسب بہت کم ہے۔

بنیادی طور پر مسلمانوں کی تعلیم کے چار محاذ ہیں۔ ایک عوامی اور عمومی تعلیم جس کا کینوس سب سے زیادہ وسیع ہے۔ یعنی صباحی اور شبینہ مکاتب اور پرائمری تعلیم درجہ ایک سے درجہ پانچ تک۔

دوسرا عصری تعلیم کا محاذ، جونیئر اسکول کی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تک میڈیکل، انجینئرنگ، کامرس، کمپیوٹر، الیکٹرانک وغیرہ تیسرا دینی مدارس جس کا تناسب مشکل سے اعشاریہ ۲ یا ۳ سے زیادہ نہیں ہے اور دال میں نمک کے برابر ہے۔ چوتھا خواتین کی تعلیم جس کا تناسب مشکل سے ایک فیصد ہے۔

اسلام کا بنیادی مقصد انسان کو اس کی حقیقت' خدا سے تعلق اور دنیا و آخرت میں اس کے طرز زندگی اور انجام سے باخبر رکھنا اور اس سلسلہ میں اس کی مکمل رہنمائی کرنا ہے۔ دینی علوم سے اچھی واقفیت کے بغیر اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان علوم میں اچھی استعداد پیدا کرنے کے لئے خاصہ وقت درکار ہوتا ہے۔ یہ تعلیم کئی مرحلوں سے گزرتی ہے۔ ابتدائی درجات میں سائنس' جغرافیہ' تاریخ اور حساب کی بھی تعلیم ہوتی ہے' لیکن اوپر کے درجات میں خصوصیت سے قرآن مجید' تفسیر' فقہ اور عربی ادب اور اس سے متعلق مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مضامین کی وسعت کی وجہ سے اور مضامین کی گنجائش نکالنا ممکن نہیں رہ جاتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جدید دور کے عصری نظام تعلیم سے پہلے زندگی کے تمام شعبوں میں ایسے ہی اداروں کے فارغین خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ ان ہی اداروں نے بلند پایہ مصنف بھی پیدا کئے اور اعلیٰ درجہ کے منتظم بھی' ممکن ہے بعض ملکوں کے مخصوص حالات میں ان اداروں کے فارغین کی مارکیٹ ویلیو کم ہو' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ لوگ اپنی روٹی روزی کے لئے کبھی سڑکوں پر نہیں آئے اور نہ اس کے لئے تحریک چلاتے ہیں۔ بلکہ جن علاقوں میں ان کو عصری سہولتیں زیادہ مل گئی ہیں' ان میں احساس ذمہ داری کا فقدان نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ معاشی بے چینی بڑھ رہی ہے۔ عصری علوم کے اداروں میں جہاں تنخواہ کا معیار بہت زیادہ ہے' یہ صورت حال اور بھی تشویش ناک ہے۔ تمام یونیورسٹیوں میں جہاں اسلامک اسٹیڈیز کے شعبے بھی قائم ہیں' کوئی بڑا علمی کام ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس کے مقابلہ میں جن کے وسائل محدود جن کی تنخواہیں کم ہیں' انہوں نے اس میدان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ جس طرح میڈیکل انجینئرنگ' دوسرے شعبوں سے متعلق لوگوں کو اور کاموں میں الجھنا مناسب نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح ان اداروں میں نئی چیزوں کا اضافہ مفید نہیں ہوگا۔ عالم ہو جانے کے بعد بے شک تخصص کے لئے کسی خاص مضمون میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے اور مضامین کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مخصوص حالات میں عصری علوم میں امتیاز رکھنے والوں اور دینی امور میں مخصوص مہارت رکھنے والوں کا اشتراک مفید ہو سکتا ہے اور یہی طریقہ جدید مسائل کو حل کرنے میں معاون

ہوگا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت تعلیم کا رقبہ تو بہت بڑھ گیا ہے لیکن تربیت کا پہلو عمومی طور پر بہت کمزور ہو گیا ہے اور اس کا گراف گرتا چلا جارہا ہے۔ عصری علوم کے ادارے ہوں یا دینی علوم کے' ہر جگہ یہ مسئلہ بے حد تشویش ناک ہے۔ ظاہر ہے مضامین کے اضافہ سے یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ تربیتی نظام کو بہتر بنانے' طالب علمی کے زمانے میں جاں فشانی اور فرض شناسی کے اوصاف پیدا کرنے سے ہی یہ مسئلہ قابو میں آسکتا ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی جوہر تھا جس نے بڑے بڑے کام کرائے۔

# دینی مدارس اور اُن کا نصابِ تعلیم

مولانا محمد اشفاق سلفی

(مدرسہ احمدیہ سلفیہ' دربھنگہ)

مدارس کے کردار کی بحالی اور اس کے فارغین سے امت مسلمہ کی وابستہ امیدیں تب ہی پوری ہو سکتی ہیں جب کہ وہاں کا تعلیمی و تربیتی نظام عمدہ اور نصابِ تعلیم بامقصد اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو گا۔ مدارس کے نظام و نصاب تعلیم کی درستگی پر امت کی ترقی منحصر ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہم بالاختصار نصاب اور نظام تعلیم پر گفتگو کرتے ہیں۔

## نصابِ تعلیم

کسی بھی نصابِ تعلیم کی قدر و قیمت اور اس کی افادیت و آفاقیت کا پتہ اس کی پیش کردہ معلومات اور طلبہ کی اس سے رغبت و انہماک اور اہداف و مقاصد کے حصول سے لگایا جا سکتا ہے۔ اگر نصاب سے طلبہ کو حاصل ہونے والی معلومات ناقص ہوں یا طلبہ کو اس سے شغف نہ ہو' نیز تعلیم کے مقاصد حسن و خوبی حاصل نہ ہوتے ہوں تو ایسا نصاب ناقص اور فرسودہ کہلائے گا۔ نصابِ تعلیم کو عمدہ اور مفید بنانے کے لئے بنیادی طور پر چند امور کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے:

(۱) ہر تعلیمی مرحلہ کی معلومات اس کے حاصل کرنے والے طلبہ کی عقلی صلاحیت کے مطابق اور ان کے فہم و ادراک کے موافق ہوں تاکہ وہ پوری طرح سمجھ کر ان معلومات کو حاصل کریں اور وہ معلومات ان کے دماغ میں دیرپا ہوں۔

(۲) کسی بھی مواد یا سبجیکٹ اور اس کے تعلیمی اوقات اور پیریڈس (Periods) کے درمیان

مناسبت لازمی ہے۔ اتنا طویل نصاب مقرر نہ کیا جائے کہ مقررہ اوقات اور مدت مدرسہ میں اس کی کماحقہ تدریس ممکن نہ ہو اور مدرس سطحی طور پر طلبہ کو مقررہ نصاب سے گزار دے' اور نہ نصاب اتنا مختصر ہو کہ وقت گزاری کی جائے اور ایک ہی موضوع کو کئی کئی دن تک دہرایا جائے۔ مدارس کے نصاب کی مطول کتابوں کے ساتھ اکثر یہی معاملہ ہوتا ہے اور مختلف درجات میں ایک ہی موضوع تکرار کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سبجیکٹ کی دوسری اہم معلومات طلبہ سے اوجھل رہتی ہیں۔

(۳) ہر مرحلہ میں پڑھایا جانے والا مواد ضروری حد تک کافی ہو' تاکہ طالب علم کو اس موضوع کی معلومات اس قدر حاصل ہو جائے کہ عملی میدان میں اس کے لئے آسانی ہو۔

(۴) نصابِ تعلیم میں حالات اور عصری تقاضوں کے تحت تعدیل و تبدیل یا حذف و اضافہ کی گنجائش ہونی چاہیے اور تقاضائے وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفید علوم وفنون کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔ دور حاضر میں طلبہ مدارس کے سامنے معاش کا مسئلہ بہت اہم ہے اگر مدرسوں میں ٹیکنیکل تعلیم مثلاً کتابت و ٹائپنگ' سلائی و گھڑی سازی وغیرہ کا انتظام کر دیا جائے اور اس کو باقاعدہ لازمی مواد کی حیثیت دی جائے تو بہت حد تک فارغین مدارس کے معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہمارے بزرگ علمائے دین تدریس کے علاوہ دیگر حلال ذرائع سے روزی کمایا کرتے تھے۔

ان بنیادی امور کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم اگر دینی عربی مدارس کے نصاب تعلیم پر غور کریں اور ضروری تبدیلی لائیں تو بہت وقیع اور بامقصد تعلیم ہوگی اور مدرسہ میں حیات و نشاط پیدا ہوگا اور طلبہ کی بے حسی اور بے دلی دور ہو جائے گی۔

جہاں تک مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم کا تعلق ہے تو ہمارے مدارس کے نصاب کے تین اجزاء ہیں۔ زبان و ادب کی تعلیم' مذہبی و اخلاقی علوم کی تعلیم اور ضروریات زندگی کے مطابق سماجی علوم کی تعلیم۔ جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے تو وہ بھی مجمل اور عمومی معلومات کی حد تک مدارس کے تعلیمی مرحلہ میں نصاب کا لازمی جز قرار دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ دینی و عصری علوم کے حسین امتزاج کے بعد ہی مدارس کا نصاب ہماری انفرادیت اور سماج کے تقاضوں کو موجودہ وسیع اور متنوع حالات میں پورا کر سکتا ہے۔

## مذہبی علوم

عربی دینی مدارس میں تفسیر وحدیث' فقہ واصول اور عربی ادب اہم مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان فنون کے رائج نصاب پر مختصر نوٹ ملاحظہ فرمایئے۔

**(الف) فن تفسیر :** چوں کہ قرآن مجید اصل الاصول اور امت مسلمہ کا دستور العمل ہے اور ہر زمان ومکان میں یہ شمع ربانی دائمی نصاب ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا اس کے ترجمہ وتفسیر کی تعلیم پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ بہر حال چند سالہ نصاب کے ذریعہ مکمل قرآن مجید ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ طلبہ کو پڑھایا جانا چاہیئے تاکہ وہ قرآن فہمی کی عظیم نعمت سے بہرہ ور ہو جائیں۔ اکثر مدارس میں تفسیر جلالین اور بیضاوی پڑھائی جاتی ہے۔ گو تفسیر جلالین مکمل مدارس کا دو سالہ نصاب ہے لیکن عملاً اکثر مدارس میں اس کی تعلیم تکمیل تک نہیں پہنچتی اور تفسیر بیضاوی زیادہ سے زیادہ سورۂ بقرہ تک پڑھائی جاتی ہے۔ پھر یہ تفسیری کتابیں بہت ہی مختصر معلومات فراہم کرتی ہیں اس طرح طلبہ میں علوم القرآن اور تفسیر کا علم ناقص ہوتا ہے۔ ان کی نظر محدود اجزاء اور سورتوں پر ہوتی ہے۔ مفسر قرآن مولانا آزاد فن تفسیر سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ پر انہوں نے وادیاں اور مراحل طے کئے تھے' ان کے ۲۷ سالہ گہرے مطالعہ کا نچوڑ "ترجمان القرآن" ہے جو اسی شہر رانچی میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے لکھا گیا۔ اس کا اسلوب نرالا اور اندازِ بیان دل کش ہے۔ تحقیقی معلومات آسان اور عام فہم زبان میں پیش کر کے امت پر مولانا نے احسانِ عظیم فرمایا۔ غیر ضروری مباحث میں الجھے بغیر کتاب الٰہی کی عمدہ ترجمانی فرمائی۔ جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء۔ میرے خیال میں مدارس کے موجودہ تفسیری نصاب کو بدل کر اس کی جگہ ایسی جامع تفسیر کی کتاب داخل نصاب کی جائے جو آسان اسلوب کے ساتھ ساتھ جامع معلومات پر مشتمل ہو اور اسی ایک کتاب کو چند سالوں میں مکمل طریقہ پر پڑھایا جائے۔ علامہ شوکانیؒ کی تفسیر "فتح القدیر" یا علامہ ابن کثیرؒ کی تفسیر القرآن العظیم عمدہ اور معرکتہ الآرا تفسیری کتابیں ہیں۔

**(ب) فن حدیث :** احادیث نبویہ شریعت اسلامیہ کی دوسری اصل عظیم ہے۔ اس کی تعلیم بعض مدارس میں منتخب ابواب تک محدود ہے اور بعض مدرسوں میں اس کے دورے کئے جاتے ہیں جب کہ بعض جگہوں پر ہر سال حدیث کی ایک معرکتہ الآرا کتاب اطمینان کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے تاکہ طلبہ بہ سہولت احادیث کا فقہ و فہم حاصل کر سکیں۔ اگر عربی درجات میں مشکوٰۃ المصابیح اور صحاح ستہ کی ایک ایک کتاب ہر سال داخل نصاب ہو جائے تو طلبہ کی استعداد میں اضافہ اور تفقہ فی الحدیث کا ذریعہ ثابت ہو گا۔

**(ج) فقہ واصول :** کا ایک جامع نصاب بحمد للہ مدارس عربیہ میں موجود ہے لیکن نصاب کی تمام فقہی کتابیں کسی خاص نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں۔ اگر ان کی جگہ کوئی فقہ مقارن جو ائمہ اربعہ و دیگر ائمہ کے مسلکوں کی وضاحت دلیلوں کے ساتھ کرتی ہو پڑھائی جائے تو انشاء اللہ اس سے فقہی و مسلکی جمود ٹوٹے گا اور طلبہ میں استنباط و اجتہاد کی صلاحیت پیدا ہو گی۔

**(د) عربی ادب :** عربی ادب اور اس سے متعلقہ فنون مثلاً نحو و صرف اور علم بلاغت وغیرہ بھی بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ تقریباً مدارس کے تمام تعلیمی سالوں میں نظم و نثر کا مجموعہ پڑھایا جاتا ہے لیکن قواعد کی تعلیم اونچے درجوں میں دی جاتی ہے۔ جس کے سبب طلبہ کی ادبی صلاحیت آگے چل کر کمزور ہو جاتی ہے۔ لہذا درجہ علیا میں بھی قواعد کی تعلیم کا بندوبست کیا جانا چاہیئے۔ علاوہ ازیں عربی ادب کی نصابی کتابوں کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ بعض کتابیں فحش اور عشقیہ اشعار سے پر ہیں مثلاً دیوانِ متنبی اور بعض کی عبارتیں قدیم اسلوب اور سخت و پیچیدہ تراکیب پر مشتمل ہیں۔ مثلاً مقامات حریری و ہمدانی۔ اور پھر ان کی تعلیم کا کوئی تربیتی واخلاقی اثر بھی طلبہ پر نہیں پڑ رہا ہے۔ اگر ان کتابوں کا نصاب سے بالکلیہ اخراج نہ کیا جا سکے تو کم از کم ان کتابوں کا عمدہ حصہ منتخب کر لیا جائے۔ زبان و ادب کا تہذیب و تمدن پر گہرا اثر پڑتا ہے لہذا زبان و ادب کو اسلامی و اخلاقی اقدار کا ترجمان ہونا چاہیئے۔

## عصری علوم

آج بھی بہت سے مدارس میں فلسفہ قدیم اور علم و منطق و ہیئت کی تعلیم متعدد سالوں

تک دی جاتی ہے۔ جب کہ ان علوم کی افادیت آج صفر کے برابر ہے۔ البتہ منطق کی کوئی ابتدائی کتاب فقہی اصطلاحات سمجھنے کی خاطر طلبہ کو پڑھادینی چاہیے اور دیگر تمام قدیم اوراق فلسفہ و منطق کی کتابوں کو خارج کر کے ان کی جگہ عصری علوم معاشیات' سیاسیات' علم ریاضی وہندسہ اور جغرافیہ و سائنس کو نصاب کا لازمی جز قرار دیا جائے۔ ہندوستان کی پہلی سرکاری زبان ہندی اور عالمی زبان انگریزی کی معیاری تعلیم مدارس عربیہ میں دی جانی چاہیئے تاکہ طلبہ ان زبانوں میں بھی دین کی دعوت دوسروں تک پہنچاسکیں اور دین کی طرف سے مدافعت کرسکیں۔

## نظامِ تعلیم

نظامِ تعلیم کے چار بنیادی عناصر ہیں۔ مناہج تعلیم، منتظمین مدارس' معلمین حضرات اور طلبہ' مناہج کے سلسلہ کی چند باتیں اوپر بیان میں آگئی ہیں اگر منتظمین ومدرسین اور طلبہ اپنی ذمہ داری کو سمجھ کر کام کریں اور مدارس کے قیام کے مقاصد ان کے سامنے ہوں تو ان میں محنت اور لگن کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دینے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ منتظمین کا کام تعلیمی سہولیات فراہم کرنا' نظم و قانون کو بحال کرنا اور خاطر خواہ کام انجام دلوانے میں مدد دینا ہے جب کہ صالح اور ذی صلاحیت مدرس کی حیثیت اساس اور بنیاد کی ہے۔ طلبہ کی علمی استعداد کو بڑھانے اور ان کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے قابل اور باصلاحیت مدرسین کی فراہمی کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ اور یہ اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ باصلاحیت مدرسین بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں۔ محققین کا اکال پڑا ہوا ہے۔ مدارس کے طلبہ احساس کمتری کے شکار ہیں۔ تعلیم و تعلم اور فریضہ دعوت و تبلیغ کی اہم ذمہ داریوں سے غافل ہو کر ان کا مقصد محض ڈگریاں حاصل کرنا اور ان کے ذریعہ سرکاری اداروں میں نوکری حاصل کر کے زندگی کے عیش و آرام کا بہتر سامان کرنا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ روزی کمانا کوئی برا نہیں ہے لیکن ساری مقصدیت کو فوت کر دینا اور صرف حصول رزق کا ذریعہ علم کو سمجھنا ستم قاتل ہے جو اس عہد کے طلبہ میں سرایت کر گیا ہے۔ الا ماشاء اللہ بہار کے اکثر چھوٹے بڑے مدارس بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پٹنہ سے ملحق ہیں۔ مدرسہ بورڈ کا طریقہ تعلیم اور

امتحانات کی دھائی...... اور ج۔ ب کا حال محتاج بیان نہیں۔ ج کی کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ اسکول اور کالجوں کے طلبہ اور دیہات میں کام کرنے والے اور بمشکل تمام اردو لکھنے پڑھنے والے لوگ عالم اور فاضل کی ڈگریاں رکھنے اور مدرسوں میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں گویا کند چھری سے بچے ذبح ہو رہے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو تحقیقی علم رکھنے والوں کا ذکر ہی چھوڑ یئے نماز اور دیگر حالتوں کی مسنون دعاؤں کا علم رکھنے والے بھی امت کو دستیاب نہیں ہوں گے' نظام تعلیم کی درستگی کی خاطر دو ایک مدرس اضافی بھی مدرسہ میں موجود رہنے چاہئیں تاکہ اصل مدرس کی غیر موجودگی میں طلبہ کی کلاس خالی نہ رہے اور طلبہ اپنا وقت گھومنے پھرنے میں ضائع نہ کریں۔ مدارس میں علمی مذاکرات اور سماجی امور پر وقتاً فوقتاً ہفتے بھی منائیں جائیں کیوں کہ جب تک تعلیم کا تعلق ہماری عملی زندگی سے نہ ہو گا۔ مدارس جمود و تعطل کا شکار رہیں گے۔

# دِینی مدارِس کے مسائل

ڈاکٹر رضی احمد
(گاندھی نگر ہالیہ' پٹنہ)

جمہوری تقاضوں کے مدنظر مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو کئی تعلیمی سہولتیں اور مواقع فراہم کیے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے درمیان روایتی مکتبوں کا سلسلہ بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ جس نے بلاشبہ بے مثال تعمیری رول ادا کیا ہے اور آج بھی اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ان کی افادیت کا اقرار کرتے ہوئے موجودہ صورت حال میں ان کے تدریسی نظام اور سلیبس میں فی زمانہ موڑ دینے کی اشد ضرورت ہے۔

حکومت بہار نے مدرسوں کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے مدرسہ بورڈ کی تشکیل کی لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بورڈ بد عنوانیوں کی آماج گاہ بن گیا ہے اور اس کے ذریعہ چلایا جانے والا نظام کرپٹ نظام مان لیا گیا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ آج جو معاشرتی ڈھانچہ اُبھر کر سامنے آگیا ہے' اس سے مسلمان اچھوتے نہیں رہیں گے' لیکن ایسے ادارے جن کے ذمہ کردار سازی کے ساتھ دنیاوی بہتری کی دوہری ذمہ داری سونپی گئی ہو' وہاں بد عنوانیوں کا دور دورہ قابل معافی نہیں۔ یہ کرپٹ نظام اور اس نظام کے ذمہ داران کس طرح کے علماء پیدا کریں گے؟ ایسی تعلیم گاہوں سے کیسی نسل پروان چڑھ کر نکلے گی؟ اور پھر ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ ایسے اداروں کی بد عنوانیوں نے پورے مسلم معاشرے کی طرف انگلی اُٹھانے کا موقعہ فراہم کر دیا ہے۔ حکومت نے مواقع کے ساتھ ذرائع بھی فراہم کئے ہیں' ان کا جائز اور بہتر استعمال کیا جانا چاہیے۔ اگر ہم ایسے اداروں کا بہتر نقشہ اور ماڈل پیش

نہیں کر سکے تو ان کی افادیت ہی کیا؟ ہر محلے اور گلیوں میں سینکڑوں اسکول اور کالج پڑھے لکھے کہے جانے والے Criminals کو پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جب ہم مدرسوں کی بات کریں گے تو لوگوں کے ذہن میں دین کے ساتھ کردار سازی کا سوال بھی آئے گا۔ لہذا ایسے اداروں میں کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اگر ہم نے مواقع اور ذرائع کا بہتر استعمال نہیں کیا تو وقت اور تاریخ ہمیں نہیں معاف کرے گی۔ ہم کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ مستقبل کی نسل ہماری نااہلیت 'بد عنوانیوں اور خود غرضیوں کا خمیازہ بھگتے گی اور ہمارے ناموں پر تھوکے گی۔ اس لئے ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ موجودہ سہولتوں کا خاطر خواہ فائدہ حاصل کریں اور اس کے لئے ایسی پلاننگ کریں جو نئی نسل میں فی زمانہ چیلنج کے مقابلہ کی صلاحیت پیدا کرنے میں مددگار تو ہو ہی 'اپنے مخصوص کردار اور تشخص کو بنائے رکھنے کا حوصلہ پیدا کر سکے۔ وہ صرف لکیر کا فقیر نہ بنی رہے۔

# دوراستے

سید محمد عابدی
(سابق پرنسپل' مدرسہ سلمانیہ' پٹنہ)

جہاں تک نصاب کے بنیادی ڈھانچہ کا سوال ہے' میرے خیال میں درست ہی ہے' اس لئے کہ اس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکول کے نصاب سے مطابقت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی لڑکا مدرسہ سے اسکول میں منتقل ہونا چاہے تو اسے دقت نہ ہو' نیز اس لئے بھی کہ مدرسہ کے طالب علم متداول علوم سے بالکل نابلد نہ رہیں' کچھ نہ کچھ واقف رہیں۔

لہذا مدرسہ بورڈ کا تیار کردہ نصاب مناسب ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ طلبہ پر بوجھ کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔

وسطانیہ کا نصاب تعلیم تمام کرنے کے بعد طلبہ میں دینی علوم' عام ضرورت کی سطح تک حاصل ہو جاتے ہیں' اس لئے اس کے بعد سے دوراستے کر دیئے جائیں ایک دست کاری اور دوسرا محض تحصیل علم کا۔ پہلا راستہ وہ طلبا اختیار کرلیں جو محض عالم دین بننا نہیں چاہتے یا ان میں اس کی صلاحیت نہ ہو کہ اس میدان میں آگے چل کر کسی لائق ہو سکیں تو وہ کوئی کام سیکھ کر اپنی روزی کما سکیں گے۔ جس کے لئے اس کے ماہرین کے مشورہ سے شعبے کھولے جا سکتے ہیں۔

اور دوسرا راستہ یعنی محض "تحصیل علم دین" انہیں طلبہ کا کام ہو جن میں علوم کے قبول کرنے کی صلاحیت ہو اور محض علم ہی اپنا مشغلہ رکھنا چاہتے ہوں تاکہ آئندہ وہ اساتذہ کی صف میں آسکیں اور پیش آنے والے علمی مسائل کو بذریعہ علم حل کر سکیں۔ نیم طبیب خطرہ جاں نہ بنیں۔ جس مذہب اور جس مسلک کا جو ادارہ ہو اس کی خصوصیات اس میں محفوظ رہنی چاہئیں۔

# دینی ادارے' ایک سازش کا شکار
## (بہار کے مدرسوں میں تعلیم)

ڈاکٹر نہال احمد کریمی
ریڈر شعبہ علم طبعیات بی این کالج' پٹنہ
ممبر اکیڈمک کونسل' بہار اسٹیٹ مدرسہ بورڈ

(۱) مدرسوں کی انتظامیہ کمیٹی کے اختیارات پر پابندی لگا دی گئی۔

(۲) مدرسین کی بحالی و برخاستگی کو مدرسہ بورڈ سیکریٹری و چیئرمین پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ انتظامیہ کمیٹی کے رائے کو بالائے طاق رکھ کر اپنا فیصلہ صادر کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسین آزاد ہو گئے اور درس و تدریس کو چھوڑ کر مدرسہ بورڈ پٹنہ کا چکر لگانے لگے۔

(۳) تعلیمی نصاب کافی کشادہ کر دیا گیا۔ جس میں انگریزی و عربی نصاب خلط ملط ہے۔ جس کی وجہ سے بچے نہ انگریزی تعلیم کے لائق رہے اور نہ عربی تعلیم پر مہارت ہوئی۔

(۴) امتحانات معین وقت سے ایک سال پیچھے ہوا کرتے ہیں اور امتحانات میں چوری کھلے عام ہو رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں لڑکے قرآن و حدیث کے ٹکڑے لے کر چوری کرتے ہیں عالم دین یعنی مدرسین' مدرسہ کے حکام اس کام کو کرا کر دنیاوی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

(۵) ان ہزاروں مدرسوں میں سینکڑوں ایسے ہیں جو صرف کاغذ پر ہیں۔ کچھ مدرسے بیل کے گھروں میں ہیں یا کسی جھونپڑی پر بورڈ ٹانگ کر ظاہر کئے گئے ہیں۔

(۶) مدرسہ بورڈ میں ایک اکیڈمک کانسل بھی ہے' جس کا قیام بالکل نام نہاد ہے جس کی میٹنگ ایک آدھ بار ہو جایا کرتی ہے۔ اور اس کے مشورے بھی بالائے طاق ہوتے ہیں۔

(۷) مدرسہ بورڈ کے اونچے عہدہ پر بحالی سیاسی پہنچ والوں کی ہوتی ہے۔ جس شخص سے

مدرسہ میں یا مدرسہ کے نظام میں بے راہ روی پیدا ہوتی ہے اسی کو ان عہدوں پر برقرار رکھا جاتا ہے۔

(۸) مختلف قسم کے گرانٹس مدرسوں کی حالت یا ضروریات کا جائزہ لے کر نہیں دیئے جاتے یا پھر اسے دیا جاتا ہے جو بورڈ کو کچھ فی صد چھوڑ دیں۔

(۹) مدرسین کی بحالی کے لئے مدرسہ بورڈ اپنا (Expert) بھیجتا ہے جس کا کوئی (Panel) نہیں ہے۔ کچھ خاص لوگ بار بار بھیجے جاتے ہیں۔

ان دینی اداروں کی حالت بڑی افسوس ناک ہے' انہیں ختم کرنے کی ایک لمبی سازش ہے۔

کوئی بھی ادارہ یا نظام اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک کہ اس کے کارندوں کو یہ ڈر نہ ہو کہ ہماری غلطیوں یا کوتاہیوں کی سزا فوراً ملے گی یا بڑی غلطی پر نکالے بھی جا سکتے ہیں۔ مدرسوں کی حالت کو سدھارنے کے لئے کچھ اہم اقدام اٹھانا ضروری ہے۔

(۱) ایک اعلیٰ درجہ کی کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو چار پانچ غیر سیاسی تعلیم یافتہ اور متقی پرہیزگاروں پر مشتمل ہو۔

یہ کمیٹی مدرسوں کے حالات کا ان امور پر جائزہ لے کر (الف) کتنے مدرسے بورڈ سے ملحق ہیں اور کتنے غیر ملحق ہیں۔ (ب) کون کون سے مدرسے طبعی طور پر موجود ہیں اور کون کون صرف کاغذ پر ہیں۔ (ج) کن مدرسوں میں تعلیم کا کیا معیار ہے۔ (د) کون کون مدرسہ کتنے یتیم و نادار بچوں کی کفالت کر رہا ہے۔ (ہ) مدرسین و تنظیمی کمیٹی کا مدرسہ کے ترقی میں کیا رول ہے۔ (و) ان مدرسوں میں پڑھنے والے لڑکوں کی کیا حالت ہے اور فارغ شدہ لڑکے کیا کر رہے ہیں۔ (ز) عوام و گورنمنٹ سے ملی ہوئی رقم کس طرح خرچ کی گئی ہے۔ (ح) مدرسہ بورڈ کے عہدہ داروں کی مالی حالت پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے؟

(۲) موجودہ نصاب میں ترمیم کی جائے۔ موجودہ نصاب میں ترمیم کے علاوہ ایک خالص دینی نصاب عمل میں لایا جائے۔ ان الحاق شدہ مدارس سے فوری طور پر کچھ مدارس کو چن لیا جائے جس میں خالص دینی (عربی) نصاب لاگو ہو اور اس کی اونچی سے اونچی تعلیم دی جائے' جس میں مختلف شعبوں کے علاوہ مطالعات و تحقیقات اسلامی کا شعبہ بھی ہو۔

(۳) مدرسہ کی انتظامیہ کمیٹی کے اختیارات بحال کئے جائیں' مدرسین کی بحالی و برخواستگی کا اختیار پورے طور پر کمیٹی کو ہو۔

(۴) ہر مدرسہ میں شعبہ صنعت و حرفت کا قیام ہو۔

(۵) ایک مدرسہ ٹیچرس ٹریننگ سینٹر کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس میں مدرسین کو علم دین کی روشنی میں ٹریننگ دی جائے اور بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دینے کا طریقہ بتایا جائے۔

(۶) ایک انسپکشن ٹیم بنائی جائے جو مدرسوں کا انسپکشن کیا کرے اور اس کی رپورٹ پر عمل ہو۔ یہی ٹیم مدرسوں میں ہونے والے ہر طرح کے تنازعات کو مدرسہ کے مقام پر جاکر ختم کرے جو فائنل ہو۔

(۷) جو مدرسے بورڈ سے الحاق شدہ ہیں انہیں بھی گرانٹس دی جائیں۔

(۸) امتحانات وقت پر ہوں۔ چوری میں ملوث لڑکوں اور مدرسین دونوں کو سزا ہو۔

# عربی مدارِس کے نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح

جناب مولانا محمد طاہر مدنی
(استاذ جامعۃ الفلاح 'بلریا گنج' اعظم گڑھ 'یو۔ پی)

مدارس کا نصاب و نظام اگرچہ تغیر پذیر رہا ہے۔ لیکن مقصد تعلیم اٹل اور نا قابلِ تغیر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مقصد ہمارے سامنے آجائے۔ کیوں کہ کوئی نصاب تعلیم یا نظام تعلیم بجائے خود مقصود و مطلوب نہیں ہوتا بلکہ کسی مقصد کا خادم اور اس کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس کی قدر و قیمت اسی مقصد کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ مدارس کے مقصد تعلیم کی وضاحت حسب ذیل نکات کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

ایسے افراد کو تیار کرنا جو :

☆ فکر و نظر اور ذہنیت کے اعتبار سے سچے پکے مسلمان ہوں اور جنہیں اسلامی عقائد پر علی وجہ البصیرت یقین ہو۔ ☆ تفقہ فی الدین اور مجتہدانہ صلاحیت و استعداد کے حامل ہوں۔ ☆ تبلیغ و اشاعت دین کے جذبے سے سرشار ہوں۔ ☆ اسلامی سیرت و کردار کا پیکر ہوں۔ ☆ اپنے عہد کے تقاضوں سے واقف ہوں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ☆ دنیا میں اپنے پیر پر کھڑے ہونے کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہوں۔

مقصد تعلیم کی اس وضاحت کی روشنی میں مدارس کی موجودہ صورت حال کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ نصاب و نظام تعلیم دونوں میں اہم اصلاحات کی ضرورت ہے۔

## (الف) نصابِ تعلیم میں اصلاح کی تجاویز :

☆ مدارس کے موجودہ نصاب کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامیات اور عربی علوم کی حیثیت سے جو چیزیں پڑھائی جا رہی ہیں ان میں کچھ تو مقصود بالذات ہیں مثلاً تفسیر

حدیث اور فقہ اور کچھ کی حیثیت وسائل وذرائع کی ہے مثلاً نحو صرف اور بلاغت' نصاب میں غالب حصہ انہیں علوم کا ہونا چاہیئے جو مقصود اصلی ہیں۔ علوم آلیہ کو اتنی ہی اہمیت اور وقت ملنا چاہیئے۔ جتنی ضرورت ہو' لیکن باوجود یہ کہ ابن خلدون کے عہد ہی سے اس سلسلے میں آوازیں بلند ہورہی ہیں' تاہم رائج الوقت نصاب میں علوم آلیہ ہی کا غلبہ ہے۔ یہ صورت حال افسوس ناک ہے۔ اسے لازماً بدلنا چاہیئے۔ قرآن و سنت جو مقصود اصلی ہیں انہیں پورے نصاب پر غالب ہونا چاہیئے۔

☆ معقولات کے غیر ضروری بوجھ سے نصاب تعلیم کو آزاد کرنے کے لئے آوازیں ایک عرصہ سے بلند ہورہی ہیں۔ لیکن اس ضمن میں قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوپائی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معقولات کی قدیم کتابوں اور قدیم علم کلام کو بس اسی حد تک نصاب میں شامل رکھا جائے' جس سے اصطلاحات کی ضروری واقفیت ہوجائے تاکہ قدما کی کتابیں پڑھنے میں دشواری نہ ہو بقیہ چیزوں کو نصاب سے خارج کردیا جائے اور اس کی جگہ جدید فلسفہ اور موجودہ افکار و نظریات کو اس طرح شامل نصاب کیا جائے کہ طلبہ ان سے واقف ہوسکیں اور ان کے رد کے لئے تیار ہوسکیں۔

☆ فقہ کا نصاب ہمارے مدارس میں اس طرح کا ہے کہ اس سے طلبہ میں مجتہدانہ بصیرت اور استخراج مسائل کی صلاحیت و اہلیت پیدا نہیں ہوپاتی۔ نصاب میں اصول کا حصہ کم اور فروع کا زیادہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اصول کا حصہ زیادہ شامل نصاب کیا جائے اور ان کے انطباق کی عملی مشق طلبہ کو بہم پہنچائی جائے تاکہ طلبہ کے اندر کتاب و سنت سے مسائل کے استنباط و استخراج کی اہلیت پیدا ہو۔ اس سلسلے میں جدید طرز پر لکھی ہوئی اصول کی کتابوں کو شامل نصاب کیا جانا چاہیئے۔

☆ موجودہ نصاب میں تاریخ کا عنصر بہت کم ہے حالاں کہ عہدِ حاضر میں فن تاریخ نے غیر معمولی اہمیت حاصل کرلی ہے لہٰذا مدارس کے نصاب میں فن تاریخ (تاریخ عالم' تاریخ اسلام' تاریخ ہند) کی شمولیت انتہائی ضروری ہے۔

☆ رائج الوقت نصاب میں عربی زبان و ادب اور انشاء کی اہمیت بہت کم ہے اور اس کے طریقہ تعلیم میں بھی خامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس میں آٹھ دس برس عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی' فارغین عربی زبان میں اپنے خیالات کے اظہار پر قادر نہیں ہوتے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مقامات بدیع الزماں اور مقامات حریری کے طرز کی کتابوں کے بجائے ادب جاہلی کے منتخب اجزاء اور بعد کے ادوار کی منتخب ادبی کتابیں شامل نصاب کی جائیں اور جدید عربی اور عربی انشاء پر خاص زور دیا جائے۔

☆ عصری علوم سے چشم پوشی کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اسلام دین و دنیا کی تفریق کا قائل نہیں ہے کہ کچھ علوم دنیوی ہوں جو غیر مطلوب ہوں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم مفیدہ مطلوب و مستحسن ہیں عصری علوم سے واقفیت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان کے بغیر مدارس کے طلبہ عصر حاضر کے تقاضوں سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتے ہیں اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام کماحقہ انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ لہذا یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ مدارس میں سائنس و ریاضی' معاشیات' سماجیات اور پولیٹیکل سائنس وغیرہ عصری علوم شامل نصاب کیے جائیں۔

☆ مدارس کے طلبہ کے لئے یہ بات بھی بہت ضروری ہے کہ وہ مختلف مذاہب و ادیان سے واقفیت رکھتے ہوں۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ مدارس کے فارغین اپنے ملک میں پائے جانے والے مختلف مذاہب مثلاً ہندو مذہب' جین ازم' بدھ ازم اور سکھ مت وغیرہ کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے۔ لہذا مدارس کے نصاب میں مختلف ادیان کے تقابلی مطالعہ کا عنصر ضرور شامل کیا جانا چاہیے۔

☆ انگریزی زبان نے موجودہ دور میں غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ وہ بین الاقوامی رابطے کی زبان بن گئی ہے۔ لہذا مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان کو لازماً شامل ہونا چاہیے اور برائے نام نہیں بلکہ اتنی استعداد بہم پہنچانے کی کوشش ہونی چاہیے کہ مدارس کے فارغین پورے طور سے انگریزی سمجھنے اور بولنے پر قادر ہوں تاکہ وہ موجودہ عالمی افکار سے واقفیت حاصل کرتے رہیں اور اس زبان کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے استعمال کر سکیں۔

☆ ہمارے ملک کے پس منظر میں ہندی زبان کی خصوصیت اہمیت ہے۔ یہ یہاں کی اکثریت کی زبان ہے' برادرانِ وطن کے اندر دعوتی کام کرنا ہمارا فریضہ منصبی ہے۔ ''وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه'' کے اصول کے پیشِ نظر ہندی زبان یہاں کی دعوتی زبان ہے۔ لہذا مدارس کے نصاب میں اسے لازماً شامل ہونا چاہیے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہمارے فارغین نہ صرف ہندی زبان سے واقف ہوں بلکہ پورے طور پر ہندی زبان میں اپنے

خیالات کا اظہار پر قادر ہوں تاکہ برادران وطن میں حسن و خوبی دعوت اسلامی کا کام انجام دے سکیں۔

☆ مدارس عربیہ کی تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فنی تعلیم اور صنعت و حرفت کا نظم بھی مدارس میں رہا ہے۔ لہٰذا مدارس میں اس طرح کے مختلف شعبہ جات کا نظم بھی ہونا چاہیے جن میں طلبہ طب، کتابت، گھڑی سازی، جلد سازی اور ٹائپنگ وغیرہ سیکھ سکیں تاکہ مدارس کے فارغین اپنے پیر پر کھڑے ہو سکیں اور عزت و وقار کے ساتھ معاشرے میں اصلاح و دعوت کا کام انجام دے سکیں۔

## (ب) نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم میں اصلاح کی تجاویز:

نصاب کے علاوہ مدارس کا نظام اور طریقہ تعلیم بھی اصلاح طلب ہے جس کے بغیر مدارس کی کارکردگی بہتر نہیں بنائی جا سکتی۔ ذیل میں اس سلسلے کی چند تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔

☆ مدارس کے نظام میں ایک خامی یہ ہے کہ ہر طالب علم کو "مجموعہ علوم" بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کسی فن کا ماہر نہیں ہو پاتا۔ علوم و فنون نے بڑی ترقی اور وسعت حاصل کر لی ہے۔ ایک ہی شخص کے لئے جملہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لینا دشوار ہے۔ لہٰذا اختصاصی تعلیم کا طریقہ اپنانا چاہیئے۔ ایک خاص مرحلے تک مختلف علوم و فنون سے ضروری واقفیت بہم پہنچانے کے بعد اختصاصی تعلیم کے مختلف شعبے ہوں جن میں طلبہ اپنے ذوق و رجحان کے مطابق داخل ہوں۔ اس طرح ہم مختلف علوم کے ماہرین پیدا کر سکیں گے۔

☆ مدارس کے نظام میں ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ عام طور سے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی جانب مدارس نے کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ حالاں کہ تعلیم نسواں کی اہمیت و ضرورت بہت زیادہ ہے۔ خواتین ہمارے معاشرے کا نصف حصہ ہیں اور نئی نسل کی پرورش و تربیت کی بھاری ذمہ داری ان پر ہے۔ اصلاح معاشرہ اور نئی نسل کی صالح تربیت کے لئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ خواتین کو علم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ مدارس کو اس سلسلے میں خصوصی توجہ دینی چاہیئے اور لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا لازماً نظم کرنا چاہیئے۔

☆ مدارس کے نظام میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ طلبہ کی غیر درسی مصروفیات کا کوئی مربوط و منظم نظم نہیں ہے جس کی وجہ سے طلبہ کی مختلف صلاحیتیں اجاگر نہیں ہو پاتی ہیں۔ لہٰذا مدارس کے نظام میں اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ کے اندر تحریر و تقریر اور انتظام و انصرام کی مختلف صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جا سکے۔

☆ مدارس عربیہ کی تاریخ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت پر خصوصی توجہ رہی ہے اور علم کے ساتھ ساتھ اساتذہ اپنے طلبہ کی سیرت و کردار کو نکھارنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ طلبہ آٹھ دس سال مدارس میں گزار کر آتے ہیں اور سیرت و کردار کے اعتبار سے ان میں بلندی پیدا نہیں ہو پاتی الا ماشاء اللہ۔ لہٰذا مدارس کا نظام تربیت اتنا عمدہ ہونا چاہیئے کہ وہاں سے نکلنے والے طلبہ اسلامی اخلاق و کردار کا پیکر ہوں اور اپنے سیرت و کردار سے اصلاح معاشرہ اور دعوت اسلامی کی خدمت انجام دیں۔

☆ مدارس کے طریقہ تدریس میں ایک بڑی خامی کتابی طریقہ تدریس کا رواج ہے حالاں کہ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عصر اول میں یہ طریقہ رائج نہ تھا۔ بلکہ املا اور لیکچر کا طریقہ رائج تھا۔ یہ بڑا مفید اور کارآمد طریقہ ہے جس میں وقت کی بھی بچت ہوتی ہے۔ کتابی طریقہ تدریس میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے اور اس کا ایک بڑا نقصان یہ کہ طالب علم کے ذہن کے دریچے بند ہو جاتے ہیں۔ اس طریقہ تدریس نے مسلمانوں میں ایسی درسی کتابیں لکھنے کا رواج دیا جو چیستاں بن کر رہ گئیں۔ لہٰذا کتابی طریقہ تدریس کے بجائے املائی طریقہ تدریس کو اختیار کرنا چاہیئے۔

☆ مختلف فنون کی تعلیم مادری زبان میں ہو تاکہ بیک وقت طلبہ پر کئی بوجھ نہ پڑیں۔

☆ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم آزادانہ غور و فکر کے ساتھ ہونی چاہیئے تاکہ طلبہ میں کسی طرح کی کوئی عصبیت پیدا نہ ہو ان اساسی علوم کی تدریس کے دوران مسائل حاضرہ پر انطباق بھی ہوتا رہے۔

# دینی مدارس کا نصاب

ڈاکٹر محمد محسن

(سابق صدر شعبہ نفسیات پٹنہ یونیورسٹی' پٹنہ)

دینی مدارس کے نصاب میں دینی تعلیم کی اولیت مسلم ہے۔ قرآن حکیم کی روشنی میں دینی تعلیم کو ہم دو شقوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک جس کا تعلق حق اللہ سے ہے اور دوسری جس کا سروکار حق العباد سے ہے۔ دونوں اقسام کی تعلیمات کا سرمایہ قرآن' حدیث اور فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے دینی مدارس کے نصاب میں ان تینوں کی شمولیت لازمی ہے۔ قرآن و حدیث کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فقہی مسائل کی ترتیب و تدوین بھی انہیں کی روشنی میں وجود میں آئی ہے۔

حق اللہ کا تعلق خدا اور بندے کے رشتے سے ہے۔ جہاں تک حق اللہ کا معاملہ ہے اس کی براہ راست' مضمر اور آشکار' بالقوہ اور بالفعل ادائیگی ایمان بالغیب اور صوم صلوۃ کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ حق العباد سے کسی فرد یا جماعت کے وہ حقوق اور مطالبات مراد ہیں جو دوسرے افراد یا جماعت سے وابستہ ہوں۔ ایک دوسرے کی نسبت فرائض اور ذمہ داریاں حقیقت میں اسلام کے نظریات کے مطابق آدمی کے انفرادی فریضے اور مسائل حق اللہ کی حدود سے تجاوز نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ فرد یا افراد کے سارے مسائل کی' جن میں زکوۃ اور حج کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے' حیثیت سوشل یعنی معاشرتی ہے اور ان کا سروکار بین الناس معاملات سے ہے۔ حق العباد کا براہ راست تعلق انہیں سے ہے۔ اسی بناء پر قرآن حکیم نے رہبانیت کو اسلام سے خارج کر دیا ہے۔ انسانی آبادی سے یکسر علیحدگی اور سماجی تعلقات سے ہر اعتبار سے کٹ جانے کے بعد آدمی سوائے حق اللہ کی ادائیگی کے ' حق العباد سے وابستہ ساری ذمہ داریوں اور فرائض سے مبرا ہو جاتا ہے۔ حق اللہ کا رتبہ اولین ہوتے ہوئے بھی'

حق العباد کا درجہ تقریباً اس کے متوازی ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن مجید میں حق العباد کے بیانات ان کی تشریح و توضیح جتنے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں' حق اللہ کی تکرار سے قطع نظر' ان کے مقابلے میں اس کی تفصیلات و وضاحت کسی شمار میں نہیں آتی۔

ہمارے علماء جنہیں دینی معاملات میں رہنمائی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے عموماً دینی مدارس سے فارغ التحصیل اصحاب میں سے ہی ہوتے ہیں۔ دینی مسائل کا تعلق خواہ حق اللہ سے ہو یا حق العباد سے' ان کے سلسلے میں خصوصاً ہمارے عوام اور اکثر خواص بھی انہیں سے رجوع کرتے ہیں' اور دینی معاملات میں ان ہی کی قیادت پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جہاں تک حق اللہ کا تعلق ہے' اس کے مسائل کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے اور ہر عالم دین نسبتاً آسانی' ان کے متعلق ہماری حاجت روائی کر سکتا ہے۔ لیکن حق العباد کے مسائل کی گرانی اور گہرائی بسااوقات ایسی عقدہ کشائی کا مطالبہ کرتی ہے جس کی فراہمی کی توقع غیر معمولی استعداد اور فہم و فراست کے مالک سے ہی کی جا سکتی ہے۔ حق العباد کا واسطہ کارخانہ حیات کی ان بین الناس سرگرمیوں اور جدوجہد سے ہے جن کے خدوخال زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ روز روز نیا رنگ و روپ اختیار کرتے جاتے ہیں۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں' زمانہ نت نئے مطالبات اور تقاضوں کی پیش کش کرتا رہتا ہے' خصوصاً عہد حاضر میں' جسے تکنیکی دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں ایسی تنظیمیں اور ادارے' ثقافتی' اقتصادی' صنعتی' سیاسی' مشکل ہی سے دکھائی دیں گے جن میں قدیم اور روایتی اصول اور طریق کار سے کسی طرح کی نسبت باقی ہے۔ ان کے معاملات سے نمٹنے اور ان کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے مروجہ طور و طریق کار کا حق العباد سے وابستہ دینی معتقدات' ارشادات اور احکامات سے ٹکراؤ ہمارے علماء کے منصبی فرائض اور ذمہ داریوں کی راہ میں قدم قدم پر روڑے اٹکا رہا ہے۔ ان پر قابو پانے کے لئے عہد حاضر کے بین الناس مسائل اور ان سے وابستہ حالات' اغراض و مقاصد کی نوعیت اور مضمرات کا صحیح اندازہ اور جائزہ از حد ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمارے علماء کو ان علوم حاضرہ سے بھی ایک حد تک بہرہ مند ہونا لازمی ہے جو ان مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ علوم علم و دانش کے اس مجموعی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جسے سوشل سائنس یا سماجی علم کہا جاتا ہے۔ سوشل سائنس کے زمرے میں داخل اصناف' عمرانیات ثقافتی انسانیت' تصنیفات بالخصوص سماجی نفسیات' اقتصادیات علم السیاست خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان علوم کے

نظریات اور ان سے وابستہ مطالبات اور تقاضے' اغراض و مقاصد' رویئے اور رجحانات' حوصلے اور توقعات لائحہ عمل اور طریق کار کی تشریحات و توجیہات بین الناس معاملات اور مسائل کی فہم وادراک میں نہایت سود مند اور معاون ہیں۔ ضروری ہے کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء دوران تعلیم ان علوم سے قطعاً ناآشنا نہ رکھے جائیں ورنہ صرف دینی تعلیم پر دسترس حاصل کر کے ہمارے علماء آج کی دنیا میں نیم حکیم خطرہ جان کی طرح نیم ملا خطرہ ایمان سمجھے جائیں گے۔ مدرسے کے نصاب میں عالم کی تعلیمی سطح پر سوشل اسٹیڈیز' مطالعہ سماج کو داخل کیا جاسکتا ہے۔ ہائی اسکول کے نصاب میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کا اردو اڈیشن بآسانی دستیاب ہے۔ کوئی ایسی تصنیف جس میں سوشل سائنس کی مختلف شاخوں کی مبادیات پر بحث کی گئی ہو فاضل کی تعلیمی سطح کے لئے داخل نصاب ہو سکتی ہے۔ انگریزی میں ایسی کافی کتابیں ہیں جیسے Grant اور Pirtle کی The Social Sciences, an integrated approach اس کو سامنے رکھ کر ترقی اردو بورڈ کا ادارہ ایک کتاب اس غرض سے تیار کرا سکتا ہے۔

مدرسے کے نصاب میں منطق اور فلسفہ بھی داخل ہیں۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی کے بعد سے جب علم و حکمت کا وہ چراغ جو علمائے اسلامی نے روشن کیا تھا ان کے ہاتھ سے نکل کر مغرب کے غیر مسلم علماء اور دانش وروں کے قبضے میں چلا گیا' منطق اور فلسفے نے جو ترقیاں کی ہیں' ہمارے دینی مدرسوں کے فارغ التحصیل ان سے نابلد ہیں۔ ضرورت ہے کہ مدرسے کے نصاب میں ان سے استفادے کی گنجائش پیدا کی جائے۔ شاید دینی مدارس کے نصاب میں یہ ترمیمات ہمارے علماء کے لئے عصری تقاضوں سے آنکھ چرانے کے بجائے آنکھ ملا کر ان سے ٹکر لینے کی گم کردہ صلاحیتوں کی بازیافت اور احیاء کا وسیلہ بن سکیں۔

# درس نظامی اور اصلاحِ نصاب کے اصول ومبادی

مولانا محمد سالم قاسمی
(مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند)

ادیان' مذاہب اور افکار و نظریات' صرف اپنی تعلیم ہی کی بنیاد پر زندہ رہتے ہیں اور ان کی زندگی کے لئے علم کے لامحدود گلزار میں سے ایسے مخصوص ومتناسب پھولوں کے انتخاب کا نام "تشکیل نصاب" ہے کہ جن سے اس گلزار کی تمام رونقیں اور رنگ برنگ پھولوں کی تمام خوشبوئیں اس میں سمٹ آئیں۔

یا دوسری تعبیر میں یوں کہئے کہ "علم" ایک ارتقاء پذیر حقیقت ہے اور اس کا ارتقاء اس کا یہ تسلسل "تسہیل و توسیع" میں پنہاں ہے' اور "فکر انسانی" کی رفعتیں علم کے اسی ارتقائی عمل کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے "تشکیل نصاب" کی اہمیت کو مزید اور غیر معمولی طور پر بڑھا دیتی ہیں' پس اسی تسہیل و توسیع علم کی صلاحیتوں کو ابھارنے والے ذریعہ کو اصطلاح میں "نصاب تعلیم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لہذا اسی صلاحیت کی ہمہ جہت ترقی' کسی نصاب کی "صحت" کا معیار گردانی جائے گی' اور اس کی محدود ترقی' یا عدم ترقی اس کے ناقص یا نادرست ہونے کی علامت قرار دی جائے گی اور تشکیل نصاب میں یہ طرزِ فکر اس حقیقت کو اصولی حیثیت عطا کر دیتا ہے کہ نصاب میں بہ تقاضائے وقت یا برعایت ضرورت' بعض علوم و فنون کو ترجیح دینا' بسا اوقات ناگزیر بن جاتا ہے' یہ ترجیحی ضرورت ضرور پوری کی جانی چاہیئے۔ لیکن اس طرح کہ مرجوح علوم و فنون کی تسہیلی اور توسیعی ترقی میں یہ ترجیح سدِ راہ نہ بننے پائے۔ کیوں کہ یہ ہی وقت اور ضرورت پرواز تقاضا بدل کر' آج کے راجح کو کل مرجوح بھی بنا سکتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ "نصاب" کی تشکیل' علوم و فنون

کی راجحیت و مرجوحیت پر نہیں بلکہ تسہیل و توسیع علوم کی صلاحیتوں کی بے داری پر مبنی ہے' اور اسی پر اس فکری ارتقاء کا بھی مدار ہے' جو اقوام و امم کی رفعت و عظمت کی کلید بنتا ہے۔

برصغیر میں ''دینی مدارس'' کا نصاب' مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد تسہیلی اور توسیعی صلاحیت کے ارتقاء کی فی الجملہ مقصدیت سے کبھی خالی نہیں رہا' یہ ہی وجہ ہے کہ کتاب و سنت کے ہمہ جہت مقصدی علوم عالیہ کے لئے' زندگی کی گوناں گوں جہات و ضروریات پر مشتمل ''علوم آلیہ میں'' تسہیلی اور توسیعی خدمات' سست رفتاری کے ساتھ ہی سہی لیکن جاری ضرور ہیں۔ جس پر حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ کے مبارک دور سے' قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے عہد میمون تک' مختلف اسلامی مکاتب فکر کی' دینی علمی' تحقیقی' عرفانی' تمدنی' تہذیبی' معاشرتی' معیشتی' ادبی اور معقولاتی' علوم آلیہ پر مشتمل' کتاب و سنت کی روشنی میں تسہیل و توسیع کی حامل تالیف اور تصانیف کو شاہد عدل بنایا جا سکتا ہے۔

اس تدریجی علمی ارتقاء نے' جہاں کتاب و سنت کی مقصدی رفعت و عظمت کو برقرار رکھا' وہیں ان علوم آلیہ کے وقیع و جامع متون پر مشتمل' تدریسی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر' جو جامع ''نصاب تعلیم'' وجود پذیر ہوا' وہی وہ ''درس نظامی'' ہے کہ جس نے برصغیر کے دینی علمی حلقوں میں مثالی قبولیت عامہ حاصل کی۔

اور اس ''درس نظامی'' کا یہ امتیاز بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی مقبولیت کو اپنے عہد آغاز ہی سے' جہاں وسائل علم و خبر اور ذرائع نقل و حمل کا ماضی کے مقابلے پر' تیز رفتار دور میسر آیا' جس نے اس کے حلقہ معتقدین کو' بہت جلد ملک گیر بنا دیا' وہیں فکری جمود پر مبنی' اس کی قدردانی نے نسلاً بعد نسلٍ تسہیل و توسیع کی راہوں سے علم کی ارتقاء پذیری کے تصور کو اسی تیز رفتاری کے ساتھ ضعف و اضمحلال سے دوچار بھی کر دیا۔ اور یہ وسیلہ علم' مقصدی علم پر اس عدم ارتقاء کے نتیجے میں ایک حد تک فائق بن گیا۔ گویا اس نصاب کی جو مقبولیت عامہ اس کے لئے ذریعہ ارتقاء بنی' وہی مقبولیت بعنوان قدردانی' بعد چندے اس کے لئے وسیلہ جمود بھی بن گئی۔ حتیٰ کہ عربی زبان کی فنی اور معنوی اہمیت اس درس میں اتنے وقیع پیمانے پر ملحوظ رکھی گئی کہ اس کی پیدا کردہ استدلال اور استنباطی قوت و صلاحیت کے ذریعہ

کتاب و سنت سے مسائل وقت کے حل کی وقیع ضرورت' اس درجہ علمی بلند معیاری کے ساتھ پوری ہوتی رہی کہ خود اہل زبان ارباب علم نے اس کا اعتراف کیا' لیکن عربی زبان کی وہ لسانی حیثیت کہ جو اظہار ماضی الضمیر کا اولین اور ضروری وسیلہ ہوتی ہے۔ وہ بالغ الفکر اہل علم و فکر کے استثنا کے ساتھ 'بیشتر مدارس و معابد میں' اس درجہ معرض خمول میں پڑ گئی کہ اہل نظر اگر اس کی ضرورت و اہمیت کو بدلائل و وجوہ ثابت کر کے پیش بھی کرتے ہیں' تو اس کو ماننے یا قابل غور قرار دیئے جانے کے بجائے' دور از کار' بے ضرورت اور غیر مفید بلکہ مضر ہونے کی تاویلات کی صورت میں عموماً اس کا جواب ملتا ہے۔

پس اس درس عربی میں جب کہ عربی کی لسانی حیثیت سے بے التفاتی کا درجہ یہ ہو' تو وقت کی دیگر زندہ اور عالم گیر زبانیں تو اس گردوپیش میں زیر تذکرہ لانے کے قابل بھی نہیں سمجھی گئیں' اور نہ سمجھی جا سکتی تھیں اور خاص طور پر دور حاضر میں ملت اسلامیہ اور دیگر اقوام کے درمیان بڑی حد تک مدار رابطہ 'بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے "انگریزی" ہی ہو سکتی تھی لیکن وہ عالم گیر ہونے کے باوجود' بد قسمتی سے برصغیر تک اس ظالم و غاصب انگریز قوم کے ذریعہ پہنچی کہ جس نے نہ صرف مسلمانوں سے اقتدار ہی چھینا تھا' بلکہ اس کی معاندانہ کوششیں "دین اسلام" کو بھی برصغیر میں قصہ پارینہ بنا دینے کی تھیں۔ پس انگریزوں سے عداوت کا یہ تاریخی اور برمحل پس منظر' انگریزی زبان کی عالم گیری تسلیم کرنے اور اس سے عالمی روابط میں استفادہ کی راہ میں سد سکندری بن گیا۔ اور نتیجتاً علم کی قدیم و جدید کے دو دائروں میں' غیر اسلامی' غیر واقعی اور غیر فطری تقسیم نے بعد چندے' ملت اسلامیہ کو خدا' رسول' دین اور قبلہ کی وحدتوں کے باوجود' دو متباعد طبقوں میں تقسیم کر دیا۔

دوسری جانب اقتدار مسلط کا ہم نوا جدت پسند طبقہ بھی' اپنی انتہا پسندی میں مخالفت اقتدار وقت قدامت پسند طبقہ سے پیچھے نہیں رہا' اور اس نے کتاب و سنت کے بارے میں زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی تاریخ ساز اور عہد آفریں ان صلاحیتوں کے عملاً انکار کو اپنا ترقی اور جدت پسندانہ موقف قرار دیا کہ جس نے پچاس سال کے مختصر ترین وقت میں' مذہبی معتقدات اور تہذیبی اور تمدنی روایات کا زبردست اختلاف رکھنے والی قوموں کی زندگیوں میں وہ ناقابل فراموش تاریخی انقلاب برپا کیا جس کی کوئی مثال اسلام سے قبل یا بعد کی تاریخ اقوام

وملل نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ کبھی کر سکے گی۔

اس موقعہ پر نفس موضوع کے لحاظ سے اس حقیقت کی پردہ کشائی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ ''دین'' کہ جس نے تمام جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر 'اپنا مخاطب اس باشعور عالم انسانی کو بنایا جو رنگ و نسل' تہذیب و تمدن' کلچر و معاشرت' اقتصاد و معیشت' علوم و افکار' نظریات و معتقدات' آب و ہوا اور مرز و بوم کے بے نہایت اختلافات رکھنے والی' مختلف المزاج اقوام پر مشتمل تھا۔ ان کے لئے مذاہب فقہیہ عقل فقہا کے دخل کی وجہ سے' مسالک ماخوذہ' راسخین فی العلم کی عقل کے دخل کی وجہ سے اور مشارب ذوقیہ عقل سے فروتر ذوق کے دخل کی وجہ سے' لائق تسلیم یا قابل توجہ نہیں ہو سکتے' کیوں کہ یہ جوہر عقل نسل انسانی کی متاع مشترک ہے' اور اس میں تفاوت و کمی بیشی کے باوصف' کسی دوسرے کی برتری کو فطرت انسانی بآسانی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ فقہی مذاہب' ماخوذ مسالک اور ذوقی مشارب شروع ہی سے محل اختلاف بنے رہے' جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تینوں چیزیں ترجیحاً تو پیش کی جا سکتی ہیں' لیکن تبلیغاً ان کو پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں نکلا اور جب سے ان کو تبلیغی درجہ دیا گیا' تب سے ہی امت گوناں گوں اختلافات کا شکار بنتی رہی ہے۔ تبلیغی چیز صرف اللہ رب العزت کا نازل فرمودہ وہ ''دین'' ہی ہو سکتا ہے کہ جو بواسطہ انبیاء کرام علیہم السلام آتا ہے' اور انسانیت کے اس کے قابل قبول یا لائق غور بننے کی وجہ صرف یہ ہی ہوتی ہے کہ وہ عقل کے استنباط واستدلال کے دخل سے یکسر خالی ہوتا ہے' اور اپنے عمومی جزؤکل کے لحاظ سے' جہاں خلاف عقل نہیں ہوتا وہیں اس کے رفیع و وقیع مسلمات کا بعض عقلوں سے بلند وماورا ہونا بھی عین ممکن ہوتا ہے۔

اسی سے دینی تعلیم کی نصاب سازی کا ایک دوسرا اصول یہ سامنے آتا ہے کہ متعلمین کی تعلیماً ذہن سازی اسی اصول پر کی جانی چاہئے کہ وہ اولیت و مقصدیت اور تبلیغی حیثیت' عقل کی ہر آمیزش سے پاک وصاف صرف منزل من اللہ دین کو ذہن اور عقل کے ذریعہ مستنبط کردہ فقہی مذاہب' ماخوذ مسالک اور ذوقی مشارب بوقت ضرورت اور بشرط ضرورت ترجیحاً پیش کریں۔ تبلیغی حیثیت انہیں ہرگز نہ دیں اور دوسروں کی جانب سے پیش کردہ مذاہب' مسالک اور مشارب کے بارے میں انہیں پورے طور پر وسیع الفکر اور متحمل المزاج

بنایا جائے۔ ورنہ بصورت دیگر' ان ترجیحی امور کو' دین کے ہم پلہ بنا کر تبلیغی درجہ دینا نہ صرف شرعاً ہی غیر صحیح اور ناصواب ہو گا' بلکہ اختلاف امت کا عظیم سبب بن جانے کی وجہ سے عقلاً بھی اسے غلط' نادرست اور خلاف مصلحت قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا ترجیح و تبلیغ کا یہ فرق بذیل تعلیم آکر نصاب ہی کا اہم تر جزو بن جاتا ہے۔

رائج الوقت "درس نظامی" زیادہ تر متون پر مشتمل ہے' جس کی بیشتر فنی کتب اپنی جامعیت معانی اور اختصار تعبیر کی وجہ سے جہاں غیر معمولی طور پر محنت طلب ہیں۔ وہیں اس کے یہ نتائج بھی کسی دلیل کے محتاج نہیں ہیں کہ استدلال و استنباط کی قرار واقعی وہ صلاحیت یہ نصاب پیدا کرتا رہا ہے کہ جس سے کتاب و سنت کے غوامض اور پیش آمدہ مسائل کے اطراف و جوانب کے انکشاف سے' حل مسائل میں آسانی میسر آتی ہے۔ لیکن اب قوائے معلمین و متعلمین نہ حل عبارات میں غیر معمول محنت کے متحمل رہے' اور نہ فہم مرادات میں تعمق فکر کے عادی اور پھر مشکل الفہم کتب نصاب نہ صرف تسہیلی لحاظ ہی سے غیر مخدوم ہی رہیں' بلکہ تسہیل کو ان متون کی مزعومہ افادیت کا ختم کر دینے والا قرار دے دیا گیا اور جواباً اگر ان متون نصاب کے اردو تراجم اور اردو شروح کو پیش بھی کیا جائے تو یہ کاوشیں فنی تسہیل و توسیع کے زمرے میں شمار نہیں کی جا سکتیں اور یہ امر مستزاد بھی ہر مرحلے پر قابل ذکر ہے کہ ان کاوشوں اور محنتوں کے باوجود' موجودہ دور میں' اس نصاب کی بعض فنی کتب' عدم محنت کی وجہ سے اور بعض کتب عدم ضرورت کی وجہ سے' اپنی سابقہ افادیت برقرار نہیں رکھ سکیں۔ اس کے نتیجہ میں علم کے مائل بجمود ہونے کی رفتار تیز ہو رہی ہے اور قلت استعداد متجدد و متنوع مسائل حیات میں' دینی حل آفرینی کو دشوار تر بناتی جا رہی ہے۔

اس لئے یہ "درس نظامی" کثیر الافادہ ہونے کے باوجود' بوجوہ مذکورہ' اصلاحاً قابل اعتناء تو یقیناً ہے لیکن اصلاح کے اہل اور مستحق صرف وہی حضرات ہو سکتے ہیں کہ جو علم کے ارتقاء کو تسہیل و توسیع پر مبنی بھی تسلیم فرماتے ہوں اور اس کے عدم کو علم کی حقیقت متحرکہ کے لئے جمود قرار دیتے ہوں اور تنقید و تنقیص میں امتیاز قائم کرنے کے ساتھ تسہیل و توسیع علم کے حقیقت آشنا بھی ہوں۔

بر سبیل اجمال اسی نصاب کے تجرباتی افادہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے درج ذیل تقسیمات کے

ذریعہ بھی اصلاحی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔

۱۔ مدارس عربیہ میں معدودے چند ایسے پر شوق اور باذوق طلباء بھی عدداً کم تر ہونے کے باوجود آتے ضرور ہیں کہ جو اپنی بلند فکری' علم کے ذوق سلیم' اور غیر معمولی مطالعاتی محنتوں کے متحمل اور شائق ہوتے ہیں' ان کے لئے یہی نصاب' علوم آلیہ میں عصری ضرورتوں کے لحاظ سے جزوی فرق کے ساتھ' بحالہ برقرار رکھا جائے تاکہ ڈیڑھ سو سالہ تجربات کے مطابق وسیع العلوم اور وسیع الفکر مدرسین' ارباب افتاء' محدثین' مفسرین اور مصنفین' امت کو اقل قلیل ہی سہی لیکن برابر حاصل ہوتے رہیں۔

۲۔ اوّل الذکر طبقے سے بہت زیادہ تعداد میں' مدارس دینیہ میں آنے والے طلباء وہ ہوتے ہیں کہ نہ دین کا قابل ذکر ذوق ہی رکھتے ہیں' اور نہ دینی علوم کی طلب کا شوق ہی انہیں ہوتا ہے۔ ایسے طلباء بالعموم آتے نہیں۔ بلکہ ان کے اولیاء اپنی خاندانی مذہبی روایات کی برقراری کے لئے انہیں بہر صورت مدارس دینیہ ہی میں بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کثیر التعداد طلباء عدم ذوق و عدم طلب کی بنیاد پر' فراغت کے بعد نہ کسی دینی منصب کو حاصل کر پاتے ہیں اور نہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہی ان کے اندر ہوتی ہے۔

اس طبقے کے لئے ضرورت ہے کہ نصاب مروج کے مقصدی دینی علوم کے منتخبات پر مشتمل ایک چار سالہ نصاب مرتب کیا جائے' یہ نصاب نہ صرف اس مقصد ہی کو پورا کر کے ان کے اولیاء کو مطمئن کرے گا کہ ان کے بچے دینی علم اور دینی تعلیم گاہ کی جانب منسوب ہو جائیں گے بلکہ جلد ہی ان کو وہ فراغ بھی میسر آسکے گا کہ جس میں وہ اپنے طبعی میلان کے مطابق کوئی فن یا علم حاصل کر کے اپنے ذوق کی تکمیل بھی کر سکیں گے۔

۳۔ اسی طرح ایک تیسرا اور کافی بڑا طبقہ ان مدارس دینیہ میں ان طلبا کا بھی آتا ہے کہ جو نہ اوّل الذکر کی طرح ذوقِ علم ہی کے حامل ہوتے ہیں' اور نہ ثانی الذکر کی طرح خاندانی روایات کی برقراری کے کسی بوجھ تلے وہ دبے ہوئے ہی ہوتے ہیں' بلکہ صرف اہلِ علم و دین سے اور کسی درس گاہ سے انتساب کا مل جانا ہی ان کا آخری مطمح نظر ہوتا ہے' اور اس انتساب سے ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے حلقے یا ماحول میں' جہل کی جانب انتساب سے محفوظ ہو جائیں۔ ان کے لئے ضرورت ہے کہ مبادیات دین پر مشتمل اردو نصاب مرتب کیا

جائے کہ جس سے یہ طبقہ اپنی عام زندگی میں' اور اپنے معاش و معیشت میں حدود دین کو فی الجملہ ملحوظ رکھ سکے کہ یہی اس کا حقیقی مقصد و مدعا ہے۔

اور مدارس دینیہ ان تینوں طبقات کو ان کے تعلیمی معیار و صلاحیت کے مطابق بوضاحت الفاظ علیحدہ علیحدہ سندات جاری کریں۔ یہ طریق عمل نصاب مروج کی افادیت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بھی بنے گا اور وہ فرق مراتب بھی قائم ہو سکے گا کہ جس کے آج نہ ہونے سے' دینی حلقوں میں افسوس ناک حوادث و واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ قلت وقت کے باعث' موضوع درس نظامی کے بارے میں' قلم برداشتہ' یہ خیالات پریشاں' بقید تحریر پیش خدمت گرامی کر رہا ہوں۔

چند کلمے ہیں' تکلف برطرف     گر قبول افتد زہے عزو شرف

# نصابِ مدارس کی اصلاح

مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی
(مدرسہ عالیہ' کلکتہ)

مدرسہ کی تاریخ طلوعِ اسلام کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ علوم و معارف دینیہ کی تدوین' ترتیب' تہذیب وارتقاء کے قدم بہ قدم' مدرسہ کا نظری و عملی وجود پروان چڑھتا رہا اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنے اندر خدمت انسانیت کی ہمہ جہت صلاحیتوں کے پیدا کرنے میں ایک حیات بخش نظام بن کر ابھرتا چلا گیا۔ مدرسہ' ثقافت انسانی کی پوری تاریخ میں وہ منظم و شائستہ ادارہ ہے جس نے جملہ علوم و فنون کو ترقی دینے' اقوام و ملل کو انفسی و آفاقی معارف سے آراستہ کرنے اور تہذیب انسانی کو ذروۂ اعلیٰ تک پہنچانے میں' گزشتہ تمام روایتی و اثری اداروں سے زیادہ ہمہ گیر و ہمہ جہت کامرانیاں حاصل کیں' مدرسہ کا نصاب تعلیم و تربیت اپنے اعلیٰ مقاصد و مطمحِ نظر کی رو سے کامیاب ترین نصاب و منہاج تعلیم ہزار بارہ سو سال تک بنا رہا اور آج بھی اس نصاب کے اساسی اجزائے ترکیبی سے بے نیازی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ مدرسہ نے احوال و نوبہ نو ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں اراکین علم و فن کو بصیرتوں سے ہمیشہ روشنی حاصل کی اور باختلاف ادوار لازمی ترمیمات و اصلاحات سے اپنے نصاب و منہج دراسی کو آراستہ کیا۔ ابن حزم اندلسی نے اپنے تجارب و نظریات کی روشنی میں جہاں نصاب تدریس میں ترمیمات کو فروغ دیا۔ حجۃ الاسلام غزالی نے بلاد مشرق میں سود مند نصابی تبدیلیاں کیں' وہیں ہندوستان میں بھی مدارس عربیہ نے وقتاً فوقتاً اصلاح و ترمیم میں ظروف و احوال کے تقاضے پورے کئے۔ یہی وہ نظام و نصاب مدارس تھے جن کی شخصیت سازی کے نتیجہ میں خانقاہی و مدرسی مشائخ و فضلاء کی جماعتیں پیدا

ہوئیں اور ملک وملت کے لئے طرۂ افتخار بنیں۔ شیخ نظام الدین سلطان الاولیاء شرف الدین ابو توآمہ' امیر خسرو' شیخ ابوالفضل وفیضی علامی' محدث عبدالحق دہلوی' مجدد الف ثانی' سعد اللہ خان' ملا عبدالحکیم سیالکوٹی' محدث نورالحق دہلوی' شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' ملا محمود جونپوری' قطب الدین سہالوی' قطب الدین شمس آبادی' ملا محب اللہ بہاری' علامہ عبدالجلیل بلگرامی' غلام علی آزاد بلگرامی' علامہ تفضل حسین' ملا نظام الدین فرنگی محلی' علامہ غلام یحیٰ' مولانا محمد علی مونگیری' علامہ شبلی نعمانی' امام الہند ابوالکلام آزاد' علامہ سید سلیمان ندوی' علامہ مناظر احسن گیلانی' ثوابت وسیارے اور بے شمار اعلام وفضلائے ہند نے اسی نظام ومنہج تعلیمی کی آغوش میں پرورش پائی اور علوم ومعارف کی دنیا کو چار چاند لگائے۔

سلطنت مغلیہ کے دور انحطاط میں ملا نظام الدین کے طرز درس وتدریس نے مستقل نظام دہی کی حیثیت حاصل کی اور درس نظامیہ کے نام سے کل ہند پیمانہ پر قبول عام حاصل کیا۔ اسی کے آثار باقیہ میں آج بھی ہندوستان کے اہم ترین تعلیمی مراکز دارالعلوم دیوبند' مظاہر العلوم سہارن پور' دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور بے شمار مدارس کا شمار ہو سکتا ہے۔ جن میں کئی ایک تعلیمی مراکز روز اول سے ضروری اصلاحات ونصابی وتربیتی ترمیمات سے آراستہ ہیں۔

اصلاح نصاب کا مسئلہ انگریزی تسلط کے دور میں شدت سے ابھرا اور محسوس کیا گیا اور اسے حل کرنے کی بابت علامہ شبلی نعمانی سے لے کر علامہ سید عبدالحئ رائے بریلوی' امام الہند مولانا آزاد' سید سلیمان ندوی' مولانا مناظر احسن گیلانی تک سربر آوردہ ماہرین نے مرتب تجاویز ومدلل اصلاحات کی تراکیب عملی تجربہ کے لئے پیش فرمائیں اور ان میں سے بعض نے نمایاں خدمتیں بھی انجام دیں جن کا سلسلہ ہنوز تشفی بخش طریقے پر جاری ہے۔

انگریزی دور میں قدیم علوم وفنون نے ترقی یافتہ شکل اور عصری روح وانداز کے ساتھ پورے ملک میں رواج حاصل کیا تحصیل علم کی زبان کی حیثیت سے دیسی زبان یا زبانوں کی بجائے انگریزی زبان وادب نے فروغ پایا۔ درس نظامیہ کے قدیم نصاب ونظام کے پہلو بہ پہلو انگریزی لبادے میں مغربی وضع واطوار سے آراستہ علوم ومعارف نے رفتہ رفتہ حکومتِ وقت کی سرپرستی میں اپنی ساکھ قائم کرلی اور معاشی مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں زیادہ سے زیادہ مفید قرار دیئے گئے۔ درس نظامیہ کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی اور دونوں طرزوں

اور نصابوں میں بجائے ہم آہنگی و تجاذب کے بعد و تفاوت بڑھتا گیا۔ اسی طرح قدیم وجدید کے تحت دونوں میں تفرقہ و تضاد پیدا ہوتا چلا گیا۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ بنیادی علوم اسلامیہ و عربیہ قرآن' حدیث' فقہ واصول فقہ وکلامیہ کے ساتھ کچھ اہم ترقی یافتہ علوم کا امتزاج قطعاً نصاب درس نظامیہ کے مزاج و روح سے متصادم نہیں ہوتا اور مزعومہ قدیم و جدید کی صالح و میصرانہ بہم آمیزی کے اصول پر وحدت نصابین و نظامین کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ اس خاص مطمح نظر سے امام الہند آزاد کی حتمی رائے و نظریہ کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے ارشادات سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

یہ بھی امر واقعی ہے کہ امام الہند کی مجوزہ اصلاحات کی روشنی میں اصول و ضوابط کے علاوہ نصاب تک کی ترتیب کر ڈالی گئی لیکن اس کے عملی نفاذ کی راہ میں گراں قدر مصارف آڑے آگئے یہ صورت حال آج بھی سدراہ بنی ہوئی ہے۔ چناں چہ مدرسہ عالیہ رام پور کا مجوزہ نصاب بدین وجہ شرمندۂ تعمیل نہ ہوسکا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے بھی جو خالص حکومت کا درسی ادارہ ہے۔ ۱۹۵۴ء کے لگ بھگ امام الہند کے نقطۂ نظر سے جو نصاب نامہ مرتب کیا تھا وہ بھی قصہ پارینہ بن کر رہ گیا۔ البتہ ابھی حال ہی میں مدرسہ عالیہ کلکتہ اور ملحقہ مدارس کا نصاب جدید تقریباً ۱۹۸۰ء میں از سر نو مرتب کیا گیا جس کو حکومت مغربی بنگال کی منظوری حاصل ہو چکی ہے۔ اس کا نفاذ سرورسنین منظور ہو چکا ہے اور اس کے تحت پہلا امتحان عالمیت کی سطح پر ۱۹۹۱ء میں متوقع ہے۔ اس تازہ ترین نصاب کی رو سے مدت تعلیم ۱۶ سال کی ہے اور کل چار امتحانات (۱) عالم (۲) فاضل پارٹ ون (۳) فاضل پارٹ ٹو (۴) اور ممتاز (گروپ حدیث)' (گروپ فقہ)' (گروپ ادبیات عربیہ) پر درسی تعلیم رسماً مکمل ہوتی ہے۔

# دِینی مدارِس اور ان کا نصاب

بشیر احمد
(سیکریٹری مدرسہ اگزامنیشن بورڈ اڑیسہ بھونیشور)

عربی دینی مدارس ہندوستان کے مختلف مقامات میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہیں ہم تین درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) پہلا وہ مدرسہ جہاں صاحب علم کو صرف قرآن حفظ کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے ان مدارس میں نصاب تعلیم یک صورت ہے ہی نہیں۔ ان کا نصب العین صرف طالب علموں کو قرآن شریف حفظ کرانا ہے۔

(۲) دوسرا "درس نظامی" کے اصول پر ہندوستان میں کثرت سے مدارس قائم ہیں جہاں زیادہ ان فنون پر زور دیا جاتا ہے جو دین کے اہم شعبوں میں معاون ثابت ہوں۔ ان مدارس کا مطمح نظر یہ ہے کہ ان مدارس کا فارغ التحصیل دینی خدمات انجام دے سکے۔ عام طور پر ان مدارس کا فارغ شدہ طالب علم یا تو اس "درس نظامی" طرز کے مدرسوں میں ملازمت کرتا ہے یا کسی مسجد میں امام بن کر زندگی گزارتا ہے لیکن یہ دائرہ بہت ہی محدود ہے' جس کی وجہ سے اکثر و بیشتر طلبہ تلاش معاش میں سرگرداں اور پریشان رہا کرتے ہیں۔ ان آزاد دینی مدارس کو حکومت کی جانب سے نہ کچھ وظیفہ ملتا ہے اور نہ ان مدارس کے معاون حکومت سے اس قسم کے عطیہ قبول کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے اب تک اپنے پرانے وضع پر قائم ہیں اور مداخلت بھی گوارا نہیں کرتے۔

(۳) مدارس جن کا الحاق بورڈ سے ہے جن کی نگرانی حکومت کرتی ہے اور مالی اعانت بھی کرتی ہے۔ یہاں ایک ہلکی سی امید کی کرن ہے کہ عصری تقاضے کے تحت اس میں ترمیم و

توسیع کی گنجائش نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ان مدارس کے نصاب تعلیم مدرسہ اگزامنیشن بورڈ' مرتب کر کے حکومت کی منظوری کے لئے بھیجتی ہے۔

صوبہ اڑیسہ عرصہ دارز سے "بہار مدرسہ اگزامنیشن بورڈ" سے ملحق تھا۔ ۱۹۷۲ء میں مدرسہ اگزامنیشن بورڈ اڑیسہ عمل میں آیا۔ ۱۹۸۴ء میں حکومت کی جانب سے یہ مطالبہ ہوا کہ موجودہ نصاب تعلیم میں کچھ ترمیم کی جائے اور کچھ ایسے مضامین کا اضافہ ہو جو موجودہ عصری تقاضے پورا کرتے ہوں۔

پروفیسر منظر حسن دسنوی اردو لیکچرار راوانشا کالج 'کٹک' کے زیر قیادت ایک کمیٹی تشکیل دی گئی کہ نصاب تعلیم برائے مدرسہ مرتب کریں۔

اس نصاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ طالب علم دینی علم کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی کافی استعداد حاصل کر لے' اگر وہ درمیان میں مدرسہ کی تعلیم کو منقطع کر کے General Education حاصل کرنا چاہے تو اسے کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے' بلکہ اس میدان میں بھی کافی نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

تحتانیہ' وسطانیہ اور مولوی میں قرآن شریف' حدیث' عربی ادب کے علاوہ علاقائی زبان (اڑیہ) تاریخ' جغرافیہ' اردو' فارسی رکھی گئی ہے' تاکہ General Education حاصل کرنے میں دقت نہ ہو۔

حکومت کی جانب سے یہ بھی سہولت رکھی گئی کہ مولوی کا فارغ شدہ طالب علم صرف انگریزی اور اردو ادب کا امتحان دے کر میٹرک کا سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتا ہے اور اس طالب علم کے لئے ذریعہ معاش کے لئے بہت ساری سہولتیں بھی مہیا ہو جاتی ہیں۔ کالج میں داخلہ بھی لے سکتا ہے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ Oriental type of education is not at all job oriented. جس کی وجہ سے لوگ اپنے بچوں کو مدرسہ میں داخلہ دلانے سے گھبراتے ہیں۔ یہ مسئلہ کافی غور طلب ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مدرسہ سے فارغ شدہ طالب علم قوم کے لئے ایک بوجھ ثابت نہ ہو۔

اس لئے ضروری ہے کہ گاندھی جی کے اس قول پر عمل کریں۔ آپ کا کہنا تھا۔

"When you are learning you are earning". جس کا اشارہ Craft کی طرف ہے۔ مدرسہ کے نصاب تعلیم میں "حرفت" کو خاص اہمیت دی جائے۔ کم از کم دو گھنٹہ متواتر حرفت سکھانے میں صرف کیا جائے تاکہ طلبہ خود کفیل ہوں اور احساس کمتری جاتی رہے۔ مولوی کا فارغ شدہ طالب علم اگر اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہے تو یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عالم و فاضل کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ قوم کی صحیح راہنمائی کر سکے۔ اس لئے ان درجوں میں تفسیر' احادیث' فقہ و دیگر فنون کی تعلیم وسیع پیمانے پر دی جائے ساتھ ہی ساتھ اردو اور فارسی میں بھی کافی استعداد حاصل کرنے کی گنجائش رکھی جائے تاکہ فاضل کا فارغ شدہ طالب علم کسی ہائی اسکول میں بحیثیت ہیڈ مولوی ملازمت کر سکے۔

فی الحال اڑیسہ میں کل ۵۱ مدارس ہیں جو حکومت کی جانب سے منظور شدہ ہیں' ان میں دو مدرسہ فاضل درجہ تک ہیں۔

# اصلاح نصاب

مولانا محمد عبد السلام خان
(سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ 'رام پور' یوپی)

نصاب کی اصلاح ضروری ہے' اصلاح نصاب کے بارے میں اس پر بھی اتفاق رہا کہ نصاب میں جدید مضامین کو ابتدائی سے جامعی مرحلے تک شامل کیا جانا چاہیئے' مضامین کی کثرت کو اختیاری اور لازمی میں تقسیم کر کے متوازن بنایا جا سکتا ہے۔ اضافہ مضامین کو فنون تک محدود رہنا چاہیئے 'علوم اور سائنسز کو چھوڑ دیا جائے' میں اس سے اتفاق نہیں کرتا' میرے نزدیک فنون اور علوم دونوں کو ہمارے نصاب کا جزو ہونا چاہیئے۔ یہ بات فقط مالی گنجائش کی ہے۔ رہے خطرات تو اس کا مداوا کیا جانا چاہیئے۔

جب تک ہندوستان گیر قسم کے مدارس اصلاح نصاب پر مائل نہ ہوں اور مناسب اقدام نہ کریں تمام مقالے' تجویزیں و بحثیں بے کار ہیں۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں ہندوستان گیر شہرت کے بڑے اور مالی اعتبار سے مستحکم مدارس کے مہتممین اور صدر مدرسوں کو دعوت دی جائے' مدعوین کی تعداد ۸' ۱۰ سے آگے نہ بڑھے اور ٹیبل ٹاک کے طور پر ان سے آزادانہ گفتگو ہو تاکہ ان کا حقیقی نقطۂ نظر سامنے آئے۔ اصلاح سے اختلاف کے وجوہ معلوم ہوں۔ اگر محض مالی دشواریاں ہوں تو ان کے حل کے لئے اقدامات کئے جائیں (جو وقف کے فنڈوں سے بھی بڑی حد تک حل ہو سکتی ہیں)۔

اگر اس نجی انداز کی صحبت سے بات آگے بڑھے تو ایک کمیٹی بنا دی جائے جو ان اکابر کے نمائندوں یا خود ان پر مشتمل ہو جس میں جدید علوم و فنون یا صرف فنون کے ماہرین اور ماہرین تعلیم شامل ہوں اور ان ہی وسیع خطوط پر جو مہتممین مدارس نے اپنی خصوصی مجلس میں طے کئے ہوں یا تجویز کئے ہوں' نصاب بنانے کی کوشش کی جائے اور مضامین میں اصولی وحدت کے ساتھ مدارس کے مضامین کی خصوصی اہمیت (اگر کوئی ہو تو) کا لحاظ رکھا جائے تاکہ مدارس کی ہم آہنگی کے ساتھ ان کے خصوصی مضامین کی اہمیت بھی باقی رہے۔

# مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کا ایک جائزہ

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی
(امارت شرعیہ' پھلواری شریف)

(۱) دینی مدارس کے نصاب تعلیم اور نظام تربیت کے سلسلہ میں یہ سیمینار وقت کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کے لئے منعقد ہوا ہے جس میں اس امر پر غور کیا جائے گا کہ دینی مدارس کی تعلیم اپنا اصل کردار ادا کر رہی ہے یا نہیں ؟ اور آج مدارس میں جو نظام تعلیم رائج ہے وہ مدارس اسلامیہ کے مقاصد کو پورا کر پا رہا ہے یا نہیں ؟

(۲) اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ متعین کر لیا جائے کہ مدارس کی تعلیم کا اصل مقصد کیا ہے ؟ کیونکہ مقصد کی تعین ہماری بحث کو صحیح خطوط پر رکھے گی اور ہم بآسانی نصاب تعلیم اور نظام تدریس کی خوبیوں اور خرابیوں تک پہنچ سکیں گے ؟ مدارس کی تعلیم کے بارے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس تعلیم کا بنیادی مقصد ایسے صالح افراد کو تیار کرنا ہے جن کا دماغ علم کی روشنی سے منور اور دل خدا کی ذات کے عرفان سے معمور ہو' یعنی اس علم سے دل میں خشیت ربانی پیدا ہو تاکہ اس علم کے حامل افراد ملک و قوم کے لئے بابرکت و نافع ہو سکیں' قرآن مجید نے علم کی غایت' خشیت ربانی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔" **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**" دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مدارس کی تعلیم کا بنیادی مقصد تو یہ ہے کہ پڑھنے والا خود اپنے اخلاق' کردار' اعمال اور فکر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ بنے' اور پھر دوسروں تک اس کو پہنچائے۔ یعنی خود عمل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین و تبلیغ کرے اور اس نظام اخلاق و نظام عبادت و خشیت میں اس کو اتنا گہرا علم حاصل ہو کہ بوقت ضرورت اس پر ہونے والے اعتراضات اور آنے والے شبہات کا پوری بصیرت کے ساتھ دفاع کر سکے۔

قرآن مجید میں حکم ہوا ہے۔ "فلو لانفر من کل فرقة طائفة لتیفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذار جعوالیھم یحذرون (توبہ۔ ۱۲۲) ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن (النحل۔ ۱۲۵)

ان ہی مقاصد ثلثہ یعنی عمل بالدین تبلیغ دین 'اور دفاع دین کو سامنے رکھ کر ہندوستان کے دینی مدارس کا نصاب تعلیم بنایا گیا ہے جو رائج ہے۔ اس سلسلہ میں تفقہ فی الدین کے لئے نصاب میں جو کتابیں اور فنون رکھے گئے ہیں وہ تو ہر دور میں تقریباً یکساں رہے ہیں۔ البتہ تبلیغ دین اور دفاع دین کا عمل چونکہ ہر دور میں ہر ملک میں الگ الگ نہج پر ہوتا رہا ہے۔ اس لئے اس مقصد کے لئے ہر دور کے نصاب میں ضروری تبدیلی بھی ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔

(۴) اس وقت ہندوستان میں جو آزاد مدارس ہیں ان کے نصاب 'اور مدت تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ ان تین مقاصد کے حصول کے لئے جن مدارس نے ان پر جتنی زیادہ توجہ دی ان کے یہاں مدت تعلیم بھی زیادہ رہی اور نصاب میں فنون و علوم زیادہ رکھے گئے اور جن مدارس نے مقامی حالات وضروریات 'یا محدود وسائل کی بناء پر ان پر کم توجہ دی 'ان کے نصاب تعلیم اور مدت تعلیم میں بھی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔ چناں چہ ان مدارس میں اس وقت عمومی طور پر فضیلت تکمیل علم کی آخری سند ہے اور فضیلت تک آٹھ سال کی مدت کا نصاب رائج ہے۔ جیسے دارالعلوم دیوبند' مظاہر علوم سہارن پور' جامعہ رحمانی مونگیر' دارالعلوم حیدر آباد' دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد' دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور' دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ' معہد ملت مالیگاؤں' جامعہ سلفیہ بنارس' دارالسلام عمر آباد وغیرہ میں بعض مدارس جیسے دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت میں سات سالہ ہی نصاب ہے اور عمومی طور پر اکثر مدارس میں آٹھ سال کی مدت میں ۲۸ فن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جن میں پانچ کا تعلق لسانیات یعنی فارسی 'اردو' ہندی' عربی اور انگریزی سے ہے اور ۲۳ کا تعلق مندرجہ ذیل فنون سے ہے۔

(۱) صرف' (۲) نحو' (۳) منطق (۴) فلسفہ' (۵) فقہ' (۶) اصول فقہ' (۷) حدیث' (۸) اصول حدیث' (۹) تفسیر' (۱۰) اصول تفسیر' (۱۱) عقائد وکلام' (۱۲) فرائض' (۱۳) تجوید قرآن' (۱۴) بلاغت' (۱۵) مناظرہ' (۱۶) سیرت النبی' (۱۷) تاریخ' (۱۸) جغرافیہ' (۱۹)

حساب'(۲۰)معاشیات'(۲۱)سائنس'(۲۲)حفظان صحت'(۲۳)سیاست۔

(۴) اس طرح فنون کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مدارس کا نظام فن کے حساب سے مکمل ہے۔ بلکہ آٹھ سال کی مدت میں ۲۸ فن کی تعلیم ایک بوجھ ہے جو تعلیمی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے اور ان فنون میں ۵ کا تعلق لسانیات اور سات کا تعلق علوم عصریہ سے ہے۔ یعنی فن تاریخ' جغرافیہ' حساب' معاشیات' سائنس' حفظان صحت اور سیاست علوم عصریہ میں داخل ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ علوم عصریہ ان مدارس کے نصاب میں کہیں تو برائے نام ہیں اور کہیں ان میں سے بعض فنون سے طلبہ کو ایک حد تک آشنائی ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان علوم عصریہ سے سے واقفیت کے لئے تمام آزاد مدارس اپنے نصاب تعلیم میں ان کو اس طرح جگہ دیں کہ طلباء کو ان کے مبادی اور ضروری مصطلحات سے واقفیت ہو سکے۔ بعض مدارس میں تو ان فنون کی کچھ کتابیں بھی داخل نصاب ہیں اور بعض میں صرف اساتذہ کے نوٹس کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں بڑی ضرورت نصابی کتب کی ترتیب ہے' بالخصوص فن معاشیات' سائنس' حفظان صحت اور سیاست کے موضوع پر درسی کتابوں کی ضرورت ہے۔ بعض بڑے مدارس جیسے دارالعلوم دیوبند نے معاشیات' سائنس' حفظان صحت اور سیاست کے مبادیات پر مشتمل کتابیں تیار کرائی ہیں مگر وہ ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہیں۔ آج سے پچیس سال پہلے کی ضرورت اور موجودہ دور کی ضرورت میں بھی فرق ہو گیا ہے۔ بالخصوص معاشیات پر اس انداز کی کتاب کی ضرورت ہے جس میں موجودہ عہد کے پیچیدہ معاشی مسائل بالخصوص کرنسی اور بینکنگ نیز موجودہ تجارتی بنیادوں کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کا دیگر رائج معاشی نظاموں سے تقابل کیا گیا ہو' بعض مدارس نے تاریخ اور جغرافیہ کو اہمیت دی ہے' لیکن ضرورت ہے کہ تاریخ ہندو تاریخ اسلام نیز جغرافیہ ہندو جزیرۃ العرب کو تمام مدارس کے نصاب میں خصوصی اہمیت دی جائے۔ اس سلسلے میں مدارس کو ان فنون کے لئے باصلاحیت اساتذہ کو اپنے یہاں رکھنے میں بخل سے کام نہ لینا چاہئے۔

(۵) یہی حال لسانیات کا ہے۔ اکثر مدارس میں اس آٹھ سالہ نصاب میں صرف عربی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ فارسی' اردو یا ہندی اور انگریزی اس مدت سے پہلے پرائمری درجات تک ہی پڑھا کر ختم کر دی جاتی ہے' البتہ بعض مدارس میں ہندی اور بعض میں انگریزی کی ایک حد تک

تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسے جامعہ رحمانیہ مونگیر کے نصاب میں ہندی زبان کی تعلیم سال سوم تک دی جاتی ہے۔ اسی طرح دار العلوم اشرفیہ راندیر میں بھی انٹر معیار کی انگریزی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یا ندوۃ العلماء لکھنؤ میں انگریزی کی تعلیم انٹر معیار کی دی جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری تبلیغی، دینی ضروریات اور ملی و قومی حاجات کے پیش نظر ہندی کی شمالی ہند کے مدارس میں ثانویہ تک کی کتابیں داخل کی جائیں۔ جس طرح دیگر ریاستوں بالخصوص آسام، جنگل، تامل ناڈو، گجرات وغیرہ کے مدارس میں وہاں کی علاقائی زبانوں کو خصوصی اہمیت دینے کی ضرورت ہے اور وہاں کے بعض بڑے مدارس میں اس کا اہتمام بھی ہے۔ اسی طرح فارسی اور اردو کی تعلیم پرائمری کے بعد بھی اس آٹھ سالہ نصاب میں ایک سال تک ضرور دی جائے' تاکہ ان دونوں زبانوں میں طلبہ شعور کے ساتھ درک حاصل کر سکیں۔ عربی زبان پر بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اس میں مہارت کے بغیر دین کے علم میں گہرائی نہیں آسکتی ہے۔

(۶) ان عصری علوم اور عصری لسانیات کے علوم و فنون کے علاوہ ہمارے مدارس میں بنیادی اور اساسی طور پر جن علوم کی تعلیم دی جاتی ہے وہ ہیں قرآن' حدیث' فقہ' عقائد اور فرائض نیز ان پانچ اساسی فنون کے لئے آٹھ تکمیلی فنون بھی رکھے گئے ہیں۔ جیسے صرف' نحو' بلاغت' عربی ادب' منطق' نیز فقہ کے اصول' تفسیر کے اصول' حدیث کے اصول۔ اسی طرح اساسی و تکمیلی کو ملانے سے کل تیرہ فنون ہوتے ہیں اور یہ کل کے کل ایسے فنون ہیں جنہیں ہمیں ان مدارس کے نصاب میں ہر حال میں رکھنا ہے۔ اس لئے کہ قرآن و حدیث کی زبان عربی ہے اور علوم قرآن و حدیث میں تعمق و گہرائی پیدا کرنے کے لئے عربی زبان کی معتدبہ تعلیم ضروری ہے اور پھر اس زبان پر عبور کے لئے علم صرف' نحو اور بلاغت کی تحصیل ضروری ہے۔ اسی طرح اصول فقہ' اصول تفسیر اور اصول حدیث ایسے تکمیلی بلکہ بنیادی فنون ہیں جنہیں نہ صرف نصاب میں باقی رکھنا ضروری ہے بلکہ ان پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ رہ گئی منطق تو اسے متقدمین علماء کی کتب فہمی کے لئے مصطلحات منطق کی حد تک نصاب میں رکھنا ضروری ہے' اسی طرح فلسفہ کے مبادیات کا علم متاخرین کے علمی ذخیرہ سے استفادہ میں معاون ہوتا ہے' اس لئے مدارس کے نصاب میں اسے بھی جگہ دی گئی ہے۔

(۷) اس آٹھ سالہ نصاب کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو دین کے بنیادی علوم قرآن و سنت اور

فقہ وعقائد کا صحیح علم آسکے، اور اگر وہ تفسیر حدیث یا فقہ اور علم کلام میں گہرائی و تعمق نہ بھی پیدا کرسکیں تو بھی ان کے اندر ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ آئندہ اپنی قوت مطالعہ و دقت نظر کو کام میں لاکر کسی بھی فن میں کمال پیدا کرسکیں۔ اس نصاب میں بالخصوص تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ پر زور دیا جاتا ہے۔ چناں چہ اکثر بڑے مدارس میں قرآن فہمی کے لئے چار سالہ نصاب رکھا گیا ہے جس میں ابتداء کے دو برسوں میں قرآن مجید کا واضح ترجمہ اور ضروری تشریح ہوتی ہے۔ پھر تفسیر میں جلالین مکمل اور بیضاوی کے کچھ حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ جلالین کے ذریعہ مختصر الفاظ سے آیات قرآنیہ کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس لئے ترجمہ قرآن کے بعد طلبہ پھر ایک سال جلالین کی تفسیر کی مدد سے پورا قرآن مجید پڑھتے ہیں اور دوسرے سال میں تفسیر بیضاوی کے ذریعہ ان کے اندر الفاظ قرآنی میں تعمق و تفقہ پیدا ہوتا ہے، اور وہ قرآنی بلاغت دقیق معانی تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ بعض مدارس میں اس کے ساتھ فتح القدیر اور فتح البیان یا تفسیر مظہری و تفسیر مدارک کے کچھ حصے زیر درس ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان مدارس میں تفسیری نصاب کی مدت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض مدارس، جیسے مظاہر علوم سہارن پور میں تین سالہ ہی نصاب جاری ہے، جس میں پہلے سال صرف پارہ عم کا ترجمہ پڑھایا جاتا ہے اور دوسرے سال میں جلالین اور اس کے بعد تفسیر بیضاوی و تفسیر مدارک کے کچھ حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ جبکہ دارالعلوم حیدر آباد، جامعہ رحمانیہ مونگیر، دارالعلوم دیوبند وغیرہ میں چار سالہ نصاب ہے۔ اسی طرح دارالسلام عمر آباد، جامعہ سلفیہ بنارس میں ٦ سالہ نصاب ہے۔ اس وقت ہندوستانی مدارس میں عمومی طور پر یہ رواج ہے کہ اس آٹھ سالہ نصاب تعلیم کے آخری سال میں مکمل طور پر کتب احادیث کی تعلیم ہوتی ہے، مگر اس سے بعض مدارس جیسے دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور مستثنیٰ ہے۔ جہاں پورا قرآن مجید تین بار تین مختلف حیثیت سے معانی کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو سال میں پورا قرآن مجید تفسیر جلالین کے ذریعہ پڑھا لیا جاتا ہے۔ پانچویں سال میں تفسیر بیضاوی کا مکمل سورہ بقرہ اور چھٹے سال میں پورا قرآن مجید چھ تفسیری کتابوں کے ذریعے، جس میں دو کتابیں تفسیر بالماثور کی ہیں یعنی تفسیر مظہری و تفسیر ابن کثیر اور تین کتابیں عقلی و نقلی تفسیر کی جامع ہیں، جیسے تفسیر بیضاوی، تفسیر کشاف، تفسیر مدارک۔ اس طرح احکام القرآن کا بھی کچھ حصہ پڑھایا جاتا ہے۔ ان تمام تفسیری نصاب پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ تفسیر قرآن کا چار

سالہ نصاب بڑا معتدل ہے' لیکن اس میں ایک ایسی تفسیری کتاب کے اضافے کی ضرورت ہے جو متاخرین مفسرین کی تفسیری کتابوں کے اقتباسات پر مشتمل ہو۔ جیسے تفسیر رازی' تفسیر روح المعانی' تفسیر الجواہر' تفسیر فی ظلال القرآن وغیرہ نیز اس میں ایسے تفسیری اقتباسات ہوں جو موجودہ دور کی تحقیقات کو نیہ اور جدید سائنس کے انکشافات کی تطبیق پر مشتمل ہوں تاکہ طلباء کو دیگر تفسیری مناہج سے واقفیت ہو سکے۔

حدیث میں اکثر بڑے مدارس جیسے دارالعلوم دیوبند' مظاہر علوم سہارنپور' دارالعلوم مئو' دارالعلوم ندوۃ' دارالعلوم حیدر آباد' دارالعلوم سبیل السلام' جامعہ سلفیہ' دارالعلوم عمر آباد' جامعہ رحمانیہ مونگیر کا نصاب مکمل ہے۔ اس میں حدیث کا تین سالہ اور چار نصاب رائج ہے۔ جس کے اندر ابتداء کے سال میں اخلاقیات کے موضوع پر کوئی ایک یا دو کتاب داخل ہے۔ اس کے بعد تیسرے سال مشکوٰۃ المصابیح اور پھر چوتھے سال صحاح ستہ کی مکمل تعلیم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اصول حدیث میں بھی ایک یا دو کتاب شامل نصاب ہوتی ہے۔ احادیث کے سلسلے میں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اساتذہ احادیث کے ان ابواب پر خصوصی دھیان دیں جن کا تعلق دور حاضر کے مسائل سے ہے۔ جیسے معاشرتی و معاملاتی حدیثیں یا وہ احادیث جو کائنات کے سلسلہ میں صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے نکلی ہیں اور سربستہ راز کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔

فقہ کے سلسلہ میں عام طور پر ان مدارس میں پانچ سالہ نصاب ہے جس میں نورالایضاح' قدوری' کنزالدقائق' شرح وقایہ اور ہدایہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ بعض مدارس میں بدایۃ المجتہد اور الفقہ المیسر داخل ہے۔ اس نصاب میں فقہ کے تمام ابواب کی تعلیم ہوتی ہے۔ عام طور پر دو برسوں میں فقہ کے مسائل کی تعلیم دلائل کے بغیر نورالایضاح اور قدوری کے ذریعے اس کے بعد کے تین برسوں میں دلائل قرآن وسنت کے ساتھ فقہی ابواب کی تعلیم ہوتی ہے۔ سلفی مدارس جیسے جامعہ سلفیہ بنارس اور دارالسلام عمر آباد میں حنفی کتب فقہ قدوری اور ہدایہ کے ساتھ فقہ عام یعنی بدایۃ المجتہد کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ اسی طرح ان مدارس میں اصول فقہ کی دو یا تین کتابیں جیسے اصول الشاشی' نورالانوار' حسامی یا عبدالوہاب خلاف کی اصول الفقہ داخل ہیں۔ بعض مدارس میں الفقہ العام کے علاوہ الفقہ المقارن بھی داخل ہے۔ جس کے ذریعہ دیگر وضعی قوانین سے قوانین اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ صرف ندوہ کے

تخصص فی الفقہ کے درجہ میں داخل ہے اور صرف نوٹس کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے۔

علم عقائد و کلام ہمارے نصاب میں برائے نام ہے۔ اس میں صرف ایک کتاب شرح عقائد نسفی یا العقیدۃ السنیہ داخل نصاب ہے۔ بعض مدارس میں ان کی جگہ "کتاب التوحید" داخل ہے۔ شرح عقائد نسفی یا کتاب التوحید یا عقیدۃ الطحاوی آٹھویں صدی ہجری سے قبل کی تصنیف ہیں۔ جس میں یا تو عقائد کی تعلیم مختصر طور پر دے دی جاتی ہے یا پھر شرح عقائد کے ذریعے یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ شبہات کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن کی آج ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے علم کلام کی موجودہ شکل بہت زیادہ قابل ترمیم ہے۔ علم کلام کا مقصد یہ تھا کہ نبوت' وحی' ذات الٰہی' نیز ذات الٰہی کے وجود' حشر و نشر' کتاب اللہ وغیرہ جیسے دین اسلام کی بنیادوں پر جو شبہات پیدا کئے جاتے ہیں ان کا جائزہ لے کر ان کی تردید کی جائے اور ظاہر ہے کہ آج کے دور میں دہریت' سوشلزم' کمیونزم اور سائنس کے نام سے قرآن کے علوم' حدیث کی صحت و حجیت' مذہب کی ضرورت' اسلام کے عائلی و معاشرتی اور حدود و قصاص کے احکام نیز ذات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو اعتراضات کئے جارہے ہیں ان کی تردید سے ہمارا علم کلام خالی ہے۔ اس لئے علم کلام کی ایسی کتابیں تیار کراکر داخل درس کی جائیں جو دور حاضر کی ضرورت کو پورا کرتی ہوں۔

یہی حال علم فرائض پر عدم توجہی کا ہے۔ اس فن کی ایک کتاب سراجی داخل نصاب ہے۔ مگر وہ بھی اکثر مدارس میں دوسری کتابوں کے تابع ہے کہ اگر ان سے سال کے آخر میں وقت بچ جاتا ہے تو اس کا درس ہوتا ہے۔ دراں حالیکہ علم فرائض کا حصول معاشرتی لحاظ سے اہم ہے اور عصر حاضر میں قرآن مجید کے اس قانون میراث پر جس قسم کے شبہات پیدا کئے جاتے ہیں ان کا صحیح جواب بھی علماء عصر کو معلوم ہونا چاہیئے۔

(۸) جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اس نصاب کا بنیادی مقصد طلبہ میں تفقہ فی الدین' تبلیغ دین اور دفاع دین کی مستحکم و ٹھوس صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ مگر اس نصاب سے آٹھ سال کی مدت میں یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا ہے۔ چناں چہ اسی وجہ سے بعض بڑے مدارس میں فقہ' عام دینیات' عربی ادب' تفسیر اور معقولات یعنی منطق و فلسفہ کے لئے الگ الگ ایک سالہ تخصص کا شعبہ و نصاب ہے۔ جیسے دارالعلوم دیوبند ہیں' مگر ضرورت ہے کہ ایسے شعبے تمام بڑے مدارس اپنے یہاں کھولیں اور ان کو اہمیت کے ساتھ فروغ دیں۔ بالخصوص تبلیغ

دین کے لئے ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس میں قرآن مجید کے تبلیغی اصول' موجودہ عہد کے کلامی مباحث' ہندوستانی ادیان کا علم اور کوئی ایک ایسی ہندوستانی زبان شامل ہو جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے افراد میں تبلیغ کا کام کر سکیں۔ اسی طرح تاریخ اسلام کا بھی شعبہ قائم کیا جائے۔ جس میں طلبہ سیرت النبی' سیرت الصحابہ' عام اسلامی تاریخ' فلسفہ تاریخ اور اس کے ساتھ سماجیات کا درس لے سکیں کہ یہ وقت کہ ایک بڑی ضرورت ہے۔

(۹) آخر میں نظام تعلیم پر گفتگو سے پہلے فن منطق' فلسفہ اور صرف و نحو کے بارے میں کہتا چلوں کہ فن منطق کی تین یا کسی مدرسہ میں چار کتابیں اس آٹھ سالہ نصاب میں داخل ہیں۔ اس فن کو ہمارے مدرسوں میں باقی رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ متاخرین علماء و فقہا کی کتابیں اور چھٹی صدی ہجری کے بعد کے علماء کے علمی ذخیرے منطقی اصطلاحات اور لب و لہجہ میں پیش کئے گئے ہیں۔ اگر طلبہ مدارس ان منطقی اصطلاحات کو جان لیں گے تو انہیں اس علمی ذخیرہ سے استفادہ میں دقت نہ ہوگی۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ علوم قرآن و حدیث تک رسائی میں منطق یا فلسفہ کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے پچاس برس پہلے مدارس کا نصاب فن منطق کی کتابوں سے کچھ زیادہ بوجھل تھا' مگر آج اکثر مدارس میں منطق کی صرف دو اور تین کتابیں داخل ہیں۔ صرف مظاہر علوم سہارنپور' دارالعلوم اشرفیہ' دارالعلوم دیوبند جیسے مدارس میں اس فن کی چار چار کتابیں داخل ہیں۔ اس سلسلہ میں جامعہ رحمانیہ مونگیر کا نصاب قدرے بہتر ہے جس میں تین سال میں فن منطق کی تین چار قدرے آسان کتابیں داخل ہیں جو فن کی اصطلاحات سے واقف ہونے میں بہت عمدہ ہیں۔ جیسے کبریٰ' مرقات شرح تہذیب اور قطبی' بلکہ علوم عصریہ اور علم عقائد کی کتابوں کے اضافہ کے لئے' منطق کی کتابیں ابھی اور کم کی جانی چاہئیں۔

فلسفہ میں عموماً ایک یا دو کتاب ہر مدرسہ میں ہے۔ اس سلسلے میں عرصہ سے ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جس میں قدیم اور جدید دونوں قسم کے فلسفہ کے مسائل کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہو تاکہ ہمارے طلبہ صرف قدیم فلسفہ کے لاحاصل بحثوں میں نہ رہ جائیں بلکہ دور جدید کے فلسفہ سے بھی آگاہی حاصل کریں۔

علم صرف اور نحو کے بارے میں اکثر مدارس کا نصاب یکساں ہے۔ عموماً دو تین کتابیں ان دونوں فنون کی داخل کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ نحو کے

متعلق کتابوں جیسے "شرح جامی" کے بجائے فن نحو کی ایسی کتاب داخل کی جائے جس سے طلبہ فن سے آگاہ ہو سکیں۔ وہ لفظی بحثوں میں الجھ کر ذہنی جمناسٹک نہ کرتے رہ جائیں۔

عربی ادب کا نصاب اکثر مدارس میں بہتر ہے' اور عام طور پر ایسی کتابیں داخل ہیں جن سے قرآن و حدیث اور عام کتب اسلامیہ کی زبان والفاظ کے فہم میں آسانی ہوتی ہے۔ صرف ضرورت طریقہ تدریس کو درست کرنے کی ہے تاکہ طلبہ عربی تحریر اور تقریر کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کر سکیں۔

(۱۰) اکثر مدارس کی تدریسی زبان اردو ہے' یا پھر علاقائی زبان ہے۔ اس وقت ہمارے یہاں اس آٹھ سالہ نصاب میں فن تاریخ' اور صرف یا لسانیات کو چھوڑ کر تمام فنون کی کتابیں عربی زبان میں ہیں اگر تعلیمی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس آٹھ سالہ نصاب کا پہلا اور دوسرا درجہ پرائمری کے بعد شروع ہونے والا درجہ ششم یا ہفتم ہے' اور ظاہر ہے کہ اس درجہ کے طلبہ کو عربی زبان میں لکھی ہوئی کسی فن کی کتاب پڑھانا ان کے اوپر ایک بوجھ ہے اور فن کے حصول میں یہ رکاوٹ بنتا ہے۔ اس لئے سال اول اور دوم میں فن کی کتابیں اردو زبان میں داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ طلبہ پر بیک وقت فن کے حصول اور زبان کا بوجھ نہ پڑے۔ نیز ابتداء کے دو برسوں میں ایسی کتابیں رکھی جائیں تاکہ ان طلبہ کو بھی دین کے مسائل سے کچھ آگاہی حاصل ہو جائے۔ جو ثانویہ درجات تک پڑھ کر تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔

**خلاصہ بحث** : خلاصہ بحث یہ ہے کہ مدارس کی تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جن کا دماغ علم کی روشنی سے منور اور دل خشیت ربانی سے معمور ہو۔ وہ علم میں اس قدر درک رکھیں کہ دین کی دعوت کا کام انجام دے سکیں۔ دین پر ہونے والے شبہات کا دفاع کر سکیں' اور نئے مسائل کے احکام کا کتاب و سنت سے استخراج کر سکیں۔ اس کے لئے مدارس کے نصاب تعلیم میں تھوڑی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

(۱) بالخصوص دعوت دین کے لئے تخصص کا شعبہ قائم کرنے اور ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان بالخصوص ہندی کو پڑھنے' تاریخ کے فن پر توجہ دینے اور سماجیات کی کتاب نصاب میں داخل کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲) علم تفسیر میں ایک ایسی کتاب کے اضافہ کی ضرورت ہے جو متاخرین اصحاب تفسیر کی

کتابوں سے اقتباسات اور آیات کونیہ کی جدید تحقیقات کی تطبیق پر مشتمل ہو۔ تفسیر کا چار سالہ نصاب تمام مدارس میں رائج کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۳) علم حدیث کے لئے اضافہ کتاب کی ضرورت تو نہیں ہے البتہ طریقہ درس میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ طلبہ ان احادیث کے معانی سے پوری طرح واقف ہو سکیں' جن میں معاشرتی و اجتماعی اور اقتصادی مسائل سے بحث ہوتی ہے۔ احادیث کی نقل و روایت کی تاریخ اور رجال سے واقفیت بھی ہونی چاہیئے۔

(۴) فقہ کے باب میں ایسے اصول پر تخصص کے شعبہ میں محنت کرائی جائے جن سے جدید عہد کے پیش آمدہ مسائل کا استخراج ہو سکتا ہے۔ فقہ حنفی کے علاوہ فقہ شافعی' مالکی حنبلی اور دیگر ائمہ فقہ کی آراء سے بھی طلبہ کو تخصص کرتے وقت واقف ہونا چاہیئے۔

(۵) علم کلام کا نصاب ہمارے مدارس میں بہت ہی ناقص ہے۔ اس کا رائج طرز امام غزالی" کے عہد کی پیداوار ہے اور عصر حاضر کے لئے ناکافی ہے۔ اس فن میں جدید کتابوں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔

(۶) علم فرائض مدارس کے نصاب میں بے توجہی کا شکار ہے۔ اس پر توجہ دینا چاہیئے۔

(۷) عصری علوم میں علم سماج' معاشیات' تاریخ اور جنرل سائنس کی کتابیں تمام مدارس میں داخل کی جائیں۔

(۸) لسانیات میں اردو اور فارسی کو سال اول و دوم تک رکھا جائے۔ ہندی اور دیگر صوبوں میں وہاں کی علاقائی زبان کو اہمیت دی جائے۔ انگریزی بھی سال دوم تک رکھی جائے۔

(۹) منطق کی کتابوں کی جگہ پر فن کی ایسی کتابیں رکھی جائیں جن سے طلبہ فن سے واقف ہو سکیں۔

(۱۰) ابتداء کے دو برسوں میں اردو زبان میں کچھ کتابوں کو رکھا جائے۔

(۱۱) اور تمام بڑے مدارس میں فقہ' حدیث' تفسیر' علم کلام' دعوت کے لئے تکمیل دینیات نیز تاریخ و علوم عمرانیات و سماجیات پر مشتمل شعبے تخصص کے لئے قائم کئے جائیں۔

# نصاب میں ترمیم

مولانا نثار احمد قاسمی
(دارالعلوم مونا تھ بھنجن)

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ دور اسلام کے لئے بہت پر آشوب ہے۔ ہمارے گردوپیش مختلف فتنے ہیں جو اسلام کو نگلنا چاہتے ہیں اور یہ ہمارے مدارس اسلامیہ جو بقول حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ اسلام کے مضبوط قلعے اور چھاؤنیاں ہیں۔ پچھلے دور کے علماء انہیں مدارس کے پروردہ تھے۔ مگر آج انہیں مدارس کے علماء و فضلا دور حاضر کے چیلنج سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ کا ازسر نو جائزہ لیا جائے اور ان کے نصاب تعلیم پر غوروفکر کر کے ایسے تمام مواد اس میں لائے جائیں جن کی ضرورت آج کے علماء کو ہو سکتی ہے اور اس میں ذرہ برابر پس و پیش نہیں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہمارے پاک طینت اور روشن ضمیر اسلاف ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔

اس لئے نصاب تعلیم میں ایک ایسی کتاب کا ہونا ضروری ہے جو دنیا کے مشہور مذاہب اور موجودہ دور کے تمام ازموں اور ان کی تاریخ اور تعلیمات پر مشتمل ہو' تاکہ ان گمراہیوں' چالوں اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی مخالفتوں اور ان کی بربادیوں کی داستانوں کو اچھی طرح جان سکیں' تاکہ ان کی غلط روش سے بچ کر خدا کی نعمتوں کے مستحق بن سکیں' اتنے جامع اور ہر حیثیت سے مکمل نصاب تعلیم پر میرے خیال میں کسی صاحب نظر کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

بہر حال نصاب تعلیم کی تدوین و ترتیب ایک اہم کام ہے' اس کی اہمیت و نزاکت سے ہم واقف ہیں' اور اپنی بے بضاعتی پر بھی نگاہ ہے' ویسے اپنی ناقص عقل کے مطابق ایک خاکہ پیش

کر دیا ہے لیکن صحیح معنی میں یہ کام ان علماء ربانی کا ہے جن کو اللہ نے رسوخ فی الدین کے ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات میں بھی بصیرت عطا کی ہے' وہ ایک ایسا جامع نصاب تعلیم تیار کریں کہ جس کو پڑھ کر دینی بصیرت' اخلاق، کردار کی بلندی' دوربینی' عقل و فکر میں گیرائی و گہرائی اور وقت کے فتنوں سے نبرد آزمائی کی قوت و صلاحیت پیدا ہو اور صحیح معنوں میں وہ علامہ اقبال کا مرد مومن بنے' جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں　　　　بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق

# مدارس کا نصاب اور سائنسی علوم

ڈاکٹر اسلام پرویز
(رانچی)

آج کی دنیا جس تیزی سے علم کے مختلف شعبوں میں ترقی کر رہی ہے وہ توجہ طلب ہے۔ اس میڈیا اور الیکٹرانکس کے آلات نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور آج ہم بغیر محسوس کئے ہوئے من وعن انہیں قبول کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ آج ہم صاحب علم وہنر اس موضوع پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ مدرسے کے نصاب تعلیم میں کیوں کر جدید علوم کی تعلیم اور اس کے مطالعہ کو داخل کیا جائے۔

اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ مدرسے کے نصاب تعلیم میں ترمیم واضافہ اور اصلاح کے بعد اسے لائق بنایا جائے کہ مدرسہ کے فارغ التحصیل طلباء بھی دنیا کے ترقی یافتہ طلبہ سے دوبدو گفتگو کر سکیں اور عالمی زندگی میں کوئی مقام حاصل کر سکیں۔ طرزِ کہن پہ اڑنے اور افکار نو سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہندوستانی مدرسوں میں دو طرح کے نصاب تعلیم رائج ہیں۔ اک درس نظامیہ اور دوسرا درس عالیہ۔ دونوں نصاب تعلیم میں قرآن' حدیث' فقہ' منطق' فلسفہ اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ان پر زور دیا جاتا ہے لیکن دونوں نصاب میں علم ریاضی اور سائنس کی تعلیم کا فقدان ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کی دوڑ اور اس کے مقابلہ میں مدرسہ کے طالب علم' انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اس میں بنیادی طور پر کہیں غلطی ہے اور اس پر ہمیں غور کرنا ہے۔ ہمارے ذہن میں ایک بات جم گئی ہے کہ دنیاوی علوم' یا سائنس کی تعلیم سے ہمارے مذہب پر آنچ آتی ہے لیکن

یہ سوچنا سراسر غلط ہے۔ سائنسی طرز فکر سے مذاہب کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور سماج کو بھی۔ دوسرے ہماری بنیادی تھیوری کہ دنیا جائے قرار نہیں ہے اور اس سے دل نہیں لگانا چاہئے اور آخرت کی تیاری کرنی چاہئے لیکن یہ تصور بھی غلط ہے ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلا جائے۔ ہمارے مذہب میں علوم کو حاصل کرنا دوسری زبانوں کو حاصل کرنا ان کے بارے میں جان کاری حاصل کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر دین کے بارے میں مکمل جانکاری حاصل کرتے ہیں تو دنیا کے بارے میں بھی مکمل آگاہی ہونی چاہئے۔ آج ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔ اور ان میں مسلمان بچے بچیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو سماج کی تعمیر و تشکیل میں ان کا بھی برابر کا حصہ ہے۔ لیکن آج کے مدرسوں کا حال یہ ہے کہ ان کا نصاب اور طرز تعلیم کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ زندگی اور اپنے دور کی تعمیری قوتوں سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی اپنا پرانا لباس تبدیل کر چکی ہے۔ علوم و فنون نئے روپ اختیار کر چکے ہیں۔ ہمارے مسائل کی نوعیت بدل گئی۔ طرز فکر اور انداز نظر بدل گیا ہر چیز قانونِ ارتقاء کے تحت ماضی سے بہت آگے نکل گئی۔ دنیا کی جن قوتوں نے ابھرتی ہوئی قوتوں کا ساتھ دیا وہ زندہ رہیں اور ترقی کرتی رہیں۔ اور جنھوں نے ان سے آنکھیں چرائیں وہ مٹ گئیں۔

اس ایٹمی دور میں نیزہ بازی' تیر اندازی اور فنون حرب کے پرانے طریقے بے کار ہو چکے ہیں' اس لئے ایٹمی قوتوں کا ساتھ دینا ہوگا اور جدید علوم و فنون سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا ہوگا......... ہم لوگ نوسٹلجیا کے شکار ہیں۔ صرف ہم اپنے ماضی پر فخر کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ یورپ نے تمام علوم و فنون عربی سے حاصل کئے۔ ہمیں آج جدید علوم کی تعلیم حاصل کر کے دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلنا ہوگا۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو    پھر پسر لائق میراث پدر کیوں کر ہو

اس لئے کارگر مشورہ کہ :

(۱) مدرسے کے نصاب تعلیم میں انقلابی تبدیلی لائی جائے۔
(۲) ریاضی اور سائنس کی تعلیم ضروری قرار دی جائے۔
(۳) حکومت وقت ان مدرسوں کی بھرپور مالی اعانت کرے جو اپنے نصاب میں ریاضی'

سائنس، پیٹرولیم، ایروناٹکس، انجینئرنگ، میڈیکل سائنس اور ٹیکنالوجی کو شامل کرتے ہیں۔

(۴) جن مدرسوں میں جدید علوم کی تعلیم دی جاتی ہو وہاں ہندوستانی عوام بھی اپنے بچوں کو داخل کرانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں۔

(۵) ہیومانیٹز اور سوشل سائنسز کو بھی مدرسے کے نصاب میں شامل کیا جائے اور انہیں فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔

(۶) بچوں کے گارجین بھی اپنا ذہن صاف ستھرا رکھیں اور اپنے طور طریقے میں سائنٹیفک رویہ اپنائیں۔

(۷) جدید نصاب کی تیاری کے لئے مختلف علوم و فنون کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو دینی تعلیم اور جدید علوم کا ایک کارآمد نصاب تیار کر سکے۔

(۸) مدرسہ کی ڈگریوں کو تمام یونیورسٹیاں تسلیم کریں۔

# مدارس اسلامیہ کا نصاب

مولانا بدر احمد مجیبی
(خانقاہ مجیبیہ' پھلواری شریف)

## مدارس کا نصاب تعلیم

اسلامی مدارس کے نصاب تعلیم میں جمود و تعطل کبھی نہیں رہا۔ وقت اور ماحول کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں تدریجاً ہوتی رہیں ہیں۔ کتابوں میں بھی تغیر ہوا اور فنون میں بھی' چوں کہ یہ مدارس شروع ہی سے دینی نوعیت کے رہے اس لئے اس کا نصاب تعلیم بھی دینی علوم اور اس کے معاون فنون سے متعلق رہا۔ تفسیر' حدیث' فقہ و اصول' بلاغت' ادب' صرف و نحو وغیرہ اس کے خاص فنون تھے۔ ان فنون کی تکمیل کے بعد طالب علم علماء کے طبقہ میں آجاتا ہے۔

امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کے قبل تک علوم عقلیہ باقاعدہ نصاب تعلیم میں داخل نہیں تھے بلکہ یہ علوم شرعیہ کے معارض و مخالف تصور کئے جاتے تھے اور عام خیال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ علوم شرعیہ اور علوم عقلیہ ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ امام غزالی نے اس ذہن و فکر کی نہایت سختی کے ساتھ تردید کی اور بتایا کہ علوم عقلیہ شرعی علوم کے بہت زیادہ ممد و معاون بن سکتے ہیں۔ چناں چہ ان کی اصلاح کا یہ اثر ہوا کہ منطق و فلسفہ اور حساب و طب وغیرہ نصاب تعلیم میں شامل ہو گئے۔ نصاب تعلیم میں یہ پہلی سب سے بڑی تبدیلی تھی جو پانچویں صدی ہجری میں عمل میں آئی۔

ہندوستان میں قائم مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم بھی تقریباً اسی طرز پر تھا۔ اور یہی فنون تفسیر' حدیث' فقہ و اصول' بلاغت' ادب' صرف و نحو' منطق و فلسفہ' کلام و تصوف زیر

درس تھے۔ بعض جگہوں پر ہیئت حساب اور طب وغیرہ بھی پڑھائے جاتے تھے۔ درس نظامی کے وجود میں آنے سے قبل تک اصل توجہ فقہ و اصول کی طرف تھی۔ فقہ و اصول میں مہارت امتیاز کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اسی نصاب تعلیم کے پروردہ علامہ حسین صغانی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی، حضرت نظام الدین اولیاء، علامہ طاہر پٹنی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ احمد امیٹھوی معروف ملا جیون، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے نامور فضلاء تھے۔

بارہویں صدی ہجری میں مدارس کے نصاب تعلیم میں کافی تغیر ہوا۔ ملا نظام الدین فرنگی محلی (م ۱۱۶۱ھ) نے ضرورت اور حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایک نیا نصاب مرتب کیا جو درس نظامی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نصاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس ترتیب سے کتابیں پڑھنے سے طلباء کے اندر دقتِ نظر پیدا ہو جاتی اور مطالعہ کی قوت میں اضافہ ہو جاتا۔ یہ نصاب تعلیم بہت مشہور و معروف ہوا، اور ہندوستان میں عام طور سے یہی درس نظامی رائج ہو گیا۔ حالات اور وقت کے اعتبار سے اس میں زیادہ اہمیت منطق اور فلسفہ کو دی گئی تھی۔ منطق کی تقریباً سات کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ نصاب تعلیم میں یہ دوسری بڑی تبدیلی تھی جو بارہویں صدی ہجری میں واقع ہوئی۔

لیکن بعد میں منطق و فلسفہ کو زیادہ اہمیت مل جانے کی وجہ سے منطق کی کتابوں کا اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ تنہا منطق کی ۱۵ کتابیں نصاب درس میں شامل ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ بظاہر یہی نکلا کہ دوسرے علوم و فنون کی طرف سے توجہ میں کمی آگئی اور سارا زور منطق پر صرف ہونے لگا۔ حدیث، تفسیر اور ادب کی کتابیں کم ہو گئیں اور ان کی طرف پوری توجہ بھی نہیں رہی۔ ان ہی حالات میں ندوۃ العلماء کی تحریک اٹھی اور علامہ شبلی اور دیگر علماء نے منطق کو کم کر کے تفسیر، حدیث اور ادب کی کتابیں شامل کرنے کی آواز بلند کی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اس نئے نصاب کی ابتداء کی۔ اگرچہ اس کی مخالفت بھی ہوئی، مگر مخالفت کے باوجود اس کا مفید اثر پڑا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں :

"باقی غیر امدادی عربی مدارس تو وہ بھی زبان کی خاموشی یا انکار کے ساتھ عملاً دل سے اس کی طرف آہستہ آہستہ آرہے ہیں۔" (حیات سلیمان۔ ص ۲۹۸)

نصاب تعلیم پر اس تحریک کے اثرات بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج مدارس اسلامیہ میں تین یا چار سے زیادہ منطق و فلسفہ کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں۔ یہ نصاب تعلیم میں تیسری سب سے بڑی تبدیلی تھی جو چودھویں صدی میں رونما ہوئی۔

## علوم جدیدہ کی ضرورت

زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ اس کے حالات اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ کل جو چیزیں ہمارے لئے نئی اور تازہ تھیں آج وہ پرانی ہو جاتی ہیں۔ آج حسب حال سمجھی جانے والی چیزیں چند روز بعد از کار رفتہ قرار دے دی جائیں گی۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس لئے دنیا کی دیگر اشیاء کی طرف نصاب تعلیم میں بھی زمانے کے تغیر اور تبدیلی کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ آج جدید علوم کی شکل میں بہت مفید چیزیں ہمارے سامنے آرہی ہیں۔ دنیا میں بھی یہی علوم رائج ہیں۔ ان میں مہارت حاصل ہو جانا ترقی یافتہ ہونے کی دلیل ہے اور ان سے ناواقفیت پسماندگی کی علامت ہے، لیکن مدارس اسلامیہ ان مفید علوم سے یکسر بیگانہ ہیں۔ تہذیب جدید کی جانب سے جو نئے اعتراضات اسلام پر وارد ہو رہے ہیں۔ مدارس اسلامیہ کے بیشتر فضلاء ان کے جوابات تو دور کی بات ان کو سمجھنے تک کی صلاحیت نہیں رکھتے اور یہ معلوم ہے کہ فلسفہ جدیدہ سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا ازالہ فلسفہ قدیمہ کے ذریعہ ممکن نہیں۔ جب تک نئے علوم میں دسترس اور کمال حاصل نہ کیا جائے کسی طرح ان نوخیز مسائل کے حل پیش نہیں کئے جاسکتے۔

جدید علوم میں سے کوئی علم بھی اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ طبیعات، معاشیات، نفسیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، عمرانیات یہ سب علوم اسلامی عقائد و قوانین کے ساتھ پڑھائی جائیں تو یہ اسلام کے معارض ہونے کے بجائے اسلام کے بڑے معاون ہو سکتے ہیں۔ آج وہ غیروں کے ہاتھوں میں ہیں اس لئے ان سے بے دینی اور دہریت پھیل رہی ہے۔ جب یہ علوم مسلمانوں کے ہاتھوں میں آجائیں گے تو پھر یہ

مسلمانوں کے لئے زہر فشاں نہیں رہیں گے بلکہ گہر ریز ہو جائیں گے۔ ہماری تاریخ میں اس کی مثال موجود ہے۔ اگر سائنس اسلام کے خلاف ہوتی تو ہمیں مسلم حکماء اور سائنس دانوں کی بڑی تعداد نظر نہ آتی۔ خوارزمی، بیرونی، ذکریا رازی، ابن سینا، وفارابی جیسے سائنس داں پیدا نہ ہوتے اور امام الحرمین امام غزالی، امام رازی، ابن رشد جیسے حکماء کا نام دنیا میں سنا نہ جاتا۔ ان میں سے اکثر حضرات اس مرتبہ کے ہیں کہ ان سے یورپ نے صدیوں خوشہ چینی کی ہے۔ جب علوم جدیدہ اسلام کے معاون بن سکتے ہیں تو کیوں نہ ایسا نصاب تعلیم ترتیب دیا جائے جس میں علوم شرعیہ کے ساتھ علوم جدیدہ کو بھی مناسب مقام حاصل ہو اور ہمارے مدارس سے دینی علوم کی مہارت کے ساتھ جدید علوم میں بھی کمال رکھنے والے فضلاء نکل سکیں۔

رہا مسئلہ اس سلسلہ میں دشواریوں اور دقتوں کا تو ان کے مناسب حل مل سکتے ہیں۔ پہلی دشواری تو یہ پیش آئے گی کہ مدارس کے نصاب میں پہلے ہی سے کثیر کتابیں موجود ہیں اب نئے علوم کے اضافے سے طلباء پر برداشت سے زیادہ بوجھ پڑ جائے گا۔

اس مسئلہ کے حل کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تمام جدید علوم کو لازمی نہیں کیا جائے، بعض جو ضروری علوم ہیں، ان کو لازمی قرار دیا جائے۔ بقیہ کو اختیاری مضامین کے مرتبہ میں رکھا جائے۔ لازمی مضامین میں انگریزی، ہندی، حساب، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات وغیرہ رکھے جا سکتے ہیں۔ ندوۃ العلماء کے نصاب میں یہ مضامین شامل ہو چکے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تمام لازمی مضامین بھی ایک ہی درجہ میں نہ رکھے جائیں بلکہ اس طرح ہو کہ کسی ایک درجہ میں معاشیات ہو۔ دوسرے درجہ میں جغرافیہ ہو۔ تاریخ کو دو درجوں میں رکھا جائے۔ حساب کو بھی دو تین درجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ البتہ انگریزی اور ہندی کی تعلیم تمام درجات میں ہونی چاہیئے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ علوم شرعیہ کے علاوہ جو علوم نصاب میں شامل ہیں ان کی کتابیں کم کر دی جائیں۔ مثلاً منطق و فلسفہ کی ایک ایک کتاب پڑھائی جائے۔ صرف اور نحو کی دو یا تین سے زیادہ کتابیں نہ پڑھائی جائیں۔ بلاغت کے لئے بھی ایک ہی جامع کتاب رکھی

جائے۔ اس طرح جدید علوم پڑھانے کے لئے کافی وقت نکل آئے گا اور طلبہ پر زیادہ بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔

دوسری اہم دشواری یہ بتائی جاسکتی ہے کہ جدید علوم پڑھانے کے لئے ہمیں اساتذہ کہاں سے میسر آئیں گے۔ سرکاری مدارس کے لئے تو مشکل نہیں ہے مگر غیر سرکاری مدارس کے پاس وسائل کی کمی ہے اور یہ مدارس جدید علوم میں مہارت رکھنے والے اساتذہ کی بڑی تنخواہوں کے متحمل نہیں ہوسکتے۔

یہ مسئلہ بھی اس طرح حل کیا جاسکتا ہے کہ ایسے اساتذہ جو اسکول اور کالج سے تو ریٹائر ہوچکے ہیں مگر ذہنی اور جسمانی اعتبار سے تدریس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان سے مدد لی جائے۔ وہ کم تنخواہ پر بھی تدریس کے لئے راضی ہوسکتے ہیں۔

دوسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ ہر مدرسہ کے لئے اس شہر کے اہل ثروت حضرات سے اپیل کی جائے کہ وہ ایسے اساتذہ کے لئے تنخواہ کا علیحدہ سے انتظام کردیں۔

تیسری شکل یہ بھی نکل سکتی ہے کہ شہر میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی ایسا فنڈ قائم کردیا جائے جس سے مدارس کے ان اساتذہ کی تنخواہ کا انتظام ہوجایا کرے۔

تیسری دشواری یہ پیش کی جاتی ہے کہ علوم جدیدہ کو نصاب تعلیم میں شامل کرلینے سے ساری توجہ جدید علوم پر مرکوز ہوجائے گی اور علوم شرعیہ کی طرف سے میلان کم ہوجائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں اصل اور بنیادی حیثیت علوم شرعیہ کی رہے گی اور یہ اپنی جگہ برقرار رہیں گے۔ ان میں کوئی تغیر و تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ البتہ ثانوی حیثیت سے علوم جدیدہ کو رکھا جائے گا اور ان کی تعلیم دی جائے گی۔ اس طرح علوم شرعیہ پر پوری توجہ رہے گی اور عدم توجہ کا خدشہ بے بنیاد ثابت ہوگا۔ امام غزالی نے اپنے زمانے کے جدید علوم کی حیثیت سے منطق و فلسفہ کو نصاب میں شامل کیا تو اس سے شرعی علوم کی حیثیت کم نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بھی مفسرین، محدثین اور فقہاء کی جماعت پیدا ہوتی رہی۔

نئے علوم و فنون کو نصاب تعلیم میں شامل کرلینے سے اس قسم کے کچھ اور مسائل بھی اٹھ سکتے ہیں اور ان کے لئے مناسب حل بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ ہمارے اہل فکر حضرات

اس سلسلہ میں مزید غور و فکر کرکے نئی راہیں بھی نکال سکتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ اگر یہ کام مناسب طریقے سے انجام پا جائے کہ نصاب تعلیم میں دینی علوم اپنی جگہ برقرار رہیں۔ دوسرے علوم میں کچھ تبدیلیاں واقع ہوں اور نئے علوم و فنون کا اضافہ ہو جائے تو اس سے بڑے دوررس نتائج حاصل ہوں گے۔ مدارس اسلامیہ کا جمود اور عصر حاضر کے تقاضوں سے اس کی بے گانگی ختم ہو جائے گی۔ مدارس سے ایسے فضلاء تیار ہوں گے جو علوم دینیہ میں مہارت کے ساتھ فنون جدیدہ میں بھی کمال رکھتے ہوں گے اور اسلام پر تہذیب جدید کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات و تنقیدات کا دندان شکن جواب دے سکیں گے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے  
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

نہ اس میں عصرِ رواں کی ضیاء سے بیزاری  
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

# ہمارے مدرسہ کا نظام اور نصاب تعلیم

مولانا مجد القدوس
(مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارن پور)

مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارن پور کا نصاب تعلیم وہی ہے جو درس نظامی کے نام سے ہندوپاک وغیرہ کے تقریباً تمام ہی مدارس عربیہ میں رائج ہے اور بعض دوسرے مدارس میں معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے مدرسہ نے کبھی اس چیز کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس درس نظامی میں کوئی غیر معمولی اور اہم تغیر و تبدل کیا جائے جزوی ترمیم یا کسی ایک آدھ کتاب میں ردوبدل تو ضرور ہوا لیکن سرے سے اس تعلیمی ڈھانچہ کو بدل کر نیا نظام تعلیم یا کوئی جدید نصاب تعلیم بنانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اگرچہ ماضی میں بعض انجمنوں اور اداروں کے مختلف ذمہ داروں نے اس کی ترغیب بھی دی اور بعض حضرات نے اس کی اہمیت و افادیت کو ارباب مدرسہ کے ذہن میں بٹھانا بھی چاہا (اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی مرحوم کی ہے) لیکن اکابر مظاہر علوم نے ان کو نہایت تحقیقی اور مسکت جوابات دیئے۔ (اس کے بعد) جمادی الاول ۱۳۵۵ھ میں انجمن اجرائے مکاتب اسلامیہ گورکھ پور کے ذمہ داروں نے اس وقت کے ناظم مدرسہ حضرت مولانا سید عبد اللطیف صاحبؒ سے اس موضوع پر خط و کتابت کی اور یہ باور کرانا چاہا کہ قدیم نصاب تعلیم کا موجودہ دور میں چلنا مشکل ہے۔ اس لئے نصاب تعلیم میں تغیر کر کے ہمارا تجویز کردہ نصاب تعلیم اپنا لیا جائے اس مقصد کے لئے انجمن مذکور کی جانب سے ایک نقشہ نصاب بھی مرتب کیا گیا تھا تاکہ مدارس میں اس کا نفاذ کیا جائے۔ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحبؒ نے اس تجویز کے جواب

میں تفصیلی طور پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا اور دلائل کے ساتھ قدیم نصاب تعلیم کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے دوسرے جدید نصابوں کے مقابلہ میں اس کی بہتری ثابت فرمائی تھی۔ حضرت مولانا کی یہ تحریر درس نظامی پر "فکر لطیف" کے نام سے شائع ہو چکی ہے موقع کی مناسبت سے اس تحریر کے صرف دو اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

ا۔ اس نصاب (قدیم) کی خوبی اور قوت مجملاً اس سے معلوم ہوتی ہے کہ تقریباً ایک صد سال سے (اور اب تو تقریباً ڈیڑھ سو سال سے) یہ نصاب رائج ہے اور تقریباً نصف صدی سے اس کی مخالفت بھی ہو رہی ہے مگر آج تک کوئی نصاب ایسا پیش نہیں کیا گیا جو اس کا مقابلہ کر سکے اور اس کو اس کے مقابلہ میں قبولیت حاصل ہو سکے اور وہ نصاب بھی ایسا ہی مکمل ہو اس کے کتب کے مصنفین کو شہرت اور مذہب کی پابندی حاصل ہو۔

۲۔ اس نصاب نظامی کو ایک صدی تجربہ میں آئے ہوئے گزر چکی ہے (اور اب تو اور بھی زائد عرصہ گزر چکا ہے) اب اگر کسی نصاب کو سو برس تک کوئی شخص تجربہ میں لائے اور بالفرض یہی منافع اور ثمرات پیدا ہوں۔ تب صرف مساوات کے دعوے کا حق پیدا ہو گا چہ جائے کہ اس کو ترجیح دی جائے مگر قبل اس قدر مدت تجربہ کے کسی کو حق نہیں کہ اس نصاب کے عیوب بیان کر کے کسی دوسرے نصاب کو ترجیح دینے کا دعویٰ کرے مگر بات یہ ہے کہ کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضرورت ہے کہ محنت و مشقت برداشت کرنے کی اور اب عادت محنت و مشقت برداشت کرنے کی رہی نہیں اور سارا عیب نصاب کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ ("فکر لطیف" ص ۹۔ ۱۰)۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استاذ الاساتذہ حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کا ارشاد گرامی بھی نقل کر دیا جائے حضرت موصوف کا ارشاد نہایت سادہ لیکن مبنی بر حقیقت ہے کہ نصاب تعلیم و نظام مدرسہ تین چیزوں سے مرکب ہے اول اساتذہ' دوم طلباء' سوم کتابیں' اساتذہ تو فارغ ہونے کے بعد بالکل ہی فارغ ہو جاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ رہے طلباء تو یہ تو بھڑوں کا چھتہ ہیں انہیں چھیڑ کے دیکھو تو سب لپٹ جائیں' رہ گئیں کتابیں یہی بے چاری بے زبان ہیں' ان ہی کو الٹتے پلٹتے رہو بس ہو جائے گی سارے نصاب تعلیم اور نظام مدارس کی اصلاح!

# مراجع وماآخذ

ترجمان التحمیل فی زمان التجیل (از حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ)

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں "فکر لطیف" (از حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ)

(۱) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے مواعظ و ملفوظات حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی تشریح و تفہیم کے ساتھ "تجدید تعلیم و تبلیغ"۔

(۲) حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ و حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ صاحب مدظلہ کے ارشادات و فضیلت علم دین وغیرہ)

(۳) حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کا رسالہ "نصاب تعلیم کا مسئلہ" (مسئلہ تعلیم)

(۴) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کا رسالہ "نصاب و نظام مدارس"۔

(۵) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے بعض فکر انگیز مضامین متعلقہ نصاب و نظام تعلیم قدیم و جدید مشمولہ کتاب "عصر حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو؟"

(۶) رحمۃ المتعلمین از مولانا عبدالرحمن صاحب اعظمیؒ (مجاز بیعت حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ)

(۷) تعلیمی رپورٹ از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ۔

# عربی دینی مدارس کا نظام و نصاب تعلیم اور عصری تقاضے

سید اسد رضا رضوی صدر الافاضل
(انچارج پرنسپل مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سٹی)

اسلام مکمل نظام حیات انسانی پیش کرتا ہے اس کا دستور لاریب کلام پاک ہے۔ جس کا دعویٰ ہے کہ لارطب ولایابس الافی کتاب مبین۔ جب قرآن مجید نازل ہوا تھا تو تعلیمی اعتبار سے عرب بہت پس ماندہ تھا۔ سمجھتے سمجھتے بھی تین صدیاں گزر گئیں اور ابن رشد جیسے لوگ پیدا ہونے لگے تو کسی کو دربدر کیا گیا اور کسی کو قتل کیا گیا۔ اس لئے کہ علم فلسفہ کو منافی اسلام سمجھا گیا۔ حالاں کہ اسلامی دستور اساسی کی تشریح میں صرف اتنی سی بات کہی گئی ہے کہ طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمته۔ علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔ اطلبو العلم من المهد الی اللحد علم مهد۔ یعنی گھوارے سے لے کر قبر کی منزل تک حاصل کرو۔ علم کے معاملے میں کلیہ ہے کہ العلم من حیث انه علم لیس بحرام علم بحیثیت علم حرام نہیں ہے یہ قول شہید ثانی کا ہے۔

علم خواہ قرآنی ہو یا تفسیر' حدیث ہو یا فقہ' فلسفہ ہو یا علم ہیئت جبر و مقابلہ یا ریاضی اور اسی طرح کے دیگر علوم جو مفید انسانیت ہوں ان کا حصول جائز ہے۔ ہمارے عربی دینی مدارس کا نظام بغداد سے لے کر مدرسہ عالیہ فرنگی محل تک بالکل یکسانیت رکھتا ہے جن کے نصاب نے عصری تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کیا۔

انگریزوں نے جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو انہوں نے رفتہ رفتہ اپنا نظام تعلیم نافذ کیا جو عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مسیحی مذہب کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا تھا جس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے دین و مذہب پر ضرب کاری لگی اور کم و بیش دونوں کو ہوش آیا۔ اس وقت سرسید احمد خاں مرحوم نے اپنی حکمت عملی سے تین تحریکیں چلائیں جن میں سب سے اہم تعلیمی تحریک تھی جس میں وہ بے حد کامیاب ہوئے' انہوں نے اپنی تعلیمی تحریک کو عصری تقاضوں کے ساتھ دینی تعلیم سے بھی ہم کنار کیا۔ لیکن علماء نے ان کی تحریک میں بزعم خود یہ خامی محسوس کی کہ سرسید نے دینی تعلیم کو ضمنی طور پر عصری تقاضوں سے منسلک کیا ہے' دراصل یہ ہونا چاہیئے کہ عربی دینی مدارس کے قدیم روش کے ایک رخے پن کو عصری تقاضوں سے بھی منسلک کیا جائے' چناں چہ اس مقصد کے لئے کان پور میں انیسویں صدی کی دسویں دہائی پر تمام جید اور بزرگ ترین علمائے اسلام نے ندوۃ العلماء نام کی ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس کے ماتحت ایک ادارۂ تعلیم ندوۃ العلماء قائم کیا جو چند برسوں کے بعد کان پور سے لکھنو منتقل ہو گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے مسلمانوں کے علمی درس گاہوں کی ازابتدا تا انتہا مکمل تاریخ تھی۔ وہ نہ تو علی گڑھ تحریک سے مطمئن تھے اور نہ ندوۃ العلماء سے انہوں نے ۱۹۴۷ء میں دہلی کی عالمی ثقافتی کانفرنس میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا اور لکھنو کی کانفرنس میں بھی یہ بات آئی تھی۔ مگر آزادی کے بعد ملکی حالات کچھ اس طرح بدلے کہ سارا منصوبہ ایک نئے نظام کے شکنجے میں گرفتار ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام باوجود یہ کہ وزیر تعلیم تھے' عربی دینی مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم کے بارے میں جو ان کے منصوبہ تھے وہ سب نذر سیاست ہو کر رہ گئے۔ اس وقت ہمارے سامنے عربی دینی مدارس کا نہایت اہم مسئلہ ہے' جو نظام اور نصاب پورے ہندوستان میں رائج ہے وہ قطعاً تشفی بخش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صوبہ بہار میں اکثر و بیشتر دینی مدارس میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا نصاب رائج ہے' اس نصاب کی خصوصیت یہ ہے کہ پورے ملک کے کسی بھی مدرسہ کا فارغ ہو یا کسی بھی یونیورسٹی کا فارغ ہو اسے جب امتحان دینا ہو گا تو وسطانیہ یعنی مڈل کلاس سے شروع کرے گا۔

یہ نصاب کسی حد تک عصری تقاضے کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے مگر شدت پسندی کے ساتھ جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ وسطانیہ مڈل کے برابر ہے اس کے بعد فوقانیہ ہے جو کہ میٹرک کے برابر ہے۔ مولوی آئی اے 'عالم بی اے' فاضل ایم اے کے برابر ہے۔

وسطانیہ کے آٹھ پرچے ہوتے ہیں۔ فوقانیہ کے گیارہ اسی طرح مولوی بھی گیارہ' عالم دین فاضل میں دس پرچے ہوتے ہیں۔ شدت پسندی ملاحظہ فرمائیں 'ایک طالب علم کو بیک وقت گیارہ مضامین کی تعلیم حاصل کرنی ہے۔ عربی کے پانچ پرچے جن میں ایک تفسیر ایک فقہ 'ایک حدیث اور دو پرچے' عربی ادب 'نثر و نظم۔ گویا عربی زبان کو اولیت دی گئی۔ اس کے بعد فارسی 'اردو' جغرافیہ' تاریخ' سائنس' حساب 'انگریزی' معاشیات اس طرح کل گیارہ پرچے ہوئے۔ جناب والا آپ ہی بتائیں جن طالب علموں کو بیک وقت گیارہ مضامین کی تیاری کرنی پڑے گی اس کے دماغ کی کیفیت کیا ہوگی۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ اسے آٹھ پرچے میں سمیٹ لیا جائے مثلاً ایک پرچہ تفسیر 'دوسرا دینیات' اسی میں حدیث اور تیسرا عربی ادب کا ہو جس میں نثر و نظم کو شامل کر دیا جائے۔ اور بھی درجات میں اسی طرح کی ترمیم کی جا سکتی ہے تاکہ طالب علم صحیح طور سے علم حاصل کر سکے۔ بہار کے عربی دینی مدارس میں جغرافیہ' حساب' سائنس' ہندی' انگریزی کی تعلیم دی جارہی ہے لیکن یہ مدارس پریکٹیکل کی سہولت سے محروم ہیں۔ عصری تقاضے کے پیشِ نظر نصاب میں ایک پرچہ ٹیکنیکل ہینڈ کا بھی ہونا چاہیئے اور باقاعدہ انہیں کسی نہ کسی فن کو سکھایا جائے۔ جیسے کتابت ہے خیاطی ہے۔

## اہم تجاویز

عربی دینی مدارس کا نصاب یکساں ہو۔ درس نظامی کے ساتھ ساتھ انگریزی' ہندی' حساب کی تعلیم دی جائے اور کوشش کی جائے کہ تمام مدارس کے امتحان ایک ساتھ ہوں۔

صوبہ بہار کے ان عربی دینی مدارس میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا نصاب رائج ہے جو اس کے ماتحت ہیں لیکن یہ نصاب طلباء کے لئے گراں ہے اس میں تخفیف کی جائے۔

مؤدبانہ گزارش ہے کہ صوبہ بہار کے ان عربی دینی مدارس کی طرف فوری توجہ چاہیئے جو بورڈ کے ماتحت ہیں۔ طلباء و طالبات کی زندگی کا صحیح مصرف نہیں ہو رہا ہے۔ یہ امتحان

ضمنی امتحان نہ ہوا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حکومت ان مدرسوں کے ساتھ اب تک مذاق کر رہی ہے۔ اساتذہ کو چھ چھ ماہ تنخواہ نہیں ملتی ہے۔ اسکول اور کالج کی طرح ساری مراعات حاصل نہیں ہیں۔ ان مدرسوں سے فارغ طلباء و طالبات کے لئے باوجود وعدے وعید اب تک سرکاری ملازمتوں میں سہولت حاصل نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تجویز کردہ نصاب کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ عربی دینی مدارس میں رائج کیا جائے اور ہندوستان کے عربی دینی مدارس کی اس سلسلہ میں رائے حاصل کی جائے۔

# دینی مدارس کا نصاب

مولانا ابو سفیان مفتاحی
(مدرسہ مفتاح العلوم مونا تھ بھنجن)

دینی مدارس کے نصاب کے سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں :

۱۔ **توحید پر زور** : آج انسان اپنے عقیدہ میں ضعیف ہو رہا ہے بنابریں مدارس کے نصاب میں عقیدۂ توحید پر چند کتابیں پڑھائی جائیں جس میں خصوصاً امام طحاوی کی العقیدۃ الطحاویہ داخل نصاب کر دی جائے۔

۲۔ **انگریزی داخل کی جائے** : علوم عربیہ کے ساتھ انگریزی زبان بھی داخل نصاب کر دی جائے کہ وہ بین الاقوامی زبان ہے اور دین حنیف کی اشاعت میں انگریزی زبان کو بڑا دخل ہے۔ چناں چہ ہمارے ماہرین اسلامیات نے علوم اسلامیہ کو انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

۳۔ **سائنس بھی داخل کی جائے** : جواہر لال نہرو نے کہا ہے کہ عرب موجودہ علم اور سائنس کے اولین موجد ہیں اور عربوں اور مسلمانوں کے تاریخی احسانات میں سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ وہ سائنس کے موجد ہیں اور نئے تاریخی دور کے ترقی پسند رہنما' نئے دور کی ابتداء مسلمانوں کے علمی کارناموں سے ہوئی ہے۔ چناں چہ فرنچ اکیڈمی کے صدر موسیو سیدیو نے اپنی تاریخ عرب میں لکھا ہے کہ عربوں نے ایجادات کے میدان میں قدم رکھتے ہی فن کیمسٹری باقاعدہ ایجاد کیا۔ انہوں نے معدنی دھاتوں کا تحلیل و تجزیہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ بنابریں علوم اسلامیہ کے ساتھ سائنس بھی داخل نصاب کی جائے۔

۴۔ **قرآن کریم کے اجزاء حفظ کرائے جائیں :** علوم اسلامیہ پڑھنے والوں کے لئے قرآن کریم کے کچھ اجزاء حفظ کرائے جائیں اور نصاب میں شامل کر دیا جائے۔

۵۔ **تجوید قرآن :** لازمی طور پر تجوید قرآن داخل نصاب کر دی جائے۔

۶۔ **اسلامی تاریخ اور سیرت :** منصوصات قرآن وحدیث کے نصاب سے دین کا ایک ڈھانچہ تو یقیناً بچہ کے ذہن میں بن جائے گا لیکن اس ڈھانچہ میں رنگ وبو آجانا اور اس کے خدوخال کو مشخص بنا کر نمایاں کیا جانا بغیر تاریخ کے ممکن نہیں یعنی جب تک دین کے ساتھ سیرت کا پہلو شامل نہ ہو۔ اس وقت تک دین کا تعارف نہیں ہو سکتا۔ نصاب میں سیرت کی اہمیت بنیادی ہے۔ مذہبی نصاب کے لئے ایک اہم جزو یہ بھی ہونا چاہئے کہ تاریخ اسلام اور سیرت کی کوئی چھوٹی یا بڑی کتاب داخل نصاب کر دی جائے۔

(۱) متقدمین کے طریقہ تعلیم کو یعنی املا کو نافذ کیا جائے کہ اس کی افادیت مسلّم ہے۔

(۲) قواعد وگرامر کی ابتدائی کتابیں مادری زبان اردو میں جاری کی جائیں۔

(۳) علامہ شوق نیموی کی کتاب آثار السنن کو داخل نصاب کر کے اس کی احادیث یاد کرائی جائیں۔

(۴) علوم اسلامیہ کے ساتھ دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ نصاب میں داخل کر دیا جائے تاکہ دین کی نشر واشاعت بحسن وخوبی انجام پذیر ہو اور انسانیت میں دوری کا خلیج ختم ہو۔

**هذا ماعندي والله اعلم ان اريد الا الاصلاح ما استطعت وماتوفيقي الا بالله**

واللہ علی ما نقول وکیل

گر قبول افتد زہے عزو شرف

# مدارسِ عربیہ کا نصاب و نظامِ تعلیم

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی
(حبیب منزل علی گڑھ)

مدارس عربیہ کے نصاب و نظام تعلیم پر میرے خیال سے بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ ندوۃ العلماء کی پوری تحریک کا مقصد یہی تھا اور مولانا آزاد کا خطبہ بھی اس موضوع پر موجود ہے۔ اصلی سوال عمل کا ہے۔ صرف تھوڑی سی انگریزی نصاب تعلیم میں شامل کر لینا بے معنی ہے۔ اس طرح کی اصلاح ضروری ہے جیسی زمانہ حال میں جامع ازہر میں ہوئی ہے۔ میرے خیال سے علاوہ ذہنی آمادگی کے ایک بڑا سوال ذرائع و وسائل کی فراہمی کا بھی ہے۔ مدارس عربیہ میں جس چیز کو علوم عقلیہ کہا جاتا ہے اس کی نوعیت فی زمانہ ان علوم کی تاریخ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ وہ جسے فلسفہ کہہ کر پڑھاتے ہیں وہ اب فلسفہ کہاں رہ گیا ہے۔ اس لئے میری ناچیز رائے میں انھیں ان علوم سے صرف نظر کر کے علوم دینیہ اور عربی ادب پر خصوصی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔ علوم دینیہ میں قرآن پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ حدیث اور فقہ میں نصاب کو مختصر کیا جاسکتا ہے۔ عربی ادب کے ضمن میں صرف و نحو سے زیادہ' جسے ہم انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں' اس سے واقفیت اور اس کا ذوق طلبہ میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی انگریزی' سائنس اور سماجی علوم کو بھی Introduce کرنا ہوگا' نیز کوئی نہ کوئی دست کاری ضرور سکھائی چاہیئے۔

# قدیم وجدید نصابِ تعلیم

صفات احمد

(سابق سیکریٹری بہار مدرسہ ایگزامنیشن بورڈ' پٹنہ)

## قدیم درس نظامیہ

اس نصاب تعلیم میں فقہ کو اول مقام دیا گیا ہے اور قرآن مجید کو حدیث کے بعد تیسرا' جب کہ دینی علوم میں سب سے زیادہ اہمیت قرآن مجید کو دی جانی چاہیئے۔ پھر حدیث کو اور پھر فقہ کو' کیوں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ حدیث رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔ موجودہ ترتیب سے طلباء کے ذہن میں فقہی اختلاف جنم پاتا ہے اور اگر طلباء کے دماغ پر قرآن مجید کی روشنی پہلے پڑ جائے تو انشاء اللہ موجودہ مسلکی اختلافات بہت کم ہو جائیں گے۔

عربی زبان کی تعلیم کماحقہ نہیں دی جاتی ہے' جبکہ قرآن و حدیث کی زبان عربی ہے۔ عربی زبان کی جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں زیادہ تر وقت عربی صرف و عربی نحو پر صرف کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طلباء عربی صرف و نحو کے ماہر تو ہو جاتے ہیں مگر عربی زبان کے ماہر نہیں ہوتے۔ اس طرح مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

عربی زبان کے بعد اردو زبان بھی بے توجہی کا شکار ہے۔ حالاں کہ عملی زندگی میں یہی زبان مرتے دم تک کام آتی ہے۔ بہت سا وقت کم مفید زبان فارسی اور کم مفید فنون منطق' فلسفہ' نجوم پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ اصلاح کی تدبیر یہ ہے کہ فارسی' فلسفہ' منطق جیسے مضامین کو نصاب سے خارج کر دیا جائے تاکہ خالص دینی مضامین قرآن' حدیث اور فقہ اور پھر عربی زبان کی تعلیم کے لئے مزید وقت مل جائے۔

## جدید درس عالیہ

اس نصاب کی تعلیم سے طلباء میں اچھی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی۔ مثل مشہور ہے۔ **طلب الکل فوت الکل**۔ یہ نصاب مدرسین و طلباء دونوں کے لئے ایک عذاب ہے۔ درس نظامیہ ہی کیا کم تھا جو اس میں اسکولی نصاب کو شامل کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر ممکن کوشش کے باوجود نصاب کی تکمیل وقت پر نہیں ہو پاتی اور طلباء امتحان میں کامیابی کی فکر میں ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے ہیں جو عربی مدارس کے شایان شان نہیں۔ اسکولی مضامین کو عربی مدارس کے نصاب سے خارج کیا جائے۔

شروع ہی سے عربی' فارسی' اردو' انگریزی اور ہندی زبانوں کی تعلیم نہ دی جائے۔ بچہ تھونس جاتا ہے۔ ابتداء صرف اردو اور قرآن خوانی سے کی جائے اور عقائد' طہارت' نماز وغیرہ کے مسائل اردو ہی میں پڑھائے جائیں' جب تک اردو روانی کے ساتھ پڑھنے' لکھنے نہ لگ جائے' کوئی دوسری زبان اس کے سامنے نہ لائی جائے۔

# مدارسِ عربیہ کا نصاب

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن خان (گونڈا)

رانچی میں خدابخش لائبریری کے تحت سیمینار کا موضوع "دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم" وقت کی اہم ضرورت ہے۔

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ جو قومیں وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتیں پستیوں میں جا گرتی ہیں۔ قومیں اپنے مستقبل کا خاکہ ماضی ہی میں بنایا کرتی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دینی مدارس کا نصاب تعلیم کافی قدیم ہے۔ جو وقت کے تقاضوں اور ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کی تعلیم وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جو نہ صرف معاش کے دروازے کھولتی ہے بلکہ طالب علموں میں خوداعتمادی کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے۔ جو دینی درس گاہوں کے طالب علموں میں مفقود ہے۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس سے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ والدین باوجود خواہش کے بچوں کو دینی تعلیمی اداروں میں داخل کرانے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی تعلیم کو معاشی ٹریننگ سے جوڑا جائے۔

اس سلسلے میں علماء واہل دانش حضرات کو میرا مشورہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نہج پر "دینی نصاب تعلیم بورڈ" کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس میں دینی و عصری علوم کے ماہرین شامل ہوں۔ جو پورے ملک کے دینی تعلیمی اداروں کے لئے ایک مشترک نصاب تیار کرے اور تمام دینی تعلیمی اداروں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔ نیز نصاب میں اسلام کے شعوری طور پر حاصل کرنے کو اولیت دی جائے۔

علماء کا یہ وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔

# مدارسِ عربیہ کا نصاب اور وقت کی ضرورت

آفتاب احمد (رانچی)

ہندوستانی معاشرے میں اجتماعی شکل اور مرکزی اہمیت کی سب سے پر اثر تنظیم مدارس ہی کی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن مدارس نے جہاں اپنی بہترین خدمات پیش کی ہیں، وہیں بہت سے معاملات میں اکثر و بیشتر عقائد کے انتشار ذہنی اور اہم و فیصلہ کن مرحلوں پر دیر اندیشی معاشرے اور خود ان کے لئے بروقت، خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرپاتی۔ اس لئے مدارس کے سلسلے میں کسی بھی تجویز سے پیشتر ان پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔

شاید ہی کسی کو اس سے انکار ہو کہ صدیوں تک اسلامی تعلیمات کی ذمہ داری، مدرسوں پر ہی رہی ہے۔ عہد وسطی کی ضرورتوں کے مطابق وہ کافی تھی۔ آج بھی جہاں روزگار کا مسئلہ صد فیصد تعلیم سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ مدارس کی تعلیم، دینی مسائل کی ذمہ داری اور معاشرتی زندگی کی اجتماعی ضرورتیں کم و بیش پوری کردیتی ہے اور جس جس معاشرے میں قرآن اور حدیث کی تعلیم تو کجا خواندگی کی شرح بھی افسوسناک حد تک کم ہے، خواندگی سے شروع کرکے قرآن اور حدیث کی بنیادی جان کاری دلادینا بھی کچھ اہم نہیں ہے۔ کیونکہ مجموعی طور پر غیر ہنر مند کارکنوں کی تعداد ابھی تک ناخواندہ ہے اور خواندگی ہنر مندی کی ترغیب کے لئے محرک ہوتی رہی ہے۔

مدارس کی خدمات کا اعتراف اس لئے بھی کرنا پڑتا ہے کہ موثر سرپرستی کی قلت میں چندوں کی فراہمی جس ضبط نفس کا کام ہے، سب کے بس کی بات نہیں۔ چندوں میں کمیشنوں کے متعلق تنقیدوں اور وصول کرنے والوں کی حالت زار میں مماثلت نظر نہیں آتی۔ البتہ اس کی ذمہ داری بہت حد تک بغیر کنٹرول کے مدارس پر مدارس کھولتے چلے جانے والوں پر

بھی ہے۔ بہر حال بہت سے مدارس کے معلموں کی مجموعی آمدنی غیر ہنر مند مزدوروں کی آمدنی سے زیادہ نہیں ہو پاتی۔ حیرت ہوتی ہے، کیا تعلیم نے مفلسی سے نجات کے محرکات کو دبانے کی تعلیم دی ہے؟ غربت وافلاس کو مقدر سمجھ کر مطمئن ہو جانا اور بات ہے، لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ انسان جس کی ملازمت کرتا ہے یا جن سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے۔ ان کے اثرات بھی قبول کرتا ہے اور ان کے کسی غلط فعل کے خلاف آواز بلند کرنے کو بھی نمک خواری کے تقاضوں کے منافی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ صورت حال خصوصاً اقلیتوں کے لئے خطرناک ہے۔ مسلمانوں نے ابھی اتنی اقتصادی ترقی نہیں کی ہے کہ دوسروں کے یہاں نوکریوں کی ضرورت نہیں رہے، اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ایک ایسا دور بھی تھا جب بنگال کے غیر مسلم جاگیر داروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے یہاں صرف ہم مذہبوں کو ہی نوکریاں دیں گے۔ کم وبیش ہندوستان کے بہت سے اداروں اور محکموں میں یہ صورت حال اب بھی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ معاشرے کی پستی اور زبوں حالی مروجہ نظام سے اعتماد اٹھ جانے کا سبب بنتے ہیں اور دوسروں کے عقائد کی تبلیغ کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔

چناں چہ مسلمانوں کو اور خصوصاً علمائے کرام کو سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ غربت مستقبل میں کس طرح کے مسائل پیدا کر سکتی ہے، اور اگر اسلامی تعلیمات کی برکتوں نے مفلوک الحالی سے اٹھا کر ایک بدترین قوم کو دنیا کی بہترین قوم بنادیا تو صرف تقریریں کر کے، مدارس کھول کر یا ساتھ ساتھ اس کے پیروں اور رہنماؤں کو کارزار عمل کی پہلی صفوں میں رکھ کر نہیں۔

## تاریخی پہلو

غالباً ہندوستان میں اس کی نوعیت تاریخی بھی ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے دور میں معیاری، منظم اور قابل ذکر اداروں کی نوعیت اور تعداد کیا تھی اور آج کتنے اذہان ان سے متاثر اور مستفیض ہوتے ہیں، اس کا صحیح علم نہیں ہونے پر راقم الحروف کو شرمندگی ہے۔ دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ اشرفیہ اعظم گڑھ اور مدرسہ شمس الہدیٰ عظیم آباد جیسے ادارے اس کے بعد ہی قائم ہوئے۔ لیکن ان کے بانی بزرگ ہستیوں کا ماحول خالص تعلیمی تھا۔ دوسرے پیشہ ورانہ شعبوں کے ماحول سے یا تو انہیں خاطر خواہ قربت نہیں تھی یا

پھر جن پر آشوب حالات میں یہ ادارے قائم کئے گئے اور ثابت و سالم رکھے گئے اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ پیشہ ورانہ استعداد فراہم کرانے کے لئے شعبہ جات کھولے جا سکیں۔ پھر اس وقت کی ضرورتیں بھی آج سے مختلف تھیں۔ اس کے اثرات ان کے نقش قدم پر چلنے والے افراد یا اداروں پر پڑنا لازمی تھا۔ لیکن اس کا دوسرا تاریخی پہلو زیادہ غور طلب ہے۔ جب عہد وسطیٰ کے ادارے دینی اور دنیوی دونوں تعلیمات کا سرچشمہ تھے اور اس دور میں زندگی کے ہر شعبے کے ماہرین پیدا ہوئے، جنہوں نے نہ صرف عالم اسلام کو ترقی کے بلند مقام تک پہنچایا بلکہ سترہویں صدی تک اہل یورپ بھی انہیں سے سیراب ہوتے رہے۔ اس کے تیسرے تاریخی پہلو کو تاریخی موڑ بھی کہا جا سکتا ہے، جہاں بروقت فیصلے کرنے یا نہیں کرنے کے دو اثرات ہو سکتے تھے، اور ہوئے بھی، جب مدارس اور اسکول الگ الگ مقاصد کے لئے قائم کئے گئے۔ ایک طرف تو سر فہرست علی گڑھ کالج یا تحریک تھی، دوسری طرف مدرسہ دیوبند جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کے نام سے معروف ہوئے۔ ان کے اغراض و مقاصد کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں، اور یہ بھی کہ الگ الگ مطمح نظر لئے دونوں الگ الگ شاہراہوں پر نکل پڑے، لیکن اس کے اچھے اور برے دونوں اثرات قوم پر پڑے، اور نظریاتی کشیدگی نقصان دہ ثابت ہوئی لیکن یہ اپنے کام میں مصروف بھی رہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تنگ دستی کے باوجود مدارس اپنا پیغام خاص و عام تک پہنچانے میں مسلسل سرگرم عمل رہے، بلکہ بغیر بلند بانگ دعوؤں کے انہوں نے اسے ایک تحریک کی شکل دے دی، ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ دوسرا فریق بھی اسی تندہی سے اپنے فرائض انجام دے گا۔ لیکن علی گڑھ سے فارغ التحصیل افراد نے سیاسی تحریکوں میں جتنے بڑے کارنامے انجام دیئے، اپنے طرز پر کالجوں کے لئے یا تو فضا کو سازگار نہیں سمجھا، یا اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اس کے بانی سر سیدؒ نے دی تھی۔

اب جب مدارس کے سامنے ان کے مروجہ نصب العین کے علاوہ نئی تجاویز پیش کی جا رہی ہیں تو وقتی طور پر ان کا شکوک اور بے یقینی کی کشمکش میں مبتلا ہو جانا لازم ہے۔ چناں چہ اس کا انحصار اب مشورہ دینے والوں پر ہے کہ وہ اپنی نیک نیتی سے اہل مدارس کو کس حد تک مطمئن کرتے ہیں اور خصوصاً اہل مدارس پر کہ اس نئی صورت حال میں کوئی مثبت فیصلہ

کرنے میں کس قدر عجلت یا تاخیر کرتے ہیں۔ علماء کو مشنری اسکولوں کے طریقہ کار کا ایک جائزہ ضرور لینے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ کیوں کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل طلباء دینی امور میں بھی اچھی خاصی دل چسپیاں لیتے ہیں۔ اس کے پیش نظر چند تجاویز جو راقم الحروف کے ذہن میں آئیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جو طلباء اپنے ہم جماعتوں میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوتے ہوں، یا صرف دینی علوم سے وابستگی رکھتے ہوں، انہیں صرف دینی تعلیم و تدریس اور اشاعت کے لئے تیار کیا جائے۔

(۲) جو طلباء اعلیٰ تعلیم کا رجحان نہیں رکھتے یا ان کے حالات اس کے لئے سازگار نہیں ہوں انہیں ضروری اور ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ پیشہ ورانہ استعداد پیدا کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ اس کے لئے۔

(الف) اتفاق رائے سے مختلف مدارس میں کسی خاص فن میں (جیسے بڑھئی، لوہار، سلائی، ریڈیو، ٹی وی، مرمت، دری یا قالین بانی، پولٹری، نرسری وغیرہ) یعنی ایک مدرسے میں صرف ایک فن میں ٹریننگ دلانے کے اسباب کی فراہمی کی کوششیں ہوں۔

(ب) جہاں ایسا ممکن نہیں ہو اور آس پاس کوئی ورک شاپ جیسے گیرج، لیتھ مشین وغیرہ ہوں تو ان کے مالکان سے گزارش کی جائے کہ چند گھنٹے طلباء کی ٹریننگ کے لئے وقف کریں۔

(ج) کچھ ایسے کورس چلائے جائیں جن کی معیاد مروج نصاب کی مدت سے لمبی ہو، جیسے اگر عام حالات میں حفظ کے لئے چھ ماہ یا ایک سال درکار ہو تو اسے دو یا چار سال میں مکمل کرایا جائے اور دو یا چار گھنٹے کی تعلیم کے بعد باقی وقت کھیتی باڑی، باغبانی اور دوسرے کاموں میں صرف ہوں۔

(د) جو لوگ کاروبار میں مصروف رہ کر یہ تعلیمات حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے پارٹ ٹائم یا Correspondance کورس کی سہولتیں ہوں، اس طرح ”ج“ اور ”د“ ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی ہو سکیں گے۔

(۳) ہر ادارے میں ورزشوں کا انتظام ہو اور خصوصاً یتیموں پر ترس کھانے کے ساتھ ساتھ ان میں خود اعتمادی بھی پیدا کرائی جائے کیوں کہ تاریخ ان کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

اس طرح صرف دینی علوم حاصل کرنے والے دینی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے خواہاں پیشہ ورانہ تعلیم بھی حاصل کر سکیں گے۔

بلا شبہ ان تجاویز کو تخیلی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم کے نفاذ سے ان کی رغبت بھی بڑھے گی جو مدارس کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔ زیادہ افراد کی شمولیت سے اقتصادی صورت حال بھی سدھر سکے گی۔

(۴) ایک اور تجویز جو گرچہ نصاب سے متعلق نہیں ہے پھر بھی میرے نزدیک اہم ہے۔

بہت سے مسائل پر علماء کا متفقہ فیصلہ نہیں ہونے پر عوام میں انتشار ذہنی اور بے اعتمادی کی فضاء پیدا ہوتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک معاملہ قرآن اور حدیث کی رو سے جائز ہو اور قرآن و حدیث کی ہی رو سے دوسروں کی نظر میں ناجائز۔ اس کے لئے بہتر ہو تا کہ ہر مکتب فکر کے علماء ایک ایسی مرکزی تنظیم قائم کرتے، کہ کسی معاملے کو عوام میں لانے سے پہلے ایک فیصلے پر پہنچتے اور فقہ و حدیث کے ان باریک پہلوؤں کا فیصلہ جس پر خود قائل نہ ہو سکے یا نہ کر سکے، اپنے معتقدوں کی جذباتی عقیدت اور قوت بازو پر چھوڑنے کی نوبت نہیں آتی۔

لیکن ان تمام تجاویز کے پیچھے ایک جذبہ کار فرما ہے۔ اسی کا اعتراف کہ یہ علماء کی کوششیں ہیں کہ انہوں نے جو بھی بہتر سمجھا کم سے کم دل و جان سے کیا، اور آج اہل مدارس کو اس پر فخر ہونا چاہئے کہ ان مسائل کے حل کے لئے بھی لوگوں کی نظر انتخاب انہیں پر پڑ رہی ہے۔

# مدارس اسلامیہ کے نصابِ تعلیم سے متعلق چند اشارات

شاہ محمد اسمٰعیل
(سابق وائس پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ)

ہندوستان کے ہر علاقے میں' مدارس اسلامیہ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے' یہ مدارس اپنے اپنے نہج پر دین کی خدمت اور علم کی اشاعت میں مصروف ہیں' ان کا اپنا نصاب تعلیم ہے' جو بڑی حد تک باہم مشترک اور ایک حد تک باہم مختلف بھی ہے' عمومی طور پر انہیں دو گروپ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' ایک مدارس نظامیہ کے یا آزاد مدارس' یہ وہ مدارس ہیں' جو حکومت سے امداد کے طالب نہیں اور افراد ملت کی اعانت پر قائم اور جاری ہیں' ان کے نصاب تعلیم جزوی طور پر باہم مختلف ہیں لیکن سہولت کے لئے ان سب کو درس نظامیہ ہی کہا جاتا ہے۔

دوسرے مدارس عالیہ یعنی جو حکومت کی نگرانی میں چل رہے ہیں اور ملک کی چند ریاستوں میں حکومت کے قائم کردہ بورڈ کے نظم و انصرام میں چلتے ہیں' ہر بورڈ کا اپنا نصاب تعلیم ہے ان میں سے بعض ریاستوں میں ان مدارس کے فارغین کو ملک کی عام تعلیم گاہوں کے مساوی حقوق بھی دیئے گئے ہیں ان میں اولیت ہماری ریاست کو حاصل ہے۔

ہمارے مدارس بھی حالات اور ضرورت کے مطابق اپنے نصاب تعلیم میں ترمیم و اضافہ کرتے رہے ہیں' اس دور کے تقاضوں کے پیش نظر ہمیں بھی ترمیم و اضافہ سے کام لینا ناگزیر ہے۔

مختلف مدارس اپنے بیانات اور مقتضیات کی بناء پر اپنا نصاب تعلیم مرتب کرتے ہیں

اور جمہوری مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں اس کا موقع ملنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ حتی الوسع ایک دوسرے سے ربط اور قرب کے ذرائع بھی حاصل رہیں تاکہ نصاب ہائے تعلیم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ ہوں اور حتی الوسع اس کی گنجائش باقی رہے کہ ایک نصاب تعلیم کا طالب علم دوسرے نصاب تعلیم میں منتقل ہو سکے۔

زیر نظر تحریر میں عمومی طور پر نصاب تعلیم سے متعلق چند اشارات کئے جا رہے ہیں:

مدارس نظامیہ اور مدرسہ عالیہ کے نصاب ہائے تعلیم کو ایک حد تک قریب لانا تو مستحسن ہے لیکن مدارس نظامیہ کے تشخص و انفرادیت کو مختلف وجوہ کی بناء پر باقی رکھنا ضروری ہے۔

مدارس کے نصاب تعلیم میں عربی اور قرآن و حدیث و فقہ (مع متعلقات) کو ہمیشہ بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل رہے گی' عصری علوم اور دیگر ملی یا غیر ملکی زبانوں کی تعلیم اسی حد تک شامل کی جائے کہ مرکزی حیثیت مجروح نہ ہو' ورنہ ان مدارس کے علیحدہ وجود کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔

عصری علوم کو محض اس غرض سے نصاب تعلیم میں شامل کرنا کہ ہمارے طلباء کے لئے ملازمتوں کے دروازے کھل جائیں' کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں' بلکہ اصل مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ نئے دور نے علوم و فنون کے جو دروازے کھول دیئے ہیں' ہمارے طلباء بھی ان میں داخل ہو سکیں یا کم از کم واقف ہو سکیں اور بقدر ضرورت ان سے استفادہ کر سکیں۔

تعلیم عام ہونے کے معنی یہ نہیں کہ ہر طالب علم ایم اے' پی ایچ ڈی ہو یا عالم فاضل ہو جائے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ابتدائی (پرائمری)' وسطانیہ (مڈل) یا ثانوی (سیکنڈری) کی حد تک ہر فرد کے لئے تعلیم لازم ہو' اس کے بعد جن طلباء میں ذہنی صلاحیت اور علم کا ذوق ہو' وہ اعلیٰ تعلیم کی طرف رُخ کریں' ورنہ معاش کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کریں' اس سلسلہ میں مدارس بھی ان کی مدد کر سکتے ہیں کہ جہاں مواقع میسر ہوں' ان مدارس میں صنعت و حرفت اور ٹیکنالوجی کے شعبے قائم کئے جائیں اور ثانوی کے بعد طلباء اس شعبہ میں داخلہ لے کر اپنی پسند کی راہ اختیار کر لیں اور کامیاب ہو کر معاش کا مسئلہ حل کر لیں۔

حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم چنداں سود مند نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے اسے تعلیم کے بعد رکھنا زیادہ مناسب ہے۔

عالیہ اور نظامیہ دونوں میں عصری مضامین بقدر ضرورت اور بقدر وسعت شامل کئے جائیں لیکن مدارس عالیہ میں ان مضامین کے لئے ایسی کتابیں تیار کی جائیں کہ حتی الامکان گراں باری سے بچتے ہوئے میٹرک کا معیار قائم رکھا جائے تاکہ عام تعلیم گاہوں کے فارغین سے انہیں مساوات کا درجہ حاصل ہو سکے اور یہ طلباء چاہیں تو عام تعلیم گاہوں میں بھی داخلہ لے سکیں۔

مدارس نظامیہ کے لئے ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ثانوی درجوں کے بعد اس کی گنجائش رکھیں کہ ایک سال یا دو سال کا ایک کورس جاری کریں' جن میں وہ عصری علوم کی بقدر ضرورت تعلیم دیں اور اس طرح ان طلباء کو بھی دوسری عام تعلیم گاہوں کے طلباء کے مساوی تسلیم کر لیا جائے۔

ہمارے ملک میں عام طور پر تعلیم کا بنیادی مقصد یہ سمجھا جاتا ہے کہ نوکری مل جائے اور وہ بھی سرکاری نوکری' ظاہر ہے کہ کوئی بھی ملک جو کتنے ہی وسائل رکھتا ہو' اپنے ملک کے تمام تعلیم یافتہ افراد کو (خصوصاً جب کہ تعلیم عام ہو رہی ہو) نوکری مہیا نہیں کر سکتا' افسوس ہے کہ ہم آزادی کے ۴۳ سال بعد بھی اس ذہنیت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ اکبر الہ آبادی نے اس صورت حال کی طرف توجہ دلائی تھی' جو آج درپیش ہے:

کالج سے آ رہی ہے صدا پاس پاس کی　　　عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے لئے تو یہ نقطۂ نظر اور زیادہ غیر مستحسن ہے کہ وہ حصول علم کا مقصد اولیں ملازمت یا حصول معاش کو سمجھ لیں' ان کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ قرآن و حدیث کے حقائق و معارف سے آگاہ ہوں اور ان کی روشنی میں اپنے آپ کو سنواریں اور اپنے علم و عمل کے ذریعہ معاشرے کو بھی سنوار سکیں اور اس طرح وہ اپنی ملت اور اپنے وطن کو سربلند کریں۔

ہمیں مدارس اسلامیہ اور تمام تعلیم گاہوں کے طلباء میں یہ شعور پیدا کرنا چاہئے کہ تعلیم یافتہ ہونے کا کیا مقصد ہے' اور ذوق علم کیا ہوتا ہے' اور انہیں معاش کے اس تنگ نالے سے نکالنا ہوگا' جس کا نام ملازمت ہے تاکہ ہمیں یہ طعن نہ سننا پڑے۔ نہ پڑھتے تو سو طرح

کھاتے کماکر کاش ہم ایسے حالات اور ایسی فضا پیدا کر سکیں کہ تعلیم سے محروم فرد یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ۔ جو پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماکر۔

ثانوی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے تین مدارج رکھے جائیں' دو سال علوم و فنون کے تعارف کے لئے جن میں عربی ادب' دینی علوم کے علاوہ دو عصری علوم بھی داخل کئے جائیں' جن کے مبادیات سے طلبہ کو واقف کرایا جائے نیز کوئی دو زبانیں' ایک ملکی اور ایک بین الاقوامی بھی داخل نصاب رہے۔

اس کے بعد عالمیت کے ۳ سال رکھے جائیں' پہلے دو سال میں عربی ادب' دینی علوم لازمی پرچوں کی حیثیت سے رکھے جائیں اور کوئی ایک عصری علم اور ایک زبان (عربی کے علاوہ) داخل نصاب ہو۔ آخری سال تخصص (آنرس) کا ہو' جس میں تفسیر (قرآنیات)' حدیث' فقہ' دیگر علوم دینیہ نیز عربی ادب' فارسی ادب اور اردو ادب میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے اس فن یا علم میں معتدبہ صلاحیت حاصل کی جا سکے۔

آخری تعلیمی مرحلہ دو سال کا ہو' جسے بالعموم فاضل کا نام دیا جاتا ہے' اور وہ درس گاہوں کے ایم اے کے مساوی ہے۔ وہ مضامین جن میں آنرس کی گنجائش ہو ان میں فاضل کرنے کی اجازت ہو' اور بیک وقت کسی ایک میں فاضل کرنے کا موقع دیا جائے' اور اس کا معیار یہ ہو کہ متعلقہ مضمون میں اسے پوری دست گاہ حاصل ہو۔ فاضل پر درسی مراحل ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد تحقیق کے لئے دو سال رکھے جا سکتے ہیں۔ اور جو طلبہ فاضل میں امتیاز حاصل کر سکے ہوں' صرف انہیں کو اس کا حق ملنا چاہئے تاکہ تحقیق حقیقی معنوں میں تحقیق ہو اور علمی دنیا میں اضافہ کا سبب بن سکے۔

تحقیق کا ایک پہلو اور ہے جس کے لئے وہ مدارس جنہیں وسائل و مواقع حاصل ہوں' کمر ہمت باندھ سکتے ہیں' ان موسسات (انسٹی ٹیوٹ) میں ان موضوعات کی تلاش کی جائے جن کا رشتہ کسی عصری علم سے اور ساتھ ہی قرآن و حدیث سے ملتا ہو' تحقیق کرنے والا مابہ الاشتراک اور مابہ الافتراق کو معلوم کر کے توجیہات و تطبیقات واضح کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ کام علوم اسلامیہ کے ماہرین اور علوم عصریہ کے ماہرین کی رہنمائی کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔

یہ معروضات ایک حد تک بر موضوع کے مدارس سے متعلق ہیں ایک یادداشت جو بہار مدرسہ ایجوکیشن کے نصاب اور نظام تعلیم سے متعلق، چند نکات پر مبنی پچھ دنوں پہلے کی نوشتہ نظر آگئی تھا بانا مناسب نہ ہو کا اس سے پیش کر دیا جاتا ہے۔

## (۲)

بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے موجودہ نصاب کی ترمیم کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل چند نکات پیش خدمت ہیں:

حالات کے تحت اس نصاب کے پڑھنے والوں کو پانچ زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے، پھر مضامین کی بہتات ہے۔ ایک طرف دینی علوم اور دوسری طرف عصری علوم ہیں، اس بناء پر نصاب گراں بار ہو گیا ہے کہ ممکنہ طور پر اسے ہلکا کرنا ضروری ہے۔

ایک سال میں دو سے زیادہ زبانوں کی ابتداء نہ کی جائے، وسطانیہ کے پہلے سال میں بیک وقت تین زبانوں کی ابتداء ہوتی ہے یعنی عربی، ہندی اور انگریزی، اس لئے مناسب ہوگا کہ تحتانیہ چہارم میں ہندی کی ابتداء کر دی جائے، یہ سال حروف شناسی کا ہوگا، اور ممکن ہو تو انگریزی کو ایک سال موخر کر دیا جائے۔

کتابوں کا بار کم کرنے کی غرض سے بعض مضامین کو ایک سال میں رکھا جائے اور بعض کو دوسرے سال میں۔ مثلاً جہاں ایک ہی جماعت میں، مطالعہ سماج اور جنرل سائنس کتابی صورت میں داخل نصاب ہے اسے دو سال میں تقسیم کر دیا جائے۔

فارسی اور اردو کی لازمی تعلیم وسطانیہ تک رکھی جائے، فوقانیہ، مولوی اور عالم میں متبادل مضامین کی فہرست میں شامل کیا جائے۔

مولوی اور عالم میں ہندی اور اردو کمپوزیشن کے پرچے ۵۰ + ۵۰ کے ہوں، اور نصاب اسی کے مطابق رکھا جائے۔

مولوی اور عالم میں انگریزی کا معیار کچھ ہلکا کیا جائے۔

جن مضامین میں فاضل کی اجازت ہے، ان میں آنرس کا نظم بھی رکھا جائے۔

دینیات کے مضامین میں بطور ضمنی مضمون، سیرت اور مختصر تاریخ اسلام بھی شامل رکھا

جائے۔

قرآن' حدیث' فقہ اور کلام کے سلسلہ میں ناگزیر متبادل کتابوں کے ساتھ' موضوع سے متعلق کوئی جدید تصنیف بھی رکھی جائے' جو متعلقہ مضامین سے متعلق عصر حاضر کے سوالات اور شبہات کا مناسب اور تشفی بخش جواب دے سکے اور طلباء میں تنقیدی شعور پیدا ہو۔

فاضل میں ایک پرچہ موضوع سے متعلق تحقیق و تنقید پر مشتمل ہونا چاہیئے۔

نصاب کو متوازن متناسب اور قابل برداشت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ حتی الامکان فوقانیہ تک کی کتابیں' بورڈ اپنی نگرانی میں تیار کرائے۔

جب تک بورڈ کتابیں تیار نہ کرا سکے' اس وقت تک کے لئے عصری مضامین کی کتابیں ٹیکسٹ بک بہار یا مقامی پبلشروں کی مطبوعات کے بجائے N.C.E.R.T کی مطبوعات رکھی جائیں وہ معیار اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے بلند ہوتی ہیں' نیز طلباء کے لئے ارزاں بھی ہوتی ہیں۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ تعلیمی معیار کی بہتری محض معیاری نصاب اور عمدہ کتابوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ طریق تعلیم کا بھی اس میں بڑا دخل ہے' اس لئے مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ کا بھی بندوبست ہونا چاہیئے۔ ٹریننگ میں اس پہلو پر خاصا زور دینا چاہیئے کہ محض کتابیں پڑھا دینا تعلیم نہیں بلکہ اس طرح متعلقہ فن پڑھایا جائے کہ طلباء اس فن سے کماحقہ واقف ہو سکیں' اور ان میں ذوق پیدا ہو۔

تعلیم کے اجزائے ترکیبی میں نصاب تعلیم' انتخاب کتب' تدریس اور امتحانات داخل ہیں۔ ان میں سے بعض اجزاء سہولت کے متقاضی ہیں اور بعض شدت کے' مثلاً نصاب متوازن ہو' کتابیں ممکنہ حد تک سہل ہوں' تفہیم کا اندازہ دل پذیر ہو سکے۔

تدریس کے معاملہ میں پابندی اور سختی بہت ضروری ہے' اس میں ڈھیل نہیں ہونی چاہیئے اسی طرح امتحانات کے اجزائے ترکیبی میں انتخاب سوالات اور جواب کی کاپیاں دیکھنے میں تو نرمی اور اعتدال سے کام لیا جائے لیکن امتحانات کی نگرانی میں پوری سختی عمل میں لائی جائے۔

تعلیم میں بہتری لانے اور امتحانات سے بدعنوانی دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حتی الوسع پرائیویٹ امتحانات کی حوصلہ افزائی کم کی جائے اور داخلہ کے وقت سختی کے ساتھ صلاحیت کا اندازہ کیا جائے۔

مدارس میں تعلیم کی پابندی اور بہتری قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسپکشن کا محکمہ بھی ہو اس لئے مناسب ہے کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اسلامک) کا جو عہدہ ختم کر دیا گیا ہے اسے پھر برقرار کیا جائے۔ بلکہ مدارس کی تعداد کا تقاضا تو یہ ہے کہ مدارس کے لئے ایک مستقل ڈائریکٹر کا عہدہ ہونا چاہیے جس کے تحت اسسٹنٹ ڈائریکٹر وغیرہ کے علاوہ ہر علاقے کے مطابق انسپکٹنگ مولوی مقرر کئے جائیں جو کم از کم سال میں ایک بار مدرسہ کا معائنہ کر سکیں۔

# دینی مدارس کا تعلیمی نظام

اقبال احمد انصاری
(شعبہ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ہندوستان کی دینی درس گاہیں، حالات کی نامساعدت اور وسائل کی کمی کے باوجود اپنی آزادی بر قرار رکھتے ہوئے تحفظ و اشاعت دین کے لئے جو علمی و عملی خدمات انجام دیتی ہی ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جاسکتا کہ ان مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آج کل ترقی یافتہ ممالک میں ہر تعلیمی ادارہ بلکہ ان کے ہر شعبہ میں ایسی کمیٹیاں ہوتی ہیں جو اپنے تعلیمی کاموں کا مسلسل جائزہ لے کر اپنے مقاصد و مناہج اور نصاب و طریقہ تعلیم و مسائل تدریس سب میں ترمیم، توسیع، تنسیخ اور تنوع کے ذریعہ اپنے پیشے، ادارہ اور اساتذہ و طلباء کو جمود و تعطل، از کار رفتگی اور ضیاع وسائل اور خود فریبی سے بچانے کے عمل میں مستعد رہتی ہیں۔ اداروں کے باہر اخبارات و رسائل اور تعلیمی جرائد میں تعلیم کے ہر موضوع پر بحث و تمحیص کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ پھر ہر بیس پچیس سال بعد کوئی سرکاری یا نیم سرکاری کمیشن اعلیٰ تعلیم یا ثانوی تعلیم کے ہر پہلو کا جائزہ لینے اور اصلاحی سفارشات پیش کرنے کے لئے قائم ہوتا رہتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ تعلیمی اداروں سے وابستہ لوگ خصوصاً اساتذہ امریکا میں ایک محدود تعداد میں، یورپ میں ان سے کچھ زیادہ، انگلستان میں معتدبہ اور ہندوستان میں ان کی غالب اکثریت نظام و نصاب اور کتب و وسائل تدریس اور طریقہ تعلیم میں کسی بھی تبدیلی کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور اپنے زمانہ کے نظام و نصاب بلکہ اسباق و درس سب کو گلے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔ طلباء کی صلاحیتوں، رجحانات اور ضروریات اور

معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات و سائل سے آنکھیں بند کر کے وہ اپنے کام میں یکسوئی سے منہمک رہنا چاہتے ہیں۔ چونکہ تعلیمی اداروں کا براہ راست اور فی الفور احتساب ممکن نہیں اس لئے اس بات کی گرفت مشکل ہے کہ تعلیمی ادارے ملک و ملت کے وسائل کا کتنا ضیاع کر رہے ہیں اور کیسے غیر متعلق و لایعنی موضوعات و مضامین کی مشق طلباء پر کرتے رہتے ہیں جن سے ان طلباء کو کسی طرح کے ذہنی و مادی یا اخلاقی فائدہ کے حصول کا امکان نہیں اور یہ کہ اساتذہ کیا کیا کر سکتے تھے جو وہ تقلید و تساہل کی وجہ سے نہیں کرتے اور یہ بھی کہ جن مفید مقاصد کے حصول میں وہ مستعد رہتے ہیں انہیں تھوڑی توجہ سے مزید بہتر طور سے کیوں کر انجام دے سکتے تھے۔

یہ صورت حال ہندوستان کے دنیاوی و دینی اداروں سب میں پائی جاتی ہے۔ سیکولر تعلیمی ادارے' تقلید و جمود اور تساہل و بے مقصدیت بلکہ مہملیت کے کم شکار نہیں۔ لیکن ان کے پاس سکہ رائج الوقت ہونے کی وجہ سے ان کی قلعی اتنی نہیں کھل پاتی۔ دوسرے مغرب سے رشتہ کی وجہ سے وہاں جاری تبدیلیوں کے کچھ بھونڈے اثرات یہاں بھی پڑ جایا کرتے ہیں۔ دینی ادارے چونکہ دائمی ہدایتِ الٰہی کو دائمی طریقوں سے دوام بخشنے کی کوشش میں منہمک رہتے ہیں' اس لئے ان کی اپنی ذہنی نارسائیوں' غفلتوں اور بے تدبیریوں پر پردہ آسانی سے پڑ سکتا ہے۔ مزید یہ کہ معاشرہ و دینی تعلیمی اداروں کے درمیان رشتہ' عقیدت مندی' ان اداروں کی کارکردگی کے احتساب سے انہیں مزید آزاد کر دیتا ہے۔

ادھر بیس پچیس برس سے مدارس دینیہ کے نصاب کی اصلاح کی طرف پھر توجہ ہو رہی ہے۔ ندوہ اور علی گڑھ ہی نہیں بلکہ مختلف کانفرنسوں' سیمیناروں اور جلسوں میں اصلاح نصاب مدارس دینیہ اب ایک پسندیدہ موضوع بن چکا ہے۔ پریس و پلیٹ فارم سے بھی آراء کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اس کے محرکات اور محرکین داخلی و خارجی دونوں طرح کے ہیں۔ وہ مصلحین جن کا تعلق راقم کی طرح کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ہے۔ انہیں یک طرفہ دینی مدارس کی اصلاح کی طرف متوجہ دیکھ کر ان کی نیتوں پر نہ سہی ان کی تدبیر پر ضرور شبہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس طبقہ میں کچھ حضرات دردمندی سے تعلیم کے دونوں دھاراؤں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہیں اور اصلاح مدارس دینیہ کو امت مسلمہ ہند کی تعمیر نو کے وسیع تر سیاق میں ایک اہم جزو کی حیثیت دے کر اسے وسیلہ سعادت دینی و دنیوی بنانا چاہتے ہیں۔ بہر حال

نیتیں معتبر سمجھنا ہی بہتر ہے۔ اگرچہ بڑے بڑے اجتماعات و کانفرنسوں میں دینی مدارس کی اصلاح کے لئے جو تجاویز پیش کی جاتی ہیں' ان سے ژولیدگی فکر اور خلط مباحث کا اندازہ ہوتا ہے' اور یہ بھی کہ تعلیمی مسائل سے مس کے بغیر صرف نیک نیتی کے سہارے بات سوچی اور کہی گئی ہے۔

مثلاً مندرجہ ذیل مشورے ملاحظہ ہوں جو تواتر سے دینی مدارس کو دیئے جاتے رہے ہیں :

(۱) انگریزی پڑھایئے۔

(۲) حالات حاضرہ سے باخبر علماء پیدا کیجئے۔

(۳) سائنس کے علم کے بغیر علماء حیات و کائنات کو نہیں سمجھ سکتے۔

(۴) تعلیم کا رشتہ روزگار سے جوڑا جائے جس کے لئے صنعتی و تکنیکی تعلیم کا انتظام ہو۔

ان میں سے ہر تجویز صحت کا عنصر رکھتی ہے لیکن سیاق سے ہٹ کر اور مضمرات پر غور کئے بغیر جس انداز سے یہ صدائیں بلند ہوتی ہیں وہ بے اثر ہوتی ہیں۔ اس انداز اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اول تو تجاویز علماء کے حلق سے نہیں اترتیں (چاہے مجوز شبلی جیسا عبقری کیوں نہ ہو) اور اتر بھی جائیں تو تعویق میں پڑی رہتی ہیں اور جب عمل بھی شروع ہوتا ہے تو علم و عالم سب کا پرنالہ وہیں گرتا رہتا ہے جہاں گرتا تھا۔ نہ انگریزی آتی ہے' نہ خوردبین و دوربین کے ذریعہ تجربہ کی مشق' نہ روزی کا انتظام اور نہ دین میں نظر و تفقہ۔

زیر نظر مضمون کا محرک یہی احساس رہا ہے کہ خلط مباحث رفع کر کے دینی درس گاہوں کے پورے نظام کے جائزہ کے بعد اصلاحی تجاویز کے لئے ان رہنما اصولوں کا تعین کیا جائے جن کی روشنی میں یہ درس گاہیں یا مستقبل میں قائم ہونے والے علوم دینیہ کے نئے ادارے اپنے لئے موزوں ماڈل خاکہ ترتیب دے سکیں اور ایسا تعلیمی پروگرام وضع کریں جن میں علم' فرد انسانی اور معاشرہ تینوں کے مقاصد و مناہج ہم آہنگ ہو سکیں' یا کم سے کم ان میں وہ تناقض و تصادم نہ رہے جو صلاحیتوں کو ضائع کرتا ہے اور حساس اساتذہ کو بے حاصلی کے افسوس میں مبتلا کرتا ہے۔

سب سے پہلے ہم دینی مدارس کے نظام و نصاب کا سرسری تاریخی جائزہ لیتے ہوئے اصلاحات کی دور بہ دور مساعی کی نشاندہی کریں گے۔ پھر تنظیم نو کے رہنما اصولوں کی

وضاحت اور آخر میں ان کی روشنی میں عملی تجاویز پیش کریں گے۔

ہندوستان میں سترہویں صدی کے آخر میں ملا نظام الدین نے درس نظامی کے نام سے موسوم جو نصاب بنایا اس میں علوم آلیہ' کے علاوہ معقولات کا حصہ خالص دینی علوم کے حصے سے کہیں زیادہ تھا جس کی وجہ اس وقت کے حالات تھے۔ یعنی یہ کہ یہی مدرسے نظم حکومت و دفتر و قضا کے لئے افراد فراہم کرتے تھی۔ اس وقت دنیاوی تعلیم کے لئے الگ سے کوئی ادارے نہیں تھے۔ انیسویں صدی کی ابتداء بلکہ نصف آخر تک یہ سلسلہ کچھ ترمیمات کے ساتھ جاری رہا یعنی صرف و نحو' ریاضی و ہیئت' حکمت و منطق اور بلاغت کے مضامین تفسیر' کلام' حدیث اور فقہ کے ساتھ پڑھائے جاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صورت حال ایسی ہوگئی کہ مدرسوں کے فارغین کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہوگئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف سر سید نے دنیوی علوم کا مدرستہ العلوم مسلمانان محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل میں قائم کیا اور دوسری طرف مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے مدرستہ العلوم دیوبند (۱۸۶۵ء) قائم کیا۔ مدرسہ کے نصاب کی بنیاد درس نظامیہ پر ہی رکھی گئی اس اہم تبدیلی کے ساتھ کہ دینی علوم اور عربی پر توجہ بڑھائی اور معقولات پر کم کی گئی۔ (۲) مثلاً عربی ادب پر چھ کتابیں' سیرت پر ایک' تاریخ اسلامی پر دو اور علم المناظرہ پر ایک کتاب اس نصاب میں شامل کی گئیں جب کہ درس نظامی میں یہ مضامین نہیں تھے۔ حدیث پر ایک سے بڑھا کر کتابوں کی تعداد گیارہ (۱۱) کردی گئی۔ اگرچہ یہ بھی دلچسپ ہے کہ صرف و نحو اور منطق پر بھی کتابیں پڑھائی گئیں۔ بالترتیب ۷ سے ۱۳ اور ۶ سے گیارہ۔ طب پر بھی نئے نصاب میں ۵ کتابیں شامل کی گئیں۔ دیوبند کے نصاب میں ۸۱ کتابیں شامل تھیں اگرچہ ان میں اسباق و صفحات کا تعین تھا جب کہ پرانے درس نظامی میں ۳۵ کتابیں تھیں۔

کم و بیش دارالعلوم دیوبند کے ہی خطوط پر شمالی ہندوستان میں ۱۸۶۵ء سے ۱۹۴۶ء تک کے عرصے میں ۲۱۷ دینی مدارس قائم ہوئے۔ آزادی کے بعد بھی ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک جائزے کے مطابق ۱۹۶۸ء تک یوپی و بہار میں ۱۴۴ مدارس قائم ہوئے۔ اس ساری فہرست میں سب سے ممتاز و قابل توجہ اضافہ ۹۴-۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلماء و دارالعلوم ندوۃ العلماء' لکھنؤ کا قیام تھا۔ موخر الذکر ادارہ اس تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا جو مروجہ دینی درس گاہوں کے تعلیمی نظام' خصوصاً نصاب سے حساس و بیدار

ذہنوں کی بے اطمینانی کی مظہر تھی۔ اس تحریک نے علوم دینی میں مذہبی علوم اور عربیت' یعنی عربی زبان وادب کو مرکزی مقام دینے کی کوشش کی۔ نیز یہ احساس عام کیا کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل قدیم علم کلام اور فن مناظرہ اور منطق و حکمت سے لیس ہو کر تہذیب جدید کے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے انہیں انگریزی زبان (جن میں علوم حاضرہ کا ذخیرہ دستیاب ہے) اور عصریت سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ اس تحریک وادارہ کے ایک نمائندہ شبلی (۴) کا مطمح نظر یہ بھی تھا کہ مذہبی و دنیاوی کی خلیج کو کم کیا جائے۔ مروجہ درس نظامیہ پر ان کی تنقید یہ بھی تھی کہ اس کے تحت کتابوں کے متن اور اس کی شرح وغیرہ کے درس پر ساری توجہ مرکوز رہنے کی وجہ سے "فن" کا علم حاصل نہیں ہوتا' جب کہ ضرورت نظر و تفقہ اور تعمق کی ہے۔ شبلی بھی انگریزی زبان کی تحصیل کے بہ شدت قائل تھے۔

مولانا آزاد بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی سے اپنے آخری زمانے تک دینی مدارس کی اصلاح کے مسئلہ میں مضطرب رہے۔ ان مدارس کے مقاصد و طریقہ تعلیم و نصاب سب ہی پر ان کی تنقید بھرپور تھی۔ ان کا احساس تھا کہ ہندوستان میں دینی و عربی علوم کی درس و تدریس علوم کے دور تنزل کے خمیر سے ہوئی تھی۔ اس لئے یہ ادارے طلباء میں نظر و اجتہاد کے بجائے جمود و تقلید اور حصول علوم و فنون کے بجائے کتابوں کے متون' ان کی شرحوں اور تعلیقات کے ذریعے خیالات کی محصوری کے عمل میں مصروف رہے۔ (۵)

نصاب کے بارے میں ان کی یہ تنقید تھی کہ اس میں "معقولات" کا عنصر علوم' اسلامیہ پر غالب ہے اور یہ کہ ان "معقولات" کے مضامین از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔

نصاب پر تنقید کے علاوہ طریقہ درس کے بارے میں ان کے خیال میں قدما کا املا (لکچر) کا طریقہ علم و فن و مضامین میں بصیرت کا باعث ہوتا تھا جب کہ اس کی جگہ کتابوں اور اسباق کے کورانہ درس نے لے لی ہے۔

۱۹۴۷ء میں عربی نصاب تعلیم کی سرکاری کمیٹی کے سامنے مولانا نے جو صدارتی تقریر کی اس میں علاوہ مندرجہ بالا امور کے یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں طالب علم پر تین طرح کے بوجھ ہیں۔ (۱) عربی زبان کا حصول (۲) حل عبارت کا بوجھ (۳) اس کے سیکھنے کے لئے زبان فارسی کا بوجھ۔ فارسی کی تعلیم اور ذریعہ تعلیم میں فرق کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ عربی علوم کی پہلی رونمائی مادری زبان میں ہونی چاہیئے۔ (۶)

اس سے کافی قبل ۱۹۱۴ء میں مولانا کو یہ احساس مضطرب رکھتا تھا کہ قرآن فہمی کے لئے ذہنوں کو اسلاف کی آراء سے بوجھل کرنے کے بجائے احادیث اور زبان وادب میں تازہ ترین تحقیقات کی مدد سے براہ راست کوشش ہونی چاہیئے۔ (۷) اس نقطۂ نظر سے انہوں نے کلکتہ میں دارالارشاد' پھر تحریک عدم تعاون کے زمانے میں مدرسہ اسلامیہ کے نام سے ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی جن کا عرصہ حیات بہت قلیل تھا۔

مولانا آزاد کی اصلاحی تجاویز کا پس منظر عالم اسلام میں انیسویں صدی کے دوران شیخ محمد عبدہ اور مولانا جمال الدین افغانی کی فکری و عملی مساعی فراہم کرتی ہیں۔ شبلی و سید سلیمان ندوی بھی بیرون ہند اور اسلامی علمی و تعلیمی تحریکات کا قوی احساس رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد کے علاوہ اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس سے متعلق اقبال' سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تجاویز قابل لحاظ ہیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے بہ حیثیت وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی و صدر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جو مساعی اس جانب کیں وہ بھی توجہ طلب ہیں۔ (۸)

ان کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نصاب کی اصلاح' حکومت اتر پردیش کی طرف سے ۱۹۳۷ء اور پھر فروری ۱۹۴۷ء میں عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کی کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ موخرالذکر کے صدر مولانا آزاد تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ایک قابل ذکر اور اہم کوشش سینٹرل وقف بورڈ نے کی۔ (۹) دینی مدارس کے مروجہ نظام کے جائزہ اور اصلاحات کی تجویز کے لئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی صدارت میں سنی و شیعہ علماء کے علاوہ اے' اے فیضی جیسے جدید عالموں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی۔ جس کی پہلی نشست سے وزیر اوقاف ہمایوں کبیر نے خطاب کیا۔ اس کمیٹی نے نصاب کے بارے میں سفارشات کے علاوہ عرصہ تعلیم اور اس کی تنظیم کے لئے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی۔ (۹)

ابتدائی ۵ سال + ثانوی ۵ سال + عالمیت ۴ سال + فضیلت (تخصص) ۲ سال + (پورا عرصہ تعلیم ۱۶ سال)

ثانوی کے ۵ سال کے کورس کے اجزاء :

پہلے دو سال صرف و نحو' عربی زبان' دینیات' اردو' ہندی' حساب' جغرافیہ

تیسرے سال : فارسی اور عربی زبان کے علاوہ ادب کا اضافہ۔

چوتھے سال : ترجمہ قرآن' فقہ' انگریزی اور معلومات عامہ کا اضافہ اور ہندی' حساب حذف اور جغرافیہ کی جگہ تاریخ۔

پانچویں سال فقہ کے ساتھ اصول فقہ' منطق' فارسی کا اضافہ اور معلومات عامہ کی جگہ عام سائنس۔

## عالمیت کے ۴ سال :

سال اول : ترجمہ قرآن' اصول تفسیر' فقہ و اصول فقہ' حدیث' تاریخ اسلام' بلاغت اور عربی زبان و ادب کے علاوہ انگریزی' منطق' فلسفہ' معاشیات یا یورپ پر فلسفیانہ فکر کا تاریخی ارتقا' فلسفہ جدید اور سیاسیات شامل ہیں۔

سال دوم : تفسیر' فقہ و تاریخ اسلامی کے علاوہ بلاغت' علم کلام' انگریزی' فلسفہ اور معاشیات یا فلسفہ جدید یا یورپی فلسفیانہ فکر کی تاریخ سیاسیات میں سے ایک۔

سال سوم : تفسیر' حدیث' فقہ کے علاوہ انگریزی اور علم کلام یا معاشیات یا فلسفہ' جدید یا یورپی فکر یا سیاسیات۔

سال چہارم : مفتی عالم : حدیث' فقہ' اسرار و حکم کے علاوہ انگریزی اور معاشیات وغیرہ میں سے ایک مضمون۔

عالم کے کورس کی تکمیل کے بعد کمیٹی کی سفارش دو سالہ تخصص کے کورس کی ہے جو مندرجہ ذیل مضامین میں فضیلت کے لئے مخصوص ہوگا۔

(۱) تفسیر (۲) حدیث (۳) فقہ (۴) عربی ادب (۵) تاریخ اسلامی۔

ان تخصیصی کورسوں کے عناصر ترکیبی میں کسی جدید علم کی ہوا نہیں لگنے دی گئی ہے۔ مثلاً فاضل فقہ بھی اپنے قدیم فقہی سرمایہ کے علاوہ دنیا میں قانون و عدالت کے نظام سے واقف نہیں ہو سکے گا اور اسی طرح تاریخ کا طالب علم۔

اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں جدہ میں منعقدہ عالمی مسلم تعلیمی کانفرنس کی سفارشات قابل توجہ ہیں۔ اس کے چند حصے جو ہمارے بعض مسائل سے متعلق ہیں ملاحظہ ہوں :

کمیٹی اول : برائے تعین تعریف و مقاصد تعلیم کی سفارش۔

(۲) تعلیم کی تنظیم۔ علم کی مندرجہ ذیل دو گونہ تقسیم کے اصول پر مبنی ہونی چاہیئے۔

(الف) قرآن و سنت اور متعلقات۔ بہ حیثیت دائمی ذخیرۂ علم۔
(ب) اکتسابی علم، جس میں زمانہ کے ساتھ اضافہ و تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس میں سے شریعت سے ماخوذ اقدار کی کسوٹی سے اخذ و انتخاب۔
سائنس اور سماجی ترقیات سے متعلق عصری علوم سے طلباء کو تعلیم کے ہر مرحلہ پر بہرہ مند کیا جائے۔
کمیٹی نمبر ۳ (زیر صدارت مولانا ابوالحسن علی ندوی) برائے اسلامی تعلیمی ورثہ ماضی و حال، کی سفارشات۔
ایسی اسلامی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں جن میں دینی علوم کے علاوہ علوم جدیدہ کی تعلیم دی جائے۔ ان یونیورسٹیوں میں تعلیمی پروگرام میں اس طرح تنوع پیدا کیا جائے کہ ہر شعبہ کے فاضل طلباء شریعت کے علاوہ جدید علوم میں سے کسی ایک میں مہارت حاصل کر سکیں تاکہ علوم جدیدہ کے ہر شعبہ میں ہمارے ماہرین کی نسل پروان چڑھ سکے۔
کمیٹی نمبر ۴ برائے تعلیمی پالیسی و عمل کی سفارشات :
(۸) تعلیمی نظام اس طور سے ترکیب پائے کہ سماجی علوم، علوم طبعی و نیز فنون (آرٹس) سب کے لئے ایک اسلامی قلب (Core) ہو۔
(۴) مسلم مکاتب میں مضامین و اسباق ایسے ہوں کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلہ کی گنجائش متعدد سطحوں پر موجود ہو۔
کسی نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے پہلے چند رہنما اصولوں کا تعین ضروری ہے جس کی روشنی میں متبادل نقشے (ماڈل) تجویز کئے جاسکتے ہیں۔
اس ضمن میں، ہمیں اسلامی تصور علم، نظریہ تعلیم، مدارس کے مقاصد تعلیم، تعلیمی عرصہ کی تنظیم و درجہ بندی کا ڈھانچہ، طریقہ تعلیم، نصاب تعلیم کے مسائل کی تنقیح کرنی پڑے گی۔ تصور علم کی بحث میں اس نظریہ سے سابقہ پیش آتا ہے کہ اسلام میں دینی و دنیاوی علوم کی کوئی تقسیم نہیں۔ اعلیٰ ترین سطح پر زندگی اور احوال زندگی کی وحدت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ تقاضا سمجھنا کہ مسجد نبوی ﷺ کے سامنے چبوترے پر اصحاب صفہ جس طرح کے علمی مشغلے میں منہمک رہتے تھے اور کھجور کی پیداوار بڑھانے کی ترکیب (جس کے بارے میں رسول کریم ﷺ نے مدینہ کے لوگوں سے فرمایا کہ یہ دنیا کا علم ہے

اسے تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو) اس کا علم ایک ہی درجہ اور ایک ہی نوعیت کا علم ہے مناسب نہیں ہوگا جس علم کی طلب اور اس کا حصول مسلمان مردوں اور عورتوں پر واجب ہے کیا وہ دونوں طرح کے علم پر حاوی ہے؟

فی زمانہ احیائے اسلام کے جلو میں علوم کو اسلامیانے کی نیک تمنائیں کانفرنسوں و سیمیناروں میں (خصوصا بیرون ہند) سننے میں آتی رہتی ہیں۔ راقم کے نزدیک اس کا نظری جواز اس لئے ہے کہ بیشتر علوم جدیدہ خصوصا فلسفہ' سائنس اور سوشل سائنس (سماجی علوم) اخلاقی وروحانی اقدار سے بے نیازی وغیر جانب داری کے باوجود ایک نظام اقدار کے تابع ہیں۔ اس لئے وہ لوگ جو سماجی وسیاسی و معاشی اداروں اور پوری تہذیب انسانی کی تعمیر اسلامی نظام اقدار کے مطابق کرنا چاہتے ہیں وہ ان علوم کو اس کا تابع بنانے میں حق بہ جانب ہیں لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں غالبًا ملحوظ نہیں رکھی جاتیں۔ ایک یہ کہ "مغرب" اور باطل' مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے مغربی تہذیب کے گہوارہ میں پروردہ علوم وفنون کو یکسر باطل قرار دینا یا کم سے کم شبہ کی نظر سے دیکھنا' صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ تہذیب اور اس کے اداروں' علم اور اس کے تمام شعبہ جات میں تال میل اور ہم آہنگی و یک جہتی اپنے اپنے دور میں وقت کی تہذیب غالب انجام دیتی ہے۔ اس لئے جب تک اسلام میں 'تہذیب غالب' بننے کی دوبارہ صلاحیت پیدا نہیں ہو جاتی' یہ کوششیں باوآور نہیں ہو سکیں گی' لیکن مساعی کے جاری رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آئندہ کے لئے نشانات راہ کا کام دے سکیں گی۔

درمیانی عرصہ میں ممالک اسلامیہ میں اور کافی بڑے عرصے تک ہندوستان جیسے مسلم اقلیتی ملک میں علوم کی وحدت اور انہیں اسلامیانے کا خواب ہمیں آج اور کل کی حقیقتوں سے دور لیتا جائے گا۔ اس لئے ضرورت یہ ہے کہ موجود حقیقت (یعنی غلبہ مغرب اور ہندوستان میں اقلیتی حیثیت) سے نبرد آزما ہونے کے لئے علم کی تقسیم کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں ردو قبول اور اخذ و انتخاب کی جس حد تک آزادی ہو اسے استعمال کرتے ہوئے اپنی بصیرت اور نظر کے ذریعہ ان علوم میں نئی روح پھونکتے رہیں۔

علم کی تقسیم ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے' ایسے تحقیقی ادارے اور مراکز بھی وجود میں آئیں جو اسلام کے وژن اور نظام اقدار کی روشنی میں ایک متبادل علمی اسکیم کا خاکہ مرتب کرنے میں مددگار ہوں۔

تصور علم کی تنقیح کے بعد مقاصد تعلیم کا تعین اور وضاحت ضروری ہے۔

دینی تعلیم کی درس گاہوں کے مقاصد حسب ذیل ہو سکتے ہیں:

(۱) طلباء کی دینی علوم کے ماخذ تک رسائی اور ان میں فہم وبصیرت کی صلاحیت پیدا کرنا تاکہ وہ اسلاف کی آرا سے مستفید ہوتے ہوئے اپنے اندر علم دین کے حصول کے ساتھ تفقہ فی الدین پیدا کر سکیں اور اس کی بھی صلاحیت کہ نظر واجتہاد کے ذریعے حالات کی ندرت و پیچیدگی کے باوجود وہ تعلیمات اسلامی کی تطبیق کر سکیں، جزو وکل کا رشتہ سمجھ سکیں اور ہدایت الٰہی کے دائمی وغیر مبدل اور احوال وظروف کے پابند حصوں کے درمیان تمیز کر سکیں۔

انہیں طلباء میں یہ احساس اور رویہ بیدار کرنا کہ علم کے لئے جستجو کا سلسلہ ایک جاری رہنے والا کام ہے اور یہ کہ قرآن کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے ابدی سرچشمہ ہدایت ہے لیکن اس کے سمجھنے والے انسانوں کی رائیں ابدی نہیں ہو سکتیں اور یہ کہ احوال وظروف کا یعنی اپنے عصر کا علم ہوئے بغیر اسلام کا فہم اور اس کی تطبیق ممکن نہیں۔

(۲) مندرجہ بالا کلیدی مقصد کے مرکزی نقطے سے مزید جو شاخیں نکل سکتی ہیں وہ نظری و عملی دونوں طرح کی حسب ذیل ہیں:

(الف) (i) اپنی اخلاقی اور روحانی تربیت و اصلاح

(ii) معاشرہ میں علم دین کو عام کرنا، اس کے لئے وعظ و تعلیم اور رشد وہدایت کے مروجہ سارے طریقوں کے علاوہ جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال کرنا۔

(iii) مدافعت و تبلیغ دین کا کام کرنا...... مسلمانوں میں اور غیر مسلموں میں

(ب)(i) اسلاف نے اسلامی علوم کا جو قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے اس میں تحقیق کے ذریعے اضافہ کرنا، خصوصاً ان شعبہ جات میں جو عرصے سے جمود وتعطل کا شکار ہیں۔

(ii) انسان نے انفس وآفاق کے بارے میں اور انسانی معاشرہ کے بارے میں جو علم وبصیرت پچھلی چند صدیوں میں حاصل کی ہیں ان کی مدد سے قرآن وسنت کے اپنے فہم میں توسیع کرنا اور تعبیر وترجمانی کی سطحوں کو اعلیٰ ترین تہذیبی وذہنی سطح تک بلند کرنا۔

اعلیٰ تعلیمی ادارے خواہ عصری علوم کے ہوں خواہ دینی مندرجہ بالا دوگونہ مقاصد جنہیں علمی و عملی Service Orientation اور Scholarship Orientation سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ بیک وقت ان کی تکمیل اپنی مختلف تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے کرتے

ہیں۔

یہ مقاصد نوعی ہیں جو ان اداروں کا وجہ قیام فراہم کرتے ہیں لیکن دیگر ذیلی و ضمنی مقاصد اور ان کے وسلہ جات و آلہ جات بھی ایک سطح پر مقاصد کی فہرست میں جگہ پا سکیں گے۔ مثلاً:

(i) دینی درس گاہوں کے لئے موزوں اور اساتذہ کی تیاری کے لئے تربیتی کورس

(ii) ذرائع ابلاغ میں سے ہر ایک صنف وسیلہ کے استعمال کے لئے موزوں کورس تاکہ علماء و فضلاء صحافت اور ریڈیو' ٹی وی و فلم کے ذرائع اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے فنی مہارت کے ساتھ استعمال کر سکیں۔

(iii) تصنیف و تالیف اور کتب و رسائل سے متعلق فنی معلومات کا کورس

(iv) ابلاغ Communication سے متعلق کثیر الابعاد کورس جو زبان و بیان اور نفسیات و سماجیات اور ٹیکنالوجی کا احاطہ کرتے ہوئے فی زمانہ بہ طریق احسن اپنا مدعا و مضمون دوسروں تک پہنچانے کے سلیقے سے طلباء کو بہرہ ور کر سکے۔

(v) کتب خانوں' لائبریریوں اور دستاویزی خدمات و حوالہ جات سے متعلق فنی معلومات کے کورس تاکہ وہ محولہ بالا عین مقاصد کے لئے سازو سامان فراہم کرنے میں معاون ہوں۔

(vi) درسی و غیر درسی کتابوں اور دیگر تدریسی وسائل و سامان مثلاً Audio Tapes اور Video Tapes کی تیاری کے لئے فنی تربیت۔

(vii) جلسہ و اجتماع' سیمینار و کانفرنس اور ورکشاپ کے انتظام و انصرام سے متعلق تربیتی کورس۔

(viii) تبلیغ کے علاوہ کمیونٹی لیڈر شپ کا کورس تاکہ اسلام کی روشنی میں اپنے شہر و علاقہ میں عام فلاح و بہبود و سعادت کے لئے اجتماعی کاموں میں رہنمائی اور پیش قدمی کی تربیت کا انتظام ہو۔

مقاصد تعلیم کے بعد ایک رہنما اصول جو عموماً دینی و دنیاوی تعلیمی ادارے مسلسل نظر انداز کرتے رہے ہیں اور جس کی وجہ سے اداروں کے وسائل برباد ہوتے ہیں اور طلباء کے ایک حصہ کو کوئی علم یا فن حاصل نہیں ہوتا جو ان کی اپنی صلاحیتوں' رجحانات اور ضروریات کے مطابق ہو۔ وہ ہے اصول کورسوں کے تنوع کاری Diversification کا۔

عقل و تجربہ بتلاتے ہیں کہ سارے طلباء جو دینی مدارس میں ابتدائی یا ثانوی میں داخلہ لیتے ہیں' وہ صلاحیت و رجحان اور آئندہ زندگی میں متوقع ضروریات کے اعتبار سے ضروری نہیں کہ وہ سب عالم دین بن کر تبلیغ و تعلیم وو عظ وار شاد' یا تحقیق واشاعت دین کا کام کر سکیں۔ اس لئے مختلف مراحل پر ان کو خود بھی اختیار ہونا چاہیئے کہ علم دین کی شارع عام ترک کر کے علم دنیا یا کسی فرد یا پیشہ ورانہ کام کی تربیت حاصل کر سکیں اور ان کا امتحان لے کر انہیں ایسے متبادل تعلیمی پروگرام کا مشورہ بھی دیا جانا چاہیئے۔ ابتدائی یا ثانوی درجات کے کورسز میں خصوصیت سے اس کا لحاظ کیا جانا چاہیئے۔ بعد میں عالم کے مرحلہ پر بھی چند مرکزی لازمی کورسز کے علاوہ مندرجہ بالا مقاصد کی فہرست میں سے ذیلی و ضمنی مقاصد میں سے ذوق و رجحان کے مطابق کچھ کورسز (مثلاً لائبریری سے متعلق یا ذرائع ابلاغ سے متعلق کورسز) اختیاری بنائے جا سکتے ہیں۔ تاکہ اس سطح پر ہر طرح کے ذوق و ضرورت کے مطابق متنوع کورسز موجود ہوں۔ ابتدائی و ثانوی مراحل پر یا عالم کے مراحل پر کاروباری اور آلیاتی' تربیت کے کورسز میں سے وسائل کے مطبق کچھ کا انتظام دینی مدارس خود کر سکتے ہیں اور کچھ جو ان کے نوعی مقاصد سے بالکل علاقہ نہیں رکھتے یا سرمایہ اور سازو سامان کثیر درکار کرتے ہیں ان کے انتظام کے لئے اپنے کو پابند نہ سمجھنے میں حق بہ جانب ہوں گے 'الا یہ کہ اپنے مدرسہ کو وہ کثیر الجہات جامعہ کا درجہ دینے کا منصوبہ بنائیں' جہاں سائنس و طب' ٹیکنالوجی اور دیگر تربیتی وفنی پروگرام مروج ہوں۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل کاموں کو ثانوی مرحلے کے بعد دینی مدارس بآسانی اپنے مرکزی کاموں میں کسی خلل کے بغیر کر سکتے ہیں :

(۱) ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ و دفتری کاموں کی تربیت۔
(۲) لائبریری کی تنظیم سے متعلق کورسز
(۳) صحافت کی تربیت
(۴) ابتدائی درجات کے لئے اساتذہ کی تربیت۔
(۵) ترجمہ کی تربیت (ہندی' اردو' انگریزی' عربی و فارسی کسی دو کے درمیان)
(٦) کتاب و رسائل کی طباعت اور چھاپہ خانہ کے کاموں کی تربیت۔
(۷) کمپیوٹر کی تربیت۔

مندرجہ بالا کاموں کی نوعیت ایسی ہے کہ سب ہی علمی کاموں کے براہ راست یا بالواسطہ معاون ہیں اور ان کا انتظام دینی مدارس کے احاطہ میں بے جوڑ اور بے ہنگم نہیں ہوگا' جیسا کہ بجلی یا مشین کے کاموں سے خدشہ ہو سکتا ہے۔

تعلیمی اداروں کی تنظیم یا ان میں اصلاح کے مندرجہ ذیل مزید پہلو ہیں جو رہنما اصولوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(الف) عرصہ تعلیم کی درجہ بندی اور مرحلہ بندی

(ب) کریکیولم اور نصاب بشمول امتحانات

(ج) کتب' رسائل' اسباق' متون' یعنی بہ حیثیت مجموعی وسائل و آلات و سامان' تعلیم Teaching Material & Resources انتخاب و تیاری۔

(د) طریقہ تعلیم........ لیکچر' مباحثہ' طلباء کا آزادانہ مطالعہ' سیمینار' سمپوزیم متعین موضوعات پر مقالات کی تیاری کی تربیت' کتب خانہ کا استعمال۔

(ڈ) ذریعہ تعلیم........زبان / زبانیں۔

(ذ) کریکیولم اور نصاب اور طریقہ تعلیم کے جزء کے طور پر اور اس کے معاون کے طور پر الگ سے مفید وسائل' مثلاً تعلیمی نمائش' طلباء اساتذہ کی بین المدارس سرگرمیاں' اہم تعلیمی مراکز میں موقت قیام برائے استفادہ۔ دوسرے ہم عصروں سے باہمی تعامل کے ذرائع و وسائل بشمول عصری علوم کے کالج و یونیورسٹیاں۔

(ر) طلباء کا داخلہ

(ڑ) اساتذہ کی تقرری و ترقی

(ز) منتظمہ

(ژ) سرمایہ و وسائل۔

(س) ملک کے تعلیمی نظام سے رشتہ اور سندوں کی سرکاری حیثیت

اب ہم ان سب ہی پہلوؤں کو لے کر رہنما اصول طے کریں گے۔

دینی مدارس کے پورے عرصہ تعلیم کی درجہ بندی مندرجہ ذیل طرز کی ہونی چاہیے۔

| | |
|---|---|
| (الف) ابتدائی مکتب | ۵ سال |
| (ب) ثانوی | ۵ سال |

(ج) عالم ۵ سال (اعلیٰ ثانوی ۲ سال + عالمیت ۳ سال)

(د) فاضل ۲ سال (عالم و فاضل کے عرصہ کو ملا کر ۷ سالہ ایک کورس بھی بن سکتا ہے)۔

(ر) محقق (دکتور) (تخصص) ڈھائی سے ۴ سال

صاف ظاہر ہے کہ یہ خاکہ عصری علوم کے تعلیمی ڈھانچہ کے عین مطابق ہے یعنی

Elementary (5 years)

5 Years High School

5 Years Secondary

2 Senior Secondary + 3 Years Graduation

2 Years M.A. + Ph.D

سینٹرل وقف بورڈ نے پورا عرصہ ۱۶ سال کا رکھا تھا۔ اب ۱۷ سال کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی مرحلہ بندی اس طرح کی جانی چاہیئے کہ سیکولر تعلیمی اداروں سے آمدورفت میں دشواری نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ مدرسہ کو ثانوی ہائی اسکول کے برابر اور عالم کی سند بی اے اور فاضل کی ایم اے کے مساوی تسلیم کی جاسکے۔ ہر مرحلہ کا منصوبہ اس طرح ہو کہ امتحان لے کر سرٹیفکیٹ دے دی جائے۔ اس کا بھی ساتھ ہی اہتمام ہو کہ آئندہ کے مرحلہ کے لئے تسلسل ہو۔ جو مدارس (پرانے قائم شدہ یا نئے) چاہیں اپنے زیر انتظام مکتب یا ثانوی نہ رکھیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ کم سے کم ثانوی کے پانچ سال کا اہتمام بھی کریں۔ عالم کے پانچ سال کے کورس میں داخلہ کی سیکولر اداروں کے ہائی اسکول پاس شدہ ان بچوں کو بھی جو داخلہ کا امتحان لینے کے بعد معیار پر پورے اتریں۔ اجازت ہونی چاہیئے (جس طرح ثانوی کے بعد دینی مدارس سے سیکولر اداروں میں داخلہ کی اجازت ہوگی)۔

یہ بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ ایک طرف عالم کے ۵ سالہ کورس کچھ لوگ ۲ + ۳ میں تبدیل کر سکیں اور کچھ کے لئے عالم و فاضل کا ۷ سالہ (بعد ثانوی) مسلسل کورس ہو۔ اس طرح فاضل کا مرحلہ تخصص (یعنی صرف تفسیر یا حدیث یا فقہ یا تاریخ یا ادب) کا نہ رہ کر علوم دینیہ اور اس کے معاون کے طور پر علوم آلیہ و علوم عصریہ کا مجموعہ ہو۔ اگرچہ اس سات سالہ کورس (بعد ثانوی) میں بھی کچھ لازمی کورسوں کے علاوہ ذوق ورجحان و صلاحیت کے اعتبار

سے اختیاری مضامین بھی ہوں۔

تخصص کا مرحلہ ۲ سال کے پروگرام کے بعد تحقیق (ریسرچ) کے لئے ہو جس پر محقق فی التفسیر (دکتور) وغیرہ کی سند دی جاسکے۔

مرحلہ وار درجہ بندی کے بعد ہم چند پہلوؤں پر سرسری روشنی ڈالتے ہوئے چند کو مرکز بحث بنائیں گے۔

ذریعہ تعلیم کے موزوں ترین زبان اردو / مادری زبان ہے۔ خصوصاً ابتدائی' ثانوی اور عالم کے مراحل پر۔ بعد میں ملکہ پیدا ہو جانے کے بعد عربی کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

..... طریقہ تعلیم میں کافی گنجائش تجربات کرنے کی ہے' یہ کلیہ ذہن نشیں رکھتے ہوئے کہ علم محض طوطے کی طرح رٹنے کا نام نہیں ہے بلکہ آلات علم اور اپنے ذہنی وسائل کے استعمال کی مشق کا نام ہے۔ طریقہ تعلیم وسیع تر موضوع تصور تعلیم کے تحت زیر بحث لایا جائے۔ اس کے لئے تعلیمی نظریات میں جو اہم مباحث نئے زاویوں سے اور اُپج کے ساتھ حال میں اٹھائے گئے ہیں ان سب سے استفادہ کی ضرورت ہے۔

..... یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کس طبقہ و خاندان و رجحان کے طلباء کن مقاصد کے لئے دینی مدارس میں داخلہ لیتے ہیں۔ فراغت کے بعد کن کن کاموں میں مصروف ہوتے ہیں۔ پچھلے بیس پچیس سال کا جائزہ ہی لے لیا جائے تو بہت سی باتوں پر نئی روشنی پڑے گی۔

..... اساتذہ کی تقرری و مشاہرہ اور ترقی کے امکانات پر ایسے ضابطے بنے ہوئے ہوں جن سے باصلاحیت اور تدریسی کام سے مخلصانہ شغف رکھنے والے ہی اداروں میں مقرر ہو سکیں اور انہیں محض نجی رنجشوں یا اختلاف یا رقابت کی وجہ سے برطرف نہ کیا جاسکے' اسی طرح اس کا بھی اہتمام ہو کہ ایک بار تقرری کے بعد ہر طرح کے محاسبہ سے اساتذہ اپنے کو آزاد نہ سمجھ سکیں۔ دیانت و فرض شناسی اور عدل و انصاف کے معیاروں کا چلن جن تعلیمی اداروں میں نہ ہو سکے انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ خود فریبی و خلق فریبی میں مسلسل مصروف رہیں۔

..... سرمایہ و وسائل کے لئے حکومت یا کسی ایجنسی کا محتاج نہ ہونا جو مدارس دینیہ کی آزادی و خود مختاری میں رخنہ اندازی کر سکیں' بہت قابل تعریف ہے جسے حتی الوسع جاری رہنا چاہیے۔ امید ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی و دینی حس مدارس کو کبھی مالی دشواریوں کا شکار نہیں ہونے دے گی۔ لیکن اس امکان کو بالکل خارج نہ کیا جائے کہ اگر یونیورسٹی گرانٹس

کمیشن / کمیٹی جیسے کسی ادارہ کے ذریعہ بغیر بے جا مداخلت و نا معقول شرائط کے، تعلیمی امداد مل سکے تو اسے حاصل کیا جا سکے۔ اس پر مزید گفتگو دوسری شق کے تحت ہو گی۔

ملک کے تعلیمی نظام سے رشتہ اور مدارس کے اپنے دستوری و قانونی مرتبہ و مقام کے تعین کے سلسلے میں مسلمانوں کی قیادت اور تعلیمی ماہرین نے اس امر کی طرف توجہ نہیں دی کہ دستور ہند کی دفعہ ۲۹ اور دفعہ ۳۰ لسانی' تہذیبی و مذہبی اقلیتوں کو جو حقوق دیتی ہیں اور ان خصوصی حقوق کا جو جواز ہے۔ ان پر دینی مدارس بھرپور پورے اترتے ہیں یعنی اپنے مذہب / ثقافت / یا رسم الخط کا تحفظ اور دوسرے اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کرنا۔ ان دونوں کسوٹیوں پر اقلیتوں کے قائم کردہ ہائی اسکول انٹر کالج یا ڈگری کالج ہی نہیں بلکہ دینی مدارس بھی پورے اترتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سارے دینی مدارس کو دستور کی ان دفعات کے تحت تسلیم کرایا جائے۔ اگرچہ اس کے لئے مالی امداد لینا ضروری نہیں ہے۔ سردست بہتر ہے کہ مالی امداد کے بغیر صرف تسلیم کرایا جائے۔ تسلیم کئے جانے کا فائدہ یہ ہو گا کہ ان مدارس کی سندیں و سرٹیفکیٹس ہائی اسکول' انٹر' بی اے اور ایم اے کے مساوی (بہ شرط اطمینان معیار) تسلیم کی جا سکیں گی۔ معیار کے تعین کے لئے نصاب کا سرکاری ہونا ضروری نہیں بلکہ جو مضامین بھی پڑھائے جا رہے ہیں ان کی سطح اور ان کا معیار دیکھا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث و فقہ کے علاوہ نصاب میں علوم جدیدہ کے عناصر اور انگریزی زبان اور ابتدائی مراحل میں ہندی' سائنس' جغرافیہ وغیرہ کے مضامین ہونے سے ان مدارس کی سندوں کے تسلیم کئے جانے میں دشواری نہیں ہونی چاہیئے۔ اس طرح جو سہولت عربی مدارس کے فارغین کو اب چند یونیورسٹیوں میں حاصل ہے وہ ملک کے ہر کالج و یونیورسٹی سے تال میل کی شکل میں حاصل ہو جائے گی و نیز جن ملازمتوں کے لئے ڈگری کی شرط ہے' اسے پورا کرنے کے لئے مدارس کے علماء و فضلا کو مزید امتحان پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔

اس سلسلہ میں جہاں یہ بات توجہ چاہتی ہے کہ پارلیمانی یا اسمبلیوں کے عمل (ایکٹ) (Act) کے ذریعے دینی مدارس کی ڈگریاں تسلیم کرائی جائیں وہیں اس رجحان کو بھی تقویت دینے کی ضرورت ہے کہ ساری ملازمتوں کا رشتہ ڈگریوں سے لازماً جڑا نہ رہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے جائزہ کے لئے جو کمیٹی اس وقت کام کر رہی ہے اس کے سربراہ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس سے تعلیمی ادارے واقعی لیاقت پیدا کریں گے تاکہ ڈگری کے کاغذ کے

بجائے اس کی اندرونی قدرت کے ذریعے اس کی شناخت ہو۔ دونوں کاموں کے لئے مسائل ملک و ملت و تعلیم کے مفاد کے پیش نظر منصف مزاج و روشن دماغ ابنائے وطن کے ساتھ مل کر کرنے کی ضرورت ہے۔

ان مدارس کو ملک کے دستور کے تحت تعلیمی نظام کے شاہراہ کا حصہ بننے سے سارے اعلیٰ تعلیمی اداروں اور یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی / کمیشن سے باہمی تعامل ممکن ہو سکے گا۔ جس کی وجہ سے سیمیناروں میں شرکت' توسیعی خطبات' تحقیقی کاموں کے لئے استفادہ اور ایسی ہی دیگر سہولتیں دستیاب ہوں گی جن سے اپنی مرضی کے مطابق واقعی موزونیت کا فیصلہ کر کے استفادہ کیا جا سکے گا۔ اسی ضمن میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ملک کے ہر خطے میں ایک ایک یونیورسٹی ایسی ہو جو دینی علوم کی فیکلٹیوں کے ساتھ علوم جدیدہ کی فیکلٹیاں بھی رکھتی ہوں جیسا کہ جامعۃ الازہر میں ہے اور جس کی سفارش ۷۷ء کی جدہ تعلیمی کانفرنس نے بھی کی ہے۔ جامعہ ہمدرد دلی اپنی توسیع ان لائنوں پر کر سکتی ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بیدار مغز و روشن ذہن لوگ بھی اس تجویز پر توجہ دے سکتے ہیں۔ ورنہ عالم اسلام کے وسائل سے اس طرح کی دو ورنہ ایک جامعہ دلی یا حیدر آباد / بنگلور میں قائم کی جا سکتی ہے۔

اس طرح کی یونیورسٹی سے جو فوائد پیش نظر ہیں وہ یہ ہیں کہ اسلامی دینی علوم اور علوم جدیدہ کے شعبہ جات ایک ہی احاطہ (کیمپس) میں واقع ہونے اور ایک دوسرے شعبوں سے اختیاری و لازمی کورسوں کا پڑھنا اور دیگر نوعیتوں کے باہمی تعامل سے ایک طرف زیادہ بیدار مغز علماء پیدا ہو سکیں گے تو دوسری طرف مسلم ماہرین معاشیات' سیاسیات و سماجیات' نفسیات' اسلام اور اس کے نظام اقدار سے بہرہ مند ہوتے رہیں گے۔ یہ یونیورسٹی / یونیورسٹیاں دوسرے دینی مدارس کے لئے علوم جدیدہ کے متعلق بامعنی حصوں پر مشتمل عالم و فاضل کے درجات کے لئے کورسز اور کتابیں اور دیگر وسائل کی تیاری اور موزوں اساتذہ کی فراہمی میں مدد دے سکیں گی۔

نصاب تعلیم اور مواد تعلیم (کتب و متون وغیرہ) ہماری دینی تعلیم کی تاریخ میں سب سے زیادہ نزاعی اور اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ فلسفہ کی ضرورت و عدم ضرورت اس کے لئے قدیم یا جدید کی بحث' علوم کلام' علم مناظرہ کی ضرورت و عدم ضرورت اور ضرورت کے ساتھ موزونیت...... ریاضی و ہیئت کی از کار رفتگی' علوم جدیدہ کی ضرورت' انگریزی کی ضرورت'

سائنس کی واقفیت' خود دینی علوم میں قرآن و حدیث و فقہ کا انتخاب اور اصول انتخاب' ان کا تناسب (مثلاً حدیث پر گھٹتی بڑھتی توجہ)۔

کریکیولم اور نصاب اور اس کے تحت تعلیمی مواد بہ شکل کتب و اسباق' و نیز طریقہ تعلیم و طریقہ امتحان سب تصور علم اور تصور تعلیم اور مقاصد تعلیم کے پابند ہوتے ہیں۔ اس لئے نصاب میں اصلاح کی بحث اسی دائرہ میں نتیجہ خیز ہو گی جس کا اوپر مقاصد تعلیم میں ہم نے احاطہ کیا۔

ایک ماڈل (نقشہ) وہ ہے جس پر جدید علوم و فنون اور دینی علوم دونوں کی فیکلٹیاں جدا جدا بھی اور زندگی و علم کے باہمی رشتے میں منسلک تعلیم کا انتظام ایک احاطہ یونیورسٹی میں کرے۔ اس کے لئے نصاب کی تجویز سردست موقوف رکھی جائے۔

دوسرا نقشہ موجودہ دینی مدارس کا ہو سکتا ہے جس سے وہ اپنے بنیادی کردار و ڈھانچہ کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مقاصد علمی و تعلیمی کی تکمیل بہتر طور سے کر سکیں۔ اس ماڈل کی اصلاح شدہ صورت تجویز کرتے وقت سارے مجوزوں کے پیشِ نظر یہ بات رہنی چاہیئے کہ یہ مدارس اسلامی علوم میں اسی طرح تخصیص کا کام کرتے ہیں جس طرح یونیورسٹیوں میں سماجی علوم' فزیکل سائنس (طبعی علوم) یا میڈیکل و طب اور انجینئرنگ کی فیکلٹیاں یا زبان و ادب و فلسفہ کے شعبہ جات اپنے مضمون کی تعلیم کے ذمہ دار ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ ادب کے طالب علم کے لئے جدید فلسفہ و نظریات اور کسی حد تک تہذیبی و علمی پس منظر یا تاریخ وغیرہ کا علم ضروری سمجھا جائے تاکہ ادب خصوصاً جدید ادب کا فہم اور اس میں بصیرت پیدا ہو سکے۔ لیکن یہ کہنا کہ انگریزی یا فارسی ادب کے ایم اے کے طالب علم کیمیا و طبیعات و حیوانیات بھی پڑھیں یا ٹائپنگ سیکھیں (یا موم بتی بنانا سیکھیں) تاکہ سائنس کا فہم اور روزگار کا حصول ممکن ہو۔ یہ غلط مبحث کے علاوہ سوقیانہ فکر کا نتیجہ ہے۔

ہمارے خیال میں روزگار کے مسئلے سے اعلیٰ دینی تعلیم کو جوڑنے کے جائز حدود و خطوط کی نشاندہی مضمون کے اس حصے میں کر دی گئی ہے جو ذیلی و ضمنی مقاصد تعلیم کے ضمن میں ذرائع ابلاغ' صحافت' کتب خانوں' چھاپہ خانوں اور نچلی سطح پر دفتری نظم' ٹائپنگ اور کمپیوٹر وغیرہ سے متعلق ہیں۔ نیز ملازمتوں اور ڈگریوں کے درمیان عقد کو فسخ کرنے کی مہم کو تقویت دینے اور مدارس اور آئندہ مجوزہ اسلامی یونیورسٹیوں کو دستور ہند کے تحت تسلیم

کرائے جانے........ان سب سے غرض یہی ہے کہ یہ ادارے علمی شاہراہ کا حصہ بھی بنیں اور نیز ملازمتوں کے لئے بھی ان کے موانع دور ہوں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ علوم جدیدہ میں کون سے علوم اور مضامین ایسے ہیں جو خود ان اداروں کے مقاصد یعنی اسلام کے فہم' تعبیر' ترجمانی' تشریح میں اور اسلامی ہدایات کی بدلتے ہوئے حالات میں تطبیق کے لئے ضروری ہیں اور کن کن موضوعات سے مزید ان کاموں میں مدد ملنے کی توقع ہے۔

انگریزی زبان کی اہمیت کا احساس شبلی سے آج تک اسی لئے رہا ہے کہ اس زبان میں ہر طرح کا لٹریچر ہمیں ملتا ہے جس سے استفادہ کرنا طلباء اسلام کے لئے ضروری ہے۔ انگریزی سیکھنے کی ایک اسکیم تو یہ ہو سکتی ہے کہ ابتدائی درجات سے ہی اس سے شناسائی ہوتی رہے اور ثانوی میں ہائی اسکول کا معیار اور اسی تدریج سے بڑھتی جائے۔ دوسری اسکیم یہ ممکن ہے کہ اسے ثانوی و عالم کے لئے اختیاری مضمون اور فاضل و تحقیق کے لئے لازمی بناکر Intensive ٹریننگ دے دی جائے۔ انگریزی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں و جرائد کو پڑھ کر اس کا مفہوم سمجھ لینا۔ یہ وہ ملکہ ہے جو ہمارے فضلاء و محققین کو درکار ہے۔ اس کے لئے اگر طالب علم میں داعیہ اور طلب صادق (Motivation) ہے تو تھوڑے عرصے میں بولنے یا لکھنے کی قدرت تو نہیں لیکن ہر طرح کے مطبوعہ مواد کو پڑھنے کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ انگریزی کی تعلیم کا جن مدارس میں انتظام ہوا وہاں کوئی مفید نتیجہ اس لئے برآمد نہیں ہو سکا کہ باصلاحیت اساتذہ ان اداروں میں ملازمت پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ دوسرے انگریزی زبان کا طریقہ تعلیم جب کالجوں اور یونیورسٹیوں کا اتنا ناقص ہے کہ چھ ماہ کا کام چھ سال میں بھی نہ ہو سکے اور ایم اے کے طلباء صحیح انگریزی لکھ بول نہ سکیں تو مدارس عربیہ کا کیا کہنا۔

جنرل سائنس کی تعلیم کا انتظام عموماً مکاتب میں اور ثانوی درجات میں ہے جہاں نہ ہو وہاں کر دیا جائے تاکہ جنرل سائنس کی تعلیم اور ریاضی و سوشل اسٹیڈیز کی تعلیم عام تعلیمی اداروں کی طرح یہاں بھی ہو جائے۔ (اغلب یہ ہے کہ سوشل اسٹیڈیز خصوصاً تاریخ کے حصے کے لئے کتاب کی تیاری خود کرانی ہوگی)۔ عربی کے درجات یعنی عالمیت و فاضلیت کے لئے طبیعیات و کیمیا اور ریاضی یا حیاتیات کی تعلیم کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ یہ بتلانے کی کہ بجلی کیسے بنتی ہے نہ اس کی کہ مادہ کی ساخت کیا ہے....... ان موضوعات و

مضامین پر عام سائنس کے علاوہ حسب ذوق ورجحان اخبار ورسائل 'ریڈیو' ٹیلی وژن کی مدد سے آج کے عام شہریوں کی طرح ہمارے دینی مدارس کے فارغ التحصیل بھی اپنے علم میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ البتہ فلسفہ' سائنس و طریقہ سائنس (Philosophy of Science and Scientific Method) اور کسی حد تک تاریخ سائنس خصوصاً سائنس و مذہب اور معاشرہ و تہذیب پر سائنس کے اثرات ایسے موضوعات ہیں جن سے واقفیت دور جدید کو سمجھنے کے لئے و نیز اسلام و تہذیب حاضر کے تصادم سے پیدا شدہ بہت سے مسائل کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہیں۔

اسی طرح قدیم یا جدید فلسفہ و منطق سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ یورپ کے نشاۃ الثانیہ سے تاحال تقریباً پانچ سو سال کے عرصہ کا جو ذہنی سفر ہے ان سے شناسائی کے ذریعے جدید تہذیب میں بصیرت پیدا کی جائے۔ اسی کے بطن سے فرد کی آزادی' قوم پروری' سائنسی انقلاب' صنعتی انقلاب' مادی ترقی کے وسائل' انسانیت دوستی' لبرازل' سرمایہ داری' سوشلزم' فرانسیسی انقلاب' امریکن اعلان آزادی' جمہوریت اور عدل و مساوات و آزادی کی نت نئی شکلیں وجود میں آتی رہی ہیں۔ ان سے آشنائی اور ان کا فہم نہ ہونے کی وجہ سے ان مسائل سے کماحقہ 'نبرد آزما ہونے کے بجائے ہمارے علماء و فضلاء کو پورا مغرب یکسر باطل نظر آتا ہے جو ہمارے خلاف سازشوں میں مبتلا ہے۔ یہ تہذیب جن سیاسی' معاشی اور تہذیبی اداروں کے ذریعے اپنی تکمیل میں مصروف ہے۔ ان کی زد سے مشرق و مغرب کا کوئی گوشہ آزاد نہیں۔ اس لئے آبادی کا مسئلہ ہو یا ووٹوں کا' انشورنس کا ہو یا فرد کی آزادی کے حدود اور ریاست کے حدود کار کا' عدل و مساوات کے مفاہیم اور ان کے توسیع شدہ مضمرات ہوں یا عورتوں اور مستضعفین کے حقوق کا' معیار زندگی کا مسئلہ ہو یا ریاست کے شہریوں کی فلاح کی ذمہ داریوں کا قانون کی بالادستی کا مسئلہ ہو یا جنگ و جہاد کے لئے نئے آلات حرب میں جواز وعدم جواز کا........ یہ اور اس جیسے سیکڑوں مسائل در مسائل ہیں جن کے اسلامی حل تلاش کرنے کی علماء پر اپنے اپنے حلقہ اثر میں عوام کی ہدایت کے لئے ذمہ داری ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی اور اس کی جدید سماجی و سیاسی و معاشی تنظیم سے ناواقفیت کے باوجود علماء فرداً فرداً اور اجتماعی گروہ کی شکل میں ایک غیر مری کلیسا کے مقام سے بے باکانہ آراء و فتاویٰ کا اظہار و اعلان کرتے ہیں اور خلق خدا کو سانست میں مبتلا کرتے ہیں۔ اجتہاد تو دور کی چیز ہے 'ترجیح

وتدریج اور تطبیق اور مقاصد اعلیٰ سے ذیلی مقاصد کا استنباط...... اس کی بھی صلاحیت بہت نایاب ہے۔

موجودہ سیاسی عمل اور جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کے مسئلہ کو صحیح طور سے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہندوستان کی ایک اسلامی جماعت تقریباً ۴۵ سال تک مسلمانوں خصوصاً اپنے ارکان کا پارلیمنٹ واسمبلیوں میں ووٹ دینا دینی اعتبار سے ناجائز قرار دیتی رہی...... اور اسی تحریک کے اخبار میں عرصہ دراز تک ہر نوع کی مانع حمل تدبیر کے لئے "نسل کشی" کی سرخی لگائی جاتی رہی۔ انشورنس کو بھی علماء عموماً الی الاطلاق (سودی کاروبار میں ملوث ہونے نہ ہونے دونوں صورتوں میں) ناجائز قرار دیتے رہے۔

ان چند منتشر مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دوران تعلیم اگر دینی درس گاہوں کے طلباء ان سارے مسائل کی کنہہ اور ان کے تاریخی و تہذیبی پس منظر سے کماحقہ واقف ہو جائیں تو اسلامی ہدایت ورہنمائی کے کام کو بہتر طور سے انجام دے سکیں گے ورنہ وہ ہوگا جو ہو رہا ہے یعنی یا تو اسلام کو زندگی سے بے دخل کر کے سمجھایا جارہا ہے کہ ہر طرح کا کاروباری سود' سٹہ اور احتکار (خصوصاً غیر اسلامی ملک میں) جائز ہے یا پھر سوکھی زمین کی آبیاری و فصل کاری کے لئے سرکاری مدد دو فیصد سود پر لینے سے ان غریب کسانوں کو روکا جارہاہے کہ سود حرام ہے۔

دینی مدارس کے طلباء اسلام کے علم کے ساتھ جدید زندگی اور اس کے نت نئے مسائل کے پس منظر اور تناظر سے پوری طرح واقف ہو کر نکلیں گے تو ملک میں بامعنی اور حقیقت پسند اسلامی آراء کی پرداخت کے لئے موزوں فضا پیدا ہو گی۔

یہ ہے جواز دینی درس گاہوں کے نظام تعلیم میں جدید علوم کے مندرجہ ذیل عناصر کی مناسب وبتدریج شمولیت کا :

(۱) مغرب میں نشاۃ الثانیہ سے بیسویں صدی تک فکر کا ارتقا...... اس کے تحت ذیلی موضوعات۔

(۲) حکومت وسیاسیات (سیاسی فکر کا ارتقاء' دستورات عالم' دستور ہند)

(۳) معاشی نظام........ ہندوستانی منصوبہ بندی۔

(۴) آبادی کا مسئلہ' عالمی تناظر میں' ہندوستان میں۔

(۵) حقوق انسانی کی تحریک۔

(۶) عدل' مساوات اور آزادی...... تاریخی اور جدید پس منظر میں

(۷) جنگ و امن آج کی دنیا میں.... موجودہ آلات حرب جوہری کیمیاوی و حیاتیاتی۔

(۸) فلسفہ جدید و نفسیات۔

(۹) سائنسی طریقہ کار

(۱۰) فلسفہ سائنس

(۱۱) سائنس اور سوسائٹی.....دور بہ دور

(۱۲) صنعتی انقلاب اور اس کے اثرات تا حال۔

فلسفہ و حکمت اور منطق جدید ہو یا قدیم اس کے بارے میں راقم کی یہ رائے رہی ہے کہ ذوق و رجحان نہ ہو تو ان کی تعلیم بے سود یا مضر ہوتی ہے اس لئے اختیاری رکھا جائے۔ یہی حال معاشیات کے زیادہ پر پیچ مسائل کا ہے کہ کچھ کے اندر اس کی دل چسپی قطعی نہیں ہو گی۔ اس لئے ان مسائل اور ان پہلوؤں سے سب کو واقف کرا دیا جائے جن کا اسلامی ہدایت سے تعلق ہو باقی اختیاری رکھا جائے۔

جو مضامین یا موضوعات اوپر لکھے گئے ہیں ان میں اضافہ و ترمیم کیا جا سکتا ہے۔ راقم کو خوشی ہے کہ سینٹرل وقف بورڈ نے بیشتر ایسے ہی علوم و مضامین کو جگہ دی ہے جن کی نشاندہی یہاں کی گئی ہے۔ جدید سائنس نے جو ذہنی دنیا بنائی ہے اور اسلامی عقیدے سے مطابقت کے جو کلامی مسائل ان سے پیدا ہوتے ہیں ان کو اس کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اختیاری بنایا جائے۔

سوال یہ ہے کہ ان مضامین و موضوعات میں بصیرت کے ساتھ واقفیت کا اہتمام دینی مدارس میں کیسے کیا جائے۔ مجوزہ اسلامی یونیورسٹی (نئی جامعہ ہمدرد یا ندوہ وغیرہ میں سے کوئی ایک) میں آسانی یہ ہو گی کہ کلیہ شریعت و علوم الدین کے علاوہ سماجی علوم و نشریات و فنون کی فیکلٹیاں ہوں گی۔ ان فیکلٹیوں کے سپرد اس طرح کے مخلوط کورس کی تیاری اور ان کی درجہ بندی کا کام ہو گا (جس طرح کلیہ شریعت ان علوم جدیدہ کے طلباء کے لئے دینی کورسز کا انتظام کریں گی) کتابوں اور درسی و غیر درسی کتب کی تیاری بھی وہ کر سکے گی۔ مروجہ دینی درس گاہوں میں الگ الگ یہ انتظام کہ ایک استاذ انگریزی کا ایک معاشیات کا رکھ لیا (جو بہت

اہل نہیں ہوں گے) اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے تدریسی مواد (Teaching Material) جو بنا بنایا مشکل سے یکجا ملے گا۔ اخذ و انتخاب اور نئی تصنیف و تالیف کے ذریعہ اردو میں فراہم کرنا ہوگا۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے کہ کس طرح یہ مراحل و مدارج عالم و فاضل کے سات برسوں میں اسے تقسیم کیا جائے تاکہ ان کی تحصیل بامعنی ہو سکے۔ ان مضامین کے لئے ذریعہ تعلیم اور مواد تعلیم کے لئے زبان اردو ہی ہونی چاہیئے۔ اس طرح کے تدریسی مواد کی تیاری کا کام (علاوہ دیگر کاموں کے) راقم کی تجویز پر مسلم یونیورسٹی میں دوڈھائی سال سے قائم شدہ سینٹر برائے ترقی تعلیم و ثقافت مسلمانان ہند کے سپرد کرنے کا فیصلہ کرایا تھا..... یہ سینٹر کوئی قابل ذکر کام ابھی تک نہیں کر سکا ہے۔ اسے فعال بنا کر اس سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ دینی مدارس اپنے کسی اجتماعی فیصلہ سے بھی یہ اسکیم کچھ باصلاحیت اساتذہ کی کمیٹی کے سپرد کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصر میں اور دیگر اسلامی ممالک میں عربی میں جو تدریسی مواد تیار اور استعمال ہو تا رہا ہے۔ اس سے بھی مدد لینے کی ضرورت ہے۔

ان مضامین کے لئے اساتذہ کی تقرری کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔ قلیل مشاہرہ وبے حیثیتی و ترقی کے مواقع کی کمی باصلاحیت و تجربہ کار اساتذہ کی تقرری میں مانع ہو گی جو ہو سکے کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ریٹائر شدہ اساتذہ کی خدمات ایک ماہ سے ایک سیشن تک کی) حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

مندرجہ بالا مضامین و موضوعات میں سے کماحقہ سب نصاب میں شامل نہیں کئے جا سکیں گے۔ نصابی تعلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ ان موضوعات پر سلسلہ تقاریر' توسیعی خطبات' مذاکرے وغیرہ کے لئے یونیورسٹیوں و کالجوں سے اساتذہ ایک اسکیم کے تحت بلائے جاتے رہیں اور طلباء تعطیل یا سیشن کے دوران کچھ عرصہ کے لئے کسی یونیورسٹی یا کالج جا کر اسپیشل کورسز (جو اسی غرض سے تیار کئے جائیں گے میں حاضری دیں)۔

اخبارات و رسائل اور ریڈیو وٹی وی اور کیسٹ کے ذرائع ان حالات میں بہت مفید ہوں گے۔ (یہ ذرائع ابلاغ ہر دینی مدرسہ میں موجود ہوں جن کا استعمال صرف تعلیمی مقاصد کے لئے کیا جائے)۔

پرانے نصاب میں منطق و حکمت کے نام سے اور خاص حد تک کلام اور مناظرہ کے

عنوان سے جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں انہیں حذف کر دیا جائے یا تبدیل کر کے جدید عناصر شامل کر کے اختیاری بنا دیا جائے۔

قرآن کو اسلامی علوم میں مرکزی حیثیت دی جائے اس کے تحت حدیث کو اور سیرت طیبہ کو قرآن کے انتخاب میں کچھ حصے موضوعات و مضامین کے اعتبار سے رکھے جائیں تو اس کی تعلیم زیادہ با معنی ہو سکے گی اور نظر پیدا ہو سکے گی۔ مثلاً قرآن کا تصور الٰہ' تصور انسان' قرآن میں خیر و شر کی حقیقت' عبد و معبود کا رشتہ' قرآن اور علم' صلاح و فلاح و سعادت قرآن کی روشنی میں۔ انہیں موضوعات میں احادیث بھی شامل کر لی جائیں۔

تحقیق (۷ سالہ عالم و فاضل کے مشترکہ کورس کے بعد) کا مرحلہ تخصیص کا ہو گا جس میں کلامی مباحث' ادیان کا تقابلی مطالعہ (سید سلیمان ندوی کا تجویز کردہ) مستشرقین اور اسلام' مسلم مفکرین کی جدید اسلامی تعبیریں' تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کے علاوہ تفسیر' حدیث اور فقہ کے مسائل کے موضوعات تحقیقی بنائے جا سکتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کی طرح ان مدارس میں بھی طریقہ تحقیق کے لئے ہر محقق کو کچھ کورسز لازماً پڑھائے جائیں تاکہ آلات و وسائل تحقیق سے بہرہ مند و مستفید ہونے کی صلاحیت پیدا ہو۔

## (حوالہ جات و حواشی)

۱۔ مولانا مناظر احسن گیلانی : اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم
علامہ شبلی نعمانی : مقالات شبلی جلد سوم (تعلیمی) ص ۹۱ تا ۱۰۱' ۱۰۲ تا ۱۲۵۔ دارالمصنفین' اعظم گڑھ' ۱۹۳۲ء

۲۔ مشیر الحق : اسلام ان سیکولر انڈیا' انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی' شملہ' ۱۹۷۲ء

۳۔ مشیر الحق : ایضاً ص ۲۶

۴۔ شبلی نعمانی : مقالات جلد سوم ص ۱۲۶ تا ۱۳۳' ص ۱۳۸ تا ۱۴۴' ص ۱۵ تا ۱۶۳

۵۔ مولانا ابو الکلام آزاد : خطبات آزاد' ساہتیہ اکاڈمی' نئی دہلی' ۱۹۸۵ء' ص ۳۰۱ تا

۶۔ ایضاً ایضاً

۷۔ تبرکات آزاد' مرتبہ غلام رسول مہر' عثمانیہ بک ڈپو' حیدر آباد' ۱۹۵۹ء

خط بنام سید سلیمان ندوی ص ۱۳۲ تا ۱۴۳۔

۸۔ (i) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ۱۹۲۴ء میں ایک نوٹ بہ حیثیت سیکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علامہ اقبال کے پاس رائے کے لئے بھیجا' جس کا جواب اقبال نے خط کی شکل میں لکھا۔ اصل انگریزی متن کے لئے ملاحظہ ہو Thoughts and Reflection of Iqbal مرتبہ سید عبدالواحد (شیخ محمد اشرف لاہور' ۱۹۷۳ء ص ۱۰۳ تا ۱۰۹ اور دو ترجمہ اقبال نامہ حصہ دوم۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں شامل ہے)۔

(ii) ۱۹۶۳ء میں مسلم یونیورسٹی نے ۷ افراد کی ایک کمیٹی بنائی جو "تمام صورت حال کا جائزہ لے اور دینیات اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لئے ایسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کرے جو ضروریات زمانہ سے مناسبت رکھتے ہوں اور جن سے اسلامی تعلیمات کو زیادہ اطمینان بخش طریق پر پیش کیا جاسکے۔"

مولانا مودودی نے اس تعلق سے دو مضامین "ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقص" اور "مسلمانوں کے لئے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل" مسلم یونیورسٹی کورٹ کے سوالات کے جواب کے طور پر لکھے لیکن اس کا خطاب عمومی ہے۔ ملاحظہ کیجئے "تعلیمات" مکتب جماعت اسلامی (ہند) ۱۹۵۰ء ص ۷ تا ۵۰۔ اسی کتابچہ "تعلیمات" میں مولانا مودودی کا ایک مضمون "نیا نظام تعلیم" شامل ہے جو ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو ندوہ لکھنو کی انجمن اتحاد طلباء کے سامنے پڑھا گیا۔

۹۔ محمد اخلاق احمد Traditional Education among muslims مسلمانوں میں قدیم طرز تعلیم۔ ضمیمہ دوم۔ ص ۱۹۶ تا ۲۱۲' دہلی ۱۹۸۵ء

۱۰۔ ایضاً۔ ص ۱۸۵ تا ۱۹۵۔

# عربی و دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری تقاضے

مولانا حبیب ریحان ندوی
(تاج المساجد' بھوپال)

## عربی و دینی تعلیم کا بُعد زمانی و مکانی

عربی زبان اور دینی تعلیم کا بُعد زمانی۔ اگر عربی زبان کی حقیقی تعلیم کو اسلام کے بعد ہی سے متعین کر لیں تو...... کم از کم چودہ سو سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے اور جس کا بُعد مکانی چالیس ہزار کلو میٹر کے قطر (کرہٗ) ارضی پر محیط ہو اس کا احاطہ تو کیا مختصر سا خلاصہ بھی چالیس منٹ میں ممکن نہیں تو پھر چھ منٹ یا چودہ منٹ کے مختصر وقفہ میں چند ناتمام گزارشات ہی کی جا سکتی ہیں کوئی ایسی منظم و محکم تجویز پیش نہیں کی جا سکتی جس سے شش جہت روشن و منور ہو جائے۔

## اسلام علوم انسانی کا محافظ

سب سے پہلے اس بے نقاب حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ اسلام علم کا محافظ ہے اور اس نے نفس انسانی اور کائنات و آفاق کے تمام علوم کے حصول پر زور دیا ہے اس کے برعکس اسلام کو علم دشمن ثابت کرنا مغرب کے سامراجی و سامرائی پروپیگنڈہ اور الزام تراشی کا واضح نمونہ ہے۔

اسلام کی کتاب ہدایت قرآن پاک اور اس کی تشریح و تفسیر یعنی نطق رسالت واسوۂ نبوی ﷺ میں علوم کی اہمیت اور فضیلت کی بے شمار ہدایتیں موجود ہیں اور سب سے پہلی آیت جو اتاری گئی اس میں قرأت' کتابت اور علم و قلم کا تذکرہ چھ بار کیا جانا ایک لاریب حقیقت ہے۔

## علم تکریم انسانی کا سب سے بڑا مظہر

علم تکریم انسانی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور اس حقیقت کو کلام پاک نے اس طرح واشگاف کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو تعلیم اسماء کی فضیلت بخش کر خدا نے فرشتوں سے برملا اس حقیقت کا اعتراف کرایا کہ آدم علیہ السلام تقویٰ و خشیت، تسبیح و تمجید و تقدیس کے ساتھ ساتھ تعلیم اسماء کے زیور سے سنوارا گیا ہے اور آیت میں لفظ ''کلہا'' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام اسماء واعیان وصفات کا علم خمیر آدم میں رکھا گیا تھا اور اب بنی نوع آدم خدا کے پیدا کئے ہوئے مواد یعنی حرارت، روشنی، معادن، گریوٹی، ایٹم اور تمام سائنسی اکتشافات کے ذریعے اور خدا کے بخشے ہوئے ذہن و دماغ سے اسرار کائنات کا جو علم بھی حاصل کرے گا وہ تکریم نسل انسانی کا مظہر اتم ہوگا اور خدا کی کبریائی و قدرت کے لئے وہ چیلنج نہ ہوگا بلکہ اس کی ابدی اور لازوال نعمتوں، بخششوں اور رحمتوں کا نمونہ اور اس کی بے پناہ تخلیقی قوتوں کا کرشمہ و سرچشمہ ہوگا۔

## علم کے ہر میدان میں سبقت

جو شخص مسلمانوں کی ثقافتی و تمدنی و علمی تاریخ سے سرسری طور پہ بھی واقف ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ اگرچہ تعصب کی وجہ سے بعض وقت اس کا اظہار نہ کرے کہ عصور اسلامیہ میں علوم دینیہ کے علاوہ تمام انسانی و سائنسی و صنعتی علوم نے محیر العقول ترقی کی تھی صرف مثال کے طور پر فلکیات، زمین کی پیمائش، جغرافیہ و تاریخ، ریاضیات وہندسہ واقلیدس، فلسفہ و منطق، طب، علم تشریح الاجسام، علم نبات و حیوان، علم معادن و علم طبقات الارض وغیرہ پر اتنے مفصل کام ایسے ہیں کہ عصر حاضر کی علمی و سائنسی ترقی ان کی رہین منت ہے اور عصور اسلامیہ میں کبھی بھی علماء و حکمائے اسلام نے زمانے کی ترقی اور تقاضوں سے آنکھیں بند نہیں کی ہیں، بغداد میں جب گھڑیاں بنتی تھیں اور سینکڑوں شیشہ کے کارخانے تھے اس وقت یورپ بھوت پریت کے قصوں اور عفاریت کی کہانیوں میں مست تھا، اور جس وقت قرطبہ کی روشنیاں بیس میل دور سے دکھائی دیتی تھیں اور رات کی تاریکی میں روشنی کا مینارہ بنی ہوئی تھیں اس وقت یورپ میں ٹمٹماتے دیئے بھی عشاء کے وقت اقتصادی بدحالی کی وجہ سے بجھ جاتے تھے اور جب قرطبہ کے لوگ نلوں کی ٹونٹیوں سے صاف و شفاف پانی پیتے

تھے اس وقت یورپ کے باشندے گندے پانی کی وافر مقدار سے محروم تھے اور پادریوں کی عجیب و غریب تعلیم نے انہیں صدیوں تک نہانے سے بھی روک دیا تھا اور ان کے جسم پر گندگی کی تہیں جمی ہوئی تھیں پیدائش کے بعد پادری کے ذریعہ بپتیسہ لینا اور مرنے کے بعد پادری کے ذریعہ جسم پر پانی ڈالنا دینداری کی سب سے بڑی علامت تھی۔ جس کا مظہر آخری صدیوں تک فرانس میں یہ رہا کہ چودھویں لوی نے پوپ سے صلح اور توبہ کے بعد جب قصر و رسائی بنایا تو اس میں سینکڑوں کمرے ہیں لیکن اسے اس بات پر فخر ہے کہ اس محل میں کوئی غسل خانہ نہیں ہے اور اس طرح اس نے پوپ کی رضامندی حاصل کی ہے۔

## ہر علم خدا کا مطیع

علمائے اسلام نے ہر زمانے میں علم و فن کو خدا کا مطیع بنا کر خدا کی مخلوق کے فائدے کے لئے استعمال کیا ہے اور اس کے مضر اور منفی پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے اس کے نقصانات سے انسانیت کو بچایا ہے اور اس کی مفید اور ایجابی قدروں کی حفاظت کی ہے اور انسانی نسلوں تک اس کو پہنچایا ہے۔ (یہ موضوع بہت طویل ہے یہاں زیادہ کی گنجائش نہیں ہے)۔

## دین و دنیا کی تفریق نہیں

اسلامی عصور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دین و دنیا کی تفریق نہیں تھی اور تمام علوم کو دین کا خادم سمجھا جاتا تھا' اسلام کی عملی زندگی میں دنیا کی تمام ضرورتوں کو حلال طریقوں پر پورا کرنے کا نام دین ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی' رہبانیت' عزلت گزینی کی تعلیم اسلامی تعلیم نہیں ہے۔

## علم بلا تفریق مذہب و ملت

دوسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ علم بلا تفریق ملت و مذہب تقسیم کیا جاتا تھا' اسپین کے اسلامی مدرسے ایسے علمی مراکز تھے جہاں سے سب ہی طلباء کسب فیض کرتے تھے پوپ سلوستر دوم جامع قرطبہ کا فارغ التحصیل طالب علم تھا اور پوپ بننے کے بعد اس نے اٹلی میں عربی علوم کے متعدد مدرسے قائم کئے جو آگے چل کر اٹلی کی علمی ترقی کا باعث ہوئے۔ عروج ترقی کے اس زریں دور کو دیکھئے اور ادبار و تنزل کے زیر سایہ آج یہ حال ہے کہ

مسلمانوں کے مختلف مکتب ہائے فکر و نظر کے داخلے ایک دوسرے کی مسجدوں میں بند ہیں تو پھر مدرسوں میں کیسے ممکن ہو سکتے ہیں؟

## علم ہوا اور روشنی کی طرح مفت

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ علم کو سوسائٹی کی ایسی ضرورت سمجھا جاتا تھا جیسے کھانا پینا اور اس کے لئے ایسی آسانیاں اور سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس لئے داخلے اور تعلیم کی کوئی فیس نہیں تھی۔ آج بھی دینی مدرسوں میں کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ قیام و طعام کا انتظام بھی کیا جاتا ہے اس کے لئے عہد اسلامی میں آج کے ترقی یافتہ زمانہ کی طرح ایسے پرائیویٹ اسکولوں کی ضرورت نہیں تھی جن کا مقصد وجود پیسہ بٹورنا ہوتا ہے اور ان سے متعدد اخلاقی و اجتماعی و اقتصادی خرابیاں رونما ہوتی ہیں اور سرکاری اسکولوں کا معیار تعلیم پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

## تعلیم گاہ کا دروازہ بند نہیں تھا

چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ کسی طالب علم کے لئے مدرسہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا تھا کیونکہ تعلیم مسجدوں میں ہوتی تھی' مسجد بیک وقت عبادت گاہ بھی تھی' تربیت گاہ بھی اور اچھے انسان ڈھالنے کی کارگاہ اور علم و عمل کی شاہراہ بھی تھی۔ بڑی مسجدوں کو جامع کہا جاتا تھا اور جس دن سے جامع (مسجد) سے نکل کر تعلیم جامعہ (یعنی کالج و یونیورسٹی) میں پہنچی اس دن سے ایڈمیشن کے دروازے بند ہوئے' تعداد مقرر ہوئی' استاذ اور شاگرد کے مستحکم رشتے ٹوٹے' اخلاص و قربانی اور للّٰہیت و انسانی خدمت کے تصورات مدھم ہوئے' اسٹرائکیں شروع ہوئیں اور طرح طرح کے وہ حالات پیدا ہوئے جو تعلیم کے خواص و عوام میں عام ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہوئے۔

## مسلمانوں کے سیاسی زوال کے اثرات

اسلام کے عہد زریں میں تعلیمی ترقی اور زمانے کے تقاضوں سے باخبر رہنے کی صلاحیت رکھنے والے علماء و فضلاء موجود رہے اور اسلامی سلطنت کی پاسبانی و نگہبانی کے زیر سایہ یہ پروان چڑھتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ تیسری صدی سے چھٹی ساتویں صدی تک اسلامی و عربی

علوم اپنے عروج و کمال کی آخری منزل تک پہنچ گئے تھے پھر فتنہ تاتار کی یورش نے اسلامی خلافت و سلطنت کی قبائے مقدس کو تار تار اور مسلمانوں کی قوت تمکنت اور وقار کو پاش پاش کر دیا تھا' اور حاکمیت سے محکومیت میں آجانے کے اضطراب اور نفسیاتی کش مکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے قوموں کو صدیاں درکار ہوتی ہیں لیکن امت اسلامیہ نے اتنی جلد سنبھالا لیا کہ مورخ حیران اور سیاست عالم و اسرار مذاہب سے واقفیت رکھنے والے ششدر ہیں اور اسے صرف اسلام کی ذاتی اور داخلی قوت کی اثر پذیری کا کارنامہ سمجھتے ہیں:

نسل سے چنگیز کی سلطان دیں پیدا ہوا　　　ظلمت تاتار سے مہر مبیں پیدا ہوا

ایک طرف مشرق میں مغل امپائر کی قوت ابھری اور دوسری طرف مغرب و مشرق کی ملی جلی خلافت آل عثمان نے جنم لیا۔ یہ کہنا کہ ہندوستان اور تمام عالم اسلامی میں چھ سات صدیوں تک کوئی تعلیمی ترقی کسی حیثیت سے نہیں ہوئی ایک مبالغہ آمیز جذباتی تعلی اور اہل علم و دانش کی کوششوں سے ناواقفیت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان عصور متاخرہ میں عصور اولیٰ جیسی نادر اور مکمل ترقی بہت سے اسباب کی بناء پر نہ ہو سکی۔ بہر حال اس موضوع کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

پھر ہندوستان میں مغل حکومت کے خاتمے کے بعد محکومیت کا ایسا دور شروع ہوا کہ زندگی کے ہر میدان میں تنزل و ادبار کے سائے چھا گئے ادھر "زوال دولت عثمان زوال شروع و ملت ہے" یعنی اس کے زوال کے بعد پورے عالم اسلامی میں گویا غم' حیرانی' اداسی اور مایوسی کی فضاء چھا گئی اور ؂

چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

ایسے حوصلہ شکن اور مایوس کن فضاء میں پورے عالم اسلامی میں روشنی کی کرن اور امید کی روزن اگر کوئی تھی تو وہ یہی دینی مدارس تھے۔ جنہوں نے عقیدہ و ایمان کی حفاظت کے ساتھ اپنے اسلاف کی میراث کو محفوظ رکھا اور تعلیم و تدریس کے ذریعے لوگوں میں روح عمل اور سامراج کے خلاف روح جہاد پھونکی۔

## علاج کے مختلف طریقے

عالم اسلامی میں سامراج کے مکمل اقتدار کے بعد عام مایوسی کے علاج کے لئے متعدد طریقے استعمال کئے گئے۔ ایک علاج بالتمثیل تھا یعنی یورپین اقوام کی تہذیب و تعلیم اور تمام معاشرتی و اجتماعی قدروں اور زبان کو اپنا لیا جائے تاکہ ان جیسی عزت و توقیر حاصل ہو جائے' سیاسی میدان میں اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ان کی زبان' قانون اور آزادی کے طریقوں کو اپنا کر ان سے آزادی کا قانونی مطالبہ کیا جائے۔ ایک علاج بالضد یا بالعکس تھا سامراج کی زبان اور علم و تہذیب کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے' اس کی سیاسی مثال یوں سمجھئے جیسے نمک تحریک یا نان کوآپریشن موومنٹ' اس علاج کی ایک شاخ یہ تھی کہ روح جہاد پیدا کی جائے اور جس طرح سامراج نے شمشیر کی قوت سے ہماری تقدیر کو برباد کیا ہے ہم بھی مسلح ہو کر اس کو بزور تلوار ملک سے نکال دیں' ایک مرکب علاج تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے عقائد و اصول پر پختگی سے قائم رہتے ہوئے جدید تہذیب کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جائے' یہاں یہ طریقہ علاج مثبت و ایجابی اور منفی پہلوؤں کی تفصیل بیان کرنا بے سود ہے۔

## اصولوں میں پختگی اور وسائل میں تبدیلی

زندگی جمود کی مخالف ہے اور ''حرکت میں برکت'' ہے۔ اور انسان نے ہر زمانہ میں ترقی کی ہے' کبھی وہ اونٹ پر سوار رہتا تھا۔ آج وہ ہوائی جہاز پر خلاء میں پرواز کرتا ہے۔ اس لئے ایمان و عقیدہ کے چند وہ مسائل جو حتمی اور لازمی اور یقینی ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے جیسے کہ ثابت شدہ اصول کہ ۲ + ۲ = ہمیشہ ۴ ہی ہوں گے' کسی ترقی یا عصر حاضر کے تقاضوں کی رو سے پانچ یا سات نہیں ہو سکتے۔ وسائل مین ترمیم و تبدیلی کے باوجود آج جدید امریکن ریاضیات کے ذریعہ بھی ۲ + ۲ = ۴ ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے مذہب کی وہ ابدی صداقتیں اور اصول و سائل نہ بدل سکتے ہیں اور نہ ان میں ترقی سے کوئی ترمیم عمل میں لائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وسائل میں بھی کوئی ترقی' ترمیم یا تبدیلی ممکن نہیں۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ کتاب الٰہی قرآن کو صرف کھجور کی چھال یا مٹی کی ٹھیکریاں یا مدبوغ کھالوں ہی پر لکھا جائے بلکہ سفید اور چکنے کاغذ پر خوش خط' خوب صورت اور اعلیٰ طباعت کے ساتھ چھاپنا نہ صرف یہ کہ جائز اور مستحب ہے بلکہ آج واجب اور ضروری ہے'

جرمنی میں پریس کی ایجاد کے بعد سب سے پہلے بائبل چھاپی گئی تھی' اس وقت جن حضرات نے قرآن پاک کی پریس میں طباعت کو توہین سمجھ کر اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی وہ دراصل ان کی ذاتی رائے تھی اسلام کے احکام یا قرآن پاک کے اوامر کی ترجمانی انہوں نے نہیں کی تھی۔ لیکن چند ہی سال بعد تفقہ فی الدین رکھنے والے علماء کی رائے پر قرآن پاک کو پریس میں چھاپا گیا جہاد کی روح اور حقیقت اور اعلائے کلمتہ اللہ کے تصور کو نہیں بدلا جاسکتا' اور ہوس ملک گیری وزر گیری وغیرہ کو جہاد نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاد کے لئے وہی اسلحہ استعمال کئے جائیں جو عصر رسالت پناہ ﷺ میں کئے جاتے تھے اور انہیں دائمی طور پر مسنون سمجھا جائے بلکہ توپ' بم اور ہر وہ ہتھیار استعمال کرنے ضروری ہیں جو اسلام کے خلاف باطل اور طاغوتی طاقتیں کر رہی ہیں بلکہ ان کا علم حاصل کرنا اور ان کو بنانا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے' ستر ڈھانکنا اور ایسا لباس پہننا جو اسلام کے اخلاقی نظام میں خلل نہ ڈالے ضروری ہے۔ لیکن یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ڈیڑھ ہزار سالہ عرب کا وہ لباس ہی پہننا لائق تبریک سمجھا جائے جو ان کے مخصوص رسم و رواج اور موسم و احوال کے مطابق تھا اسی طرح لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے آواز کو دور تک پہنچانا یا ریڈیو' ٹیلی وژن اور ویڈیو سیٹلائٹ کے ذریعے علم اور مذہب کو نشر کرنا یا ہوائی جہاز پر سوار ہو کر خیر کی عظیم قدروں کو پھیلانا بھی وسائل کی ناگزیر ترقی میں شامل ہے۔

## نصاب تعلیم میں ارتقاء

اب یہ کیسے ممکن ہے کہ حیات انسانی کی ہر روش ترقی پذیر ہو اور زمانہ کی ہر جنبش سائنس اور انسانی علوم کے ذریعے نئے نئے وسائل پیش کر رہی ہو اور ہم نصاب تعلیم کو جو ہمارے ہی جیسے انسانوں کا بنایا ہوا ہے کوئی ایسا آسمانی صحیفہ سمجھیں کہ اس میں کسی قسم کی ترمیم' اصلاح یا ایک نقطہ کی تبدیلی بھی ممکن نہ ہو۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ہر قدیم کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ وہ قدیم ہے ورنہ پھر سورج کی روشنی سے بھی محروم ہونا پڑے گا اور اس دھرتی اور کائنات سے باہر کوئی نئی دین ڈھونڈنی پڑے گی' اسی لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جدید کو صرف اس لئے قبول کر لیا جائے کہ وہ جدید ہے بلکہ حکمت مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے اور فائدہ مند چیزوں سے استفادہ کرنا ہی دانش مندی ہے چاہے وہ پرانی ہو یا نئی۔

# دینی تعلیم کا مقصد اور غایت

کسی بھی نصاب پر نظر ثانی کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس تعلیم کے جو اغراض ہیں یا جن مقاصد کے پیش نظر زندگی گزارنے کا فیصلہ کسی قوم امت یا گروہ نے کیا ہے کیا یہ نصاب اس کی تکمیل میں معاون و مددگار ہے یا مخالف ہے؟

عام تعلیم کے تمام شعبوں کے مقاصد تقریباً یہی ہیں علم کا حصول اچھی ملازمت زمانے کے تقاضوں سے آشنائی و ہم آہنگی ذہنی آسودگی اور عقلی پرواز وغیرہ۔

دینی تعلیم کے مقاصد بھی یہی ہیں لیکن ان کے آگے جو مقاصد ہیں وہ یہ ہیں انسانی ہدایت کے لئے جو پیغام ربانی نازل کیا گیا ہے اس پر خود قائم و دائم رہنا اور انسانیت کو اس سے آشنا کرانا کتاب الٰہی اور نبی ﷺ سے نطق زرافشاں کے جو بول یا انمول موتی سنت کے ذریعے ہمیں ملے ہیں ان کی حفاظت اپنی جانوں سے زیادہ کرنا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو جوں کا توں انہیں پہنچانا۔ اسلامی شریعت و قانون جو تمام انسانی ضرورتوں کی کفیل اور ضامن ہے اس کے احیاء کی کوششیں اور ان علوم کی تدریس و تعلیم تاکہ جب کبھی سامراج اور طاغوت کا بنایا ہوا غیر فطری نظام زندگی دم توڑ دے تو انسانیت کی کامیاب رہبری کے لئے یہ قانونِ شریعت موجود رہے ایک سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ زندگی کی تمام ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عالم آخرت اور موت کے بعد آنے والی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرنا اور اس کے لئے وہ اخلاقی و مذہبی پابندیاں قبول کرنا جن کے بغیر نہ زندگی کا سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اور نہ حیات بعد الممات کی راحت جاوداں۔

عربی زبان کی تعلیم کے دو اغراض ہیں ایک تو یہ کہ عربی دنیا کی ایک زندہ زبان ہے اس لئے اس کو حاصل کرنا۔ لیکن دوسری اہم غرض یہ ہے کہ اس زبان میں کلام الٰہی اور نطق نبوی ﷺ موجود ہے اور فقہ و شریعت کے تمام عظیم مراجع اسی زبان میں ہیں اس لئے ان تمام علوم کو حاصل کرنا جو خدا کی تعلیمات کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوں۔

# نصاب تعلیم کی اصلاحی کوششیں

گزشتہ صدی سے عالم اسلامی میں اس قسم کی تحریکیں برپا ہوئیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جن حضرات نے ان مسائل پر بغائر نظر سوچا اور لکھا علامہ رشید رضا کے قول

کے مطابق دنیا میں جو پہلے تین شخص ہیں ان میں سر زمین ہند کا سرمایہ ناز و افتخار علامہ شبلی نعمانی بھی ایک ہیں اور ہندوستان میں مولانا پہلے شخص ہیں جنھوں نے انتہائی تفصیل و تحقیق اور شرح وبسط کے ساتھ اس معاملہ پر سوچا اور لکھا۔ ندوہ تحریک کا عظیم مقصد بھی اصلاح نصاب تھا' ندوہ کے بانیوں کی جماعت نے انہیں خطوط پر کام کیا۔ شبلی کو ندوہ کا معمار حقیقی اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اصلاح و تجدید کی وہ روح پھونک دی جو باد مخالف کے باوجود سو سال سے زندہ ہے۔ شبلی کی کلی اصلاحی تحریک اس وقت بوجوہ مکمل طور سے کامیاب نہیں ہوئی' لیکن امت کے سامنے ایک نقشہ اور لائحہ عمل پیش ہو گیا۔ جس میں نئی کتابوں اور وسائل سے مدد لی گئی تھی انگریزی اور سنسکرت کی تخصصانہ تعلیم کی تجویز مولانا شبلی نے پیش کی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ آخر کار دار العلوم ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب میں اہم تبدیلیاں کیں۔ انگریزی زبان' تاریخ و جغرافیہ' فلسفہ' جدید اور مبادی سائنس وغیرہ کو شامل کیا جن سے بہترین اصلاح ہوئی۔ عربی زبان میں ندوہ نے اپنا کامل اور مکتفی نصاب بنایا ہے جس میں بچوں کی دینی و ادبی تربیت کے ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اور ہندوستان کی حد تک اور موجودہ ناقص وسائل کی حد تک وہ ایک کامیاب نصاب ہے جسے تمام دینی مدارس کو اختیار کرنا چاہئے۔

دیوبند کا نصاب تعلیم بھی اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ایک کامیاب نصاب ہے مجھے اس میں مدت تعلیم کے بہت کم ہونے کا احساس ہے۔ غور و فکر کے بعد اسے بڑھایا جا سکتا ہے' دیوبند کے نصاب میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

ندوہ' دیوبند اور دوسرے مدارس کی کامیاب اصلاحی کوششوں کے بعد بھی راقم یہی کہے گا کہ ثریا سے سدرۃ المنتہی کی تمنا' خوب سے خوب تر کی تلاش اور حسین سے حسین ترین کی جستجو ہی زندگی کی ہر رعنائی و بہار کی ضامن ہے' ہم نے جو کام کر لئے ہیں ان ہی پر فخر کرتے رہنا اور اپنے آپ کو سب سے زیادہ تجربہ کار اور سب سے بہتر سمجھنا اور ہم سے بہتر طریقوں پر اسباب و وسائل کی وجہ سے جنھوں نے بہت سے نئے اور اچھے کام کئے ہیں یا وہ کر سکتے ہیں ان سے استفادہ نہ کرنا یا ان کی تحقیر کرنا یا ان سے چشم پوشی و اغماض برتنا علمی اصول سے غلطی اور صریح ناانصافی ہے اس لئے عربوں کو جدید تعلیم یا ترقی اور جامعہ ازہر کے

جدید ترین اصلاحی نصاب جو قدیم و جدید کے متوازن امتزاج پہ قائم ہے۔ اس سے عالمی طور پر استفادہ کرنا کسی بھی اصلاح نصاب کی تحریک یا کوشش کے لئے ناگزیر ہے۔

## نصاب تعلیم میں تبدیلی کا حق

یہ بات واضح کر دی جائے کہ جن حضرات کو نہ عربی آتی ہے اور نہ اس کی باریکیوں سے واقف ہیں' نہ اس کے علوم و فنون سے آشنا ہیں' اور نہ ہی انہوں نے دینی و اسلامی علوم کو اس کے اصلی مراجع سے حاصل کیا ہے اور نہ ان کے نزدیک اسلامی قانون شریعت دنیا کی عالمی رہنمائی و ہدایت کا کام انجام دے سکتا ہے۔ وہ حضرات صرف انگریزی زبان کے بل بوتے پر اور یورپ و امریکا کے تعلیمی نظریات کے پیش نظر جو ان کی لادینی اور لااخلاقی قدروں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ایجاد کئے گئے ہیں۔ وسائل کی تبدیلی سے بھی آگے بڑھ کر نفس علوم اسلامیہ میں کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت کی جو اسکیمیں پیش کرتے ہیں نہ وہ مسلم علماء قبول کر سکتے ہیں اور نہ دینی تعلیم پہ فریفتہ مسلم عوام۔ یہ تو بالکل ہی ایسی غیر فطری بات ہوئی جیسے راقم انگریزی زبان' یا ریاضیات کے نصاب یا میڈیکل کالج کے نصاب میں ترمیم و تبدیلی کی بات کرے اور اس طرح کرے کہ تمام ان علوم و فنون کے ماہرین پہ رجعت پسندی کا الزام لگا دے یا اپنے کو ان کے سامنے مجتہد اعظم سمجھے۔ اگر میں اس کی جرأت کروں تو یقیناً نادان کہلاؤں۔

راقم الحروف نصاب تعلیم پر لحظہ بلحظہ اور سال بہ سال ترمیم و اضافہ اور غور و خوض کی دعوت دیتا ہے۔ اس نصاب تعلیم میں حسب ذیل باتوں کا خیال اگر رکھا جائے تو مفید ہو سکتا ہے یہاں راقم وقت کی تنگی کی وجہ سے تفصیلی تجاویز پیش نہیں کرے گا صرف اختصار سے کام لے گا۔

### ا۔ عالم عربی اور جامعہ ازہر کا نصاب

عالم عربی اور خصوصاً جامعہ ازہر کے دینی نصاب میں ان ساٹھ ستر برس میں ایسی عظیم اصلاحی کوششیں ہوئی ہیں جن سے وہ مفید ترین بن گئے ہیں' اس سے ہندوستان کے دینی مدرسے نصاب بنانے میں مکمل طور پہ مدد اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نصاب تعلیم بنانے کے لئے جن اعلیٰ صلاحیتوں اور سرکاری

اقتصادی امدادوں وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسلامی و عربی درس گاہوں کے پاس عالم عربی میں موجود ہیں' اور انتہائی اعلیٰ تعلیمی صلاحیتوں کے حامل' تجربہ کار لوگ ان ملکوں میں نصاب تعلیم تیار کرتے ہیں جو اسلام کی بقاء و حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کے دفاع اور باطل نظریات پر ہجوم اور عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہوتا رہے۔

## ۲۔ تعلیم کا ایک مفہوم

مصر میں اکثر دانش ور بار بار یہ تجویز پیش کرتے رہے ہیں کہ دو تعلیمیں ختم کر کے صرف ایک تعلیم رہ جائے لیکن اب تک ایسا نہیں ہو سکا ہے کیونکہ ایک تعلیم کے نام پر عربی و دینی بنیادی علوم میں بڑی حد تک کمی کا پلان بنایا جاتا ہے۔ لیکن جامعہ ازہر نے اپنی بارہ سالہ ثانوی تعلیم میں تمام ان عصری سائنسی اور ریاضی کے علوم کو اپنالیا ہے جو مصری اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں' اور دینی علوم میں کسی قسم کی کمی نہیں ہونے دی۔ لیکن کتابوں اور رسائل میں بڑی حد تک تجدید کر دی گئی ہے۔ اس طرح بارہ سال تک ازہر کے طالب علم پر دوہرا بوجھ پڑتا ہے۔ لیکن وہ فراغت کے بعد ازہر کے قدیم تھیالوجی' شریعت اور عربیہ کے کالجوں ہی کی طرح میڈیکل' انجینئرنگ اور دوسرے سائنسی کالجوں میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔

## ۳۔ عرب مؤلفین کی کتابیں

ندوۃ العلماء کے نصاب نے بعض اچھی عربی کی ابتدائی کتابیں تیار کی ہیں ان کو اس متذکرہ نصاب میں شامل کیا جانا بہتر ہے۔ لیکن اصولی طور پر عرب مؤلفین کی کتابیں داخل نصاب ہونی چاہئیں۔ کیونکہ کسی زبان کی تعلیم عجمی زبان و انداز بیان کے ذریعے دی جانے کے بعد جو مضر نتائج ہوتے ہیں وہ اہلِ علم و اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ کسی ملک کے کوئی ایک یا دو عالم و ادیب تو دوسرے اہلِ زبان کی طرح زبان شاید لکھ سکتے ہیں' لیکن ہر شخص سے یہ توقع غیر حقیقت پسندانہ جرأت یا دعویٰ ہے۔ یہ بات عربی زبان و انشاء و ادب سے متعلق ہے علمی و فکری چیزوں میں عربی و غیر عربی میں تفریق کی ضرورت نہیں' تاہم ان مقالات میں بھی عالم عربی کے وسائل و امکانات کی روشنی میں استفادہ کے زیادہ مواقع ہمارے لئے موجود ہیں۔

## ۴۔ اسلامی نصاب اصول تعلیمات پر مبنی ہو

نصاب تعلیم میں کتاب و سنت کی اصلی اور بے داغ تعلیمات کو جگہ دی جائے۔ مخلصانہ نظریات یا فروعی مسائل' یا افراد کی ذاتی صواب دید پر مشتمل اسلام کی تشریحات یا سلف صالح کی سیرتوں کو چھوڑ کر ماضی قریب کے افراد کی ایسی سیرتیں پیش نہ کی جائیں جو اسلام کے کسی خصوصی مکتب فکر ہی کی نمائندگی کرتی ہوں یا فلسفہ و تصوف کے اثر سے کتاب و سنت کی تشریحات کے خلاف نتائج اخذ کیے جائیں۔

## ۵۔ اختلافی مباحث

عقائد و اصول کو پڑھانے میں ایسا مناسب طریقہ اختیار کیا جائے کہ اصول تعریفات' تمام فرقوں کے اقوال اور ان کے دلائل غیر جانب داری کے ساتھ پیش کر دیئے جائیں۔ اور جہاں تک وہ اسلام کے کسی بنیادی مباحث سے نہ ٹکراتے ہوں' یا صریح کفر کے دائرے میں نہ آتے ہوں۔ ان پر ایسی بحثیں نہ لکھی جائیں جن سے آپس کے تفریق و اختلافات رونما ہوں۔ اس سلسلہ میں بھی عقائد سے متعلق عرب نصاب تعلیم کی کتابیں کامیاب تجربہ ہیں۔

## ۶۔ جدید باطل نظریات کی تعلیم

قدماء نے اس زمانہ کے باطل فلسفے اور نظریات سے آئے ہوئے اعتراضات کے مکمل جوابات دیئے ہیں جو ہمارے لئے باعث فخر علمی کارنامہ اور اسلامی خدمت کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ عصر حاضر میں تمام جدید باطل تحریکوں نیز دوسرے نظریائے فکر و نظر و اجتہاد کی تعلیم دی جانی ضروری ہے' تاکہ طالب علم غیر محدود اور جارحانہ نیشنلزم کے نقصانات' کمیونزم' سوشلزم اور دیگر لااخلاقی اقدار کو پھیلانے والی تحریکوں اور الحاد و لادینی کی جملہ کوششوں سے واقف ہو۔

## ۷۔ مستغربین کا گروہ

غیر مسلموں نے اسلام اور عربی زبان کی جو عظیم الشان خدمات کی ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے مقاصد جو بھی ہوں لیکن علمی تحقیق' قدیم مراجع کی طباعت وغیرہ

کے فوائد کا انکار ایسا ہی ہے جیسے سورج کے طلوع ہونے کا انکار۔ کیونکہ شروع میں یہ کام یورپین اسکالروں نے کیا ہے اور مشرقی زبانوں اور ادیان پر یہ کام شروع کیا تھا اس لئے محققین کے اس گروہ کا نام ''مستشرقین'' پڑ گیا یعنی حقیقتاً تو وہ مغربی ہیں لیکن مشرقی علوم پر کام کرنے سے مشرقی بن گئے ہیں۔ حیرت اور مسرت ہے کہ مشرقی درس گاہوں میں ان مشرقی علماء کا وجود نہیں ہے جو مشرقی ہونے کے باوجود مغربی علوم پر بحث کریں اور مغرب میں پھیلے ہوئے ادیان کا مکمل محققانہ جائزہ لیں۔ اب کچھ افراد یا ادارے چھوٹے پیمانے پر یہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن ضرورت اس کی ہے کہ بڑے پیمانے پر مستغربین کا گروہ پیدا ہو، اور ہر علمی و دینی مدرسہ میں تقابل ادیان وغیرہ کے سیکشن بڑے پیمانے پر کھولے جائیں۔

## ۸۔ نصاب کی اعلیٰ کمیٹی

نصاب پر غور وفکر کے لئے اعلیٰ کمیٹی تشکیل دینی ضروری ہے جو دائمی طور پر اپنا کام کرتی رہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ کسی بھی شخص نے کوئی کتاب لکھی اور وہ نصاب تعلیم میں شامل ہوگئی، نصاب کی کسی نئی کتاب کے لئے ملک گیر پیمانے پر اعلان کیا جانا ضروری ہے اور اہل فن میں سے جو اس فن کے محقق و اسکالر بھی ہوں متعدد حضرات گائیڈ لائنز کی روشنی میں اس فن پر متعدد کتابیں تیار کر کے پیش کر دیں اور پھر دانش وروں اور اسی فن کے ماہروں کی اعلیٰ سیکشن کمیٹی ان متعدد کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو منتخب کر کے نصاب درس میں داخل کرے۔ جامعہ ازہر یا قاہرہ یونیورسٹی میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ شیخ الازہر یا وائس چانسلر کوئی سی بھی تحریر پیش کر دیں اور وہ نصاب تعلیم میں داخل کر دی جائے۔

## ۹۔ نصاب تعلیم کی کتاب اور مطالعہ کی کتاب کا فرق

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہئے کہ نصاب تعلیم کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں علمی فنی و تربیتی بہت سے اصولوں کو سامنے رکھا جاتا ہے اور فن سے متعلق بے شمار باریکیاں اور حقیقتیں اس میں ایک خاص اصطلاحی زبان میں پیش کی جاتی ہیں، اس کے برعکس عام اصلاحی یا دینی یا دعوتی یا معلوماتی کتابیں جو لکھی جاتی ہیں وہ عام مطالعہ یا عوام کے فائدہ کے لئے جتنی بھی مفید ہوں۔ لیکن نصاب درس اور طلباء کے لئے اتنی مفید نہیں ہو سکتیں۔ اسی لئے اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے کہ کون سی کتاب نصاب درس کی ضرورتوں کو

پورا کرتی ہے۔ اور کون سی کتاب عام استفادہ اور مطالعہ کے لئے بہتر ہے۔

## ۱۰۔ عالم عربی کا نصاب

نصاب بنانے والی کمیٹی عالم عربی و ازہر کے ابتدائی، اعدادی، ثانوی اور یونیورسٹی کے نصاب ہائے تعلیم سفارتوں یا براہ راست وزارتوں کے ذریعے حاصل کرے اور بہترین اور موزوں کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کی روشنی میں یہ کام کیا جائے تو انتہائی مفید ایجابی پہلو سامنے آئیں گے۔

۱۱۔ عصری علوم عربی میں پڑھائے جائیں

جدید سائنس، ریاضی جغرافیہ وغیرہ کے تمام عصری علوم دینی مدرسوں کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن یہاں بھی راقم کی حقیر رائے یہ ہے اور دوسروں کو مکمل طور سے اس سے اختلاف کا حق حاصل ہے کہ ان موضوعات پر عربی ممالک کے مدارس میں اتنی عالی شان اور بہترین کتابیں پڑھائی جارہی ہیں جو جدید امریکن تجربوں کی روشنی میں تیار کی گئی ہیں اور جدید ہیں۔ ان کتابوں یا ان کے خلاصوں کو داخل نصاب کیا جائے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ عربی زبان نے کتنی ترقی کی ہے اس کا اندازہ بھی ہوگا اور طالب علم کی عربی استعداد بھی بڑھے گی۔

## ۱۲۔ اعلیٰ دینی تعلیم تخصص چاہتی ہے

اعلیٰ دینی تعلیم تخصص چاہتی ہے۔ کوئی یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ ایک ڈاکٹر انجینئر بھی ہو یا ماہر فلکیات بھی ہو، بلکہ آج کے علمی دور میں تو علم کی ایک ایک شاخ کے اندر بھی جزوی تخصص کا رواج عام ہو چکا ہے۔ اس لئے دینی طالب علم عصری علوم سے ناواقف نہ ہو اور اتنی دست گاہ رکھتا ہو کہ وہ بیسویں صدی کا باشندہ کہلائے پھر جب وہ دینی علوم میں انتہائی کمال کی منزلوں پر پہنچ جائے گا تو وہاں اسے تخصص بھی کرنا ہوگا۔

## ۱۳۔ انگریزی و ہندی اور دوسری زبانیں

یہ تو ناممکن ہے کہ کسی ڈاکٹر سے یا اردو و فارسی فیکلٹی کے کسی طالب علم سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس کی انگریزی M.A یا P.H.D کے برابر ہو کیوں کہ ہر زبان اور علم و فن کے لئے مخصوص لوگ درکار ہیں۔ اسی طرح دینی طالب علم کو اپنی مدت طالب علمی میں اتنی ہندی

انگریزی جاننا ضروری ہے کہ اگر وہ تبلیغ دین کی ضرورتوں کی خاطر مزید ان زبانوں کو سیکھنا چاہے اور ان میں تخصص کرنا چاہے تو اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اس لئے ایسے طالب علموں کے لئے عربی و دین کی منتہی تعلیم کے بعد زبانوں کے تخصص کا کورس سال دو سال کا بنایا جانا ضروری ہے۔

## ۱۴۔ عجیب و غریب مطالبہ کی اجازت

یہاں میں ایک عجیب و غریب مطالبہ کی اجازت چاہوں گا اور وہ یہ کہ ہندوستان کے مدارس دیونیورسٹیوں اور سائنسی اداروں میں عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم اتنی دی جائے کہ وہ کم از کم M.A کے برابر ہو کیوں کہ عربی ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ شاید میرے اس مطالبہ کو مولویانہ حماقت سے تعبیر کیا جائے۔ پھر ان لوگوں سے جنھوں نے عربی زبان و ادب اور اس کے علوم میں مہارت اور اس کی خدمت کی نیت روز اول سے پوری قناعت اور رضامندی اور عقلی سوچ بچار کے بعد کی ہو بار بار یہ مطالبہ کہ فلاں فلاں خبروں میں مہارت حاصل کرو چاہے تمہارے اپنے علوم و فنون و زبان کی معلومات اس طرح کم سے کم تر ہو جائیں کوئی دانش مندانہ مطالبہ نہیں ہے۔ ضرورت کے مطابق ہی چیزوں کو نئے نصاب میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

## ۱۵۔ صنعتی اسکولوں کا قیام

دینی مدارس ہی میں جلد سازی، یا معمولی صنعتی ادارے وغیرہ کھولنا یا ان کو سکھانا۔ آج کا موضوع ہے میں اسے غلط یا بے بنیاد نہیں کہتا کیوں کہ اقتصادی مسائل سے جذباتی انداز میں کنارہ کشی اختیار کرنا صحیح موقف نہیں ہے لیکن راقم کی حقیر رائے میں خلط مبحث نقصان دہ ہے۔ کوئی گورنمنٹ کے میٹریکولیشن یا ہائر سیکنڈری وغیرہ کے نصاب اور مدارس میں یہ مطالبہ کرے کہ صنعتی چیزیں سکھانی چاہئیں تو یہ مطالبہ نامنظور و مسترد ہو جائے گا۔ لیکن معمولی صنعتی ادارے علیحدہ سے کھولے جائیں گے جہاں لڑکے آٹھویں یا گیارہویں کے بعد داخل ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح دینی مدرسے میں مزید صنعت کاری کے ادارے کھولنے سے جہد اور وقت اور

نظام عمل کی مزید الجھنیں اور مشکلات بڑھ سکتی ہیں۔ اس لئے الگ سے صنعتی ادارے ٹیکنیکل اسکول اور کام سکھانے کے مراکز کھولے جائیں اور وہ دینی طالب علم جو اعلیٰ دینی تعلیم کے خواہاں نہ ہوں وہ مدرسہ کی اجازت سے صبح یا شام اس میں کام سیکھ سکتے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد سیمینار کے ناطے سے راقم نے مولانا آزاد کے دینی مدارس سے متعلق تعلیمی نظریات کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن وہ جائزہ طویل بھی ہو جائے گا اور تعریف کے چند پہلوؤں کو چھوڑ کر تمام تر تنقیدی بن جائے گا اس لئے وہ کسی دوسرے موقع اور فرصت میں پیش کیا جائے گا جو علیحدہ سے چھپایا جا سکتا ہے۔

## منصب قیادت

اصل مسئلہ جزوی اصلاح کا نہیں ہے کہ آج نصاب درس کی اصلاح کل افکار کی اصلاح پرسوں اقتصادی اصلاح کا دروازہ کھولا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ منصب قیادت کی تبدیلی سے ہندوستان میں ان عربی و دینی علوم کے حامل کسمپرسی کا شکار ہیں۔ آج کے بھی عالم عربی میں ان کے لئے نوکریوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس لئے اصل مسئلہ یہ ہے کہ دین کے ان محافظوں اور علم و فن کے ان تابندہ و درخشاں ستاروں کی اقتصادی مشکلات کا کلی حل تلاش کیا جائے اور ہمارے نزدیک یہ سیکولر حکومت کا فریضہ نہیں ہے بلکہ اس امت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے جس کی فلاح دنیوی و آخروی کے لئے یہ گروہ اخلاص و قربانی اور رضائے الٰہی کے عظیم جذبات کے ساتھ اپنا تن من دھن لٹا رہا ہے۔ اگر امت اس ذمہ داری کو قبول نہیں کرتی تو پھر کوئی دوسرا کیوں قبول کرے۔

# عربی مدارس کے نصاب کا مسئلہ

سید شہاب الدین دسنوی (پٹنہ)

عربی مدارس کے قیام کا مقصد ایک طرف علوم دین کی تحصیل و اشاعت اور دوسری طرف طلباء کی روحانی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ان مقاصد میں کس حد تک کامیابی ہوتی ہے' اس پر نہ تو غور کیا جاتا ہے اور نہ بحث ہوتی ہے۔ عام طور سے دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ مدارس سے فارغ التحصیل طلباء میں سے تھوڑے سے درس و تدریس میں لگ جاتے ہیں' کچھ لوگ مساجد کے امام یا موذن بن جاتے ہیں اور ایک اچھی بڑی تعداد ان کی ہوتی ہے جو پرائیویٹ طور پر یا کالج میں شریک ہو کر یونیورسٹی کے امتحان کی تیاری کرنے لگتے ہیں' اس کے بعد عام روش کے مطابق سرکاری یا نیم سرکاری دفاتر میں ملازمت تلاش کرنے لگتے ہیں۔ یہ موخر الذکر صورت دن بہ دن زور پکڑتی جارہی ہے اس لئے کچھ تو طلباء کے دباؤ اور کچھ حکومت کے شعبہ تعلیمات کے احکام کے تحت عربی مدارس میں قدیم کے ساتھ جدید علوم کا بھی اچھا خاصا بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ جس میں ہندی' انگریزی' سائنس' ریاضی وغیرہ داخل ہیں اور جن کا معیار بھی تقریباً وہی رکھا گیا ہے جو ان کے متوازی عام اسکولوں میں رائج ہیں۔ اس کے نتیجے میں طلباء میں نہ تو دینی علوم کی خاطر خواہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور نہ جدید علوم کی۔ گویا یہ مدارس بھی طبیہ کالج کے جیسے ہوتے جارہے ہیں جن میں مغربی طب کے مضامین یہ کہہ کر شامل کر دیئے گئے ہیں کہ مستقبل کے "حکیموں" کو میڈیکل کالج کے ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کے مساوی تسلیم کیا جاسکے۔ چناں چہ اب حکیم صاحب نبض اور قارورہ سے مرض کی تشخیص اور مریض کا مزاج معلوم کرنے کے بجائے تھرمامیٹر' اسٹھیتسکوپ اور

مختلف نوعیت کے ٹیسٹ پر اعتماد کرتے ہیں اور علاج میں مفردات اور معجون کے بجائے اینٹی بائیوٹک گولیاں کھلاتے ہیں۔ ان کے بورڈ پر "حکیم" کے بجائے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" لکھا ہوتا ہے۔ عربی مدارس بھی کچھ اسی ڈھنگ کے ہوتے جارہے ہیں۔ یہاں کے فارغ التحصیل "عالم" اور "فاضل" انگریزی لباس پہنتے ہیں' بول چال میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور داڑھی مونچھ منڈاتے ہیں۔

انگریزی یا ہندی پڑھانے کی غرض یہ ہو کہ طلباء ان زبانوں میں شائع شدہ اسلام سے متعلقہ لٹریچر کا مطالعہ کر سکیں تو بے شک یہ زبانیں پڑھائی جائیں۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ سال بہ سال اور اسی معیار اور اتنے ہی گھنٹوں کے لئے پڑھائی جائیں جن کا رواج عام قسم کے تعلیمی اداروں میں ہے؟ اگر سائنس پڑھائی جاتی ہے تو اس کا پریکٹیکل کیوں نہیں کرایا جاتا ہے۔ اس کے بغیر سائنس کی تعلیم ناقص ہو گی۔

جب تک ہم مدارس کی تعلیم کو یونیورسٹی کے امتحانات سے علیحدہ نہیں کریں گے۔ ہمارے مدارس اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ تعلیم کے معاملے میں پہلے نصاب کے ہر مضمون کے مقصد کو واضح طور پر متعین کرنا بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر "دینی تعلیم" کے نام پر بچے کو قرآن مجید ناظرہ پڑھایا جارہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ کلام پاک کا احترام سیکھ جائے اور نماز کے لئے کچھ سورتیں یاد کرلے اور اس طرح خیر و برکت کا ذریعہ بنائے۔ لیکن اگر اسے معنی کے ساتھ کلام پاک پڑھایا جارہا ہو تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہ قرآنی تعلیمات سے واقف ہو جائے اور اپنی زندگی میں ان پر عمل پیرا ہو۔ اس طرح کہنے کو ونوں طریقے سے "دینی تعلیم" دی جارہی ہے۔ لیکن دونوں کے اغراض و مقاصد الگ الگ ہوں گے۔

نصاب تعلیم مرتب کرنے میں طلباء کو ۶ سال سے ۱۴ سال کی عمر تک دینی مدارس میں علیم اس طرح دینی چاہئے کہ پہلے ۸۰ فیصدی' پھر ۷۵ فیصدی اور اس کے بعد ۶۰ فیصدی قت درجہ بہ درجہ دینی علوم کے لئے مختص ہو اور بقیہ حصہ جدید علوم کے لئے۔ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ کن طلباء میں مزید دینی علوم سے مستفید ہونے کی صلاحیت موجود ہے (عام زیں کہ ایسے طلباء کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو) ان طلباء کو دینی تعلیم کی تحصیل کے لئے

مدرسے میں رکھا جائے اور ان کے لئے ۸۰ فیصد وقت اس کام کے لئے دیا جائے۔ بقیہ ۲۰ فیصدی عصری علوم کے لئے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ مدرسوں میں طلباء کی بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے جو محض اپنے والدین کی مرضی کی بناء پر یا عسرت سے مجبور ہو کر داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن اور کردار میں شاید وہ صلاحیت نہیں ہوتی جو آگے چل کر عالم دین کی شان ہونی چاہئے۔ جو باقی تھوڑے سے طلباء رہ جائیں گے وہ البتہ مدرسے سے فارغ ہو کر "عالم" اور "فاضل" بن کر نکلیں گے اور دین کی خدمت و اشاعت' تحریر و تقریر کے ذریعے بہتر طریقے سے انجام دے سکیں گے۔

میرا خیال ہے کہ ان باتوں کی روشنی میں مدرسوں کے نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مختلف مضامین کی ضرورت اور مقاصد' ان کے معیار اور اوقات اس طرح معین کئے جائیں کہ قدیم و جدید کا امتزاج ہو سکے۔

# فارغین مدارس عربیہ کا مستقبل

حکیم سید محمد حسان نگرامی

ارباب حل وعقد غور فرمائیں کہ آج عربی مدارس کے فارغین کا حال کیا ہے۔ معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایسے لوگوں کو' جو کسی کے سہارے عرب ممالک کو چلے جاتے ہیں یا عمائدین سے اپنی راہ ورسم بنائے رکھ کر ہندوستان میں کہیں لگ جاتے ہوں' چھوڑ کر ان عربی مدارس کے فارغین کا مستقبل مسجدوں میں امامت سے آگے نہیں بڑھتا اور اب ابتری اس حد تک ہو چکی ہے کہ مسجدوں کی امامت کے لئے بھی سند یافتہ مولویوں کے مقابلہ میں صرف ناظرہ یا زیادہ سے زیادہ ایسے حفاظ کو ترجیح دی جاتی ہے جو کم معاوضہ پر' بھی صرف مسجد کے حجرہ کی سہولت پر' قناعت کر کے نام نہاد امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں ان میں کچھ ایسے خوش نصیب بھی شامل ہیں جنہیں محلّہ کے گھروں سے صبح وشام کا کھانا مل جاتا ہے (یاد رہے کہ اس شکم پروری کے لئے امام صاحب کو گھر گھر ناشتہ دان لے کر صبح وشام دستک کے فرائض بھی ادا کرنے پڑتے ہیں)۔ عربی مدارس کے فارغین کو درج ذیل میدانوں میں سے کسی ایک میدان پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

(۱) مسجدوں کی امامت (اس کی دشواریوں کا تذکرہ اوپر ہو چکا) (۲) مدرسوں میں مدرسی (۳) بی اے میں داخلے (۴) بی یو ایم ایس میں داخلے (۵) عرب ممالک کی ملازمت (۶) تجارت یا کاروبار۔

آیئے ان امکانات کا تفصیلی جائزہ لیں تاکہ ملک کے اس مخصوص طبقہ کی صحیح صورت حال سامنے آسکے۔

عربی مدارس میں ۱۰-۱۴ سال تک صرف کرنے کے بعد مسجدوں کی امامت کے

بارے میں ہم لکھ چکے ہیں۔ دوسرے نمبر پر فراغت کے بعد بی اے میں داخلہ لینے کا مسئلہ آتا ہے ملحوظ رہے کہ ہندوستان میں صرف ۲ یا ۳ یونیورسٹیاں چند عربی مدارس کے فارغین کو یہ سہولت دے رہی ہیں لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ ان یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لئے ان فارغین کو بہتوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور بالفرض ٹیسٹ میں داخلہ مل بھی جائے تو تمام یونیورسٹیوں میں داخلوں کی کل تعداد ۵۰ سے زائد نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بمشکل تمام بی اے میں داخلہ مل جانے کے بعد طلبہ کی اکثریت گریجویٹ بے روزگاروں کی لمبی فہرست میں جگہ پانے کے بجائے کوئی اور مقصد حاصل نہیں کر پاتے۔

تیسرے نمبر پر طبیہ کالجوں میں داخلہ کی بات ہے۔ میری معلومات کی حد تک اب صرف علی گڑھ بہار اور ہمدرد طبی کالج کے علاوہ کسی ڈگری کالج میں یہ سہولت حاصل نہیں ہے۔ جہاں ہزاروں طلبہ کے ساتھ ٹیسٹ میں کامیاب ہونے والے طلباء کی مجموعی تعداد ۲۰ سے آگے نہیں بڑھتی۔

چوتھے نمبر پر چھوٹے مدرسوں میں مدرسی کا مسئلہ آتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ مدرسے اپنے محدود وسائل کی بنیاد پر ۳۴ روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ کہ یہ فارغین جو صحیح معنوں میں بہتر تعلیم دے سکتے ہیں۔ ان مدرسوں سے دور بھاگتے ہیں۔

پانچویں نمبر پر عرب ممالک میں ملازمت کی بات آتی ہے ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ اس دور میں کم از کم ۲۵ ہزار صرف کرنے کے بعد ہی عرب ممالک میں غیر علمی ملازمت ہی مل سکتی ہے جس کا تناسب بھی ایک فیصد سے زائد نہیں ہے۔

چھٹے نمبر پر تجارت یا کاروبار کا مسئلہ آتا ہے۔ یاد رہے کہ ۱۴ سال تک پڑھانے کے بعد بوڑھے والدین اپنے فرزند سے سہارا ملنے کے بجائے انہیں بے روزگار پاکر عام طور سے اس حالات میں نہیں رہتے کہ اپنے مصارف پورا کر سکیں۔ چہ جائیکہ وہ لاکھوں روپے صرف کر کے ان فارغین کو تجارت یا کاروبار میں لگائیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس میدان میں عربی مدارس کی نمائندگی صفر رہ جاتی ہے۔

(۱) اس سلسلے میں پہلی تجویز یہ ہے کہ عربی مدارس کے ذمہ داروں کو یہ طے کرنا ہے کہ ۱۲۔۱۴ سال کی طویل مدت کے بجائے دینی مضامین کا ایسا جامع نصاب تیار کیا جائے جو صرف ۵ سال پر محیط ہو اور اس عرصہ میں بھی انگریزی اور ہندی کی کم از کم اتنی تعلیم ضرور دے دی

جائے جس کے سہارے وہ باہر کی دنیا میں اجنبیت محسوس نہ کریں۔

(۲) عربی مدارس کے ذمہ داران اس ۵ سالہ دینی نصاب کے ساتھ ساتھ اپنے وسائل کے مطابق تکنیکی تربیت کا محکمہ قائم کریں۔ جس کے ذریعہ چھوٹی سے بڑی صنعت کی تربیت کا انتظام رہے' تاکہ فراغت کے بعد طلبہ اپنی دل چسپی اور مہارت کے مطابق اپنا ذریعہ معاش طے کر سکیں۔

واضح رہے کہ عربی مدارس کے لئے طبیہ کالجوں کا قیام زیادہ آسان' قابل عمل اور مفید ہے کیونکہ طبیہ کالجوں کے قیام میں زیادہ پیچیدگیاں بھی نہیں'اس کے علاوہ طبیہ کالجوں سے فراغت کے بعد ایک لمبی تعداد اگر ملازمت سے وابستہ نہ بھی ہو سکے تو ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی میں طبابت کے آزاد پیشہ کے ذریعہ آسانی سے مسئلہ معاش حل کر سکتی ہے۔

(۳) مدارس کی تعمیرات پر روک لگائی جائے اور دیگر مصارف محدود کر کے مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافے کئے جائیں تاکہ ان مدارس کی طرف ان فارغین کی توجہ اور بڑھے۔

(۴) مسجدوں کی امامت کا ایک ضابطہ بنایا جائے اور ان کی تقرری کا معیار متعین کیا جائے' نیز اماموں کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے' تاکہ قوم کا یہ امام گھر گھر ناشتہ دان لے کر جانے کے بجائے اس عظیم ذمہ داری کو باوقار طور سے نبھا سکے۔

# مدارس عربیہ کا نصاب' چند مشورے

عون احمد قادری

(خانقاہ مجیبیہ 'پھلواری شریف۔ پٹنہ)

☆ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تمام عصری علوم کو شامل کر لینا قطعی مناسب نہیں ہے۔اس سے طلبہ نہ دینی علوم میں مہارت حاصل کر سکیں گے اور نہ عصری علوم سے کماحقہ واقف ہو سکیں گے۔

☆ عصری علوم میں سے صرف ان علوم کو نصاب میں شامل کیا جائے جو انتہائی ضروری ہیں اور جن کا دینی علوم سے گہرا ربط بھی ہے۔ مثلاً حساب 'جغرافیہ 'تاریخ 'معاشیات وغیرہ۔

☆ جن علوم کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ان کی آسان کتابیں اردو میں تیار کی جائیں۔

☆ لسانیات میں سے انگریزی اور ہندی کو عالم تک کے تمام درجات میں لازم کر دیا جائے۔

☆ سائنس کو بھی نصاب میں اس طرح پر شامل کیا جائے کہ جدید سائنسی معلومات پر مشتمل ایک مختصر کتاب پڑھائی جائے۔

☆ ادیان کے تقابلی مطالعہ کو بھی اہمیت دی جائے۔

☆ نیا نصاب تیار کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ عصری جامعات کی طرح مدارس کا بھی واحد مقصد روزی کمانا اور ملازمت کا حصول نہ ہو جائے بلکہ اس کا اصل مقصد پیش نظر رہنا چاہیے۔البتہ اقتصادی مسائل سے بالکل لاتعلقی بھی نہ رہے۔

☆ عربی مدارس کے نصاب میں ٹیکنیکل تعلیم پر مشتمل ایک مستقل شعبہ کا اضافہ ذرا محل غور ہے۔ کیوں کہ اصل دینی تعلیم اور اس کے تحقیقاتی اصناف و شعوب ٹیکنیکل تعلیم کے لازمی قرار دیے جانے سے متاثر ہوں گے۔ اس لئے یا تو ایسے خواہش مند طلبہ جو اس کو اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں' ان کے لئے اس کا انتظام کیا جائے یا پھر دینی نصاب تعلیم کے پورا کرنے کے بعد لوگ ٹیکنیکل شعبہ میں داخلہ لے کر اس کی تعلیم حاصل کریں۔

# ہندوستان کے اہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم

## (ایک تقابلی جائزہ)

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن' مولانا محمد شاہجہاں قاسمی
(خدا بخش ریسرچ اسٹاف لائبریری)

ہندوستان کے دینی مدارس کے نصاب تعلیم سے پورے طور پر واقف ہونے اور کسی نتیجہ خیز مقام تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے کچھ اہم اور معروف دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کس کس مدرسے نے کون کون سی کتابیں اپنے نصاب تعلیم میں داخل کی ہیں؟ وہ کتابیں اپنی فنی خوبی اور زبان وبیان کے لحاظ سے کس معیار کی ہیں اور پھر کیا دور حاضر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو مد نظر رکھ کر نصاب مرتب کیا گیا ہے۔ کیوں کہ جس دینی ادارہ کے نصاب تعلیم میں ایسی کتابیں شامل ہوں جو نہ زبان و بیان اور طرز ادا کے لحاظ سے آسان ہوں اور نہ عصری تقاصوں کو پوری کرتی ہوں تو ان سے طلباء نہ تو پورے طور پر مستفید ہو سکتے ہیں اور نہ عصری مسائل حل کرنے میں کوئی اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

اسی غرض سے یہاں مندرجہ ذیل دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے جو ملک کے ممتاز اور اہم مدارس ہیں اور درس نظامی اور عالیہ کے نمائندہ ادارے کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں:

(۱) دارالعلوم' دیوبند (۲) دارالعلوم' ندوۃ العلماء' لکھنو (۳) مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔ اعظم گڑھ (۴) جامعۃ الفلاح 'بلیریا گنج' اعظم گڑھ (۵) بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ' بنگال (۶) معہد ملت' مالیگاؤں (۷) جامعۃ الہدیٰ' مالیگاؤں (۸) جامعہ دارالسلام مالیر کوٹلہ (۹) جامعہ اشرفیہ سورت (۱۰) جامعہ دارالسلام عمر آباد (۱۱) دارالعلوم حیدر آباد (۱۲) جامعہ رحمانی

مونگیر (۱۳) مدرسہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف (۱۴) بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پٹنہ۔ ان دینی مدارس میں مندرجہ ذیل موضوعات کی کتابیں داخل درس ہیں جن کی تفصیلات اس طرح ہیں :

## تفسیر

علوم دینیہ میں تفسیر کا مقام سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ کیوں کہ اس فن کی کتاب میں قرآن مجید کی توضیح وتشریح کی جاتی ہے اور اس کے معانی ومطالب بیان کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مدرسہ میں اس فن کی اہم کتابیں داخل درس ہوتی ہیں۔ اس فن کی کون کون سی کتابیں مذکورہ مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح ملاحظہ فرمائیے :

| نام کتب | ندوہ | بہار بورڈ | دیوبند | بنگال | عمرآباد بورڈ | اشرفیہ | حیدرآباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | جامعۃ الہدی | معہد ملت | مالیر کوٹلہ | الاصلاح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ابن کثیر (تفسیر) | 〃 | 〃 | | | | | | | | | | | |
| احکام القرآن | 〃 | 〃 | | | | | | | | | | | |
| بیضاوی | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | | | | |
| تفسیر ابی سعود | 〃 | | | | | | | | | | | | |
| تفسیر فی ظلال القرآن | | 〃 | | | | | | | | 〃 | | | |
| تفسیر مظہری | 〃 | 〃 | | | | | | | | | | | |
| جلالین شریف | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | 〃 | | | 〃 | 〃 | |
| دلائل النظام (فراہی) | | | | | | | | | | | | | 〃 |
| روح المعانی | 〃 | | | | | | | | | | | | |
| فتح القدیر (شوکانی) | 〃 | | | | | | | | | | | | |
| کشاف | 〃 | 〃 | | 〃 | | | | | | | 〃 | | |
| مدارک | 〃 | | | | | | | | 〃 | | | | |
| مفردات القرآن | | | | | | | | | | | | | 〃 |

ان تمام کتابوں میں جلالین اور بیضاوی اکثر مدارس میں داخل مدرس ہیں۔ جب کہ زبان وبیان اور لب ولہجہ کے لحاظ سے ایک نہایت مختصر اور دوسری بہت دقت طلب ہے۔ ان کے مقابلے میں روح المعانی، کشاف، ابن کثیر زیادہ آسان اور عام فہم ہیں۔ جنہیں موجودہ دور کے طلباء بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں جیسی کتابوں کی تمام مدارس میں تعلیم دینی چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں دورِ حاضر کی صرف دو تصنیفات (تفسیر مظہری اور تفسیر فی ظلال القرآن) شامل درس ہیں اور وہ بھی محض ندوۃ، بہار بورڈ، جامعۃ الہدیٰ میں جب کہ ضرورت کا تقاضا ہے کہ جدید مفسرین کی کتابیں بھی ہر مدرسہ کے نصاب میں شامل کی جائیں تاکہ موجودہ دور کے طلباء عہد جدید کی زبان لب ولہجہ اور تحقیقات کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھ سکیں اور بصیرت پیدا کر سکیں۔

## اصول تفسیر

دینی علوم میں اہمیت ومقام کے لحاظ سے تفسیر کے بعد اصول تفسیر کا درجہ ہے کیوں کہ اس فن کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کن بنیادوں پر کی جائے۔ اس کے اصول وضوابط کیا ہوں اور پھر تفسیر بیانی سے قبل کن علوم وفنون کی جان کاری لازمی ہے۔ اس لئے اس فن کی چند اہم کتابیں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں جو اس طرح ہیں :

| نام کتب | بہار بورڈ | بنگال بورڈ | عمرآباد | الاصلاح | دیوبند | جامعہ رحمانی | پھلواری | ندوہ | جامعۃ الہدیٰ | اشرفیہ | حیدرآباد | مالیر کوٹلہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| الاتقان | " | " | " | | | | | | | | | |
| اصول التاویل (رفاہی) | | | | " | | | | | | | | |
| تلخیص الاتقان | | | | | " | " | " | | | | | |
| الفوز الکبیر | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " |

## حدیث

حدیث آنحضرت محمد ﷺ کے اقوال وافعال کا نام ہے۔ اس بناء پر قرآن شریف کے بعد اس کا مرتبہ مسلم ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو باتیں اختصار کے ساتھ لکھی ہیں۔ انہیں باتوں کی توضیح وتشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان وبیان اور عمل سے کی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن کی معتبر اور صحیح کتابیں دینی مدارس میں داخل درس ہیں جو اس طرح ہیں :

| نام کتب | دیوبند | ندوہ | معہد ملت | بہار بورڈ | بنگال بورڈ | اشرفیہ | حیدرآباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | الاصلاح | الفلاح | جامعۃ الہدیٰ | عمرآباد |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| آثار السنن | | | | " | | | " | | | | | | |
| ابن ماجہ | " | " | " | " | " | " | " | " | " | | | | |
| ابوداؤد | " | " | " | " | " | " | " | " | " | | | | " |
| اشعۃ اللمعات | | " | | | | | | | | | | | |
| الفیۃ الحدیث | " | | | | | | | | | | | | |
| بخاری شریف | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " |

| نام کتب | مالیر کوٹلہ | دیوبند | ندوہ | معہد ملت | بہار بورڈ | بنگال بورڈ | اشرفیہ | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | الاصلاح | الفلاح | جامعۃ الہدیٰ | عمر آباد |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ترمذی شریف | | " | " | " | " | " | " | " | " | " | | " | | " |
| تہذیب الاخلاق | | | " | | | | | | | | | | | |
| ریاض الصالحین | " | | " | " | | | | " | | " | | " | | |
| شمائل ترمذی | | " | | | | | | " | | " | | | | |
| طحاوی شریف | | | " | " | " | | " | " | " | | | | | |
| مرقاۃ | | | " | | | | | | | | | | | |
| مسلم شریف | | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " |
| مشکوٰۃ الآثار | | " | | | | | | | | | | | | |
| مشکوٰۃ المصابیح | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | | " | " | " |
| المنتقی من اخبار المصطفیٰ | | | | | | | | | | | | | | " |
| موطا امام محمد | | " | " | " | | | " | " | " | | " | | | |
| نسائی | | " | | " | " | " | " | " | " | | | | | |

ان تمام کتابوں میں مشکوٰۃ شریف اور صحاح ستہ تقریباً سب ہی دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ مدارس میں صحاح ستہ کی کتابیں اونچے درجوں کے مختلف رسالوں میں ایک ایک دو دو کرکے پڑھائی جاتی ہیں۔ جب کہ اکثر مدارس میں ایک ہی سال میں جو درسیات کا آخری سال ہوتا ہے اور جس کو دورے کا سال کہا جاتا ہے تمام صحاح کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں کسی بھی فن کی اونچی کتابوں کے پڑھانے کا یہ طریقہ مناسب نہیں کیوں کہ کسی فن میں پورا تجربہ اور جان کاری حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس فن کی اعلیٰ کتابوں کی تعلیم پوری شرح وبسط کے ساتھ بتدریج دی جائے تاکہ ہر طالب علم کے سامنے کوئی علمی گوشہ تشنہ طلب نہ رہ جائے۔ بلکہ ہر بات اس کے ذہن نشین ہوتی چلی جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ خوبی صرف ایک سال میں تمام صحاح کی کتابوں کے پڑھانے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ ہر مدرسہ میں صحاح کی کتابیں اونچے درجات کے مختلف سالوں میں پڑھائی جائیں تاکہ طلباء بتدریج یہ کتابیں پڑھ کر اس فن میں بصیرت پیدا کر سکیں۔

## اصول حدیث

حدیث شریف سے پورے طور پر استفادہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس کے اصول و ضوابط سے واقفیت حاصل کی جائے کیوں کہ کون سی حدیث صحیح ہے۔ کس کو حدیث مرسل کہتے ہیں۔ حدیث ضعیف یا حدیث حسن کی کیا تعریف ہے؟ ان تمام امور کی جان کاری اصول حدیث کی کتابوں سے ہوتی ہے۔ اس لئے دینی مدارس میں اس فن کی چند کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو اس طرح ہیں:

| نام کتب | الاصلاح | ندوۃ | بہار بورڈ | عمر آباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | الفلاح | دیوبند | اشرفیہ | حیدر آباد | بنگال بورڈ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| اصول حدیث و تاریخ | " | | | | | | | | | | |
| علوم الحدیث | | | | | | | | | | | |
| الحدیث المحدثون | | " | | | | | | | | | |
| مصطلحات الحدیث | | " | | | | | | | | | |
| مقدمہ ابن صلاح | | " | " | " | | | | | | | |
| مقدمہ مشکوٰۃ | | " | " | " | " | " | " | | | | |
| نخبۃ الفکر | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " | " |

ان کتابوں میں اول الذکر (اصول حدیث و تاریخ علوم الحدیث) اور ثانی الذکر (الحدیث والمحدثون) اصول حدیث کے ساتھ تاریخ علوم حدیث سے بھی بحث کرتی ہیں۔ جو صرف الاصلاح اور ندوۃ العلماء میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جب کہ ان کے بعد کی کتابیں صرف اصول حدیث سے بحث کرتی ہیں اور یہی اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر طلباء علم حدیث کی تدوین اور اس کی تاریخ سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ تاریخ علوم حدیث کی کتابیں بھی درسیات میں شامل کی جائیں۔

## فقہ

فقہ ان شرعی قوانین اور مسائل واحکام کا نام ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں مدون کئے گئے ہیں۔ اس لئے قرآن و حدیث کے بعد ان کا پڑھانا ضروری ہوتا ہے۔ اس فن کی اہم کتابیں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں جو اس طرح ہیں :

| نام کتب | الاصلاح | بہار بورڈ | عمر آباد | الفلاح |
|---|---|---|---|---|
| ہدایۃ المجتہد | ” | ” | ” | ” |

| نام کتب | بہار بورڈ | عمر آباد | دیوبند | ندوۃ | معہد ملت | اشرفیہ | بنگال بورڈ | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | الاصلاح | جامعہ الہدیٰ | مالیر کوٹلہ | الفلاح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| بلوغ المرام | ” | ” | | | | | | | | | | | | |
| در مختار | | | ” | | | | | | | | | | | |
| شرح وقایہ | ” | | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | | | | |
| الفقہ المیسر | ” | | | ” | | | | | | | | | | |
| قدوری | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | | ” | ” | ” | ” |
| کنز الدقائق | | | ” | | | ” | | ” | | | | | | |
| مالابد منہ | | | | | | ” | | ” | | | | | | |
| نور الایضاح | | | ” | | | ” | ” | ” | ” | ” | | | | |
| ہدایہ | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” |

## اصول فقہ

شرعی مسائل واحکام کے استخراج کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک طالب علم پہلے

اس کے اصول و ضوابط سے واقف ہو۔ اصول فقہ انہیں اصول و ضوابط کا نام ہے۔ اس فن کی مندرجہ ذیل کتابیں داخل درس ہیں :

| نام کتب | دیوبند | بہار بورڈ | بنگال بورڈ | ندوہ | معہد ملت | اشرفیہ | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | عمر آباد | الفلاح | الاصلاح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| الاشباہ والنظائر | " | " | " | | | | | | | | | |
| اصول الشاشی | " | " | " | " | " | " | " | " | " | | | |
| اصول الفقہ | | " | | | | | | | | " | " | |
| اصول الفقہ و تاریخ التشریع الاسلامی | | " | " | | | | | | | | | " |
| علم اصول فقہ | | | | " | | | | | | " | | |
| قواعد الفقہ | " | | | | | | | | | | | |
| نور الانوار | " | " | " | | " | " | " | " | " | | | |

| نام کتب | بہار بورڈ | بنگال بورڈ |
|---|---|---|
| الانصاف فی سبب الاختلاف | " | " |
| مسلم الثبوت | " | " |

ان کتابوں میں اصول الفقہ و تاریخ التشریع الاسلامی صرف مدرستہ الاصلاح، بہار بورڈ اور بنگال بورڈ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اصول الفقہ و قانون اسلامی کے اصول بتاتی ہے جب کہ تاریخ التشریع الاسلامی فقہ اسلامی کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ جس کا جاننا ہر طالب علم دین کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے شاندار کارناموں کے موضوع پر کوئی کتاب ہر دینی مدرسہ میں پڑھائی جائے تاکہ دینی طلباء علماء کے فقہی کارناموں کی تاریخ سے ناآشنا نہ رہیں۔

## فتاویٰ

فقہ کی کچھ ایسی کتابیں ہیں جن میں پیش آمدہ فقہی مسائل بیان کئے جاتے ہیں یہ مسائل قرآن، حدیث، اجماع، قیاس سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ مدارس اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے علماء تیار کریں جو قرآن و حدیث اور عصری حالات و واقعات کی روشنی میں شرعی مسائل بتانے اور رہنمائی کرنے والے ہوں۔ جو عالم دین یہ فریضہ انجام دیتا ہے اس کو شریعت کی اصطلاح میں مفتی کہا جاتا ہے۔ ایسے افراد پیدا کرنے کے لئے مخصوص تعلیم و تربیت

اور مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پورے ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند ہی ایسا دینی تعلیمی ادارہ ہے جہاں اس کا شعبہ پورے اہتمام کے ساتھ عرصہ دراز سے قائم ہے اور اس کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے ہر بڑے مدرسہ میں اس کا اہتمام کیا جائے اور اس کی طرف خصوصی دھیان دیا جائے۔

## فرائض

تقسیم وراثت کا قانون دراصل الٰہی قانون ہے، فقہ کی کچھ ایسی کتابیں ہیں جن میں تقسیم وراثت کے اصول و ضوابط مرتب کئے گئے ہیں۔ یہی فرائض کی کتابیں کہلاتی ہیں۔ اس فن کی مندرجہ ذیل کتابیں مختلف مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں :

| نام کتب | دیوبند | ندوہ | بہار بورڈ | بنگال بورڈ | عمر آباد | اشرفیہ | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | الاصلاح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| سراجی | ″ | ″ | ″ | ″ | ″ | ″ | ″ | ″ | ″ | |
| علم الفرائض | | | ″ | | | | | | | ″ |

## حکمت شرعیہ

اللہ تعالیٰ نے ہر شرعی حکم میں انسانوں کے لئے کوئی نہ کوئی بھلائی اور بہتری کا پہلو رکھا ہے۔ جس کا جاننا ایک عالم دین کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے اس فن کی مندرجہ ذیل کتابیں دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہیں :

| نام کتب | ندوہ | بہار بورڈ | پھلواری | دیوبند | الاصلاح | بنگال بورڈ | عمر آباد | الفلاح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ارکان اربعہ | ″ | ″ | | | | | | |
| جواہر الحکم | | | ″ | | | | | |
| حجۃ اللہ البالغہ | ″ | ″ | | ″ | ″ | ″ | ″ | ″ |

## عربی ادب

قرآن وحدیث کے صحیح معنیٰ و مفہوم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان وادب کا خصوصی مطالعہ کیا جائے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں عربی زبان ہی میں لکھی گئی ہیں اور جب

تک ایک طالب علم عربی زبان وادب پر قدرت حاصل نہ کرلے اس وقت تک وہ قرآن و حدیث کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔

عربی ادب کی کتابیں عرصہ دراز سے درس نظامی اور عالیہ میں پڑھائی جارہی ہیں لیکن درس نظامی میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ عربی ادب کی وہی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو زبان وبیان اور لب ولہجہ کے لحاظ سے مشکل تھیں ادق و مشکل الفاظ یا پیچیدہ تراکیب اور تشبیہات و استعارات کے لئے معروف تھیں، جیسے مقامات حریری، نفحۃ الیمن، نفحۃ العرب وغیرہ۔ یہ کتابیں درجہ فضیلت کے لئے مفید ہو سکتی تھیں، لیکن ابتدائی درجوں میں زبان سکھانے اور ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے قطعاً نامناسب تھیں۔ دوسرا نقص یہ تھا کہ تاریخ ادب عربی اور جدید عربی ادب کی کتابیں بھی داخل درس نہیں تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طلباء نہ تو عربی ادب کی تاریخ سے واقف ہوتے تھے اور نہ جدید عربی ادب اور اس کے لئے رجحانات سے باخبر۔ جدید عربی لکھنا اور بولنا تو بہت دور کی باتیں تھیں۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ادھر پندرہ سولہ سال کے عرصے میں درس نظامی میں کافی سدھار ہوا ہے اور عربی زبان و ادب کی ایسی کتابیں داخل درس کی گئی ہیں۔ جو موجودہ دور کے طلباء کے لئے زیادہ مفید ہیں اس وقت دینی مدارس میں عربی زبان وادب کی جو کتابیں داخل درس ہیں وہ اس طرح ہیں :

| نام کتب | مالیر کوٹلہ | ندوہ | بہار بورڈ |
|---|---|---|---|
| الادب الجمیل | " | | |

| نام کتب | مالیر کوٹلہ | ندوہ | بہار بورڈ | الاصلاح | الفلاح | عمر آباد | دیوبند | بنگال بورڈ | پھلواری | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | اشرفیہ | معہد ملت | جامعۃ الہدیٰ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| الادب العربی | | " | " | | | | | | | | | | | |
| من غرض الاغانی | | " | | | | | | | | | | | | |
| امثال آصف الحکم | | | | " | " | | | | | | | | | |
| الاناشید الی الشعر الصحاب | | | | | | " | | | | | | | | |

| نام کتب | مالیر کوٹلہ | ندوہ | بہار بورڈ | الاصلاح | الفلاح | عمر آباد | دیوبند | بنگال بورڈ | پھلواری | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | اشرفیہ | معہد ملت | جامعۃ الہدی |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| الایام طٰہٰ حسین | | | | | | | ” | ” | | | | | | |
| ازہار العرب | | | ” | | | | | | | | | | | |
| باکورۃ الادب | | | | | | | | | ” | | | | | |
| البیان والتبیین | ” | | ” | | | | | ” | | | | | | |
| تاریخ الادب العربی | ” | ” | ” | ” | | ” | ” | | | | | | | |
| جمہرۃ خطب العرب | | | | ” | | | | | | | | | | |
| جمہرۃ اشعار العرب | | | | ” | ” | | | | | | | | | |
| حیاتی احمد امین | | | | | | ” | | | | | | | | |
| دروس الادب | | | | | | ” | | | | | | | | |
| دیوان حماسہ | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | | | | |
| دیوان متنبی | ” | | ” | | | ” | ” | ” | | ” | ” | | | |
| دیوان نابغہ | ” | | | | | | | | | | | | | |
| روضۃ الادب | | | | | | | ” | | | | | ” | | |
| سبعہ معلقہ | | ” | ” | | | ” | ” | ” | | | | | | |
| شعر الاسلامی | | ” | | | | | | | | | | | | |
| والشعر الجمیل | ” | | | | | | | | | | | | | |
| العبرات | | | ” | | | | ” | ” | | | | | | |
| عبقریات | | | | | | | ” | | | | | | | |
| القراۃ الراشدہ | | ” | ” | | | | | | ” | ” | ” | | | ” |

| نام کتب | مالیر کوٹلہ | ندوہ | بہار بورڈ | اسلامیہ | منہاج | احمد آباد | دیوبند | بنگال بورڈ | پھلواری | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | اشرفیہ | معہد ملت | جامعۃ الہدیٰ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| القراءۃ الرشیدہ | | | | | " | " | | | | | | | " | |
| قصص النبیین | " | " | | | | " | | | " | " | " | " | | " |
| قصیدہ بانت سعاد | | " | | | | | | " | | | | | | |
| قصیدہ بردہ | | | " | | | | | | " | | | | | |
| کتاب بلوغ الارب | | " | | | | | | | | | | | | |
| کتاب الخلفاء | " | " | | | | | | | | | | | | |
| کفاک علماء بالعربیہ | | | | " | | | | | | | | | | |
| کلیلہ ودمنہ | | | | " | " | " | | | | | | | | |
| محاسن شعر | | | | " | | | | | | | | | | |
| المحاورۃ العربیہ | | " | | | | | | | | | | | | |
| مختارات | | " | " | | " | " | | " | | " | " | " | " | |
| معلم الانشاء | " | " | " | | | " | | | | " | | " | " | " |
| مقامات بدیع الزمان ہمدانی | | " | " | | | " | | | | | | | | |
| مقامات حریری | " | " | | | | | " | " | | | | | | |
| منتخبات جمہرۃ خطب العرب | | | | " | | | | | | | | | | |
| منشورات | " | " | " | | " | | | | " | | | | " | " |
| منہاج العربیہ | | | " | | | | | | | " | | | | " |

| نام کتب | مئو کوٹلہ | ندوہ | بہار بورڈ | الاصلاح | الفلاح | عمر آباد | دیوبند | بنگال بورڈ | پھلواری | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | شرفیہ | معہد ملت | جامعۃ الہدی |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| [illegible]قد الادبی | | " | | | | | | | | | | | | |
| [illegible]عۃ الادب | " | | | | | " | | | | | | | | |
| [illegible]عۃ العرب | | | | | | | " | | | | | " | | |
| نہج البلاغۃ | " | " | | | | | | " | | | | | | |

## صرف و نحو

کسی زبان کو جاننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس کے قواعد و ضوابط سے واقفیت حاصل کی جائے، صرف و نحو دراصل عربی زبان کے قواعد کا نام ہے اس لئے ایک دینی طالب علم کو ان کا پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس موضوع کی درج ذیل کتابیں مختلف مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں :

| نام کتب | الاصلاح | الفلاح | دیوبند | بنگال بورڈ | مالیر کوٹلہ | حیدر آباد | عمر آباد | ندوہ | بہار بورڈ | پھلواری | اشرفیہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| اسباق النحو | " | " | | | | | | | | | |
| پنج گنج | | | " | " | | | | | | | |
| تبویب الصرف | | | | | " | | | | | | |
| تسہیل الصرف | | | | | | " | | | | | |
| تطبیق الصرف | | | | | | | " | | | | |
| تطبیق النحو | | | | | | | " | | | | |
| تمرین الصرف | | | | | | | " | " | " | " | |
| تمرین النحو | | | | | " | | | " | " | " | |
| تیسیری المبتدی | | | | | | " | | | | | |
| شذ العرب | | | | | | | | " | | | |
| شرح جامی | | | " | " | " | | | | | | |
| شرح شذور الذہب | | | | | | | | " | | | |
| شرح ابن عقیل | | | | " | | " | | " | | | |
| شرح مایۃ عامل | | | | | | | | | | | |
| صرف میر | | | | | | | | | | | " |
| صفوۃ المصادر | | | | " | | | | | | | " |
| علم التصریف | | | | | | | | " | | | |
| علم الصیغہ | | | " | " | | " | | | " | | " |

| نام کتاب | [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] | ندوہ | [illegible] | پھلواری | اشرفیہ | جامعہ رحمانی | [illegible] |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| فصول اکبری | | | . | | | | | .. | | | | | |
| قواعد اللغۃ | | | | | | | | | | | | | |
| العربیۃ | | | .. | | | | | | | | | | |
| کافیہ | | | .. | .. | | | | | .. | .. | | .. | |
| کتاب الصرف | | | | | | | | .. | .. | | .. | | |
| کتاب النحو | | | | | | | | | .. | | .. | | |
| مبادی الصرف | | | | | .. | | | | | | | | |
| مفتاح الصرف | | | | | | . | | | | | | | |
| مفتاح النحو | | | | | | .. | | | | | | | |
| المفصل | .. | . | | | | | . | .. | | | | | |
| میزان ومنشعب | | | .. | .. | | | .. | | | | .. | | |
| نحو میر | | | .. | .. | | | | | .. | .. | | | |
| النحو الواضح | | . | .. | | | | .. | .. | | | | | .. |
| ہدایۃ النحو | | | .. | .. | | .. | .. | .. | .. | .. | | .. | |

ان کتابوں میں کچھ ایسی ہیں جو زبان وبیان اور اسلوب تحریر کے لحاظ سے مشکل ہیں جیسے کافیہ، شرح جامی اور شرح مایہ عامل وغیرہ۔ کافیہ تو ایسی مختصر اور مشکل کتاب ہے کہ اس کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کی درجنوں شرحیں لکھی گئی ہیں۔ شرح جامی تو کافیہ ہی کی شرح ہے۔ لیکن یہ بغیر حواشی کی مدد کے پورے طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ کتابیں جب طلباء پڑھتے ہیں تو ان کی عبارت فہمی ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اصل قواعد ان کے ذہن میں بہت مشکل سے بیٹھ پاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں دوسری کتابیں جیسے النحو الواضح، شذور الذہب، تمرین النحو، تمرین الصرف، شرح ابن عقیل، المفصل زیادہ آسان اور قواعد سکھانے کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام مدارس اسلامیہ میں صرف ونحو کی آسان وسہل کتابیں داخل درس کی جائیں اور مشکل کتابیں نصاب سے خارج کر دی جائیں تاکہ طلباء عربی زبان کے قواعد آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں اور کم سے کم وقت میں اس پر حاوی ہو سکیں۔

## بلاغت ومعانی

قرآن مجید فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہی نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ ہے۔ حدیث

شریف بھی فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔ قرآن و حدیث کی اس خوبی کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس فن کی اچھی کتابیں دینی مدارس کے نصاب میں شامل کی جائیں۔ چنانچہ ہمیں مندرجہ ذیل کتابیں مختلف مدارس کے نصاب میں ملتی ہیں :

| نام کتب | بنگال بورڈ | ندوہ | دیوبند | الاصلاح | معہد ملت | بہار بورڈ | عمر آباد | حیدر آباد | الفلاح | پھلواری | اشرفیہ | جامعہ رحمانی | مایہ تونہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| اسرار البلاغہ | " | | | | | | | | | | | | |
| اصول البلاغہ | | " | | | | | | | | | | | |
| البلاغۃ الواضحہ | | " | " | " | " | " | " | " | " | | | | |
| تلخیص المفتاح | " | | " | | | | | | | " | | | |
| جمہرۃ البلاغہ | | | | | | | | | " | | | | |
| دروس البلاغہ | | | | | | | | | | | | | |
| دلائل الاعجاز | " | " | | | | | " | | | | | | |
| سفینۃ البلغاء | | | | | | | | | | | " | | |
| مبادی البلاغہ | | | | | | | " | | | | | | |
| مجموع الادب | | | | | | | | | | | | " | |
| مختصر المعانی | " | | " | | | " | | " | | " | " | " | " |

ان تمام کتابوں میں مختصر المعانی اکثر مدارس میں داخلِ درس ہیں۔ جب کہ مذکورہ کتابوں کے مقابلے میں یہی زیادہ مشکل اور وقت طلب ہے۔ عہد حاضر کے طلباء کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت ہے کہ اس فن کی آسان کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں تاکہ طلباء کم سے کم وقت میں اس فن سے بخوبی آشنا ہو سکیں اور قرآن و حدیث کی فنی عظمت کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں۔

## عقائد

ہر مذہب میں اس کے عقائد کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ اس بنیاد پر اس مذہب کی فکر و عمل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور اس کا تہذیبی اور سماجی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔

اسلام چوں کہ ایک ٹھوس اور مستحکم مذہب ہے اس لئے اس کے عقائد بھی نہایت

مضبوط اور مستحکم حقائق پر مبنی ہیں۔ ان عقائد سے واقفیت ایک دینی طالب علم کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے اس فن کی اہم کتابیں مدارس میں داخل نصاب ہیں جو اس طرح ہیں :

| نام کتب | ندوہ | عمر آباد | دیوبند | بہار ورہ | بنگال ورہ | اشرفیہ | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | پھلواری | معہد ملت |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| رسالۃ التوحید | " | " | | | | | | | | |
| شرح عقائد نسفی | | | " | " | " | " | " | " | " | |
| شرح فقہ اکبر | | | | | " | | | " | | |
| العقیدۃ السنیہ | " | " | | " | | | | | | " |
| العقیدۃ الطحاویہ | | " | " | | | | " | | | |
| نسیم الکلام | | | | | | | | | " | |

ان تمام کتابوں میں شرح عقائد نسفی عام طور پر دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ جس کا اسلوب بیان پیچیدہ اور مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں العقیدۃ الطحاویۃ، شرح فقہ اکبر، العقیدۃ السنیہ زیادہ آسان اور دور حاضر کے طلباء کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اس لئے انہیں کتابوں کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

## منطق و فلسفہ

منطق و فلسفہ دو اہم موضوع ہیں۔ جو علوم آلیہ میں سے ہیں۔ یعنی ایسے علوم میں جن کے مطالعہ سے متقدمین علماء کی دینی کتابوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہیئت بھی ایک اہم موضوع ہے۔ اس بناء پر ان دونوں فن کی مندرجہ ذیل کتابیں مختلف مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

| نام کتب | مالیر کوٹلہ | پھلواری | دیوبند | اشرفیہ | حیدر آباد | الفلاح | معہد ملت | ندوہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| تصریح | " | " | | | | | | |
| تہذیب | | | " | " | " | " | | |
| تیسیر المنطق | | " | " | " | " | | | |
| جدید فلسفہ | | | " | | | | | |
| حمد اللہ | " | | | | | | | |
| حواشی زاہدیہ | " | | | | | | | |
| دروس فی الفلسفہ | | | | | | | | " |

| نام کتاب | ندوہ | دیوبند | مدرسہ عالیہ | مبارک پور | اشرفیہ | پھلواری | حیدر آباد | جامعہ رحمانی | عمر آباد | الفلاح | الاصلاح | بہار پور |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| دروس فی المنطق | ” | | | | | | | | | | | |
| سلم العلوم | | ” | | | | | | | | | | |
| شرح اشارات | | | ” | | | | | | | | | |
| شرح تہذیب | | ” | | ” | ” | ” | | | | | | |
| شرح چغمینی | | | ” | | | | | | | | | |
| شرح حکمۃ | | | | | | | | | | | | |
| الاشراق | | | ” | | | | | | | | | |
| شرح مواقف | | | ” | ” | | | | | | | | ” |
| شمس بازغہ | | | ” | | | | | | | | | |
| صدرا | | | ” | | | | | | | | | |
| قاضی مبارک | | | ” | | | | | | | | | |
| قطبی | | ” | | | | | ” | ” | | | | |
| کبریٰ | | | | | | | | ” | | | | |
| مرقاۃ | | ” | | ” | ” | ” | ” | ” | ” | ” | | |
| مسامرہ | | | | | | | | ” | | | | |
| المنطق والفلسفہ | | | | | | | | | | | ” | |
| میبذی | | ” | | | | | | | | | | |
| ہدایۃ الحکمت | | | | ” | | | ” | ” | | | | |
| ہدیہ سعیدیہ | | | | | | | | ” | | | | |

منطق و فلسفہ کی تعلیم کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلباء کو ان کے عہدے کے غیر اسلامی نظریات و افکار سے واقف کرایا جائے اور انہیں اس لائق بنایا جائے کہ وہ ان نظریات و افکار سے واقف ہو کر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا علمی و تحقیقی انداز سے جواب دے سکیں اور سچ پوچھئے تو مذکورہ تمام کتابیں اسی مقصد سے لکھی گئی تھیں جو مختلف عہد کی ہیں اور اپنے اپنے دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ علماء نے ان کتابوں کو اپنے اپنے مدرسہ کے نصاب تعلیم میں اس لئے داخل کیا تھا کہ طلباء اپنے عہد کے غیر اسلامی نظریات سے واقف ہو کر اسلام کی طرف سے ان کا علمی انداز میں جواب دے سکیں۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی کے علماء نے ان تمام کتابوں کو تبرک سمجھ کر اپنے اپنے مدرسہ کے نصاب میں داخل درس کیا۔ وہ اس بات کو فراموش کر گئے کہ ان کا دور متقدمین کے دور سے بالکل مختلف ہے۔ ان دونوں صدیوں میں سائنسی تحقیقات و انکشافات نے بہت سارے

حقائق بدل ڈالے۔ قدیم فلسفیانہ نظریات فرسودہ اور غلط قرار دے دیئے گئے۔ غور و فکر اور منطقیانہ طرز استدلال کے طریقے بھی بدل دیئے گئے۔

اب بالکل نئی دنیا ہے نئے حقائق ہیں اور نئی تحقیقات سے ہمارا مقابلہ ہے۔ ایسی صورت میں صرف قدیم فلسفیانہ نظریات کی کتابیں پڑھانا اور دور حاضر کی تحقیقات سے صرف نظر کرنا طلباء کو ذہنی طور پر Backward بنانا ہے اور اسلام کی صحیح خدمت کرنے سے انہیں محروم رکھنا ہے۔ چناں چہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے دینی مدارس کے طلباء منطق و فلسفہ کی درجنوں کتابیں پڑھنے کے بعد مدارس سے نکلتے ہیں تو انہیں اس بات کی قطعاً واقفیت نہیں ہوتی کہ جدید فلسفہ کیا ہے۔ اس کے بنیادی نظریات کیا ہیں۔ کون کون سے جدید فلاسفر ہیں اور اسلام نے ان کے فلسفیانہ خیالات کے کیا کیا جواب دیئے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ قدیم فلسفہ و منطق کی صرف دو ایک کتاب پڑھا کر جدید فلسفے اور منطق کی مختلف اچھی کتابیں داخل درس کی جائیں جن میں نہ صرف جدید فلسفیانہ نظریات کا تعارف ہو بلکہ اسلام کی طرف سے ان کا بھرپور جواب بھی موجود ہو۔ تاکہ طلباء جدید فلسفہ سے واقف ہونے کے ساتھ اسلام کے بنیادی عقائد اور فلسفیانہ نظریات سے پورے طور پر باخبر ہو سکیں اور پھر آگے چل کر دین اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکیں۔

خوشی کی بات ہے کہ اس ضرورت کو ہندوستان کے مشہور ترین تعلیمی ادارہ دارالعلوم دیوبند نے پہلی بار محسوس کیا اور ایک کتاب جدید فلسفہ کے نام سے اپنے یہاں کے نصاب میں شامل کیا ہے لیکن ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس فن کی مزید کتابیں داخل درس کی جائیں اور ہندوستان کے ہر مدرسہ میں پڑھائی جائیں۔

## تاریخ عالم

تاریخ عالم سے واقفیت ہر تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ضروری ہے۔ کیوں کہ وہ جس دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ انسانوں کے عروج و زوال، فتح و شکست، رنج و غم، خوشی و مسرت، امید و بیم، ناامیدی و مایوسی، صداقت و سچائی، کذب و افترا کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ جن کے مطالعہ سے ایک قاری کے معلومات میں نہ صرف بیش بہا اضافہ ہوتا ہے بلکہ سبق آموز واقعات جاننے سے اس کو اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے میں بہت ہی مدد ملتی

ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں بھی دو ایک اچھی کتاب داخل درس کی جائے۔ لیکن تمام مذکورہ مدارس میں صرف جامعہ رحمانی مونگیری ایسا تعلیمی ادارہ ہے جس نے اپنے نصاب میں تاریخ عالم کے نام سے ایک کتاب داخل درس کی ہے۔

## تاریخِ اسلام

اسلام کی ایک شان دار تاریخ ہے جس میں آنحضرت محمد ﷺ، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین علماء، خلفاء اور سلاطین اسلام کے مفصل حالات وواقعات نہایت مستند طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے واقفیت ایک عالم دین کے لئے ضروری ہے۔ کیوں کہ جو عالم دین اسلام کی تاریخ سے پوری طرح واقف نہ ہو وہ نہ تو کود اسلام کو پورے طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ امت مسلمہ کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیمات پیش کر سکتا ہے۔ اس لئے ہر دینی مدرسہ میں اس کی کوئی کتاب شامل درس ہونی چاہیئے۔ اب تک مندرجہ ذیل دینی ادارہ میں تاریخِ اسلام کی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں سیرت کے نام سے بھی اس فن کی کتاب داخلِ درس ہے۔

دیوبند، ندوہ، الاصلاح، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، جامعۃ الہدیٰ، الفلاح، عمر آباد، اشرفیہ، مالیر کوٹلہ، جامعہ رحمانی۔

## تاریخِ ہند

ہندوستان جغرافیائی لحاظ سے نہایت وسیع وعریض ملک ہے۔ جہاں خوب صورت اور پر شکوہ پہاڑ، دلکش دریا اور سمندر پائے جاتے ہیں۔ خوشگوار موسم، دلفریب چمن اور شاداب باغات ہیں۔ خوب صورت جانور اور چرند و پرند ہیں قیمتی معدنیات اور انمول ہیرے جواہرات ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے یہ قدیم ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ جہاں قدیم قومیں بستی ہیں اور جو رنگ ونسل، زبان وبیان، تہذیب وتمدن اور مذہبی اقدار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

اس ملک میں جہاں آریوں، بدھسٹوں اور جین مذہب کے پیروؤں نے ہزاروں سال تک حکومت کی ہے اور اپنے اپنے مذہب کا پرچار کیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں نے بھی یہاں تقریباً ایک ہزار سال تک شان دار حکومت کی ہے اور اپنی خوب صورت تہذیب وتمدن

اور مذہبی رواداری کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہاں کے علماء اور صوفیا نے دین اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں۔ کیوں کہ یہاں کی سرزمین معتدل، صلح پسند اور صالح اقدار کو قبول کرنے والی رہی ہے۔ اب تک صرف چند دینی مدارس میں اس فن کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو یہ ہیں۔ دیوبند، ندوہ، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، جامعہ رحمانی، الفلاح۔

ضرورت کا تقاضا ہے کہ ملک کے ہر مدرسہ میں اس فن کی کتابیں پڑھائی جائیں اور طلباء کو یہاں کے تاریخی و جغرافیائی حالات وواقعات سے باخبر کرایا جائے۔

## جنرل سائنس

موجودہ دور میں سائنس نے نہایت اونچا مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کی بدولت آج کا انسان چاند پر پہنچ چکا ہے۔

اس نے بہت سارے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جو مذہب کے لئے چیلنج ہیں اور جن کو حل کرنا ایک مذہبی پیشوا کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے سائنس کی مبادیات سے دینی طالب علم کو واقف ہونا لازم ہے تاکہ وہ آگے چل کر مزید اس کا مطالعہ کر کے مذہب کے خلاف چیلنج کا جواب دے سکے۔ اس وقت مندرجہ ذیل مدارس میں اس موضوع کی کتابیں پڑھائی جارہی ہیں۔

دیوبند، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، جامعۃ الہدیٰ، الفلاح، عمر آباد، جامعہ رحمانی۔

جب کہ ضرورت ہے کہ ہر مدرسہ کے نصاب میں اس موضوع کی کتابیں داخل درس کی جائیں۔

## معلومات عامہ

جس دنیا میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس میں تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے بہت ساری گراں قدر اور اہم چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جن سے واقفیت ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ بعض مدارس دینیہ نے اس کی ضرورت محسوس کی ہے اور اپنے نصاب میں اس موضوع کی کتاب داخل درس کیا ہے۔ وہ مدارس یہ ہیں۔ ندوہ، معہد ملت، بہار بورڈ، عمر آباد، الفلاح۔

## حساب

ہر آدمی اپنے روزمرہ کی زندگی میں حساب کتاب کا محتاج ہوتا ہے۔بلکہ ایک عالم دین کو بعض مذہبی امور جیسے تقسیم وراثت وغیرہ کے سلسلے میں حساب دانی کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ایسی صورت میں دینی مدارس کے نصاب میں ایسی کتابوں کو شامل کرنا ضروری ہوتا ہے جن کو پڑھ کر طلباء حساب سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔اس فن کی کتابیں صرف مندرجہ ذیل مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

دیوبند، ندوہ، الاصلاح، الفلاح، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، جامعۃ الہدیٰ۔

جب کہ ضرورت ہے کہ ہر دینی مدرسہ میں اس کی تعلیم دی جائے۔

## جغرافیہ

جغرافیہ ایک اہم فن ہے جس میں کسی علاقے یا ملک کے حدود اربعہ، آبادی، موسم، پہاڑ، پیداوار وغیرہ جیسے ضروری امور سے بحث کی جاتی ہے۔

پھر دنیا کے ہر ملک کا الگ الگ جغرافیہ ہوتا ہے۔آب وہوا اور موسم کے لحاظ سے بھی تقریباً ہر ملک کی الگ الگ خصوصیت ہوتی ہے۔وہاں کے باشندوں کے مزاج، رسم ورواج اور رہن سہن کے طور وطریق بھی جدا جدا ہیں، ہر ملک کے طلوع وغروب کا وقت بھی یکساں نہیں ہے۔آب وہوا اور موسم کی تبدیلی کی بناء پر ان کی ضروریات اور تقاضے بھی علیحدہ ہیں۔ ایسی صورت میں ایک عالم دین جب تک ان تمام باتوں کی جان کاری نہیں رکھتا اس وقت تک وہ وہاں کے ملکی مسائل میں صحیح طور پر رہنمائی نہیں کر سکتا اور نہ عالمانہ رول ادا کر سکتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اب تک صرف مندرجہ ذیل مدارس میں اس فن کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

دیوبند، ندوہ، الاصلاح، الفلاح، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، جامعۃ الہدیٰ، جامعہ رحمانی۔

جب کہ ضرورت ہے کہ ہر مدرسہ کے نصاب میں اس موضوع کی کتابیں شامل کی جائیں۔

## معاشیات

اسلام نے اپنا معاشی نظام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جو نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے

اور انسانوں کی معاشی بدحالی و پریشانی کا واحد علاج ہے لیکن یہ نظام موجودہ دور کے معاشی نظام سے کس قدر مختلف ہے۔ دور حاضر میں کون کون سے معاشی نظام چل رہے ہیں۔ ان کی بنیادیں کیا کیا ہیں۔ وہ انسانوں کی بدحالی دور کرنے میں کہاں تک مفید ثابت ہورہے ہیں یا تباہی و بربادی کے گھاٹ پر پہنچا رہے ہیں۔ ان تمام امور کی جانکاری ایک عالم دین کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ ان کا تقابلی مطالعہ کرکے دنیا کے سامنے صحیح اور واضح معاشی نظام پیش کرسکے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایسے اہم اور ضروری موضوع کی کتابیں صرف چار مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں اور وہ ہیں۔ دیوبند، ندوہ، بہار بورڈ، الفلاح۔

## سیاسیات

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جس نے سیاسیات میں بھی اپنا مخصوص نظریہ پیش کیا ہے جو ٹھوس حقائق اور مفید عناصر پر مبنی ہے اس کے مقابلے میں عصر حاضر میں مختلف سیاسی نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ جو دنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہیں۔ لیکن یہ نظریات کہاں تک صحیح ہیں انسانوں کے لئے مفید ہیں یا غیر مفید۔ انسانوں کے لئے مناسب ترین سیاسی نظام کیا ہوسکتا ہے؟ ان تمام باتوں سے واقفیت ایک عالم دین کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ ایک دینی قائد ہونے کی بناء پر دنیا کے سامنے صحیح سیاسی نظام پیش کرسکے اور انسانوں کے تمام خود ساختہ سیاسی نظریات کو رد کرکے اسلام کے سیاسی نظریہ کی فوقیت، برتری اور فوائد ثابت کرسکے۔ ضرورت ہے کہ تمام دینی مدارس میں اس طرح کی کتابیں داخل درس کی جائیں لیکن حیرت ہے کہ اب تک صرف دو ہی مدرسہ میں اس موضوع کی کتاب پڑھائی جاتی ہے اور وہ ہے دارالعلوم دیوبند، الفلاح۔

## سماجیات

جس سماج میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ قدیم زمانے سے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہے۔ ہر دور میں مختلف قومیں گزری ہیں اور ہر قوم کا الگ الگ مزاج، رسم و رواج اور طرز رہائش رہا ہے۔ آج بھی دنیا میں ہزاروں قومیں بستی ہیں اور ہر قوم کا طور طریقہ عادات و خصائل اور فہم و فکر کا انداز ایک دوسرے سے الگ ہے اور اسی بناء پر دور حاضر میں سماج اور اس کی تاریخ کو ایک خاص مقام حاصل ہوگیا ہے اور اس موضوع پر نہایت

گراں قدر کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ آج یہ ایک مستقل فن بن گیا ہے جو علم سماج یا سماجیات کے نام سے معروف ہے۔ موجودہ دور میں ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ کم از کم اس کی مبادیات سے واقفیت حاصل کرے تاکہ ایک اچھے سماج کی تعمیر میں اپنا کوئی اچھا رول ادا کر سکے۔

## دستورِ ہند

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ جہاں مختلف قوموں، طبقوں، مذہب والوں کو رہنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ اس ملک کا ایک جمہوری آئین اور قانون ہے جس سے واقفیت یہاں کے ہر باشندہ کو ہونی چاہئے۔ خوشی کی بات ہے کہ تمام دینی مدارس میں صرف ایک تعلیمی ادارہ دارالعلوم دیوبند نے اس کی ضرورت محسوس کرکے اپنے نصاب میں دستورِ ہند نامی کتاب داخل درس کیا ہے۔

## انگریزی

انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے جو دنیا کے بیشتر ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے علاوہ اسلامیات کا وافر ذخیرہ اس زبان میں موجودہ ہے۔ خاص طور پر مستشرقین کے جو علمی، تحقیقی، تنقیدی کارنامے ہیں وہ زیادہ تر اس زبان میں ملتے ہیں۔ جب تک کوئی تعلیم یافتہ آدمی اس زبان سے واقف نہ ہو وہ ان کے علمی کارناموں سے مستفید نہیں ہو سکتا اور نہ اسے اس بات کا علم ہو سکتا ہے کہ یورپی ممالک کے ماہرین اسلامیات نے کیا کہا ہے اور ان کے دلائل کیا ہیں۔ اس لئے عصر حاضر کے ایک عالم دین کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان سے بخوبی واقفیت حاصل کرے اور پھر مستشرقین کے لٹریچر کا مطالعہ کرکے اسلام کی طرف سے ان کا بھرپور جواب دے۔ اب تک مندرجہ ذیل مدارس میں اس زبان کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

دیوبند، ندوہ، الاصلاح، معہد ملت، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، جامعۃ الہدیٰ، الفلاح۔

## ہندی

ہندی زبان ہمارے ملک کی پہلی سرکاری زبان ہے جس کو یہاں کی بہت بڑی آبادی بولتی

اور سمجھتی ہے۔ اس کے علاوہ برادران وطن اسلامی تعلیمات سے بہت کم واقف ہیں، کیوں کہ ہندی زبان میں اسلامیات پر کام بہت کم ہوا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر عالم دین اس زبان سے واقف ہو اور اس میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر تیار کیا جائے۔ لیکن سخت حیرت کی بات ہے کہ اس زبان کی کتاب صرف مندرجہ ذیل مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ دیوبند، الاصلاح، الفلاح، بہار بورڈ، جامعہ رحمانی۔ پتہ نہیں دیگر مدارس اس کی کتاب داخل درس کرنے سے گریز کیوں کرتے ہیں۔

## اردو

اردو ایک بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ جس کے بولنے اور سمجھنے والے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیاء اور یورپ کے ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں اسلامیات کا اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو چکا ہے۔ جو دینیات، عقائد، کلام، منطق و فلسفہ، سائنسی علوم وغیرہ تمام موضوعات پر محیط ہے۔ مذکورہ مدارس کے نصاب تعلیم میں صرف مندرجہ ذیل مدارس میں اس زبان کی کتاب شامل درس ہونے کی اطلاع ملتی ہے۔

دیوبند، ندوہ، الاصلاح، معہد ملت، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، جامعۃ الہدیٰ، جامعہ رحمانی، عمر آباد۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی کوئی نہ کوئی کتاب ہندوستان کے تقریباً سب ہی مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ارباب مدرسہ جہاں ایک طرف اس زبان کے ذریعہ اشاعت دین کا کام کر رہے ہیں وہیں دوسری طرف وہ خود اس زبان کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا رول ادا کر رہے ہیں۔ کیوں کہ آج اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں اردو کے جو طلباء نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر کسی نہ کسی مدرسہ یا مکتب کے فیض یافتہ ہوتے ہیں۔

## فارسی

یہ ایک مسلمان ملک ایران کی زبان ہے۔ جس میں اسلامی تاریخ، ادب، سائنس وغیرہ کے علاوہ دینیات کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مسلمانی عہد میں یہ زبان کافی عروج پر رہی ہے۔ اس عہد میں تاریخ ہند، تاریخ اسلام، ادب، تذکرہ، کلام، منطق و فلسفہ، ہیئت اور دیگر علوم و فنون پر لکھی گئی کتابیں وافر مقدار میں موجود ہیں جو اپنی فنی خوبیوں اور تحقیقات کی بناء پر آج بھی عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے

اس زبان کا پڑھنا ہر دینی طالب علم کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل مدارس میں اس زبان کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

دیوبند، الاصلاح، معہد ملت، بہار بورڈ، بنگال بورڈ، اشرفیہ، مالیر کوٹلہ، الفلاح۔

لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے علاوہ دیگر مدارس میں بھی اس زبان کی کتاب پڑھائی جاتی ہے اور اس لحاظ سے فارسی زبان کی اشاعت میں دینی مدارس بڑا اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

## علاقائی زبانیں

ہندوستان میں علاقائی زبانوں کی بڑی اہمیت ہے۔ کیوں کہ اس علاقہ کی ایک بہت بڑی آبادی اس زبان کو بولتی اور سمجھتی ہے ضرورت ہے کہ ہر علاقہ کے مدارس میں وہاں کی زبان کی کتابیں داخل درس کی جائیں تاکہ وہاں کے دینی طلباء اس زبان سے واقف ہو کر اس زبان میں تبلیغ واشاعت دین کا کام کر سکیں اور اسلامی لٹریچر تیار کر سکیں۔ اس طرح ہندوستان کی ہر زبان میں اسلامیات کی کتابیں تیار ہو جائیں گی۔ خوشی کی بات ہے کہ بنگال بورڈ نے اپنے نصاب میں اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بنگالی زبان کی کتاب داخل درس کیا ہے۔ اس طرح مالیگاؤں نے بھی اپنی علاقائی زبان میں دینی تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کی ہے اور مراٹھی زبان کی کتاب اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔

# روداد و تجاویز اجلاس رانچی و دہلی

جاوید اشرف
(خدابخش لائبریری)

خدابخش لائبریری کے زیراہتمام مولانا آزاد صدی تقریبات کے تحت گزشتہ ۷، ۸، ۹ مئی ۹۰ء کو راج بھون رانچی میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے کے موضوع پر ایک نمائندہ سیمینار منعقد ہوا۔ جس میں بہار اڑیسہ، یوپی اور آندھرا پردیش کے سابق و موجودہ گورنروں کے علاوہ ہندوستان مدارس اسلامیہ کے ممتاز علماء و فضلا اور دانشوران ملک وملت نے شرکت کی۔

رانچی کے افتتاحی اجلاس میں ڈائریکٹر خدابخش لائبریری ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا پھر مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کا معذرت نامہ اور خطبہ افتتاحیہ پڑھ کر سنایا گیا اس کے بعد موجودہ گورنر آندھرا پردیش جناب کرشناکانت صاحب، موجودہ گورنر اترپردیش جناب ایس این ریڈی صاحب، سابق گورنر اڑیسہ جناب بی این پانڈے صاحب، سابق گورنر بہار جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب، آزاد ہند فوج کے کرنل محبوب احمد صاحب، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ جناب انور جمال قدوائی صاحب، سابق چیف جسٹس پٹنہ کورٹ جناب سرور علی صاحب اور دیگر معززین کے خطبات ہوئے۔ اس کے بعد موجودہ گورنر بہار جناب محمد یونس سلیم صاحب نے اپنے صدارتی کلمات سے اجلاس کو مستفیض کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد ایک سیشن مولانا آزاد پر ہوا۔ جس میں مولانا آزاد کے تشکیلی عہد کی ابتدائی دو دہائیوں پر اور آخری تاریخ ساز عہد یعنی آزادی کے قبل کی آخری دہائی پر دو

مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ بیس سال پر مشتمل تھا جس میں مولانا آزاد کے غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں ان کی شخصیت کی تعمیر اور نفسیات کی تشکیل کے ساتھ ساتھ ان کے خاندانی کوائف اور ان کے فکر و نظر کے وہ گوشے اجاگر کئے گئے جو نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ یہ مقالہ محترمہ شائستہ خاں خدابخش فیلو نے پیش کیا تھا۔

۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء کی خطرناک دہائی پر جنگ آزادی کے سپاہی محترم تقی رحیم صاحب کا مقالہ تھا جس کا عنوان تھا "مولانا آزاد کے تیس صفحات" اس مقالہ میں پہلی بار تیس صفحات کے حوالہ سے ہندوستانی سیاست کے آزادی سے قبل کے دس سال کا منصفانہ تجزیہ اور اس کے تناظر میں آزاد کی شخصیت اور کردار کا تعین کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ دو مقالے مولانا آزاد کے رانچی کے تعلق سے لکھے گئے تھے ایک "رانچی غبار خاطر کے آئینے میں" از ڈاکٹر اسلم پرویز، دوسرا انگریزی میں مقالہ "رانچی اینڈ مولانا آزاد" از ڈاکٹر شیل مادھو پاٹھک شعبہ تاریخ رانچی یونیورسٹی۔

دوسرے دن صبح سے دوپہر تک کا سیشن بھی مولانا آزاد کے لئے مختص رہا اور شام کا سیشن مدرسہ سسٹم کے لئے۔ پھر غروب آفتاب کے بعد بہار میں یونیورسٹی تعلیم کے مسائل پر ایک سیشن ہوا۔ یونیورسٹی تعلیم پر غور کیا جانا مدرسہ تعلیم کو تناظر دینے کے لئے ضروری تھا۔ یونیورسٹی تعلیم کے سیشن کا آغاز بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر شکیل احمد کے مقالہ سے ہوا۔ بحث میں وائس چانسلر برسا یونیورسٹی، ڈاکٹر ایچ آر مشرا، وائس چانسلر رانچی یونیورسٹی جناب لال سنگھ صاحب، سابق وائس چانسلر جامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب، چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب، چانسلر آندھرا پردیش جامعات شری کرشنا کانت پرو وائس چانسلر رانچی یونیورسٹی ڈاکٹر سنہا، سابق وائس چانسلر رانچی یونیورسٹی جناب رام دیال منڈا صاحب نے حصہ لیا۔ خصوصی طور پر ایجوکیشن کمشنر مسٹر ٹی سہائے نے اعداد و شمار پیش کر کے ثابت کیا کہ جامعات میں تعلیم کی صورت حال ہیبت ناک حد تک اندوہ ناک ہے لیکن اگر سیاسی دباؤ ختم ہو جائے تو مایوسی کی اب بھی کوئی وجہ نہیں۔

تیسرے دن ۱۰ بجے صبح سے ۵ بجے شام تک کا سیشن مدرسہ سسٹم کے مسائل پر موقوف رہا۔ پھر اسی شام ۷ بجے پبلک اردو لائبریری رانچی کے زیر اہتمام رانچی کی جانب سے

ایک استقبالیہ تھا۔ اس سے قبل کی دو شاموں میں رانچی یونیورسٹی اور انجمن اسلامیہ کے استقبالیے ہو چکے تھے۔ استقبالیوں میں اس امر پر زیادہ زور دیا جاتا رہا کہ مولانا آزاد نے رانچی سے لئے جو اصلاحی مہم شروع کی تھی وہ مضمحل کیوں ہوگئی۔ ان کا قائم کردہ مدرسہ کس مپرسی کا شکار کیوں ہے؟ ان کے نام پر قائم کردہ یادگار جس کا سنگ بنیاد سابق وزیر اعظم نے رکھا۔ محض اس سنگ بنیاد سے آگے کیوں نہ بڑھ پایا۔ مولانا کے نام پر قائم کردہ مولانا آزاد کالج بہار کا تیسرے درجے کا کالج کیوں ہے۔ شکر کا مقام تھا کہ اس ہر کیوں کے پیچھے چھپی یاس انگیزی کا شاندار جواب انجمن اسلامیہ کے کارکنوں عبدالجبار صاحب، شاہنواز احمد خان صاحب اور ان کے ساتھیوں نے عملی طور سے اس طرح مہیا کر دیا تھا کہ ساتھ سے اوپر دکانیں تعمیر کرا کے انجمن اسلامیہ کو لاکھوں روپے کی آمدنی مہیا کر دی تھی۔ جس سے اب انجمن اپنے ادارے خود بھی چلا سکتی تھی۔

رانچی اجلاس میں وہ ادارے جن کی نمائندگی ہوئی حسب ذیل ہیں :

دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو، مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ حسینیہ رانچی، جامعہ سعیدیہ رانچی، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ، مدرسہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، مدرسہ مفتاح العلوم مئو، مدرسہ عالیہ رام پور، مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سٹی، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، امارت شرعیہ پھلواری شریف، خانقاہ منعمیہ ابو العلائیہ پٹنہ، خانقاہ منعمیہ قمریہ پٹنہ، مدرسہ تاج المساجد بھوپال، انسان اسکول کشن گنج، انجمن اسلامیہ رانچی، خانقاہ رحمانیہ مونگیر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی، دہلی یونیورسٹی، رانچی یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی، برسا یونیورسٹی اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری وغیرہ۔

مدعوئین جن کے معذرت نامے آگئے حسب ذیل ہیں :

جناب رفیق زکریا صاحب (ممبئی)، جناب سید ابو الحسن علی ندوی صاحب (لکھنو)، جناب حکیم عبدالحمید صاحب (دہلی)، جناب سید ہاشم علی صاحب (حیدر آباد)، جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دارالعلوم (دیوبند)، جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب (علی گڑھ)، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب (بنگلور)، جناب سید حامد صاحب (دہلی)، جناب منظور الحسن صاحب (ٹونک)، جناب پروفیسر آل احمد سرور صاحب (علی گڑھ)، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی

صاحب (علی گڑھ)، جناب مولانا منت اللہ رحمانی صاحب (مونگیر)، جناب ارشد القادری صاحب (جمشید پور)، جناب محمود حسن قیصر صاحب (علی گڑھ)، جناب عبدالسمیع جعفری صاحب (پٹنہ)، جناب مولانا محمد عمر صاحب شاہی مسجد (مراد آباد)، جناب مولانا نورالعین سلفی صاحب (مالیگاؤں)، جناب شمس نوید عثمانی صاحب (رام پور)۔

رانچی اجلاس کے مدعوئین جو اپنے مقالات کے ساتھ شریک ہوئے مندرجہ ذیل ہیں:

شاہ محمد اسماعیل صاحب (پٹنہ)، مولانا محمد شاہ جہاں قاسمی (پٹنہ)، جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب (اعظم گڑھ)، جناب مولانا ابو سفیان مفتاحی صاحب (مئو)، جناب سید محمد عابدی صاحب (پٹنہ)، جناب بشیر احمد صاحب (اڑیسہ)، جناب مولانا نثار احمد قاسمی صاحب (مئو)، جناب سید اسد رضا رضوی صاحب (پٹنہ)، جناب بدر احمد مجیبی صاحب (پٹنہ)، جناب مولانا ابو محفوظ الکریم المعصومی صاحب (کلکتہ)، جناب ڈاکٹر یحییٰ ندوی صاحب (بیگو سرائے)، جناب عبدالسلام صاحب (رام پور)، جناب مولانا حبیب ریحان ندوی صاحب (بھوپال)، ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب (رانچی)، جناب ابو البقاندوی صاحب (اعظم گڑھ)، جناب مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب (پٹنہ)، جناب معین الدین احمد صاحب (کٹک)، جناب محمد ولی رحمانی صاحب (مونگیر)، جناب اقبال احمد انصاری صاحب (علی گڑھ)، جناب احمد علی قاسمی صاحب (دہلی)، جناب سید حسن صاحب (کشن گنج)، جناب تقی رحیم صاحب (پٹنہ)، جناب غلام ربانی صاحب (رانچی)، جناب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب (اعظم گڑھ)، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن خان صاحب (گونڈہ)، ڈاکٹر شکیل احمد صاحب، وائس چانسلر بہار یونیورسٹی (مظفر پور)، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب (دہلی)، محترمہ شائستہ خاں صاحبہ (پٹنہ)، ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی صاحب (رانچی)، جناب مولانا اشفاق احمد سلفی صاحب (دربھنگہ)، جناب مولانا معین الدین قاسمی صاحب (گیا)، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن صاحب (پٹنہ)۔

مندرجہ ذیل صاحبان کے مقالے آگئے لیکن وہ خود شریک نہ ہو سکے:

جناب مونس رضا صاحب (دہلی)، جناب نہال احمد کریمی صاحب (مظفر پور)، جناب سید حامد صاحب (دہلی)، جناب اشتیاق حسین قریشی صاحب (لکھنو)، جناب شبیر احمد خاں غوری صاحب (علی گڑھ)، جناب سید ابوالحسن علی ندوی صاحب (لکھنو)، جناب مولانا

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی صاحب، مدرسۃ الاصلاح (اعظم گڑھ)، جناب نہال احمد کریمی صاحب (پٹنہ)، محترمہ نجمہ ہبت اللہ (دہلی)، جناب سید شہاب الدین دسنوی و میر اکبر علی خان صاحب (حیدر آباد)۔

زبانی جن صاحبوں نے بحث میں بھرپور حصہ لیا ان کے نام نامی مندرجہ ذیل ہیں :

پروفیسر آفتاب محسن صاحب، ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب، ڈاکٹر لال صاحب سنگھ وائس چانسلر رانچی یونیورسٹی، پرووائس چانسلر صاحب رانچی یونیورسٹی، وائس چانسلر برسا یونیورسٹی، جناب ڈاکٹر ایچ آر مشرا، سابق وائس چانسلر رانچی یونیورسٹی، جناب رام دیال منڈا صاحب، ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب، جناب محمد محفوظ عالم صاحب، جناب محمد اختر صاحب، جناب بی سی کمار صاحب، جناب بقراط صاحب، جناب پاٹھک صاحب، جناب رام دھیان سنگھ، جناب ابن حبیب صاحب، جناب شین اختر صاحب، جناب ابوذر عثمانی صاحب، جناب جمشید قمر صاحب، جناب حاجی اسماعیل صاحب، جناب بدرالہدیٰ صاحب، جناب شفیق محسن صاحب، جناب مظہر عالم صاحب، جناب شعیب رحمانی صاحب، جناب دوبے جی، جناب بشمبھر ناتھ پانڈے جی، جناب کرشن کانت جی۔

رانچی اجلاس کے وہ شرکاء جنہوں نے مدارس اسلامیہ کے مسائل پر اپنی تجاویز پیش کیں :

جناب اقبال انصاری صاحب، جناب سرفراز احمد خان صاحب، جناب حبیب ریحان ندوی صاحب، جناب غلام ربانی صاحب، جناب اسلم پرویز صاحب، جناب عبدالسلام خان صاحب، جناب سید اسد رضا صاحب، جناب یحییٰ ندوی صاحب، جناب خورشید ہاشمی صاحب، جناب ابو محفوظ الکریم المعصومی صاحب، جناب شاہنواز احمد خان صاحب، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن صاحب، جناب ولی رحمانی صاحب، جناب طاہر مدنی صاحب، جناب سید حسن صاحب، جناب محمود عالم ہاشمی صاحب، جناب شاہجہاں قاسمی صاحب، جناب وکیل احمد رضوی صاحب، جناب تقی رحیم صاحب، جناب ایس ایم پٹیل صاحب، جناب آفتاب محسن صاحب، جناب مجیب اللہ ندوی صاحب، جناب احمد علی قاسمی صاحب، جناب ابوذر عثمانی صاحب، جناب شائستہ خان صاحب، جناب عطا خورشید صاحب، جناب ذکی الرحمٰن وارثی صاحب، جناب بدر مجیبی صاحب، جناب ڈاکٹر محمد محسن صاحب، جناب سید مظہر الحق

صاحب، جناب ثمر الحق صاحب، جناب محمد طاہر صاحب، جناب محمد اشفاق صاحب، جناب انیس الرحمٰن قاسمی صاحب، قاری معین الدین صاحب، نثار احمد قاسمی صاحب، جناب بشیر احمد خان صاحب، جناب سید محمد عابدی صاحب، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب، جناب شاہ اسماعیل صاحب، جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب، محترمہ معزز جہاں صاحبہ، ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب، جناب بقراط صاحب، ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی صاحب، جناب صفات احمد صاحب۔

رانچی اجلاس میں چالیس کے قریب مقالے پڑھے گئے، ساٹھ کے قریب شرکاء نے بحث میں حصہ لیا، مدرسہ سسٹم اور یونیورسٹی سسٹم پر کھل کر تفصیل سے تین دن تک بحث ہوئی۔ مدرسہ سسٹم پر مولانا آزاد کے اپنے مخصوص خیالات تھے، وہ مدارس کی ترقی میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، مولانا نئے ہندوستان کے یونیورسٹی سسٹم اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ساری ترقیوں کے بھی جنم داتا ہیں، اسی لئے گفتگو بار بار ان کے حوالے سے ہوتی رہی اور اس طرح آزاد صدی تقریب کا مقصد پورا ہوتا رہا۔ آخر میں پچاس کے قریب شرکاء نے اپنی سوچی سمجھی تجاویز اجلاس کے سامنے رکھیں۔

خدابخش لائبریری کے زیر اہتمام مولانا آزاد صدی تقریبات کے تحت "مدارس اسلامیہ کے نظام و نصاب تعلیم اور عصری تقاضے" کے موضوع پر رانچی اجلاس کے فیصلے کے مطابق دہلی میں ۷ جون کو بہار بھون میں علماء و فضلا اور ممتاز دانش وروں کا ایک مشاورتی جلسہ زیر صدارت جناب محمد یونس سلیم صاحب گورنر بہار منعقد ہوا۔ جس میں باتفاق آرا یہ تجاویز طے پائیں کہ:

"اس کی سفارشوں کو آگے بڑھانے کے لئے جناب محمد یونس سلیم صاحب، چیئرمین خدابخش لائبریری کمیٹی کی صدارت میں ایک ایسی چھوٹی کمیٹی مقرر کی جائے جس کے کنوینر ڈاکٹر عابد رضا بیدار ہوں اور جس کے ارکان جناب صدر کے نامزد کئے ہوئے ہوں گے۔ یہ کمیٹی ایک مستقل مرکزی تنظیم کی تشکیل کرے جو ماہرین کی کمیٹیاں مقرر کرے گی۔ یہ تنظیم نصاب، ٹیکنیکل تعلیم اور عصری علوم کے لئے ڈرافٹ اسکیم تیار کرے جسے مدارس کو بھیج کر استصواب رائے کیا جا سکے ان کی آراء کی روشنی میں فائنل ترمیمات یا اسکیم کا مسودہ تیار کیا جائے، اسی مرکزی تنظیم کے ذمے سیمینار کی دوسری سفارشات کو عملی جامہ پہنانا بھی

ہو۔

مرکزی کمیٹی، مرکزی مدارس اور تعلیم گاہوں کی موقر نمائندگی پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ نیز اصلاح وترمیم سے پہلے مدارس اسلامیہ سے مشورہ کر کے مدارس عربیہ کے بنیادی مقاصد کی تعیین کرالی جائے اور پھر اسی کی روشنی میں کام آگے بڑھایا جائے۔"

دہلی اجلاس میں ۵۲ مدعوئین میں سے حسب ذیل حضرات نے شرکت کی اور تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

تعلیمات اسلامیہ عربیہ کے زبردست بہی خواہ سابق گورنر اڑیسہ جناب بی این پانڈے صاحب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب، دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب مونس رضا صاحب، دہلی کے جناب احمد رشید شروانی صاحب، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کے ڈاکٹر بسمل پرشاد صاحب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب، لکھنو کے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب، پروفیسر وصی الرحمٰن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نمائندے سائنٹسٹ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، دہلی کے جناب رام دتادوبے صاحب، پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس سرور علی صاحب، پٹنہ کے جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب، دہلی کے جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب، وقف دارالعلوم دیوبند کے جناب مولانا محمد سالم قاسمی صاحب، جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے اور دارالعلوم دیوبند کے نمائندے جناب مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب، ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے نمائندے جناب مولانا مفتی مجدد القدوس صاحب اور مولانا مفتی عبدالحسیب صاحب، جناب مولانا رابع ندوی صاحب اور ندوۃ العلماء کے نمائندے جناب مولانا نذر الحفیظ صاحب، جناب محمد یونس سلیم صاحب، گورنر بہار، جناب کرشنا کانت صاحب گورنر، ایم پی جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب ڈائریکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ، دارالعلوم وقف دیوبند کے جناب مولانا انظر شاہ مسعودی صاحب، علی گڑھ کے جناب شبیر احمد خان غوری صاحب، دہلی کے جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، دہلی کے جناب مولانا اخلاق حسین قاسمی، صاحب، لکھنو کے جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب، حال مقیم لندن۔

دہلی اجلاس میں چار کلیدی مقالے جناب مولانا محمد سالم قاسمی صاحب (دیوبند)، مولانا

مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب، (دیوبند)، جناب مولانا نذر الحفیظ صاحب (ندوۃ العلماء لکھنو)، جناب مولانا مفتی مجد القدوس صاحب (مظاہر العلوم، سہارن پور)، کے پڑھے گئے دیگر شرکاء نے زبانی بحث میں حصہ لیا اور اپنے قیمتی افکار سے نوازا۔

پچھلے ماہ رانچی میں عربی مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم پر جو گفتگو ہوئی تھی اس کے نتیجہ میں یہ طے پایا کہ علماء و فضلا کا ایک منتخب مشاورتی اجلاس دہلی میں پھر منعقد ہو جس میں رانچی اجلاس کی گفتگو کے ماحصل کو سامنے رکھ کر ضروری باتوں پر مشورہ کر لیا جائے، اسی فیصلے کے مطابق یہ چوٹی مشاورتی اجلاس ۷ جون کو دس بجے بہار بھون دہلی میں ہوا، اس موقع پر جو امور زیر بحث آئے ان میں مندرجہ ذیل باتیں بھی شامل ہیں۔

(۱) کیا عربی مدارس میں عصری علوم / عصری زبانوں کی تعلیم کو بھی رواج دیا جائے ؟ اگر ہاں تو اس سے پیدا شدہ مسائل! (۲) کیا مدارس عربیہ کو سینٹر آف ایڈوانس اسٹیڈیز مان کر ان کے اصل خطوط پر ہی چل کر انہیں ترقی نہیں دی جاسکتی ؟ (۳) کیا مدارس کی ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد خواہش مندوں کے لئے یا یوں کہئے کہ اعلیٰ تعلیم کی خواہش نہ رکھنے والوں کے لئے پولی ٹیکنک ادارے نہیں کھولے جاسکتے۔ (۴) مزارات کے اوقاف کی طرح مدارس کی گرانٹ کے صحیح یا غلط مصارف کے مسئلہ میں الجھے بغیر کیا ضروری اصلاحیں عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔

## تجاویز

☆ مدرسہ وہ ادارہ ہے جہاں درس و تدریس کا کام ہو جہاں ایک جاننے والا نہ جاننے والے تک علم کو پہنچا دے۔ مدرسہ صرف بخاری ترمذی پڑھانے کا نام نہیں بلکہ مدرسہ وہ ہے جہاں دیگر علوم و فنون بھی پڑھائے جائیں۔ ☆ یہ عرب اور اسلام کا کمال تھا کہ اس نے یونانی علوم کو بچایا ورنہ وہ علوم دنیا ہی سے ختم ہو جاتے۔ ☆ دو قسم کے ادارے ہوتے ہیں، ایک وہ جو عربی زبان لینگویج کی حیثیت سے پڑھاتے ہیں، وہ مدارس عربیہ کہلاتے ہیں، دوسرے وہ ادارے جو دین پڑھاتے ہیں وہ مدارس دینیہ کہلاتے ہیں۔ دینی ادارے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک ابتدائی مرحلہ وہ مدارس دینیہ کہلائے۔ اگرچہ اس میں عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں، پھر دین اسلام کے اعلیٰ درجے کے مدارس، مدارس عربیہ کہلاتے ہیں۔

یونیورسٹی میں بھی عربی پڑھائی جاتی ہے، پھر دین اسلام کے اعلیٰ درجے کے مدارس، مدارس عربیہ کہلاتے ہیں، یونیورسٹی میں بھی عربی پڑھائی جاتی ہے۔ مگر وہ مدارس عربیہ نہیں کہلاتے۔ ☆ ابتدائی درجے کے مدارس دینیہ کا نام ہے مکاتب اسلامیہ، جن کے دو مقصود ہیں۔ ایک دین جو ہر مسلمان کی دینی ضرورت ہے اور دنیا جو ہر مسلمان کی دنیاوی ضرورت ہے۔ مکاتب اسلامیہ میں قرآن شریف ناظرہ بھی ہے۔ حفظ، دینیات بھی ہے فقہ، تاریخ، حساب' جغرافیہ، ہندی، انگریزی، فارسی گویا سب سموئی جاتی ہیں۔ بعض صوبے جہاں اسکولوں کی بہتات ہے وہاں مدارس نے دینی مضامین رکھے اور دنیاوی نصاب اسکولوں کے حوالے کئے۔ لیکن جہاں اسکولوں کی فراوانی نہیں وہاں مکاتب اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ دین کے ساتھ دنیوی ضرورت کو بھی شامل نصاب کریں۔ ☆ مدارس عربیہ کا بنیادی مقصد ہے ماہرین قرآن وحدیث بنانا یعنی ماہر شریعت نبویہ یا شریعت اسلامیہ تیار کرنا اس مقصد کے لئے دو قسم کے علوم ہیں۔ ایک علوم آلیہ دوسرا علوم عالیہ، آلیہ وہ علوم ہیں جو مقصود بالذات نہیں ہیں جو وسیلہ اور ذریعہ بنا کر پڑھائے جاتے ہیں۔ علوم عالیہ وہ علوم ہیں جو مقصود بالذات ہیں اور جن کو مقصود بنا کر پڑھایا جاتا ہے۔ عالیہ میں قرآن وحدیث اور فقہ ہے اور ان تینوں علوم کے لئے ہمیں تین اور بنیادی علوم پڑھانے پڑتے ہیں۔ اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر، جامعات میں علم تفصیلی نہیں پڑھایا جاتا بلکہ علم حاصل کرنے کی استعداد بنائی جاتی ہے۔ اس طرح مدارس عربیہ میں بھی استعداد بنائی جاتی ہے کہ وہ آگے اپنی تعلیم جاری رکھ کر ماہرانہ بصیرت پیدا کرلے۔ چھ علوم ہمارے یہاں مقصود بنا کر پڑھائے جاتے ہیں ان علوم کے بعد آٹھ دس علوم ایسے ہیں جو ان کے لئے معاون بنا کر پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً صرف نحو، لغت، ادب، اشتقاق وغیرہ کہ جن کو پڑھے بغیر زبان نہیں آسکتی۔ ان کا پڑھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان کے بغیر دین کو نہیں سمجھ سکتے۔ ☆ ہندوستان میں مدارس کے نظام دو طرح کے ہیں عالیہ اور نظامیہ عالیہ کا مقصود علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ سے آگاہی ہے۔ نصاب میں عصری علوم معتدبہ مقدار میں داخل کئے گئے جس کی وجہ سے کر نصاب بوجھل ہوگیا اور طلبہ دنیاداری کے ماحول سے متاثر ہونے لگے۔ حشر یہ ہوا کہ عالم دین بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ☆ آزاد مدارس اپنے مقاصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں مگر ان کی افادیت ایک مخصوص دائرے تک ہی محدود ہے جس کی اہم وجہ نصاب

کا عمل اتساع سے گریز ہے۔ ایسی صورت میں دونوں قسم کے نصاب قابل ترمیم ہیں۔ ☆ مدارس اسلامیہ کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور ان کے نصاب تعلیم پر غور و فکر کر کے ایسے تمام مواد اس میں لائے جائیں جن کی ضرورت آج کے علماء کو ہو سکتی ہے۔ ☆ دین اور دنیا کو لازم و ملزوم مان کر نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی جائے۔ ☆ ہندوستان گیر قسم کے مدارس کو اصلاح نصاب پر مائل کیا جائے۔ ☆ ایک کمیٹی اکابرین اور جدید علوم و فنون کے ماہرین پر مشتمل تشکیل دی جائے اور مہتممین مدارس کے مجوزہ وسیع خطوط پر نصاب بنانے کی کوشش کی جائے اور مضامین میں اصولی وحدت کے ساتھ مدارس کے مضامین کی خصوصی اہمیت کا لحاظ رکھا جائے تاکہ مضامین کی ہم آہنگی کے ساتھ ان کی خصوصی اہمیت بھی باقی رہے۔ ☆ جامعات کے فارغ طلبہ کو اعلیٰ دینیاتی تعلیم اور مدارس کے فارغ طلبہ کو اعلیٰ سیکولر تعلیم دیئے جانے کی مرکزی وقف کونسل کی ۱۹۶۹ء کی ''یونس سلیم اسکیم'' کو نئے حالات اور نئی ضروریات کے پیش نظر اسکالر شپ کی رقم بڑھا کر روزگار کے بہتر ذرائع کھول کر از سر نو دہرایا جاسکتا ہے۔ ☆ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نہج پر ''دینی نصاب تعلیم بورڈ'' کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں دینی و عصری علوم کے ماہرین شامل ہوں جو پورے ملک کے دینی تعلیمی اداروں کے لئے ایک مشترک نصاب تیار کرے اور تمام دینی تعلیمی اداروں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے نیز نصاب میں اسلام کے شعوری طور پر حاصل کرنے کو اولیت دی جائے۔ ☆ نیا نصاب تیار کرتے وقت یہ لحاظ رکھا جائے کہ عصری جامعات کی طرح مدارس کا بھی واحد مقصد روزی کمانا اور ملازمت کا حصول نہ ہو جائے بلکہ اس کا اصل مقصد پیش نظر رہنا چاہیئے البتہ اقتصادی مسائل سے بالکل لاتعلقی بھی نہ رہے۔ ☆ دینی علوم میں بنیاد قرآن مجید پر ہونی چاہیئے، نیز تفاسیر سے ابتداء کے بجائے ہم ترجمے سے روشناس کرائیں پھر تفسیر اور تفاسیر میں بھی قدیم و جدید تفاسیر کے درمیان انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ ☆ تفسیر قرآن کے ترجمہ کو بنیاد بنا کر تعلیم ہو۔ تفسیر جلالین کا نصف یا مکمل پڑھنا اور اس کے بعد تفسیر بیضاوی کے سورہ بقرۃ تک پڑھانے سے تفسیر و متعلقہ علوم قرآن پر کماحقہ نظر نہیں ہو سکتی۔ ☆ علوم دینیہ پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ حدیث و فقہ میں نصاب کو مختصر کیا جاسکتا۔ عربی ادب کے ضمن میں صرف نحو سے زیادہ لٹریچر سے واقفیت اور اس کا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے، ساتھ ہی انگریزی، سائنس، سماجی علوم کو بھی متعارف کرنا ہوگا، نیز

کوئی دست کاری ضرور سکھائی چاہیئے۔ ☆ قرآن، حدیث، فقہ اور کلام کے سلسلہ میں ناگزیر متداول کتابوں کے ساتھ موضوع سے متعلق کوئی جدید تصنیف بھی رکھی جائے جو متعلقہ مضامین سے متعلق عصر حاضر کے سوالات اور شبہات کا مناسب اور تشفی بخش جواب دے سکے اور طلبہ میں تنقیدی شعور پیدا ہو۔ ☆ علوم شرعیہ اس طرح سکھائے جائیں کہ علم ناقص نہ رہے۔ جلالین اور بیضاوی کی چند سورتیں طالب علم بمشکل پوری کرپاتا ہے۔ نتیجہ میں علوم قرآن اور تفسیر کا علم ناقص رہتا ہے۔ علم تفسیر نے جلالین اور بیضاوی کے بعد بھی ترقی کی ہے۔ مولانا آزاد کی ترجمان القرآن وجود میں آچکی ہے۔ اس قسم کی کوئی کتاب شوکانی یا ابن کثیر کی تفاسیر چند سالوں میں مکمل کیوں نہ کی جائیں۔ ☆ نصاب میں عربی اور قرآن و حدیث و فقہ (مع متعلقات) کو ہمیشہ بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل رہے گی۔ عصری علوم اور دیگر ملکی یا غیر ملکی زبانوں کو اسی حد تک شامل کیا جائے کہ مرکزی حیثیت مجروح نہ ہو ورنہ مدارس کے علیحدہ وجود کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتا۔ ☆ مدارس نظامیہ میں عموماً تفسیر و اصول تفسیر، حدیث و اصول حدیث، فقہ و اصول فقہ، فرائض، عقائد و کلام نحو صرف، عربی ادب، عروض وبلاغت بھی ضروری ہے۔ ☆ عربی ادب، تفسیر واصول تفسیر اور فقہ کا نصاب کافی ہے۔ البتہ فرائض اور عقائد و کلام میں کتابوں کے اضافے کی ضرورت ہے۔ ☆ آخری سال تخصص (آنرس) کا ہو جس میں تفسیر، حدیث، فقہ دیگر علوم دینیہ، نیز عربی ادب، فارسی ادب اور اردو ادب میں سے کوئی ایک اختیار کرکے اس فن یا علم میں معتدبہ صلاحیت حاصل کی جاسکے۔ ☆ تدوین حدیث اور تاریخ کتابت قرآن کی کتابیں داخل درس ہوں۔ ☆ حدیث میں مشکوٰۃ اور صحاح ستہ کی ایک کتاب ہر سال داخل نصاب رہے تو تفقہ فی الحدیث ہوسکتا ہے۔ ☆ حدیث کے فقہی ابواب کے بجائے اخلاقیات اور حالات حاضرہ سے متعلق احادیث پر زور دینا چاہیئے۔ ☆ فن حدیث میں کچھ کتابیں ہٹادی جائیں تو کچھ ضروری عصری علوم و فنون آسانی سے داخل نصاب کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً آخری سال میں حدیث کی گیارہ کتابیں نہ پڑھا کر صرف صحاح ستہ پڑھادی جائیں تو بقیہ کتابوں کی جگہ دوسرے فنون لے سکتے ہیں۔ ☆ نفس علوم کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ ہاں طریقہ تعلیم میں کمی و زیادتی کی جاسکتی ہے۔ حدیث کے ابواب میں فقہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اب کم کرکے اخلاقیات اور حالات حاضرہ کے پیش شدہ حالات پر احادیث کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ ☆ فقہ

میں وہ ابواب پڑھائے جائیں جن سے ہماری زندگی اب دوچار ہو رہی ہے اور پرانی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ ☆ فقہ کی ایسی کتابیں شامل ہوں جو آپس کے اختلافات کے بجائے رواداری اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے جذبے پر محمول ہوں۔ قدیم درس نظامیہ کے نصاب تعلیم میں فقہ کو اول مقام دیا گیا ہے اور قرآن کو حدیث کے بعد موجودہ ترتیب سے طلبہ کے ذہن میں فقہی اختلافات جنم پاتے ہیں اگر طلبہ کے دماغ پر قرآن کی روشنی پہلے پڑجائے تو موجودہ مسلکی اختلافات بہت کم ہو جائیں گے۔ ☆ فقہ میں اصول کم اور فروع زیادہ ہیں یہ بدلا جائے اور اصول کے بارے میں جدید طرز پر لکھی کتابوں کو شامل کیا جائے۔ ☆ فقہ اور اصول فقہ میں سارے نصابات کسی خاص نقطہ نظر کے ترجمان رہے ہیں ان کی جگہ فقہ مقارن کی تعلیم کیوں نہ ہو جس سے فقہی اور مسلکی جمود ٹوٹے۔ ☆ قابل تبلیغ فقط دین ہے، مذاہب فقہ قابل تبلیغ نہیں، یہ قابل ترجیح ہو سکتے ہیں۔ ☆ مدارس عربیہ کے فارغین جتنی مدت میں جتنے علوم وفنون عالیہ میں مہارت حاصل کرتے ہیں ان میں تفسیر و حدیث، فقہ، اصول، صرف و نحو، منطق و فلسفہ، معانی وبیان ہیئت جیسے بہت سے علوم ایسے ہیں جن میں تحقیقی کام کرنے کی عمدہ صلاحیت و مہارت ہوتی ہے مگر حوصلہ افزائی نہ ہونے کے باعث بہت سے اچھے صلاحیت مند افراد ضائع ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے لئے ترغیب کا کوئی سامان فراہم نہیں ہوتا۔ ☆ جدید علم کلام اور عقائد کی کتابیں داخل کی جائیں۔ ☆ منطق پڑھانے کا مقصود ذہن کو بلند کرنا ہے جب یہ مقصد ہے تو آپ کوئی ایسا علم رکھیں جس سے طالب علم کے ذہن کا معیار بڑھے۔ منطق فی نفسہ کوئی علوم اسلامیہ میں نہیں ہے۔ مقصد فقط طالب علم کا لیول بڑھانا ہے۔ ☆ منطق اور فلسفہ نے جو جدید ترقیاں کی ہیں مدرسے کے نصاب میں اس سے استفادے کی گنجائش پیدا کی جائے۔ منطق اور فلسفہ صرف اصطلاحات سمجھنے کی خاطر طلبہ کو پڑھانا چاہیئے۔ ☆ علوم آلیہ، منطق، فلسفہ، صرف و نحو، بلاغت کی کتابیں کم کر دی جائیں۔ ☆ قدیم منطق و فلسفہ میں ایک کتاب کافی ہے۔ ☆ مدارس میں عربی زبان کے بعد اردو زبان بھی بے توجہی کا شکار ہے۔ خاصا وقت کم مفید فنون، منطق فلسفہ نجوم پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ منطق و فلسفہ کو نصاب سے خارج کر دیا جائے۔ ☆ منطق و فلسفہ، اسلامی فلسفہ جسے آپ کہتے ہیں وہ ہمارے مزاج ہماری فکر کے رگ وریشے میں سرایت کر چکی ہے علم کلام کے اندر قرآنی تفسیر کے اندر حتی کہ حدیث کے

اندر بھی لہٰذا اسے باقی رکھنا چاہیئے۔ ☆ مدارس میں فلسفہ جو پڑھایا جاتا ہے وہ فلسفہ نہیں بلکہ رد فلسفہ ہے۔ یونان کا فلسفہ ایک مکمل آئیڈیل ہے اس میں الٰہیات، عنصریات، فلکیات وغیرہ کی بحثیں ہیں یعنی پوری دنیا و آخرت کے تمام معاملات پر وہ فلسفہ حاوی ہے۔ اس فلسفے میں کچھ صحیح باتیں ہیں کچھ غلط بھی۔ ہدیہ سعیدیہ، ہدایۃ الحکمۃ بطور تمہید پڑھائے جاتے ہیں اسی طرح "میبزی" ایسی کتاب ہے کہ جو بھی غلط بات ہو گی فلسفہ قدیم میں وہ ہر بات توڑ کر برابر کر دے گی۔ ☆ آج دنیا میں جتنے ازم ہیں مارکسزم، کمیونزم، کیپیٹلزم وغیرہ جدید فلسفہ ان تمام گوشوں پر حاوی نہیں ہے۔ اس لئے فلسفہ جدید کو بدلنے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا جب ہم فلسفہ قدیم پڑھاتے ہم تو رد فلسفہ پڑھاتے ہیں۔ اگر باطل ازم کی تردید میں کوئی ایسی کتاب لکھی گئی ہو تو پہلے ہمیں یہ پڑھانی چاہیئے کیونکہ پرانے فلسفے کو رد کرنا سکھایا جارہا ہے۔ اس کے بجائے اگر باطل نظریئے کو رد کرنا سکھایا جائے تو یہ اور اچھی بات ہے مگر ہمارے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں ہے اور کتابیں نہ ہونے کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا باطل ازم نہیں ہے جو دنیا کے تمام گوشوں پر حاوی ہو، ایسا لازم تو فلسفہ قدیم ہے۔ ☆ گرامر سے زبان سیکھنا تعلیم کے نئے طریقوں میں غیر ضروری اور غیر مفید سمجھا جاتا ہے اس لئے نئے طریقے کو اپنانا چاہیئے۔ ☆ عربی ممالک میں صرف کا جو نصاب ہے اسے رائج کیا جائے۔ ☆ گرامر کی ابتدائی کتابیں فارسی کے بجائے مادری زبان میں ہوں۔ ☆ عربی زبان کی تعلیم کماحقہ نہیں دی جاتی جب کہ قرآن و حدیث کی زبان عربی ہے، عربی زبان کی تعلیم میں صرف و نحو پر زیادہ وقت ختم کر دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے طلبہ صرف و نحو کے ماہر تو ہو جاتے ہیں عربی زبان کے ماہر نہیں ہوتے، اس طرح مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ☆ جدید عربی کی تعلیم کی طرف بھی دھیان دیا جائے۔ ☆ نصاب میں عربی ادب کی کتابیں قدیم اسلوب پے چیدہ تراکیب اور عشقیہ اشعار سے پر ہیں ان کا اخراج نہ ہو سکے تو کم از کم عمدہ حصے منتخب کر لئے جائیں۔ ☆ ادب میں مقامات کے بجائے قدیم عربی ادب کے منتخبات کافی سمجھے جائیں اور بقیہ وقت جدید عربی اور عربی انشاء پر صرف کیا جائے۔ ☆ فارسی اور اردو کی لازمی تعلیم وسطانیہ تک رکھی جائے۔ فوقانیہ مولوی اور عالم میں متبادل مضامین کی فہرست میں اسے شامل کیا جائے۔ ☆ شروع ہی سے عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں کی تعلیم نہ دی جائے۔ بچہ تھونس جاتا ہے ابتداء صرف اردو اور قرآن خوانی سے کی جائے اور عقائد، طہارت، نماز وغیرہ کے

مسائل اردو ہی میں پڑھائے جائیں۔ جب تک اردو روانی کے ساتھ پڑھنے نہ لگ جائے کوئی دوسری زبان اس کے سامنے نہ لائی جائے۔ ☆ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کو خاص طور سے ہندی، انگریزی زبانوں کو بھی نصاب میں جگہ دی جائے۔ مقامی ملکی اور بین الاقوامی رائج الوقت زبانوں کی افادیت کو نظر انداز کرنا حکمت اور مصلحت کے منافی ہے۔ ☆ صرف تھوڑی سی انگریزی نصاب میں داخل کر لینا بے معنی ہے اس طرح کی اصلاح ضروری ہے جیسی زمانہ حال میں جامع ازہر میں ہوئی ہے۔ ایک بڑا سوال ذرائع و وسائل کی فراہمی کا بھی ہے۔ مدارس عربیہ میں جس چیز کو علوم عقلیہ کہا جاتا ہے اس کی نوعیت فی زمانہ ان علوم کی تاریخ سے زیادہ کچھ نہیں ہے وہ جسے فلسفہ کہہ کر پڑھاتے ہیں وہ اب فلسفہ کہاں رہ گیا ہے لہٰذا ان علوم سے صرف نظر کر کے علوم دینیہ اور عربی ادب پر خصوصی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ☆ مولوی اور عالم میں انگریزی کا معیار کچھ ہلکا کیا جائے۔ ☆ مولوی اور عالم میں ہندی اور اردو کمپوزیشن کے پرچے ۵۰ + ۵۰ کے ہوں اور نصاب اسی کے مطابق رکھا جائے۔ ☆ لسانیات میں سے انگریزی اور ہندی کو عالم تک کے تمام درجات میں لازم کر دیا جائے۔ ☆ ہندی اور انگریزی کی تعلیم کو اعلیٰ درجوں میں بھی شامل کیا جائے۔ ☆ اعلیٰ انگریزی تعلیم کے لئے یونیورسٹی کے تحت منتخب مدارس میں انگریزی لسانیات کیشارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم کورس کا نظم کیا جائے۔ ☆ املا کا طریقہ اور لیکچر کا طریقہ رائج کیا جائے۔ ☆ مدارس میں انگریزی اور ہندی زبانوں کی تعلیم لازمی ہو۔ ☆ انگریزی اور اڑیا کا اضافہ ہو اڑیسہ کے مدارس میں۔ ☆ ایک سال میں دو سے زائد زبانوں کی ابتداء نہ کی جائے وسطانیہ کے پہلے سال میں بیک وقت تین زبانوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ عربی، ہندی، انگریزی مناسب ہوگا کہ تحتانیہ چہارم میں ہندی کی ابتداء کر دی جائے یہ سال حروف شناسی کا ہوگا اور ممکن ہو تو انگریزی ایک سال مؤخر کر دی جائے۔ ☆ مکتبوں میں ہندی پڑھنے کا انتظام بھی کیا جائے اور ہندوؤں کے لئے مذہبی تعلیم کی جگہ اردو کی حروف شناسی کو لازمی قرار دیا جائے باقی مضامین سب کے لئے یکساں رہیں البتہ مسلمانوں کو صرف ابتدائی مذہبی تعلیم الگ سے دینی ہوگی۔ ☆ ثانوی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے تین مدارج رکھے جائیں، دو سال علوم وفنون کے تعارف کے لئے جن میں عربی و عربی ادب، دینی علوم کے علاوہ دو عصری علوم بھی داخل کئے جائیں جن کے مبادیات سے طلبہ کو واقف کرایا جائے نیز کوئی دو

زبانیں ایک ملکی اور ایک بین الاقوامی بھی داخل نصاب رہیں اس کے بعد عالمیت کے تین سال رکھے جائیں۔ دو سال میں عربی ادب، دینی علوم لازمی پرچے کی حیثیت سے رکھے جائیں اور کوئی ایک عصری علم اور کوئی ایک زبان۔ ☆ علاقائی زبانوں کے ساتھ دوسری اہم زبانوں کو بھی شامل کیا جائے جن میں سے کسی ایک کا چناؤ اختیاری ہو ان میں فارسی شامل نہیں۔ ☆ عربی مدارس میں قدیم کے ساتھ جدید علوم کا بھی بوجھ ڈالا جاتا ہے جس میں ہندی انگریزی، سائنس، ریاضی وغیرہ داخل ہیں اور ان کا معیار بھی تقریباً عام اسکولوں کے برابر ہے۔ نتیجتاً نہ تو دینی علوم کی خاطر خواہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے نہ جدید علوم کی۔ ☆ زبانوں کو معیار کا خیال رکھتے ہوئے چوتھے درجے سے پڑھایا جائے لیکن ریاضی اور سائنس اس وقت شروع کرائی جائیں جب طلبہ اس معیار تک پہنچ جائیں جہاں سے وہ ترجمہ قرآن تفسیر اور حدیث شروع کرتے ہیں پھر الگ سے مختلف زبانوں اور علوم میں تخصص کے درجات قائم کئے جائیں جو لازمی نہ ہوں بلکہ طلبہ کے ذوق اور علمی تشنگی پر ان کا انحصار ہو۔ ☆ دینیات کے مضامین میں بطور ضمنی مضمون، سیرت اور مختصر تاریخ اسلام کو بھی شامل رکھا جائے۔ ☆ مدارس کے نصاب میں تاریخ ہند اور تاریخ اسلام داخل کئے جائیں۔ ☆ سماجی علوم بھی داخل نصاب کئے جائیں۔ ☆ مدرسے کے نصاب میں عالم کی سطح پر سوشل اسٹیڈیز کو داخل کیا جاسکتا ہے کوئی ایسی تصنیف جس میں سوشل سائنس کی مبادیات پر بحث کی گئی ہو فاضل کی تعلیمی سطح کے لئے داخل نصاب کی جاسکتی ہے۔ ☆ زیادہ توجہ سوشل سائنس پر دی جائے، مثلاً تاریخ عالم، اسلامی تاریخ، فلسفہ، جدید فلسفہ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ انگریزی ہندی زبان میں مہارت بھی ضروری ہے۔ ☆ مدارس میں جدید علوم ریاضی، جغرافیہ، معاشیات، سائنس، نفسیات وغیرہ لازمی قرار دیئے جائیں اور اس کے لئے آسان زبان میں کتابیں تیار کرائی جائیں۔ ☆ سماجی اور معاشی تقاضوں کی روشنی میں عصری علوم یعنی سائنس، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، سیاسیات، نفسیات، سماجیات اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مختلف مضامین کی گنجائش بھی رکھی جائے دیگر مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا موقع بھی دیا جائے۔

☆ ادیان کے تقابلی مطالعہ کو ضروری قرار دیا جائے خصوصاً ہندوستانی مذاہب۔ ☆ نصاب تعلیم میں ایک ایسی کتاب کا ہونا ضروری ہے جو دنیا کے مشہور مذاہب اور موجود تمام ازموں اور ان کی تاریخ اور تعلیمات پر مشتمل ہو۔ ☆ عصری علوم میں صرف ان علوم کو

نصاب میں شامل کیا جائے جو انتہائی ضروری ہیں اور جن کا دینی علوم سے گہرا ربط بھی ہے مثلاً حساب، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات وغیرہ۔ ☆ سائنس کی تعلیم جنرل سائنس اور اصطلاحات و مبادی کے جاننے کی حد تک ضروری ہے۔ ☆ سائنس میں کمال پیدا کرنا مدارس کا مقصد نہیں، واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے کمال حاصل کرنے کے لئے یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ ☆ سائنس کو بھی نصاب میں اس طرح پر شامل کیا جائے کہ جدید سائنسی معلومات پر مشتمل ایک مختصر کتاب پڑھائی جائے۔ ☆ مدارس میں سائنس جدید علوم اور سنسکرت بھی داخل کرلیں مگر ہمارے طالب علموں کو وہ خصوصی مراعات ملنے چاہئیں جو یونیورسٹی کے طالب علموں کو حاصل ہیں۔ ☆ ارتھمٹک کی تعلیم بھی مدارس میں ضروری ہے۔ ☆ مدارس میں سائنس پڑھائی جاتی ہے تو اس کا پریکٹیکل کیوں نہیں کرایا جاتا ہے اس کے بغیر سائنس کی تعلیم ناقص ہوگی۔ ☆ مدارس دینیہ میں سائنس کے لئے عملی تجربات کا بندوبست کیا جائے۔ نیچرل سائنس اور سوشل سائنس بھی نصاب میں داخل ہوں۔ ☆ سائنسی علوم مجمل اور عمومی معلومات کی حد تک نصاب میں شامل رہنا چاہیے۔ ☆ مدارس کے لئے عصری علوم مثلاً سائنس، ریاضی، سیاسیات وغیرہ پر خصوصی کتابیں اردو زبان میں تیار کرائی جائیں۔ ☆ ایک باضابطہ نصاب تیار کیا جائے جس میں مناسب انداز میں عصری علوم کو بھی شامل کیا جائے۔ علوم میں سائنس معلومات عامہ اور ریاضی کی ضروری واقفیت کو شامل کرسکتے ہیں اور زبان کے سلسلے میں لسانی فارمولے کو بروئے کار لاسکتے ہیں یعنی ایک بین الاقوامی دوسری قومی زبان اور تیسری علاقائی زبان، مادری زبان الگ سے پڑھائی جانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عموماً مدارس میں مادری زبان میں تعلیم ہوتی ہے۔ ☆ اسلام نے کبھی عصری علوم سے انحراف نہیں کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی ہے، بیچ کی کئی صدیاں مسلمان سائنس دانوں کی مرہون منت ہیں یہ سائنس کے مؤرخین تسلیم کرتے ہیں تو وہ بھی ہم نے دوسری جگہ سے لیا تھا آج ہم دوسری چیز کیوں نہ لیں لیکن مقدار کیا ہو اور کن چیزوں کو لیا جائے۔ ☆ ٹیکنیکل تعلیم کو بھی داخل نصاب کیا جائے۔ ☆ ہر ادارے میں اس کے جغرافیائی ضروریات اور سہولت کے لحاظ سے کچھ چھوٹی صنعتیں بھی قائم کی جائیں۔ ☆ ثانوی درجے تک کے لئے شعبہ صنعت و حرفت قائم کیا جائے۔ ☆ ہنرمندی میں مقامی طور سے جس چیز کی طلب ہو اس پر زور دیا جائے اس میں مشینی، بنائی، سلائی، ٹائپ،

ویلڈنگ، ننگ اور موٹر میکینک کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ☆ مدارس میں ٹیکنیکل علوم کی بھی تعلیم دی جائے مثلاً شارٹ ہینڈ، ٹائپنگ وغیرہ۔ ☆ پرائمری مڈل یا سیکنڈری تک تعلیم ہر فرد کے لئے ضروری ہو جن مدارس میں مواقع میسر ہوں وہاں صنعت و حرفت اور ٹیکنالوجی کے شعبے قائم کئے جائیں اور ثانوی کے بعد طلبہ اس شعبے میں اپنی پسند کی راہ اختیار کریں اور معاش کا مسئلہ حل کریں۔ ☆ ٹیکنیکل تعلیم کے سلسلے میں ایک تجویز یہ ہے کہ ایک سال کے لئے مدرسے میں ایک سے زائد دو تین چار مختلف قسم کے فنون یا ہنر کا انتظام کریں اور اپنے ہر طالب علم کو تین ماہ کے لئے ایک ہنر اس کے بعد دوسرا تیسرا تین تین ماہ وہ اس میں گزارے تاکہ اسے اندازہ ہو کہ اس کی افتادِ طبع کیا ہے اور کون سی چیز میں اس کی دلچسپی ہو سکتی ہے اس طرح وہ اپنے پیشے کے اعتبار سے کام کا انتخاب کر سکتا ہے اور جن کا علمی و ادبی ذوق ہے وہ علمی اور ادبی ذوق کے مالک ہو سکتے ہیں۔ اس میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں عام طور سے ہاتھ سے کام کرنے کی عادت نہیں، یہ چھوٹی اور حقیر چیز سمجھی جاتی ہے اس سے یہ حقارت کا جذبہ بھی ٹوٹے گا۔ ہنر مندی کے فنون میں ٹائپ کا کام، لکڑی کا کام، بجلی کا کام، موٹر میکنک، پرنٹنگ، خطاطی، فٹنگ، خیاطی، سائیکل مرمت کا کام چھوٹے بڑے مدرسوں میں جاری ہو سکتے ہیں۔ ☆ عربی نصاب کے تعلیم میں ٹیکنیکل تعلیم پر مشتمل ایک مستقل شعبہ کا اضافہ ذرا محل غور ہے کیونکہ اصل دینی تعلیم اور اس کے تحقیقاتی اصناف و شعوب ٹیکنیکل تعلیم کے لازمی قرار دیئے جانے سے متاثر ہوں گے اس لئے یا تو ایسے خواہش مند طلبہ جو اس کو اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں ان کے لئے اس کا انتظام کیا جائے یا پھر دینی نصاب تعلیم کے پورا کرنے کے بعد لوگ ٹیکنیکل شعبہ میں داخلہ لے کر اس کی تعلیم حاصل کریں۔ ☆ مدارس کی تعلیم کو روزگار سے مربوط کر دیا جائے۔ ☆ عصری علوم کو روزی روٹی کا دروازہ بنایا جائے بلکہ مقصود نئے دور کے علوم و فنون سے آگہی اور بقدر ضرورت استفادہ ہو۔ ☆ زراعتی تعلیم کو بھی مدارس میں شامل کیا جائے۔ ☆ مدارس میں فراغت کے بعد صحافت، خطابت، امامت اور تبلیغ و دعوت کا اسپیشل کورس کھولا جائے۔ ☆ فن کتابت پر بھی توجہ دی جائے۔ ☆ مدارس میں ترجمے کا رواج قائم کیا جائے۔ ☆ عالمی سیاست کا موضوع بھی مدارس میں پڑھایا جائے۔ ☆ تحقیقی شعبے اسلامی موضوعات پر قائم کئے جائیں۔ ☆ فاضل میں پرچہ موضوع سے متعلق تحقیق و تنقید پر مشتمل ہونا چاہیئے۔

☆ تحقیق کا ایک پہلو اور ہے کہ ان مؤسسات (انسٹی ٹیوٹ) میں ان موضوعات کی تلاش کی جائے جن کا رشتہ کسی عصری علم سے اور قرآن و حدیث سے ملتا ہو تحقیق کرنے والا مابہ الاشتراک اور مابہ الافتراق کو معلوم کر کے توجیہات و تطبیقات واضح کرنے کی کوشش کرے گا یہ کام علوم اسلامیہ کے ماہرین اور علوم عصریہ کے ماہرین کی رہنمائی کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔ ☆ عصری علوم کی تعلیم مادری زبان میں ہو۔ ☆ عرب مصنفین کی کتابیں داخل کی جائیں۔ ☆ غیر درسی مشغلوں کی اہمیت اور افادیت کو سمجھا جائے۔ اس روشنی میں ورزش، کھیل، تحریر، تقریر، مباحثے، صحافت، انتظام، مختلف قومی اور ملکی تقریبات کو ان اداروں کے پروگرام کا حصہ بنایا جائے۔ بین المدارس مقابلوں کے ذریعہ آپس کی ہم آہنگی کو تقویت دی جائے۔ ان درس گاہوں کا ماحول مردم ساز اور تاریخ ساز افراد کے لئے سازگار بنایا جائے۔ کتابوں کی تصنیف بھی ایک بڑا مسئلہ ہے اس جانب بھی توجہ ہونی چاہیئے۔ ☆ کوئی نصاب تیار ہوگا تو کتابوں کی تیاری کا مسئلہ ایک بڑا مسئلہ ہوگا کیونکہ مختلف جامعات میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو بعینہ رائج نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک الگ پس منظر، نیز الگ ترجیحات اور معاملات ہیں۔ ☆ جن علوم کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے ان کی آسان کتابیں اردو میں تیار کی جائیں۔ ☆ اضافی فنون کے سلسلے میں مخلص ماہرین کی مدد سے بالخصوص ایسے ہی مضامین پر مشتمل کتابیں تیار کرائی جائیں جو اپنے موضوع کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ کی کفایت بھی کر سکیں۔ مثلاً انگریزی میں ایسی کتابیں مرتب کرائی جائیں جن میں تاریخ اسلام اخلاقیات تذکرہ صحابہ جیسے مضامین پر روشنی پڑ سکے۔ اسی طرح سائنس کی کتابوں میں قرآنی آیات سے موازنہ ضرور پیش کیا جائے۔ ☆ ہندوستان کے نصاب تعلیم میں کچھ ایسی کتابیں بھی داخل کر دی گئی ہیں جنھوں نے مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کر دی ہیں ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ نصاب تعلیم کو اس زہر سے پاک کرنا ہے اس کے لئے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جائیں اور وہ بنیادی ضرورت پوری کریں اور مختلف فرقوں کے درمیاں جو خلیج حائل ہو گئی ہے وہ ختم ہو جائے۔
☆ نصاب کو متوازن، متناسب اور قابل برداشت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ فوقانیہ تک کتابیں بورڈ اپنی نگرانی میں تیار کرائے۔ ☆ جب تک بورڈ کتابیں تیار نہ کرا سکے اس وقت تک کے لئے عصری مضامین کی کتابیں ٹیکسٹ بک بہار، یا مقامی پبلشروں کی مطبوعات کے

بجائے این سی ای آر ٹی کی مطبوعات رکھی جائیں۔ ☆ مدرسہ بورڈ کے نصاب میں شامل کتابوں کے لئے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جائے تاکہ طلبہ کو بآسانی کتابیں مل سکیں۔ ☆ جو نصاب ہمارے یہاں رائج ہے ان کے بجائے کچھ نئی کتابیں ایسی دستیاب ہیں جو شاید ان سے بہتر ہوں۔ ☆ بعض علوم جو ہم پڑھارہے ہیں جن کو کسی زمانے میں ہم نے دوسروں سے اخذ کیا تھا، اب غالباً اسی جگہ پر دوسروں سے اخذ کرکے کچھ دوسرے علوم کے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ ☆ ایک اہم مسئلہ ہے دینی مدارس کے مقاصد کی حفاظت کا۔ دوسرا مسئلہ ہے کتابوں کا مقاصد کی حفاظت کے بعد کتابوں کا مسئلہ اہم نہیں رہ جاتا، ان میں تغیر اور تبدیلی کی جاسکتی ہے، مولانا انور شاہ کشمیری نے ڈابھیل جانے کے بعد جو نصاب بنایا تھا اس میں شرح جامی کی جگہ ابن عقیل، شرح وقایہ کی جگہ شرح نقایہ وغیرہ بہت سی تبدیلیاں لائی تھیں اسی طرح مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی ایک نصاب کی تشکیل کی اس ضرورت کے پیش نظر کہ وقت کم سے کم درکار ہو اور اس کے ساتھ ہم اپنے مقاصد اور تعلیم کی روح سے لوگوں کو مطلع کردیں۔ حضرت کا وہ نصاب بھی موجود ہے اور اس میں جدید علوم کا اضافہ بھی ہونا چاہیئے۔ ☆ عصری علوم پر مبنی ایک برج کورس تیار کیا جائے جس کی وساطت سے خواہش مند طلبہ عصری اداروں میں داخل ہوکر اپنی زندگی خوش گوار بنا سکیں۔ ☆ انگریزی اسکولوں کے طلبہ اور ملازمت میں لگے ہوئے لوگوں کے لئے دینی تعلیم کا ایک شارٹ ٹرم کورس بھی قائم کیا جائے۔ ☆ مدارس میں جو اساتذہ سائنس، ریاضی اور دیگر عصری علوم پڑھارہے ہیں ان کے لئے ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے تاکہ ان کی کارکردگی زیادہ اچھی ہوسکے اس ضمن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذریعہ کچھ قابل قدر کام ہورہے ہیں۔ ☆ گائیڈینس کا انتظام ہو تاکہ طلبہ کی خداداد صلاحیتوں کو معلوم کیا جائے اور انہیں مناسب مشورے دیئے جائیں۔ ☆ مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ کا بھی بندوبست ہونا چاہیئے۔ ٹریننگ میں اس پہلو پر خاص زور دینا چاہیئے کہ محض کتابیں پڑھادینا تعلیم نہیں بلکہ اس طرح متعلقہ فن پڑھایا جائے کہ طلبہ اس فن سے کماحقہ واقف ہوسکیں اور ان میں ذوق پیدا ہوجائے۔ ☆ اساتذہ کے لئے ٹریننگ سینٹر قائم کیا جائے۔ ☆ جو مدارس عملی طور سے اصلاح کے کوشاں ہیں ان کے سامنے بڑی دشواری مناسب اساتذہ کی فراہمی ہے۔ مدارس کے محدود وسائل اور قلیل آمدنی میں عصری علوم کے مدرسین کی فراہمی دشوار ہے اس سلسلے

میں مختلف ملی اداروں اور انجمنوں کو دست تعاون بڑھانا چاہیئے۔ ☆ نصاب تعلیم ایسا جامع ہو کہ جسے پڑھ کر دینی بصیرت، اخلاق و کردار کی بلندی، دوربینی، عقل و فکر میں گہرائی و گیرائی اور وقت کے فتنوں سے نبرد آزمائی کی قوت و صلاحیت پیدا ہو اور صحیح معنوں میں وہ علامہ اقبال کا مرد مومن بنے۔ ☆ ہمارے بڑے مدارس اور جامعات اگر سر جوڑ کر بیٹھیں اور قدم ملا کر چلیں تو دینی تعلیم کو مر اسلاتی نظام تدریس کے ذریعہ غیر معمولی توسیع دی جاسکتی ہے اور اس کا چلن گھر گھر ہو سکتا ہے۔ ☆ مدارس میں لڑکیوں کی تعلیم کا بھی نظم کیا جائے اور الگ سے ادارے کھولے جائیں۔ ☆ بچیوں کی تعلیم سے متعلق جو ادارے قائم ہوں ان میں پوری احتیاط ملحوظ رکھی جائے ورنہ فتنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ☆ مدارس میں تعلیم بالغان کا نظم کیا جائے۔ ☆ مدارس کے بنیادی مقاصد میں اضافے ہونے چاہئیں۔ ایک بنیادی ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے لئے بھی کوئی ایسا طریقہ تعلیم وضع کریں کہ کم از کم ان کے ذہن میں کچھ ایسی بنیادی باتیں آجائیں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کہ وہ اس سے بے خبر نہ ہو۔ ☆ بنیادی طور پر مسلمانوں کی تعلیم کے چار محاذ ہیں۔ عوامی اور عمومی تعلیم یعنی صباحی اور شبینہ مکاتب اور پرائمری تعلیم سے ایک درجہ پنجم تک دوسرا عصری تعلیم کا محاذ جونیئر اسکول سے یونیورسٹی تک میڈیکل، انجینئرنگ، کامرس، کمپیوٹر، الیکٹرانک وغیرہ۔ تیسرا دینی مدارس جس کا تناسب اعشاریہ دو یا تین سے زیادہ نہیں۔ چوتھا خواتین کی تعلیم جس کا تناسب بمشکل ایک فیصد ہے۔ ☆ سرکاری پرائمری اسکولوں کے نصاب تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے مکتبی نظام تعلیم کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس سے غیر مسلم بچے بچیاں بھی فیض یاب ہو سکیں۔ ☆ ایک ایجوکیشن بورڈ بنا کر مکتبی نظام تعلیم کو باقاعدگی کے ساتھ ریاست گیر پیمانے پر رائج کرنے کی کوشش کی جائے۔ ☆ غیر مسلموں کے لئے مدارس اسلامیہ میں ایک مخصوص اسلامی نصاب تیار کیا جائے۔ ☆ مذہبی تعلیم کو تقلید سے آزاد رکھا جائے۔ ☆ دینی تعلیم کو مہر بند نہ رکھا جائے بلکہ منظر عام پر لایا جائے۔ ☆ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں بھی کسی زمانے میں مذہبی تعلیمی مراکز تھیں مگر ان لوگوں نے وقت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالا اور وہ دنیا کے ماڈرن علوم کے بہت بڑے مرکز بن گئے۔ ☆ نصاب تعلیم کوئی ایسی چیز نہیں جو کہ جامد اور مستقل ہو اور اس میں کوئی تبدیلی کبھی نہ آئے۔ ہمارے مدارس میں جو نصاب

رائج ہے وہ عہد وسطیٰ سے آرہا ہے۔ اس زمانے میں کوئی تفریق نہ تھی اب یہ تفریق ہو گئی ہے کہ سول سروسز کے لئے، سرکاری ملازمت کے لئے یہ علوم کافی نہیں لہذا نصاب میں کسی قدر تبدیلی لازمی ہے۔ ☆ مدارس دینیہ کی ابتدائی تعلیم اور نہائی تعلیم میں تو خط امتیاز ہے مگر ابتدائی ختم ہو کر ثانوی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور ثانوی کہاں سے ختم ہو کر آخری کہاں سے شروع ہوتی ہے اس میں کوئی واضح خط امتیاز نہیں یہ خط امتیاز ہونا ضروری ہے کیونکہ تینوں درجے الگ ہو جائیں تو تینوں کا الگ نصاب بن سکتا ہے۔ ☆ ابتدائی مرحلے سے فراغت کے بعد ثانوی مرحلے کا ایک بنیادی مقصد ہونا چاہئے اور ہوتا ہے اور اس کے پیش نظر نصاب بنتا ہے اس میں دین بھی ہے اور غالب حصہ دین کا ہے۔ بچہ ثانوی تعلیم کے بعد ہائر ایجوکیشن میں جانا چاہے تو راستے کھلے ہوں۔ ☆ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عربی چہارم تک ثانوی تعلیم اور پنجم سے عالیہ کی تعلیم ہوئی مگر عربی اول، دوم، سوم، چہارم ان چار سالوں میں بچوں کی دینی ضرورت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ ☆ فرض کیجئے ایک بچہ ابتدائی درجات کی تعلیم پاکر چھوڑ دے یا ثانوی کے بعد چھوڑ دے تو اس کے چار سال بے کار ہو گئے کیوں کہ وہ چار سال تو تمہید ہے اگلے درجوں کے لئے تو ہم ان چار سالوں کو مقصود بنائیں۔ مدارس ومکاتب کی ایک مرکزی تنظیم قائم کی جائے۔ ☆ ہندوستان کے تمام دینی مدارس کا ایک دوسرے سے رابطہ کے لئے ایک رابطہ کونسل قائم کی جائے۔ ☆ مدارس اور جامعات کے درمیان ایک ربط قائم کیا جائے۔ ☆ کچھ منتخب مدارس کو مرکز بنا کر نصاب کی اصلاح کی جائے۔ ☆ جب تک اہم مراکز کسی بات پر متفق نہ ہو جائیں اصلاح کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ ان میں ترامیم واصلاح کی قبولیت جب تک پیدا نہ ہو جائے اصلاح ناممکن ہے۔ ☆ ہمدرد طبیہ کالج اور مدرسہ فتح پوری میں بھی جدید وقدیم کا جوڑ لگا کر کچھ کام کرنے کی کوشش کی گئی مگر ناکام ثابت ہوئی۔ ☆ مدارس نظامیہ اور عالیہ کے نصاب کو قریب لانا مستحسن ہے لیکن مدارس نظامیہ کے تشخص وانفرادیت کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ ☆ عالیہ اور نظامیہ میں عصری مضامین بقدر ضرورت اور بقدر وسعت شامل کئے جائیں لیکن مدارس عالیہ میں ان مضامین کے لئے ایسی کتابیں تیار کی جائیں کہ حتی الامکان گراں باری سے بچتے ہوئے میٹرک کا معیار قائم رکھا جاسکے تاکہ عام تعلیم گاہوں کے فارغین سے انہیں مساوات کا درجہ حاصل ہو سکے اور طلبہ چاہیں تو عام تعلیم گاہوں میں بھی داخلہ لے سکیں۔ ☆ دراصل اصلاح کی

ضرورت علوم آلیہ میں ہے۔ ☆ مدارس نظامیہ کے لئے ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ثانوی درجوں کے بعد اس کی گنجائش رکھیں کہ سال دو سال کا ایک کورس جاری کریں جس میں عصری علوم کی بقدر ضرورت تعلیم دیں اور اس طرح ان طلبہ کو بھی دوسری تعلیم کے طلبہ کے مساوی تسلیم کرلیا جائے۔ ☆ بنیادی علوم اسلامیہ اور عربی کے ساتھ کچھ ہم ترقی یافتہ علوم کا امتزاج نصاب درس نظامیہ کے مزاج کی رو سے قطعاً متصادم نہیں ہوتا۔ ☆ علوم جدیدہ کو نصاب میں شامل کر لینے سے علوم شرعیہ کی طرف میلان ہر گز کم نہ ہوگا۔ امام غزالی نے اپنے زمانے کے جدید علوم کو شامل نصاب کیا تو اس سے شرعی علوم کی حیثیت کم نہ ہوئی تھی۔ ☆ ندوہ کا نصاب ایک حد تک محدود رہا سارے ملک تک نہ پھیل سکا۔ اسے پھیلانے کی ضرورت ہے۔ ☆ درس عالیہ اور درس نظامیہ کے درمیان نصاب تعلیم کے لحاظ سے فرق ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ اور طلبہ کی عمر کے لحاظ سے کتابیں داخل نصاب کی جائیں۔ ☆ درس نظامی میں عصری علوم کے لئے دو سال یا ایک سال وقت دیا جائے۔ ☆ مدارس عالیہ کا نصاب اس طرح ہو کہ وہاں کے فارغین ٹی پی ایس سی وغیرہ کے مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہو سکیں۔ ☆ عصری علوم کو مدرسوں میں داخل نصاب کرنے سے کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم اپنے مدرسوں میں بعینہ وہی کورس داخل کریں جو دوسرے ہائی اسکولوں اور کالجوں یونیورسٹیوں میں ہے ہم اپنا نصاب خود مرتب کریں اور اپنی ٹیکسٹ بک خود شائع کریں۔ ☆ کتابوں کی تعداد کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی کو فاضل کا نصاب پڑھا کر نصاب میں داخل تمام علوم کا ماہر نہیں بنادینا ہے بلکہ ان علوم سے یک گونہ مناسبت پیدا کر دینی ہے۔ ☆ تمام مدارس میں یکساں نصاب نافذ کر دینا ممکن نہیں کیوں کہ مختلف مقاصد سے قائم کئے گئے ہیں ان کے اپنے مختلف ترجیحات ہیں۔ ☆ تبدیلی نصاب کی بات اگر اہل مدارس سے کی جائے تو وہ ہرگز قبول کرنے کو تیار نہ ہوں گے لیکن اگر آپ اسی عنوان کو بدل کر نصاب علوم جدیدہ کا عنوان کر دیں تو بات جلد قبول کرلی جائے گی۔ ☆ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تمام عصری علوم کو شامل کرلینا قطعی مناسب نہیں ہے اس سے نہ دینی علوم میں مہارت حاصل کر سکیں گے اور نہ عصری علوم سے کماحقہ واقف ہو سکیں گے۔ ☆ جدید مدارس عالیہ کے نصاب تعلیم سے طلبہ میں اچھی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اس میں اسکولی نصاب کی شمولیت کی وجہ سے نصاب

کی تکمیل وقت پر نہیں ہو پاتی کیونکہ بوجھ بڑھ جاتا ہے لہذا ممکن حد تک اسکولی مضامین کو مدارس عربیہ کے نصاب سے خارج کیا جائے۔ اسکول کے شائقین طلبہ کے لئے اسکول بہت ہیں۔ ☆ بڑے دینی مدارس کا اپنے قریبی دینی مکاتب سے روابط ہوں۔ ☆ مختلف مدارس میں آپس میں ربط ضبط رہے تاکہ نصاب ہائے تعلیم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ ہوں اور یہ گنجائش رہے کہ ایک نصاب تعلیم کا طالب علم دوسرے نصاب تعلیم میں منتقل ہو سکے۔ ☆ جدید تعلیمی اداروں سے بھی مدارس کا ربط ہونا ضروری ہے تاکہ دونوں نقطۂ نظر ایک دوسرے پر واضح ہوں۔ ☆ دینی علوم اور عصری علوم میں تفریق تو بہر حال رہے دونوں کو ملا کر ایک مجموعہ بنائیں تو یہ کہیں کامیاب نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ ایک دوسرے سے رابطہ ہو اور ایک دوسرے کو ہم کچھ دیں اور لیں۔ ☆ مدارس کے نصاب میں ترمیم کے لئے ایک ایکسپرٹ کمیٹی ایسی بنائی جائے جو ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مدارس کے نصاب اکٹھا کرے پھر ایک ماڈل نصاب تیار کیا جائے جو چاہے مانے جو نہ چاہے اس کو تکلیف کے ساتھ گوارا کرے۔ نصاب تعلیم پر غور وخوض کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو علماء اور جدید علوم کے ماہرین پر مشتمل ہو۔ ☆ نصاب پر غور وفکر کے لئے ایک اعلیٰ کمیٹی کی تشکیل ضروری ہے جو دائمی طور پر کام کرتی رہے یہ بھی ملحوظ رہے کہ نصابی کتاب اور مطالعہ کی کتاب میں مابین فرق ہوتا ہے اور یہی طریقہ جدید مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوگا۔ ☆ کسی فارمولے پر تمام مدارس کو متفق کر کے کام کرنا ممکن نہ ہوگا بہتر یہ ہے کہ چند منتخب اداروں سے کام کا آغاز کیا جائے اور ان کا تعاون کیا جائے ان کی کارکردگی معیاری اور نمونے کی بنائی جائے اور عملاً کام کر کے ان تمام خدشات کو دور کیا جائے جو پیش کئے جاتے ہیں۔ ☆ مولانا آزاد نے جو نصاب بنایا تھا وہ بھی ۵۷ سالہ پرانا ہے اس طویل عرصہ میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہاں مولانا کے خطوط کو سامنے رکھ کر غور وفکر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مولانا کے خود بنائے ہوئے نصاب پر جم جانا صحیح طریقہ کار نہیں۔ ☆ علم ایک ارتقاپذیر حقیقت ہے اور اس کا ارتقا اس کی مسلسل توسیع اور ترسیل میں مضمر ہے ضرورت ہے کہ مبادیات دینی پر مشتمل اردو نصاب تیار کیا جائے جس سے ایک طبقہ اپنی عام زندگی میں اور اپنے معاش ومعیشت کے حصول میں مدد لے سکے اور مدارس دینیہ ان طبقات کے تعلیمی معیار وصلاحیت کے مطابق علیحدہ اس کا نصاب جاری کریں۔ ☆ دینی تعلیم کے نصاب کے

بارے میں عالم اسلام کو مل کر کوشش اور ورزش کرنی چاہیئے۔ ☆ نصاب تعلیم پر وقتاً فوقتاً غور و خوض ہو۔ ☆ مدارس کے نصاب پر غور و خوض کے لئے ایک متحدہ سیمینار بلایا جائے جس میں علماء کے علاوہ علوم جدیدہ کے ماہرین بھی شامل ہوں۔ ☆ بین المدارس سیمینار کسی ایک صوبہ میں ہو۔ ☆ مدارس میں عصری علوم کے ماہرین سے توسیعی لیکچرز دلوائے جائیں۔ ☆ اساتذہ اور طلبہ میں تعلیمی دلچسپی بڑھانے کے لئے سیمینار و سمپوزیم منعقد کئے جائیں۔ ☆ نصاب کا ایک ماڈل ضرور تیار ہو جس میں دونوں اسکیم کے ماہرین ہوں اور جسے اپنی ضرورت کے مطابق لوگ اختیار کریں۔ ☆ نصاب متوازن ہو کتابیں ممکنہ حد تک سہل ہوں تفہیم کا انداز دل پذیر ہو۔ ☆ طالب علم کے لئے وہ نصاب تیار کیا جائے اس میں اس کی نفسیات کی رعایت لازمی ہوگی۔ وہ لڑکے جو میٹرک کا ایکویلنٹ پڑھتے ہیں مثلاً فوقانیہ تو نصاب کا ایسا توازن اور امتزاج ہونا چاہیئے کہ کوئی بھی لڑکا اس لیول کے ہر مقابلے میں کامیابی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ☆ مضامین کی کثرت کو اختیاری اور لازمی میں تقسیم کر کے متوازن بنایا جا سکتا ہے۔ ☆ مدارس عالیہ کا نصاب ہلکا اور قابل عمل بنایا جائے اور بنیادی مقصد کے حصول کو اولیت دی جائے۔ ☆ نصاب تعلیم مرتب کرنے میں طلبہ کو ۶ سے ۴ سال کی عمر تک دینی مدارس میں تعلیم اس طرح دینی چاہیئے کہ پہلے ۸۰ فیصد پھر ۷۵ فیصد اور اس کی بعد ۶۰ فیصد وقت درجہ بدرجہ دینی علوم کے لئے مختص ہو اور بقیہ عصر جدید علوم کے لئے اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ کن طلبہ میں مزید دینی علوم سے مستفید ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ ☆ مدارس کے امتحانات کی نوعیت ان کی اسناد، داخلے کی شرائط وغیرہ مسائل پر نصاب کی ترتیب کے بعد غور و فکر کیا جائے۔ ☆ ہر طالب علم کو ایک مجوزہ نصاب سے نہ گزارا جائے بلکہ لازمی امتیازی اور خصوصی خط پر طالب علم کی خداداد صلاحیتوں کی روشنی میں جگہ وقت اور درجے کے معیار کے مطابق مواد اور تربیت کو سامنے رکھ کر اس کے لئے نصاب ترتیب اور تجویز کیا جائے۔ لازمی سے مراد وہ نصاب ہے جو عام مسلمان کو بحیثیت ایک عام شہری کے چاہیئے۔ اختیاری مضامین کا تعلق طالب علم کی خداداد صلاحیتوں اس کے رجحانات اور اس کی پسند سے ہے۔ خصوصی نصاب اختیاری مضامین میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وسعت اور گہرائی حاصل کرنے کی سہولتیں پیش کرتا ہے یعنی یہ تخصص کا موقع دیتا ہے۔ ☆ نصاب میں جدید مضامین کو ابتدائی سے جامعی مرحلے تک شامل کیا جانا چاہیئے۔ ☆ آٹھ

سالہ مدت تعلیم میں تخفیف کی جائے۔ ☆ دفاعی ترقی کے لحاظ سے نصاب میں تبدیلی لائی جائے۔ ☆ جامعہ کے نصاب و تاریخ اسلام وغیرہ سے استفادہ کیا جائے۔ ☆ مدارس اور ان کے نصاب کو طلباء کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ایک مخصوص نصاب تیار ہو اور بہار میں ابتدائی تعلیم کے لئے ایک بورڈ بنا کر اس کام کو پورا کیا جائے۔ ☆ مدارس کا ایک خصوصی نصاب بھی ہو جس کے تحت اسکول کالج کے طلبہ بھی مستفید ہو سکیں۔ ☆ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پٹنہ کے نصاب کا ازسر نو جائزہ لیا جائے اور ضروری ترامیم کی جائیں۔ ☆ ثانوی مدارس کو ہائی اسکول کے مساوی معیار پر لایا جائے تاکہ طالب علم اگر چاہے تو سرکاری کالجوں میں جاسکے۔ ☆ غیر ضروری مضامین کو نصاب سے خارج کر دیا جائے۔ ☆ امام الہند کی مجوزہ اصلاحات کی روشنی میں اصول و ضوابط کے علاوہ نصاب تک کی ترتیب کر ڈالی گئی لیکن اس کے عملی نفاذ میں گراں قدر مصارف آڑے آگئے۔ یہ صورت حال آج بھی سد راہ ہے اور مدرسہ عالیہ رام پور کا نصاب بایں وجہ شرمندہ تکمیل نہ ہو سکا۔ جن مدارس نے عصری تقاضوں کے تحت بطور خود مرتبہ اصلاحی نصاب پر عمل درآمد شروع کر رکھا ہے ان کی بابت تفصیلات کو بھی حاصل کیا جائے اور ان کے نتائج و آزمودہ تجارب کو پرکھ لینا چاہیئے تاکہ ان کے ذریعہ اصلاحی اقدامات میں زیادہ سہولت ہو سکے۔ ☆ مولانا آزاد کی مجوزہ اصلاحات کی گہرائی و گیرائی کا حتی الامکان احاطہ کر لینا چاہیئے تاکہ ان کی تجاویز کی روح باقی رکھی جاسکے۔ ☆ جن مضامین میں فاضل کی اجازت ہے ان میں آنرس کا بھی نظم رکھا جائے۔ ☆ آخری تعلیمی مرحلہ دو سال کا ہو جسے بالعموم فاضل کا نام دیا جاتا ہے اور عام درس گاہوں کے ایم اے کے مساوی ہے۔ ☆ کتابوں میں کمی لانے کی غرض سے بعض مضامین کو ایک ایک سال میں رکھا جائے بعض کو دوسرے سال میں۔ ☆ جامعہ ازہر میں جو اصلاحات ہوئیں ان سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ازہر میں بارہ سال گزار کر فراغت کے بعد ایک طالب علم میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر سائنسی کالجوں میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ☆ جامعہ ازہر کا نصاب ممکن ہو تو اختیار کیا جائے۔ ☆ اچھے طلبہ کو گورنمنٹ کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی، ازہر یونیورسٹی، واشنگٹن کے اسلامی سینٹر وغیرہ کو تربیتی کورس کے لئے بھیجا جاسکتا ہے۔ ☆ مدارس میں دستور ہند کی دفعات ۲۹، ۳۰ کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ ☆ مدارس اسلامیہ کا الحاق یو جی سی سے ہونا چاہیئے۔ ☆ یونیورسٹی میں مدارس کے

طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سہولت مہیا کی جائے۔ ☆ مدارس میں تخصص کا درجہ قائم ہو۔ ☆ وہ جامعات جن کے پاس وسائل ہیں وہ اپنے یہاں تین دھاراؤں کا اہتمام کر سکتی ہیں۔(۱) صرف دینی (۲) دینی وجدید مضامین کے ساتھ (۳) دینی حرفتی ٹیکنیکل یا پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ طالب علم ان تینوں دھاراؤں میں سے کسی ایک کو چن سکتا ہے۔ ☆ مدرس میں میتھڈ آف ٹیچنگ پر توجہ دی جائے۔ ☆ مدارس کے انتظامات کی اصلاح کی طرف توجہ بھی ضروری ہے۔ ☆ عصری علوم کے لئے ابتداء ریٹائرڈ مخلص اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں اور بعد میں خود ان مدارس کے فارغین ان کی جگہ لے لیں۔ ☆ مدارس میں دو ایک اضافی مدرس بھی موجود ہیں تاکہ اصل مدرس کی غیر موجودگی میں طلبہ کا تعلیمی نقصان نہ ہو۔ ☆ مدارس عربیہ کے طلبہ کو عالم کی سند دینے سے پہلے ہندوستان کے ہر علاقے میں ایک مخصوص تربیتی پروگرام سے گزارا جائے تاکہ زندگی میں عملی میدان میں داخل ہونے سے پہلے معاشرہ سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائیں۔ ☆ مدارس میں اچھے، صلاحیت مند اساتذہ بحال کئے جائیں۔ ☆ تعلیم برائے زندگی ہو، تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی زور ہو، علم کو عمل میں لایا جائے، قاری اور راوی ہونے کے ساتھ ساتھ عامل، محقق، مفکر، مدبر اور مصلح پیدا کرنے کی بھی کوشش ہو۔ علم کو تربیت اور استعمال کے ذریعہ اسے زندگی کا ایک حصہ بنا دیا جائے۔ ☆ بچوں کی اخلاق سازی اور سیرت پر زور دیا جائے۔ ☆ نظام تربیت بہتر کیا جائے تاکہ طلبہ اخلاق و کردار کا پیکر بن کر نکلیں۔ املا اور لیکچر کا طریقہ رائج کیا جائے اور کتابی طریقہ تدریس بند کیا جائے۔ ☆ مدارس میں کردار سازی کی تعلیم اب نہیں ہو رہی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اساتذہ بھی باکردار ہوں کوئی سینٹر لائزڈ ایجنسی ایسی ہو جن سے اساتذہ لئے جائیں تو شاید یہ مسئلہ حل ہو۔ ☆ اس وقت تعلیم کا رقبہ بہت بڑھ گیا ہے لیکن تربیت کا پہلو عمومی طور پر بہت کمزور ہو گیا ہے۔ مضامین کے اضافے سے یہ مسئلہ حل ہونے کو نہیں تربیتی نظام کو بہتر بنانے اور طالب علمی کے زمانے میں جانفشانی اور فرض شناسی کے اوصاف پیدا کرنے سے ہی یہ مسئلہ قابو میں آسکتا ہے۔ ☆ عصری علوم کی تعلیم کے لئے اسکول کالج کے ریٹائرڈ اساتذہ سے مدد لی جائے۔ شہر کے اہل ثروت سے گزارش کی جائے کہ ایسے اساتذہ کے لئے الگ سے انتظام کر دیں یا ایک ایسا فنڈ قائم ہو سکے جس سے کفالت ہو سکے۔ ☆ ہر طالب علم کو مجموعہ علم بنانے کے بجائے

اقتباسی تعلیم کا طریقہ اپنایا جائے۔ ☆ غیر درسی مصروفیات، تحریر و تقریر، انتظام وانصرام کا نظم بھی کیا جائے۔ ☆ مستشرقین کی کتابوں کا مطالعہ کر سکنے کی اہمیت اور ان کے جواب دے سکنے کی صلاحیت آنی چاہیئے۔ ☆ پرائیویٹ امتحانات کی حوصلہ افزائی کم کی جائے اور داخلہ کے وقت سختی کے ساتھ صلاحیت کا اندازہ کیا جائے۔ ☆ تدریس کے معاملہ میں پابندی اور سختی ضروری ہے امتحانات کے سوالات اور جوابات کی کاپیاں دیکھنے میں نرمی اور اعتدال سے کام لیا جائے لیکن امتحانات کی نگرانی میں پوری سختی عمل میں لائی جائے۔ ☆ غیر تدریسی مشغلوں کی اہمیت اور افادیت کو سمجھا جائے اور درس گاہوں کا ماحول تاریخ ساز افراد کے لئے سازگار کیا جائے۔ ہائی اسکول تک جدید علوم کی تعلیم ضروری ہو۔ نیز حالات حاضرہ کی واقفیت بھی ہو۔ ☆ مدارس اپنے نظم و نسق کے لئے ٹھوس مالیاتی بنیاد فراہم کریں۔ ☆ مدارس اسلامیہ اور تمام تعلیم گاہوں کے طلبہ میں یہ شعور پیدا کرنا چاہیئے کہ تعلیم یافتہ ہونے کا مقصد کیا ہے اور ذوق علم کیا ہوتا ہے اور انہیں معاش کی اس تنگنائے سے نکالنا ہوگا جس کا نام ملازمت ہے۔ ☆ افرادی مالی وسائل فراہم کرنا دشوار ہے اس کا حل اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستانی مسلمان دینی تعلیم کو فراہمی وسائل کی حد تک اہمیت دینا شروع کردیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ مدارس کی کفالت سرکار اپنے شانوں پر لے لے۔ دوران تعلیم اگر ہاتھ میں کوئی ہنر آجائے تو وہ زادراہ کے کام آسکتا ہے۔ ☆ دینی مدارس کی کفالت مقامی اوقاف اپنے ذمہ لے لیں لیکن تعلیمی اور تعمیری کاموں کا جہاں تک تعلق ہے چھوٹتے ہی وقف کا دوسرا مفہوم کارفرما ہونے لگتا ہے۔ ☆ ہمارا وہ نظام تعلیم جس کو بظاہر معاشی فیتے سے ناپا جائے تو کم از کم درجہ میں آجائے گا لیکن حقیقتاً وہ معاشرے کو تھامے ہوئے ہیں۔ ہمیں اس کو استحکام دینا چاہیئے۔ جن علاقوں میں مدارس ہیں وہاں جو خام مال پیدا ہوتا ہے اس کی مدد سے گھریلو صنعتیں جو چلائی جاسکتی ہیں وہ قائم کی جائیں۔ یہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی تجویز تھی جو عمل میں نہ آسکی۔ مدارس کے سوشل اسٹیٹس کو اونچا کیا جائے۔ طالب علموں کی معاشیات بہتر کی جائے۔ مدارس عربیہ میں کوئی کمزور پہلو ہے تو اس کی اصلاح کی جائے۔ ☆ ہمارا ایک تعلیمی نظام تھا وہ پاٹھ شالاؤں کی شکل میں ہو یا مدارس کی شکل میں۔ آج مدرسوں پاٹھ شالاؤں میں جو بحران ہے اس کے لئے ہمیں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی پر غور کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کے درمیان روایتی مکتبوں کا سلسلہ اب بھی موجود ہے جس نے بے مثال تعمیری

رول ادا کیا ہے آج بھی کر رہا ہے ان مکتبوں کے تدریسی نظام اور نصاب میں فی زمانہ موڑ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ☆ ٹھوس ابتدائی تعلیم کے لئے مکتبی نظام کو وسیع بنایا جائے۔ ☆ علم ایک بڑھتا ہوا دریا ہے تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اس بڑھتے ہوئے سمندر کو نئی نسل تک پہنچا دے اور اسے انسان بنادے اگر ایسا نہیں ہوتا تو تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ☆ کثرت علم سے کثرت مکاتب فکر پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اندر جتنے مکاتب فکر پیدا ہوئے دوسرے مذاہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ☆ اصلاح اندر سے آتی ہے باہر سے نہیں آتی۔ اکبر اعظم نے بھی اصلاح کی کوشش کی مگر نتیجہ کیا ہوا؟ ☆ تبدیلیاں تدریجی ہوں نہ کہ انقلابی۔ نیز یہ تبدیلیاں مستقبل کی روشنی میں جزوی، وقتی اور عارضی نہ ہوں۔ ☆ مدارس کو سماج کا ہی ایک حصہ تسلیم کرتے ہوئے ان کو سماج میں جگہ اور وقت سے وابستہ رکھا جائے۔ ☆ ان اداروں کو اسلام اور اسلامی معاشرہ کا ترجمان بنانے کی کوشش ہو کہ ہم پوری انسانیت کے لئے باعث رحمت بن سکیں۔ ☆ مدارس میں تعلیم کی پابندی اور بہتری قائم کرنے کے لئے ایک انسپکشن کا محکمہ بھی ہو۔ اس لئے مناسب ہے کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اسلامک) کا جو عہدہ ختم کر دیا گیا ہے اسے پھر بر قرار کیا جائے۔ علاوہ ازیں ہر علاقے میں انسپکٹنگ مولوی مقرر کئے جائیں جو کم از کم سال میں ایک بار ہر مدرسہ کا معائنہ کر سکیں۔ جامعات میں نظامی مدارس کی سندیں تسلیم کرائی جائیں اور عالم فاضل کو بی اے، ایم اے کے مساوی قرار دیا جائے۔ ☆ صوبہ بہار میں مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کو چلانے کے لئے ایک یونیورسٹی کا قیام ضروری ہے۔ (ایک رائے)۔ ☆ مدرسہ بورڈ کے اسناد کو کالج اور یونیورسٹی کے مساوی قرار دیا گیا لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا ہے۔ اس خامی کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ☆ ایک عربی یونیورسٹی قائم کر دی جائے اور تمام مدارس کو اس میں شامل کر دیا جائے۔ ☆ رانچی میں مولانا آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے جو مولانا کے تصور تعلیم کو پھیلا سکے اور مدرسہ سسٹم کا بہترین تجربہ کر سکے۔ ☆ پڑھے گئے مقالات اور شرکاء کے خیالات کا خلاصہ تمام مدرسوں کو بھیج دیا جائے۔ ☆ حکومت بہار نے مدرسوں کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے مدرسہ بورڈ کی تشکیل کی لیکن افسوس یہ بورڈ بدنظمیوں کی آماجگاہ بن گئی ہے اور اس کے ذریعہ چلایا جانے والا نظام غیر مفید نظام مان لیا گیا ہے۔ ایسا نظام اور اس کے ذمہ داران کس طرح کے علماء پیدا کریں گے۔ حکومت نے مواقع کے ساتھ ذرائع بھی فراہم

کرائے ہیں ان کا جائز اور بہتر استعمال کیا جانا چاہیئے۔ ☆ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نظام کو درست کیا جائے تاکہ امتحانات وقت پر ہو سکیں۔ ☆ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب میں پانچ زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے مضامین کی بھی بہتات ہے، ایک طرف دینی علوم دوسری طرف عصری علوم ہیں اس بناء پر نصاب گراں بار ہو گیا ہے۔ ممکنہ طور پر اسے ہلکا کرنا ضروری ہے۔ ☆ عقائد کی حیثیت ہمارے مذہب میں بنیادی ہے۔ ایسی کتابیں درس میں ہوں جن میں مسائل ضروریہ ہوں۔ اختلافی مباحث کا ذکر نہ ہو۔ ☆ مدرسوں میں زیادہ تعداد ان طلبہ کی ہوتی ہے جو اپنے والدین کی مرضی اور عسرت سے مجبور ہو کر داخل ہوتے ہیں ان کے ذہن و کردار میں شاید وہ صلاحیت نہیں ہوتی جو آگے چل کر عالم دین کی شان ہوتی ہے جو باقی تھوڑے طلبہ رہ جائیں گے وہ البتہ مدرسے سے فارغ ہو کر عالم اور فاضل بن کر نکلیں گے اور دین کی خدمت بہتر طریقے سے انجام دے سکیں گے۔ ☆ جو امر خالص عمل سے متعلق ہے اسے محض قومی و لسانی تجویزوں سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اصل ضرورت قلب و دماغ کی تکوین کی ہے اس کے بغیر کوئی نظام تہہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ ☆ پہلے کے مقابلے میں تنخواہوں کا جو تناسب بڑھا ہے اس حساب سے ہماری تعلیم کا تناسب گھٹا ہے۔ ☆ کیا ہم اپنے دینی مدارس کو اس رخ پر ڈال دینا چاہتے ہیں کہ جہاں ان کا مزاج ان کا ذہن اور ان کی فکر صرف اس پر کام کرے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ہماری یافت کیا ہو۔ ☆ مسلمان جب تک اپنے دین سے وابستہ ہے عوامی اور عمومی سطح پر تب تک خیریت ہے ورنہ جتنا وہ اپنے دین سے ہٹتا چلا جائے گا تو وہ ساری خرابیاں پیدا ہوں گی جو عام طور پر معاشرے میں ہیں۔ ☆ مدارس کا جو مقصد ہے اور ہمارا جو نصاب ہے ہم اس مقصد کو پورا نہیں کر پائے ہیں۔ ☆ زمانے کا ساتھ دیئے بغیر اور تبدیلی سے ہم آہنگ ہوئے بغیر آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ☆ آئے دن ہمارے سامنے مسائل کھڑے ہوتے ہیں اس میں کچھ ہماری بھی ذمہ داری بنتی ہے۔ دینی مدارس کی بدولت مختلف ریاستوں میں اردو کا رسم الخط جزئی طور پر محفوظ ہو گیا ہے ان مدارس نے دینی، اخلاقی، لسانی، ادبی، ثقافتی میدانوں میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے ہمارا فرض ہے کہ ان پر زنگ لگنے نہ دیں انہیں نئے اسالیب تدریس سے مستفید ہونے کا موقع دیں اور ان کے نصاب کی جامعیت و افادیت میں اضافہ کر کے انہیں ملک و ملت کے لئے مایہ افتخار بنا دیں۔ اس کے لئے شہر شہر، گاؤں گاؤں، محلہ محلہ مقامی سطح پر مؤثر کوشش کرنی چاہیئے۔ جس عنوان

سے بھی جو تبدیلیاں کی جائیں وہ تدریجی ہوں نہ کہ انقلابی۔ ساتھ ہی یہ تبدیلیاں مستقبل کی روشنی میں جزوی، وقتی اور عارضی نہ ہوں۔ ☆ حکومت بہار تقریباً سات کروڑ سالانہ مدارس پر صرف کرتی ہے اس رقم کا صحیح مصرف کیا جائے۔ ☆ تعلیم و تدریس کے نئے نئے طریقوں کا چلن اور ان کی افادیت دینی اور عصری تعلیم دونوں کے لئے برابر ہے دینی تعلیم کو ان سے محروم کرنا صریح کفران نعمت ہے اور زیادتی۔ طرز تدریس کی دریافتوں کو اپنی ضروریات موضوعات اور مقاصد کے مطابق ڈھالا جائے اور ان میں ضروری ترمیم کے بعد وسیع پیمانے پر اختیار کیا جائے۔ ☆ عربی مدارس کا مستقبل جیسا ہے اسے رہنے دیا جائے لیکن عربی مدارس کے طالب علم کے سامنے جب تک کوئی روشن مستقبل نہیں ہوگا کوئی پڑھنے کو نہیں آئے گا۔ معدودے چند افراد جاتے رہیں گے مدارس کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ ☆ مدارس کی اصلاح وہی لوگ اچھی طرح کر سکیں گے جنہوں نے اس کے اندر اپنی عمریں گزاری ہیں۔ سیل اصلاح کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں اس طرح بہالے جائے کہ دینی تعلیم کی بناء جیسی بھی وہ فی الوقت ہے وہ خلل پذیر ہونے لگے اگر ایسا ہوا تو یہ بڑا نقصان ہوگا۔ ☆ آج عموماً جو مدارس قائم ہو رہے ہیں وہ شخصی مولوی اپنی ضرورت کے لئے مدرسے قائم کرتا ہے۔ چندے لاتا ہے، زکوٰۃ وصول کرتا ہے، وہاں قوم کی بہت بڑی رقم ضائع ہو رہی ہے۔ اس پر کس طرح قابو پایا جائے۔ کنٹرول کی ضرورت ہے۔

# برصغیر کی درسی کتابیں اور مصنفین

## بہ ترتیب تاریخی

مرتبہ۔ مولانا محمد شاہ جہان قاسمی

| تصنیف | مصنف | زمانہ تصنیف |
| --- | --- | --- |
| **تفسیر** | | |
| کشاف | زمخشری ۵۳۸ | ۲۸ ربیع الآخر ۵۲۸ھ |
| تفسیر بیضاوی | عبداللہ بن عمر بیضاوی م ۶۸۴ھ | ساتویں صدی ھ |
| مدارک | ابوالبرکات م ۷۱۰ھ | آٹھویں صدی ھ |
| تفسیر ابن کثیر | ابن کثیر ۷۷۴ھ | " " |
| جلالین | جلال الدین السیوطی محلی ۸۶۴ھ | |
| تفسیر مظہری | ثناء اللہ پانی پتی م ۱۲۲۵ھ | تیرہویں صدی ھ |
| **اصول تفسیر** | | |
| الاتقان | جلال الدین السیوطی م ۹۱۱ھ | دسویں صدی ھ |
| الفوز الکبیر | شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ | بارہویں صدی ھ |
| **حدیث** | | |
| مؤطا امام مالک | امام مالک م ۱۷۹ھ | دوسری صدی ھ |
| مؤطا امام محمد | امام محمد م ۱۸۹ھ | " " |
| صحیح البخاری | امام بخاری ۲۵۶ھ | تیسری صدی ھ |
| صحیح المسلم | مسلم بن الحجاج م ۲۶۱ھ | " " |

| تصنیف | مصنف | زمانہ تصنیف |
| --- | --- | --- |
| سنن ابن ماجہ | محمد بن ماجہ ۲۷۳ | تیسری صدی ھ |
| سنن ابی داؤد | ابوداؤد سلیمان م ۲۷۵ھ | " " |
| سنن ترمذی | امام ترمذی ۲۷۹ھ | " " |
| شمائل ترمذی | " " | " " |
| سنن نسائی | عبدالرحمٰن احمد نسائی م ۳۰۲ھ | " " |
| سنن طحاوی | امام احمد طحاوی م ۳۳۱ھ | چوتھی صدی ھ |
| مشکوٰۃ المصابیح | ولی الدین عراقی ۷۴۰ھ | آٹھویں صدی ھ |
| **اصول حدیث** | | |
| مقدمہ ابن الصلاح | ابن الصلاح ۶۴۳ | ۶۳۴ھ |
| نخبۃ الفکر | ابن حجر عسقلانی م ۸۵۲ھ | نویں صدی ھ |
| **فقہ** | | |
| قدوری | احمد بن محمد قدوری م ۴۲۸ھ | پانچویں صدی ھ |
| ہدایہ | برہان الدین مرغینانی م ۸۹۳ | ۵۸۶ھ |
| کنزالدقائق | عبداللہ بن احمد نسفی م ۷۱۰ھ | آٹھویں صدی ھ |

| تصنیف | مصنف | زمانہ تصنیف |
|---|---|---|
| شرح وقایہ | عبید اللہ بن مسعود م ۷۴۷ھ | آٹھویں صدی ھ |
| بلوغ المرام | ابن حجر عسقلانی م ۸۵۲ھ | نویں صدی ھ |
| نور الایضاح | حسن بن عمار شرنبلالی م ۱۰۶۹ھ | گیارہویں صدی ھ |
| **اصول فقہ** | | |
| اصول الشاشی | اسحٰق بن ابراہیم شاشی م ۳۲۵ھ | چوتھی صدی ھ |
| حسامی | حسام الدین محمد م ۶۴۴ھ | ساتویں صدی ھ |
| الاشباہ والنظائر | ابن نجیم م ۹۷۰ھ | ۹۶۹ھ |
| نور الانوار | ملا جیون م ۱۱۳۰ھ | ۷ جمادی الاول ۱۱۰۵ھ |
| مسلم الثبوت | محب اللہ بہاری م ۱۱۱۹ھ | ۱۱۰۹ھ |
| **فرائض** | | |
| سراجی | سراج الدین سجاوندی | چھٹی، ساتویں صدی ھ |
| **حکمت شرعیہ** | | |
| حجۃ اللہ البالغۃ | شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ | بارہویں صدی ھ |
| **عربی ادب** | | |
| سبعہ معلقہ | شعرائے عہد جاہلیت | قبل اسلام |
| دیوان حماسہ | ابو تمام م ۲۳۲ھ | چوتھی صدی ھ |
| دیوان متنبی | احمد بن حسین متنبی م ۳۵۴ھ | " " |
| الاغانی | ابو الفرج اصبہانی م ۳۶۵ھ | چوتھی صدی ھ |
| نہج البلاغۃ | شریف رضی م ۴۰۴ھ | پانچویں صدی ھ |
| مقامات حریری | قاسم بن علی حریری م ۵۱۶ھ | چھٹی صدی ھ |
| نفحۃ الیمن | احمد یمنی شروانی م ۱۲۵۶ھ | تیرہویں صدی ھ |

| تصنیف | مصنف | زمانہ تصنیف |
|---|---|---|
| نفحۃ العرب | اعزاز علی دیوبندی م ۱۳۷۴ھ | چودھویں صدی ھ |
| **صرف ونحو** | | |
| شرح مائۃ عامل | عبد القاہر جرجانی م ۴۷۴ھ | پانچویں صدی ھ |
| کافیہ | ابن حاجب م ۶۴۶ھ | ساتویں صدی ھ |
| ہدایۃ النحو | ابو حیان اندلسی م ۷۴۵ھ | آٹھویں صدی ھ |
| پنج گنج | سراج الدین اودھی م ۷۵۸ھ | " " |
| میزان الصرف | " " | " " |
| شرح شذور الذہب | ابو محمد جمال الدین ابن ہشام م ۷۶۱ھ | " " |
| شرح ابن عقیل | ابن عقیل ۷۶۹ھ | " " |
| صرف میر | سید شریف جرجانی م ۸۱۶ھ | نویں صدی ھ |
| نحو میر | سید شریف جرجانی م ۸۱۶ھ | نویں صدی ھ |
| شرح جامی | عبد الرحمٰن جامی م ۸۹۸ھ | " " |
| فصول اکبری | سید علی اکبر الہ آبادی م ۱۰۹۰ھ | گیارہویں صدی ھ |
| منشعب | حمید الدین کاکوروی م ۱۲۱۵ھ | تیرہویں صدی ھ |
| علم الصیغہ | مفتی عنایت احمد کاکوروی م ۱۲۷۹ھ | " " |
| **معانی وبلاغت** | | |
| اسرار البلاغۃ | عبد القاہر جرجانی م ۴۷۴ھ | پانچویں صدی ھ |
| دلائل الاعجاز | " " | " " |
| تلخیص المفتاح | محمد بن عبد الرحمٰن قزوینی م ۷۳۹ھ | آٹھویں صدی ھ |

| تصنیف | مصنف | زمانہ تصنیف | تصنیف | مصنف | زمانہ تصنیف |
|---|---|---|---|---|---|
| مختصر المعانی | سعد الدین التفتازانی م ۷۹۲ھ | آٹھویں صدی ھ | قاضی مبارک | قاضی مبارک م ۱۱۶۲ھ | بارہویں صدی ھ |
| **عقائد** | | | مرقاۃ | فضل امام خیر آبادی م ۱۲۴۴ھ | تیرہویں صدی ھ |
| العقیدۃ الطحاویہ | احمد طحاوی م ۳۲۱ | چوتھی صدی ھ | | | |
| شرح عقائد نسفی | نجم الدین عمر نسفی م ۵۳۷ھ | چھٹی صدی ھ | ہدیہ سعیدیہ | فضل حق خیر آبادی م ۱۲۷۸ھ | " " |
| شرح فقہ اکبر | بحر العلوم م ۱۲۲۵ھ | تیرہویں صدی ھ | | | |
| **منطق و فلسفہ** | | | | | |
| ہدایۃ الحکمۃ | مفضل اثیر الدین مولانا زادہ م ۶۶۰ | ساتویں صدی ھ | شرح سلم العلوم (حمد اللہ) | حمد اللہ سندیلوی م ۱۱۶۰ھ | " " |
| قطبی | قطب الدین رازی م ۷۶۶ھ | آٹھویں صدی ھ | | | |
| تہذیب المنطق | سعد الدین التفتازانی م ۸۹۲ھ | " " | | | |
| کبریٰ | سید شریف جرجانی م ۸۱۶ھ | نویں صدی ھ | | | |
| شرح چغمینی | موسیٰ پاشا رومی م (۸۳۲-۸۴۱) | " " | | | |
| شرح مواقف | سید شریف جرجانی م ۸۱۶ھ | " " | | | |
| مسامرہ | ابو المعالی محمد کمال الدین م ۹۰۵ھ | " " | | | |
| شرح تہذیب | عبد اللہ یزدی م ۹۸۱ھ | دسویں صدی ھ | | | |
| صدرا | صدر الدین شیرازی م ۱۰۵۰ھ | گیارہویں صدی ھ | | | |
| شمس البازغہ | محمود جونپوری م ۱۰۹۶ھ | " " | | | |
| میبذی | میر حسین میبذی م ۱۸۱۴ھ | گیارہویں صدی ھ | | | |
| حواشی زاہدیہ | میر محمد زاہد ہروی م ۱۱۰۱ھ | بارہویں صدی ھ | | | |
| سلم العلوم | محب اللہ بہاری م ۱۱۱۹ھ | " " | | | |
| تصریح | امام الدین ریاضی م ۱۱۴۵ھ | " " | | | |

# مکاتیب بسلسلہ نصاب تعلیم

استاذی، مرشدی، و مخدومی حضرت مولانا فضل محمد صاحب نور اللہ مرقدہ، بانی مدرسہ عربیہ قاسم العلوم فقیر والی ضلع بہاول نگر نے تقسیم ہند سے پہلے جب درس نظامی میں ترمیم کی بات سننا بھی لوگوں پر گراں گزرتا تھا۔ حضرت مرحوم نے نہایت دور اندیشی اور ژرف نگاری سے کام لیتے ہوئے نصاب و نظام تعلیم درس نظامی کے بارے میں ایک سوال نامہ اکابرین عصر اور ممتاز ماہر تعلیم کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا اور اس کے بعد جواب کی روشنی میں ایک نصاب بھی ترتیب دیا تھا۔ یہ سوال نامہ حضرت مولانا فضل محمد صاحب کی رہنمائی میں جناب مولانا محمد نعیم دیوبندی سابق صدر مدرس مدرسہ عربیہ قاسم العلوم فقیر والی و حال شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند نے مرتب فرمایا۔ اس سوال نامے کے جوابات نہایت قیمتی آراء کا خزانہ ہیں یہ مشورے آج بھی تازہ و شگفتہ محسوس ہوتے ہیں انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے ابھی تک کتنا کام باقی ہے۔ کتنے اہم پہلو ہیں جو ہم نے نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ اب ملاحظہ فرمائیے پہلے سوال نامہ پھر اس کے جوابات۔

(حافظ حقانی میاں قادری)

انتہائی افادیت اور استفادے کی غرض سے ہم ان نوادرات کو شامل اشاعت کر رہے ہیں۔

# سوالات
# دربارہ نصاب درسِ نظامیہ

فقیر والی' ریاست بہاول پور میں آٹھ نو سال سے ایک مختصر پیمانہ پر عربی مدرسہ قائم ہے، جس میں "درس نظامیہ" کی مروجہ تعلیم ہوتی ہے بڑے مدارس عربیہ جس اعلیٰ پیمانہ پر کام کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ پر ضروری، درست اور مفید ہے لیکن ہم موجودہ ضروریات اور مقتضیات کا خیال رکھتے ہوئے ابتدائی اصلاحات کے ساتھ مختصر پیمانہ پر کام کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ایسے نصاب اور طریقہ کار کی ضرورت ہے جس سے موجودہ جمود، سستی، کاہلی اور بے عملی دور ہو کر چستی، جذبہ عملی، اور سرگرمی پیدا ہو سکے۔

اس سلسلہ میں مختلف مشاہیر اور اہل قلم حضرات سے ہم مکاتبت کرنا چاہتے ہیں، آنجناب کی مصروفیات کے باوجود نہایت عاجزانہ استدعا ہے کہ اس بارے میں اپنے تجربات و نظریات سے مندرجہ ذیل استفسارات کی صورت میں استفادہ کا موقعہ دیں گے۔

(۱) علوم مقصودہ، تفسیر، حدیث، فقہ، میں کون کون سی کتابیں رکھی جائیں جن سے کم از کم وقت میں اچھا، اور زیادہ کام لیا جا سکے؟

(۲) ترجمہ قرآن شریف کے بعد تفسیر میں جلالین کے علاوہ کوئی دوسری معتدل تفسیر بھی تجویز کی جائے، تفسیر مظہری یا تفسیر جوہری طنطاوی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔؟

"دورہ حدیث" سے پہلے حدیث میں مشکوۃ شریف کے علاوہ ایسی اور کیا کتاب رکھی جائے جو حذف مکررات کے بعد صحاح ستہ کو حاوی ہو جمع الفوائد اور تیسیر الوصول کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فقہ کی مجوزہ کتب میں فتویٰ نویسی کی رعایت سے بھی کوئی کتاب ضرور رکھی جائے۔

(۳) اصول تفسیر، اصول حدیث میں الفوز الکبیر، نخبۃ الفکر کے علاوہ اور کیا کتاب رکھی جائے؟ خیر الاصول اور مولانا عبدالحق دہلوی کے رسالہ کے بارہ میں کیا رائے ہے؟

(۴) "علوم آلیہ" ادب، کلام، معانی، مناظرہ، منطق، فلسفہ، ہیئت، میراث، صرف، نحو، میں کیا کیا کتابیں رکھی جائیں جو بقدر ضرورت استعداد کو حاوی ہوں، نیز وقت بھی بحیثیت انفرادی "علوم مقصودہ" سے زائد صرف نہ ہو، طریق مطالعہ و تعلیم کی وضاحت کی جائے۔ درستگی اخلاق، واصلاح باطنی و ظاہری کا لحاظ بھی ضرور رکھا جائے۔

(۵) فلسفہ جدید، منطق جدید، سائنس، جدید علم کلام، تاریخ، اخلاقیات، اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، وغیرہ علوم عصریہ بھی آپ کے نزدیک قابل اضافہ ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کون کون سے؟ اور کس حد تک؟ کتابیں کیا کیا رکھی جائیں؟ طریق تعلیم و مطالعہ کیا ہو؟ حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہ اکابر کی کتابوں کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مناظرہ کے بارہ میں موجودہ ضروریات، مثلاً مرزائیت، خاکساریت، بدعات ورسومات کی تردید و معلومات کے لیے مناسب کتب کی تجویز کی ضرورت ہے؟

(۶) فرضی مناظروں، اور تقریروں کے بجائے اگر طلبہ کو عملی طور پر تبلیغ میں شرکت کا موقعہ دیا جائے، جس سے قوم کے صحیح امراض واحساسات ورجحانات کے اندازہ کا موقع بھی ملتا رہے گا، اور دکھتی ہوئی رگوں پر صحیح نشتر زنی کی مشق بھی تدریجاً بہم پہنچتی رہے گی، گویا طلبہ کے لیے یہ عملی قسم کی ٹریننگ ہوگی، اس میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۷۔ ابتدائی تعلیم کے لیے بھی نمبروار ہدایات کی ضرورت ہے۔

(۱) داخلہ کے لیے معیار عمر اوسطاً کیا رکھا جائے اور مدت تعلیم کل کتنی ہو؟

(۲) اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بھی معیار قرار دیا جائے یا بلا تخصیص سب کو ایک طرف سے داخل کر لیا جائے۔

(۳) دینیات کی تعلیم کا قدیم مروجہ طریقہ زیادہ مفید ہے کہ مثلاً اوّل قرآن مجید کی تعلیم مکمل کرلی جائے بعد ازاں اردو، فارسی وغیرہ شروع کرائی جائے، یا جدید مخلوط طریقہ تعلیم زیادہ بہتر ہے مثلاً دینیات اردو، فارسی قرآن شریف سب کے الگ الگ گھنٹے مقرر کر دیے جائیں، سب مضامین ایک ہی معلم سے متعلق ہوں یا مختلف اساتذہ کے پاس ہونے چاہئیں؟

پہلی قدیم صورت میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے، اور ثانی جدید صورت میں متعلقہ مضامین ناقص اور نامکمل رہ جاتے ہیں، آپ کے نزدیک اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟

(۴) قرآن شریف، ناظرہ، حفظ، اردو، فارسی، حساب، جغرافیہ، وغیرہ مضامین کی مدت تعلیم کیا رکھی جائے؟

(۵) اور ان کا نصاب کیا مقرر کیا جائے۔

(۶) معلم کے اوصاف ضروریہ کی تشریح فرمائی جائے۔

(۷) جسمانی تربیت کے لیے کیا طریقہ تجویز کیا جائے؟ اور ورزش کے لیے کون سے کھیل رکھے جائیں؟

نوٹ:۔ استفسارات مذکورہ کے علاوہ ابتدائی اصلاحات کے لیے اگر کوئی ضروری مفید، قابل ذِکر بات رہ گئی ہو تو ازراہ عنایت اضافہ کیا جاسکتا ہے مگر یاد واضح رہے کہ ہم (بذریعہ جرائد ورسائل) جدید تقاضوں، اور خیالات سے باخبر تو ضرور ہیں لیکن اس درجہ متاثر نہیں ہیں کہ نصاب مروجہ میں ترمیم کی بجائے تنسیخ کے قائل ہو جائیں، نیز تمام ضروریات اور مقتضیات زمانہ میں اسلامی اسپرٹ اور روح کی بقا کے قائل ہیں، اور اس کی حمایت چاہتے ہیں، والسلام خیر ختام

| | |
|---|---|
| کتبہ ورتبہ<br>العبد<br>محمد نعیم غفرلہ دیوبندی<br>صدر مدرس مدرسہ قاسم العلوم<br>فقیروالی<br>۲۶۔۳۔۷۲ھ | العبد<br>فضل محمد<br>مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیروالی<br>بہاولپور<br>۲۶۔۳۔۷۲ھ |

# استاذ العلماء والمشائخ حضرۃ مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

## دار العلوم دیوبند کا جواب گرامی (۱)

عزیز مکرم زیدت معالیکم۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا میں اتفاق سے کچھ ایسا عدیم الفرصت ہوگیا ہوں کہ بلا مبالغہ اب میرا کوئی فریضہ بھی پورے طریقے پر انجام نہیں پاتا ہے۔ کام کی کثرت اور پھر اس کا پورے طریقہ پر انجام نہ پانا میرے لیے تکلیف دہ ہے۔

نصاب کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ نصاب کی کہانی اور پھر میری زبانی! اچھا خاصہ ایک طویل قصہ ہے۔ بہت دفعہ چاہا کہ اس کو لکھ کر اپنے دوستوں میں شائع کردوں تاکہ اس کو وہ دیکھ کر ''خذ ما صفادع ما کدر'' پر عمل کر سکیں۔ میرے نزدیک موجودہ نصاب تعلیم کی ترمیم کا شور مچانے والے فی صد پچھتر ایسے لوگ ہیں جنھوں نے تحصیل علم کی خاطر ہلکی سے ہلکی تکلیف برداشت کرنے کا بھی ارادہ نہیں کیا۔ اور اس شخص کی طرح پر ہیں، جس کو جنت کی، تقرب خداوندی کی تمنا تو ہو لیکن اور تو کیا، دو رکعت نفل پڑھنا بھی دشوار ہو! یہ حضرات اپنی نا اہلیت پر پردہ ڈالنے کے لیے عدم کمال کا ذمہ دار موجودہ نصاب کو ٹھہراتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کیا آپ نے شروع سے آخر تک ایک دن بھی دو چار گھنٹے کسی کتاب کو یاد کیا تھا یا علم ایسا ہی حلوائے بے دودھ ہے کہ حلق سے جلدی اتر جائے، غور تو کیجئے کہا تو یہ جاتا ہے کہ ہمارے اندر ابو حنیفہؒ، بو علی سینا نہ پیدا ہونے کی ذمہ داری اس ناقص نصاب پر ہے۔ لیکن کبھی اس پر توجہ نہیں فرمائی گئی کہ یہ حضرات ایک ایک مسئلے کیلئے دنیا بھر کی خاک چھانتے پھرے ہیں اور علم کو اس طرح ڈھونڈتے پھرے ہیں جیسے کوئی گم کردہ صحت اپنی تلف کردہ صحت کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ پھر آپ نے علم کو تلاش ہی کب کیا تھا

کہ وہ آپ کا ناخریدہ غلام بن کر آپ کے سامنے حاضر ہو جاتا۔

میں اس قصے کو مختصر کر کے عرض کرتا ہوں کہ اس کے باوجود بھی موجودہ نصاب کی ترمیم کا حامی ہوں۔ تنسیخ کا نہیں۔ میرے نزدیک درس نظامی کا ہیولیٰ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے متعلمین میں احادیث و شروح احادیث، قرآن و تفاسیر قرآن کے سمجھنے کی اچھی خاصی استعداد پیدا ہو جائے۔ اسی طرح میرے نزدیک موجودہ نصاب کی غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ اہل مصر کی طرح پر عربی بولنا آجائے۔ اس ہیولیٰ کو باقی رکھ کر اگر موجودہ نصاب میں ترمیم ہوگی تو صورت کی ترمیم ہوگی نصاب کی حقیقت نہ بدلے گی۔ بات اب بھی بڑھتی جاتی ہے اور میرے پاس وقت زیادہ نہیں۔ اس لیے میں اختصار کے ساتھ اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔

(۱) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ قومی مدارس میں ایسے اساتذہ رکھے جائیں جو ذی استعداد، محنتی فرائض تدریس کے انجام دینے میں کوتاہی نہ کرنے والے ہوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس طرح تعلیم دینے کا ملکہ رکھتے ہوں کہ طلبہ میں تحصیل علم کا شوق پیدا ہو جائے۔

(۲) میری ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ کنز الدقائق یا کافیہ کتابیں درس نظامی سے کم کی جائیں۔ میں سمجھتا ہوں اور میرا تجربہ ہے کہ ان کتابوں کے اغلاق اور مضامین کی دشواری سے طلبہ کے اذہان پر صیقل ہو جاتی ہے اور ان کو عادت ہو جاتی ہے کہ غور کر کے کسی مضمون کو نکال سکیں اور مسائل کے فروق میں غور کر سکیں۔ گویا جس طرح جسمانی طاقت کے لیے ورزش کرائی جاتی ہے اسی طرح ذکاوت حاصل کرنے کے لیے یہ کتابیں دماغی ورزش کا ذریعہ ہیں۔ اس میں کمی کرنے سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو **"المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده"** کا ترجمہ یوں کیا کریں گے کہ ''مسلمان وہ ہے جو مسلمانوں کو ہاتھ اور زبان سے سلام کرے۔''

(۳) موجودہ نصاب میں ترمیم کرنے سے پہلے طرز تعلیم کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔ اگر اساتذہ تدریس کے ماہر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ مشکل سے مشکل مضامین کو آسانی کے ساتھ نہ سمجھا سکیں اور اسی کے لیے ضرورت ہے کہ ایک دار المدرسین کی بنیاد رکھی جائے، جہاں پر مدرسہ سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کو تعلیم کا طرز بتایا جاوے۔

(۴) میری رائے ہے کہ فقہ کی کتابوں میں شرح وقایہ کے بجائے ملتقی الابحر کو جگہ

دی جائے۔ اور ہدایہ پڑھانے کے ساتھ طلب کو ہدایت کی جائے کہ شرح نقایہ کا مطالعہ کریں اور مطالعہ کی نگرانی کے لیے ہدایہ کے امتحان کے ساتھ ہی شرح نقایہ کا امتحان بھی ہو۔

(۵) میری رائے قطعاً نہیں ہے کہ منطق، ہیئت، ریاضی، فلسفہ درس نظامی سے قطعاً خارج کر دیا جائے میری خواہش ہے کہ ان کی تعلیم اس طرح پر ہو کہ کامل الفن لوگ پیدا ہوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ ملتقی الابحر تک پڑھنے کے بعد طلبہ کو اجازت ہو کہ وہ اپنی دل چسپی کے موافق جس شعبہ کو چاہیں اختیار کریں اور ان تمام شعبوں کا نصاب ملتقی الابحر کے بعد جدا جدا ہو اور ہر چیز میں عملی امتحان بھی ہو۔ مثلاً تبلیغ کے لیے کسی ایسے موقعہ پر بھیجا جائے جہاں غیر دین داروں کی کثرت ہو۔ اور حکم دیا جائے کہ وہاں یہ شخص ہفتہ بھر قیام کرے اور واپسی میں اس کے قیام کے حالات اس سے معلوم کیئے جائیں کہ کہاں سے کھایا؟ اپنا صرف کیا یا دعوتیں کھائیں؟ زمین پر سویا یا مکلف فرش ملتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ ان سے جائزہ ہو سکے گا کہ فرض تبلیغ ادا کرنے کی اہلیت اس میں ہے یا نہیں۔ وعظ کے شعبہ میں کسی جلسے میں کوئی موضوع دے کر بھیج دیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ وعظ کی مشق کا کیا حال ہے۔ اسی طرح تمام شعبوں کی عملی جانچ کی جائے امید ہے کہ اس صورت سے اچھے اچھے قابل لوگ ہر فن میں پیدا ہو سکیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ منطق کی زائد از حاجت کتابیں کم کر دی جائیں مگر پڑھایا اس طرح جائے کہ اس کمی کی تلافی ہو سکے۔

(۶) تفسیر کی کتاب جلالین ہے۔ تجربہ سے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ لیکن پڑھانے کا طرز "وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا" کی یاد دلاتا ہے۔ اگر اس کے پڑھانے والے نہ ملیں تو اس کو درس سے نکال کر کوئی مختصر تفسیر رکھ دی جائے۔ تفسیر میں اضافہ کی ضرورت ہے۔

(۷) حدیث کے دورہ میں اب تک میری رائے یہی ہے کہ موطائین اور طحاوی خواہ پڑھائی جائیں یا نہ پڑھائی جائیں مگر صحاح ستہ من اولہا الی آخرھا ضروری ہے۔

(۸) صرف ونحو میں فصول اکبری ابتدائی طلبہ کے لیے حجر اصم بن جاتی ہے۔ اس کو نکال دیا جائے۔ شافیہ، زرادی، زنجانی اور دستور المبتدی ضرورت سے زائد ہیں۔ ہاں علم الصیغہ میں اس قدر مشق کرادی جائے کہ صیغوں کا الٹ پھیر پڑھنے والوں کے ذہن میں اچھی طرح آجائے۔

(۹) نحو اوّل تو تھی ہی کہاں اور جو کچھ تھی اس کو ہماری بے التفاتی نے کھو دیا۔ اس کو اس طرح پڑھا جائے کہ طالب علم م سے ہم یہ سمجھنے لگے کہ مجھ کو ہر مرفوع و منصوب و مجرور کے متعلق طے کرنا چاہیے کہ اس حالت میں یہ کیوں ہے۔

(۱۰) حدیث میں اس پر غور کرنے کا عادی بنایا جائے کہ حدیث کے کسی لفظ کا خلاف، حنفیہ کے مذہب میں تو نہیں ہے اور اگر ہے تو کیوں؟

(۱۱) یہ بھی ضروری ہے کہ فقہ کی تعلیم میں نہ تو یہ خیال پیدا ہو کہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب صحیح ہے اور بقیہ ائمہ، باطل پر ہیں، نہ یہ ہی عقیدہ رہے کہ فقہ ہمارے لیے کافی ہے حدیث و قرآن میں خواہ کچھ ہی ہو۔

(۱۲) اسی طرح ہیئت وغیرہ میں ان سے عملی کام کرایا جائے اور اس طرح پر تعلیم کی جائے کہ وہ یہاں سے نکل کر ہیئت جدیدہ بلکہ تمام علوم جدیدہ پر غور کر سکیں۔

یہ مختصر خاکہ ہے میرے خیالات کا۔ کتابوں کی تفصیل میرے ذہن میں بہت کچھ ہے۔ مگر یہ کام ذرا سی دیر کا نہیں ہے۔ اگر خداوند عالم نے توفیق دی تو پھر کسی وقت کر سکوں گا۔ آپ کی مساعی قابل شکریہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اشاعتِ علوم دینیہ کی توفیق اور زیادہ دے۔ آج کل اسلام کو بد دینوں کے ہاتھ سے بچانے کا طریقہ ان چھوٹے چھوٹے مدارس ہی میں ہے۔ آپ ہمت سے کام کیجئے اور خداوند عالم کے الطاف پر نظر رکھیے۔ جب کوئی شخص بندے کی امداد کرتا ہے تو خدائی امداد اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر آپ خدا کے دین کی مخلصانہ امداد کریں تو یقیناً خدائی امداد آپ کے ساتھ ہو گی۔

میں نے اس قدر عرض کرنا فقط آپ کے ارشاد کی بنا پر ضروری سمجھا۔ ورنہ آپ یقین کریں کہ میں تو اب ضروری سے ضروری کام کے لیے پریشان ہو جاتا ہوں کہ اس کو کس طرح پورا کروں۔ والسلام

محمد اعزاز علی غفرلہ' از دیوبند

۱۴ ربیع الاول ۶۶ھ

# حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

## شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند کا جواب گرامی (۲)

(غالباً گذشتہ مکتوب گرامی کے بعد حضرۃ مرحوم نے مزید تفصیل کیلئے اصرار کیا تو اس پر یہ جواب آیا)

برادر عزیز زیدت معالیکم۔ السلام علیکم۔ آپ کے خطوط آئے۔

عزیز مکرم مولانا قاری حافظ محمد نعیم صاحب کا بھی خط آیا اور حالات معلوم ہوئے نصاب کے متعلق آپ کے استفسارات اوّل تو عدد میں ہی بہت زیادہ ہیں اور دوسرے ان کے جوابات کیلئے میرے خیال میں اس قدر تفصیل ضروری ہے کہ اچھا خاصہ ایک رسالہ ہو سکتا ہے۔

پھر ان استفسارات میں ایسی کتابوں کے متعلق بھی مجھ سے دریافت کیا گیا ہے جو میں نے دیکھی بھی نہیں۔ اور جب تک دیکھ نہ لوں، کیا رائے قائم کر سکتا ہوں؟ اور اب آپ ہی فرمائیں کہ میری اس عدیم الفرصتی کی حالت میں کسی رسالہ کی تصنیف ممکن ہے یا نہیں۔ آپ کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ حضرت مولانا مدنی مدظلہ بہت زیادہ عدیم الفرصت ہیں۔ لیکن خداوند عالم نے ان کے اوقات میں ایسی برکت عطا فرمائی ہے کہ کوئی کام ان سے عدیم الفرصتی کے باوجود چھوٹتا نہیں ہے۔ میں بھی عدیم الفرصت ہوں مگر وہ قوت قدسیہ کہاں سے لاؤں کہ جس کے ذریعہ سے بعض بزرگ گھوڑے کی رکاب میں پَیر رکھ کر سوار ہونے کے وقت تک قرآن کی تلاوت سے فارغ ہو جایا کرتے تھے! غالباً آپ کو میری عدیم الفرصتی کا پورا احساس نہیں ہے۔

جب سے میں نے لکھنؤ کمیٹی میں شرکت کی ہے اس وقت سے نصاب کے متعلق

استفسارات کا تانتا بندھ گیا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں نصاب کے متعلق اپنے پورے خیالات قلم بند کر کے شائع کرا دیتا۔ مگر افسوس ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی ہے اور ظاہر ہے کہ ملازمت کے فرائض انجام دینے بہت زیادہ ضروری ہیں۔ اس لیے میں یہی سمجھتا ہوں کہ آپ کو میری عدیم الفرصتی کا صحیح علم نہیں ہے۔ پس امیدوار ہوں کہ جس قدر نصاب کے متعلق عرض کر چکا ہوں اس سے زیادہ عرض کرنا پورے وقت کا مقتضی ہے۔ جو میرے بس کا نہیں ہے۔ آپ تشریف لائیں گے اس وقت تک انشاء اللہ میرے اسباق متعلقہ بھی ختم ہو جائیں گے اس کے بعد ممکن ہے کہ وقت میں کوئی وسعت ہو جائے۔ اس وقت تو میری درخواست آپ سے یہی ہے کہ آپ مجھے حسبۃً للہ معاف فرمادیں۔

رہا کسی وقت میری حاضری کا مبحث، سو آپ یقین کریں کہ اب تو خیال میں بھی یہ بات دل میں کبھی نہیں آئی ہے کہ میری حاضری ہو سکے گی۔ اس لیے آپ اس کی تکلیف نہ فرمادیں۔ والسلام

بخدمت عزیز مکرم جناب مولانا مولوی قاری حافظ محمد نعیم صاحب و مولانا عبداللطیف صاحب و مولانا احمد میاں صابری سلام عرض ہے۔

محمد اعزاز علی غفرلہ از دیوبند

۴ جمادی الاولیٰ ۶۶ھ شب جمعہ

# جواب گرامی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب

## کامل پوری رحمہ اللہ تعالیٰ سابق صدر مدرس

## مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، انڈیا

جب کہ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالے اور حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس جواب کی تصدیق و تصویب فرمائی

۷۸۶

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔ مولانا فضل محمد صاحب زیدت مکارمکم و محاسنکم وبارک اللہ فی مساعیکم الجمیلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ'۔ ملفوف گرامی نامہ متضمن استشارہ ادارۂ خود ارسال فرمانا باعث یاد آوری و قدر دانی ہوا۔ آپ کے مدرسہ کی شہرت تو کچھ عرصہ سے میں سن رہا ہوں مگر حاضری کی نوبت نہیں آئی اگرچہ بہاول پور اور بہاول نگر تک چند مرتبہ حاضری ہوئی مگر شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ بہر حال آپ نے بنابر حسن ظن ہم لوگوں سے مشورہ فرمایا ہے۔ "والمستشار موتتمن" اس لیے دیانت داری اور امانت داری کے ساتھ مشورہ دینا لازمی ہو گیا۔ اولاً چند امور پر مشتمل ایک تمہید معروض ہے اس کے بعد اصل مشورہ خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔

(۱) یہ ظاہر ہے کہ لوگوں کو دینی اور مذہبی امور کی طرف بالکل گویا توجہ نہیں۔ ایک شرذمہ قلیلہ دینی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ مخالفین کو یہ بھی ناگوار ہے۔ اگر محض بے توجہی ہوتی تو بھی قصہ ہلکا تھا لیکن اس کی تخریب کی فکر میں بڑی بڑی جماعتیں لگی ہوئی ہیں اور اس سلسلہ میں وہ مختلف صورتیں اختیار کر رہی ہیں۔ عوام کو علماء سے بدگمان کر کے اور علماء کو قدیمی روش سے ہٹا کر اور اکابر سلف کے طرق قائم کردہ سے جدا کر کے اور جدید جدید صورتیں پیش کر کے کہ "کل جدید لذیذ" کا مقولہ مشہور و مسلمہ ہے، اسکیمیں پیش کرتے رہتے ہیں۔

(۲) یہ بھی ظاہر ہے کہ نصاب قدیمی جو مروج ہے ہمارے اکابر واسلاف اس کے فارغ شدہ حضرات تھے اور موجودہ اکابر اور مشہور ہستیاں جن کی استعداد مسلم الثبوت ہے وہ بھی اسی نصاب سے فارغ شدہ ہیں اور اسی سے مستفیض ہوئے ہیں۔ اس نصاب کی مخالفت بھی آج سے نہیں بلکہ پچاس سال سے موجود ہے۔ لوگوں نے بہت سے نصاب پیش کیے مگر قبولیت کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بڑی نیک نیتی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیال سے بہت جدوجہد کے ساتھ ایک نصاب مرتب فرمایا اور محض تجویز ہی نہیں بلکہ اس کو چھپوا کر شائع کروایا اور محض اشاعت ہی نہیں بلکہ اپنے حلقہ اثر میں مستقل مکاتیب میں معمول بہا کرا دیا۔ میرٹھ میں ایک مدرسہ خادم العلوم تھا جس میں محض یہی نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ خانقاہ امدادیہ میں بھی یہی نصاب تعلیم دیا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ مقامات حلقات زیر اثر میں جاری فرمادیا مگر کیا اس نصاب مجوزہ کا ایک فرد بھی فارغ شدہ عالم میں موجود ہے۔ اس قبولیت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ مخلصین کی سعی بھی نہ چلی کہ صورت کے اعتبار سے اسی نصاب معمول بہا کا مقابلہ تھا اور مولانا کا حلقہ اثر کس قدر وسیع تھا، جو مخفی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ قبولیت میں اس نصاب کا مقابلہ کوئی نصاب نہیں کر سکتا، خواہ مخالفانہ طرز ہو یا مخلصانہ، یہ امر غیر اختیاری ہے، اب حکومتیں اس طرف متوجہ ہیں وہ بھی منہ کی کھائیں گی۔ کیونکہ قبولیت عند اللہ کا مقابلہ ناممکن ہے۔ یوں مجموعی حیثیت سے ضروری تغیرات اداروں میں حسبِ اقتضاءِ مصلحت ہوتے رہتے ہیں۔ نہ اس کا انکار ہے نہ وہ متنازعہ فیہ ہے۔

(۳) یونیورسٹیوں کے نصاب آئے دن بدلتے رہتے ہیں جن کا مقصد نہ اخلاص ہے نہ مفادِ استعداد ہے بلکہ خود غرضی اور تجارت کے مفادات ہیں۔ اگر باپ کوئی ڈگری حاصل کر لے تو بیٹا بھی اس نصاب سے مستفید نہیں ہو سکتا کہ اس قدر جلدی نصاب بدل جاتا ہے۔ ایک نصاب قدیم مروجہ سے خدا جانے مسلسل کتنی کتنی نسلیں مستفید ہوئیں اور ہوتی رہیں گی۔

(۴) یونیورسٹیوں کے امتحانات اور تجاویز سے البتہ قدیم اداروں کو یہ نقصان پہنچا کہ بامید ملازمت یا مناصب فارغ شدہ ان اداروں کے اس طرف متوجہ ہو گئے اور اب ان اداروں کو مدرس قابل کا ملنا محال نہیں دشوار اور متعسر ضرور ہو گیا۔ باوجودیکہ ان اداروں سے ایک خاصی تعداد اور کافی، سالانہ فارغ ہو کر نکلتی ہے۔

(۵) حکومت کو دینیات سے کوئی انس یا دل چسپی نہیں ہو سکتی تو اس کے مقدمات و مبادی سے کیا اور کیوں دل چسپی ہو گی؟

(۶) تبدیلی نصاب سے اس کا نصب العین سوچنا چاہیے۔ اگر حکومت سے امداد مطلوب ہے تو دینیات کی خیر نہیں اور اگر کوئی دوسری غرض ہے تو اس کا متعین ہونا اور سامنے آنا ضروری ہے کہ اس پر گفتگو کی جائے۔

(۷) اب تک جو ان اداروں نے کام کیا ہے اور مقصد میں کامیاب رہے تو اس وجہ سے کہ حکومت سے بے تعلق رہے خود بلاد اسلامیہ حجاز وغیرہ میں غور کیا جائے کہ حکومت کے دخل سے اداروں کی آزادی کس قدر سلب ہو گئی۔ اور اہل ادارہ کس قدر تنگ ہیں۔ یہ سب کچھ امداد کی بدولت ہوا ہے۔

(۸) حکومت کی امداد خود مستقل ایک سبب میلانِ طبع ہے اس کی وجہ سے مدیرینِ مدارس و ادارات خود اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ان کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں کہ پھر ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور آئندہ چل کر سرکاری امداد بھی بند ہو جاتی ہے کہ بعض شرائط امداد کی پابندی نہیں ہوتی ہے یا انسپکٹر مدارس غیر مسلک آجاتے ہیں وہ نکتہ چینی کر کے امداد بند کرا دیتے ہیں۔ اور اپنے ہم مسلک مدرسین کے بھیجنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مدرسہ ہی قطعاً بند ہو جاتا ہے اور یہ ضرب المثل صادق آجاتی ہے۔ ؂

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

(۹) اشتراک حکومت یا اس کے مشورہ سے جو نصاب مرتب ہو گا وہ ادارات قدیمہ اور درس گاہائے قدیمہ کے لیے غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر یا اس کی حیثیت کو مٹانے والا ہے۔ **فیکف تیحدان؟** سوائے طمع امداد یا دیگر اغراض فاسدہ کے کوئی چیز نہیں۔

(۱۰) تعجب ہے کہ جو ہستیاں آج دنیا میں برسراقتدار ہیں اور اسی نصاب قدیمہ کے خوشہ چیں ہیں انھیں کے ہاتھوں اس کی بیخ کنی ہو رہی ہے۔ **یاللعجب لضیعته الادب**۔ عالم کے عجائبات سے ایک یہ بھی ہے کہ جس بنی نوع کے ہاتھوں کسی چیز کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ انھیں کے ہاتھوں اس چیز کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ **فیاحسرة علی العباد!**

(۱۱) ان وجوہات اور دلائل کے ہوتے ہوئے کسی کو اس نصاب کی ترجیح میں تردد یا کلام ہو تو

فیصلہ کی صورت، مقابلہ کا امتحان ہے۔ جدید نصابوں سے کوئی سا نصاب جو بہتر سے بہتر سمجھا جاتا ہو اس کے فارغ شدہ لے لئے جاویں اور نصاب قدیم سے فارغ شدہ لے لئے جاویں۔ اور دونوں جانب میں تین اقسام لیئے جاویں ادنی اوسط اعلیٰ۔ ایک جانب کی کسی قسم کا مقابلہ مثل اپنی قسم کے کرادیا جائے۔ جس نصاب والا کامیاب ہو جاوے اس کو اختیار کیا جاوے۔ یہ آخری فیصلہ ہے ورنہ نتائج مقابلہ ہر دو کے ظاہر ہیں۔

یہ جملہ نمبرات تمہیدی تھے۔ اس کے بعد آپ کے اصل استفسارات کا جواب بہت مختصر ہے۔ کہ ابھی آپ کا مدرسہ مدت بلوغ کو نہیں پہنچا۔ اس لیے اس کو ایسی بلند پرواز مفید نہ ہوگی۔ بڑے بڑے ادارے بھی ابھی تک تردد میں ہیں۔ اس لیے آپ "تیل دیکھیں تیل کی دھار دیکھیں" کی مثل پر عمل کریں۔ کہیں دوسری ضرب المثل صادق نہ آجاوے۔ کہ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔" موجودہ رفتار کو آپ غنیمت سمجھیں اور اس کی قدردانی کریں۔ ورنہ اس کے سلب ہو جانے کا خطرہ ہے، جیسا کہ عادت اللہ جاری ہے کہ جب اس کی نعماء کی قدردانی نہیں کی جاتی تو وہ نعمت چھین لی جاتی ہے۔ موجودہ گرانی بصورت کنٹرول موجودہ اسی ضابطہ کی شاخ اور شعبہ ہے۔

آپ کے اصل استفسار کے متعلق باقی ایک چیز رہ جاتی ہے جو غالباً آپ کو آپ کی مشکلات کے حل میں مفید ہوگی وہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ یہ پرواز آپ کی طبع سامی کی طرف سے نہ ہو بلکہ پبلک کے لوگ آپ کو دق کرتے ہوں اور اسکیم نصاب کے بولنے پر آپ کو مجبور کرتے ہوں کہ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" یا ایک ہندی مثل مشہور ہے کہ "رانڈ تو جب رہے جب رنڈوے رہنے دیں" اندریں صورت ان کے جواب کے لئے کسی تدبیر یا لطائف الحیل کی ضرورت ہے۔

اس غرض سے وہ بھی عرض کیے دیتا ہوں۔ اس کی اسکیم یہ ہے کہ آپ ان سے یہ کہیں کہ ہماری پرانی اسکیم تو اس قدر عرصہ سے تجربہ میں آرہی ہے اور اس کے نتائج بھی سامنے ہیں جس قدر ادارے اطراف و جوانب میں کام کر رہے ہیں خواہ پنجاب میں خواہ یوپی میں، اور غیر امدادی بھی ہیں ان کے ذمہ دار اسی نصاب کے فارغ شدہ ہیں۔ اب آپ تجدید نصاب و تجدید اسکیم چاہتے ہیں۔ ہم آپ کی رائے سے موافقت کرتے ہیں۔ مگر اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس جدید اسکیم کا اس طرح چند سال تجربہ کیا جاوے کہ وہ مستقل ادارہ ہو مستقل اس کا مکان ہو مستقل چند ذمہ داران ہوں۔ اہل شہر کو اس میں شریک کیا جاوے۔

چندہ اس مدنا علیحدہ ہو، کمیٹی علیحدہ ہو، آپ بھی اس کے رکن ہوں، مشیر ہوں۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اس اسکیم کو ہم بھی اپنے ادارے میں جگہ دیں گے۔ چونکہ پرانی اسکیم کو جس کا تجربہ ۱۰۰ سو سال سے زائد ہو رہا ہے۔ ایسی اسکیم سے جو جدید ہوا بھی اس کا تجربہ نہ ہوا ہو منسوخ کر دینا یا اس میں ترمیم کر دینا خلاف اصول ہے کہ " اليقين لايزول بالشك" اصول مسلمہ ہے۔ اب دو اسکیم چلیں گی ایک جدید دوسری قدیم۔ قیاس کا مقتضی تو یہ ہے کہ جدید اسکیم کا تجربہ سو سال کرے اور اس کے نتائج بہترین سامنے آجانے کے بعد، جو پرانی اسکیم کے نتائج سے بہترین ہوں، ترمیم یا تنسیخ کی رائے قائم کی جاوے۔

لیکن اگر یہ مدت طویل معلوم ہو تو کم از کم دس بیس سال ضرور تجربہ کیا جاوے۔ اس سے پہلے کوئی تجویز مناسب نہیں ہے۔ چرا عاقل کند کارے کہ باز آید پشیمانی۔" جب یہ چیز آپ کے سامنے رکھیں گے۔ تو سمجھ دار طبقہ موجودہ اسکیم یونیورسٹی کے امتحانات وغیرہ سے خود ہی نتیجہ نکال لیں گے کہ " الشجرة تنبئي عن الثمرة" بقیہ طبقہ کا اصرار ہو تو ضرور بطریق مذکور ان کو طیار کیا جاوے اور جدید اسکیم بنا کر مستقل ادارہ بنا دیا جاوے۔ مگر آپ کا دخل محض مشیر اور رکن ہونے کی حیثیت سے رہے۔ آپ کا قدیمی ادارہ علیٰ حالہ چلتا رہے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ محرکین کی سعی کہاں تک ساتھ دیتی ہے اور نظارہ مقولہ مشہور کا آپ کے سامنے آجاوے گا۔

"تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شور" اور ان کو بھی پھر "وہی کھر یاد ہی جاتی" پر قناعت کرنی پڑے گی اور آپ اپنے ادارہ کو اطمینان سے پرانے طریقہ پر چلاتے رہیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

اور اگر آپ کی طبع سامی ہی اس طرف پرواز کرنے کو ہے تو "صاحب البيت ادرى بمافيه" شاید "اے روشنیء طبع تو بر من بلا شدی" کا منظر سامنے آجاوے۔

بندہ عبدالرحمٰن غفر لہ ۵/۵/۶۶ھ

"از زکریا عفی عنہ، بعد سلام مسنون، مضمون واحد۔"

"یہ مضمون جس خیال و نظر کے ماتحت سپرد قلم فرمایا گیا ہے، وہ دوربین حضرات کے لیے بہت زیادہ اہم اور واجب العمل ہے واقعات شاہد ہیں کہ اقوام نے ذہنیت بدلنے کے لیے تبدیل نصاب کو ضرورت قرار دیا ہے اور اس وقت جو تبدیلی ہو گی، وہ مذہب سے دور ہی لے جانے والی ہو گی۔

محمد اسعد اللہ ۵/۵/۶۶ھ

# مکتوب گرامی حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ
# سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند

مورخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ

مطابق ۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء

حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

کئی روز ہوئے گرامی نامہ صادر ہوا تھا۔ احقر اپنی کاہلی یا مشغولیت کے باعث جواب نہیں دے سکا۔ اس تاخیر کو معاف فرمادیں۔

فسادات کی بناء پر اپنے احباب، بزرگوں اور رفقاء کرام کی طرف سے تشویش رہتی ہے خدا کرے آپ سب حضرات بہمہ وجوہ بعافیت ہوں۔

آپ معاف فرمادیں آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ احقر نصاب کے بارے میں مبصر کبھی بھی نہیں تھا۔

اب تو چند سال سے جیل خانہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی اور باہر آیا تو دفتر مرکزیہ جمعیۃ علماء ہند میں محرری کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ جو لفظِ نظامت کی عملی حقیقت ہے ایسی حالت میں احقر کا کچھ لکھنا نابلد کی تحریر ہوگی۔ مگر ارشاد گرامی کی تعمیل بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ لہذا سب سے پہلے احقر یہ واضح کردینا ضروری سمجھتا ہے کہ تبدیل نصاب کے بارہ میں احقر کچھ زیادہ روشن خیال نہیں واقع ہوا۔ بلکہ بڑی حد تک احقر مقلد ہے۔ موجودہ نصاب میں کچھ تبدیلی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور احقر ضروری سمجھتا ہے، مگر وہ

تبدیلی صرف جزوی ترمیم سے ممکن نہیں۔

پرائمری اور ابتدائی درجات میں تو احقر کی یہ خواہش ہے کہ ان کا نقشہ وہی ہو جو سرکاری پرائمری اسکولوں کا ہوتا ہے۔ البتہ اس میں مذہبیات کا اضافہ آپ کر دیں۔ مگر وہ نہایت سہل ہو کہ بچے بآسانی اس کو برداشت کر لیں۔ اس طرح کسی مسلمان کو اس کا موقعہ نہ رہے گا کہ وہ آپ کے مدرسہ میں اپنے بچے کو نہ بھیجے۔ وہ پرائمری تعلیم جو پرائمری اسکول میں دی جاتی ہے۔ آپ کے ہاں بھی دی جائے گی اس پر قرآن حکیم اور دینیات کا اضافہ ہو جائے گا۔ گورنمنٹ بھی آپ کے بچے کو جبری تعلیم سے مستثنیٰ کر سکتی ہے اور آپ کے یہاں پڑھنے والے بچے مقدمات کی دست برد سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن درجات حفظ بالکل علیحدہ ہوں اور تااختتام حفظ، بچے کے دماغ کو منتشر نہ کیا جائے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد بچے کو فارسی یا عربی کی طرف متوجہ کرایا جائے۔ ایک خیال یہ ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم بیکار ہے۔ عربی کی ابتدائی کتابیں اردو میں ہونی چاہئیں۔ فارسی صرف ان کو پڑھائی جائے جو اس زبان کو حاصل کرنا چاہیں مطلب یہ ہے کہ فارسی زبان عربی کا ذریعہ تعلیم نہ رہے بلکہ انگریزی زبان کی طرح علیحدہ زبان قرار دیا جائے اور صرف ان کو پڑھائی جائے جو اس زبان کو سیکھنا چاہیں۔ عربی زبان کے لئے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ یہ خیال درست ہے۔ مگر احقر کے خیال میں اب تک جو کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ ان سے عربی تعلیم میں اور طوالت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر علم الصیغہ اور نحو میر کا ترجمہ اردو میں ہو جائے تو احقر کے خیال میں وہ بہتر اور مختصر رہے گا۔ عربی درجات کے نصاب میں اس قدر ترمیم تو ضروری ہے کہ منطق اور فلسفہ جو علوم آلیہ ہیں، متون پڑھا کر نفس مسئلہ کی تعلیم اور اس کی تمرین پر زور دیا جائے۔ شروح کی طوالت کو حذف کر دیا جائے۔ البتہ متون میں بعض مناسب اضافہ ضرور کر دیا جائے۔ مثلاً معانی میں مختصر المعانی حذف کر کے تلخیص المفتاح کے بعد معانی کی کوئی اور کتاب پڑھائی جائے۔ (اس کے متعلق مولانا عبدالحق صاحب مدیر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد سے استصواب کیا جائے)۔

نحو اور ادب کی تعلیم کا طرز کیا ہو پہلے ادب ہو یا پہلے نحو و صرف اس مسئلہ میں آپ مولانا معراج الحق صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند ضلع سہارن پور سے مشورہ فرمائیے۔

فنونِ آلیہ کے سلسلہ میں جغرافیہ اور تاریخ کا اضافہ ازبس ضروری ہے کچھ کتب تاریخ

وجغرافیہ کا ان کو مطالعہ کرایا جائے۔ مطالعہ کی بہتر صورت یہ ہے کہ چند طلبہ کی چھوٹی سی جماعت بنا کر ہدایت کی جائے کہ ایک صاحب کتاب پڑھیں دوسرے سنتے رہیں۔ اس طرح کتابوں کا مطالعہ کرایا جائے اور ہر کتاب کے ختم پر اس کا امتحان لے کر دوسری کتاب کے مطالعہ کی فرمائش کی جائے۔

رسول کریم ﷺ، قصص القرآن، سیرۃ النبی ﷺ، الفاروق، شان دار ماضی وغیرہ کا مطالعہ اسی طرح کرایا جائے۔

علوم مقصودہ کے نصاب میں جو کتابیں ہیں ان میں کمی کی شکایت ہے یعنی ضرورت سے بہت کم ہیں۔ زیادتی کی شکایت نہیں۔ لہذا احقر کے خیال میں کم کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ صرف یہ کہ کنزالدقائق اور شرح وقایہ کے بجائے شرح نقایہ مکمل طور پر پڑھائی جائے۔

الفوزالکبیر اور نخبۃ الفکر کی تعلیم لازمی ہے اور الاتقان فی علوم القرآن کے بھی کچھ حصے داخل درس ہونے چاہئیں۔ خیر الاصول کے مطالعہ کا احقر کو شرف حاصل نہیں ہوا۔

درستی اخلاق کے بارے میں احقر کا خیال ہوا کرتا ہے کہ طلبہ کی مختلف جماعتیں کر کے ایک ایک جماعت کو ایک ایک استاد کے حوالہ کر دیا جائے جو ۲۴ گھنٹہ ان کی نگرانی رکھے۔ باہمی اختلاط مربیانہ معاشرت سے ان کی تربیت کرتا رہے ایسے مدرس اگر میسر آجائیں تو ان کی تلاش کرنی ضروری ہے اور ان کی تنخواہوں میں بخل اور بے جا کفایت شعاری سے کام نہ لیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کی کتابوں اور اس قسم کی درسی کتابوں کے متعلق احقر کی رائے تو یہ ہے کہ ان کے لئے مستقل درجات تکمیل ہوں۔ جن میں انگریزی، ہندی وغیرہ کی تعلیم بھی ہو اور تبلیغ وغیرہ کی عملی مشق بھی ہو۔ زمانہ درس میں تبلیغ کی عملی مشق مناسب نہیں۔

احقر نمبر ۷ کا ضمناً اور صراحتہً جواب دے چکا ہے۔ اگر موقعہ مل سکا تو اربعین مصنفہ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب اور رسالہ ہمارے پیغمبر کے نمونے احقر بھیجے گا اگر مناسب سمجھیں تو ابتدائی تعلیم کے سلسلہ دینیات میں داخل فرمالیں۔

والسلام

محمد میاں

# استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ

## جواب گرامی

مولانا المکرم زاد فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تعمیلاً لارشاد مختصراً عارض ہوں۔

(۱)۔ (۲) متن قرآن کریم کا ترجمہ تین سال میں عربیت و ادبیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سبقاً پڑھایا جائے۔ سال اولیٰ میں منزل اول، دوئم میں تا سورۃ مومنون، سوئم میں ختم تک، پھر مدارک یا جلالین استحساناً، باقی بس۔

مشکوٰۃ شریف خود صحاح ستہ کو تقریباً حاوی ہے۔ اس کے بعد جمع الفوائد وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس سے قبل آثار السنن نیموی کا پڑھانا از حد مفید ثابت ہوا ہے اور مشکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اگر احیاء السنن اور اعلاء السنن کا مطالعہ کرا دیا جائے تو سونے پہ سہاگہ ہے۔

دورہ حدیث کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دو سال میں ہونا زیادہ مفید ہے۔ پہلے سال ترمذی شریف اور دوسرے سال بخاری شریف اصل قرار دی جائیں، باقی توابع۔

فقہ میں، رسالہ عقود رسم المفتی اور اس کے بعد در مختار کتاب الطہارۃ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الطلاق، کتاب الوقف مع تمرین فتویٰ نویسی۔

(۳) اصول تفسیر، بطور مطالعہ تفسیر اتقان مناسب ہے۔ اصولِ حدیث میں علاوہ نخبۃ الفکر کے خیر الاصول، مقدمہ انہاء السکن مناسب ہیں۔

(۴) ادب، عقائد، معانی، مناظرہ، میراث، نحو کے متعلق دار العلوم دیوبند کا مروجہ نصاب انسب ہے۔

صرف میں میزان و منشعب، صرف میر معہ گردانہائے ابواب الصرف علم الصیغہ،

فصول اکبری کافی ہیں۔

منطق میں۔ تیسیر المنطق، ایسا غوجی، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی کامل، سلم العلوم کامل، ملا حسن تا مفہوم۔

فلسفہ میں۔ ہدیہ سعیدیہ تا بحث مزان، میبذی۔

ہیئت میں۔ تصریح۔

(۵) ان میں سے فی الحال کوئی درس میں داخل کرنے کے قابل نہیں۔

البتہ جب ان فنون کے اساتذہ مل جائیں تو بقدر کفایت اول الذکر داخل درس کئے جاسکتے ہیں (فی الحال یہ سوال قبل از وقت ہے یا شیخ چلی کا کھیل ہے اس لئے نہ تالیف میسر نہ معلم)۔

(۶) اس صورت میں تعلیم نہایت کمزور اور ردی ہو جائے گی۔ کتابی اور علمی استعداد سے طلبہ محروم ہو جائیں گے۔

(۷) اس سوال میں بہت سی باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ جن کا مختصر جواب کافی نہیں ہو سکتا اور تفصیل کی فرصت نہیں۔ اس لئے مناسب یہ ہو تاکہ اپنی دانست کے مطابق ایک نقشہ کار مفصل لکھ کر ترمیم طلب کر لی جاتی تو جواب دینے والوں کو ایک گونہ سہولت ہوتی۔

فقط

خیر محمد عفی عنہ

از مدرسہ خیر المدارس جالندھر

۲۶۔۵۔۷ھ

## جواب گرامی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ تعالیٰ

از بندہ محمد شفیع عفااللہ عنہ مفتی دیوبند

مورخہ ۴ جمادی الاولیٰ ٦٦ھ

مکرم بندہ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

گرامی نامہ سے مسرور فرمایا۔ نصاب وغیرہ متعلقہ سوالات کے بارہ میں اپنی ناچیز رائے معروض ہے۔

(۱) تفسیر میں۔ جلالین، تفسیر بیان القرآن، تفسیر مظہری۔

حدیث میں۔ دورہ حدیث کی کتب متداولہ کافی ہیں۔ صرف اعلاء السنن مکمل کے اضافہ کی ضرورت ہے۔

فقہ میں۔ کتب متداولہ کنز، ہدایہ وغیرہ کافی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ماہر علماء درس کے لئے مقرر ہوں۔ جو اپنی زندگی کا مقصد درس کی تکمیل کو سمجھیں اور کتابیں اول سے آخر تک پوری محنت سے پڑھائی جاویں۔

(۲) تفسیر مظہری بہت مناسب ہے۔ طنطاوی کی تفسیر کو تفسیر کہنا اس کی حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ وہ کوئی تفسیر کی کتاب نہیں۔ حدیث میں میرے نزدیک مشکوٰۃ شریف کافی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اعلاء السنن کامل کا اضافہ مناسب ہے۔

(۳) فوز الکبیر، نخبتہ الفکر بھی کافی ہیں۔ اگر طلباء اچھے پڑھنے والے سمجھ دار ہوں تو تدریب الراوی بھی پڑھادی جائے۔ بہت مفید ہے۔

(۴) ان علوم میں جو کتب درس نظامی میں مروج ہیں۔ اختصار کے لئے ان میں سے زواہد ثلثہ، شرح مواقف، مطول کو حذف کر دیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ ان کی جگہ فلسفہ جدیدہ اور جغرافیہ کے چند رسائل رکھ دیئے جائیں۔

(۵) یہ اضافہ مناسب ہے مگر اس کی کتابیں مجھے کچھ زیادہ پیش نظر نہیں۔ جامعہ ازہر مصر کا

نصاب کہیں سے حاصل کر کے اس میں سے انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں میں سے صرف حجۃ اللہ البالغہ ایسی ہے جس کو درساً پڑھایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی جب کہ پڑھانے والا کوئی ماہر عالم ہو اور پڑھنے والے منتہی مستعد طلبہ ہوں ورنہ خواہ مخواہ سر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ باقی ان کی وہ تصانیف جو علوم مکاشفہ وغیرہ سے متعلق ہیں نہ وہ تعلیم و تعلم کے لئے وضع ہیں نہ ان کا پڑھانا مفید ہے بلکہ انہیں کی تصریحات کے مطابق مضر ہے۔

(۶) اگر صرف ہفتہ وار جمعہ کے روز اساتذہ کی نگرانی میں ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے زیادہ ہونے میں تعلیم، جو اصل مقصد ہے گم ہو جائے گا۔

یہ تو جناب کے سوالات کا جواب تھا۔ لیکن احقر کو اپنے مختصر تجربہ سے جو ثابت ہوا، وہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت میں جو نقص عام مدارس میں آج کل محسوس کیا جا رہا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ کام کے آدمی پیدا نہیں ہوتے اس کا سبب نصاب کی کوتاہی نہیں۔ رجال کار کی کوتاہی ہے۔

اول تو ماہرین فن کا قحط ہے پھر کوئی ماہر بھی ہو تو اسے اشاعت علوم کا جذبہ حاصل نہیں اور یہ کام ہمیشہ جذبہ صادقہ سے ہوتا ہے۔ محض تنخواہ و ملازمت سے نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں نصاب کی تجویز و تشکیل کی فکر فضول ہے۔ جو موجودہ مروجہ نصاب ہے، وہ بھی کافی ہے، اس میں مقامی اور وقتی ضرورت سے معمولی تغیر کر دیا جائے تو یہ مفید ہو سکتا ہے۔ مگر اصل توجہ اور فکر کی چیز رجالِ کار کا مہیا کرنا ہے، جو اشاعت علم اور تربیت طلباء کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھیں۔ ایسا ایک آدمی بھی مہیا ہو جائے تو غنیمت کبریٰ ہے۔ دوسرے بھی پھر اس کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔

جتنے اکابر علماء اب تک پیدا ہوئے وہ اسی نصاب کے فاضل ہیں جس کو آج فرسودہ کہا جاتا ہے۔ مگر اساتذہ کاملین و ماہرین تھے۔ اس لئے اسی نصاب سے سب کچھ حاصل ہو گیا اور عام اسکولوں کالجوں میں ہر تیسرے سال نصاب بدلنے والی کمیٹیاں بیٹھتی ہیں۔ مگر رجالِ کار کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اس کے غلط نتائج کسی بصیر انسان سے پوشیدہ نہیں۔

والسلام

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

دیوبند

# جواب گرامی حضرت مولانا فاروق احمد رحمتہ اللہ تعالیٰ

(سابق مفتی دارالعلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور و مدرسہ قاسم العلوم فقیروالی)

مولانا المحترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

"تعلیمی نصاب پر اصلاحی نظر" مجھ جیسے بے بضاعت سے امید موہوم سے زیادہ نہیں مگر تعمیلِ ارشاد کیجئے یا آپ کے حسن ظن کی رہنمائی، قلم اٹھاتا ہوں شاید کچھ سنگریزوں میں جواہر پارے بھی دستیاب ہو جائیں "گدڑی میں لعل" مشہور فقرہ ہے۔

مولانا! اصلاحِ نصاب اپنے اندر اس قدر جاذبیت رکھتا ہے کہ اس کا نام آتے ہی نگاہ طلب کہہ دیتی ہے کہ تمناؤں کا بے اتھاہ سمندر ہے جو قلم کی زبان پر آب یاری کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ "نوری مساکین" کا بہت بڑا طبقہ اس کی ضرورت میں زبان اور قلم سے بہت زیادہ پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مجالس میں تقریریں ہوتی ہیں۔ مدارس کے اکابر سے بھی گاہے گاہے ایسے فقرے نکل جاتے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا نصاب بہت بڑی اصلاح کا محتاج ہے۔ مگر عملی قدم اجتماعی طور سے کبھی نہیں اٹھایا گیا۔ "ثم رجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسئاً وھو حسیر۔" کا مصداق ہے۔ یہ سوچیئے کہ ضرورت تسلیم کرنے کے بعد عملی قدم کیوں نہیں اٹھتا ہے۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مولانا! بات یہ ہے کہ جن کا کام ہے وہ کرتے نہیں اور جو کرنا چاہتے ہیں ان کے بس کی بات نہیں۔

معاملہ جہاں کا ہے وہاں کا وہاں رہ گیا۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ منڈی میں وہی چیز آئے گی جس کے خریدار ہوں گے۔ بنگال میں غلّہ کے انبار در انبار لے جا کر ان کی فروخت کی امید

ایسی غیر یقینی ہے جیسے بنگال کے چاول پنجاب میں لا کر ان سے نفع کی امید رکھنا۔ اسی طرح جو کپڑا پنجاب میں فروخت ہوتا ہے۔ اسے یوپی میں لے جا کر اس کے نکاس کی امید رکھنا محض خیال خام ہے۔

آپ اصلاحی نصاب جاری کر کے اس کی منڈی کہاں بنائیں گے؟ اصلاحی نصاب چلانے والے آپ کو کہاں ملیں گے؟ پڑھنے والوں کو کہاں سے بلائیں گے؟ اس نصاب کے چلانے میں قدم قدم پر وادی خارزار سے گزرنا پڑے گا۔ گزرتے ہوئے دامن بچانے اور سروں کی حفاظت کا کیا انتظام ہو سکے گا۔ اگر آپ نے کسی طرح مدرسین اور طلبہ کو آمادہ بھی کر لیا تو اصلاحی نصاب پر اخراجات آپ کس طرح برداشت کریں گے؟

جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہر اصلاحی کام کی ابتداء میں خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کو ملازمین کی تنخواہ بہت زیادہ دینی ہوگی۔ طلباء پر انعامات کی موسلا دھار بارش کا فکر دامن گیر رہے گا۔ آپ نے دیکھا ندوہ نے اپنی دانست میں اصلاحی قدم اٹھایا، جس کو پچاس برس سے زیادہ عرصہ ہوا ہوگا۔ اس کو کیا کامیابی ہوئی؟ کس قدر مدارس اسی طرح پر قائم ہوئے؟ کتنے طلبہ اس کے مقاصد لئے ہوئے نکلے؟ دیکھا یہ گیا کہ نہ قوم میں ان کی قدر ہوئی اور نہ ہی حکومت نے ان کو پوچھا۔ مجبوراً وہاں سے نکل کر دیوبند میں اپنی تکمیل کی یا انگریزی مدارس کا رخ کیا۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جن کی شہرت اور مقبولیت آپ سے پوشیدہ نہیں، ایک نصاب بنام زمان التکمیل جاری کیا لیکن قوم نے جو اس کے ساتھ معاملہ کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ، دہلی کو دیکھئے اور جامعہ عباسیہ بہاول پور کی طرف نظر اٹھائیے کیا قوم نے یا حکومت نے کسی قسم کی قدر افزائی کی؟ مولانا! میں پہلے ظاہر کر آیا ہوں کہ نصاب تعلیم کی عملی تبدیلی دو ہی طرح ہو سکتی ہے۔

(۱) مرکز مدارس تبدیلی کرے۔ دیوبند، سہارن پور، دہلی۔

(۲) یا حکومت اصلاحی نصاب کے تعلیم پانے والوں کو ممتاز درجہ مرحمت کرے۔ یہ دونوں چیزیں ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ لہذا اس کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے کہ نصاب تعلیم عربیہ اصولاً موجودہ زمانہ میں بدلا جا سکتا ہے۔ یہ جواب اس صورت میں ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ موجودہ نصاب تعلیم ناقص ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہ قاعدہ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو اس نصاب کو اسی قاعدہ سے کیوں پرکھا نہیں جاتا۔ کیا اکابرین

علماء دیوبند، سہارن پور، دہلی اسی نصاب کے پروردہ نہ تھے اگر یہ نصاب ذاتی طور سے ناقص ہوتا، تو اس قدر اہل کمال اس نصاب کی بدولت پیدا نہ ہو سکتے۔ البتہ جزوی ترمیم اگر کی جائے تو مناسب ہے۔

میرا پچاس سالہ تجربہ یہ ہے کہ اس وقت علماء کامل پیدا ہونا بند ہو رہا ہے۔ اسکی دو وجہ ہیں۔

(۱) سب سے زیادہ طریقہ تعلیم غلط ہو گیا ہے۔ نصاب سابق رہا اور طریقہ تعلیم بدل دیا گیا۔

(۲) آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ زمانہ میں قویٰ کمزور ہو گئے ہیں اور دماغی اصلاح کا کوئی سامان نہیں۔ مگر تعلیمی بوجھ اور چھ گھنٹے کی تعلیمی ذمہ داری سابق طریقے پر ہے۔ دماغی کمزوری اور ماحول کے اثرات سے جو لوگ اپنے علم کو ابتداءً پختہ نہیں کر سکے اس چھ گھٹے کی تعلیم میں ان کو اپنی قابلیت کے بڑھانے کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا۔ چھ گھنٹے دماغ سوزی کے بعد اور اس کی تیاری میں اپنے کئی گھنٹے خرچ کرنے کے بعد دوسری ضروریات کی موجودگی میں اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ اپنی قابلیت میں ترقی کرے گا۔ کہاں تک صحیح امید ہے؟ لہٰذا اسباق کی تعلیم کا وقت چار گھنٹے ہونا چاہیئے اور دو گھنٹے ایسے رکھے جائیں کہ علاوہ درسی کتابوں کے عامہ معلومات بڑھانے کے واسطے وہ مطالعہ کر سکے اور قابل ترین معلم ہو جائے۔ اس طرح پر وہ مدرسہ میں پورے چھ گھنٹوں کا پابند رہے گا اور کام بھی بہت اچھا کرے گا۔

(۳) قدیمی طریقہ تعلیم کو چھوڑنے کا باعث ہی ہمارے نصاب تعلیم کی بدنامی کا سبب ہو رہا ہے۔ ہر چیز کی کامیابی مقصد کے متعین کرنے سے ہوتی ہے۔ عربی طلبہ کے سامنے کوئی مقصد نہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کیونکہ ہمیشہ حکم ظاہر پر ہوتا ہے اور ظاہر ان کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عربی پڑھنے کے بعد دنیا کے تقریباً تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں بمشکل سوڈیڑھ سو ایسے ہوتے ہیں جن کو اہل مدارس اپنے ہاں کام پر لگا لیتے ہیں وہ بھی بہت معمولی تنخواہ پر، زیادہ حصہ ایسے ہیں کہ نہ دین کے نہ دنیا کے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب مقصد ہی سامنے نہ ہو۔ اس کا نتیجہ بے پرواہی اور بد شوقی ہوتا ہے۔ چناں چہ بیشتر حصہ طلباء کا بد شوق اور بے محنت ہوتا ہے۔ یاد کرنے کی چیزیں یاد نہیں کرتے۔ مطالعہ کی چیزوں کا مطالعہ نہیں کرتے اس لئے بنیادیں کمزور ہوتی ہیں اور نتیجہ

کچھ نہیں۔ سب سے پہلے انہیں شوق دلانے کی کوشش کی جائے۔ ان کے سامنے ان کے مقصد کو واضح کیا جائے۔ امتحان ماہوار لیا جائے۔ اساتذہ سخت نگرانی کریں کہ مطالعہ میں مصروف رہیں۔ اچھے نمبروں پر کامیاب طلباء کو کافی انعام دیا جائے۔

(۴) سابقہ طریقہ تعلیم یہ تھا کہ طلباء مطالعہ کرتے تھے اور استاذ ان کے مطالعے کو سنتے تھے۔ مطالعہ کا طریقہ بتلاتے تھے، فہمائش کرتے تھے۔ اظہار خفگی اور ناراضی ہوتا تھا۔ اس طریقہ سے طلباء پر بھی اثر ہوتا تھا اور وہ مطالعہ میں منہمک رہتے تھے اور ان کی لیاقتیں بڑھتی تھیں اور موجودہ طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ طلباء نے عبارت پڑھی اور استادوں نے تقریر کر دی۔ یہ نہایت مضر ہے۔ اس کو چھوڑا جائے اور طلباء سے ہی تقریر کرائی جائے۔ اس میں ابتداءً اگرچہ سبق کم ہو گا طلباء دل برداشتہ ہوں گے۔ ان کی تسلی کی جائے۔ نیز ایسی مالی امداد کی جائے جو دوسرے مدارس میں نہیں۔

(۵) متون کے مضامین ضروریہ کو حفظ کرایا جائے۔ ابتدائی درجہ کے طلباء کو پہلے سال اردو خط اور دوسرے سال عربی خط کی مشق کرائی جائے اور جو طلباء ان دو درجوں کی تعلیم کے بعد ہوں ان پر بھی ہر دو خطوط کی تعلیم لازمی کی جائے۔

(۶) جن طلباء نے درجہ فارسی، اردو میں حساب نہ کیا ہو ان کو کم از کم پانچ جماعت اور زیادہ سے زیادہ مڈل کا حساب لازماً کرایا جائے۔

(۷) تعلیم کے دوران میں فوقانی جماعت کے ذمے تحتانی جماعت کے بعض اسباق، زیر نگرانی اساتذہ لگائے جائیں۔

(۸) کچھ طلبہ کو وظیفہ دے کر لاہور یا دہلی بھیج کر کاپی نویسی بھی سکھلائی جائے۔ اس سے ان کی معاشی اور اقتصادی ضروریات کا حل ہو گا۔

(۹) آج کل اس پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے کہ طلباء کو تقریر کا فن سکھایا جائے۔ بعض مدارس کوشش بھی کر رہے ہیں مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ تحتانی اور وسطانی درجات کا تقریر کرنا موجودہ صورت میں ان کی آئندہ ترقی کو مانع ہوتا ہے۔ تقریر آنے کی صورت میں تعلیم کو چھوڑ چھاڑ کر وعظ گوئی کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اور ''ضلّوا واضلّوا'' کا مصداق بنتے ہیں۔ نیز وعظ گوئی مشکل نہیں۔ مناسبت کی ضرورت ہے۔ وعظ گوئی کی شکل میں مشکل کتابوں کی طرف توجہ مشکل ہو جاتی ہے اور اس طرح تعلیم سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے حل کی

صورت یہ ہے کہ "یوم تقریر" کے واسطے ان کی تعلیمی کتابوں سے ان کو مضامین دیئے جائیں۔ اس سے تقریر اور کتاب دانی دونوں حاصل ہوں گی اس میں شک نہیں کہ اس اصلاحی طریقے پر چلنے سے مدرسہ میں طلباء کم آئیں گے اور اساتذہ بھی اس کو اپنے لئے تکلیف کا باعث سمجھیں گے۔ لیکن اگر منتظمین مدرسہ کوشاں ہوں تو یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ محنتی طلباء کو علاوہ معمولی امداد کے خصوصی امداد دی جائے اور اساتذہ کو ایسے طلبہ تیار کرنے کے علاوہ تنخواہ کے انعام دیا جایا کرے۔ یہی نصاب انشاء اللہ بہت کامیاب اور کافی ہوگا۔ البتہ جزوی ترمیمات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آپ کا یہی منشا ہے کہ طریقہ تعلیم یہی جاری رہے اور نصاب میں ترمیم ہو جائے اگرچہ میرے نزدیک کامیابی نہیں ہوگی، مگر حسب ترتیب نمبر وار جوابات پیش ہیں۔

(۱) بجائے منیۃ المصلی، نور الایضاح، قدوری اور کنز الدقائق کے تین جماعتوں میں فتاویٰ بزازیہ مکمل پڑھایا جائے۔ اس کے بعد شرح وقایہ مکمل اور بدایۃ المجتہد لابن الرشد تمام۔ اس سے فتویٰ نویسی میں بھی امداد ہوگی اور فتویٰ نویسی کی مشق ابتداء سے کرائی جائے۔ ہر چیز عمل سے ہوتی ہے۔ محض علم ہی مفید نہیں۔

(۲) تفسیر جلالین کے ساتھ تفسیر بیان القرآن حضرت تھانویؒ کا بھی مطالعہ کرایا جائے۔ تفسیر اتقان کا پہلا حصہ سبقاً اور باقی مطالعہ اور تفسیر ابو السعود جس قدر مناسب ہو۔ نیز اسباب النزول تفسیر مظہری مطالعہ کی کتاب ہے۔ تعلیم کے وقت اس کو اساتذہ دیکھیں اور جلالین کی تدریس کے وقت ضروری امور تفسیر مظہری کے بیان کئے جائیں۔ جلالین دو سال میں پڑھائی جائے۔ طحاوی میری دیکھی ہوئی نہیں ہے۔ حدیث شریف میں مشکوٰۃ سے قبل ریاض الصالحین پڑھائیں۔ نیز جامع الصغیر سیوطی، مشکوٰۃ کو بھی کتاب الآداب سے آخر تک پہلے سال پڑھایا جائے اور مابقی کو دوسرے سال موضوعات ملا علی قاری یا موضوعات پٹنی، دونوں میں سے ایک پڑھائی جائے۔ طحاوی میری دیکھی ہوئی نہیں ہے۔ حدیث شریف میں مشکوٰۃ سے قبل ریاض الصالحین پڑھائیں۔ نیز جامع الصغیر سیوطی، مشکوٰۃ کو بھی کتاب الآداب سے آخر تک پہلے سال پڑھایا جائے اور مابقی کو دوسرے سال موضوعات ملا علی قاری یا موضوعات پٹنی، دونوں میں سے ایک پڑھائی جائے۔

اصول تفسیر میں فوز الکبیر کے علاوہ تفسیر اتقان کا ضروری حصہ پڑھایا جانا سابقاً ذکر کیا گیا

ہے۔ جمع الفوائد اور تحصیل الوصول کا طلبہ سے مطالعہ کرایا جائے، تعلیم میں نہ ہوں۔ نخبۃ الفکر کے مضامین کا یاد کرادینا کافی ہو گا۔

(۶) ادب میں وہ کتابیں ابتداءً پڑھائی جائیں جو انگریزی مدارس میں جاری ہیں کم از کم انٹرنس تک جو کتابیں عربی ادب کی ہیں داخل نصاب ہوں اور اردو، عربی کی مشق بھی ساتھ ساتھ ہو۔

علم کلام میں مولانا عبدالحق یا مولانا آزاد سبحانی کا اردو رسالہ عقائد کا پڑھایا جائے۔

معانی میں دروس البلاغۃ۔

مناظرہ میں رسالہ حمیدیہ کے ضروری مضامین بطور املاء۔

منطق میں ایساغوجی، میزان منطق، مرقاۃ، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی اور ملا مبین مکمل۔

فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ۔

میراث میں سراجی بشرطیکہ عملاً پڑھائی جائے۔ بہت کافی ہے۔

صرف میں جو کچھ اس وقت پڑھایا جاتا ہے اگر اس کی مشق کرائی جائے اور قرآن شریف سے اس کے مطابق صیغے نکلوائے جائیں تو بہت اچھا ہے بشرطیکہ علم الصیغہ اچھی طرح یاد کرالیا جائے۔

نحو میں نحو میر، شرح مائۃ عامل اور ہدایۃ النحو اس فن میں کافی کتابیں ہیں۔ البتہ قطبی کے ساتھ علامہ سیوطی کی افصح السالک پڑھائی جائے۔

درستی اخلاق کے لئے طریقہ محمدیہ علیہ السلام شامل کیا جائے اور ازالہ شبہات کے لئے رسالہ حمیدیہ۔

تاریخ، اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، علم النفسیات، جدید علم کلام اور فلسفہ جدیدیہ سب اردو میں پڑھایا جائے۔ ان کی کتابیں سب حیدر آباد سے مل سکتی ہیں۔ آخر میں حجۃ اللہ البالغہ کے ابتدائی مشکل مضامین چھوڑ کر باقی ضرور پڑھایا جائے۔

رد مذاہب و بدعات کی بات یہ ہے کہ طلباء کو موقعہ دیا جائے کہ ان کی کتب اصولی اور اصولی جولانات دیکھتے رہیں۔ میرے ذہن میں ایسی کتب نہیں جو تجویز کر سکوں۔ جو لوگ مناظرہ کرتے رہتے ہیں ان سے ایسی کتابوں کی تجویز کرائی جائے۔ یہ تجویز مناسب ہے کہ

فرضی مناظروں اور تقریروں کے بجائے عملی تبلیغ کا موقعہ دیا جائے۔

(۷) ابتدائی تعلیم کے متعلق تفصیل ہونی چاہیئے تھی کہ اردو، قرآن شریف کی بابت دریافت کیا گیا ہے یا فارسی وغیرہ کے متعلق؟

داخلہ کے لئے معیارِ عمر اوسطاً ۶، ۷ سال ہونا ضروری ہے اور درجات پر تقسیم ہو، قرآن شریف، اردو، حساب تین سال، فارسی، ابتدائی عربی تا ختم (کافیہ)، تین سال، دینیات کا قدیم طریقہ تعلیم مفید نہیں۔ کیوں کہ ضرورت زمانہ زیادہ فراغت سے مانع ہے۔

اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے جو بکثرت میرے تجربہ میں آیا ہے کہ ابتداءً قرآن شریف پڑھایا جائے اور زیادہ وقت قرآن شریف میں صرف کیا جاوے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بچا کر نماز پہاڑے اور تختی، گنتی اور قاعدہ اردو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔ جب بچے قرآن شریف کا مطالعہ اچھا کرنے لگیں اور قرآن شریف پڑھنے میں روانی پیدا ہو جائے تو تین گھنٹہ قرآن کے اور باقی وقت فارسی، حساب، اردو وغیرہ پر صرف کیا جائے۔

تیسرا سال، حساب اور اردو کے ساتھ فارسی کا ڈیڑھ دو گھنٹہ دیا جائے فارسی میں گلستان، بوستان اور بعض کتب انشاء نویسی پڑھائی جائیں۔

چوتھا سال، فارسی کے صرف تین گھنٹے ہوں گے۔ بقیہ تین گھنٹے سے ایک گھنٹہ اردو کی تعلیم کا ہوگا جس میں اردو، تاریخ سیرت، اخلاقیات، معاشیات کی تعلیم دی جائے گی۔ باقی دو گھنٹے عربی تعلیم جس میں زیادہ تر ادبیات ہوں پڑھائی جائیں۔

پانچواں سال، پانچ گھنٹہ عربی تعلیم کے اور ایک گھنٹہ اردو کا لازمی ہوگا۔

مولانا! نصاب تعلیم بنانا آسان ہے۔ لیکن اس کا چلانا مشکل ہے سب سے زیادہ مشکل ابتدائی تعلیم ہے مگر اس کا معیار بہت کم رکھا ہے۔ آج کل یہ رواج ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لئے سستے اور معمولی مدرس رکھ لئے جاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ہمیشہ قابل، تجربہ کار اساتذہ رکھے جائیں، اس وقت کوئی نصاب کامیاب ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ کریں کہ پہلی دو جماعتوں کا نصاب مقرر کیا جاوے اور اس کی تعلیم شروع کی جائے اور ان دو درجوں کے واسطے قابل ترین اساتذہ رکھے جائیں اور ایک شخص جو ماہر تعلیم وہ ان جماعتوں کو دیکھتا رہے کہ حسب ہدایات مدرس کام کر رہا ہے یا نہیں اور کام خلوص سے کر رہا ہے یا محض ضابطہ پری؟

اگر وہ اوقاتِ تعلیم کے علاوہ طلباء کی لیاقت بیدار کرنے کے واسطے اپنا خارجی وقت دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اوقات تعلیم میں پوری محنت کر رہا ہے تو اس کو اس زائد کام کا الاؤنس دیا جائے۔ ان دو جماعتوں کے مدرس کے پاس تعداد طلباء مناسب رکھی جائے۔

ہر استاذ کے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ لڑکے سپرد ہوں اس سے زیادہ ہوں تو اور استاذ اس درجہ کے لئے رکھا جاوے۔

دونوں استادوں کو ایک ہی درجہ کی تعلیم سے حسن کارکردگی کا بھی علم ہو سکے گا۔ اگر آپ اس طریقہ پر دو جماعتیں کھولنے کی ابتداء کریں اور ان دونوں جماعتوں کی اعزازی نگرانی میرے سپرد کر دیں۔ تو اس وقت نصاب تعلیم بھی تیار کر دیا جائے گا اور یہ خدمت کرنے کے لئے میں تیار ہوں۔

معلم کے اوصاف میں تین چیزیں بہت ضروری ہیں۔

(۱) نیک چلن ہونا۔

(۲) تعلیم سے دل چسپی اور لگاؤ۔

(۳) طریقہ تعلیم سے واقفیت۔

ورزش کے واسطے پرانا طریقہ کافی ہے۔ کبڈی کی مشق کرائی جائے۔ اس کے علاوہ دوڑ، پھاندنا اور لکڑی چلانے کی مشق بھی نہایت ضروری اور مناسب ہے ہر چیز کی ترقی کا مدار افسر کی مستعدی اور عملہ کی قابلیت اور اس کا تعاون ہے۔ یہ زمانہ قحط الرجال کا ہے۔ افسر مستعد، عملہ ناکارہ، عملہ قابل اور کارکن، افسر نااہل، افسر مستعد، عملہ قابل کارکن مگر افسر ناقدردان، عموماً یہی صورتیں پیش آرہی ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر ادارے ناکام ہیں۔ فقط والسلام۔ اگر کوئی امر اس تحریر کا پسند آئے مجھے بھی مطلع فرمائیں۔

فاروق احمد

(سابق شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ و مفتی دارالعلوم و صدر مدرس مدرسہ عالیہ)

# حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی

## قدس سرہٗ کا جواب گرامی (۱)

حضرت والا۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

معاف فرمایئے گا۔ آپ کے شفقت نامہ کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ میں دانت کے قصوں میں الجھا ہوا تھا۔ اب جب سب کو نکلوا چکا ہوں۔ دماغ کچھ قابو میں آیا ہوا ہے۔ بہت سے خطوط لوگوں کے جمع ہو گئے ہیں۔ کسی کو تفصیلی جواب نہیں دے رہا ہوں۔

امتحانات کا قصہ بھی اسی وقت سر پڑ گیا ہے۔ کالج بند بھی ہو رہا ہے۔ بمنت تام معافی کا خواستگار ہوں۔ دانتوں نے اتنا پریشان ادھر کچھ دنوں سے کیا ہے اور ان کے نکلوانے کی وجہ سے ضعف اتنا لاحق ہو گیا ہے کہ شاید قریب میں سفر بھی میرے لئے دشوار ہی ہو۔

دیکھو! بہاول پور کی حاضری مقدر ہے بھی یا نہیں۔ اگر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تو قدم بوسی کی سعادت انشاء اللہ تعالیٰ حاصل ہو گی۔

مجبوریوں کو پیش نظر رکھ کر میری فروگذاشتوں سے چشم پوشی فرمائی جائے۔

نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

# حضرت گیلانیؒ کا جواب باصواب (۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

۳ مارچ ۷۴ء

رفیع القدر، منبع الحسنات مولانا صاحب مدمجدکم العالی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا نوازش نامہ کئی دن سے آیا رکھا ہوا ہے۔ آپ نے اتنے سوالات اپنے اس خط میں جمع کر دیئے ہیں کہ صحیح جواب کے لئے دو ڈھائی سو صفحات کی کتاب کی ضرورت ہے۔

آج کل ہمارے ہاں امتحانات کا زور ہے۔ ان میں اتنی شدید مصروفیت ہے کہ کسی دوسرے کام کے لئے وقت نکالنا دشوار ہے۔ میں اسی فرصت کے انتظار میں رہا لیکن محسوس ہوا کہ تعطیلات گرما جو شروع اپریل سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سے پہلے تفصیلی تو کیا اجمالی جواب کا موقعہ بھی نہ مل سکے گا۔ انتظار کی تکلیف اور اس تکلیف کے گناہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے یہ چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

کلی طور پر ایک تو حوالہ کا ذکر کرتا ہوں۔ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے خاکسار کی ایک کتاب نظامِ تعلیم و تربیت دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

بظاہر ہے تو وہ ہندوستان کے نظام تعلیم کی تاریخ، لیکن بباطن ماضی کو سامنے لا کر اہلِ علم کو مشورہ دیا گیا ہے کہ مستقبل کا لائحہ عمل تیار کریں۔ کیا جناب والا کی نظر سے یہ کتاب گزری ہے۔ اگر گزر چکی ہے تو میرا نقطۂ نظر معلوم ہو چکا ہو گا اور نہ گزری ہو تو اجمالاً اس کا خلاصہ صرف دو ضابطوں میں آسکتا ہے۔

(۱) قرآن و حدیث، فقہ ان تین علوم کے سوا ہمارے مدرسوں کے سارے علوم نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ صورت جسمیہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن ہیولیٰ ہر حال میں مشترک رہا ہے۔

علوم اصلیہ میرے نزدیک بھی تین ہیں۔ ان کے سوا ہر زمانہ میں ہمارے نصاب کی کتابیں بدلتی رہی ہیں اس تبدیلی میں ہمیشہ زمانے کے اقتضا کا خیال کیا گیا ہے۔

درس نظامیہ میں اسی وجہ سے، میرے خیال کے رو سے اور حقیقت کل تین کتابیں اصلی و حقیقی دینیات کی داخل درس تھیں (۱) قرآن (اسی کا ترجمہ عربی جلالین ہے)۔ (۲) مشکوٰۃ (خلاصہ صحاح)۔ (۳) شرح وقایہ کی اولین، ہدایہ کی اخیرین جو ایک ہی کتاب ہوئی۔ شرح وقایہ کی طرح ہدایہ اولین پڑھانا اب بھی مفید ہے تاکہ اسی تعدد بھی باقی رہے۔

پندرہ بیس سال کی طویل مدت میں دینیات کی کل تین کتابیں، (کنز، منیہ، قدوری کے متون اتنی مختصر کتابیں ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اسی طرح ڈھائی پارے بیضاوی کے کیا قابل ذکر ہو سکتے ہیں) اور ان کے سوا جو کچھ بھی تھا اس کا تعلق فارسی کی نظم و نثر، عربی میں معقولات (ریاضی، اقلیدس، ہندسہ، فلسفہ، کلام، اصول فقہ، بلاغت و معانی و بدیع) قدرے عربی ادب (مقامات و معلقات و متنبی و حماسہ) سے تھا۔ میرا اب بھی خیال ہے کہ بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر دینیات کی تین کتابوں کو باقی رکھتے ہوئے علوم عصریہ کو معقولات ماضیہ کی جگہ اور فارسی کی جگہ انگریزی کو اس وقت تک قبول کر لینا چاہیئے۔ جب تک انگریزوں کی حکومت ہے مشترک تعلیم کا نصاب بھی ہوگا۔ بعد کو تکمیلی درجوں میں غیر دینی علوم کے ساتھ تفسیر و حدیث و فقہ، کلام و تصوف وغیرہ میں سے کسی ایک علم کی تعلیم کم از کم تین سال طلبہ کو دینا چاہیئے۔

اس طریقہ سے کارآمد، چست و چالاک زمانہ کی ضرورت کے مطابق علماء پیدا ہو سکتے ہیں۔ ودونہ خرط القتاد۔

(۴) جن صنعتوں میں یورپ و امریکا سے مقابلہ کا اندیشہ نہیں ہے ان میں سے کسی صنعت کو ہر عربی مدرسہ میں لازم کیا جائے۔ مثلاً خیاطی، دری بافی، نواربافی، نجاری، زرگری، آہن گری، قصاری، طباخی، باغبانی، مرغبانی، زرعی تعلیم، دواسازی، عطر سازی وغیرہ۔

دیگر بعض ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں کہ ممکن ہے کہ میں خود بہاول پور پہنچوں۔ اس وقت انشاء اللہ آپ کے مدرسہ کا معائنہ بھی کروں گا۔ اس خط کو اپنے خط کا جواب نہ سمجھئے یہ تو میرے خیالات ہیں۔ آپ کے نصب العین کو محفوظ رکھتے ہوئے مشورہ کی نوعیت دوسری ہوگی۔ خط آپ کا رکھ لیا ہے اولین فرصت میں ضرور ہر سوال کا جواب انشاء اللہ دیا جائے گا۔

مناظر احسن گیلانی

# جوابِ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم العالی

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ نقش بندیؒ
رائے بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

مکرم و محترم السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ آپ کے مدرسہ اور آپ کی مساعی سے اجمالاً واقفیت تھی۔ جن مقاصد و خصوصیات کے ساتھ آپ مدرسہ کو چلانا چاہتے ہیں وہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے مگر افسوس ہے کہ حضرات علماء ہی اس سے سب سے زیادہ بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے مجھے شدید خطرہ ہے کہ مستقبل میں ہندوستان میں دینی تعلیم باقی بھی رہ سکے گی یا نہیں۔

میں نے رسالہ ''الفرقان'' اور ''الندوہ'' مرحوم میں ''اسلام کے قلعے'' کے عنوان کے ماتحت اپنے خیالات کا تفصیل کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اگر کہیں سے آپ کو یہ پرچے مل سکیں تو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

آپ نے جو سوالات قائم کئے ہیں۔ ان کے جواب کچھ تفصیل اور وقت چاہتے ہین۔ اگر اس کا انتظار کیا جائے تو معلوم نہیں کب اس کی نوبت آئے اس لئے مختصراً عرض کر دیتا ہوں۔ نیز بلا تکلف ہر سوال کے جواب کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ جو میرا موضوع نہیں اور اس سلسلے میں میری کوئی نظر اور عملی تجربہ نہیں۔ اس کو اصحابِ نظر پر محول کروں گا۔

(۱) علوم مقصودہ تفسیر و حدیث و فقہ میں کتابوں میں اتنی تبدیلی اور اضافے کی ضرورت

نہیں، جتنی طرز تعلیم، مطالعہ اور استعداد آفرینی کے لحاظ کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس میں ان فنون میں جو مستند قدیم کتابیں داخل ہیں ان سے استغنا مشکل ہے اور ان کا بدل بھی آسان نہیں۔ لیکن طرزِ تعلیم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اصل انحصار معلمین، ان کی تربیت، زمانہ کے فہم اور روح دعوت، جدید علم سے واقفیت پر ہے۔ اس میں سے ہر جز مستقل تفصیل طلب ہے۔ خط اس کا متحمل نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اگر معلمین ان علوم کے مقاصد و کلیات کو گرفت میں لے آئے ہیں۔ زمانے کے نئے رجحانات اور ذہن کے نئے راستوں سے واقف ہیں۔ مسائل دینیہ کو ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور دعوت کا جذبہ ہے تو ان کے لئے موجودہ کتب بھی کافی اور مفید ہیں اور اگر ایسا نہیں تو کتابوں کی تبدیلی بے کار ہوگی۔ میرے نزدیک ان کتابوں کو ابھی بحالہ قائم رکھا جائے، تو مضائقہ نہیں۔

(۲) ترجمہ قرآن شریف کے بعد جلالین کے علاوہ مدارک مناسب ہو سکتی ہے مگر اصل یہ ہے کہ کوئی ایک تفسیر ہی کافی نہیں طالب علم کو اس کا عادی بنانا چاہیئے کہ وہ چند تفسیروں کو سامنے رکھ کر مطالب حل کرے۔ اگر تھوڑے سے حصہ میں بھی اس کی عادت پڑ گئی تو بہت مفید ہوگا۔ تفسیر مظہری بھی کچھ طویل ہے۔ تفسیر طنطاوی کسی طرح موزوں نہیں۔

دورہ حدیث سے پہلے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ کوئی کتاب ایسی پڑھائی جاوے جس سے طالب علم کو روحانی اور اخلاقی فائدہ ہو اور مسائل واحکام کے بجائے فضائل اعمال و اخلاق معلوم ہوں۔ اخلاص و ایمان واحتساب اور جذبہ عمل بیدار ہو اس کے لئے سب سے زیادہ مؤثر بابرکت کتاب امام نوویؒ کی ریاض الصالحین ہے۔ اس کو ضرور رواج دینا چاہیئے کہ حدیث کا اصل موضوع یہی ہے کہ اس کی طرف سب سے کم توجہ ہے۔ فتویٰ نویسی کے سلسلہ میں مولانا اعزاز علی صاحب اور جناب مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا خیر محمد جالندھری سے استصواب کیا جائے۔

(۳) اصولِ تفسیر میں الفوز الکبیر نہایت ضروری ہے۔ لیکن کوئی ایسے صاحب پڑھائیں جو قرآن کریم سے مناسبت اور قرآن مجید کا طبعی ذوق رکھتے ہوں اور شاہ صاحب کے طرز سے آشنا ہوں۔ اصول حدیث کے سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب (مظاہر العلوم)

مولانا ادریس صاحب (دارالعلوم) سے مشورہ کیا جاوے۔

(۴) صرف و نحو میں طرز تعلیم بدلنے کی فوری و شدید ضرورت ہے۔ سب سے ابتدائی کتابیں اپنی زبان میں مشق واستقرائی اصول پر ہوں۔ مصر کا سلسلہ النحو الواضح اور اس کا اردو چربہ تمرین النحو ملاحظہ ہو۔ مدرسین صاحب استعداد واجتہاد ہوں جو اپنے فن کو دلچسپ اور سہل کر سکیں۔

ادب سے پہلے زبان کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ابتدائی درجوں کے لئے الطریقۃ الجدیدہ (مولانا محمد ناظم صاحب ندوی استاذ دارالعلوم ندوہ) قصص النبیین للاطفال ا۔ ۲۔ ۳ از کاتب الحروف۔ القراۃ الراشدہ (ا۔ ۲۔ ۳) زیر طبع، اختیار کرنی چاہئیں۔ عربی زبان کی تعلیم دراصل ہمارے مدارس میں نہیں ہو رہی۔ اس کے لئے خود عربی ممالک میں بھی شاید اس سے بہتر نصاب تیار نہ ہوا ہو۔

ادب کے لئے "مختارات من ادب العرب" (مطبوعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) موزوں کتاب ہے۔ مکتبہ التعاون، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں۔ الترجمۃ العربیہ (مولفہ مولانا مسعود عالم و مولانا محمد ناظم) بھی قابل اضافہ ہیں۔

کلام کی تعلیم کے لئے قدیم کتابیں مثلاً شرح عقائد نسفی وغیرہ نہ صرف ناکافی بلکہ مضر ہیں۔ دراصل اس کی از سر نو تدوین و ترتیب کی ضرورت ہے۔ جب تک کوئی شایانِ شان کتاب نہ ہو مضامین قرآن از راقم سطور، رسالہ اہلِ سنت از مولانا سید سلیمان ندوی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مطالعہ کے لئے مذہب و عقلیات از مولانا عبدالباری ندوی، مذہب و تمدن از راقم سطور، تنقیحات و تفہیمات از سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سفارش کی جا سکتی ہے۔ یہ سب علم کلام سے متعلق ایک نظریہ پر مبنی ہے جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ کبھی ملاقات ہو تو عرض کیا جا سکتا ہے۔

(۵) کا مجمل جواب بھی اوپر آگیا۔ ان تمام عناوین کے لئے نئی کتابوں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ اور اس کا سامان نہیں، اگر ان میں عجلت سے کام نہ لیا جائے تو ایک متوسط مدرسہ کے لئے اس کی گنجائش ہے۔ شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں سے رسالہ انصاف اگر داخل درس ہو تو

طلبہ حدیث کے لئے چشم کشا، بصیرت افروز واعتدال آفرین ہوگا۔ باقی ازالۃ الخفاء کے مطالعہ کی تشویق و ترغیب ہو۔ حجۃ اللہ بلند پایہ کتاب ہے اگر استعداد ہو تو اس کے منتخب ابواب پڑھانے چاہئیں۔

(۶) مناظروں کے بارے میں مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا الیاسؒ کے طریقہ کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مولانا کی سوانح اور ایک اہم دینی دعوت، ضرور ملاحظہ ہو۔

(۷) کے استفسارات تجارب وانتظامی امور سے متعلق ہیں۔ مدارس کے مہتمم حضرات سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ کبھی ملنا ہو تو شاید کوئی مفید بات ہو سکے۔ امید ہے کہ فی الحال اسی قدر پر اکتفا کی اجازت دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب و بامراد فرمائے۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

خاکسار
ابوالحسن علی
مکتبہ اسلام نمبر ۳۷ گوئین روڈ لکھنو

# حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں

اعظم گڑھ سوال نامہ بھیجا گیا۔ آپ وہاں تشریف نہیں رکھتے تھے تو ریاست علی ندوی صاحب کی طرف سے یہ جواب آیا۔

دار لمصنفین اعظم گڑھ

محترم زادا لطفکم

السلام علیکم! آپ کے استفساروں کا تعلق خاص حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ سے ہے۔ پتہ پر دفتر معارف ہونے کی وجہ سے یہاں خط کھول لیا گیا۔ واپس ارسال خدمت ہے۔ براہِ کرام آپ کی خدمت میں ذیل کے پتہ سے روانہ فرمادیں۔

"دارالقضا، متصل ہوتی مسجد، بھوپال"

یہ خط یہاں سے بھی بھوپال بھیجا جاسکتا تھا مگر آپ کو انتظار رہے گا۔ اس لئے آپ کی خدمت میں واپس کرنا مناسب معلوم ہوا۔ والسلام

سید ریاست علی ندوی

۱۴ اپریل ۱۹۴۷ء

..................................................

اسی اثناء میں بھوپال سوال نامہ بھیجا گیا، تو حضرت ندویؒ کی طرف سے جناب محمد نعمان صاحب نے یہ جواب ارسال فرمایا۔

از بھوپال

منجانب علامہ سید سلیمان صاحب ندوی۔ قاضی ریاست بھوپال۔

جناب مکرم۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج والا عافیت سے ہوگا۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس سے قبل ایک

عریضہ ارسال کیا جاچکا ہے جس میں نصاب روانہ کیا گیا تھا۔ جس کے جواب میں علامہ فرمارہے ہیں کہ وہ مجھے موصول نہیں ہوا۔ اس بناء پر کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے؟

مزید جس کانفرنس میں شرکت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔ اس میں علامہ کی شرکت یقینی نہیں۔ اگر حالات بھوپال نے اجازت دی تو پھر انشاء اللہ اپنی امکانی کوشش حاضری کے بارے میں ضرور کروں گا۔ ابھی کوئی تیاری نہیں ہے۔

علامہ موصوف نے مصروفیت کی بناء پر یہ چند سطریں مجھ سے لکھنے کے لئے فرمایا، جس کی تعمیل کررہا ہوں۔ کارلائقہ کے لئے حاضر

محمد نعمان عفی عنہ

۷۔۴۔۱۹۴۷

................................................................

بعد ازیں حضرت علامہ ندویؒ کے قلم سے یہ جوابِ گرامی شرف صدور لایا

امیر جامعہ احمدیہ، قاضی ریاست

بھوپال۔

مکرم۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کے سوالات میں نے پڑھے، اس کے جواب میں، میں نے جامعہ شرقیہ کا نصاب آپ کے پاس بھجوادیا ہے اور اب آپ دارالعلوم ندوہ کا نصاب منگوالیں۔ آپ کو ان دونوں سے مدد ملے گی۔

والسلام

سید سلیمان ندوی

یکم مئی ۱۹۴۷ء

# جواب گرامی حضرت مولانا احمد علی صاحب

## لاہوری قدس سرہ العزیز

مخدومی و مکرمی دام مجدکم

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ۔

السلام علیکم رحمۃ اللہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے مبارک ارادوں میں امداد فرمائے۔ آمین

میرا خیال ہے کہ اس قسم کی چیزیں روبرو افہام و تفہیم سے باآسانی طے ہو سکتی ہیں۔ فقط

۱۲ اپریل ۱۹۴۷ء

# جواب گرامی منجانب حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

محترم! سلام مسنون

قبلہ مفتی صاحب کی طبیعت اب ان امور میں غور و خوض کرنے کی متحمل نہیں رہی۔

آپ اس بارے میں مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند سے خط و کتابت کیجئے۔ والسلام

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بعافیت ہوگا۔

محمد اختر عفا اللہ عنہ

مدرسہ امینیہ دہلی

۵-۱-۶۷

# جواب گرامی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

سینٹرل آفس آف
آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
سلطان جہان منزل
علی گڑھ

۷ ۱۹۴ء۔۴۔۲

مخدوم و محترم السلام علیکم

مدرسہ قاسم العلوم میں نصاب تعلیم کے متعلق آپ کے استفسارات موصول ہوئے۔ مناسب یہ ہے کہ اس خصوص میں آپ حضرت علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی سے استفادہ فرمائیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی ایک خاکہ نصاب مذہبی تعلیم کا طیار کرایا ہے۔ جو ملفوف ہے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔

خاکسار
سید الطاف علی بریلوی
سپرنٹنڈنٹ کانفرنس
علی گڑھ

# حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہم کا جواب گرامی

از محمد منظور نعمانی

نمبر ۳۳ گوئن روڈ، لکھنو ۱۴ مارچ ۷۴ء

حضرت محترمی! سلام مسنون!

ملفوف گرامی نامہ موصول ہوا۔ دفتر الفرقان کے لکھنو منتقل کرنے کے کاموں میں قریباً دو مہینہ سے میں ایسا مصروف ہوں کہ وقت طلب خطوط کے جوابات بھی نہیں دے سکتا۔

گرامی نامہ بریلی سے منتقل ہو کر یہاں پہنچا۔ اپنے آپ کو تحریر جواب سے اس وقت معذور پاتا ہوں۔ لیکن چوں کہ آپ کے اخلاص اور آپ کے مدرسہ کی خصوصیات کا میرے دل میں گہرا اثر ہے۔ اس لئے آج آپ کا گرامی نامہ ایک اور دوست کے سپرد کیا ہے جو اس کام کے لئے فی الحقیقت مجھ سے زیادہ اہل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان ہی کی رائے میں، میں بھی شامل ہو جاؤں گا اور انشاء اللہ مشترکہ غور سے ہم دونوں جواب دیں گے۔

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے امور پر مشافہتہً ہی غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔

کیا اچھا ہو تا کہ آپ یا آپ کے کوئی قائم مقام خاص اس کام کے لئے سفر فرماتے اور مختلف مقامات پر اس کے جو اہل ہیں ان سے مشافہتہً مشورہ فرما کر اپنے لئے کوئی لائحہ عمل طے کرتے۔ میری مخلصانہ اور دوستانہ رائے یہی ہے۔ تحریری مراسلت سے کام ادھورا اور ناقص ہی رہے گا۔

والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(آپ کا جوابی لفافہ محفوظ ہے)

# حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ
# کا جواب گرامی

دفتر برہان، دہلی ۱۲ اپریل ۱۹۷۴ء

مکرمی! السلام علیکم

پہلے ایک لفافہ ملا تھا۔ آج ایک کارڈ ملا۔ آپ نے اس خط میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کو بھی خطاب کیا تھا۔ اس لئے میں نے وہ خط ان ہی کو دے دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جواب لکھ دیں۔ آج کے کارڈ سے معلوم ہوا کہ آپ کو اب تک جواب نہیں پہنچا ہے افسوس ہوا۔

گزارش یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں اصولاً تو گفتگو کر سکتا ہوں۔ رہا مضامین کے لئے کتابوں کا انتخاب، تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ مختلف مضامین کے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی جائے اور یہ کام سب کے مشورہ سے انجام دیا جائے۔

چناں چہ مولانا ابو الکلام آزاد نے ۲۱ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی اسی غرض سے بنائی ہے۔

میرا خطبہ صدارت اب کہیں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ اس کی کوئی کاپی میرے پاس بھی نہیں ہے۔ ورنہ حاضر خدمت کرتا۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

والسلام مع الاکرام
مخلص
سعید احمد

# جواب گرامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جماعت اسلامی

شعبہ استفسارات

دارالاسلام، پٹھان کوٹ، پنجاب

مؤرخہ۔ ۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء

بحوالہ۔ ۱۸۵۷

مکرمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

گرامی نامہ ملا۔ آپ نے جو سوالات تحریر فرمائے ہیں۔ ان کا جواب کما حقہ دینا مشکل ہے۔ کتابوں اور نصاب کی تفصیلات کو طے کرنا شخص واحد کا کام نہیں، جماعت کی مقررہ کمیٹیوں نے اپنا کام اب تک مکمل کیا نہیں، لے دے کے تعلیمی کانفرنس کی روداد اور اس کا طے کردہ تعلیمی لائحہ عمل ہے جس کی روشنی میں آپ بطورِ خود اپنے ہاں کے لئے کتب نصاب متعین کر سکتے ہیں اور شخصاً دوسرے دل چسپی رکھنے والے حضرات سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ اگر ضرورت سمجھیں تو دیوبند، ندوہ، مدرستہ الاسلام، مظاہر العلوم سہارن پور، نیز پنجاب یونیورسٹی، دکن یونیورسٹی، وغیرہ کے نصاب بھی آپ مطالعہ فرمالیں۔

بقلم نعیم صدیقی

باجازت

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

# تذییل

امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ۲۴ سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئے تو اوائل ۱۹۴۴ء میں دیوبند گئے۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے۔ جہاں دیدہ اور گرم و سرد چشیدہ امامؒ نے حضرت انورؒ کو کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ موضوع کی مناسبت اور اہمیت کے پیشِ نظر یہ نصائح نذر قارئین ہیں۔

فرمایا انورؔ! تمہارے اور تمہاری عمر کے نوجوانوں کے لئے ہماری یہ نصیحت ہے کہ دورۂ حدیث شریف کے بعد بی اے کے اسٹینڈرڈ تک انگریزی زبان میں استعداد جب تک بہم نہ پہنچالو عملی زندگی میں قدم نہ رکھنا۔

پھر فرمایا! ہمارا تجربہ ہے کہ دارالعلوم کا نصاب پڑھنے کے بعد نوجوانوں میں بے پناہ صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ فضلاء سے ان کا ذہنی ارتقاء کسی طرح کم نہیں ہوتا، بلکہ ہم تو تجربہ کے بعد انہیں فائق سمجھتے ہیں۔ یہ علمی فنون کی کتابیں اور درجہ تکمیل جس میں حجۃ اللہ البالغہ سمجھ کر پڑھی گئی ہو تب نصیب ہوتا ہے۔ اب صرف انگریزی زبان کا پردہ بیچ میں حائل رہتا ہے اور ڈائریکٹ میتھڈ کے اصول پر عمل کیا جائے تو یہ چند ماہ کی بات ہے۔ اگر ہمارے طلبہ ذرا سی ہمت کر کے اسے بھی چاک کر ڈالیں تو پھر یہ آج بھی ہر میدان میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتے ہیں۔

پھر ذرا بلند آواز میں فرمایا سنو انور! دارالعلوم دیوبند جو حضرت نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی بے مثال قربانیوں کا ثمر شیریں ہے۔ اگر دارالعلوم کے طلبہ نے ہماری اس تجویز پر عمل کیا تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں ایک فاضلِ دیوبند صدر جمہوریہ اور ایک وزیر اعظم کے عہدہ تک ضرور پہنچے گا اور مسلم ممالک بالخصوص عرب ریاستوں میں سفراء تو صرف ہمارے علماء ہی جانے چاہئیں۔ اس کے بعد مولانا سندھیؒ ہنس

کر فرمانے لگے ، خیال ایک بیج ہی تو ہوتا ہے خواہ یہ بیج کسی درخت کا ہو ، کسی شہر ، کسی جامعہ یا کسی تحریک کا کیوں نہ ہو۔ پہلے دماغ میں جنم لیتا ہے پھر زمین میں جڑیں پکڑتا اور آسمانی رفعتوں کو چھونے لگتا ہے۔

پھر فرمایا اور ہماری دوسری نصیحت بلکہ وصیت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ یا اپنے والد (مولانا احمد علیؒ) سے ذکر قلبی کرنے کا طریقہ معلوم کرلو، پھر تمام عمر تم اور تمہاری عمر کے نوجوان کم از کم ایک گھنٹہ یومیہ ضرور لطیفہ قلبی کا ذکر کریں، اس کی برکت سے انشاء اللہ کسی دجل اور دجال کا کبھی اثر نہیں ہوگا۔

پھر فرمایا دیکھو انور! اسمِ ذات اللہ کا خوب دل لگا کر ذکر کرنا۔ جس کثرت سے ذکر الٰہی کرو گے خدا نے چاہا اسی نسبت سے اعتماد علی اللہ پھر اس کے نتیجہ میں اعتماد علی النفس پیدا ہوگا لیکن طبیعت میں اس درجہ خود اعتمادی کے باوصف جب بھی کسی کام کی ابتداء کرو تو پہلے اسے عقل و خرد کے ترازو میں تولو۔ جذبات اور محض ظن و تخمین کی بناء پر کوئی فیصلہ ہرگز نہ کرو۔ جب خوب سمجھ اور چھان پھٹک کر کوئی فیصلہ کرو تو پھر اس وقت تک اس پر قائم رہو جب تک حقائق اس کی غلطی ثابت نہ کردیں۔

**اذا عزمت فتوکل علی اللہ**

مولانا سندھیؒ نمبر ، ہفت روزہ خدام الدین

گزشتہ جوابات کی روشنی میں حضرت مرحوم نے ایک نصاب تعلیم مرتب فرمایا تھا اس کے بارے میں

## حضرت مولانا محمد ناظم ندوی مدظلہم سابق شیخ الجامعہ، بہاول پور کی رائے گرامی

دنیا کے تمام ممالک کے نصاب تعلیم میں ہمیشہ وقت کے تقاضوں تعلیمی تجربوں اور ترقیوں کے پیش نظر تغیر واصلاح کا عمل جاری رہتا ہے۔

مگر ہمارے دینی مدرسوں میں ایک ہی قسم کا نصاب صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ البتہ اس میں اصلاح و تغیر کا عام احساس ہو رہا ہے۔ مگر کوئی بڑا مدرسہ اس میں بنیادی تغیر کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم کے مہتمم صاحب مستحق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس کا احساس کرتے ہی اپنے مدرسہ میں ابتدائی درجوں کے نصاب میں اصلاح کر کے اسے نافذ کرنے کا عزم کیا ہے۔

پیشِ نظر نصاب میں قدیم نصاب کے تمام محاسن موجود ہیں اور اس کا اشکال مفقود ہے۔ نیز تاریخ، جغرافیہ، حساب وغیرہ کے ساتھ نحو وصرف کی جدید آسان کتابوں کو شامل کیا گیا ہے۔ بلاد عربیہ اور ہندوستان میں جو بہترین کتابیں موجودہ زمانہ میں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بہترین کتابوں کو داخل نصاب کیا گیا ہے۔

توقع ہے کہ اس جدید نصاب کے مطابق تعلیم سے عربی زبان کے سمجھنے، بولنے اور لکھنے کی مشق کم از کم مدت میں حاصل ہوگی اور انشاء اللہ تھوڑی مدت میں فقہ، حدیث اور قرآن کریم کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جائے گی اور ان ہی علوم کے حصول کے لئے یہ عربی مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نصاب جدید سے علم دین کی اشاعت و تبلیغ کا کام لے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ہیچمدان
محمد ناظم ندوی
شیخ الجامعہ بہاول پور
۲۰ مئی ۱۹۵۲ء

# نصاب کے بارے میں
# حضرت مولانا محمد صادق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
## سابق ناظم امور مذہبیہ ریاست بہاول پور کی رائے گرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

الحمدللہ و کفی والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ

امابعد! بفضلہ تعالیٰ زندگی کا انسلاک ہمیشہ تعلیم و تعلم سے رہا ہے، اس وجہ سے قدیم و جدید نصابوں کے دیکھنے اور فکر کرنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ نصاب تعلیم مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ مقصود بالغیر ہے۔

اصل مقصد حصول ملکہ دقت نظر، حقائق و معارف تک صحیح رسائی ہے۔ اس مقصد کے لئے ہر زمانہ کے ارباب علم و فضل نے مختلف علوم اور مخصوص کتابوں کی تعلیم کو مفید مطلب سمجھا اور نصاب کے نام سے موسوم ہوتا رہا۔ اس میں کلام نہیں کہ ان حضرات کی مساعی مشکور ہوتی رہیں اور توقعات کے مطابق نتائج بر آمد ہوتے رہے۔

آخر نصاب (درس نظامی) پڑھنے والوں پر نظر ڈالیئے۔ تو آسمان علم کے درخشان چاند و تارے دکھائی دیں گے۔ مگر ہر زمانے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نصابِ تعلیم کو تیار کرنا وقت کا اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لئے عرصہ سے اکابرین ملت اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی پہلی کڑی ندوہ کی تاسیس اور اس کا نصاب ہے اور دوسری کڑی جامعہ عباسیہ کی تاسیس اور اس کا نصاب ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری طریق پر مدارس عربیہ کے نصاب پر غور ہو رہا ہے کہ نصاب تعلیم مذہبی تقاضوں اور وقت کی

ضروریات کو پورا کرنے کا کفیل ہو۔ درحقیقت یہ تحریک محمود و مستحسن ہے۔

اسی سلسلہ میں مولانا فضل محمد صاحب مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی کی مساعی قابل داد ہیں کہ موصوف نے ریاست کے بعض اکابر علماء کی امداد و اعانت سے ایک نصاب تعلیم ۸ سالہ مرتب کرایا ہے جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ یہ نصاب میرے خیال میں بہترین نصاب ہے اور توقع ہے کہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ شرح تہذیب سے پہلے ایسا غوجی کا پڑھایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ طلبہ شرح تہذیب بالکل نہیں سمجھ سکیں گے یا سمجھنے میں ان کو دشواری ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف اور حضرات اراکین کمیٹی کی سعی کو مشکور فرمادیں اور یہ نصاب ملک و ملت کے لئے مفید تر ثابت ہو۔

فقط

عبدہ محمد صادق عفی عنہ

ناظم محکمہ امور مذہبیہ

۲۷ شعبان ۱۳۷۱ھ

۲۲ مئی ۱۹۵۲ء

# جواب گرامی منجانب

# حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمتہ اللہ تعالیٰ

نیو دہلی

۷ اپریل ۱۹۴۷ء

جنابِ من! آپ کا خط مؤرخہ ۲۰ / ۵ / ۶۶ھ حضرت مولانا کو مل گیا، وہ فرماتے ہیں کہ حضرات علماء دیوبند و سہارن پور کے اشتراک عمل کے ساتھ ایک کمیٹی بن چکی ہے۔ جو اصلاحِ نصاب کے مسئلہ پر غور کرے گی۔

اس کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کیجئے۔

نور الدین احمد

جناب فضل محمد صاحب
مہتمم مدرسہ عربیہ قاسم العلوم فقیروالی
ریاست بہاول پور (پنجاب)

# دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

اس گرامی نامہ میں جس کمیٹی کا ذکر ہے، حضرت مولانا آزادؒ نے اس کمیٹی کے سامنے لکھنو میں ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اس میں امام الہندؒ نے دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا بے لاگ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے۔ یہ خطبہ آپؒ کی دقت نظر، جودتِ فکر اور تبحر علمی کا آئینہ دار ہے مکتوب گرامی کے حوالے سے اور موضوع کی مناسبت سے ہم یہ خطبہ زیرِ نظر کتاب کی زینت بنا رہے ہیں۔

(تمہیدی ارشادات کے بعد) : مجھے آپ بزرگوں سے جو کچھ عرض کرنا ہے، ابھی ہوائی جہاز میں راستہ میں آتے ہوئے کوشش کی کہ میں اپنے خیالات میں ترتیب پیدا کروں۔ معاملہ بہت وسیع ہے۔ یہ ایک طول طویل داستان ہے۔ علوم عربیہ کی تعلیم کا مسئلہ، اس کی پچھلی تاریخ، درمیانی عہد کے تغیرات اور اصلاح کی تحریک، اس تحریک کے سلسلے میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں ان کی کہانی اور پھر آج جو معاملہ منزل پر پہنچ کر رکا ہوا ہے، اس کی سرگزشت۔ یہ ایک بڑی کہانی ہے۔ نہ تو اس کانفرنس کے حصے میں اتنا وقت آیا ہے جو اس کا متحمل ہو سکتا ہے، اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے جو بہت سے پہلو ہیں، آپ حضرات علم کے سامنے ان کو پیش کر کے وقت کو ضائع کیا جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ جو اہم نکات ہیں، جو اہم پوائنٹس (Points) ہیں، جن پر ہمیں جلد سے جلد پہنچ جانا چاہیئے، ان کی طرف آپ دوستوں کی توجہ دلاؤں گا۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ وہ داستان ایسی ہے کہ اس کو شروع

کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ابتدائی مقدمہ سامنے لانا پڑتا ہے اور اس لئے چند منٹ ضرور اس میں صرف ہوں گے۔ یہ چیز تو آپ حضرات کے سامنے ہے کہ قدرتی طور سے ہر علم تین مختلف دوروں سے، تین مختلف منزلوں سے گزرتا ہے۔ پہلا دور جو اس کی پیدائش کا ہوتا ہے، جس کو عربی میں کہیں گے تدوین کا دور۔ تو علم کا بحیثیت علم مدون ہونا، وہ اینٹیں جو فی الواقع متفرق دماغوں میں پڑی تھیں، ان اینٹوں کا ایک کے اوپر ایک رکھا جانا اور ایک دیوار بننا، اس کو کہتے ہیں تدوین۔ تو پہلا دور تو علم کی تدوین کا ہوتا ہے، اس کی بناوٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کام ختم نہیں ہو جاتا۔ دیوار چن لی گئی، لیکن ابھی اس کے نقش و نگار بہت کچھ باقی ہیں۔ تب دوسرا دور آتا ہے، جس کو ترقی کی منزل کہنا چاہئے، تنقیح علوم کا۔ پہلا دور تدوین کا ہے، دوسرا دور تہذیب کا ہے۔ اب اس کی کاٹ چھانٹ کرنا، اس کو سنوارنا، اس کو بڑھانا، اس کی نوک و پلک کا بنانا، یہ تہذیب ہے۔ تو قدرتی طور پر پہلے دور کے بعد ہر علم پر دوسرا دور جو گزرتا ہے، وہ اس کی تنقیح و تہذیب کا ہوتا ہے۔ تنقیح کا لفظ زیادہ موزوں نہیں ہے، بلکہ تہذیب کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ تہذیب کے معنی چھانٹنا، سنوارنا ہیں تو دوسرا دور تہذیب کا ہوتا ہے۔ تو اب نہ صرف دیوار بن گئی بلکہ اس دیوار کے نقش و نگار بھی بن گئے، نوک و پلک درست ہو گئے۔ تب تیسرا دور آتا ہے، جس کو کہ آپ بلوغ اور تکمیل کا دور کہتے ہیں۔ یعنی وہی چیز اب اپنے کمال تک پہنچ گی اور اب اس میں کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کی نوک و پلک درست کی جائے۔ اب اس کی اشاعت، اس کا پھیلانا اور بڑھانا ہے، درس و تدریس سے اس کو زیادہ استوار کرنا ہے۔ تو تیسرا دور بلوغ و تکمیل کا آتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ تین دور اسلامی علوم پر بھی گزرے۔ پہلا دور تدوین کا تھا، دوسرا تہذیب کا اور تیسرا بلوغ و تکمیل کا۔ اگر ان تین دوروں اور زمانوں کی جستجو کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوین علوم کا زمانہ تھا۔ تیسری صدی ہجری کے بعد سے پانچویں صدی تک کا زمانہ، اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹیں گے تو معلوم ہو گا کہ پانچویں صدی کا زمانہ تہذیب علوم کا زمانہ ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جو علوم پچھلی تین صدیوں کے اندر مدون ہو چکے تھے، ان کی تہذیب، ان کی مزید نقش آرائی، ان کی ترتیب، یہ داستان ہوئی۔ آپ کو پانچویں صدی ہجری تک نمایاں دکھائی دے گی۔ اس کے بعد کا زمانہ اسلامی علوم کے بلوغ و تکمیل کا اور ان کی اشاعت کا زمانہ تھا۔ یہ، اگر دقت نظر کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالی جائے تو میں

سمجھتا ہوں ساتویں صدی ہجری تک پہنچتا ہے۔ یعنی ساتویں صدی ہجری تک، ہم کو ایسے ائمہ فن نظر آتے ہیں جن کا کام اگر چہ بنیادی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ علوم کی تہذیب کا تھا، لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ بہت سے تہذیب کے کام تھے جن کو انہوں نے پورا کیا۔ نام ان کے میری زبان پر ہیں، مگر میں اس کے آگے نہیں بڑھنا چاہتا ہوں، اور اس ٹکڑے کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ساتویں صدی کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اچانک اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، ایک نیا ورق الٹتا ہے، اور یکایک آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ پچھلی چند صدیاں جن علوم کی تدوین میں، ان کی تہذیب میں اور ان کی درس و تدریس میں اور بلوغ و تکمیل میں صرف ہو چکی ہیں، اچانک اب ایک نئے دور سے آشنا ہوتی ہیں، اب ایک نئے دور سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس دور کو میں دور تنزل اور ذہنی تنزل کا دور قرار دیتا ہوں۔ علم و فن کے ہر گوشے میں یہ چیز آپ کو نظر آئے گی کہ جو درخت تہذیب و تدوین کا پھل پھول رہا تھا، اس کی شاخیں ساتویں صدی تک کمال مرتبہ تک پہنچ گئیں اور بجائے اس کے کہ پھلتا پھولتا، اچانک آپ کو نظر آئے گا کہ اب پت جھڑ شروع ہو گئی اور درخت بڑھنے کی جگہ گھٹ رہا ہے۔ چناں چہ ساتویں ہجری کے بعد اسلامی علوم پر ایک عالم گیر تنزل کا دور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلی چیز جو نمایاں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ علم کی ترقی کے لئے جو بنیادی چیز ہے، جس کو عربی میں نظر و اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، اچانک غائب ہو جاتی ہے اور ساتویں صدی کے بعد جمود ہر گوشے پر چھا گیا۔ چناں چہ اس کے بعد سے کسی علم و فن میں، الا یہ کہ کسی گوشے میں کبھی کبھی کوئی نادر شخصیت پیدا ہو گئی، جیسے علامہ ابن تیمیہ پیدا ہوئے ساتویں صدی ہجری میں، مگر عام رفتار تنزل کی شروع ہو چکی تھی اور اب کوئی قوت ایسی باقی نہیں رہی کہ علم کے کسی زاویے میں کسی نئے گوشے کو ابھارے۔ اب جو کچھ بھی سرمایہ رہ گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جو دیواریں اٹھ چکی ہیں، ان کی لیپا پوتی کی جائے۔ چناں چہ یہ دور وہ پیدا ہوتا ہے، جس کو شروح کا دور کہا جا سکے۔ لیکن اس سے پہلے بھی شرحیں لکھی گئی تھیں جو علمی جگہ رکھتی تھیں، مگر اب دماغی قوت ختم ہو چکی تھی۔ چناں چہ آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑے سے بڑے ائمہ فن جو پیدا ہوتے ہیں، ان کی زندگی کن کاموں میں ختم ہوتی ہے؟ وہ تلخیص میں مصروف ہوتے ہیں، وہ خلاصہ کرتے ہیں یا شرح نویسی۔ لیکن کسی علم و فن میں نظر و اجتہاد کے ساتھ قدم اٹھے، یہ چیز ختم ہو چکی تھی اور لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی علم و فن کے جو

کارخانے قائم ہوئے تھے، وہ ایک بنیادی انقلاب سے زائل ہو گئے اور درس و تدریس بجائے اس کے کہ اس ڈھنگ پر چلے جس ڈھنگ پر چھ صدیوں تک چلا تھا، ایک نیا ڈھنگ شروع ہو گیا۔ یہ ڈھنگ دور تنزل کی پیداوار تھا اور روز بروز یہ تنزل بڑھتا گیا۔ اب یہ جو انقلاب ہوا ہے اس کی تفصیل میں نہ جاؤں گا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات علم و فضل کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ میں تفصیل میں جاؤں۔ اس تنزل کا نتیجہ جو کچھ نکلا، اس نے علم و فضل کے مختلف صیغوں پر کیا اثر ڈالا، اس کی داستان بہت طول طویل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایسے ارباب نظر موجود تھے کہ جنہوں نے اس چیز کو محسوس کیا اس چیز کو جسے چھ صدیاں گزرنے کے بعد آج ہم محسوس کر رہے ہیں اور اس پر ہم ماتم کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی گہری نظریں جو باہر کی تمام سطحوں سے گزر کر حقیقت کے اندرونی گوشوں تک پہنچنے والی تھیں، ایسی نظریں اس وقت پیدا ہوئیں، جنہوں نے اس صدی میں اس حقیقت کو محسوس کیا، جیسے علامہ ابن خلدون۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن خلدون نے یہ حقیقت محسوس کی جیسا کہ اس نے اپنے مقدمے میں اشارہ کیا۔ بہر حال یہ خال خال نظریں تھیں۔ ان کا اثر وقت کی عام رفتار پر نہیں پڑا۔ تنزل کا دور شروع ہو چکا تھا اور وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اب اس دور میں آکر ہمیں جو تبدیلیاں معلوم ہوئیں، وہ بھی اتنی مختصر نہیں ہیں کہ میں چند منٹوں میں سمجھانے کی کوشش کر سکوں۔ سب سے بڑا بنیادی انقلاب جو پڑھنے پڑھانے کے طریقے میں ہم کو نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس وقت تک قدما یعنی پچھلوں کے طریقہ تعلیم کا ایک خاص ڈھنگ تھا۔ وہ طریقہ تعلیم آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ ساتویں صدی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل مبدل ہو گیا۔ متقدمین کے طریقہ تعلیم میں آپ کو معلوم ہے کہ علوم و فنون عالیہ کے درس میں ایک قسم ہے آلات کی اور ایک قسم ہے نفس علوم کی۔ عربی میں دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ ایک ہے فنون آلیہ اور ایک ہے نفس علوم۔ تو پچھلوں کا جو طریقہ تعلیم تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ طریقہ تھا املا کا۔ املا عربی کی خاص اصطلاح ہے۔ تعلیم کی وجہ سے یہ اصطلاح اس شکل میں ابھری۔ املا کے جو طریقے متقدمین کے تھے، وہ آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہوئے؟ آج کچھ کتابوں کی نقل نکل آئی ہے اور اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ املا کسے کہ سکتے ہیں۔ مثلاً شریف مرتضیٰ کی کتاب ہے امالی۔ املا کے معنی ٹھیک وہی ہیں، جیسے آج آپ کسی کالج میں چلے جائیں وہاں پروفیسر جس طریقے پر تقریر کرتا ہے،

لیکچر دیتا ہے، ٹھیک اسی معنی میں املا ہے۔ ایک صاحب علم کوئی خاص کتاب اپنے سامنے نہیں رکھتا تھا۔ وہ بیٹھتا تھا اور طالب علم اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ طالب علم کاغذ رکھ لیتے تھے اور جو موضوع اس کے پیش نظر ہوتا تھا، مثلاً اس نے علم ادب، حدیث، تفسیر لے لیا، اس کے اوپر وہ زبانی تقریر کرتا تھا اور جو طلاب اس کے حلقہ درس میں بیٹھے ہوتے تھے وہ سنتے تھے اور اس کے نوٹس (Notes) لیتے تھے اور یہ نوٹس جمع کر لیتے تھے۔ جو کتابیں آج آپ کو مل گئی ہیں مثلاً قاری کی کتاب، شریف مرتضیٰ کی کتاب، یہ وہی نوٹس ہیں جو لیکچر کے وقت مستعد طالب علموں نے لئے ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس طریقہ تعلیم کی بلندی کتنی تھی اور آج کل کا جو موجودہ سسٹم ہے، وہ ٹھیک اس کے مطابق چلتا تھا، لیکن بنیادی فرق آپ کو ساتویں صدی کے بعد نظر آئے گا، اگرچہ یہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور اگر ہم اس کی کھوج میں نکلیں تو معلوم ہو گا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد کا جو زمانہ آتا ہے، تو املا کا طریقہ عربی اور اسلامی مدرسوں میں بالکل مفقود اور ناپید ہو جاتا ہے اور کہیں اس کی پرچھائیں نظر نہیں آتی اور بدقسمتی سے املا کی جگہ کتابیں لے لیتی ہیں۔ یاد رکھئے کہ قدما کے طریقہ تعلیم میں کیا تھا! ان کا اعتماد املا کے اوپر تھا نہ کہ کتابوں کے اوپر۔ حتیٰ کہ اگر میں آپ سے کہوں کہ علوم عالیہ اور صرف و نحو یعنی گرامر ایسی چیز ہے کہ آپ اس کے لئے کہیں گے کہ کتابیں ہونا چاہئیں، آج بھی طریقہ تعلیم یہ ہے کہ ان چیزوں کا دارومدار کتابوں پر ہے، لیکن آپ کو تعجب ہو گا کہ متقدمین اور مسلمانوں کا جو طریقہ رہا تھا، اسلامی علوم اور صرف و نحو اور ادب یا اسی قسم کی جو چیزیں ہیں، اس میں اعتماد املا پر تھا۔ کتابیں بن چکی تھیں، دوسری صدی ہجری سے کتابیں مرتب ہو چکی تھیں، وہ کتابیں اس زمانہ میں مل سکتی تھیں، لیکن اعتماد جو کچھ تھا، وہ املا پر تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی مسافت اس تنزل کے دور میں اسلامی دماغ نے طے کی ہے۔ اس نکتے سے جہاں اعلیٰ علوم کی تعلیم ہی نہیں بلکہ علوم آلیہ یعنی صرف و نحو و گرامر وغیرہ کی تعلیم بھی زبانی درس کے ذریعے سے ہوتی تھی، جس کو املا کہتے ہیں، وہاں سے تنزل کے کارواں کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ساتویں صدی میں آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ جو اعلیٰ علوم ہیں جیسے کہ حدیث، تفسیر اور فلسفہ، ان کی تعلیم تمام تر کتاب پر ہوتی ہے، کتابوں کے ورق پڑھنے والے کے سامنے ہیں اور دماغ کے سارے دروازے جو اس موقع پر کھلنا چاہئیں، ایک صاحب نظر و علم کے، وہ اس موقع پر بند ہو گئے اور قفل چڑھا دیا گیا۔ اس طریقہ تعلیم کو رائج کیا گیا تھا۔

بظاہر آپ کہیں گے کہ یہ ایک نہایت معصوم تبدیلی ہے، جس میں کوئی حرج نہیں، قدما کے پاس اتنی کتابیں کہاں تھیں! قدما کے پاس یہ عجیب و غریب طریقہ متون و شروح کا کہاں تھا! متن نویسی کا طریقہ نکلا اور شرحیں لکھی گئیں اور حواشی لکھے گئے۔ یہ تمام سرمایہ پچھلوں کے پاس کہاں تھا! وہ محض تقریر کے ذریعے اپنا کام چلاتے تھے۔ کتابیں بن گئی تھیں۔ وہ مرتب اور مدون ہو گئی تھیں۔ لیکن نہیں۔ کاش معاملہ اس تک ہوتا۔ لیکن معاملہ یہاں تک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے، اس ظاہری پردے کے پیچھے، ایک بڑی دماغی تبدیلی بیٹھی ہوئی ہے۔ چیز یہ تھی کہ جس علم کو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس علم کے لئے آپ کے دماغ کو کسی ایک معین کتاب کے اوراق میں بند کرنا چاہیئے، مقفل کرنا چاہیئے یا کہ ایک کتاب سے مدد لیتے ہوئے پڑھنے والے کا دماغ اور پڑھانے والے کا دماغ علم و فن کی وادیوں میں کھلے طور پر پڑھ سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تعلیم کے لئے ایک خاص حد تک کسی معین کتاب کا رکھنا ضروری ہے۔ وہ پڑھنے والے کو مدد دیتی ہے۔ وہ اس کے دماغ کو عبارت کے حل کرنے کی مشق کراتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر حقیقت اس وقت تک حقیقت ہے، جب تک اعتقاد کے درجے میں ہو۔ وہاں سے جہاں وہ ادھر ادھر ہوئی، اس کے بعد وہ گر گئی۔ یہ چیز اس حد تک صحیح تھی، جس حد تک اسے جانا چاہیئے تھا، لیکن جب کتابوں کا راستہ کھل گیا تو اب تمام تر دارومدار ہو گیا کتاب پر۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۲ برس سے ۱۴ برس تک آپ اپنا دماغ صرف کرتے ہیں، مگر نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ مجھے معاف کیا جائے۔ یہ کہنے کی میں جرأت کروں کہ چند کتابوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے اور علوم حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ چند کتابوں کا علم حاصل کرنے میں اور نفس علم حاصل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس تبدیلی سے روز بروز تمام تر اعتماد کتابوں پر ہوتا گیا اور وہ جو پچھلا طریقہ املا کا تھا اور زبانی درس کا تھا وہ روز بروز ختم ہوتا گیا۔ یہ ایک عجیب مصیبت ہے کہ دنیا ان منزلوں سے گزر چکی اور صدیوں کا فرق ہو گیا۔ آپ کو تعجب ہوگا اگر اب آپ کے سامنے اس چیز کو پیش کروں۔ مثلاً آپ علم تفسیر کا درس لے رہے ہیں اور آپ کا دارومدار بیضاوی اور جلالین پر ہے۔ کیا ہوگا کہ بیضاوی اور جلالین کی لفظی عبارت، اس کے مرجع اور ضمائر کا علم حاصل ہو جائے گا، نہ کہ علم تفسیر کا، بلکہ اس کی پرچھائیں تک نظر نہ آئے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ درس و تدریس میں علمی قوت کمزور ہوئی۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ میں اس کے پھیلاؤ کو سمیٹ نہیں

سکتا۔ اس لئے کچھ چیزیں نظر انداز کرنا پڑیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز تعلیم کا ڈھانچہ بگڑتا گیا، تعلیم گرتی گئی۔ ایک بڑی غلط چیز جو پیدا ہوئی، وہ تھا متون و شروح کا حد اعتدال سے آگے بڑھ جانا۔ متن و شرح لکھنے کا طریقہ فی نفسہ صحیح تھا۔ یہ چیز ہر علم و فن میں اور ہر زبان میں اچھی ہوتی ہے، لیکن یہ چیز جب حد سے زائد بڑھ جائے گی تب ظاہر ہے کہ اس سے نفس علم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ بجائے اس کے آپ کسی علم میں کوئی ایک کتاب نپی تلی زبان میں وضاحت کے ساتھ مرتب کریں اور وہ ایک طالب علم کے آگے رکھیں تاکہ اس کو موقع ملے کہ وہ پورے طور پر اس کتاب پر چھا جائے، آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ آپ نے ایک چیز لکھی کہ جس کا نام متن، اور گن گن کر اتنے الفاظ رکھ دیئے کہ کم سے کم الفاظ ہوں اور وہ ایک معما اور چیستاں بن سکے۔ جو شرح جو لکھنی چاہیئے تو اس شرح میں مبحث آگئے، مثلاً اس نیک بخت نے ایک متن لکھا اور اس امر کی کوشش کی کہ عبارت کو سخت بنانے میں کوئی بھی دروازہ اور کھڑکی کھلی نہ چھوڑی جائے، جس سے دماغ اپنی راہ پر آجائے۔ اگر اس کو عبارت میں اشارہ کرنا تھا، تو وہ ان ذریعوں سے کام لیتا۔ اگر وہ ان ذریعوں کو یعنی مرجع اور ضمائر کو اس عبارت میں رکھ دیتا، تو معاملہ صاف ہے۔ مثلاً اس کو یہ کہنا ہے کہ ایسی صورت میں اس سے نتیجہ یہ نکلے۔ اگر وہاں وہ اس چیز کا نام بھی رکھ دے، تو یہ بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ مگر وہ نیک بخت نہیں رکھتا ہے اور یہ ناممکن ہے۔ اب اس سے ایک اہم بحث پیدا ہوئی کہ ”اس سے“ جو لفظ آیا ہے، وہ کس طرف جاتا ہے۔ چناں چہ اس پر بحث چلی۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا، تو یہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ دماغ کو عبارت کے حل کرنے اور سمجھنے کی قوت پیدا ہو۔ حل عبارت بہر حال ضروری چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک طالب علم کے لئے تو یہ بہت ہی ضروری ہے کہ وہ کسی کتاب کو پڑھنے اور اس کی عبارت کو سمجھنے میں اور مباحث کو قابو میں لانے کے لئے اپنے اندر صلاحیت پیدا کر سکے، لیکن اس کے لئے آپ بہت سے طریقے اختیار کر سکتے ہیں، اس کی کیا ضرورت ہے کہ تمام علوم و فنون کی جو آپ تعلیم دیں، ان کی تمام کتابوں کو آپ اسی طریقے سے غارت کریں اور دماغی قوت کا بڑا حصہ اصلی علم کو حاصل نہ کر سکے بلکہ وہ بیکار کی بحث میں خرچ ہو۔ آپ غور کیجئے کہ ایک شخص کو منطق پڑھا رہے ہیں، آپ کے لئے جو چیز ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ آپ منطق میں اس شخص کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ جو براہ راست رشتہ پیدا کر سکتے ہیں پیدا کریں۔ یہ رشتہ جتنا زیادہ

مضبوط ہو گا، اتنا ہی زیادہ دماغ اس کے لئے تیار ہو گا اور لاجک (Logic) کو پکڑ میں لے گا۔ لیکن آپ نے طریقہ کیا اختیار کیا ہے؟ وہ ایک کتاب شروع کرتا ہے۔ اس کے دماغ کی ساری قوت اس کتاب میں صرف ہوتی ہے۔ دماغ کو صرف کیا جاتا ہے منطق کی مبادیات، مسائل، مباحث، مقاصد کے اوپر، کسی چیز پر جو ایک خاص نام کی کتاب ہے، اس کا ایک خاص نام کا مصنف ہے، اس نے ایک متن لکھا ہے، اس کی جو ایک خاص سطر ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ خیال کیجئے کہ اس کے اصلی موضوع سے، آپ اس کے دماغ کو بھٹکا کر، کہاں سے کہاں لے گئے! یہ سب کچھ آپ اس لئے کر رہے ہیں کہ عبارت کے حل کرنے کی اس مشق ہو۔ مگر یہاں معاملہ اس کے بالکل بر عکس ہے۔ آپ اس کے دماغ کو غارت کرتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر علم کے لئے گرامر بہت زیادہ ضروری ہے اور بیک وقت آپ دو بوجھ اس پر لادتے ہیں، اور ہندوستان میں تین بوجھ۔ پہلا بوجھ ہے اصل علم کا، دوسرا حل عبارت کا۔ اس کی ساری قوت عبارت کے حل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دماغ کی پکڑ میں چیز نہیں آتی ہے۔ پھر آپ شکایت کرتے ہیں کہ لوگ کوڑھ مغز ہیں لیکن جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے، وہ ان کو کوڑھ مغز بنانے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ میں اس چیز میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ طریقہ درس میں جو تبدیلی ہوئی، اس سے اسلامی علوم کو بہت سخت نقصان پہنچا۔ قدما کے طریقہ املا کو ترک کر دیا۔ اعلیٰ علوم کی تعلیم زبانی درس کے ذریعے سے اور لیکچرز (Lectures) سے دی جاتی تھی، یہ بالکل ناپید ہو گیا اور تمام تر کتابوں پر اعتماد ہو گیا۔ اور جو طریقہ اختیار کیا گیا، وہ اصولی تعلیم کے لحاظ سے بالکل غلط طریقہ اختیار کیا گیا۔ اب اس سلسلے میں جو بہت سی چیزیں ہیں، ان سب کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی، آپ سب حضرات علم و فضل کی موجودگی میں۔ برسوں سے میرا خیال یہ ہے، تیس برس سے میرا خیال ہے کہ علامہ تفتازانی ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے اور تیس برس سے میری یہ رائے ہے کہ انہوں نے جو متن و شرح لکھے وہ ان کی زندگی میں بہت مقبول تھے اور ان کے علم و فضل کا سکہ سب پر جما ہوا تھا اور جو چیز ان کے قلم سے نکلتی تھی، وہ تمام ملک میں چھا جاتی تھی اور بعض تصنیفات ان کی زندگی میں داخل درس ہو گئیں اور آج تک ہم سب منت گزار ہیں، ان کی تصنیفات کے۔ کوئی صاحب یہاں پر ایسے نہ ہوں گے جنہوں نے علامہ موصوف کی تصنیفات نہ پڑھی ہوں۔ علامہ تفتازانی کی کتابوں کی مقبولیت اس زمانے

میں اس لئے ہونے لگی تھی کہ اسلامی علوم کا دماغی تنزل شروع ہو چکا تھا اور ترقی کا دور ختم ہو گیا تھا اور ان کتابوں سے بجائے اس کے کہ آگے چل کر ترقی کے دروازے کھلے ہوں، ایک حد تک نقصان پہنچا۔ یہ میں ڈرتے ڈرتے ایک لفظ آپ حضرات سے کہہ رہا ہوں، تاکہ آپ حضرات کو گراں نہ گزرے۔ یہ بھی میرا عقیدہ کہ ادب عربی اور عربی بلاغت کو مطول نے سخت نقصان پہنچایا۔ قدما کی کتابیں نکل آئی ہیں، جیسے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغت۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں نکل آئی ہیں، جن سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بلاغت عربی کی تعلیم کہاں تک تھی۔ ہم بد قسمتی سے کہاں سے گر کر کہاں آ گئے۔ جرجانی کی تصنیفات کو چھوڑ دیجیے۔ سکاکی اس دور کی پیداوار تھا۔ دراصل ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا، اس نے مفتاح لکھی۔ کاش وہ اصلی شکل میں رہتی، لیکن نہیں رکھی گئی۔ بہر حال یہ داستان طولانی ہے۔ میں جس چیز کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی اور اس نے اسلامی علوم اور اس کی بنیاد کو ہلا دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات آپ یاد رکھئے کہ ترقی اور تنزل کا معاملہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ کتنی کھلی ہوئی اس تنزل کی باتیں ہوں یا ترقی کی باتیں ہوں، ان کو آپ یا آپ کا زمانہ فوراً نہیں پکڑ سکتا۔ ترقی اور تنزل حقیقتاً دونوں بڑی دھیمی چال چلتے ہیں۔ ایسی دھیمی چال چلتے ہیں کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کوئی چل رہا ہے۔ لیکن کافی وقت گزر جاتا ہے اور کافی مسافت جب زمانہ طے کر لیتا ہے، تب آپ چونکتے ہیں، مؤرخ چونکتا ہے، اور لکھتا ہے کہ حقیقت یہاں سے یہاں آ گئی۔ لیکن وہ اچانک نہیں آئی ہے۔ پچاس ساٹھ یا سو برس میں یہاں آئی ہے۔ لیکن اس سو برس میں اس کی چال اتنی دھیمی تھی کہ اس چال کو کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ منٹوں کو آپ پکڑ سکتے ہیں، گھنٹوں کو آپ پکڑ سکتے ہیں کیونکہ ساٹھ منٹ کا گھنٹہ ہوتا ہے، مگر اس کو آپ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کی چال اتنی دھیمی ہے کہ اس کو آپ کی آنکھ بھی نہیں پکڑ سکتی۔ اسی طرح دنیا کی تمام حقیقتیں دھیمی چال چلتی ہیں اور یہ دھیمی چال پکڑ میں نہیں آتی ہے۔ جب زمانہ بہت کافی مسافت طے کر لیتا ہے اور جب ایک نقطے کو چھوڑ کر دوسرے نقطے تک پہنچتا ہے تب آپ چونکتے ہیں کہ کتنی مسافت طے کر لی، تو اس طریقہ پر دماغی ترقی اور تنزل کا افسانہ ہے۔ ترقی شروع ہوتی ہے، تو کوئی مؤرخ اس کو پکڑ نہیں سکتا کہ فلاں سن، فلاں برس یہ ترقی شروع ہوئی یا بجائے اس کے تنزل کے کارواں کا سفر شروع ہو جاتا ہے، لیکن آنکھ اس کو پکڑ نہیں سکتی کہ وہ بتلا سکے کہ فلاں سن میں

اتنے بچے اسلامی علوم کے کارواں کے تنزل کا سفر شروع ہوا۔ لیکن وہ چیز شروع ہو جاتی ہے اور پھر ایک لمبی مسافت طے کر لیتی ہے، تب مؤرخ کا قلم آشنا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر آپ کوشش کریں گے کہ ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تخمیناً مقرر کر دیا ہے، تو ساتویں صدی ہجری کے بعد دماغی تنزل کا زمانہ کھلے طور پر کھڑا ہر جگہ نظر آجائے۔ تنزل اس طرح شروع نہیں ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے سر اٹھایا اور ساری نگاہوں نے دیکھ لیا کہ وہ تنزل کھڑا ہے۔ وہ تو اس طرح آتا ہے کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کے میدان میں ہیں مگر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ساتویں صدی ہجری میں اسلامی اور عربی علوم کے مدارس آباد ہیں، ہر جگہ علماو فضلا درس دے رہے ہیں، جن کے حلقہ درس سے سیکڑوں عالم و فاضل فیض یاب ہو کر زندگی کے بلند سے بلند مرتبے تک پہنچتے ہیں، لیکن تنزل کے کارواں کا جو بیج تھا وہ زمین پکڑ چکا تھا اور اس نے اپنے برگ و بار پیدا کرنا شروع کر دیئے تھے اب کافی وقت تھا کہ وہ درخت جو پیدا ہوا تھا، وہ جب اس حد تک پہنچا اور بلند ہوا تو اس کی پھیلی ہوئی شاخیں ہر ایک کو نظر آنے لگیں۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں، تو یہ بنیادی حقیقت سامنے ابھرے گی۔ میں اس چیز کی طرف آپ کی وجہ دلا رہا تھا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی علوم کے تنزل کا دور شروع ہوا۔ اب جب ہم نے اس زمانے کو ایک حد تک معین کر لیا، تو ہمارے لئے یہ چیز صاف ہو گئی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے درس و تدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، تو وہ کس خمیر سے پیدا ہوا تھا۔ ترقی کے خمیر سے یا تنزل کے خمیر سے۔ ہندوستان میں اول ہی روز سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کی بنیاد جو قائم ہوئی تھی، وہ تنزل کے دور کا نتیجہ تھی، ترقی کے دور کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے خمیر میں تنزل کا مواد موجود تھا۔ ساتویں صدی ہجری سے پہلے اسلامی علوم کی ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ چھٹی صدی میں تاتاریوں کی بغاوت، خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتل عام، ان تمام چیزوں کا جو عالم گیر اثر پڑا علوم اسلامی نیز ان کی دماغی اور علمی حالت پر، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گوشے میں خرابیاں پیدا ہوئیں اور قدرتی طور سے یہ جو ایک گوشہ تھا درس و تدریس علوم کا، وہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ لیکن بہر حال اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہیئے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اب موجودہ حالت میں جو معاملہ ہمارے پاس موجود ہے، اس کو کس شکل میں حل کرنا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں تک پہنچوں۔ یہ چیز کہ

جس ڈھنگ پر اسلامی اور عربی علوم کا طریقہ سلسلہ جاری ہے، اس میں اصلاح ہونا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں اس کا احساس کب شروع ہوا، یہ بھی کہنا مشکل ہے۔ لیکن میری نظر سے جو چیز گزری ہے، اس کو میں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید سب سے پہلے ایک شخص بیرن توسی نے انیسویں صدی میں ممالک اسلامیہ کا سفر کیا اور گیارہ جلدوں میں اپنا سفر نامہ مرتب کیا اور خاص اہتمام سے اسے مصر میں چھپوایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کو آپ لے لیں۔ اس صدی میں ایک مسیحی عالم یہ کہتے ہوئے نظر آتا ہے کہ جن طریقوں پر اسلامی اور عربی علوم کا ڈھانچہ چل رہا ہے وہ کامیاب نہیں ہے۔ یہ عالم بیرن توسی ہے۔ اس کے بعد پھر جو شخص اس کے خلاف پوری قوت سے اٹھا وہ مرحوم شیخ عبدہ تھا۔ یہ جب مصر سے جلاوطن کیے گئے تو بیروت گئے اور پھر سید جمال الدین سے مل کر بیروت میں ۱۸۹۲ء میں ایک لائحہ، ایک اسکیم (Scheme) تیار کی اور یہ مرتب کر کے ترکی کے شیخ الاسلام کے پاس بھیجی، ان کا خیال ہوا کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے، اور اگر اس مسئلے کو چھیڑا جا سکتا ہے، تو اس کے لئے شیخ الاسلام موزوں ہیں کہ وہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کا جو سلسلہ اس وقت قائم ہے، وہ غلط ہے، اور اس سے امید نہیں ہے کہ صحیح نتائج پیدا ہو سکیں۔ اس لئے اس میں اصلاح ہونا چاہیئے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ترکی کے شیخ الاسلام ایک نیا مدرسہ اور کالج قسطنطنیہ یا استنبول میں قائم کریں۔ چناں چہ شیخ رشید رضا کے مضامین میں یہ اسکیم موجود ہے۔ یہ نہایت قیمتی تحریک تھی۔ لیکن اس کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ شیخ محمد عبدہ کے خط کا کوئی جواب دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ترکی میں یہ سلسلہ جس شکل میں قائم تھا اور جو لوگ اس عہدے پر مقرر کئے جاتے تھے، ان سے کسی تبدیلی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ اسکیم ایک قیمتی چیز ہے۔ اس کے بعد سید جمال الدین نے عربی میں ایک اخبار نکالا اس کا نام "العروۃ الوثقٰی" تھا۔ ۱۴ نمبر اس اخبار کے نکلے۔ یہ اخبار پیرس سے نکلتا تھا۔ مہینے میں دو نمبر نکلتے تھے۔ حقیقتاً یہ ایک انقلاب انگیز چیز تھی۔ وہ اسکیم اس اخبار میں بھی شائع ہوئی۔ عربی بولنے والی دنیا پر اس اخبار نے اس اسکیم نے ایک انقلاب انگیز اثر ڈالا۔ بہر حال وہ مضامین کتاب کی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک سے زیادہ مضامین شیخ محمد عبدہ نے اس موضوع پر لکھے، مگر ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

آج جب ہم اس وقت لکھنو میں اکٹھا ہوئے ہیں، اس کی یاد دلانا بہت آسان ہے۔ اگر اس

مسئلے کو کسی انجمن نے پوری قوت کے ساتھ اٹھایا تو وہ ندوۃ العلماء تھا۔ ندوۃ العلماء کے مدرسے کا قیام ۱۳۱۱ھ میں ہوا بلکہ اس کے بعد ندوۃ العلماء علم کی تحریکوں کا مرکز بن گیا اور آج بھی وہ بہت سے امتیازات رکھتا ہے۔ ندوۃ العلماء، علم کی تحریکوں کا مرکز بن گیا اور آج بھی وہ بہت سے امتیازات رکھتا ہے۔ ندوۃ العلماء نے پوری قوت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا جس میں ارباب فہم حضرات موجود تھے جو اس مسئلے کی گہرائی کو سمجھ سکتے تھے۔ ندوۃ العلماء نے اپنا بنیادی مقصد اصلاح نصاب تعلیم قرار دیا تھا، مگر میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا، اس کے مختلف وجوہ تھے کہ ندوۃ العلماء اس معاملے میں قدم آگے نہ بڑھا سکا اور یہ گتھی سلجھ نہ سکی اور ابھی تک الجھی ہوئی ہے۔ حالانکہ بارہا ندوۃ العلماء نے اس سلسلہ میں جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں، وہ ہمیشہ اس مسئلے کو سلجھانے میں مدد دیں گی۔ مجھے بہت جلد اپنی داستان کو ختم کرنا ہے۔ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم جس ڈھنگ پر دی جارہی ہے، اس کی اصلاح ہو، اس کے بارے میں اہم اور بنیادی چیزیں کہی گئی ہیں۔ وہ چیزیں سرسری طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ اور اس کے بعد ہم کو موقع ملے گا کہ ہم غور کرسکیں کہ کیا واقعی ان اصلاحوں کی ضرورت ہے! کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ جو حضرات مسلمانوں کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، اسلامی علوم کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں؟ ان کی ذمہ داریاں بہت ہیں۔ وہ نہ صرف ملک کے سامنے بلکہ تمام عالم اسلام کے آگے جوابدہ ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اس عظیم الشان خدمت کو انجام دیں! اس خواب کو جو سو برس سے لوگوں نے دیکھا ہے اور جو آج تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے، کم از کم آج تو اس کی تعبیر عالم اسلام کے سامنے آئے۔ اس سلسلے میں اس پر غور کرنا چاہیے کہ جو طریقے اصلاح کے ہیں، ان کی اہم باتیں کیا ہیں اور مہمات کیا ہیں۔ سب سے پہلی چیز مختصر میں آپ سے کہوں گا کہ وہ فنون آلیہ کے متعلق ہے۔ میں نے فنون آلیہ کے متعلق آپ سے کہا۔ وہ فن خود مقصود نہ ہو، بلکہ وسیلہ ہو کچھ ایسی چیزوں کا جو مقصود ہوں، تو اس لئے وہ سبھی ضروری ہو گئے۔ کچھ چیزیں تو بطور وسیلے کے ہیں اور کچھ چیزیں بطور مقصود کے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہوسکتی، علم و نظر کے کسی صیغے میں کہ ہم وسیلے کو مقصد بنادیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہر گوشے میں سب سے پہلی ٹھوکر جو انسانی دماغ لیتا ہے وہ یہ ہے

کہ جس چیز کو اس نے بطور وسیلے کے پکڑا تھا، اس نے اسے مقصود بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و حقیقت کے ہر صیغے میں ہم مقصد سے اتنا دور جا پڑے ہیں کہ ہم کسی حالت میں بھی اس کے نزدیک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کون سی چیز وسیلہ ہے اور کون سی چیز مقصود ہے۔ اگر ہم نے وسیلہ کو مقصود بنالیا اور اسی وسیلہ کو سمجھ لیا کہ یہ ہمارا مقصود ہے، تب ہم نے شیرازے کو درہم برہم کر دیا۔ تو اس کو ڈھونڈنا پڑے گا کہ وہ فنون آلیہ کون کون ہیں! صرف و نحو (گرامر)۔ تو صرف و نحو ایک بنیادی چیز ہے کہ جس کے بغیر عربی زبان کو ہم نہیں سیکھ سکتے ہیں۔ آپ جس چیز کو ڈھونڈنے نکلے ہیں، عربی گرامر نہیں ہے، بلکہ وہ اسلامی علوم وفنون ہیں جو صندوق میں بند ہیں اور ان پر قفل چڑھا ہوا ہے۔ آپ کو کنجی کی تلاش ہے۔ جو چیز آپ کو ڈھونڈنا ہے اور جو صندوق کے اندر ہے، اس کو بغیر کنجی کے آپ نہیں پا سکتے اور صرف و نحو وہ کنجی ہے جس سے اس صندوق کا قفل کھل سکتا ہے۔ اس طرح علم و ادب، عربی علم ادب ہے۔ جب تک آپ کی قابلیت پورے طور پر نہیں ہوتی ہے اور وہ قابلیت صحت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، اس وقت تک آپ اپنے مقصود سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ اس طریقے سے لاجک (Logic) اور منطق بھی ضروری ہے۔ منطق بجائے خود مقصود نہیں ہے۔ اصلی مقصد تو آپ کا ہے کسی نتیجے تک پہنچنا، کسی بحث کو اس طریقے سے ترتیب دینا کہ صحیح نتیجے تک آپ پہنچیں۔ یہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہو سکتی، جس کی آپ کو ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ منطق بھی بہر حال وسیلہ ہوئی اور مقصود نہیں ہوئی اور وہ فنون آلیہ میں داخل ہوئی۔ آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ اگر آپ تھوڑی دور تک بھی میرے ساتھ چلیں، میں زیادہ دور تک آپ کو لے جانے کی ہمت نہیں کروں گا، چند قدم آپ میرے ساتھ چلیں، اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری طرح مطمئن ہو جائیں گے کہ ان فنون آلیہ کی تعلیم جو ہمارے مدرسوں میں دی جارہی ہے، وہ صحیح نہیں ہے اور جو کام تھوڑے وقت میں کیا جاتا ہے، اس کام کو ہم زیادہ وقت میں کررہے ہیں اور بہتر نتیجہ نہیں نکل رہا ہے، تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ابھی میں نے آپ سے کہا تھا کہ طالب علموں پر دوسری جگہ دو بوجھ ڈالے جاتے ہیں، مگر ہمارے یہاں ہندوستان میں طالب علم پر بیک وقت تین پڑرہے ہیں۔ یہ سب سے پہلی بات جو میں آپ کو یاد دلاؤں گا، وہ یہ ہے کہ نہ عربی ہماری مادری زبان ہے اور نہ فارسی ہماری مادری زبان ہے۔ جو طالب علم تیار کیا جاتا ہے اس کے سامنے اجنبی زبانیں ہوتی ہیں اور اس کو ایک لمبی چوڑی

مسافت عربی زبان میں طے کرنا پڑتی ہے۔ آپ ایک طالب علم کو ایک مدرسے میں بٹھاتے ہیں اور اس کے سامنے عربی کتابیں رکھتے ہیں۔ آپ یہ چیز محسوس نہیں کرتے ہیں کہ عربی زبان میں آپ نے اس کے اوپر ایک وقت میں تین بوجھ ڈالے۔ پہلا بوجھ خود عربی زبان کا ہے۔ دوسرا بوجھ کتاب کا اور جو اس میں عبارت لکھی گئی ہے اور تیسرا بوجھ یہ کہ اس زبان کو سیکھے، جو اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا پرانا طریقہ یہ تھا کہ عربی صرف و نحو اور گرامر، میان اور منشعب سے شروع ہوتی تھی اور صرف میر اور نحو میر پڑھائی جاتی تھی۔ یہ کتابیں جس زمانے کے لئے لکھی گئی تھیں، اس زمانے کے لئے صحیح تھیں کیونکہ فارسی زبان اس زمانے میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہاں فارسی اجنبی زبان ہے۔ ہندوستان میں کبھی ایسا دور نہیں گزرا کہ فارسی مادری زبان ہوئی ہو۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم اتنی عام تھی کہ لوگوں کو اس سے توحش نہ تھا۔ اس لئے عربی صرف و نحو کی کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں۔

جو چیز میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، وہ ایک گہری چیز ہے۔ مگر بہت صاف ہے اور وہ بغیر کسی کدوکاوش کے آپ کے سامنے ابھر آئے گی۔ ایک شخص عربی زبان سے نا آشنا ہے۔ ایک بچہ آٹھ برس کا عربی زبان کو شروع کرتا ہے۔ آپ میزان اور منشعب سے شروع کراتے ہیں۔ فارسی زبان اس کے لئے اجنبی زبان ہے، اس کی مادری زبان اردو ہے۔ آپ ایک ہی وقت میں اس پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ پہلا بوجھ یہ ہے کہ وہ فارسی عبارت کو حل کرے جو اس کے لئے بالکل بیگانہ زبان ہے۔ دوسرا بوجھ یہ ہے کہ وہ کتابیں اور وہ رسائل اس ڈھنگ پر لکھے گئے ہیں کہ فن تعلیم کے لحاظ سے جو سہل آسان اور سمویا ہوا ڈھنگ ہونا چاہیئے، اس ڈھنگ پر وہ نہیں لکھے گئے۔ تیسرا بوجھ ہے عربی صرف و نحو کے سمجھنے کا۔ تو اب آپ غور کیجئے کہ اس کا دماغ ایک ہی وقت میں آپ کتنی قوتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اس کی ساری دماغی قوت تین خانوں میں بٹ رہی ہے۔ فارسی زبان کا سمجھنا، عبارت کا حل کرنا اور عربی گرامر یعنی صرف و نحو کے مسائل کو سمجھنا اور حل کرنا ہے۔ ان تینوں خانوں میں اس کا دماغ بٹ جاتا ہے۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ اس کا دماغ ایک ہی چیز میں صرف ہوتا یعنی صرف و نحو حاصل کرنا۔ تو کیا وہ عربی زبان کے صرف و نحو کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے دماغ میں جگہ نہ دیتا؟ اور عربی زبان کا صرف و نحو اس کے دماغ میں راسخ نہ ہو جاتا؟ لیکن آپ ایک ہی وقت

میں اس کے دماغ پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی دماغی قوت منتشر ہو جاتی ہے اور جو چیز آپ اس کو سکھا رہے ہیں یعنی صرف و نحو اس کی دماغی قوت اس کو مرکز بنا کر سامنے نہیں رکھتی۔ دماغ بھٹکتا ہے۔ چونکہ فارسی ایک اجنبی زبان ہے۔ فارسی کی عبارت کا مطلب اول سمجھے۔ عبارت پیچیدہ ہے، اس کے حل کرنے میں اسے دقت ہوتی ہے اور عربی صرف و نحو کے حاصل کرنے میں مزید مشکل پڑتی ہے۔ بہر حال اب مجھے جلد ختم کرنا ہے۔ ایک بنیادی غلطی جو عربی تعلیم میں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے کہ اگر ہم اصلاح چاہتے ہیں، تو بہر حال ہمیں تسلیم کرنا ہے کہ ہندوستان میں عربی علم اور تعلیم میں جس فن کی تعلیم بھی شروع کی جائے، اس کی پہلی رونمائی مادری زبان میں ہونا چاہیے، تاکہ وہ اس کو فوراً پکڑ لے اور اگر پہلی رونمائی مادری زبان میں نہیں ہوتی ہے اور ایک اجنبی روپ اس کے سامنے آتا ہے، جسے وہ پہچانتا نہیں ہے، تو پھر کافی وقت اس کے دماغ کو لگ جاتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو اس اجنبی صورت سے آشنا کرے۔ آپ اس کو فارسی پڑھانا چاہتے ہیں اس کی کیا ضرورت ہے کہ عربی صرف و نحو کی تعلیم کے پیچ و خم سے اس کے دماغ کو متوحش کریں۔ بلکہ بنیادی اصول یہ ہونا چاہیئے کہ ہر فن کی ابتدائی رونمائی مادری زبان میں ہوا کرے۔ کوئی علم جو اس کے سامنے آئے، پہلی مرتبہ جو اپنا گھونگھٹ ہٹائے اپنے چہرہ سے، تو وہ یہ سمجھے کہ یہ جانی بوجھی ہوئی صورت ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ عربی کے صرف و نحو کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح سے منطق کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیئے۔ اس طریقے سے جتنے فنون آلیہ ہیں، ان کی پہلی کتاب مادری زبان میں ہونی چاہیئے، تاکہ بیک وقت حل زبان، حل عبارت، حل موضوع کا بوجھ اس کے اوپر نہ پڑے۔ اس میں بھی بال و پر ہیں، مگر میں اس کو ختم کرتا ہوں۔

دوسری چیز جس کی تفصیل میں، میں نہ جاؤں گا، وہ متون وہ شروح کی بابت ہے۔ اس کا طریقہ حد اعتدال سے گزر گیا۔ جس حد تک یہ معاملہ پہنچ گیا ہے، وہ ہماری تعلیمی قوت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ تو بہر حال یہ چیز بھی پیش نظر رکھئے۔ ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ متون و شروح کے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں، ان میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔

تیسری چیز جو آپ سے میں کہوں گا، وہ یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے ہندوستان میں عربی علم و ادب کی تعلیم ہمیشہ کمزور رہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی علم و ادب

میں اسلامی علوم کا خزانہ مدفون ہے اور بغیر اس سے آشنا ہوئے ہم اسلامی علوم سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں ادب عربی کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کمزور رہا ہے۔ چناں چہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک ہزار برس کی زندگی میں، جو یہاں اسلامی علوم کو آئے ہوئے ہو گئے، اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ کون کون اشخاص ایسے پیدا ہوئے، جن کو یہ قدرت تھی کہ وہ ایک عرب کی طرح سلیس اور فصیح عربی لکھ سکیں! جتنے اشخاص پیدا ہوئے ہیں، میں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا ہوں، اور پانچوں انگلیوں کا شمار نہیں ختم ہوگا کہ نام ختم ہو جائیں گے۔ یہ چیز ہمیشہ کمزور رہی۔ اس کے کیا اسباب تھے؟ آپ اگر اس میں جائیں گے، تو یہ ایک بڑی داستان معلوم ہوگی۔ اس داستان کا ایک حصہ اس بنیادی غلطی پر مبنی ہے جو اس کے بارے میں ہوئی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ایک چیز فن بدیع ہے اور ایک فن کتابت۔ یہ کتنی بڑی بنیادی غلطی تھی کہ لوگوں نے فن بدیع اور فن کتابت میں فرق نہیں کیا۔ بدیع کیا ہے، یہ آپ سے کہنے کی ضرورت نہیں، جہاں جدید تعلیم یافتہ احباب موجود ہیں۔ فن بدیع ایک طرح کی صنعت گری ہے، جو ابھرتی ہے تنزل کے زمانے میں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ لفظوں کا گورکھ دھندا بنانے میں بڑے سے بڑا کمال دکھایا جاتا ہے۔ ہر زبان میں پہلا دور معانی کا دور ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئیں گے، تو محسوس کریں گے کہ معانی کی جھولی خالی ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہ لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس جائیں گے۔ اگر گرمی کا لفظ پہلے مصرع میں آیا، تو سردی کا لفظ دوسرے مصرع میں آنا ضروری ہے۔ اس طرح کی جو لفظی کاریگریاں ہیں، ان کو عربی میں کہتے ہیں فن بدیع۔ یہ تو آپ سمجھ گئے کہ فن بدیع یعنی لفظی صنعت گری کا فن، یہ ایک الگ چیز ہے، اس کو آپ نثر میں لا سکتے ہیں اور نظم میں بھی۔ صحیح ادبی ڈھنگ پر لکھنا، یہ چیز ہے فن کتابت۔ کتابت میں اگر آپ فن بدیع کو جوڑ دیں گے، تو وہ کتابت نہیں رہے گی اور یہ لفظوں کی صنعت گری، لفظوں کا گورکھ دھندا اور کتابت کا معما اور چیستان اور تماشا بن جائے گا، لیکن فن کتابت نہ ہوگی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ فن بدیع کا زیادہ تعلق نثر سے ہے۔ یہ چیز وہ ہے جو عربی میں نثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اسے مقامات کا طریقہ کہہ سکتے ہیں اور اس کے لکھنے والے کو اصحاب مقامات کہتے ہیں۔ مثلاً حریری کے مقامات، بدیع الزمان کے مقامات۔ بہر حال یہ فن بدیع میں لکھے گئے تھے اور ان کی وجہ سے ان کی شہرت

ہوئی۔ لیکن خود حریری اور بدیع الزمان کے ذہن میں ایک منٹ کے لئے بھی یہ بات نہیں آئی کہ کوئی زمانہ لفظی صنعت گری کا ایسا آئے گا کہ وہ فن کتابت کا نمونہ سمجھا جائے گا۔ لیکن ہندوستان میں عربی کی تعلیم کا جب خیال پیدا ہوا، تو مقامات حریری طالب علموں کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ خدارا انصاف کیجئے کہ فن کتابت سے اس کا کیا تعلق ہے اور کیا اس کو درس میں رکھ کر آپ نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ عربی میں اونچی سے اونچی ترقی جو ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے؟ اس طرح سے آپ طالب علم کا وقت خراب کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا لکھنا تک نہیں آتا ہے۔ لیکن کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس کے سامنے نمونہ فن بدیع کا رکھا جائے، لفظی کاریگری کا جس کا کتابت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ ایک صفحہ لکھیں جس میں قاف (ق) کا لفظ نہ آئے یا ایسا صفحہ لکھیں کہ جس میں ہر لفظ میں یا ہر سطر میں قاف (ق) آئے، اگر آپ کی عمر کا دامن بہت پھیلا ہوا ہے، تو کیجئے، چشم ما روشن دل ماشاد۔ لیکن آپ نمونہ خطوط لکھنے کا نہیں بنا سکتے ہیں۔ اگر ایک شخص کو خط لکھنا ہے جس میں کہ (ص) نہ آئے، (ب) نہ آئے، اگر اس طریقہ سے کوئی خط لکھنے لگے گا، تو اس کو لوگ مجنون سمجھنے لگیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فن بدیع الگ ہے اور فن کتابت الگ ہے۔

حضرات! مجھے معاف کیا جائے۔ ۱۴ یا ۱۵ برس تک لڑکے پڑھتے ہیں اور دس سطریں عربی کی صلاحیت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے، اگر لکھیں گے تو ایسی عربی ہوگی، جس کو ایک عرب پہچان نہ سکے گا۔ تو یہ ایک بہت بڑا نقص ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ ضرورت ہے کہ عربی کی تعلیم کی نیو نئے سرے سے قائم کریں۔ بہترین کتابیں موجود ہیں، بہترین مواد موجود ہے، ایسی کتابیں موجود ہیں کہ عربی ادب کے معجزات میں جن کا شمار ہو سکے۔ مقامات قطعاً درس میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی اہم چیز کی طرف آتے ہوئے مجھے دیر لگ گئی۔ بہر حال یہ معاملہ اتنا اہم ہے اور اتنا کم وقت مجھے ملا، جس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ زور جواب میرے دماغ میں باقی ہے وہ میں کوشش کروں گا کہ اس میں صرف ہو۔

حضرات! اب میں آتا ہوں معقولات پر۔ آپ کی تعلیم کا بہت بڑا حصہ ان چیزوں پر مشتمل ہے جن کو عام بول چال میں معقولات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک درس نظامیہ کا

تعلق ہے، اول روز سے اس کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ عنصر معقولات کا رکھا جائے۔ خود ملا نظام الدین نے جو کتابیں رکھی ہیں، وہ محدود تھیں۔ ہمارے درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر بہت چھا گیا ہے۔ اب میں اس مقدار کے متعلق آپ کو متوجہ نہیں کرنا چاہتا۔ بہر حال میں اس چیز کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں کیا ایسا وقت نہیں آیا ہے کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ جو حقیقت آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے دنیا نے تسلیم کرلی تھی، کب تک آپ اس سے انکار کرتے رہیں گے؟ کب تک آپ اس کو جھٹلائیں گے؟ کیا آپ نے اس کو محسوس کیا ہے کہ دنیا کہاں جارہی ہے اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے! میں نے بھی پھٹی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر ان کتابوں کو پڑھا ہے اور میری ابتدائی تعلیم کا وہ سرمایہ ہیں۔ ایک منٹ کے لئے بھی میرے اندر مخالفت کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر اس بارے میں میرا دل زخمی ہے۔ یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ آج سے ایک سو برس پہلے ہم نے اس چیز کو محسوس کیا ہوتا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہوتا کہ اب دنیا کہاں سے کہاں آگئی ہے اور اس کے بارے میں کیا تبدیلی ہمیں کرنا ہے۔ لیکن اگر سو برس پہلے ہم نے تبدیلی نہیں کی، تو کم از کم یہ تبدیلی ہم کو پچاس برس پہلے کرنا چاہئے تھی۔ لیکن آج ۱۹۴۷ء میں اپنے مدرسوں میں جن چیزوں کو ہم معقولات کے نام سے پڑھا رہے ہیں، وہ وہی چیزیں ہیں، جن سے دنیا کا دماغی کارواں دو سو برس پہلے گزر چکا۔ آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر میں اس معاملے کی تفصیل میں جاؤں اور میں آپ کو توجہ دلاؤں، تو کم از کم تین چار گھنٹے چاہیئے ہیں کہ حقیقتاً معاملات کی نوعیت کیا ہے! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم جس زمانہ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا تھا، آج سے چالیس برس پہلے، اس وقت شاید یہ دقتیں ہوں، لیکن اب یہ حقیقت اتنی کھلی چکی ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جہاں تک معقولات کا تعلق ہے، آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ معقولات کا جو کچھ ذخیرہ ہے، وہ سب بے کار ہے۔ سوائے اس کے کہ دماغ کو اس سے بے کار کریں اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بہر حال اب میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، لیکن اس پر توجہ دلاؤں گا کہ اس میں شک نہیں ہے کہ فلسفہ اور تاریخ میں ایک عہد متوسط ہے اور آج کل کی بول چال میں فلسفہ تاریخ کے جو خاص حصے کیے گئے ہیں، اس میں ایک زمانہ ہے، دور وسطیٰ کا۔ یہ درمیانی

عہد حقیقتاً ایک کڑی ہے، جو یونانی فلسفے کو موجودہ زمانے کے فلسفے سے قریب کرتی ہے اور یہ کڑی دراصل عربوں کا فلسفہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عربوں نے اپنے فلسفیانہ جدوجہد کے زمانہ میں جو یادگاریں چھوڑی ہیں، وہ فلسفہ کے مختلف صیغوں پر چھائی ہوئی ہیں۔ کہ ان کو دیکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یونان نے، ہندوستان نے معاملات کو جس حد تک پہنچایا تھا، اب اس کے بعد عربوں نے آج کل کے فلسفہ کو جس جگہ پہنچایا، اس کے بیچ کی ایک جگہ ہے۔ پچھلی جگہ سے ہٹتی ہوئی، آنے والی جگہ سے جڑتی ہوئی، یہ عربوں کا فلسفہ ہے۔ اگر یہ کڑی بیچ کی نہ ہوتی، تو شاید نئے دور میں جو اٹھان ہوئی ہے، وہ اٹھان اس شکل میں نہ ہوتی۔ بہر حال یہ وہ دور ہے، جسے موجودہ زمانے کے لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت عظیم اور بلند چیز ہے۔ لیکن وہ اس لئے نہیں ہے کہ اس فلسفہ کی تعلیم میں وقت صرف کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ وہ ایک قیمتی میراث ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کو محفوظ رکھیں، اس کی بلندی اور عظمت کو نمایاں رکھیں۔ اس لئے زمانے کو اس کی ضرورت ہے کہ کوئی ایک کتاب تو ایسی ہو کہ جس سے اہل علم کو معلوم ہو سکے کہ فلسفہ عربوں نے جو یونانیوں سے لیا، اس کو انہوں نے کس طریقہ سے محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔ نیز اس کے مباحث میں انہوں نے کتنے نئے قدم اٹھائے۔ بلاشبہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہونا چاہئے کہ جس کے ذریعہ سے ہم اس چیز کو محفوظ رکھ سکیں۔ آج جو طریقہ ہے فلسفہ کا، مثلاً انہوں نے گریک فلسفہ کو لیا، یونانی فلسفہ کو لیا، اس کے خاص مسائل پر روشنی ڈالی، بیچ کا جو دور آیا اس کی کہانی سنائی۔ اس کے بعد ماڈرن زمانہ آیا جسے عہد حاضر کہتے ہیں۔ اب یہ دماغ اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے آگے جو ایک تصویر آجاتی ہے فلسفہ کے مختلف عہدوں کی، مختلف دوروں کی، وہ اس کے لئے کفایت کرتا ہے کہ دماغ آگے بڑھنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اب ہمیں کوئی نہ کوئی چیز اس طریقے کی رکھنا ہے کہ جو قدیم ذخیرہ موجود ہے، اس کو ہم پورے طور پر محفوظ رکھ سکیں اور نمایاں رکھیں، کہ ایک طالب علم جو ہمارے مدرسے میں آیا ہے، وہ اس سے بے خبر نہ رہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت ہے کہ یہ حقیقت مان لی جائے کہ دراصل جو فلسفہ آپ کو پڑھانا ہے، وہ مختلف مسائل ہیں جو کہ اس وقت منقح ہو چکے ہیں۔ اگر یہ چیز آپ نہیں کرتے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ زمانہ سے واقف نہیں

ہیں۔بلکہ آپ زمانے سے لڑ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کی ایک لمبی چوڑی داستان ہمارے سامنے ہے، جو ہم کو یقین دلاتی ہے کہ قدامت پرستی نے جب ہتھیار اٹھایا، تو نتیجہ یہ نکلا کہ کش مکش ہوئی۔ مگر اس کش مکش کا یہ نتیجہ نکلا کہ قدامت پرستی کو ہارنا پڑا اور وقت کو جیتنا پڑا۔ اب اس کش مکش کی عمر بڑھ سکتی ہے، لیکن آخر میں ہار ہی ماننا پڑے گی، قدامت پرستی کو، تو اس سلسلے میں جیسا میں نے کہا کہ آپ وقت سے لڑ نہیں سکتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اتنی لمبی چوڑی کہانی سنائی اور یہ کہہ دیا کہ ساتویں صدی کے بعد سے جو دور رہا، وہ تنزل کا دور رہا، لیکن اس ساتویں صدی کے بعد یہی مدرسے تھے، یہی تعلیم گاہیں تھیں، اور یہی نصاب تعلیم تھا، یہی پڑھانے والے تھے، جن سے ایسے لوگ پیدا ہوئے، جن کی قابلیت کا یہ حال تھا کہ علوم و فنون تو چھوڑ دیجئے ملک کے انتظام کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اگر یہ تعلیم کا طریقہ غلط تھا، تو کیوں کر ممکن تھا کہ اس کے پڑھے ہوئے ایسا انقلاب پیدا کر سکتے اور شہنشاہی امور میں اونچے سے اونچے عہدہ پر پہنچ سکتے۔ ابو الفضل اور فیضی کہاں کے پڑھے ہوئے تھے۔ نظام الملک طوسی کہاں کے پڑھے ہوئے تھے! یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ملک کے انتظام کی باگیں اپنے ہاتھ میں لیں اور اپنے نقوش اور یادگار ہمیشہ کے لئے چھوڑے۔ آپ کو معلوم ہے کہ زمین کی پیائش اور اس کے بندوبست کا خیال اور بندوبست کے لفظ کی اصطلاح، آپ کو معلوم ہے کہ بنیادی طور بندوبست آج بھی ان ہی کھمبوں پر قائم ہے، جن کھمبوں پر اکبر کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ پہلی بنیاد تو شیر شاہ کے زمانے میں پڑی۔ لیکن اکبر کے زمانے میں اس کی تنقیح کی گئی اور ٹوڈر مل نے اس کو مکمل کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نقشہ کس نے بنایا تھا! حکیم فتح اللہ شیرازی ایک شخص تھا، وہ شیراز کا ایک پروفیسر تھا۔ وہ ہندوستان آیا، اکبر کے زمانے میں۔ یہ پیائش کا معاملہ اس کے سپرد کیا گیا۔ فتح اللہ نے ایک رسالہ اس کے اوپر لکھا اور راجہ ٹوڈر مل سے مل کر اس کام کو انجام دیا۔ آخر یہی تو تعلیم تھی جس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ نہ صرف علوم و فنون کے صیغے میں، بلکہ ملک کے انتظامی معاملات میں بھی ان کا ہمیشہ دخل رہا۔ آج میں کہوں گا کہ کسی اونچے عہدے پر کسی مولوی کو رکھ دیجئے تو لوگ ہمیں پریشان کریں گے، لیکن یہی مولوی تھے جن کے ہاتھ میں سول (Civil) اور دیوانی کے انتظامات تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا

تعلق ہے، وہی لوگ تھے جو ان ہی مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے آتے تھے۔ اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، وہ پاٹھ شالاؤں کے پڑھے ہوئے تھے۔ مگر ایک چیز آپ بھول گئے۔ وہ چیز ہے تعلیم اور وقت اور زندگی کی چال کے متعلق کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتی، اگر وہ وقت اور زندگی کی چال کے ساتھ نہ ہو۔ جو تعلیم ہو وہ ایسی ہونی چاہیئے کہ زمانہ کی جو چال ہے، وہ اس کے ساتھ جڑ سکتی ہو۔ اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ رکھیں گے، تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی عربی کی اور فارسی کی تعلیم تھی، لیکن اس وقت زمانہ ۱۹۴۷ء کا نہ تھا۔ اس تعلیم میں اور وقت میں رشتہ تھا، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان مدرسوں سے جو لوگ پیدا ہوئے، زمانہ ان کا استقبال کرتا تھا۔ بہر طور وہ زمانہ گزر گیا، لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ زمانہ تو اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا اور آپ وہیں بیٹھے رہے۔ آپ ان ہی مدرسوں میں بیٹھے رہے، جن مدرسوں میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم رکھا تھا۔ اس پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی۔ زمانہ بھی چلتا رہا۔ وہ پانچ سو برس کی مسافت طے کر چکا ہے اور آپ وہی کے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آج جو تعلیم آپ ان مدرسوں میں دے رہے ہیں، آپ وقت کی چال سے اسے کیسے جوڑ سکتے ہیں؟ نہیں جوڑ سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ میں اور آپ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم کہ جس تعلیم سے ملک کے بہترین مدبر، ملک کے بہترین منتظم اور ملک کے بہترین عہدہ دار پیدا ہوتے تھے، آج ان ہی مدرسوں کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ بالکل نکمے ہیں، ان مدرسوں سے نکلنے کے بعد مسجدوں میں بیٹھ کر یہ لوگ بس خیرات کی روٹیاں توڑ لیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں، انہوں نے حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہم زمانے سے دور ہو گئے ہیں۔ میرے پاس ایک بہت ہی جچی تلی بہتر طریقے سے لکھی ہوئی ایک تحریر آئی کہ چوں کہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا کے صیغہ تعلیم میں موجود ہیں، تو کیا یہ توقع کی جائے کہ جو عربی فارسی علوم کے مدرسے موجود ہیں، جہاں سے بہتر سے بہتر مستند طلباء فارغ ہو کر ڈگریاں حاصل کر کے نکلتے ہیں، کون سی وجہ ہے کہ ان کے لئے ملک کی انتظامی زندگی میں وہ دروازے کھلے نہ ہوں، جو انگریزی تعلیم کے حاصل کئے ہوئے اور پڑھے ہوئے لوگوں کے

لئے ہیں ؟ کون سی وجہ ہے کہ جو تعلیم ہمارے ملک کی اصلی تعلیم مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں دی جاتی تھی، اور جس تعلیم کو حاصل کر کے فتح اللہ شیرازی اور ٹوڈر مل پیدا ہوتے تھے، آج اس تعلیم سے جو لوگ نکلے ہیں، ان پر ملک کے انتظامی دروازے بند ہوں ؟ مجھے ان کے جواب دینے کی مہلت نہیں ہوئی۔ لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس کا جواب اسی میں موجود ہے۔ آپ نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ آپ اپنے مدرسوں کو زمانہ کی چال کے ساتھ جوڑ سکیں۔ زمانہ چلتا رہا اور ترقی پر پہنچ گیا اور آپ وہیں رہے، جہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم کو زمانہ کی مانگوں سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ اور زمانہ نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ کر دیا۔ زمانہ نے آپ کو بے کار سمجھا ہے، آپ کو نکما سمجھا ہے۔ مدرسہ میں عربی ان کو پڑھنا ہے، تو یہ مجبوری ہے کہ کسی نہ کسی مولوی کو رکھ لیا، لیکن کوئی حقیقی وقعت آپ کے دل میں مولوی کی نہیں ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ آپ کے دل میں اس کی عزت ہونا چاہیئے۔ تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس کی تہہ میں جو چیز ہے وہ زمانے کی ناقدر شناسی ہے۔

ہم کو اپنی جگہ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا چاہیئے کہ ہمارا فرض تھا کہ ہم زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتے، مگر ہم نے زمانے کا ساتھ نہیں دیا۔

# دینی مدارس کا نصاب و نظامِ تعلیم
# اور
# عصری تقاضے

دینی مدارس کے نصاب و نظامِ تعلیم کے حوالے
سے علامہ شبلی نعمانی کے نادر و نایاب مقالات

# قدیم تعلیم

## ۱۲۵ھ اور تعلیم تعلّم کی وسعت اور اس کے اسباب، طرزِ تعلیم، انقلابات، مختلف ملکوں کی خصوصیتیں، تعلیم کا مذہبی و تمدنی اثر

۱۲۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو تعلّم و تعلیم تھی، وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لئے موزوں تھی، علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا، بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا، (یعنی سند و روایت)، جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا لیکن سو برس کی مدت میں تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا، اور اسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب و باقاعدہ ہو چلی، اس دور میں جن علوم کو رواج عام حاصل ہوا وہ نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان کے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا، مگر رواج عام نہ حاصل کر سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا، اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ و منطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے، دیکھو ٹیگس سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رکتا چلا ہے، مفتوحہ ممالک میں امن و انتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے۔ سینکڑوں قبیلے ریگستان عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں۔ لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سر رشتہ تعلیم ہے، نہ یونیورسٹیاں ہیں، نہ مدرسے ہیں، عرب کی نسلیں حکمران ہیں، مگر حکومت ایسی

بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا، تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے، ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم و فنون، کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں، مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لئے ہزاروں کتب قائم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے، اور جو آج کل کے سیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں، اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لئے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے علماء کے ذاتی مکانات ہیں لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے بڑے بڑے عالی شان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے، اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی، اگرچہ اس وقت اس زمانہ کا کوئی رجسٹر نہیں موجود ہے۔ جس سے ہم حساب لگا سکیں، کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سینکڑوں، ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے ہم صحیح اندازہ کے قریب پہنچ سکتے ہیں، اگرچہ متواتر انقلابات، تخت گاہوں کی بربادی، اسپین کی تباہی، تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانہ کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں۔ تاہم ہر عہد میں ہم سینکڑوں ماہرین و مجتہدین فن کا نشان دیکھ سکتے ہیں۔ صرف ہم عصر ہم وطن اہلِ کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، ڈاکٹر اسپرنگر صاحب تخمینہ کرتے ہیں (شاید حسن ظن ہو) کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔

اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے جو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہو سکتا ہے۔

مشہور علماء کے تعلیمی حالات پڑھو، ایک ایک استاد کے حلقہ درس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب العلم مشغول درس نظر آئیں گے، علامہ ذہبی، طبقات میں ابو التقی المتوفی ۲۵۱ھ کے ترجمے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس زمانے کے بعض حلقہ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں، اور لوگ احادیث نبوی ﷺ لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد و فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے،

خطیب مؤرخ بغداد علامہ ابو حامد اسفرائینی کے حلقے میں خود شریک تھا، اس کا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس میں حاضر تھے۔ فراء نحوی نے کتاب المعانی کا جب لیکچر دیا (جس کو عربی زبان میں املا کہتے ہیں) تو حاضرین میں سے ۸۰ صرف قاضی تھے (۱)۔ رضی الدین نیشاپوری کے حلقہ درس میں چار سو فارغ التحصیل اہل علم حاضر ہوتے تھے۔ بصرہ کی جامع مسجد میں امام بخاری نے جب مجلس املا منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین، فقہا، حفاظ، اہل مناظرہ شامل ہوئے۔ خود امام بخاری سے جن لوگوں نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی ان کی تعداد قریباً نوے ہزار ہے۔ (۲)۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں جن کا ہم استقصاً نہیں کر سکتے۔

ہر قوم، ہر فرقہ، ہر طبقہ میں تعلیم کثرت سے جاری تھی، مصنفین واہلِ فن کے حالات پڑھو، سینکڑوں، ہزاروں، اہلِ کمال ملیں گے۔ جن کے باپ دادا، خیاط، اسکاف، جولاہے، حلوائی، طباخ، حداد وغیرہ تھے، امراء کا عیش پسند گروہ بھی تعلیم سے مالا مال تھا۔ لوگ تعجب سے سنیں گے کہ ابن المعتز عباسی المتوفی ۲۹۶ھ جو علم، بدیع کا موجد اور شاعری میں ابو نواس وبشار کا ہمسر تھا اور ابو فراس جس پر عرب کی شاعری کا خاتمہ ہو گیا، والیان ملک تھے، اور حکیم بو علی سینا و محقق طوسی وزارت کے بلند منصب پر ممتاز تھے۔

اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے۔ یعنی املا جس کو اردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں۔ استاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب العلم جو ہمیشہ دوات و قلم لے کر بیٹھتے تھے، ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے۔ اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی، امالی ابن درید و ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں، جب معمول سے زیادہ طلبہ حلقہ درس میں جمع ہوتے تھے تو استاد کے سامنے یا دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے، جو دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے۔ یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے، یہ طریقہ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، ابو بشر متی جو بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا۔ اس کے لیکچر میں سینکڑوں طلبہ

(۱) ان لوگوں کے تراجم دیکھو (۲) دیکھو مقدمہ قسطلانی

شریک ہوتے تھے جن میں فارابی بھی تھا اور اس نے کئی سو صفحے خود نقل کئے تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہلِ کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہلِ فن کی لائف چھان ڈالو، ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے تکمیل تعلیم کے لئے دو چار سو میل کی مسافت نہ طے کی ہو۔ اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوا، اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغداد، نیشاپور، قرطبہ وغیرہ میں گوہر فن کے کامل موجود تھے، مگر ان شہروں کے رہنے والے بھی مشرق و مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔

علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ان ہی علماء کے حالات میں ہے جو اسپین سے مصر و شام وبغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر اسپین میں داخل ہوئے، جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لئے مسلمان ہمیشہ سفر کرتے رہے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لئے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لئے خاص وقت اور مقام مقرر تھے۔ بعض امراء اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔ فقہ و ادب، نحو وغیرہ ہر ایک علم کے لئے جداگانہ مجلسیں تھیں، ان میں علماء اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیہ کے لئے انتخاب کیا جاتا تھا یہ جلسے جن میں زیادہ تر انصاف و حق پسندی کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصاب تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پر اثر تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عنایت کرتا تھا جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علماء کا مخصوص لباس (۱) تھا۔

---

(۱) علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "اول جس شخص نے علماء کے لئے خاص لباس قرار دیا، وہ قاضی ابو یوسف صاحب ہیں، وہی لباس اب بھی چلا آتا ہے، یہ لباس طیلسان کے علاوہ ایک جبہ ہوتا تھا، جو آج کل کے ایم اے کے لوگوں سے بہت مشابہ تھا۔ اس میں ہڈ بھی لگا ہوتا تھا۔ (دیکھو حسن المحاضرہ، جلد ثانی ص ۲۲۶ مطبوعہ مصر)

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے۔ (۱) تعلیم، مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی، قرآن و حدیث (جس پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں، اتنے تعلق سے نحو و صرف، لغت، معانی، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزاء تھے، فلسفہ نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی اس سلسلے نے بڑھتے بڑھتے قریباً ہر علم و فن کو اپنے دائرہ میں لے لیا تھا، اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے، جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے، جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہو گی تو کس حد تک پہنچا کر رہے گی۔ عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کر چکی تھیں، مذہب نے ان کو بھی ان ہی سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا، جو عرب کے ذاتی خاصے تھے، اور چوں کہ وہ مدت سے تمدن و معاشرت کی آبادی میں بسر کرتے آئے تھے تعلیم کے معاملے میں انہوں نے اپنے استاد (عرب) سے زیادہ کام دیا۔ یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول، فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں، علامہ ابن خلدون نے اس پر مقدمہ تاریخ میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "حملته العلم فی الاسلام اکثر هم العجم" یعنی اسلام میں علم کے حاملین اکثر عجم ہیں۔ ہمارے اکثر اخوان جو عرب کی نسل سے ہیں اس بات کو رشک اور تعجب سے سنیں گے مگر ان کو ہشام (۱) و عیسیٰ کی طرح صبر کرنا چاہئے۔

(۲) تعلیم مسجدوں اور علماء کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی، وزراء حکام، فوجی افسر، اہل منصب، ہر طبقہ کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بو علی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

---

(۱) ہشان بن عبدالملک دولتِ بنو امیہ کا نامور خلیفہ تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ مجھ سے ہشام نے پوچھا کہ اس وقت مکہ میں علم کا سردار کون ہے۔ میں نے کہا عطاء (ہشام) وہ عربی الاصل ہے (میں) نہیں۔ اسی طرح اس نے شام، مصر، خضیرہ، خراسان، بصرہ کی نسبت پوچھا، میں نے مکحول، یزید، میمون، ضحاک کے نام لئے ہر نام پر پوچھتا جاتا تھا کہ عربی الاصل ہے اور مجھ سے "نہیں" کا لفظ سن کر پیچ و تاب کھاتا جاتا تھا۔ اخیر میں، میں نے کہا کہ ابراہیم النخعی جو کوفہ کا امام ہے عربی الاصل ہے اس پر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ خیر اس سے کچھ تسکین ہوئی۔ (فتح المغیث ص ۵۹۰) عیسیٰ کی نسبت بھی ایک اسی قسم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی، کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا۔ اہلِ کمال کے زمرہ میں سینکڑوں گزرے ہیں، جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

(۴) امراء اور اہلِ منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا، سلاطین ووزراء تو ایک طرف معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سینکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چوں کہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے بدل نہ تھیں۔ بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبول عام مہنگے داموں کو خریدا جاتا تھا۔ تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زور طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لئے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں۔

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ نصاب تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا۔ پرائیویٹ تعلیم گاہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لئے ایک خاص مدت متعین ہو چکی تھی۔ گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی۔ مثلاً مغرب (مراکو وغیرہ) میں ۱۶ برس، اور تیونس میں پانچ برس طالب العلم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا۔ املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ آٹھویں صدی میں حافظ زین الدین عراقی نے (حافظ ابن حجر کے استاد تھے) اس کو زندہ کرنا چاہا اور تقریباً چار سو مجلسوں میں اس طرح درس بھی دیا، حافظ ابن حجر و سخاوی نے بھی ان کی تقلید کی، مگر ان ہی بزرگوں پر خاتمہ ہو گیا، جلال الدین سیوطی نے ارادہ کیا، مگر لوگوں کی بے توجہی دیکھ کر خود باز رہے۔

یہ مدرسے اکثر مذہبی تھے اور کسی ایک مذہب کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے۔ دارالعلوم نظامیہ صرف شافعیوں کے لئے تھا۔ مستنصریہ وغیرہ میں چاردن مذہب کا درس ہوتا، مگر مدرسین و نصاب تعلیم بالکل جداگانہ تھے۔ اس خصوصیت نے مذہب پر ایک نمایاں

اثر ڈالا۔ چوتھی صدی میں بلکہ اس سے پہلے تقلید مذہبی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ مگر ان مدرسوں نے چوں کہ اس کو محسوس صورت میں دکھایا، قوم میں اس کا عام رواج ہو گیا اور نہایت سختی کے ساتھ ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب نے تقلید شخصی کی ابتداء چوتھی صدی کے بعد قرار دی ہے(۱)۔ ہر شخص بہ آسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان مدرسوں نے جو تقلید شخصی کے ہم زبان ہیں یا خود تقلید کو پیدا کیا ہو گا یا کم سے کم اس کو ترقی اور استواری دی ہو گی۔ مدرسوں کے ابتدائی زمانہ میں تو ایسے علماء کثرت سے تھے جو اجتہاد کا حق رکھتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ تقلید کے عام رواج نے علوم اور ایجاد کی قوت کو اس قدر گھٹا دیا کہ گویا قوم سے اجتہاد کی قابلیت ہی جاتی رہی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے کتاب الانصاف میں نہایت سچ لکھا ہے کہ اس زمانے میں (یعنی پانچویں چھٹی صدی میں) تقلید ہی ضروری تھی۔

تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے، مثلاً نحو، صرف، منطق وامثال وذلک، ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ ان ہی کی نذر ہو گیا۔ اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہو سکتی۔

تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا۔ (۲) اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا۔ پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی، ہمارے ہندوستان میں تو ضمیروں کے مرجع اور حیثیت تعلیلی و تقلیدی و بعدیت ذاتی وزمانی کے تنگ دائرے سے طلبہ تو کیا اکثر علماء بھی کبھی باہر نہیں نکلے۔

ان مدرسوں میں (ترکی مدارس کے سوا) فلسفہ ومنطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں تو ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی لیکن اس کا الزام بانیان مدرسہ پر نہیں ہے۔ بلکہ قوم کے ان بزرگواروں پر ہے جو دینی یا دنیوی حیثیت سے قوم پر حکمران تھے۔ ہم لکھ آئے ہیں کہ مسلمانوں میں علوم کی بنیاد مذہب کی زمین پر رکھی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں کی اجتہادی رائیں جدھر رخ کریں علوم بھی ان کا ساتھ دیں۔ اسی وجہ سے

---

(۱) دیکھو حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۸ (۲) علامہ ابن خلدون نے ان دونوں باتوں پر نہایت عمدہ بحث لکھی ہے، دیکھو مقدمہ، تاریخ فصل ۶ کی فصل ۲۰ فصل ۳۱۔

مملکت اسلامی کے ہر گوشے میں رہ رہ کر فلسفہ کو صدمے اٹھانے پڑتے تھے۔

............ معتضد باللہ خلیفہ عباسی نے جو ۲۷۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ پہلے ہی سال فرمان نافذ کیا کہ کتب فروش فلسفہ کی کتابیں نہ بیچنے پائیں۔ (۱) حکیم ابن رشد کو اپنی فلسفی تصنیفات سے اس لئے انکار کرنا پڑا کہ خاندان عبدالمومن (سلاطین مراکو) نے اس جرم پر اس کو قید کر دیا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرماں روا نے جس کا نام مامون تھا حکیم بن حبیب کو قتل کرا دیا۔ (۲) سلطنت عثمانیہ میں بھی ایک مفتی صاحب نے فلسفہ کا درس بند کرا دیا۔ (۳) حافظ جلال الدین سیوطی نے علم منطق کے ناجائز ہونے پر ایک کتاب ہی تصنیف کر ڈالی جس کا نام "القول المشرق في تحريم الاشغال بالمنطق" ہے علامہ ابن الصلاح نے بھی اس مضمون کا ایک فتویٰ لکھا ہے۔ (۴) علامہ ابن تیمیہ مامون الرشید پر ہمیشہ ترس کھاتے رہے کہ دیکھئے اس جرم پر (فلسفہ کا رواج دینا)" خدا اس سے کیا مواخذہ کرتا ہے۔" اسپین میں امراء اور خواص فلسفہ کے حامی تھے لیکن عوام کی برہمی کے خوف سے کبھی اس علم کو عام آزادی نہیں دی گئی۔ (۵) تاہم مجھ کو اقرار کرنا چاہیئے کہ فلسفہ کے دوستوں کی تعداد (عوام کا ذکر نہیں) دشمنوں سے زیادہ تھی۔

مذہب نے تعلیم پر جو بڑا نمایاں اثر دکھایا، وہ یہ ہے کہ قدیم عربی زبان نہایت احتیاط سے محفوظ رہی، حالاں کہ قدیم عربی ایک مدت سے نہ ملک کی زبان ہے نہ حکومت کی، فارس و خراساں کی عام زبان فارسی تھی۔ عباسی جو بغداد میں خلیفہ کہلاتے تھے۔ ان کا جاہ و جلال بغداد کی شہر پناہ تک محدود تھا۔ عنان حکومت دیلم یا سلجوق کے ہاتھ میں تھی، جو زبان اور اصل دونوں اعتبار سے عجمی تھے۔ مصر و شام ایک مدت تک ربیہ، نوریہ، چرائسہ کے قبضہ میں رہے، اور یہ سب عجمی تھے۔ ممالک مغربی (مراکو، تونس وغیرہ)، میں بربر وزناتہ کی عمل داری تھی۔ خود عرب میں قدیم عربی کا رواج نہیں رہا تھا الغرض اس کے زندہ رہنے کا کوئی سہارا نہ تھا لیکن صرف اس بات نے کہ قرآن پاک اور حدیث اسی زبان میں تھی، اس کہنہ زبان کو تیرہ سو برس کی عمر دی، اور خدا سے امید ہے کہ قیامت تک اس کو قائم رکھے۔

---

(۱) تاریخ الخلفاء خلافت معتضد باللہ (۲) نفح الطیب تاریخ اسپین مطبوعہ فرانس جلد ثانی ص ۱۲۵ (۳) کشف الظنون، ذکر علم حکمت (۴) حسن المحاضرۃ ترجمہ حافظ جلال الدین سیوطی (۵) نفح الطیب جلد اول ص ۱۳۶۔

اس بات کا بے شبہ افسوس ہے کہ اس یک طرفہ توجہ نے موجودہ زبان سے ہم کو بالکل محروم رکھا، آج چھ سو برس ہوئے کہ عرب کی زبان بالکل بدل گئی۔ سینکڑوں نئے الفاظ کا داخل ہو جانا مختلف تصرفات و تبدیلیاں نئے محاوروں کا استعمال، یہ سب ایک طرف خود اعراب و ترکیب کی وہ حالت نہیں رہی، موجودہ علم نحو اب سرے سے بے کار ہو گیا ہے۔ تقریباً پانچ سو برس سے عرب اسی نئی زبان میں شعر و قصائد لکھتے ہیں اسی زبان میں ان کے فصیح و بلیغ خطبے پائے جاتے ہیں، لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ یہ قصائد اگر اعراب کے ساتھ پڑھے جائیں و موزوں نہیں رہتے، افسوس ہے کہ اس جدید مستقل زبان پر کسی نے توجہ نہ کی اور ان اشعار و خطب کے سمجھنے کے لئے ہمارے پاس کوئی لغت موجود نہیں (۱)۔ کس قدر افسوس و شرم کی بات ہے کہ ان لغات محدثہ کے لئے ہم کو عیسائی فاضلوں کا دریوزہ گر ہونا پڑتا ہے یعنی پروفیسر پطرس کا جس نے نہایت تحقیق سے محیط المحیط لکھی ہے اور لین صاحب انگلشی کا جن کی کتاب القاموس کی ۷ اجلدیں لندن میں چھپ چکی ہیں۔

اسلام جس وسیع دنیا پر حکومت کر رہا تھا اس میں جغرافی تقسیم کی حیثیت سے مختلف ملک شامل تھے اور متعدد قومیں آباد تھیں۔ اسلامی اتحاد نے اگرچہ ہر حصہ میں یکساں طور پر علوم کی روشنی پھیلائی مگر ملکی و قومی خصوصیتوں نے مختلف صورتیں پیدا کیں۔

ایران نے منقولی علوم کے علاوہ عقلیات کو معراجِ کمال تک پہنچایا، مصر و شام میں فقہ، حدیث و اسماء الرجال پر زیادہ توجہ ہوئی۔ حافظ جلال الدین سیوطی، مصر کی فضیلت کی ایک بڑی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ "وہاں فلسفہ کا زور نہیں ہے"۔ اسپین میں زبان دانی، شاعری، تاریخ کو زیادہ فروغ ہوا۔ یہاں تک کہ لڑکوں کو قرآن پڑھنے کے زمانہ سے اشعار و امثال یاد کرائے جاتے تھے۔ یہ اختلاف ان ہی ملکی خصوصیتوں کا اثر تھا، ایرانیوں کے ذہن کی لطافت، موشگافی، دقیقہ سنجی، فلسفہ و منطق کے بالکل مناسب تھی، مصر و شام عرب کے دامن میں تھے، اور اس وجہ سے قوتِ حافظہ کی عمدگی اور متوسط ذہانت نے حدیث و اسماء الرجال کو زیادہ پسند کیا، اسپین عرب ہونے کی حیثیت سے مصر و شام کا ہم پایہ تھا لیکن اتنی خصوصیت نے کہ وہاں مدت تک عرب خاندان حکومت کرتے رہے، شعرو شاعری پر جان

(۱)۔ علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں اس بحث پر متعدد مضمون لکھے ہیں۔ بہت سے اشعار بھی نقل کئے ہیں جو اس نئی زبان میں شعرائے عرب نے لکھے اور جن میں اعراب کا مطلق پتہ نہیں۔

دیتے تھے، اسپین میں ادب و شاعری کو زیادہ چمکایا۔ شام میں بھی آل حمدان کے زمانے میں جو عموماً سخن ور تھے۔ شاعری کا پایہ نہایت بلند ہو گیا تھا۔

انقلابات حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوا کئے اعلیٰ مقاصد کے لئے اکثر مفید ثابت ہوئے ایک خاندان گو کلیتہً برباد ہو جاتا تھا۔ مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے تھے۔ دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کر سکتی تھی۔ ہلاکو خان نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا۔ تاہم اوقاف میں کچھ تصرف نہ کر سکا۔ اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقق طوسی کے ہاتھ میں دیئے۔ جس کا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکام سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کے لئے ضرور تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومت سے زیادہ فیاضیاں دکھاتے۔ اس بات سے تعجب اور افسوس دونوں ہوتا ہے کہ پچھلی تعلیم جس کا اترا ہوا خاکہ اب بھی ہندوستان میں موجود ہے۔ پولیٹیکل آواز سے بالکل خالی تھی۔ نصاب تعلیم میں ایسی کوئی کتاب داخل نہ تھی، تاریخ کی کتابیں اگر پڑھائی جاتی تھیں تو تاریخی حیثیت سے نہیں، بلکہ فن انشاء کے اعتبار سے طالب علموں کی سادہ اور مفلسانہ طرزِ زندگی، دنیوی خواہشوں سے مبرا اور بے غرض شوق، کمالاتِ علمی کے لئے جس قدر زیادہ مفید تھا، اسی قدر ان کو معاملات ملکی سے الگ رکھتا تھا، ہم کو تو جرأت نہیں ہو سکتی، مگر علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں (گو بیان سبب میں ہم سے مختلف ہیں کہ ”ان **العلماء من بین البشرا لبعدلامور عن السیاسة**“ یعنی نوع بشر میں عام لوگ انتظامات ملکی سے بہت دور ہیں۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں، مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے۔ ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات و صنائع کو مدرسوں کے احاطہ سے باہر ڈھونڈنا چاہیئے۔ مدرسوں کی کثرت اور عالم گیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا۔ ۸۴۷ھ میں جب کہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا۔ خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس

(۱) دیکھو مقدمہ ابنِ خلدون فصل ۶ کی فصل ۳۵

سے زائد حلقہ درس تھے۔ جن میں ہر قسم کے علوم وفنون پڑھائے جاتے تھے۔(۱)

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب وتاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں۔ ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

**مؤلف**

گر قتم کز حریفان بیش یا کم میتوان گفتن      زدستت تا چہ آمد آخر ایں ہم میتوان گفتن

---

(۱) حسن المحاضرہ جلد ثانی ص ۱۸۔

# ملا نظام الدین علیہ الرحمتہ

## بانی درس نظامیہ

آج تمام ہندوستان میں عربی تعلیم کا جو نصاب ہے وہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، لیکن یہ سخت تعجب ہے کہ اکثر لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ نصاب کب بنا؟ اور کس نے بنایا؟ حال کی ایک تصنیف میں اس کو نظام الملک وزیر دولت سلجوقیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ پرانے تعلیم یافتہ اس قدر جانتے ہیں کہ اس کے بانی ملا نظام الدین صاحب لکھنوی ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کو بھی واقفیت نہیں۔

ملا نظام الدین صاحب جس رتبہ کے شخص تھے اور خصوصاً اس نصاب کے قائم کرنے سے ان کو جو شہرت حاصل ہوئی، اس کے لحاظ سے میں ایک مدت سے اس بات کا آرزومند تھا کہ ان کے مفصل حالات دریافت کروں لیکن چوں کہ ہمارے ملک میں بلیوگرافی (سوانح عمری) لکھنے کا طریقہ بہت کم تھا۔ اس لئے اس آرزو کے پوری ہونے کی بہت کم امید ہو سکتی تھی۔ میر غلام علی آزاد نے **سجتہ المرجان** میں مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے۔ جو بالکل ناکافی ہے۔ بڑے تلاش سے ایک رسالہ ہاتھ آیا جو مولانا ولی اللہ صاحب فرنگی محلی (محشی صدرا) کی تصنیف ہے، اور خاص ملا صاحب مرحوم کے حالات میں ہے۔ لیکن اس میں اصلی حالات نہایت کم ہیں۔ البتہ ان کی کرامتوں اور خرقِ عادات کا ایک بڑا دفتر ہے، وہ اس زمانہ کے کام کا نہیں۔

تاہم بمصداق **لایدرك كله لا يترك كله**، میں ایک مختصر سا خاکہ ان کی سوانح عمری کا ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

## خاندان کا حال

لکھنو کے اطراف میں جو مردم خیز بستیاں ہیں ان میں ایک مشہور قصبہ سہالی ہے جو لکھنو سے اٹھائیس میل ہے۔ یہاں مسلمانوں کے دو مشہور خاندان آباد تھے۔ انصاری جو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھے، عثمانی یعنی حضرت عثمانؓ کی اولاد سے، ملا صاحب اسی قصبہ کے رہنے والے تھے اور انصاری خاندان سے تھے۔ ان کے والد ملا قطب الدین بہت بڑے مستند عالم تھے اور ان کا حلقہ درس تمام مشرقی ممالک کا قبلہ گاہ تھا۔ عثمانیوں اور انصاریوں میں قدیم سے عداوت چلی آتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن عثمانی ملا صاحب کے گھر پر چڑھ آئے، اور ان کو قتل کر کے گھر میں آگ لگا دی۔ یہ واقعہ ۱۱۰۳ھ میں پیش آیا چوں کہ وہ بے گناہ قتل کئے گئے تھے۔ قوم نے ان کو شہید کا لقب دیا۔ چناں چہ کتب علمیہ میں جہاں ان کا نام آتا ہے، اسی لقب کے ساتھ آتا ہے۔ ملا قطب الدین صاحب کے چار فرزند تھے، بڑے صاحبزادے اس وقت دلی میں عالم گیر بادشاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، شیخ محمد سعید، شیخ محمد اسعد اور ملا نظام الدین مکان پر تھے، ملا قطب الدین صاحب کی شہادت کے بعد یہ لوگ بے کسی کی وجہ سے سہالی سے نکل کر لکھنو چلے گئے لیکن یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سلطنت تیموریہ کے زمانہ میں چوں کہ واقعہ نگاری کا صیغہ نہایت وسعت کے ساتھ قائم تھا اور ملک کا ایک ایک جزئی واقعہ دربار شاہی تک پہنچتا رہتا تھا۔ لکھنو کے واقعہ نگار نے فوراً دربار کو اطلاع دی اور وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ ملا صاحب کے صاحبزادوں کو فرنگی محل کے محلہ میں ایک قطعہ مکان مع عمارات متعلقہ عنایت کیا جائے۔ اطلاع کی تاریخ ۱۴ شعبان ۳۷ جلوس والا مطابق ۱۱۰۵ھ اور فرمان صادر ہونے کی تاریخ ۱۱ شوال ۳۸ جلوس والا ہے، اس فرمان کی کچھ عبارت ہم آگے نقل کریں گے۔

## لکھنو میں آباد ہونے کا سبب

ملا نظام الدین صاحب جن کا ہم تذکرہ لکھ رہے ہیں، اس وقت پانزدہ سالہ تھے، اس لئے فرمان میں ان کا نام نہیں ہے، بلکہ ان کے دونوں بڑے بھائیوں کا ہے، یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور میں نے ایک دفعہ لکھنو میں اس کی زیارت کی تھی۔ چناں چہ ہم اس کے ضروری الفاظ اس موقع پر درج کرتے ہیں۔ پیشانی پر عالم گیر کی مہر ہے۔

## عالم گیر کا فرمان

دامن میں یہ عبارت ہے

''دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یکمنزل حویلی فرنگی محل بامتعلقہ آن واقع بلدۂ لکھنو، مضاف بہ صوبہ اودھ کہ ازامکنہ نزولی است، برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و مصدیان مہمات حال واستقبال و جاگیرداران و کردریان آں رابنام مشاء الیہا معارف ومرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نہ شوندواندریں باب سند مجدد نہ طلبند''۔ مرقوم غرہ ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشت شد۔

فرمان کی پشت پر جو عبارت ہے اس کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

''شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشبہ ۱۴ شعبان المعظم ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرواد ماہ برسالہ صدارت و مشیخت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوار مرحمت واحسان، صدر منیع القدر فاضل خان و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہِ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی میگردد کہ بعرض مقدس و معلیٰ رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبہ مذکور را گذاشتہ جلاوطن گردیدند وکدام مکانہا سکونت ندارند الخ''۔

## طالب علمی

جس وقت ملا قطب الدین کا خاندان لکھنو میں آباد ہوا ملا نظام الدین صاحب کی عمر پندرہ برس کی تھی اور شرح جامی پڑھتے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک اطمینان کی معقول صورت نہیں پیدا ہوئی تھی، تاہم ملا صاحب نے فراغ خاطر کا انتظار نہ کیا، اور علوم کی تحصیل جاری رکھی۔ غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ ملا صاحب نے پورب کا سفر کیا اور مختلف شہروں میں تحصیل کی۔ آخیر میں لکھنو واپس آکر شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور ان ہی سے سند فضیلت حاصل کی لیکن مولوی ولی اللہ صاحب نے جو مستقل رسالہ ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ابتدائی کتابیں دیوا میں اور قصبات میں جاکر پڑھیں، لیکن انتہائی کتابیں بنارس میں جاکر حافظ امان اللہ بنارسی سے ختم کیں۔ فرنگی محل

میں آج جو روایت مشہور ہے وہ بھی اسی کی مؤید ہے۔

فراغِ تحصیل کے ساتھ ہی ملا صاحب اپنے والد بزرگوار کے مسند درس پر متمکن ہوئے، اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا آستانہ تمام مشرقی ہندوستان کا مرجع بن گیا۔

## تصوف

علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو کر ملا صاحب نے علوم باطنی کی طرف توجہ کی، اس وقت حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب ہانسوی کے فیوض و برکات کا تمام ہندوستان میں غلغلہ تھا۔ ملا صاحب ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ صاحب موصوف علوم رسمیہ سے ناآشنا تھے، اس لئے تمام لوگوں کو استعجاب ہوا یہاں تک کہ علمائے فرنگی محل نے اعلانیہ ملا صاحب سے شکایت کی، ملا صاحب کے تلامذہ میں سے ملا کمال علوم عقلیہ میں بڑی دست گاہ رکھتے تھے، اور چوں کہ بے انتاذ ہین اور طباع تھے، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ملا صاحب کی بیعت پر دوبدو گستاخانہ عرض کیا کہ آپ نے ایک جاہل کے ہاتھ پر کیوں بیعت کی اس پر بھی قناعت نہ کر کے شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور فلسفہ کے چند مشکل مسئلے سوچ کر گئے کہ شاہ صاحب سے پوچھیں گے اور ان کو الزام دیں گے، مشہور ہے کہ شاہ صاحب نے خود ان مسائل کو چھیڑا، اور ملا کمال کی خاطر خواہ تسکین کر دی، چناں چہ اسی وقت ملا کمال اور ان کے ساتھ بہت سے علماء شاہ صاحب کے قدموں پر گر پڑے، اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

شاہ صاحب نے ۱۱۳۶ھ میں رحلت فرمائی، ان کی وفات کے بعد ملا نظام الدین نے ان کے خلیفہ سید اسماعیل بلگرامی سے باطنی فیوض حاصل کئے۔

## بیماری اور وفات

ملا صاحب کو ابتداء سے قرحہ کا مرض تھا۔ لیکن کبھی معالجہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اور آخر عمر میں جب کہ سن شریف ۷۵ برس کو پہنچ گیا، نہایت ضعیف ہو کر صاحب فراش ہو گئے۔ دیوان خانہ میں رہنے لگے لیکن چوں کہ نہایت کثرت سے لوگ بیمار پرسی کو جاتے تھے اور بار بار پردہ کرانے میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی تھی، ملا احمد عبدالحق صاحب نے عرض کیا کہ حضور اگر دیوان خانہ میں تشریف رکھتے تو بہتر ہوتا، ملا صاحب نے کچھ جواب نہ دیا، دوسرے

دن شاہ عبدالغنی صاحب عیادت کو آئے تو ملا صاحب نے یہ مصرعہ

"ہر روز تنم تنگ تر سوراخ ایں غربالہا"

پڑھ کر فرمایا کہ اچھا میاں عبدالحق ہی کی مرضی پر عمل کرو، چناں چہ دیوان خانہ میں اٹھ کر تشریف لائے اور وہیں وفات کی۔

ملا صاحب کی دو بیویاں تھیں، دوسری شادی غالباً اس غرض سے کی تھی کہ پہلی سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ بیماری کو جب اشتداد ہوا تو زوجہ اولیٰ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور کہا کہ مجھ سے جو تقصیر ہوئی معاف فرمایئے۔ فرمایا تم نے کوئی تقصیر نہیں کی، البتہ مجھ سے یہ گناہ ہوا کہ تمہارے ہوتے دوسری شادی کی، اس جرم کو معاف کردو۔ تھوڑی دیر کے بعد زوجہ ثانیہ آئیں اور کہا کہ آپ تو تشریف لئے جاتے ہیں، اولاد کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں، ملا صاحب کو سخت رنج ہوا، حاضرین سے کہا کہ مجھ کو اٹھا کر بٹھادو، پھر فرمایا کہ نظام الدین تو جاتا ہے لیکن خدا ہمیشہ رہے گا۔

## تاریخ وفات

آخر نویں تاریخ جمادی الاولیٰ روز چہار شنبہ ۱۱۶۱ھ دوپہر دن چڑھے انتقال فرمایا۔ تاریخ وفات یہ ہے

ملک بود وبیک حرکت ملک گشت

عربی مادہ یہ ہے۔

مال العاشق الی المعشوق

## اخلاق وعادات

ملا صاحب ابتداء ہی سے نہایت غنی النفس اور متوکل تھے، ان کی عملی شہرت ان کی زندگی ہی میں اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ وہ ذرا سی خواہش کرتے تو ہر قسم کا جاہ و منصب حاصل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس طرف توجہ نہ کی، تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے اور نہایت استقلال کے ساتھ برداشت کرتے تھے، امراء اور اہلِ دول سے بالکل نہیں ملتے تھے، بلکہ اس قسم کے لوگ خدمت میں حاضر ہوتے، تو بے التفاتی ظاہر فرماتے، شیخ غلام مخدوم کا بیان

ہے کہ میں ایک دفعہ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، اور بیماری کی وجہ سے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا، اتفاقاً امراء میں سے ایک صاحب ملنے کے لئے آئے، میں نے ان کے لحاظ سے پلنگ پر سے اتر آنا چاہا، ملا صاحب نے فرمایا کہ "سفید پوشوں کو دیکھ کر بد حواس کیوں ہوتے ہو، آرام سے لیٹے رہو۔"

امرائے شاہی میں سے ایک رئیس جو ہفت ہزاری کا منصب رکھتا تھا، ملا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا، ایک دفعہ جمعہ کے دن عین نماز کے وقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ ذرا انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر ہو کر حضور کی اقتدا کا شرف حاصل کر سکوں، ملا صاحب نے ذرا دیر انتظار فرمایا، پھر کہا کہ "نماز خدا کے لئے ہے، اہلِ دنیا کے لئے نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔

## بے نفسی

لیکن یہ بے نیازی اور بد دماغی امراء اور جاہ پرستوں کے لئے مخصوص تھی، ورنہ مزاج میں مسکینی اور تواضع تھی۔ ایک دن ایک ایرانی ابو المعالی نام ملا صاحب کا شہرہ سن کر ملاقات کے لئے آیا۔ ملا صاحب درس گاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے تھے۔ اس نے ایرانی علماء کا جاہ و جلال دیکھا تھا، ملا صاحب کی طرف اس کا خیال نہ جا سکا، لوگوں سے پوچھا ملا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا لیکن نظام الدین میرا ہی نام ہے۔ اس نے چند فقہی مسائل پیش کئے کہ اہلِ حق (یعنی شیعہ مذہب والوں) کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے۔ ملا صاحب نے اس کا منشا سمجھ کر شیعوں کی روایت کے مطابق جواب دیا۔ نہایت پسند کیا اور کہا کہ ان ہی مسئلوں کو اہلِ ضلالت (سنیوں) کے مذہب کے موافق بیان فرمائیے۔ ملا صاحب نے سنیوں کی روایتیں بیان کیں۔ وہ عش عش کر گیا اور کہا کہ جس قدر سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔

علماء کی نسبت عام شکایت ہے کہ علمی مباحثات سے ہمیشہ ان کو فخر اور امتیاز مقصود ہوتا ہے اور اس لئے وہ کبھی حریف کے مقابلہ میں سکوت اختیار نہیں کرتے لیکن ملا صاحب اس عیب سے بالکل پاک تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب ان سے بحث کرنے کے لئے تشریف لائے۔ ملا صاحب نے مسئلہ کی تحقیق بیان فرمائی، انہوں نے اعتراض کیا، ملا صاحب چپ

ہو گئے، انہوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ میں نے ملا نظام الدین کو بند کر دیا۔ ملا صاحب کے تلامذہ کو ناگوار گزرا، اور ایک شاگرد نے جا کر ان صاحب کو زورِ تقریر سے بالکل ساکت کر دیا۔ ملا صاحب کو خبر ہوئی تو اس قدر برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقہ درس سے الگ کر دیا، اور کہا کہ میں ہرگز یہ نہیں پسند کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

## تصنیفات

ملا صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں مثلاً شرح مسلم الثبوت، شرح منار مسمی، بہ صبح صادق، حاشیہ صدرا، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ، یہ تمام کتابیں بڑے پایہ کی ہیں اور نہایت دقیق تحقیقات پر مشتمل ہیں۔ لیکن درحقیقت ملا صاحب کی شہرت ان تصنیفات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے طریقہ درس کے بدولت ہے۔ ملا صاحب کے زمانہ میں ہندوستان کے تمام اطراف میں بڑے بڑے علماء موجود تھے اور ہر ایک کی الگ الگ درس گاہ قائم تھی۔ مثلاً ملا محب اللہ بہاری مصنف سلم و مسلم متوفی ۱۱۱۹ھ ملا جیون مصنف نور الانوار المتوفی ۱۱۳۰ھ سید عبد الجلیل بلگرامی استاذ غلام علی آزاد المتوفی ۱۱۲۲ھ میر غلام علی آزاد بلگرامی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی، المتوفی ۱۱۷۶ھ لیکن ملا صاحب کے حلقہ درس سے جس رتبہ کے فضلاء پیدا ہوئے، وہ خود ان بزرگوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے، ملا صاحب کے فرزند مولانا عبد العلی کو تمام ملک نے بحر العلوم کا لقب دیا۔ جو آج تک مشہور ہے اور درحقیقت ہندوستان کی خاک سے کوئی شخص اس جامعیت کا شروع اسلام سے آج تک نہیں پیدا ہوا۔ ملا صاحب کے دوسرے شاگرد ملا کمال اس پایہ کے شخص تھے کہ مولوی حمد اللہ جن کی شرح سلم آج نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ ان ہی کے دامنِ فیض میں پلے تھے۔ ملا حسن کو بھی ملا صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

ملا صاحب کے درس نے اس قدر قبولیت حاصل کی کہ ہندوستان میں ہر جگہ سلسلہ بہ سلسلہ ان ہی کے شاگرد نظر آتے تھے اور لکھنو کا فرنگی محل تو علم و فن کا معدن بن گیا، جہاں دو سو سال سے آج تک علمی سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور سینکڑوں اہلِ کمال پیدا ہو کر پیوند خاک ہو گئے۔ ملا مبین، مولانا ظہور اللہ، مولانا ولی اللہ، مفتی محمد یوسف، مولانا عبد الحلیم، مولانا

عبدالحیٔ صاحب مرحوم جو ہمارے زمانہ میں موجود تھے ان کی تصنیفیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، آج جہاں جہاں علوم عربیہ کا نام و نشان باقی ہے اسی خاندان کا پر توفیض ہے۔ ہندوستان کے کسی گوشہ میں جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے۔ میں نے ۱۸۹٦ء میں جب ملا نظام الدین کے آستانہ کی زیارت کی اوران کی درس گاہ کو جو ایک مختصر ساباالا خانہ تھا، دیکھا تو عجب حیرت ہوئی، اللہ اکبر ہمارے ہندوستان کا کیمبرج یہی ہے، یہی خاک ہے جس سے عبدالعلی بحر العلوم اور ملا کمال پیدا ہوئے۔ افسوس اب یہ کعبہ ویران ہوتا جاتا ہے یادر فتگان صرف ایک مقدس بزرگ مولانا نعیم صاحب باقی ہیں۔ جو عبدالعلی بحر العلوم کے پڑپوتے ہیں اور جن کو ہماری سرکار نے شمس العلماء کا خطاب دیا ہے۔

## درس نظامیہ کی خصوصیات

ملا صاحب کے حالات میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ ان کا مقرر کردہ نصاب ہے جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نصاب کی خصوصیات یہ ہیں :

(۱) نصاب میں ہندوستان کے علماء کی متعدد کتابیں داخل ہیں۔ مثلاً نور الانوار، سلم، مسلم، رشیدیہ، شمس بازغہ، حالاں کہ اس سے پہلے یہاں کی ایک تصنیف بھی درس میں داخل نہ تھی۔

(۲) ہر فن کی وہ کتابیں لی ہیں جن سے زیادہ مشکل اس فن میں کوئی کتاب نہ تھی۔

(۳) منطق و فلسفہ کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زیادہ ہیں۔

(۴) حدیث کی صرف ایک کتاب ہے یعنی مشکوٰۃ۔

(۵) ادب کا حصہ بہت کم ہے۔

اس نصاب میں سب سے زیادہ مقدم خصوصیت جو ملا صاحب کو پیشِ نظر تھی، یہ تھی کہ قوتِ مطالعہ اس قدر قوی ہو جائے کہ نصاب کے ختم کرنے کے بعد طالب العلم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے، اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ درس نظامیہ کی کتابیں اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو عربی زبان کی کوئی کتاب لا ینحل نہیں رہ سکتی، بخلاف درس قدیم کے کہ اس سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

اختصار کے لحاظ سے بھی اس نصاب کو نصاب قدیم پر ترجیح ہے ایک متوسط الذہن طالب العلم سولہ سترہ برس کی عمر میں تمام کتب درسیہ سے فارغ ہو سکتا ہے۔ چناں چہ علمائے فرنگی محل میں اکثر اتنی ہی عمر میں فارغ ہو جاتے تھے۔

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ چوں کہ اس میں فقہ کی کتابیں بہت کم ہیں، اور جو ہیں ان میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے اس لئے اس نصاب سے وہ تقشف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بے جا تعصب نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو سطحی فقہاء کا خاصہ ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ فرنگی محل میں جو بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے ان میں کسی نے مذہبی مناظرات کی کوئی کتاب نہیں لکھی، شیعہ و سنی کا جھگڑا سب سے زیادہ لکھنو میں پیدا ہو سکتا تھا لیکن یہ صدا دلی سے بلند ہوئی اور گو تمام ملک اس ہنگامہ میں مبتلا ہو گیا، اور تحفہ اثناء عشریہ کے فقرے رجز کی طرح مذہبی پہلوانوں کی زبانوں پر چڑھ گئے۔ تاہم علمائے فرنگی محل آخیر تک اس شورش سے الگ رہے۔ اس نصاب سے اور باتوں کے ساتھ ملا نظام الدین صاحب کی انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی کا بڑا ثبوت ملتا ہے۔ علماء میں یہ خصلت بہت کم پائی جاتی ہے کہ ان کو معاصرین کے فضل کا قرار ہوا لیکن ملا صاحب نے اپنے معاصر علماء کی اس وقت عزت کی کہ ان کی کتابیں درس میں داخل کر دیں، نور الانوار، سلم، و مسلم سب ان کے معاصرین کی تصنیفات ہیں اور درس نظامیہ میں داخل ہیں۔ ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ اپنی کوئی تصنیف نصاب میں دخل نہیں کی، حالاں کہ ان کا کوئی معاصر ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ موجودہ درس جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے دراصل درس نظامیہ نہیں ہے، اس میں بہت سی کتابیں ایسی اضافہ ہو گئی ہیں جو ملا نظام الدین صاحب کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں۔ مثلاً ملا حسن، حمد اللہ، حاشیہ، غلام یحییٰ، قاضی مبارک، اگر چہ ہمارے نزدیک ضروریات زمانہ کے لحاظ سے درس نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم واضافہ کی ضرورت ہے لیکن اس مضمون میں ہم اس بحث کو نہیں چھیڑتے اور اسی تحریر پر بس کرتے ہیں۔

(معارف علی گڑھ فروری سنہ ۱۹۰۰ء)

# درسِ نظامیہ (۱)

## فرنگی محل، یا نظامیہ بغداد یا ہندوستان کا کیمبرج

ہماری قدیم طرزِ تعلیم اور آج کل کی مغربی تعلیم میں اس قدر فرق ہے کہ چند روز کے بعد لوگوں کو قدیم تعلیم کی صحیح تصویر ذہن نشین کرانی مشکل ہو گی، جس طرح آج سلطنتِ تیموریہ کے اصولِ حکمت اور طریقہ انتظام کا خاکہ لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا، ایک شان دار عظیم الشان عمارت ماہران فن کا ایک گروہ، لیکچروں کا ایک سلسلہ چند محدود گھنٹے (جس کے بعد وہ عمارت قالبِ بے جان رہ جاتی ہے) یہ چیزیں یک جا ہو جائیں تو یہ ایک یونیورسٹی یا کالج ہے، لیکن قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود خاص کا نام تھا، وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا، کالج بن جاتا تھا، اس کے گرد مستفیدوں کی ایک جماعتِ کثیر جمع ہو جاتی تھی، اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا، دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا، علمی لیکچر ہوتا تھا، اس کے حرکات سکنات، نشست برخاست، وضع قطع، طور طریقے، سب خاموش علمی لیکچر تھے۔ شاگردوں کا سلسلہ شاگردوں کا سلسلہ در سلسلہ پھیلتا جاتا تھا، یہاں تک کہ چند دن کے بعد یہ ذی روح کالج، یونیورسٹی یا جامعہ، اعظم بن جاتا تھا۔ آج لوگ کالج کی طرف منسوب ہوتے ہیں مثلاً الحسن لیکن اس زمانہ میں شخص کی طرف منسوب ہوتے تھے، نظامیہ بغداد سے ہزاروں اربابِ کمال تعلیم پا کر نکلے، لیکن اسمائے رجال میں جہاں کہیں ان کا حال لکھا جاتا ہے،

---

(۱) اس مضمون کی ماخذ حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) رسالہ قطبیہ درحال ملا قطب الدین شہید از ملا عبد الاعلیٰ فرزند مولوی عبد العلی بحر العلوم (۲) اغصان اربعہ مولوی ولی اللہ محشی صدرا (۳) عمدۃ الوسائل مولوی ولی اللہ صاحب موصوف الصدر ور حال ملا قطب الدین و شاہ عبد الرزاق بانسوی (۴) اغصان الانساب مصنفہ رضی الدین محمود انصاری، تصنیف ۱۲۶۰ھ۔ اس موقع پر مجھ کو جناب مولوی عبد الباری کا شکریہ ادا کرنا بھی فرض ہے جنہوں نے یہ کتابیں مجھ کو دیکھنے کے لئے عنایت کیں۔

نظامیہ کا نام نہیں آتا، بلکہ ان اساتذہ کا نام آتا ہے، جن سے انہوں نے تعلیم پائی تھی، آج کل کی یونیورسٹیاں یا کالج صرف بڑے بڑے شہروں میں قائم کئے جا سکتے ہیں، لیکن اس وقت کے ذی روح کالج ہر قصبہ، ہر گاؤں، ہر جھونپڑے میں قائم ہو سکتے تھے۔ دلی اور لکھنو پائے تخت تھے۔ لیکن علمی فیض رسانی میں سہالی، دیوا، گوپامؤ، بلگرام جیسے دیہات ان دار السلطنتوں سے بجا ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ ملا نظام الدین جن کے پر توفیض سے آج تمام ہندوستان روشن ہے، ملا محب اللہ بہاری جن کے سلم اور مسلم نے آدھا حصہ درس کا دبالیا ہے، قاضی مبارک جن کی تصنیف کا سمجھنا انتہائے استعداد سمجھا جاتا ہے، یہ اہلِ کمال ان ہی دیہات نے پیدا کئے تھے۔

اس قسم کے زندہ کالج اگرچہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں موجود تھے لیکن نسبتاً اودھ کا صوبہ تمام اور صوبہ جات سے ممتاز تھا، اس صوبہ میں دس دس پانچ پانچ میل پر شرفاء اور نجباء کے دیہات آباد تھے، جن میں اچھے اچھے نامور فضلاء درس دیتے تھے، اور دور دور سے تحصیل علم کے لئے آتے تھے، سلاطینِ وقت کی طرف ان درس گاہوں کے لئے دیہات معاف تھے، مولوی غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، ہم اس موقع کا اقتباس نقل کرتے ہیں۔

"اگرچہ جمیع صوبہ جات ہندبوجوہ حاملان علم تفاخر دارند اما صوبہ اودھ والہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتوان یافت، چہ در تمام صوبہ اودھ والہ آباد بفاصلہ پنج کردہ نہایت دہ کردہ آبادی شرفاء نجباء ہست کہ از سلاطین وحکام، وظائف وزمین مدد معاش واشتہ اند ومساجد ومدارس وخانقاہات بنانہادہ مدرسان عصر در ہر جاابواب علم بر روئے دانش پژوہان کشادہ وطلبہ علم خیل خیل می روند وہر جا موافقت دست بہم داد، بہ تحصیل مشغول می شوند وصاحب توفیقان ہر معمورہ طلبہ علم رانگاہ می دارند، وخدمت این جماعہ راسعادت عظمیٰ می دانند صاحبقران ثانی شاہجہان انار اللہ برہانہ، می گفت پورب شیراز مملکت ماست (۱)

یہ نظام ۱۱۳۰ھ تک قائم رہا جب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری اودھ کے صوبہ دار

---

(۱) کتاب مذکور تذکرہ ملا نظام الدین۔

ہوئے۔ تو تمام معافیاں ضبط کر لیں۔ علماء و فضلاء کی اولاد کسب معاش کی ضرورت سے پڑھنا پڑھانا چھوڑ کر سپہ گری میں مصروف ہوئی، مدرسے ویران ہو گئے، اور علمی صحبتیں درہم برہم ہو گئیں، ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کا صوبہ بھی اس خاندان کے قبضہ میں آگیا، اور صفدر جنگ صوبہ دار مقرر ہوئے، انہوں نے رہی سہی معافیاں بھی ضبط کر لیں، احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ کو وزارت ملی، ان کے نائب نے وظیفہ داروں کو اور بھی تنگ پکڑا اور اس طرح علمی بستیاں اجڑ گئیں۔ (۱)

غرض ان ہی زندہ کالجوں میں ایک سہالی بھی تھی، جس نے آگے چل کر فرنگی محل کا قالب اختیار کیا۔ یہ لکھنو سے ۳۲ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جو کسی زمانہ میں بہت بڑا قصبہ تھا، درسِ نظامیہ کا سنگ بنیاد اسی سرزمین پر رکھا گیا۔

درسِ نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے۔ ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، سب اسی درس کی شاخیں ہیں۔ کوئی عالم عالم نہیں مانا جا سکتا، جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اسی طریقہ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے، جس طرح کھوٹا سکہ ٹکسال باہر کہلاتا ہے اسی طرح کسی کتاب کا درسِ نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ نصابِ تعلیم میں داخل ہونے کی قابلیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی، درسِ نظامیہ اگرچہ خاص ہندوستان کا کارنامہ فخر ہے لیکن نظام الملک نے بغداد میں جو مدرسہ اعظم نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا، اس کی عالم گیر شہرت نے اس قدر دست درازی کی کہ اس سلسلہ کو بھی اس کے فہرستِ اعمال میں داخل کرنا چاہا، چناں چہ ہمارے زمانہ کے اکثر ناواقفوں کو دھوکا ہو گیا، یہاں تک کہ ایک اردو تصنیف میں صراحتاً یہ دعویٰ کیا گیا۔

درسِ نظامیہ اگرچہ ملا نظام الدین صاحب کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت اس کی تاریخ ایک پشت اوپر سے شروع ہوتی ہے، یعنی ملا نظام الدین کے والد سے جن کا نام ملا قطب الدین شہید تھا، اور اس لئے اس علمی لوح کے طغرا وہی قرار پا سکتے ہیں، تمام ہندوستان میں بلکہ انصاف یہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں یہ بات صرف اسی مقدس ذات کو حاصل ہے کہ پورے دو سو برس تک متواتر اور بلا فصل ان کی نسل سے علماء ہوتے چلے آئے، اور آج بھی یہ

---

(۱) یہ پوری تفصیل مآثر الکرام میں ہے۔

سلسلہ قائم ہے، ہندوستان کی علمی تاریخ میں یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ اس ملک میں تاریخ اور رجال کا مذاق کم تھا، لیکن اس سلسلہ نے خاص اپنے خاندان کا حال اس استقصاء کے ساتھ لکھا کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ چناں چہ ہم کو اس مضمون کے لکھنے میں تاریخی معلومات کی حیثیت سے کوئی دقت نہیں پیش آئی۔

اسلام جب عرب سے نکل کر دور دور ممالک میں پھیلا تو اکثر عرب کے خاندان ہجرت کر کے ان ممالک میں چلے آئے، ان میں سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی نسل سے ایک بزرگ ہرات میں آئے، اور یہاں سکونت کی، ان کے خاندان سے ایک بزرگ (۱) علاؤالدین انصاری ہندوستان آئے، چناں چہ ان کا مزار قصبہ برناوہ میں ہے۔ جو دلی اور متھرا کی راہ میں واقع ہے، ان کی نسل سے شیخ نظام الدین سہالی میں آئے۔ شیخ موصوف نے یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔

شیخ نظام الدین کے پڑپوتے شیخ حافظ نے علم و عمل میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا، تیموری حکومت کی یہ خصوصیت، اس کے کارناموں کا طغرائے زریں ہے کہ تمام ملک میں چپہ چپہ پر واقعہ نویس موجود تھے، جن کے متعلق یہ خدمت بھی تھی کہ ارباب کمالِ کے وجود سے بادشاہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے۔ چناں چہ خبر ہونے کے ساتھ ان لوگوں کی جاگیریں مقرر ہو جاتی تھیں، جن کی مال گذاری ان کے لئے معاف ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے بے شمار فرامین شاہی خود ہماری نظر سے گزرے ہیں، غرض شیخ حافظ کی بھی جاگیر مقرر ہو گئی، اور اس کے متعلق فرمان شاہی عطا ہوا یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور اس میں جیسا کہ مولوی ولی اللہ صاحب نے اغصانِ اربعہ میں لکھا ہے، شیخ کی نسبت نہایت تعظیمی الفاظ مذکور ہیں۔ شیخ موصوف کی درس گاہ میں طلبہ کی سکونت کا انتظام تھا، جن کے مصارف کا تکفل خود شیخ کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

ملا قطب الدین شہید، ان ہی شیخ حافظ کی نسل سے چوتھی پشت میں تھے، درسِ نظامیہ کی اصل بنیاد ان ہی سے شروع ہوتی ہے، ملا صاحب کے والد لاہور کے مدرسہ میں مدرس تھے،

---

(۱) یہ تین بھائی ساتھ آئے تھے، ایک نے ان میں سے پانی پت میں قیام کیا، چناں چہ پانی پت کے انصاری ان ہی کے خاندان میں سے ہیں (رسالہ قطبیہ) اس بناء پر مولانا حالی اور علمائے فرنگی محل ہم نسب ہیں۔

ملا صاحب نے اسی زمانہ میں ان سے تعلیم پائی، ان کے علاوہ قاضی گھانسی سے علوم حاصل کئے، جو بہت بڑے صوفی اور حضرت محب اللہ الہ آبادی کے خلیفہ اور جانشین تھے، اس زمانہ میں قصبہ دیواجو لکھنو کے نواح میں ہے۔ مولانا عبدالسلام کے درس کی وجہ سے علم و فضل کا مرکز تھا، ملا صاحب نے وہاں بھی جاکر علم کی تحصیل کی، مولانا عبدالعلی بحر العلوم کے خلف اکبر مولوی عبدالاعلیٰ اپنے رسالہ قطبیہ میں لکھتے ہیں کہ "ان کی تصنیفات میں سے صرف شرح حکمۃ العین کا حاشیہ اور رسالہ امور عامہ کے مسودہ کے کچھ اجزاء میرے والد کے کتب خانہ میں موجود ہیں، توضیح کا حاشیہ بھی ملا نظام الدین کے زمانہ تک موجود تھا، مگر اب مفقود ہے۔"

ملا صاحب کا معمول یہ تھا کہ دن کو درس دیتے تھے، شب کو عبادت میں مصروف ہوتے اور سہ شنبہ اور جمعہ کے دن تصنیف کرتے تھے۔(۱)

ملا صاحب کا فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو عالم گیر نے ان سے ملاقات کی خواہش کی، لیکن ملا صاحب نے اپنے اسلاف کے طریقہ کے موافق گوشہ غزلت کا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔(۲)

ملا صاحب نے درس کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا تھا، جو خود ان کا قائم کردہ تھا، وہ ہر فن کی صرف ایک جامع اور مستند کتاب پڑھاتے تھے کہ شاگرد کو تمام مسائل پر مجتہدانہ عبور ہو جاتا تھا، رسالہ قطبیہ میں ہے۔

"مولانا نے شہید (ملا قطب الدین) از ہر فن یک یک کتاب می خوانید ند، شاگردان محقق می شدند۔"

ملا نظام الدین اور مولانا بحر العلوم نے اس پر اضافہ کیا، چناں چہ تفصیل آگے آتی ہے۔

ملا صاحب کے حلقہ درس نے نہایت وسعت حاصل کی اور سلسلہ تلامذہ میں ایسے علماء پیدا ہوئے جن کے الگ الگ حلقہ درس ہو گئے اور تمام ہندوستان پر چھا گئے، ان میں سے چار شخص نہایت نامور ہیں، ملا نظام الدین جن کے نام سے درسِ نظامیہ مشہور ہے، ملا محب اللہ بہاری جو بیک واسطہ ملا صاحب کے شاگرد ہیں اور جن کی تصنیف سلم و مسلم اس قدر مقبول ہوئی کہ آج علماء کا سرمایہ کمال یہی کتابیں اور ان کی شرحیں ہیں۔ مولوی امان اللہ بنارسی جو ملا نظام الدین کے استاد ہیں، اور جن کی اصول فقہ میں ایک معرکہ آرا تصنیف ہے، قطب

(۱) رسالہ قطبیہ از مولانا عبدالاعلیٰ درحال ملا قطب الدین شہید (۲) گلزار انصار۔

الدین شمس آبادی جو محب اللہ بہاری کے استاد تھے۔

## ملا صاحب کی شہادت

ملا قطب الدین کی شہادت، گرچہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن سخت تعجب ہے کہ رسالہ قطبیہ اغصان اربعہ اور سبحۃ المرجان ان سب کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت اجمال سے لکھا ہے۔ اس لئے ہم عمدۃ الوسائل اور گلزار انصار سے اس کی تفصیل لکھتے ہیں۔ اگرچہ پچھلی کتاب ایک معمولی درجہ کی تصنیف ہے۔

قصبہ سہالی کے آس پاس خانزادے رہتے ہیں۔ ان سے چودھری محمد آصف سے جو سہالی کے زمیندار اور ملا صاحب کے ابن العم تھے، ہمیشہ سرحدی جھگڑے رہتے تھے۔ ملا صاحب کی شادی چودھری محمد آصف کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس تعلق سے خانزادوں کو ملا صاحب سے بھی عداوت ہوگئی، تاہم چوں کہ ملا صاحب کی عزت دربار شاہی میں تھی، یہ لوگ کچھ جرأت نہیں کر سکتے سو اتفاق یہ کہ خود سہالی میں عثمانی خاندان کے جو شیخ زادے تھے ان سے اور چودھری محمد آصف سے موضع بلرن کی آب پاشی کے متعلق نزاع ہوئی۔ اہلِ شہر ان جزئیات کی وقعت نہیں کر سکتے، لیکن ہم دیہات والے ان مہمات کو ایران و توران کے معرکوں سے کم نہیں سمجھتے، غرض دونوں طرف سے بڑے زور کی تیاریاں ہوئیں۔ ملا صاحب نے جا کر بیچ بچاؤ کیا، اور دونوں طرف کی فوجیں واپس آگئیں۔ موقع پا کر خانزادے کئی سو آدمی کے ساتھ سہالی میں آگئے اور عثمانیوں کو جا کر بھڑکایا کہ ہم ساتھ ہیں، آپ حملہ کیجئے، سب مل کر چودھری محمد آصف کے گھر پر چڑھ آئے، چودھری صاحب، ملا صاحب کے مکان پر تقریب ولادت کی مبارک باد دینے گئے تھے۔ (۱) ظالموں نے جا کر ملا صاحب کے گھر کا محاصرہ کر لیا، دیواروں میں نقب لگا کر گھس گئے، ایک نازک اور کمزور جسم کے لئے ہلکا سا ایک وار کافی تھا، لیکن ظالموں نے تمام آلات جنگ استعمال کئے۔ پہلے تیر، پھر بندوق اور آخر تلواروں کے سات واروں نے مل کر اس پیکر روحانی کو برباد کرنا چاہا۔ اور اپنے اعتقاد کے مطابق کامیاب بھی ہوئے لیکن

---

(۱) یہ تفصیل گلزار انصار سے ماخوذ ہے، محضر نامہ میں نہیں ہے، اغصان الانساب اور رسالہ قطبیہ میں ہے کہ مخالفین نے پہلے چودھری آصف کے گھر پر حملہ کیا اور ملا صاحب کے پاس اعانت و مشورت کے لئے آئے، مخالفوں نے تعاقب کیا اور ان کے ساتھ ملا صاحب کو بھی شہید کیا۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

اس واقعہ کی تاریخ روز دو شنبہ رجب ۱۱۰۳ھ ہے۔

ملا صاحب کے ساتھ چند طلبہ نے بھی جو مشغول درس تھے، وفات پائی، ظالموں نے خون ریزی سے فارغ ہو کر گھر کا مال واسباب لوٹا اور ملا صاحب کا ذخیرۂ علمی جس میں سات سو کتابیں تھیں جلا کر برباد کر دیا، ملا صاحب کی لاش اور چودھری آصف کا سر ساتھ لے گئے، تین چار دن کے بعد ملا صاحب کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لئے اور لاش سہالی بھیج دی، چناں چہ ۲۷ رجب کو نمازِ جنازہ پڑھ کر تجہیز و تکفین کی۔

اس واقعہ میں ملا صاحبزادوں میں سے تین صاحب موجود تھے۔ ملا سعید، ملا نظام الدین، ملا نظام الدین، ملا رضا، ملا سعید زخمی ہوئے ۷ اور ملا نظام الدین کو اشقیاء پکڑ کر بیٹھے پور لے گئے۔ لیکن فتح پور اور دیوا کے شرفاء نے جا کر نہایت لجاجت اور الحاح سے ان کی رہائی کرائی، صاحبزادوں نے ایک محضر لکھا جس میں تمام واقعات کی تفصیل لکھی، یہ محضر اب تک موجود ہے، اور اس پر تمام مشہور علماء اور رؤساء اور عمال شاہی کے تصدیقی دستخط ثبت ہیں، چوں کہ اس محضر میں تمام واقعات اور قاتلوں کے نام تفصیل سے درج ہیں، اس لئے ہم اس کو بعینہ نقل کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

**بحکم آیہ کریمہ ولاتکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ اٰثم قلبہ۔** سوال می کنم و گواہی می خواہم، باجماعۃ ستم رسیدگان محمد سعید و نظام الدین و محمد رضا پسران مولوی قطب الدین ساکن قصبہ سہالی سرکار لکھنو، صوبہ اودھ از قضاۃ اسلام و مشائخ کرام و جمہور انام بر ایں معنی کہ بر اصاغر و اکابر ایں دیار روشن و ہویدا است کہ مولوی مذکور موصوف بکمالات انسانیہ و فضائل علمیہ و عملیہ حافظ قرآن مجید بودند و غیر اشغال تدریس و تکرار باطلبہ علوم دینیہ و عبادت و طاعت کارے نداشتند، دور اوقات فراغ از درس و عبادت بہ تصنیف در علم تفسیر و حدیث، وفقہ و اصول، می پرداختند، بتاریخ رجب المرجب ۱۱۰۳ھ مطابق روز دوشنبہ بر عادت قدیمہ از نماز فجر و وظائف فراغ اندوختہ در مدرسہ آمدہ بدرس جمع از فضلائے حاضر الخدمت مشغول شدند، چون دو گھڑی روز بر آمد، اسد اللہ و باقر و پیر محمد سکنہ روضہ عملہ پرگنہ

سہالی، ونور وغلام محی الدین بساون، وسہاون ساکنان قصبہ سہالی وفقیر اللہ متوطن قصبہ دیوا، وانور ساکن استی معمولہ پرگنہ بجہور وغیرہ زمینداران گرد وپیش خانہ مولوی را محاصرہ نمودند و ازہر چہار طرف دیوار نقبہازدہ اندرون در آمدند و مولوی را یک زخم تیر و یک زخم تفنگ و ہفت ضرب شمشیر بررو رسانیدہ، شہید ساختند و شیخ غلام محمد نبیرہ، زبدۃ الاولاد بندگی شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی و دیگر شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ کہ نجواندن فاتحۃ الفراغ در خدمت بودند، نیز از دست ظلمہ مذکورین شہید شدند، ومحمد آصف چودھری پرگنہ سہالی کہ برائے مدد، مولوی رسیدہ، باہمراہیان خود شہید شد ند بندہ محمد سعید و جمعے از طلبہ و شیخ فضل اللہ برادر نائب قاضی عبداللہ قاضی پرگنہ سہالی، وغیرہ زخمی شدہ از آنکہ جملہ مذکورین از قتل و نکاح فارغ شدند، بہ نہب اموال وامتعہ کہ در حویلی بود پرداختند، چنانچہ اثر ے ازان بگذاشتند و کتب مولوی وغیرہ از مردم کہ قریب جہصدہ مجتمع بود اکثرے ازان آتش دادہ سوختند اوران میان مصحف مجید چہار جلد و مشکوٰۃ وغیرہ از کتب حدیث و مصنفات مولوی حاشیہ تلویح، شرح عقائد نسفیہ و تعریفات بزدوی و حاشیہ مطول وغیرہ کتب کثیر الحجم مشتمل بر فوائد جمیلہ بودند ہمہ سوختہ شد و جہہ رابردند با مستوران مولوی، برادران بانواع ہتک و حرمت بیش آمدند، ازاں بر خانہ شیخ حسام الدین برادر عم زاد حقیقی مولوی وغیرہ و برادران و مردم غرباسکنہ قصبہ سہالی بر ریختند، مال و متاع ہر چہ بود بغارت بردند، چون وقت دوپہر از کارہائے مسطور فارغ شدند و مراجعت بمسکن خود کہ موضع بیتھے پور معمولہ پرگنہ فتح پور دیوا وغیرہ باشد نمودند، بندہ نظام الدین پسر خورد مولوی، راا سیر کردہ ہمراہ گرفتند، و نعش مولوی و سر محمد آصف چودھری نیز باخود با موضع مذکور بردند، بعد از سہ چہار روز از الحاج و عجز بعضے شرفاء فتح پور و دیوا بندہ نظام الدین را خلاص نمودند، و سر محمد آصف دادند، و نعش مولوی را جاہجا مدفون می کردند می برآوردند، آخر بعد نہ روز ہر دو دست بریدہ گرفتند و نعش بہ قصبہ سہالی فرستادند، چنانچہ جمع از مسلمین نماز جنازہ خواندہ بتاریخ بست و ہفتم شہر مذکور در قصبہ سہالی مدفون ساختند۔

تذکروں میں دشمنوں کی مخالفت کی کوئی خاص وجہ ملا صاحب سے نہیں ہے اور صرف آصف چودھری کی پناہ گزینی، ایسی بے رحمی اور سفاکی کا سبب نہیں ہوسکتی۔ عمدۃ الوسائل میں لکھا ہے کہ مخالفین اپنی زمین داری میں نہایت ظلم کرتے تھے، اور چوں کہ عالم گیر ملا قطب الدین سے بہت راہ ورسم رکھتا تھا، اور امرائے دربار کو ان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا،

اس لئے انہوں نے سمجھا کہ ہمارے مظالم بادشاہ تک پہنچ جائیں گے، ملا سعید یہ محضر لے کر عالم گیر کے پاس دکن گئے، عالم گیر نے عمال کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا خاندان برباد کر دیا جائے۔ (۱)۔ چناں چہ صوبہ دار لکھنو نے سرکاری سپاہ بھیج کر ان کا گھربار غارت کر دیا۔ مخالفین بھاگ کر جلاوطن ہو گئے اور بالآخر خاندان والوں نے جعلی فوتی نامہ بنا کر عالم گیر کے دربار میں پیش کیا کہ قاتل مر گئے۔ قاتل اسد اللہ تھا، جو موضع پینتی پور کا رہنے والا تھا۔ وہ گوروپوش ہو کر بچ رہا لیکن مدت تک زندہ رہا۔ چناں چہ ملا نظام الدین (پسر ملا قطب الدین شہید) کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، اس نے ملا صاحب کی خدمت میں خون بہا بھی پیش کیا لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ بلکہ اپنا حصہ معاف کر دیا۔ تاہم خون کا یہ اثر تھا کہ جب وہ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو آپ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔ (۲)۔ مولوی ولی اللہ صاحب عمدۃ الوسائل میں لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۲۰۹ھ میں پینتی پور جا کر دیکھا، تو ویران اور تباہ تھا، اور گاؤں والے کہتے تھے کہ یہ اسی خون ناحق کی سزا ہے۔

عالم گیر نے ملا قطب الدین کے صاحبزادوں کے رہنے کے لئے فرمان کے ذریعہ سے لکھنو میں دو مکان عنایت کئے۔ یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور ہم اس کے جستہ جستہ حصے نقل کرتے ہیں۔

”درین وقت میمنت اقتران والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی محل بامتعلقہ آن واقع بلدہ لکھنو مصاف بہ اودھ کہ از امکنہ نزولی ست برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حاول نہ واستقبال و جاگیرداران و کروریاں آن راہنام مشارا۔ معاف و مرنوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نہ شوند، واندرین باب سند مجدد نہ طلبند، مرقوم عزہ ذی قعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد۔“

فرمان کے پشت پر جو عبارت ہے اس کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

”شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۴ شعبان المعظم ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ بر سالہ صدارت و منجمت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ، سزاوار مرحمت و احسان، صدر منبع القدر فاضل خان و نوبت، واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلایق پناہ حسام

(۱) احسان اربعہ مطبوعہ مطبع کارنامہ لکھنو۔ (۲) رسالہ قطبیہ۔

الدین حسین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس ومعلی رسید کہ شیخ محمد اسعد ومحمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبہ مذکور را گذاشتہ جلاوطن گردیدند و کدام مکان ہا سکونت ندارند۔

ملا صاحب کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی اور فرمان کی تاریخ تحریر شعبان ۱۱۰۵ھ ہے چوں کہ عالم گیر اس زمانہ میں دکن میں تھا اس لئے ملا سعید کو وہاں پہنچتے اور حکم صادر ہوتے ہوئی دو برس کا زمانہ گذرا، غرض فرمان کے بعد سارا خاندان لکھنو میں آگیا اور فرنگی محل دار العلم و عمل بن گیا۔

اس محلّہ کی وجہ تسمیہ یہ مشہور ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلّہ میں تجارت کے تعلق سے رہا تھا، وہ وطن چلا گیا تو اس کے مکانات سرکاری قبضہ میں آگئے اور وہی اسلامی علوم کی یونیورسٹی بن گئی۔

یہ بین کرامتِ بتخانہ مرا اے شیخ
کہ چون خراب شود خانہ خدا گردد

ملا صاحب کے چار صاحبزادے تھے، ملا اسعد، ملا سعید، ملا نظام الدین، ملا رضا۔ ملا اسعد سب میں بڑے تھے اور بہت بڑے عالم تھے۔ حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ لکھا تھا، ملا جیون سے مناظرہ میں فتح حاصل کی۔ مزاج امیرانہ تھا۔ اس لئے دربار میں توسل پیدا کیا اور ہمیشہ عالم گیر کے ہمرکاب رہتے تھے، شاہ عالم کے زمانہ میں وفات (۱) پائی۔ ملا حسن جو مشہور عالم گزرے ہیں ان ہی کے پوتے تھے۔

دوسرے صاحبزادے ملا سعید باپ کے ساتھ زخمی ہوئے تھے، اچھے ہو کر دکن گئے اور فرنگی محل کی معافی کا فرمان لائے، عنفوان شباب میں وفات کی۔ ملا احمد عبد الحق جو مشہور صوفی اور مصنف گزرے ہیں، ان ہی کی صاحبزادے ہیں، مولوی مبین شارح سلم ان ہی کے فرزند تھے۔

تیسرے صاحبزادے ملا نظام الدین تھے ان کا حال تفصیل سے آتا ہے۔

چوتھے صاحبزادے ملا محمد رضا ملا نظام الدین سے سات برس چھوٹے تھے، یہ بھی بڑے

(۱) رسالہ قطبیہ

عالم تھے، مسلم پر شرح لکھی، لیکن آخیر میں درس و تدریس کا سلسلہ چھوڑ کر شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر مرید ہوئے اور تارک الدنیا ہو گئے۔

ملا نظام الدین کی عمر باپ کی شہادت کے وقت ۱۴ برس کی تھی اور شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے۔ لکھنو میں آکر طالب علمی میں مشغول ہوئے ابتدائی کتابیں دیوا میں جاکر پڑھیں۔ جو آج حاجی وارث علی صاحب مرحوم کے انتساب سے مشہور ہے اور اس زمانہ میں مولانا عبدالسلام کا درس گاہ تھا، پھر اکثر کتابیں جائس میں جاکر ملا علی قلی سے پڑھیں، امور عامہ مولانا امان اللہ بنارسی سے پڑھا، توضیحہ کی تحصیل ملا نقش بند گورکھپور سے کی (۱) مولوی غلام علی آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں کہ آخری کتابیں ملا غلام علی نقش بند سے لکھنو میں پڑھیں، زمانہ کا انقلاب دیکھو آج جائس اور دیوا معمولی دیہات ہیں ایک زمانہ تھا کہ وہ ملا نظام الدین کے قبلہ مقصد تھے۔ غرض ملا صاحب نے ۲۴ برس کی عمر میں تمام علوم و فنون سے فراغت حاصل کی۔

سلسلہ قطبیہ میں یوں تو سینکڑوں علماء پیدا ہو گئے، ملا نظام الدین کے نام کو خدا نے وہ عزت دی کہ آج سب کا نام ان ہی کے نام سے روشن ہے اور ہندوستان کا تمام سلسلہ درس ان ہی کے نام سے منسوب ہے۔ مولوی غلام علی آزاد مآثرالکرام میں لکھتے ہیں۔ "امروز علمائے اکثر نظر ہندوستان نسبت تلمذبہ مولوی دارند و کلاہ گوشہ تفاخرمی شکنند و کیسحہ سلسلہ تلمذبہ اور ساندبین الفضلاء علم امتیازی افرازد" وہ علم و فضل کے ساتھ زہد و قناعت صبر و رضا، تقدس اور ایثار نفس کے وجود مجسم تھے۔ ان کی تصنیفات بھی کثرت سے ہیں، لیکن یہ بھی ان کا ایثار نفس ہے کہ سلسلہ درس میں اپنی ایک تصنیف بھی نہیں رکھی بلکہ اپنے استاد بھائی ملا محب اللہ بہاری کی کتابیں سلم و مسلم درس میں داخل کیں جس کی بدولت آج ان کتابوں کا نام آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن ہے۔

ملا صاحب نے چالیس برس کی عمر میں شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر تصوف کا رنگ ان پر غالب آگیا۔ ملا صاحب کا بالاخانہ جس پر بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے، آج بھی موجود ہے، میں نے ۱۸۶۹ء میں اس کی زیارت کی تھی۔ ۹ جمادی الاولی ۱۱۶۸ھ میں سنگ مثانہ کی بیماری میں وفات پائی۔ عبدالباسط امیٹھوی نے تاریخ لکھی۔

(۱) یہ تفصیل انصاف از مناسب میں ہے

نظام الدین محمد واصل حق چو ازروئے زمین سوئے فلک شد
وصال سال تاریخش فلک گفت ملک بودوبیک حرکت(۱) ملک شد

تصنیفات حسب ذیل ہیں:
شرح منار، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ، حاشیہ قدیمہ، شرح عقائد جلالیہ، شرح مسلم، شرح تحریرالاصول، حاشیہ صدرا۔

ملا صاحب نے نہایت زہد و قناعت کی زندگی بسر کی، کبھی کبھی تین تین دن کا فاقہ گزر جاتا تھا، اکثر چنے چاب کر رہ جاتے تھے، کبھی اہل دنیا کی طرف توجہ نہ کی، مناظرہ اور مجادلہ جو علماء کا عام طریقہ ہے اس سے پرہیز کرتے تھے ان کے طلبہ میں اگر کوئی کسی کو بحث میں الزام دیتا تھا تو اس سے ناراض ہوتے تھے، چوں کہ میں نے ملا صاحب کا حال معارف میں تفصیل سے لکھا ہے، اس لئے یہاں قلم انداز کرتا ہوں۔

## مولانا عبدالعلی بحر العلوم

ملا صاحب کی پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ تھی، لوگ کہتے تھے کہ دوسری شادی کیجئے، فرماتے تھے کہ میں بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا، ہاں کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوری ہے، میر اسماعیل بلگرامی سے ملا صاحب نے فیض باطنی حاصل کیا تھا، انہوں نے کہلا بھیجا کہ مجھ کو الہام سے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے تمہارے اولاد ہوگی، غرض آخیر سن میں قصبہ سترکھ میں شادی کی جس سے وہ گوہر شاہوار پیدا ہوا جو آج بحر العلوم کے نام سے مشہور ہے۔

بحر العلوم نے جن کا اصلی نام عبدالعلی ہے، تمام کتابیں ملا صاحب ہی سے پڑھیں، اس وقت ان کا سن ۱۷ سال کا تھا، اسی زمانہ میں ملا صاحب نے ان کی شادی قصبہ کاکوری میں کردی، ملا صاحب کی وفات کے بعد بحر العلوم نے ملا کمال سے استفادہ کیا، جو ملا نظام الدین کے شاگردوں میں سب سے ممتاز تھے۔

آغاز شباب تھا کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے ان کو وطن چھوڑنا پڑا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سید نورالحسن خان صاحب بلگرامی ایک بزرگ شیعی مذہب تھے، وہ اس زمانہ میں بیمار تھے اور مولوی محب اللہ صاحب کے مکان پر جو مولوی مبین شارح سلم

(۱) رباعی عمدۃ الوسائل میں نقل کی ہے اور شاعر کا نام اغصان الانساب میں لکھا ہے۔

کے والد تھے، مقیم تھے، محرم کا زمانہ آیا تو بیماری کی وجہ سے خود تعزیہ کی زیارت کو نہ جاسکے اور کہلا بھیجا کہ تعزیہ کو اسی طرف سے لے جائیں تاکہ میں یہیں سے زیارت کرلوں۔ مولانا بحر العلوم کا مدرسہ سر راہ تھا اور اتفاق یہ کہ اس وقت مولانا محرم کے شربت پر فاتحہ دے رہے تھے، ان کو معلوم نہ تھا کہ بلگرامی صاحب کے سبب طلب تعزیہ آیا ہے، چوں کہ فاتحہ میں مصروف تھے۔ زبان سے نہ بولے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ادھر سے راستہ نہیں، طلبہ موجود تھے، سمجھے تعزیہ کے توڑنے کا حکم دیا، اٹھ کر تعزیہ توڑ پھوڑ کر ڈالا، یہ نوابان اودھ کا زمانہ اور شیعیت کا زور تھا۔ غل پڑ گیا کہ مولانا نے بغاوت کی، قاضی غلام مصطفی جو شیعی مذہب تھے، بلوہ عام کر کے مولانا کے گھر پر چڑھ آئے، مولانا نے بھی سینکڑوں ہزاروں آدمی جمع کر لئے اور مقابلہ کی تیاری کی۔ یہ سامان دیکھ کر قاضی صاحب نے صلح کی، درخواست کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن یہ محض واقع الوقتی تھی، قاضی صاحب چاہتے تھے کہ بے خبری میں مولانا کو قتل کرادیں۔ مولانا نے اہل خاندان سے مشورت کی، حکومت کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔ لوگوں نے کہا مصلحت یہ ہے کہ آپ کچھ دنوں کے لئے ٹل جائیں لیکن مولانا کے احباب نے کہا کہ ملا نظام الدین صاحب کی نشست گاہ سے نکلنا ٹھیک نہیں۔ آپ یہیں رہیں۔ ہم لوگ سینہ سپر ہوں گے لیکن خاندان کے لوگ خود مولانا کا عروج نہیں دیکھ سکتے تھے، اور چاہتے تھے کہ یہ پتھر سینہ سے ٹل جائے، ان لوگوں نے کہا آپ اپنے ساتھ ہم کو نہ برباد کرائیے، مولانا کے رفقاء اب بھی راضی نہ تھے لیکن مولانا چھپ کر گھر سے نکلے اور شاہ جہاں پور چلے آئے۔ یہاں حافظ رحمت خان کی حکومت تھی، اس نے بڑی تعظیم و تکریم کی، مولانا نے ۲۰ سال تک یہاں قیام کیا۔ (۱)

حافظ رحمت خان نے مولانا کے مصارف کے لئے معقول رقم مقرر کر دی اور ان کے طلبہ کے وظائف مقرر کرادیئے۔ نواب عبداللہ خان رئیس شاہ جہان پور نے قلعہ میں لے جاکر اپنے مکان میں اتارا، دور دور سے طلبہ مولانا کا نام سن کر آنے لگے اور بہت بڑی درس گاہ قائم ہو گئی۔ بہت سے لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے، یہاں مولانا نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ حافظ رحمت خان نے جب شہادت پائی تو یہ اطراف نواب شجاع الدولہ کی

(۱) یہ پوری تفصیل رسالہ قطبیہ میں ہے اور چوں کہ یہ خود مولانا کے خلفِ اکبر کی تحریر ہے، اس لئے اس سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کوئی شہادت نہیں ہو سکتی۔

حکومت میں آگئے تو مولانا نے یہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا، اس زمانہ میں رام پور کی ریاست پر نواب فیض اللہ خان حکمران تھے، وہ خود آکر مولانا کو ساتھ لے گئے، چند روز تک مولانا نے یہاں قیام کیا لیکن نواب موصوف مولانا کے گروہ طلبہ کی کفالت نہ کر سکے اور مولانا نے یہاں سے بھی نکلنے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں منشی صدر الدین خان نے بوہار میں جو کلکتہ کے نواح میں ہے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ مولانا کے پاس زادِ راہ بھیج کر تشریف لانے کی درخواست کی، مولانا سو شاگردوں کے ساتھ بوہار کو روانہ ہوئے، قریب پہنچے تو منشی صدر الدین خان خود استقبال کر کے لائے۔ چار سو تنخواہ مقرر کی اور مولانا کے تمام شاگردوں کے وظائف مقرر کر دیئے۔

یہ واقعات اغصان اربعہ سے منقول ہیں لیکن رسالہ قطبیہ میں ہے کہ مولانا کو رام پور میں کچھ شکایت کی وجہ نہیں پیدا ہوئی تھی، لیکن منشی صدر الدین خان کے سخت اصرار کی وجہ سے مجبور ہو گئے، قطبیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ منشی صدر الدین خان نے افسرانِ انگریزی کی سفارشیں بھی نواب فیض اللہ خان کے پاس بھجوائیں کہ وہ مولانا کو ادھر روانہ کر دیں۔

بہر حال مولانا نے بوہار میں کچھ زیادہ زمانہ تک قیام کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مدراس میں نواب والا جاہ محمد علی خان والئی ارکاٹ کی حکومت تھی، وہ خاص قصبہ گوپامؤ کے رہنے والے تھے۔ اس تعلق سے مولانا کے ہم وطن تھے، مولانا بعض اسباب کی وجہ سے بوہار سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، یہ خبر نواب کو پہنچی، فوراً درخواست بھیجی، مولانا بوہار سے روانہ ہوئے، مدراس کے قریب پہنچے تو نواب نے، اعزۂ خاندان اور امرائے دربار کو ایک منزل آگے استقبال کے لئے بھیجا، شہر میں داخل ہوئے، تو سب امراء جلو میں ساتھ ساتھ تھے، ڈیوڑھی کے قریب پالکی پہنچی تو نواب مع تمام مقربین کے پیادہ پا نکلا، مولانا نے پالکی سے اترنا چاہا، نواب نے دوڑ کر پالکی میں کاندھا دیا اور اسی طرح مکان کے صحن تک لایا، دربار میں جہاں خود اس کی نشست تھی مولانا کو اس جگہ بٹھایا، اور مولانا کے قدم چومے اور کہا اللہ اکبر یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے گھر میں آتا۔(۱)

اغصان الانساب میں لکھا ہے کہ مولانا بوہار سے اٹھ کر پہلے کلکتہ میں آئے، یہاں نظام حیدر آباد اور سلطان حیدر (ٹیپو سلطان کا باپ) کی متعدد عرضیاں آئیں کہ یہاں قدم رنجہ

(۱) یہ پوری تفصیل اغصان اربعہ میں ہے۔

فرمایئے، لیکن چوں کہ ہم وطنی کا واسطہ تھا، اس لئے مولانا نے مدراس کو ترجیح دی۔

نواب محمد علی خان نے مولانا کو ایک نہایت عمدہ محل رہنے کو دیا اور روزانہ اپنے باورچی خانہ سے کھانا بھجواتا تھا، جب کبھی مولانا اس کے ملنے کو جاتے تھے تو اسی پہلے دستور کے موافق استقبال اور تعظیم کرتا، چند روز کے بعد ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، مولانا کی بتیس قرار تنخواہ مقرر کی، طلبہ کے وظیفے مقرر کئے، مولانا اب اسی مدرسہ میں طلبہ کے ساتھ رہنے لگے۔

نواب محمد علی خان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے عمدۃ الامراء مسند نشین ہوئے۔ خاندان میں مسند نشینی کے متعلق نزاع کا احتمال تھا، لیکن مولانا نے جب ان کو لے جاکر مسند پر بٹھایا، تو سب نے گردنِ اطاعت خم کر دی، عمدۃ الامراء نے باپ سے بھی زیادہ عزت و حرمت کی، مولانا کے علاوہ ان کے خاندان کے لئے الگ ماہواریں مقرر کیں۔ عمدۃ الامراء کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کے بیٹے کو مسند نشین کیا، لیکن چوں کہ مولانا اس کے عقائد اور مذہب کی طرف سے مطمئن نہ تھے، خود اس رسم میں شریک نہ ہوئے، چوں کہ اس نے اہلِ خاندان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، لوگوں نے شکایت کی، بالآخر چھ مہینے کے بعد انگریزوں نے اس کو معزول کر دیا، اور عظیم الدولہ کو جو نواب محمد علی خان کے بڑے بیٹے تھے، مسند نشین کیا، عظیم الدولہ مولانا کے شاگرد خاص تھے، عظیم الدولہ کی نوابی برائے نام تھی کیوں کہ گورنمنٹ انگریزی نے ملک اس کے قبضہ سے نکال کر روزینہ مقرر کر دیا تھا، لیکن عظیم الدولہ نے مولانا کی ماہوار جاری رکھی۔

اب مولانا کی عمر ۸۳ برس کی ہو چکی تھی اور ضعف غالب آتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ۸ رجب ۱۲۳۵ھ میں مرض الموت میں گرفتار ہوئے، چار دن تک یہ حالت رہی کہ کبھی کبھی ہوش آجاتا تھا، پھر غشی طاری ہو جاتی تھی، ہوش کی حالت میں چندبار فرمایا کہ نفی و اثبات کی حقیقت اب معلوم ہوئی خدا کے سوا کوئی چیز موجود نہیں، ۱۲ رجب کو انتقال کیا۔ (۱)

مولانا کے اخلاق و عادات کی سب سے نمایاں صفت فیاضی اور دریادلی تھی، ہمیشہ نہایت فارغ البال تھے۔ لیکن جو کچھ آتا تھا احباب اور فقراء کو تقسیم کر دیتے تھے، اس وجہ سے اہل و عیال نہایت تنگی سے بسر کرتے تھے لیکن ان سے بار بار اپنی عسرت اور تنگ حالی کی شکایت

(۱) اغصانِ اربعہ۔

کرتے تھے لیکن مولانا کچھ خیال نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی نواب کو خبر ہو جاتی تھی تو وہ براہِ راست بھیج دیتا تھا۔

مزاج میں اپنے والد کے خلاف ادعاء اور تمکنت تھی، کسی سے دبتے نہ تھے، مناظرہ کے بہت شائق تھے، ان سے زیادہ سن و سال کے جو علماء تھے ان سے مباحثہ کرتے تھے۔ لکھنو میں جب شیعوں نے ان کے مقابلہ میں بلوہ کرنا چاہا تو ایک گروہ کثیر ساتھ لے کر مقابل ہوئے اور آخر حریف کو ہٹ جانا پڑا، تصنیفات میں بھی اندازِ طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے۔

مولانا کے تین صاحبزادے تھے، ان کے حالات تفصیل سے لکھے جاسکتے ہیں، لیکن یہ مضمون ایک کتاب بن جائے گی۔

## سلسلہ نظامیہ کی علمی حالات پر ایک عام اجمالی نظر

اس خاندان نے علم و فن کے ترقی دینے میں جو جو کام کئے ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے، میں مختصراً بعض اہم باتیں لکھتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ اتفاق سے یہ خاندان کثیر الافراد تھا، ملا قطب الدین شہید کے چار صاحبزادے تھے۔ ان سب سے خاندان پھیلے اور ہر طبقہ میں کثرتِ اولاد رہی، مولوی عبدالباری صاحب نے ایک رسالہ آثار الاول نامی لکھا ہے جو شائع ہو چکا ہے، وہ گویا اس خاندان کی انسائیکلوپیڈیا ہے، اس میں سینکڑوں بزرگوں کے نام اور مختصر حالات لکھے ہیں، ان بزرگوں میں اکثر صاحب علم اور صاحب تصنیفات تھے، یہاں تک کہ اگر ان سب کی تصنیفات جمع کی جائیں تو ایک کتب خانہ نہ بن جائے گا، میرے زمانہ تک جو مشاہیر زندہ تھے ان کے یہ نام ہیں مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا نعمت اللہ، ریاضی دان، مولانا عبدالحلیم، مولانا محمد نعیم، مولانا عبدالحئی، مولوی فضل اللہ۔

ان بزرگوں کے تلامذہ سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز تھے، جن میں بہت سے خود بڑے بڑے سلسلہ درس کے مالک تھے، خاکسار کو بھی اس سلسلہ شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

ہندوستان میں جس قدر اور جہاں جہاں بڑے بڑے سلسلہ درس قائم ہوئے اکثر اسی خاندان کا فیض ہے، مثلاً پورب میں محب اللہ بہاری اور غلام یحییٰ بہاری سے علم پھیلا، دونوں اسی خاندان کے شاگرد ہیں رام پور ایک زمانہ تک درس گاہِ عالم تھا۔ یہ مولانا بحر العلوم اور ملا

حسن کا فیض تھا کیوں کہ یہ دونوں بزرگ ایک مدت تک یہاں رہے تھے اور ملا حسن نے رام پور ہی میں وفات پائی، نجیب الدولہ نے دارانگر میں جو امروہہ کے قریب ہے، ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں نہایت کثرت سے طلبہ نے تعلیم پائی، اس مدرسہ کے اکثر مدرسین اسی خاندان کے شاگرد تھے۔

بنگال اور مدراس میں جو کچھ علم پھیلا وہ مولانا بحر العلوم کا فیض ہے کہ ان مقامات میں آپ نے قیام فرمایا تھا۔ یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ یہ خاندان اگر دنیا کی طرف متوجہ ہوتا تو جاہ و منصب کی کمی نہ تھی، چناں چہ بعض بعض نے اتفاقاً ادھر کارخ کیا تو بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ مثلاً مولوی غلام یحییٰ اور مولوی غلام محمد صدر الصدور تھے۔ نوریہ سلسلہ نے حیدر آباد میں نہایت عظمت حاصل کی لیکن من حیث الاغلب اس خاندان نے علم و فن کو مقصد زندگی قرار دیا، فقر و فاقہ میں بسر کی، اور اس میں عمریں گزار دیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں اور جو علمی خاندان تھے مثلاً دلی میں شاہ ولی اللہ، الٰہ آباد میں شاہ محمد افضل صاحب کا دائرہ، بہار میں ملا محبّ اللہ، جون پور میں ملا محمود جون پوری، بلگرام میں عبدالجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد یہ سب خاندان دو دو، تین تین پشت سے زیادہ نہ چلے، یعنی وہ علمی حیثیت قائم رہی، لیکن فرنگی محل کا خاندان دو سو برس تک ایک حیثیت سے قائم رہا اور سینکڑوں علماء و فضلاء پیدا ہوئے۔

۲۔ آج تمام ہندوستان میں جو نصابِ تعلیم جاری ہے اس میں اکثر کتابیں اسی علمی سلسلہ کی تصنیفات ہیں۔ سلم ملا محبّ اللہ بہاری کی تصنیف ہے۔ جو ملا قطب الدین کے شاگرد تھے۔ اس کی تین شرحیں داخل درس ہیں، وہ سب اسی خاندان کی یا ان کے شاگردوں کی تصنیف ہیں۔ میر زاہد پر غلام یحییٰ کا حاشیہ درس میں داخل ہے۔ وہ بیک واسطہ ملا کمال کے شاگرد تھے۔

۳۔ ایک مدت سے درس کا جو طریقہ چلا آتا تھا۔ اس خاندان نے اس کو بدل دیا۔ اور اس میں مناسب اصلاح کی اس خاندان سے پہلے ہر فن میں متعدد اور کثرت سے کتابیں درس میں داخل تھیں۔ ملا قطب الدین شہید نے یہ طریقہ قائم کیا کہ ہر فن کی صرف ایک مختصر اور جامع کتاب مقرر کی، ملا نظام الدین نے ایک ایک کتاب کا اضافہ کیا، یعنی ہر فن کی دو دو کتابیں لیں، اس طرح ایک بڑا طومار کم ہو گیا، مثلاً پہلے منطق میں شرح مطالع پڑھاتے تھے، ملا صاحب نے بجائے اس کے قطبی رکھی، جو اس سے بہت مختصر ہے، حاشیہ قدیمہ و جدیدہ

وغیرہ جس کو ملا فتح اللہ نے ہندوستان میں رواج دیا تھا، سب اٹھا دیا۔

یہ امر خاص طور پر اظہار کے قابل ہے کہ آج جس چیز کو لوگ درس نظامیہ کہتے ہیں اور اس نام کی وجہ سے نہایت سختی کے ساتھ اس پر اڑے ہوئے ہیں اس کا بڑا حصہ درس نظامیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً حمد اللہ، ملا حسن آج درس میں داخل ہیں۔ یہ کتابیں نظام الدین صاحب کے زمانہ میں تصنیف بھی نہیں ہوئی تھیں۔ قاضی مبارک بھی درس میں داخل نہ تھی، غلام یحییٰ کا مطلق پتہ نہ تھا، اس کے علاوہ متعدد کتابیں جو اس وقت درس میں داخل تھیں، اب اڑا دی گئیں، مولوی عبدالاعلیٰ (خلف اکبر مولانا بحر العلوم) نے اپنے زمانہ کا جو سلسلہ درس بتایا ہے اس میں شرح حکمۃ العین داخل ہے، حالاں کہ آج کل بالکل متروک ہے، اسی طرح انہوں نے فن موسیقی کو بھی داخلِ درس رکھا ہے، حالاں کہ آج اس فن کا نام لینا بھی گناہ ہے۔

## درسِ نظامیہ کا اصول کیا تھا

درسِ نظامیہ میں اصول ذیل ملحوظ رکھے گئے۔

۱۔ اختصار یعنی ہر فن کی ایک دو مختصر کتابیں لے لی گئیں۔

۲۔ اختصار کے اصول پر اکثر کتابیں ناتمام درس میں رکھی گئیں، یعنی صرف اس قدر حصہ لیا گیا جو ضروری خیال کیا گیا۔ مثلاً میر زاہد، ملا جلال، صدرا، شمس بازغہ، مسلم، التلویح، ان سب کتابوں کے کچھ کچھ حصے درس میں داخل ہیں۔

۳۔ ہر فن میں وہی کتاب رکھی ہے جو اس فن کی سب سے مشکل کتاب ہے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ غور کی قوت پیدا ہو جائے کہ پھر جس کتاب کو چاہے دیکھ کر سمجھ سکے۔

۴۔ منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی یعنی اس میں کسی اور فن کی آمیزش نہ تھی، ملا محب اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملا دیئے اور اس کا عام انداز بدل دیا۔ یہ کتاب ملا نظام الدین صاحب نے درس میں داخل کی، پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں اور ان میں فلسفہ کا اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوتی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج منطق کی بہت سی کتابیں پڑھ کر بھی منطق نہیں آتی، کیوں کہ جس کو منطق سمجھتے ہیں، وہ منطق نہیں، بلکہ فلسفہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دو عالم جو باہم بحث کرتے ہیں تو ان

کی تقریر منطقی قواعد سے بالکل الگ رہتی ہے اسی طرح اصولِ فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا۔ ملا محبّ اللہ نے اس میں بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا۔ اور اب اصول بھی گویا فلسفہ ہے۔

ہندوستان میں علم و فن کا رواج گو چھ سو برس سے ہے لیکن زیادہ تر منقولات کا رواج تھا۔ منطق و فلسفہ صرف قطبی تک پڑھاتے تھے، سب سے پہلے مولانا عبداللہ ملتی، المتوفی ۹۲۲ھ نے معقولات کی ترویج کی(۱)۔ ان کے بعد قطب الدین شہید، اور ان کے خاندان نے معقولات کو ترقی دی، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علماء میں وہ سختی کم ہوگئی جو فقہا میں عموماً ہوتی ہے۔ فتاویٰ عالم گیری میں تکفیر کا باب اٹھا کر دیکھو، اس کے مقابلہ میں مولانا بحر العلوم نے ارکان اربعہ میں امامت کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مقابلہ کرو تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

(الندوہ ج، نمبر ۱۲، دسمبر ۱۹۲۰ء)

---

(۱) مآثر الکرام۔

# فنِ نحو کی مروجہ کتابیں

ابن حاجب نے کافیہ میں مسائل نحویہ کو جس طریقہ سے مدون کیا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بعد جس قدر کتابیں اس فن میں لکھی گئیں، گویا اسی کی عکسی تصویریں تھیں، ایک مدت کی ممارست اور انس کی وجہ سے اب یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس طریقہ میں کوئی نقص ہوگا لیکن آؤ تقلید کے دائرہ سے نکل کر دیکھیں کہ کیا ایسا ہی ہے؟

علوم وفنون کی تدوین میں عمدگی کا جو معیار قرار دیا جاسکتا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ مسائل کی ترتیب اصولِ عقلی کے بناء پر ہو۔

۲۔ جو اصطلاحات قائم کئے جائیں، ان کے لغوی اور مصطلح معنی میں نمایاں تناسب ہو تاکہ لغوی معنی سے اصطلاحی معنی کی طرف خیال جلد منتقل ہوسکے۔

۳۔ قواعد کلیہ کی تعداد اس قدر کم ہو کہ اس سے کم نہ ہوسکتی ہو۔

سب سے پہلے ہم اس پر بحث کرتے ہیں کہ موجودہ ترتیب کہاں تک اصول عقلی پر مبنی ہے اس کے لئے ہم کو نحو کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا چاہیئے۔

نحو کی تعریف متاخرین نے یہ کی ہے۔ **علم باصول یعرف بها احوال اواخر العلم۔** لیکن اگر نحو کی یہی حقیقت ہے۔ تو جن زبانوں میں اعراف نہیں ہے ان کے لئے نحو کا فن بالکل بے کار ہوگا۔ کیوں کہ اس تعریف کی رو سے نحو کا یہ مقصد ہے کہ الفاظ کا اعراب معلوم کیا جائے، اس لئے جن زبانوں میں سرے سے اعراب نہیں، مثلاً موجودہ فارسی یا اہلِ زبان کی عربی جس میں تمام الفاظ ساکن الاواخر ہوتے ہیں اور عوامل کے آنے سے ان میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا وہ نحو کے دائرہ سے باہر ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان میں ادائے مطلب کے لئے الفاظ کی ترتیب کا خاص طریقہ

ہے۔ یہ طریقے بعض میں مشترک ہوتے ہیں، بعض اور کسی دوسری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں اور بعض غیر مشترک جو خاص ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان ہی طریقوں کے جزئیات کا نام نحو ہے اور نحو کی تدوین کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام جزئیات کا استقصاء کر کے ان کو کلیات کے تحت میں لایا جائے۔

علامہ ابن خلدون نے نحو کی تعریف ان جامع الفاظ میں کی ہے۔ به يتبين اصول المقاصد بالدلالة اس تعریف سے ثابت ہوگا کہ نحو کا اصلی مقصد ادائے معانی سے متعلق ہے۔ یعنی جب ہم ایک مطلب ادا کرنا چاہیں تو ہم کو فاعل، مفعول، متعلقاتِ فعل وغیرہ کو کس ترتیب سے لانا چاہیے، باقی یہ امر کہ الفاظ پر ان تراکیب کا کیا اثر پڑتا ہے، اور اواخر حروف کو کس حالت میں کون سا اعراب ہوتا ہے یہ ایک ضمنی مسئلہ ہے۔ البتہ چوں کہ نحو کی تدوین اصل میں علمائے عجم نے کی، اور ان کے لئے اعراب کی صحت بھی ایک امرِ اہم تھی اس لئے رفتہ رفتہ اعراب کی حیثیت اس قدر اہم ہو گئی کہ متاخرین نے اس کو عین نحو سمجھ لیا۔

جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ نحو کا اصلی تعلق الفاظ کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر سے ہے تو نحو کی ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ کلام کے جو اجزاء سب سے مقدم ہیں ان کا حال پہلے بیان کیا جائے پھر ان سے کم درجہ کے اجزاء کا حال، پھر ان سے کم کا، اس لحاظ سے پہلے مسند الیہ کا حال بیان کرنا چاہیے، پھر مسند کا، پھر متعلقات کا، پھر توابع کا، اس بناء پر متبداء، فاعل، حروف مشبہ کے اسماء، افعال ناقصہ کی خبر و امثال ہذہ کا حال، ایک عنوان کے نیچے لکھنا چاہیے لیکن متاخرین نے اس معنوی حیثیت کو چھوڑ کر صرف اعراب کا لحاظ رکھا اور مرفوعات، منصوبات اور مجرورات کے لحاظ سے ترتیب قائم کی، اس اعراب پرستی کی وجہ سے بہت سے مسائل کی حیثیت بدل گئی، اور ان کے موقع ترتیب میں فرق آگیا، چناں چہ ہم چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ا۔ مفعول لہ معنی کے لحاظ سے مجرور باللام ہے، ضربته تاديباً و ضربته للتاديب میں معناً کسی طرح کا فرق نہیں، لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کو فتحہ ہوتا ہے، اس کے لئے زبردستی ایک نیا نام ایجاد کیا گیا اور اس کو مفعول کے اقسام میں شمار کیا گیا۔

یہی کیفیت مفعول معہ کی ہے۔ خوب غور سے دیکھو معنی کے اعتبار سے مفعول معہ اور

معطوف بالکل ایک ہیں۔ صرف اعراب کی بناء پر اس کو مفعول کا لقب دیا گیا۔ حالاں کہ یہ نہایت آسان بات تھی، کہ اس کو واؤ عاطفہ کے تحت میں بیان کیا جاتا اور اس قدر اضافہ کر دیا جاتا کہ بعض موقعوں پر معطوف کو فتحہ ہو تا ہے، اس کے ساتھ مفعول معہ کے خصوصیات بیان کر دی جاتیں۔

۲۔ حروف مشبہ کے اسماء مسند الیہ ہیں اور اس لحاظ سے ان کو فاعل اور متبداء کے ساتھ بیان کرنا چاہیئے لیکن اعراب کے لحاظ سے وہ منصوبات میں داخل کیے گئے، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

ایک بڑا نقص موجودہ نحو میں یہ ہے کہ کلمات کے بہت سے اقسام اور اصطلاحات بے فائدہ بنائے گئے ہیں۔ چناں چہ ہم چند مثالیں درج ذیل کرتے ہیں۔

ا۔ مفعول مالم یسم فاعلہ کو ایک خاص اصطلاح قرار دینا اور اس کے مسائل جداگانہ لکھنا محض بے کار ہے۔ مفعول مالم یسم فاعلہ کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ فعل مجہول کے فاعل کا نام ہے، فاعل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سے فعل کا ارتکاب ہوا ہو، بلکہ اصطلاح نحو میں فاعل کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ وہ فعل یا شبہِ فعل کا مسند الیہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ ضُرِبَ زید میں مضروبیت کی اسناد زید کی طرف ہے اس بناء پر وہ بھی اسی طرح فاعل ہے جس طرح ضرب زید میں زید۔

۲۔ افعال ناقصہ کو تمام افعال سے جداگانہ قرار دینا اور اس کے معمول کے لئے بالکل ایک نئی اصطلاح اسم و خبر کے نام سے قائم کرنا محض لغو ہے۔ یہ غلطی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ افعال ناقصہ کو فعل لازم سمجھا ہے، حالاں کہ وہ در حقیقت متعدی ہیں، چناں چہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

۳۔ افعال مقاربت کی جداگانہ اصطلاح قائم کرنا بے فائدہ ہے۔ افعال مقاربت میں جس چیز کو اسم کہتے ہیں۔ وہ در حقیقت فاعل ہے اور جس کو خبر کہتے ہیں وہ مفعول ہے۔ ان افعال میں بھی فعل فاعل پر تمام نہیں ہو تا، بلکہ ایک اور چیز کا محتاج رہتا ہے، اور وہی مفعول ہے۔

۴۔ اسی طرح افعال مدح و ذم کی اصطلاح کی بھی ضرورت نہیں، انعم الرجل زید میں الرجل فاعل ہے اور زید بدل اور یہ معمولی ترکیب ہے۔

متعدی کی تعریف کافیہ وغیرہ میں یہ ہے کہ مایتوقف فھم علی متعلق اس بناء پر افعال ناقصہ عموماً متعدی ہیں کیوں کہ ان کا مفہوم تنہا فاعل سے سمجھ میں نہیں آتا، علامہ رضی نے تصریح کی ہے کہ اس تعریف کی بناء پر قرب وغیرہ متعدی ہیں۔ چناں چہ لازم و متعدی کی بحث میں لکھتے ہیں۔ وعلی ماحد ینبغی ان یکون نحو قرب و بعد و خرج و دخل متعدیا اذالا یفھم معانیھا لا بمتعلق اس بناء پر افعالِ ناقصہ کے اسم و خبر در حقیقت فاعل اور مفعول ہیں۔

(الندوہ جلد ا نمبر ۶ شوال ۱۳۲۲ھ)

# رپورٹ
## متعلق
## اصلاح نصاب دار العلوم حیدر آباد

بموجب مراسلہ ناظم صاحب سابق نواب عماد الملک بہادر و مراسلہ و ناظم صاحب حال مورخہ ۳۔ ماہ الٰہی ۱۳۱۷ھ نشان (۱۲۲۳) دار العلوم کے نصاب اور مدت تعلیم میں جو تغیر اور اصلاح میں نے کی ہے اور جس کا نقشہ اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہے، اس کی نسبت میں ایک علیحدہ مفصل یادداشت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ترمیم اور اصلاح کن اصولوں پر کی گئی ہے اور ترمیم اور اصلاح کے مہمات امور کیا ہیں۔

نصاب دار العلوم کی ترتیب دینے کے وقت سب سے پہلے یہ امر پیشِ نظر ہونا چاہئے کہ دار العلوم کا اصلی مقصد کیا ہے اور کس قسم کے لوگ اس سے پیدا کرنے مقصود ہیں۔

دار العلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا، اس کی غرض صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے لائق ہوں اور اس مقصد میں دار العلوم نمایاں طور پر کامیاب رہا، لیکن اب جب کہ دار العلوم خود مختار اور آزاد ہو گیا ہے اس کے مقاصد زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اس کی غرض اب ایسے اشخاص کو پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں بلکہ اس سے ایسے اشخاص بھی پیدا ہوں جو شرعی خدمات انجام دینے کے قابل ہوں جو علومِ دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ ادب میں کمال رکھتے ہوں، جو ملک میں مذہبی عالم کی حیثیت سے تسلیم کیے جا سکتے ہوں اور اس بناء پر ان کی ہدایت اور تلقین کا عامہ اہلِ اسلام پر اثر پڑ سکے اور وہ عوام میں عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا سکیں۔ جو علوم قدیمہ کے ساتھ جدید علوم و فنون اور جدید خیالات سے بھی آشنا ہوں تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر

ان کا اثر پڑ سکے۔

یہ امر بھی خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ اس وقت تک جو تعلیم جدید تمام ہندوستان میں جاری ہے اس کی نسبت تمام اہل الرائے نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہماری ضرورتوں کے لئے کافی نہیں لیکن چوں کہ بغیر اس طریقہ تعمیر کے سرکاری نوکریاں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے چار و ناچار اسی طریقہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس طریقہ تعلیم میں ہماری مذہبی اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہیں، اس میں مذہبی تعلیم ہے، نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہو سکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق اور مسائل اخلاق کا علم ہو سکتا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک شخص گو بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرلے لیکن اسلامی مسائل، اسلامی تاریخ، اسلامی اخلاق کے متعلق اس کی واقفیت اور اس کا پوزیشن اس سے کچھ زیادہ نہیں ہو سکتا جو ایک عامی مسلمان کا ہو سکتا ہے۔

باایں ہمہ ہندوستان میں اس شکل کا کچھ علاج نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے موقع ہاتھ آئے۔

لیکن چوں کہ ریاست نظام ایک وسیع مملکت ہے اور اس وقت اس نے سرکاری نوکریوں کے لئے یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے۔ اس نے اس کو موقع ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم کے علاوہ ایک ایسا خاص سلسلہ تعلیم بھی قائم کرے جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو اور جس کے تعلیم یافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں، اس قسم کی تعلیم کا انتظام دارالعلوم میں ہو سکتا ہے اور ہم کو موجودہ نصاب کے مرتب کرنے میں اس پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

اغراضِ مذکورۂ بالا کے لحاظ سے نصاب موجودہ میں جو تغیر اور اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ہر فن کی تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقہ سے بیان کئے گئے ہوں تاکہ طالب العلم بآسانی تمام مسائل پر حاوی ہو جائے۔ اس بناء پر وہ کتابیں جو معما اور چیتان کے طور پر اس قدر مختصر اور معلق لکھی گئی ہیں کہ ایک ایک سطر میں ایک ایک صفحہ کے مطالب کھپا دیئے گئے ہیں، وہ

خارج کر دی گئیں۔

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں ہیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیئے گئے ہیں۔ اس لئے غلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم، اس فن کے مسائل سے دور پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ملا حسن، میر زاہد، قاضی مبارک وغیرہ کہ یہ کتابیں دراصل منطق میں ہیں لیکن ان میں فلسفے اور امور عامہ کے دقیق مسائل اس قدر شامل کر دیئے ہیں کہ اصل فن کے مسائل پر گویا پردہ پڑ گیا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ تمام کتابیں پڑھ کر بھی طالب العلم کو خاص منطقی مسائل کی مشق نہیں ہوتی اور یہ نہیں کر سکتا کہ تقریر اور مناظرے میں اپنے دعوؤں کو اشکال منطقی کے ذریعے سے ثابت کر سکے۔

اس بناء پر نصابِ حال میں ہر فن میں وہی کتابیں رکھی گئی ہیں جن میں خالص اسی فن کے مسائل استیعاب کے ساتھ مذکور ہیں۔

(۳) قدیم نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ نہایت کم ہے، قرآن مجید کا متن تک درس میں نہیں۔ تفسیروں میں صرف دو تفسیریں درس میں داخل ہیں۔ ایک جلالین جس کے الفاظ اور قرآن مجید کے الفاظ عدد میں برابر برابر ہیں اور دوسری بیضاوی جس کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں۔ جو کتاب کا پندرہواں حصہ بھی نہیں۔ اس لئے قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا ہے۔

(۴) قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصہ نہایت کم ہے حالاں کہ ادب کے بغیر تفسیر، حدیث، اصول فقہ کسی چیز میں کمال نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس بناء پر ادب کا نصاب بہت بڑھا دیا گیا ہے۔

(۵) یہ عام شکایت ہے کہ عربی خوان سب کچھ پڑھ جاتے ہیں لیکن چند سطریں صحیح عربی نہیں لکھ سکتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادب کی تعلیم کم تھی، دوسری یہ کہ انشاپردازی اور مضمون نگاری کی مشق نہیں کرائی جاتی تھی اس لئے نصابِ حال میں انشاپردازی کے لئے خاص گھنٹے مقرر کیے گئے۔

(۶) عقائد و علم کلام میں صرف ایک کتاب اور وہ بھی معمولی درجہ کی درس میں تھی، یعنی شرح عقائد نسفی حالاں کہ یہ فن تمام اسلامی فنون پر مقدم اور سب کا اصل الاصول ہے اس لئے اس فن میں متعدد اور بلند پایہ کتابیں نصاب میں رکھی گئیں۔

(۷) تاریخِ اسلام اور عام تاریخ کی ایک کتاب بھی نہ تھی، اس لئے اس فن کی کتابیں بھی داخل کی گئیں۔

(۸) علومِ جدیدہ کی بعض کتابیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئی ہیں نصاب میں شامل کی گئیں۔ لیکن اس موقع پر یہ ظاہر کردینا ضرور ہے کہ ان کے پڑھانے کا انتظام مشکل ہے۔ ہمارے علماء ان کتابوں کو پڑھا نہیں سکتے اور انگریزی خوان، عربی زبان سے آشنا نہیں، یہ ہو سکتا تھا کہ اردو میں جو کتابیں موجود ہیں، وہ داخل نصاب کر دی جائیں لیکن جہاں تک مجھ کو معلوم ہے طبیعیات کی جو کتابیں اردو میں موجود ہیں وہ مڈل کے رتبہ سے زیادہ نہیں، اس کے سوا عربی خوان طلبہ اردو زبان کی کتاب کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے، اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ ایسے پروفیسر مقرر کئے جائیں جنہوں نے بی اے میں سائنس لیا ہو اور عربی زبان ان کی سیکنڈ لینگو یج رہی ہو۔

(۹) انگریزی زبان بطور سیکنڈ لینگو یج کے لازمی قرار دی گئی ہے۔ میں انگریزی زبان سے واقف نہیں ہوں، اس لئے میں نے انگریزی کتابوں کا نام نہیں لکھا ہے۔ لیکن اس قدر بخوبی جانتا ہوں کہ موجودہ نصاب میں اس قدر گنجائش ہے کہ انگریزی زبان دانی کی کتابیں انٹرنس تک کی اس میں شامل کی جاسکتی ہیں اور درجہ فاضل کے بعد دو برس اس غرض سے رکھے گئے ہیں کہ جو شخص چاہے دو برس تک صرف انگریزی زبان دانی کی تعلیم حاصل کرے، جس سے وہ انگریزی زبان پر بخوبی قادر ہو سکتا ہے۔

(۱۰) نصابِ سابق میں ابتداء سے آخیر تک مدت تعلیم ۱۹ برس تھی لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی اس لئے گھٹا کر کل مدت ۱۴ برس قرار دی گئی ہے۔

(۱۱) نصابِ مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی ہے اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ لڑکا ساتویں برس کے سن سے دارالعلوم کی ابتدائی جماعتوں میں لیا جائے گا۔ یہ تعلیم پانچ برس میں تمام ہو گی اور اس میں اردو اور ابتدائی فارسی اور حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہو گی۔

اس درجہ کے بعد دو الگ شاخیں شروع ہوں گی، یعنی منشی اور عالم اور طالب العلم کو اختیار ہو گا کہ ان دونوں شاخوں میں سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے۔

## منشی

کے ۳ سال اور منشی عالم کے ۲ سال اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا ہے، منشی فاضل تک طالب العلم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کی سواد خوانی اور انگریزی بقدر عام ضرورت آجائے گی۔

عربی کے دو درجے قرار دیئے گئے۔

## عالم

اس کی مدت تعلیم ۸ برس ہے۔ یہ درجہ بی اے کے برابر ہے۔ اس میں تمام علوم متداولہ عربی اور بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زبان دانی انٹرنس کے درجہ تک آجائے گی، یہ میری خاص رائے ہے لیکن اگر یہاں کے حالات کے لحاظ سے ضروری ہو تو بیچ میں ایک اور درجہ مولوی یا ملا کے نام سے قائم کیا جائے اور یہ درجہ پانچویں سال تک تمام ہو جائے، اس کے بعد تین برس عالم کے لئے رکھے جائیں۔

## فاضل

اس کی مدت تعلیم دو برس ہے اور یہ درجہ ایم اے کے برابر ہے، اس میں کسی ایک خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا۔ مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ وغیرہ۔

عالم یا فاضل کے درجہ کے بعد ضروری ہے کہ چند طلبہ کو دو برس تک خالص انگریزی زبان سکھائی جائے تاکہ انگریزی زبان میں تحریر اور تقریر کا ملکہ ہو، اور ایسے علماء پیدا ہوں کہ یورپ کی علمی تحقیقات کو اسلامی علوم میں اضافہ کر سکیں اور انگریزی دان جماعت کے مجمع میں ان ہی کی زبان اور خیالات میں اسلامی عقائد اور مسائل پر تقریر کر سکیں۔

(۱۲) نصابِ تعلیم کے نقشے کے ملاحظہ سے چوں کہ ہر فن کی کتابیں یکجائی طور پر پیش نظر نہ ہوں گی۔ اس لئے اس موقع پر ہر فن کی الگ الگ کتابیں یکجا لکھ دی جاتی ہیں جس سے بیک نظر اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے گا کہ ہر فن میں کس پایہ کی اور کس طرح کی کتابیں نصاب میں تجویز کی گئی ہیں۔

## ادب و معانی و بیان

اخوان الصفاء، اطباق الذہب عبدالمومن، اصفہانی، سبعہ معلقہ، مجموع الادب، حسن التوسل، الیٰ صناعۃ الترسیل، مختصر المعانی، متنبی، تیمیہ بن المقفع، مقامات حریری، حماسہ، نقد الشعر ابن قدامہ، نہج البلاغۃ، اسرار البلاغۃ، عبدالقادر الجرجانی، کتاب الصناعتین، ابوبلال عسکری۔

## فقہ و اصول فقہ

قدوری، سراجی، درمختار، ارکان اربعہ، مولانا بحر العلوم، ہدایہ، نور الانوار، تحریر ابن الہمام، مسلم الثبوت، توضیح و تلویح، رسالہ امام شافعی۔

## قرآن مجید و تفسیر

الہدایۃ الیٰ الصراط المستقیم، فوز الکبیر فی اصول التفسیر، جلالین، بیضاوی، احکام القرآن ابوبکر رازی۔

## فلسفہ

ہدیہ سعیدیہ، شرح، ہدایۃ الحکمت از خیر آبادی، شرح اشاراتِ رازی وطوسی، شرح حکمۃ الاشراق شمس بازغہ، دروس الاولیہ فی العلوم الجدیدہ، ہیآت جدیدہ۔

## کلام اسرار الدین

رسالہ التوحید، معالم امام رازی، حجۃ اللہ البالغہ۔

اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی قرار پائی جس کا اجلاس شعبان ۱۳۲۶ھ میں قرار پایا لیکن چوں کہ عین اسی زمانہ میں ندوہ کی خاص ضرورت سے مجھ کو لکھنو واپس آنا پڑا اس لئے وہ اجلاس ملتوی ہوگیا۔ اس کے بعد میں ۲۳ جنوری ۱۹۰۹ء کو پھر حیدرآباد آگیا اور ایک کمیٹی میں نصاب مرتبہ پیش کیا گیا۔ اس کمیٹی میں مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت وافسر تعلیمات، شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی، مولوی انوار اللہ صاحب استاذ حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مددگار

ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، لیکن چوں کہ اس کمیٹی میں کچھ مراتب باقی رہ گئے تھے اس لئے ۷ افروری ۱۹۰۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا۔ جس کے پریذیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر روز یر عدالت تھے اور جس میں نواب عماد الملک بہادر اور ڈاکٹر سید سراج الحسن ناظم تعلیمات بھی بہ حیثیت رکن کے شریک تھے۔

دونوں کمیٹیوں میں آزادی سے ہر پہلو پر بحث ہوئی اور کسی قدر تغیر اور ترمیم کے ساتھ نصاب مرتبہ منظور کیا گیا۔

نواب عماد الملک بہادر کی رائے تھی کہ علوم عربیہ کے ساتھ انگریزی کی تعلیم نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کو نصاب سے خارج کر دینا چاہئے لیکن یہ جب ظاہر کیا گیا کہ علوم عربیہ میں بہت سی فضول کتابیں جو منطق و فلسفہ کی شامل تھیں، خارج کر دی گئی ہیں اس لئے کافی گنجائش ہو سکتی ہے تو نواب صاحب موصوف نے بھی اتفاق ظاہر کیا۔

ہم کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا کہ اس کمیٹی میں نہایت متقشف اور پرانے خیال کے علماء بھی شریک تھے، تاہم انگریزی کے داخل کرنے سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں ہندوستان کی بہ نسبت روشن خیالی کا اثر زیادہ ہے۔

نصاب کے طے پانے کے بعد اسی کے موافق دار العلوم میں جدید اسٹاف قائم ہوگا اس کے ساتھ ایک مجلس بطور سینٹ کے قائم ہوگی اور اسی کے لئے فیلوز منتخب ہوں گے۔ اسی طرح ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد قائم ہو جائے گی۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ اس وقت افسرانِ تعلیم نواب فخر الملک بہادر روز یر عدالت اور مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت اور سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات ہیں اس لئے ہر طرح پر امید ہے کہ یونیورسٹی عمدہ اور مستحکم اصول پر قائم ہوگی۔

یہ ہم نے بار بار کہا ہے کہ اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

(الندوہ ج ۶ نمبر ۲ مارچ ۱۹۱۹ء)

# تعلیم قدیم جدید

کیا ان میں سے کوئی غیر ضروری ہے؟ کیا ان دونوں میں تعارض ہے؟ کیا ان میں کسی اصلاح کی ضرورت ہے؟ دونوں مل کر کیوں کر کام کر سکتے ہیں؟

اگرچہ یہ سوالات قومی مسئلہ کے متعلق اہم اور ضروری سوالات ہیں لیکن قوم نے کبھی ان سوالات پر مستقل حیثیت سے بحث نہیں کی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دنیوی اور دینی درس گاہیں یا انجمنیں ملک میں قائم ہیں ان کو جو کامیابی اس وقت حاصل ہے وہ اس پر قانع تھیں، اس لئے ان مسائل کے حل کرنے کی ان کو ضرورت معلوم نہیں ہوئی، مثلاً اسلامی کالجوں میں سینکڑوں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں، ہر سال سینکڑوں ایم اے اور بی اے ہو کر نکلتے ہیں، سینکڑوں فارغ شدہ طلبہ نے معقول نوکریاں حاصل کیں، سینکڑوں وکالت کر رہے ہیں، سینکڑوں اپرنٹس اور امیدوار ہیں، ان باتوں کے ہوتے ان کو اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ قدیم تعلیم کی ضرورت اور اس کے نتائج اور ترمیم و اصلاح کا سودا مول لیں۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

اس کے مقابلہ میں عربی مدارس دیکھ رہے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ مساجد میں پھیلے ہوئے ہیں، ہزاروں مولوی تیار ہو گئے ہیں، ہر ہر ضلع میں عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں، ہر جگہ واعظوں کی مانگ ہے، ان باتوں کے ساتھ ان کو کیا غرض ہے کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت اٹھائیں۔

لیکن اب اس سکون میں کچھ جنبش پیدا ہو چلی ہے، کیوں کہ اب ہر گروہ جس قسم کی تعلیم

کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک میں وہی تعلیم پھیل جائے،اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں گروہوں میں تقابل، مسابقت اور محاسدہ پیدا ہو، چناں چہ ایسا ہوا، صرف یہ امتیاز باقی رہا کہ پست حوصلہ لوگوں نے اعلانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنوں کی برائی شروع کی اور مہذب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا۔

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں سے دونوں کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لئے مدد مل سکتی ہے لیکن واقعی اب اس کا وقت آگیا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک وسیع خاکہ تیار کردے، جس میں تمام درس گاہوں اور انجمنوں کی نسبت طے کردیا جائے، کہ کون کون ضروری ہیں؟ کس حد تک ضروری ہیں؟ اور مجوزہ نقشہ میں ہر ایک کی جگہ کہاں ہے تاکہ جو کام ہورہے ہیں سب مل کر ایک کام بن جائیں، اور ایک کام دوسرے کام میں خلل انداز نہ ہونے پائے اور نہ دو طرفہ کش مکش میں ہزاروں لاکھوں مسلمان یہ فیصلہ نہ کرسکیں گے کہ وہ کس رخ اور کدھر جائیں۔

اس غرض سے سوالات ذیل پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

علی گڑھ، دیوبند، ندوہ کے کیا حدود ہیں اور کون کون کام کس کے حدِ عمل میں چھوڑ دینے چاہئیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا اور اگر کسی کو ہو تو ہم کو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعتاً نفی کی صورت میں آئے گا لیکن ان کو ذرا غور سے کام لینا چاہئے اور پہلے سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم، قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے۔ لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے، کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے؟

تیسرا سوال یعنی یہ کہ دونوں طریقہ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ایک معرکہ کا سوال ہے نہ اس لئے کہ در حقیقت وہ ایسا ہے بلکہ اس لئے کہ دونوں فریق ایک مدت سے اسی حالت پر قائم ہیں اور چوں کہ دونوں اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کامیاب ہیں اس لئے ان کو اعلانیہ نظر آتا ہے کہ اصلاح کی ضرورت نہیں، تاہم جدید گروہ بہ آسانی اپنے خلاف نکتہ چینی سننے پر آمادہ ہو سکتا ہے اس لئے پہلے ہم ان ہی سے خطاب کرتے ہیں۔

اس قدر مسلم ہونے کے بعد کہ تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس ضرورت کی مقدار کیا ہے؟ اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ، افتاء کا کام لینا نہیں ہے، بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بقدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں۔ اس کے لئے صرف ایک مختصر اور جامع ومانع سلسلہ کتب دینیات کی ضرورت ہے، جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج کلاسوں تک کے قابل کتابیں ہوں۔ اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں۔

عقائد فقہ اور تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ کے متعلق مصر میں عمدہ کتابیں تیار ہو گئی ہیں ان کا ترجمہ کافی ہوگا، عقائد کی نسبت البتہ مشکل ہے کیوں کہ ہندوستان میں جو کتابیں آج کل لکھی گئی ہیں ان پر ابھی تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہو سکتا اور مصر وغیرہ کی جدید تصانیف ناکافی اور ناقابل درس ہیں۔ اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کلاسوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات اور خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہو سکتا، بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے، دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے، مذہبی علماء بیش قرار مشاہرہ کے مقرر کیے جائیں، وعظ کے موقعوں پر اکثر ارکان کالج تا امکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بناء پر طلبہ کی خاص توقیر اور تحسین کی جائے اور سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبہ کو گراں بہا وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کی بعد مذہبی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی جائے۔

یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں، اس لئے ہم ان سے سوالات ذیل کے جواب چاہتے ہیں۔

(۱) یورپ کے مصنفین، مذہب پر جو حملہ کر رہے ہیں، اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں ؟

(۲) اگر علماء خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خوان مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے ؟

(۳) مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے ؟

(۴) علماء جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے جواب کیوں کر دے سکیں گے ؟

(۵) کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں دیکھا تھا، اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیئے تھے ؟

(۶) اگر اس وقت اس زمانے کے فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں ہے ؟

ان سوالات کا اگرچہ خود بخود یہ جواب ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے لیکن بایں ہمہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ان علماء کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں خیال کرتے، اصلاح پر مجبور کریں، اس کی وجہ ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے، مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکام اسلام کا

پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے جس کے لئے سینکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے، اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں، جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں۔ اس لئے تقسیم عمل کی رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں۔ اور ہر طرح پر ان کی تائید واعانت اور احترام کرنا چاہیئے۔ اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بے کار بتاتے ہیں وہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہے صرف ہم کو ان کا استعمال صحیح طور سے کرنا چاہیئے۔

صحابہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے جو لاکھوں روپے کے مالک تھے، اور حضرت ابوذرؓ بھی تھے جن کا قول تھا کہ صاحب المال کافر (جس کے پاس روپیہ ہو وہ کافر ہے) بایں ہمہ اسلام کو دونوں کی ذات سے نفع پہنچتا تھا، کیوں کہ دونوں سے مختلف کام لئے جاتے تھے البتہ اس قسم کے قدیم مدرسوں میں اس قسم کی تربیت پر اصرار کرنا چاہیئے جس سے تعصب، سخت دلی، تنگ خیالی نہ پیدا ہو جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پرانے مولوی اور جدید تعلیم یافتہ ایک صحبت میں بسر نہیں کر سکتے اور ہر موقع پر دونوں دو حریف کی صورت میں نظر آتے ہیں، ان لوگوں کو دربار نبوی ﷺ کا نمونہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جہاں کافروں اور منافقوں تک کو بار ملتا تھا اور ان کی بھی خاطر داری کی جاتی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے، تو ان کو حکم ہوا کہ قولا له قولا لینا یعنی فرعون سے نرمی سے بات کرنا؟

دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزاء ہیں، اس لئے دونوں کو آپس میں دست وبازو ہو کر کام کرنا چاہیئے۔

لیکن علماء کے جس گروہ نے جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا ہے اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح واضافہ کرنا چاہتے ہیں وہ ان اصول کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں جو ندوہ نے اختیار کیا ہے، اور جو عملی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اگر قوم ان واقعات کو پیش نظر رکھے تو آج کل قوم کی کوششوں کی پراگندگی کا جو اعتراض ہے وہ اٹھ جائے اور لوگ اطمینان اور سکون اور بے تعصبی کے ساتھ اپنی اپنی حدود میں محدود رہ کر اپنے کاموں کو انجام دیں۔

(الندوہ ج، نمبر ۹، ستمبر ۱۹۱۰ء)

# دارالعلوم ندوہ کی ایک اور خصوصیت

ہندوستان میں آج جس قدر عربی مدارس موجود ہیں اور جن کی تعداد سینکڑوں ہزاروں تک پہنچ گئی ہے، ان میں جو طلبہ تعلیم پاتے ہیں صرف وہ ہیں جن کو مدرسہ کی طرف سے کھانا، کپڑا ملتا ہے، یا مدرسہ کی سفارش پر دوسری جگہوں سے کھانا مقرر ہو جاتا ہے، اس واقعہ سے متعدد نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) عربی کی تعلیم صرف ان لوگوں میں محدود رہ گئی ہے جو افلاس کی وجہ سے اور کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

(۲) عربی تعلیم ایسی بے کار شے سمجھ لی گئی ہے کہ بغیر اس قسم کی ترغیب دینے کے کوئی شخص اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔

(۳) ان مدارس میں اس قسم کا انتظام نہیں کہ ذی وجاہت لوگ اپنی اولاد کو وہاں بھیجنا گوارہ کریں اور اس لئے امراء کا گروہ عربی اور مذہبی تعلیم سے قطعاً محروم ہو جاتا ہے۔

(۴) چوں کہ صرف غریب لوگ عربی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کی تمام جماعت میں ایک شخص بھی خوش حال اور صاحب جاہ و دولت نہیں ہوتا، اس لئے اس گروہ کے خیالات اور ہمتیں پستی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑا اولوالعزم شخص اس گروہ میں نہیں پیدا ہوتا۔

لیکن دارالعلوم ندوہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس میں دو ثلث کے قریب وہ طلبہ ہیں جو اپنے مصارف کے آپ متکفل ہیں اور اگر دارالاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) میں گنجائش ہوتی، تو اس قسم کے طلبہ کی تعداد اور بہت زیادہ ہو جاتی۔

اس واقعہ سے متعدد امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) یہاں کی عربی تعلیم میں کچھ ایسی خصوصیت ہے کہ دولت مند اور خوش حال لوگ بھی

اس کو بے کار نہیں سمجھتے۔

(۲) یہاں کے دارالاقامہ میں ذی وجاہت لوگ بھی اپنی اولاد کا بھیجنا گوارہ کرتے ہیں۔

(۳) دارالعلوم سے بہت بڑا فائدہ یہ متوقع ہے کہ دولت مند گروہ میں بھی عربی اور مذہبی تعلیم بقدر ضرورت رواج پائے۔

اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک یہی امر ندوہ کے برے ہونے کا بڑا ثبوت ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ لوگوں کو ضروری تعلیم (یعنی انگریزی) سے روک کر ایک بے کار چیز میں پھنساتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی تعلیم اگر صحیح اصول پر ہو تو وہ انگریزی تعلیم کی سدراہ نہیں بلکہ اور اس کے لئے راستہ صاف کرنے والی ہوگی۔

آج تیس برس سے انگریزی تعلیم کا غل برپا ہے، باوجود اس کے ایک نہایت قلیل تعداد نے اس طرف توجہ کی ہے لیکن اگر علماء انگریزی تعلیم کے طرف داربن جائیں تو دفعتاً قوم کی قوم کا رخ پھر جائے، دارالعلوم ندوہ کا مقصد اسی قسم کے علماء تیار کرنا ہے جو ایک طرف عربی اور مذہبی تعلیم کی حفاظت میں کوشش کریں اور دوسری طرف دنیوی تعلیم کی طرف بھی لوگوں کو رغبت دلائیں۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام وسنداں باختن

(الندوہ، نمبر ۱۰ جلد ۳)

شوال ۱۳۲۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۰۶ء

# ندوہ اور نصابِ تعلیم

ندوہ کے قائم ہونے کی سب سے بڑی ضرورت جو ظاہر کی گئی اور واقعی تھی بھی وہ نصابِ تعلیم کی اصلاح تھی، ندوہ کے مقاصد میں یہ اہم المقاصد تھا اور آج تک ندوہ کے جتنے اجلاس ہوئے اس مقصد کو ہمیشہ نہایت بلند آہنگی سے بیان کیا گیا لیکن یہ امر بظاہر نہایت تعجب انگیز ہے کہ پار سال تک جو نصاب جاری تھا وہ قریباً وہی قدیم نصاب تھا جو دیوبند وغیرہ میں جاری ہے۔

اس کی وجہ بہت بڑی یہ ہے کہ اصلاحِ نصاب کا خیال صرف چند روشن خیال علماء کے دل میں پیدا ہوا ہے، باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں، اور چوں کہ فیصلہ عموماً کثرت رائے پر ہوتا ہے، اس لئے ان ہی بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے وہ جدید نصاب (جس میں قدما کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں، مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی ہیں ان کے بیسیوں حاشیے موجود ہیں، اس لئے ان کا پڑھالینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے لیکن جدید نصاب میں ان کے بجائے دلائل الاعجاز عبدالقاہر جرجانی رکھی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ فن بلاغت کی جان ہے اور مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چین ہیں لیکن نہ ہمارے مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا نہ اس پر شرحیں اور حاشیے موجود ہیں، اس لئے یہ لوگ اس کے پڑھانے سے عاجز ہیں اور چوں کہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے۔ اس لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ بہر حال سال حال میں یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے اجراء کے ساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفاء دیا، اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شائع کئے جارہے ہیں کہ جدید نصاب درس

کے قابل نہیں، بے شبہہ اس نئے راستہ کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں گی، لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے، تو اس کو سرے سے اصلاحِ نصاب کا نام لینا نہ چاہیئے، یہ سخت بد دیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاحِ نصاب کا غل مچایا جائے، اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔

ہم نے اسی خیال سے اصلاحِ نصاب کے متعلق، ایک سلسلہ وار مضمون شروع کیا ہے جس کا پہلا نمبر آج کے پرچے میں درج ہے۔

## نصابِ تعلیم

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے کہ ہندوستان میں ہمارے علمی تنزل کا اصل سبب کیا ہے؟ اس کے مختلف جواب دیئے جاتے ہیں۔

عام جواب تو یہ ہے کہ تقدیر، لیکن یہ جواب صرف اسی سوال کا نہیں بلکہ دنیا کے تمام سوالوں کا جواب ہے، اور ہم کو ایسے جواب کی ضرورت ہے جس کو اس سوال سے بھی کوئی خاص خصوصیت ہو، بعضوں کا خیال ہے کہ انقلابِ سلطنت، لیکن اسلامی سلطنتوں کی نسبت کیا کہا جائے گا، خاص قسطنطنیہ میں کم سے کم بیس ہزار طلبہ علوم عربیہ کی تعلیم پاتے ہیں لیکن مدتوں سے ایک شخص بھی صاحبِ کمال نہیں پیدا ہوا اور سچ یہ ہے کہ مصر و شام و روم کا علمی معیار ہندوستان سے بھی گھٹا ہوا ہے، اس سوال کا صحیح جواب صرف یہ ہے کہ "نصابِ تعلیم کا نقص" اس کی تفصیل آگے آئے گی، لیکن تفصیل سے پہلے بعض ظاہر الورود اعتراضات کا ذکر کرنا اور ان کا جواب دینا ضرور ہے۔

اس جواب پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسی نصاب نے عبد العلی، بحر العلوم، حمد اللہ محبّ اللہ بہاری، قاضی مبارک، شاہ ولی اللہ، ملا حسن جیسے اشخاص پیدا کئے تھے، اس لئے اگر نصابِ تعلیم کا قصور ہوتا تو اس سے اس درجہ کے کامل الفن کیوں کر پیدا ہوتے۔

اس اعتراض کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ جو نصاب اب ہے وہ ان بزرگوں کے زمانہ میں کہاں تھا، شرح سلم، حمد اللہ، شرح مسلم، ملا حسن، حاشیہ بحر العلوم، قاضی غلام یحیٰ، ہدیہ سعیدیہ، وغیرہ یہ کتابیں اس زمانہ میں کہاں تھیں، لیکن اس اعتراض کا حقیقی جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی خرابی کا اثر عموماً ابتداء میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر پہلے پیدا ہوتا ہے پھر آہستہ

آہستہ بڑھتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر علانیہ ظاہر ہو جاتا ہے، موجودہ نصاب کی خرابی کا اثر پہلے ہی دن شروع ہو گیا تھا جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا عین اسی دن سے علم کا تنزل شروع ہو گیا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے، یعنی جس درجہ کے علماء اس وقت تھے ان کے شاگردان سے کم درجہ کے نکلے، شاگرد کے شاگردان سے بھی کم، پھر ان سے بھی کم، یہاں تک کہ یہ زمانہ آگیا جس میں کمال کا نام و نشان بھی نہ رہا۔

پہلے طبقوں کا تنزل ہم کو اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ گو وہ لوگ علم و فضل میں اگلوں سے کم تھے، تاہم آج کی حالت کے لحاظ سے نہایت بلند رتبہ تھے، لیکن جب تنزل کی رفتار روز بروز تیز ہوتی گئی، اور اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک بھی صاحبِ فن نظر نہیں آتا، تو کون شبہہ کر سکتا ہے کہ یہ نتیجہ اس تخم کا ثمر ہے، جو سو برس پہلے بویا گیا تھا، ہم اس دعویٰ کے ثابت کرنے کے لئے امارات و قرائن پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ قطعی طریقہ سے ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ نصابِ تعلیم، نہایت ناقص اور ابتر ہے سب سے پہلے ہم کو چند مقدمات اصولِ موضوعہ کے طور پر ذہن نشین کر لینے چاہئیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے۔

۲۔ ہر فن کے حاصل کرنے کا یہ عمدہ طریقہ ہے کہ اس کے مسائل کا منفرداً اور بہ استقلال حاصل کیا جائے، تاکہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے، بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائے، تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہو گی۔

۳۔ متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں الاقدم فالا قدم کا خیال ضرور ہے یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں، ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے، جو مقصود بالعرض ہیں، ان میں کم، اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہیئے، یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں اور زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔

۴۔ ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو۔

مذکورۂ بالا اصول کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اب ان اصول کی بناء پر ہم موجودہ نصاب سے بحث کرتے ہیں۔

ا۔ موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے، یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بے کار ہو جائیں، مثلاً شمسیہ میں یہ عبارت تھی کہ العلم اماتصور فقط وھوالخ قطبی میں اس کے متعلق ایک بڑی بحث اس بناء پر چھیڑ دی گئی کہ ھو کی ضمیر تصور کی طرف پھرتی ہے، یا تصور فقط کی طرف، اس بحث میں قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہو گئے لیکن اگر مصنف ضمیر کے بجائے خود مرجع کو ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثیں رائیگاں جاتیں، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے مصنف کے ایک خالص لفظ اور اس کے منشاء پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

نصاب موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے، یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں، ان کے قریب بلکہ ان سے زیادہ یہ فضول لفظی مسائل ہیں۔

اس موقع پر یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قدماء کے زمانہ میں شرح اور حاشیہ کا طریقہ نہ تھا، بو علی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا، لیکن اس وقت تک شرح میں بھی مصنف کی خاص عبارت اور الفاظ سے بحث نہیں کرتے تھے، بلکہ اصل مسئلہ کی توضیح اور تشریح کرتے تھے، اس کے بعد یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چنداں غرض نہیں رہے، بلکہ تمام تر توجہ اس پر صرف ہوتی تھی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے، کس لفظ سے کیا خاص فائدہ ہے؟، کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے؟ مصنف کی عبارت کا اوروں نے جو مطلب سمجھا ہے فلاں جگہ مصنف نے دفع دخل مقدر کیا ہے، مصنف کی عبارت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جس وقت سے یہ طریقہ جاری ہوا وہ علمی تنزل کا پہلا دن تھا۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں ایک مضمون لکھا ہے جس کی سرخی یہ ہے۔فی ان کثرۃالتالیف فی العلوم عایقة عن التحصیل۔اس مضمون کا ماحصل یہی ہے، چنانچہ وہ مثلاً فن فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لکھ کر لکھتے ہیں۔

”وھی کلھا متکرۃ والمعنی واحدو المتعلم مطالب باستحضا جمیعھا تمیز مابینھا والعمر ینقضی فی واحد منھا ولو اقتصرالمعلمون بالمتعلمین علی المسائل المذھبية فقد لكان الام ربدون ذلك بكثير وكان التعليم سهلاً۔“

"یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں اور مطلب ایک ہے اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے، اور عمر ایک ہی کے محفوظ رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے، اس لئے اگر مدرسین صرف مسائل مذہبی پر اکتفا کرتے تو تعلیم نہایت سہل ہوتی اور بہت کم زمانہ صرف ہوتا۔"

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے زمانہ میں بھی وہی حالت تھی جو اب ہے۔ یعنی باوجود اس طریقہ کی خرابی کے لوگ اس کو ترک نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ طریقہ لوگوں کے لئے بجائے طبیعت ثانیہ کے ہو گیا تھا، چناں چہ علامہ موصوف عبارتِ مذکورہ کے بعد لکھتے ہیں :

"ولكنه داء لايرتفع لاستقرار العوايد عليه نصارت كالطبيعة۔"

"لیکن یہ ایک مرض بن گیا ہے جو رفع نہیں ہو سکتا، کیوں کہ معمول عام ہو جانے کی وجہ سے وہ بجائے طبیعت کے ہو گیا ہے۔"

۲۔ سب سے بڑی خرابی نصابِ موجودہ کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں داخل ہیں، جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم کا ذہن پریشان ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک منطق کی کتابیں ہیں لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور مابعد الطبیعہ کے ہیں، مثلاً علم باری جعل، بسیط و جعل مرکب، کلی طبیعی کا وجود فی الخارج، وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ۔

ملا جلال فن منطق میں بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن جس قدر درس میں ہے اس کا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح میں ہے، جو صرف اس خاص عبارت سے متعلق ہے، جو مصنف نے حمد و نعت میں لکھی ہے، ان کتابوں کے درس کا جو زمانہ رکھا گیا ہے، اس وقت تک میبذی کے سوا فلسفہ کی اور کوئی کتاب پڑھائی نہیں جاتی، اس لئے الٰہیات کے مباحث طالب العلم کو بالکل اجنبی اور سخت نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ ان ہی کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہی جو مثلاً نحو صرف و منطق مقصود بالعرض ہیں لیکن کتبِ درسیہ زیادہ تر ان ہی کے متعلق ہیں منطق کا مقصود یہ ہے

کہ فلسفہ میں کام آئے لیکن منطق کی درسی کتابیں فلسفہ کے اعتبار سے اضعافاً مضاعفہ ہیں، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد، ملا جلال، حمد اللہ، قاضی مبارک یہ انبار کا انبار منطق میں ہے اور درس میں داخل ہے لیکن فلسفہ کی صرف تین کتابیں درس میں داخل ہیں جن میں سے میبذی پوری پڑھائی جاتی ہے۔ باقی کے جستہ جستہ مقامات۔

اسی طرح نحو و صرف میں برسوں اوقات صرف کی جاتی ہے، اور جو اس کی غرض و غایت ہے یعنی علم ادب اس میں بہت کم زمانہ صرف ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سینکڑوں ہزاروں طلبہ میں سے ایک بھی صاحب فن نہیں پیدا ہوتا۔

علامہ ابن خلدون نے اس خرابی پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے چناں چہ لکھتے ہیں۔

"واما العلوم التی ھی الة لغیرھا مثل العربیة والمنطق و امثالھا فلاینبعی ان ینظرفیھا الا من حیث ھی الة لذٰلك الغیر فقط ولا یوسع فیھا الکلام ولا تفرع المسائل لان ذٰلك مخرج لھا عن المقصود........ فیکون الاشتغال بھذه العلوم الا لیة تضیعاً للعمر وشغلا بما لایعنی وھذا کمال فعل المتاخرون فی صناعة النحو وصناعة المنطق واصول الفقه لانھما اوسعواد ایرة الکلام فیھا لھی من نوع اللغو، وعلی ایضاً مضرة بالمتعلمین علیٰ لاطلاق فاذاقطعوا العمر فی تحصیل الوسائل نمتی یظفرون بالمقاصد۔"

"باقی وہ علوم جو دوسرے علموں کا آلہ ہیں، مثلاً عربیت اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ فلاں علم کا آلہ ہیں، ان میں نہ کلام کو وسعت دینی چاہیئے نہ مائل کی تفریع کرنی چاہیئے کیوں کہ ایسا کرنا اس کو اصل مقصد سے خارج کر دیتا ہے۔ تو ان علوم آلیہ میں مشغول ہونا عمر کا ضائع کرنا ہے، اور لادینی کام میں مشغول ہونا ہے، جیساکہ متاخرین نے نحو اور منطق اور اصول فقہ کے متعلق کیا یعنی کلام کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ یہ تو ایک قسم کی لغویت ہے، اور وہ طالب العلموں کو بھی عموماً مضر ہے۔ کیوں کہ جب وہ مسائل میں عمر ضائع کردیں گے تو اصل مقصد تک کب پہنچیں گے؟"

(الندوہ ج، نمبر ۲ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ)

## (تعلیمی)

# ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے؟

ندوۃ العلماء کا غلغلہ جس زور و شور سے اٹھا اور پھر جس افسردگی سے پست ہو گیا، دونوں باتیں بظاہر تعجب انگیز تھیں لیکن حقیقت میں ایک بھی تعجب خیز نہیں، ابتدائی زور شور کے ضروری اسباب تھے، قوم ایک مدت سے دیکھ رہی تھی کہ قومی خیالات و حالات میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے، لیکن جن لوگوں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا چوں کہ وہ رہنمایانِ مذہبی کے دائرہ سے نہ تھے، اس لئے ان کے اثر کا دائرہ بھی محدود رہا، چناں چہ تمام ہائے پکار، شور غل کے بعد بھی قوم کے جو افراد تعلیم جدید کی طرف متوجہ ہوئے وہ صرف نوکری پیشہ لوگ تھے، جن کی معاش کا تعلیم انگریزی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، ان کا اس طرف متوجہ ہونا روشن خیالی یا مذاقِ علمی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ وہ یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔

اس حالت میں پھر علماء کے حلقہ سے جب اصلاح کی آواز بلند ہوئی تو دفعتہً تمام ملک سے جو پہلے سے ہمہ تن انتظار تھا لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ علماء کا حلقہ اگرچہ ابتداء میں مختصر تھا لیکن تمام ملک نے جس خلوص اور جوش سے ان کی صدا پر خیر مقدم کیا اسی نے اس دائرہ کو بہت وسیع کر دیا۔ سینکڑوں مولوی اور عالم جو ندوہ کی حقیقت کو ذرہ برابر بھی نہ سمجھتے تھے، یہ دیکھ کر کہ مسجد نشینوں کی ریاست قائم ہوئی جاتی ہے، ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور دو ہی تین سال کے اندر اندر اس سرے سے اس سرے تک ہر طرف ندوہ ہی ندوہ کی صدا بلند تھی، ندوہ کے سالانہ جلسوں میں مولویوں کی جس قدر تعداد جمع ہوئی حکومتِ اسلام کے زمانہ میں بھی کسی مجمع میں دستارِ فضیلت کے اس قدر شملے یکجا نظر نہ آئے ہوں گے۔

ایشیائی قوموں کا جوش اور افسردگی دونوں فوری اور نا قابلِ اعتبار ہوتی ہیں جن لوگوں نے ندوہ سے بڑی بڑی امیدوں کی لو لگائی تھی، دو چار برس کے بعد یہ دیکھ کر بیٹھ رہے کہ ندوہ سے

نہ کوئی مذہبی۔ مقارت چین وجاپان گئی نہ قوم میں امام غزالی اور رازی پیدا ہوئے۔ نہ کسی عالم نے یورپ کے علوم وفنون کے طلسم کی پردہ دری کی، قوم کے جوش اور اشتیاق میں کمی ہوئی تو مولوی خود بخود اس طرح افسردہ ہوتے گئے جس طرح مرثیہ خواں، آہ وبکا کے غل نہ ہونے سے ہمت ہار جاتا ہے، وہ گروہ جو تقلید پرستی یا خودغرضی کی وجہ سے پہلے ہی سے مخالف تھا، اس کو اور بھی شماتت کا موقع ہاتھ آیا، اب اقل قلیل صرف چند اشخاص رہ گئے جو ندوہ کے اصلی عناصر تھے۔

نکتہ سنج پہلے ہی دن سے سمجھتے تھے کہ ندوہ کے جو کام ہیں وہ پچھلی نسل سے جو قدیم زمانہ کی تربیت یافتہ ہے ہرگز انجام پذیر نہیں ہوسکتے، ندوہ کے کیا کیا کام تھے۔

(۱) علماء میں ایثارِ نفس کا پیدا کرنا۔

(۲) انگریزی داں علماء پیدا کرنا۔

(۳) مذاقِ حال کے موافق علماء کے گروہ میں مقررین اور اربابِ قلم کا پیدا کرنا۔

(۴) ایسے علماء کا پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کرسکیں۔

اب غور کرو کہ ہندوستان کی تمام درس گاہوں میں تربیت کا جو طریقہ ہے، یعنی دونوں وقت کسی کے دروازہ پر جاکر فقیروں کی طرح کھانا مانگ لانا، یا بڑی معراج ہوئی تو نان بائی کی دوکان پر جاکر کھا آنا، اس سے کسی قسم کی ہمت، غیرت یا ایثار نفس پیدا ہوسکتا ہے، اس طریقہ کے تربیت یافتہ، صدقہ، نذر اور خیرات کے سوا اور کسی طریقہ پر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا ان لوگوں سے کسی قسم کی بلند خیالی کی توقع ہوسکتی ہے؟

تربیت سے قطع نظر کرکے تعلیم کو لو، تعلیم میں جب تک یورپ کی کسی زبان کی تعلیم لازمی نہ قرار دی جائے اور زمانہ موجودہ کے علوم وفنون نہ پڑھائے جائیں، اس وقت تک مذاقِ حال کے موافق، کیوں کر اربابِ قلم پیدا ہوسکتے ہیں؟

اس بناء پر ندوہ کے اصلی بانیوں نے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف دارالعلوم (یعنی مدرسہ مجوزہ ندوہ) پر اپنی امیدوں کا مدار رکھا، دارالعلوم میں بھی سخت دشواریاں تھیں، علماء نصاب قدیم میں کسی قسم کی اصلاح منظور نہیں کرتے تھے، انگریزی زبان کے جاری کرنے پر بعض معزز ارکانِ ندوہ نے اس زور کی مخالفت کی کہ کئی برس تک یہ مسئلہ مردہ ہوکر پڑا رہا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی اور وہ اب بھی بہت کچھ باقی ہے کہ مدرسین جو ندوہ کو مل سکتے

تھے، اسی قدیم لکیر کے فقیر تھے، اس لئے نئے راستہ پر ان سے قدم نہیں رکھا جاتا، اور زور لگا کر چلائے جاتے ہیں تو پاؤں الٹی طرف پڑتا ہے۔

غیر ممالک میں اشاعت اسلام کا کام، لوگوں نے اس قدر آسان سمجھا تھا کہ بہت سے لوگ صرف اس وجہ سے ندوہ سے الگ ہو گئے کہ اس نے اب تک اس کام کو کیوں انجام نہیں دیا، اس الزام سے فائدہ اٹھا کر بعض کم مایہ لوگوں نے خود اس کام کا بیڑا اٹھایا اور تبلیغ اسلام و اشاعتِ اسلام کے نام سے فنڈ کھولے، قومی دنیا بہت وسیع ہے، ایسے احمق بھی بہت نکل آتے ہیں جو بے سمجھے، بوجھے ساتھ ہو لیتے ہیں، غرض چندہ جمع ہونا شروع ہوا، اور وہ تیاریاں ہونے لگیں کہ جاپان وامریکا کا مسلمان ہونا صبح شام کی بات رہ گئی، سوء اتفاق سے اسی اثناء میں اپان کی مذہبی کانفرنس کا غل اٹھا اور خود شاہ جاپان کی طرف سے تمام ممالک اسلامیہ میں اس مضمون کے اعلانات شائع ہوئے کہ علمائے اسلام اس کانفرنس میں قدم رنجہ فرمائیں، اور اسلام کی حقیقت سمجھائیں، اس صدا کے ساتھ تمام ہندوستان میں سناٹا تھا۔ ہندوستان کو تو اپنی طرف سے پہلے بھی مایوسی تھی لیکن مصر وشام وایران دور کی ڈھول تھے، اسی لئے سب کی نگاہیں اس طرف اٹھیں، مصر کے عربی اخبارات میں متعدد علما کے نام چھپے، جو معقول و منقول کے جامع تھے، اور جن کی نسبت مشتہر کیا گیا کہ وہ جاپان جاچکے یا عنقریب جانے والے ہیں۔ لطف یہ کہ ان علماء میں ہندوستان کے بھی متعدد علماء کا نام تھا جن کو اگرچہ ہم نہیں جانتے لیکن خوشی کی بات ہے کہ مصر وشام وروم جانتا ہے۔ ان میں ایک انگریزی خواں صاحب دہلی کے بھی تھے جن کو مصری اخبارات فیلسوف اور حکیم بتاتے ہیں، ترکی اور مصر سے جن لوگوں کا انتخاب ہوا ہم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان میں ایک شخص بھی تفسیر و حدیث سے باخبر نہیں، کیوں کہ وہاں بھی یہی مصیبت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ علوم دینیہ سے ناواقف ہیں، اور قدیم تعلیم یافتہ مذاقِ حال سے آشنا نہیں۔ تاہم چوں کہ ان کی زبان مادری عربی ہے، اس لئے قرآن وحدیث کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں، اور چوں کہ زمانہ حال کے خیالات سے واقف ہیں، اس لئے اس خدمت کو علماء کی بہ نسبت زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے ہیں، افسوس!

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

بہر حال مجبوری کے لئے چاہے جو کچھ کیا جائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جاپان کی فتح کرنے کے لئے سپہ سالار ایک طرف ہمارے ہاں سپاہی بھی تیار نہیں، بھولے بھالے مسلمان جو یورپ میں تبلیغ کے نام کا غل مچاتے ہیں، ان کی بھی بعینہ یہ حالت ہے کہ ؂

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ندوہ نے نصابِ تعلیم میں ضروری اصلاح کی، قدیم نصاب بہت کچھ بدل گیا، منطق و فلسفہ کی بے کار کتابیں نکل گئیں، تفسیر اور علم ادب کا حصہ زیادہ کر دیا گیا، انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہو گئی، یہ تبدیلیاں کئی برس کے بحث و مباحثہ اور ردو کد کے بعد حال میں عمل میں آئیں اور ابھی دس بارہ برس میں ان کے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بے شبہہ ندوہ کو جو کچھ کرنا چاہیئے اس میں سے اس نے ابھی من میں چھٹانک بھر بھی نہیں کیا، لیکن جب یہ خیال کیا جائے کہ خود اسلامی سلطنتوں میں جہاں اسلام کی شاہنشاہی قائم ہے، اس قسم کی کوشش کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، تو جو کچھ اب تک ندوہ نے کیا ہے، اس کو کسی طرح نگاہِ حقارت سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

ابھی ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ منزل تک ہم پہنچ گئے یا نہیں، بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم جس راستہ پر چل رہے ہیں وہ منزل تک جاتا ہے یا نہیں، اور یہ کہ ہم نے اس راستہ کو کچھ طے بھی کیا ہے یا نہیں۔

رہبر واں راختگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست وہم خود منزل ست

(الندوہ ج ۳ نمبر ۸)

ماہ ستمبر ۱۹۰۶ء مطابق شعبان ۱۳۲۴ھ

# ندوۃ العلماء کا نیا دور اور اس کا جلسۂ سالانہ

## (بنارس میں)

ندوۃ العلماء پر اس تھوڑی سی مدت میں تین دور گزرے ہیں، ایک اس کا آغاز جو اس زور شور کا تھا، جس کے غلغلہ سے دفعتہً تمام ہندوستان گونج اٹھا، دوسرا انڈل لبجز (عہدِ ظلمت) یہ دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب مولوی محمد علی صاحب (سکریٹری ندوۃ العلماء) اپنے ضعف و ناتوانی کی وجہ سے ندوہ کے خدمات سے علیحدہ ہونے لگے اور یہاں تک کہ نوبت پہنچی کہ باوجود عام اصرار کے اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔

تیسرا دور ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتا ہے، جب کہ ارکان کو یہ حالت دیکھ کر سخت بے چینی پیدا ہوئی، معتمد دارالعلوم نے ترکِ تعلقات کر کے خود ندوہ میں سکونت اختیار کی، دفتر شاہ جہاں پور سے اٹھ آیا، مصارف جو آمدنی سے بہت زیادہ تھے، گھٹا کر مداخل کے قریب قریب کر لئے گئے، نصاب مجوزہ جس پر اب تک عمل نہیں کیا گیا تھا، جاری کر دیا گیا، انگریزی زبان بطور سیکنڈ لینگویج کے لازمی کر دی گئی، مقامی ارکان میں مولوی محمد نسیم صاحب وکیل اور مولوی ظہور احمد صاحب وکیل کا اضافہ ہوا، شملہ اور امرت سر کو ڈیپوٹیشن گیا، اور کامیاب آیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جناب معلی القاب سرکار عالیہ ریاست بھوپال نے سرپرستی فرما کر چھ سو روپیہ سالانہ کی مستقل رقم مقرر کر دی۔

ان حالات سے وہ عام افسردگی جو تمام ملک میں پیدا ہو گئی تھی کسی قدر کم ہونی شروع ہوئی، آس پاس کے مقامات کو ندوہ کی دوبارہ زندگی کا کچھ احساس ہونے لگا، اور اس کی طرف امید کی نگاہیں اٹھنے لگیں، یہاں تک کہ گورکھ پور اور بنارس میں جلسہ سالانہ کی تحریک شروع ہوئی، اور بالآخر قرعہ فال بنارس کے نام پر نکلا، جو ایک مشہور تاریخی مقام ہے، بنارس کی مقامی کمیٹی کے صدر انجمن مولوی محمد عمر صاحب وکیل اور سکریٹری مولوی مقبول عالم

صاحب قرار پائے ہیں۔ اول الذکر صاحب ندوہ کے ارکان انتظامی میں ہیں اور مولوی مقبول عالم صاحب ایک نہایت نیک طینت، اور دین دار آدمی ہیں، اور جس سرگرمی اور ذوق سے وہ جلسہ کی تیاریاں کر رہے ہیں اس سے بڑی بڑی امیدیں پائی جاتی ہیں۔

اس جلسہ میں جو خاص بات اور تمام جلسوں سے مزید ہوگی وہ یہ ہے کہ ندوہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کیا جائے گا۔ ندوہ کی تعلیم کے جو انتہائی مقاصد ہیں، ان کے ظہور کا تو وقت ابھی نہیں آیا اس کے لئے کم از کم ابھی آٹھ سال درکار ہیں، لیکن اس جلسہ میں اس بات کا تجربہ ہو سکے گا کہ ندوہ کی تعلیم کو اور تمام مدارس پر کیا ترجیح ہے، ندوہ کے طلبہ عام مجالس میں علمی اور اخلاقی مضامین پر عمدگی سے تقریر کر سکتے ہیں، فلسفہ جدید سے ان کو کسی حد تک واقفیت حاصل ہے، علوم قدیمہ و جدیدہ کا وہ کچھ نہ کچھ موازنہ کر سکتے ہیں، ان میں عموماً وسعتِ نظر اور روشن خیالی پائی جاتی ہے، عربی زبان میں وہ مستعدانہ طور پر مضمون نگاری کر سکتے ہیں۔

(الندوہ ۱۹۰٦ء)

# مصر کی یونیورسٹی

ہمارے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مصر کی قومی یونیورسٹی جس کا نام جامع مصریہ ہے اس کو قائم ہوئے صرف ایک سال کی مدت ہوئی، اتنے تھوڑے سے زمانہ میں اس نے نہایت ترقی کی، اور اس کی ترقی کی رفتار روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یورپ کی سلطنتوں نے اس کی تائید و اعانت پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ چناں چہ اٹلی نے اطلاع دی ہے کہ کیمسٹری کا جو کارخانہ یونیورسٹی میں قائم کیا جائے گا اس کے تمام آلات اور سامان اٹلی کی سلطنت ہدیۃً ارسال کرے گی، حال میں احمد توفیق راغب نے ساڑھے سات ہزار روپے یونیورسٹی فنڈ میں عنایت کئے ہیں۔

یونیورسٹی کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے یہاں کے طلبہ کو خاص خاص علوم وفنون کی تکمیل کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجتے ہیں، اس سے پہلے ایک جماعت جاچکی ہے، اور اب دوسری جماعت عنقریب روانہ ہوگی، قاعدہ یہ ہے کہ جو طلبہ اس غرض کے لئے تیار ہوتے ہیں ان کا مختلف علوم وفنون میں ایک خاص امتحان لیا جاتا ہے۔ چناں چہ علم ادب کے چند سوالات ہم اس غرض سے المؤید سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے علماء اندازہ کر سکیں کہ اب علم ادب پر کن حیثیتوں سے نگاہ ڈالی جاتی ہے اور فن ادب کے کمال کے لئے کس قسم کی معلومات ضروری ہیں۔

(۱) سبعہ معلقہ کے ہر قصیدہ میں جو شعر سب سے اچھا ہے اس کو لکھو اور اس کی ترجیح کے وجوہ بتاؤ۔ ہر قصیدہ کا موضوع کیا ہے اور اس سے اہلِ عرب کے کن اخلاق اور عادات کا ثبوت ہوتا ہے۔

(۲) بتاؤ کہ ایران اور رومہ کی انشاء پردازی کا اثر عرب کی زبان پر کیا پڑا۔ یہ اثر کن لوگوں نے پیدا کیا، مثالوں اور سندوں سے اس کا ثبوت دو۔

(۳) بصرہ اور کوفہ کی حالت اس حیثیت سے لکھو کہ وہ علوم عربیت کے تربیت گاہ تھے۔

(۴) عرب میں فن موسیقی کی تاریخ لکھو اور بتاؤ کہ عرب کے تمدن اور فن ادب پر اس کا کیا اثر ہوا۔

(۵) کیا دولتِ عباسیہ اور امویہ میں ایسے شعراء بھی پائے جاتے ہیں جو عرب نہ تھے لیکن علم ادب میں امامِ فن سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے بعضوں کے نام اور ان کے حالات لکھو۔

(الندوہ ج ۶ نمبر ۵)

جمادی الاولی ۱۳۲۷ھ مطابق جون ۱۹۰۹ء

# علمی گروہ

صوفیاں مستند و زاہد بے خبر
از کہ پرسم من رہِ میخانہ را

ہمارے ریفارمروں نے جب جدید تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہی تو ضروری سمجھا کہ پہلے قدیم عمارت ڈھا کر سطح ہموار اور درست کر لی جائے، ہم نے اس کو منظور کیا، پرانی تعلیم (جس قدر ہم سے ہو سکا) عملاً مٹا دی گئی، اور چوں کہ خطرہ تھا کہ قدامت پرست لوگ منہدم شدہ عمارت نئے سرے سے نہ اٹھائیں، اس لئے ضرور ٹھہرا کہ دلوں سے بھی اس کی عظمت کا نقش مٹا دیا جائے۔ اس بناء پر ہم نے اس کو افسانہ پارینہ، تقویم کہن، عضو شل، آبِ جامد وغیرہ وغیرہ مختلف خطابات دیئے اور اس طرح بار بار دہرایا کہ قدیم تعلیم بھی بول اٹھی کہ ؎

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی میکند نسبت
کہ من ہم درگماں افتادہ پندارم گنہگارم

تیس برس کا زمانہ گزر گیا، قدیم تعلیم مر چلی، نئی نسلیں تیار ہوئیں، ہزاروں بی اے نکلے، سینکڑوں نے ایم اے کی ڈگریاں لیں یہ سب کچھ ہوا، لیکن نتیجہ ؟

کیا کوئی علمی جماعت پیدا ہوئی ؟ کوئی مسئلہ حل ہوا ؟ کسی نے کچھ اجتہاد کیا ؟ کوئی مصنف پیدا ہوا ؟ قومی منبر پر کوئی خطیب نظر آیا ؟ کسی کے قلم نے انشاء پردازی کے معرکے فتح کئے ؟

تم کہو گے کہ یہ ہماری ناانصافی ہے، ایک نوعمر گروہ سے ایسے فتوحات عظیمہ کی توقع خود ہماری خام خیالی ہے، بے شبہہ تم سچ کہتے ہو، سوالات مذکورہ کو یوں بدل دینا چاہیئے۔

کیا علمی مذاق کا کوئی گروہ پیدا ہوا ؟ یورپ کی کسی فلسفیانہ کتاب کا ترجمہ ہوا ؟ علومِ جدیدہ کے کچھ مسائل قوم کی زبان میں شائع ہوئے ؟ کوئی علمی پرچہ نکلا ؟ اسلام پر یورپ نے جو

سینکڑوں ناقد تصنیفات اور مضامین لکھے اس میں سے کچھ اردو زبان میں آیا؟ تم کہو گے کہ سوالات مذکورہ کا معیار اور گھٹانا چاہیئے، ہم اس کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یورپ نے مذہب اسلام اور اسلامی لٹریچر پر عربی اور فارسی شاعری پر، عرب کے جغرافیہ پر، فلسفہ اسلام پر، مسلمانوں کی تاریخ پر سینکڑوں نادر کتابیں اور رسالے لکھے، نئے گروہ کو ان میں سے کس قدر معلوم ہے؟ مسلمانوں کے سینکڑوں عجیب و غریب نادر تصنیفات کو یورپ نے شائع کیا ہے، ان کی ان لوگوں کو خبر ہے؟ جرمنی میں مسلمانوں کے خاص علوم و فنون پر جو انسائیکلوپیڈیا لکھی جاری ہے کیا اس سے ان کو واقفیت ہے؟ پروفیسر ڈوزی نے دو ضخیم جلدوں میں تمام عربی مولد الفاظ کی ڈکشنری پچاس برس کی محنت میں لکھی، کیا ان لوگوں نے اس کو دیکھا ہے، گب میموریل سیریز جن کے ذریعہ سے خاص عربی اور فارسی کی قدیم نادر کتابیں شائع کی جارہی ہیں، اس سے ان کی واقفیت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے علوم، اپنے فنون، اپنی تاریخ، اپنا تمدن، سب کچھ فدیہ دے کر ایک نوکری پیشہ گروہ پیدا کیا ہے اور نازاں ہیں کہ ؂

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

لیکن ان سب حالات کے ساتھ سوال یہ ہے کہ چارۂ کار کیا ہے؟ کیا ہم کو اس درد کا علاج پرانے طریقہ کے مدارس میں ڈھونڈنا چاہیئے؟ کیا وہاں کچھ تحقیق کار پر تو نظر آئے گا، کوئی مشکل حل ہوگی؟ لفظوں کے گورکھ دھندے کے سوا اور کچھ ہاتھ آئے گا؟ قدما کی تحقیقات کا نشان ملے گا؟ ابن ہیثم نے فن مناظرہ پر جو اضافہ کیا، فارابی نے فن موسیقی میں جو ترقیاں کیں، خیام نے جبر و مقابلہ پر جو کچھ لکھا، ابن مسکویہ نے جو تاریخی تحقیقاتیں کیں ان میں سے کسی چیز کا پتہ چلے گا؟ نہیں کچھ بھی نہیں، ہمارے مولویوں کے تو کان بھی ان سوالوں سے آشنا نہ ہوں گے۔

غرض موجودہ حالات کے ساتھ ان دونوں گروہوں میں سے کوئی گروہ ہمارے کام کا نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون سا گروہ کوشش کرنے سے کام کا بن سکتا ہے۔

ہر قوم جب ترقی کرتی ہے تو اس میں دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک وہ جو دنیوی علوم سیکھتا ہے، سرکاری خدمتیں حاصل کرتا ہے، انتظامات ملکی میں

شریک ہوتا ہے، پالیٹکس میں دخل دیتا ہے، یہ گروہ علم و فن سے بے بہرہ نہیں ہوتا، لیکن علم اس کا مقصد زندگی نہیں ہوتا، ہمارے زمانے میں یہ گروہ وہی ہے جس کو ہم جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں۔

دوسرا گروہ علمی گروہ ہوتا ہے، اس کی غرض و غایت محض علم ہوتی ہے، وہ تھوڑی سی معاش پر اکتفا کرتا ہے، اور صرف علمی خدمت کو اپنا منتہائے مقصد قرار دیتا ہے، یہ گروہ اگرچہ درحقیقت آج کل مفقود ہے، لیکن اس گروہ کے جو آثار اور خواص ہیں وہ عربی خواں گروہ میں پائے جاتے ہیں۔ عربی خواں گروہ اعلانیہ جانتا ہے کہ عربی علوم کے پڑھنے سے معاش نہیں حاصل ہو سکتی، اور زمانے کی نظروں میں ان علوم کی کچھ قدر نہیں، تاہم یہ گروہ نہایت محویت، شوق اور شیفتگی سے علوم عربی کی تحصیل میں مصروف ہے، صرف اس لئے کہ اس نے اپنا مقصد، تحصیل دنیا نہیں بلکہ تحصیل علم قرار دیا ہے، جو کچھ کمی ہے یہ ہے کہ وہ جس چیز کو علم سمجھ رہے ہیں وہ علم کے نہایت ابتدائی مراتب ہیں۔

عربی میں جو علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں (دینیات کو چھوڑ کر) ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو یورپ نے اس قدر ترقی دی ہے کہ ان کی تحقیقات کے سامنے پچھلے کارنامے بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں رہے، میبذی اور صدرا کی طبیعات کو آج کل کی طبیعات سے کیا نسبت ہے، عربی ادب کے متعلق یورپ نے عربی کی وہ قدیم نادر تصنیفات بہم پہنچائیں جن کی ہمارے علماء کو خبر تک نہیں۔ غرض یہی عربی خواں گروہ اگر یورپ کی کسی زبان اور یورپ کی تحقیقات سے آشنا ہو جائے تو وہ گروہ بن جائے گا جس کو ہم علمی گروہ کہتے ہیں اور جس کے بغیر قوم کی قوم۔

خوب ست و خوش ست و بو ندارد

بے شبہ آج تک عربی خواں گروہ نے انگریزی زبان اور انگریزی علوم و فنون سے احتراز کیا، لیکن کیوں؟ اس لئے نہیں کہ ان کے نزدیک انگریزی پڑھنا کفر ہے، بلکہ اس لئے کہ ان کو یہ غلط خیال ہے کہ انگریزی میں علوم و فنون نہیں، صرف سطحی اور عامیانہ باتیں ہیں، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا ہے کہ ہم خود ندوہ میں برسوں سے اس اعتقاد کو زائل کرنا چاہتے ہیں، لیکن کسی شخص پر کچھ اثر نہیں ہوتا جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے علماء یورپ کے علوم و

فنون کا اندازہ انگریزی خوانوں سے کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس گروہ سے یورپ کی علمی تحقیقات و تدقیقات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں میں علمی گروہ وہی بن سکتا ہے جو اسلامی علوم کے ساتھ تحقیقاتِ حال سے بھی ناآشنا نہ ہو۔ چناں چہ بلادِ اسلامیہ نے مدت کے تجربہ کے بعد اس نکتہ کو سمجھا، اور اسی بناء پر قاہرہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی، جس کا نام جامعہ مصریہ ہے۔ تاہم اس یونیورسٹی میں یہ کمی ہے کہ اس میں خاص مذہبی علوم یعنی تفسیر و حدیث وغیرہ نہیں پڑھائے جاتے، اس جبر کی تلافی کی اگر امید ہو سکتی ہے تو حیدر آباد سے ہو سکتی ہے، جس نے دارالعلوم کو وسیع پیمانے پر قائم کرنا چاہا ہے، ندوہ کے تہی مایہ دارالعلوم نے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا ہے، اور اب اس کے کامیابی کے نہایت ابتدائی آثار نظر آنے لگے ہیں۔

**(الندوہ، جلد ۶ نمبر ۵)**

جمادی الاولی ۱۳۲۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۰۹ء

# دینی مدارس کا نصاب و نظامِ تعلیم
# اور
# عصری تقاضے

دینی مدارس کے نصاب و نظامِ تعلیم کے حوالے
سے ممتاز علماء و ماہرین تعلیم کے نادر و نایاب مقالات

# مسلمانوں کی آئندہ تعلیم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے۔ لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لئے پہلے "قواعد بغدادی" یا "یسرنا القرآن" وغیرہ پڑھاتے ہیں، اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو میں دست رس ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے، اس کے بعد قرآن شریف شروع کر دیا جائے، اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ اختلافِ صور بچوں کا ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کر دے۔

ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کار آمد نہیں۔ ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں، لیکن بہر حال انہوں نے اتنا پورے یقین کے ساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو بامقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے، چناں چہ اسی لئے انہوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے، امریکا کے ایک مشینری رسالہ "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے، جو درج ذیل ہے :

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر ﷺ پر ایمان لایا جائے، جنھوں نے

ہم کو اسلام کی تعلیم دی، ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر ﷺ پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ جس نے کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے، ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے، یا کیوں کرہے، وہ بہت بڑا ہے......... بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے، اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے، اللہ تعالیٰ، پیغمبر علیہ ﷺ اور مذہبِ اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے۔

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے، ہم ترک ہیں، ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں۔ ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمیشہ دشمنوں سے فتح یاب ہوگا، جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے، اور میر سر بلند ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں، جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں۔"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پالیا ہے، اور دین و وطنیت و دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے، یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ایک منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

آج کل عام طور سے یہ دیکھا جارہا ہے کہ ہماری درس گاہیں اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات میں بیش از بیش نمائش پسندی میں مبتلا ہیں۔ ہماری گزشتہ تعلیم کے عہد میں ہماری مسجدیں، ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال، اور مسجد کا فرش، ہماری میزیں اور بینچیں اور کرسیاں تھیں، صرف ان ہی دومدوں کی کفایت کا اندازہ موجودہ گراں طریقہ تعلیم سے بآسانی کیا جاسکتا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بہتر سے بہتر درس گاہ بہتر سے بہتر مقصدوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بانیوں کی ساری محنت زمین، اینٹ اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے، اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے۔

ہمارے دارالاقاموں میں سب سے بہتر دارالاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے طالب علموں کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے، اور ان کے رہنے کے لئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے، حالاں کہ تمام تر یہ ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریب نظر ہے اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی زندگی ہے، جو ہماری تباہی کی تمام تر ذمہ دار ہے۔

ہم نے اسلامی اصطلاحات میں جہاد کا نام سن کر اپنی روشن دماغی کے ثبوت میں کتنی دفعہ اس سے تبری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اے عزیزان کرام! اب وقت ہے کہ ہم

جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھیں اور برت کر دکھائیں، جہاد جہد سے مشتق ہے۔ جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہیں، حق کی راہ میں ہم جو تکلیف اٹھائیں، وہ ہمارا جہاد ہے۔ دنیا کی زندگی سکون پر نہیں دائمی حرکت پر قائم ہے، غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ ہم جس قدر سکون پائیں گے اسی قدر آرام اٹھائیں گے، پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا تھا ؎

بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

لیکن حقیقت میں یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے، راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل فصیح عرب کہتا ہے :

"في الحركته بركته" جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصلی لطف ملتا ہے، اور جو آنکھیں بیدار رہی ہیں، وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں، اسی طرح محنت و مشقت کے بغیر آرام و راحت کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، جب تک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤں پر نہ ٹپکے گا، جو روٹی ہمارے ہاتھ آئے گی وہ ہمارے احساس کے ذائقہ کو بھی تسکین نہیں دے گی۔

سست امیروں کی پر لطف غذائیں ہی وہ جراثیم ہیں، جو ان کی بیماریوں کو پیدا کرتے ہیں، ایک محنتی مزدور چوں کہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے، اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اس کی صحت کا خزانہ ہوتا ہے۔

بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہیے، ان کی طالب علمانہ زندگی میں یہ عادت ایسی پختہ ہو جانی چاہیے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضہ میں کر لیں۔ تعلیم، امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم کی فراغت کے بعد جس شاہراہ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو، ہر ایک میں یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہو سکتا ہے۔ ہماری درس گاہوں کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علموں کے یہ ذہن نشین کر دیں کہ اب تمہاری زندگی صرف تمہاری محنت، جفاکشی اور جاں فشانی پر موقوف ہے۔ یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے نکل کر ساحل تک سلامتی سے پہنچنا صرف تمہارے ہی ہاتھ پاؤں چلانے پر موقوف ہے۔

(معارف نمبر ۳، جلد ۳۲)

# میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ

مولانا سید مناظر احسن گیلانی (صدر شعبہ دینیات، جامعہ عثمانیہ)

تعلیم کے وجود دو مستقل نظام (حکومت مسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں، اس کی دوئی اور اثنیت کو توڑ کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے، اسی لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے ''نظریہ وحدتِ نظام تعلیم'' رکھا ہے۔

مسلمانانِ ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا عام طور پر ''درس نظامیہ'' کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے، اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم و نثر و انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب و خطاطی وغیرہ کی مشق کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبانوں کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی، ابتداء سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے) حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فرقہ کے سلسلہ میں گو بہ ظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی ''شرح وقایہ'' اور ''ہدایہ'' لیکن عملاً ان کو ایک ہی کتاب سمجھنا چاہیئے، کیونکہ کچھ ابواب ''شرح وقایہ'' سے اور کچھ ''ہدایہ'' کے اس طور پر پڑھا دیئے جاتے تھے کہ جن ابواب کی تعلیم ''شرح وقایہ'' میں دی جاتی تھی، ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھا جاتا تھا، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ حکماً و عملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی، زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے

تھے " خیر آبادی خانوادے " میں صرف سواپارہ بیضاوی کا جز ونصاب تھا لیکن اگر مان لیا جائے کہ بیضاوی بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی جاتی تھی تو مطلب کیا ہوا؟ یہی تو کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرانے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا، ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلبہ جو کچھ بھی پڑھتے تھے، فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورہ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا، یعنی علم کلام، اور علم اصول فقہ، معانی وبیان وغیرہ ان ہی علوم وفنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا، جن میں صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔

دینیات کی عمومی تعلیم کے لئے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں یا کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے۔ ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کرکے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے "درس نظامیہ" سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی، ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا، اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ملا، عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے نظریہ "وحدت نظام تعلیم" کے نام سے اپنی کتاب میں، میں نے پیش کیا ہے، اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔ میری تجویز پر جو شبہات کیے جاتے ہیں ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائے گا، پہلا شبہ یہ ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لئے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے، اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ اسی کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ محفوظ ہیں، اس حصہ کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لئے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی اسی پچاسی فی صدی الفاظ اس کے حصہ کے یہ اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔ چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خودبخود سمجھنے لگتا ہے، البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت وعہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات اور مسامرات انشاء اور خالص ادبی نثر ونظم کی کتابیں ہیں۔ یقیناً دشوار ہے۔ لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر شخص کو نہیں ہے، جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی امور میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کر سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور تبحر واختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے میری گفتگو صرف عام اور لزومی واقفیت تک محدود ہے۔ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت ومناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا۔ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت ومناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں۔

باقی تبحر واختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا، اس کے لئے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی، جیسے غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے، وہی طرز علم ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں، بلکہ قطعاً اختیار کرنا چاہیئے۔

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر و نظر نے اب تک جو کچھ سوچا، سمجھا، لکھا پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو تو کیا ان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا مناسب ہو گا، علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح و توضیح کے لئے ایجاد کیا تھا مثلاً اصول فقہ، کلام، یا بیان و معانی و بدیع وغیرہ کا جو حال ہے میں نے اس کا اپنی کتاب میں بھی جواب دیا ہے کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لئے یہ مناسب ہو گا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دینا کافی ہو گا۔ کچھ لوگوں کا پڑھنا پڑھانا ان کی بقاء و ارتقاء کے لئے کافی ہے۔

بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ ان کو بھی اختیاری مضامین میں شریک کر کے زندہ رکھا جائے، لیکن ہر مسلمان کو میلان باقی رہنے کے لئے خصوصاً موجودہ حالات میں یعنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی لزومی تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کر دینے کے بعد بھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی زندگی بن جائے گی؟ کیا ان کا جو ماحول ہے اس کے سمی اثرات کے ازالہ کے لئے صرف تعلیم کافی ہے؟ بلاشبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل زہرہ گداز اور حوصلہ شکن سوال ہے، ماحول حکومت کے نقطۂ نظر کا تابع ہوتا ہے، جب تک حکومت غیر اسلامی ہے اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر و عزت کی توقع غلط توقع ہے، لیکن پھر کیا کیا جائے، کیا مسلمان کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قبول پر ضرورت پڑتا ہے، خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو، اسی کے ساتھ طبائع بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے، اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد علی مرحوم، ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں، جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخر ان کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑا، تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے، ہو سکتا ہے کہ قرآن کی، پیغمبر کی زندگی کی، اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے، سب کو نہیں تو بعض کو تو انشاء اللہ ضرور

متاثر کرے رہے گی۔ اور ان بعض کا تاثر انشاء اللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان محکومیت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں، یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبہ کے لئے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کیے جائیں اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے۔ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے تو جو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت یہ بھی ہو سکتی ہے۔

علاوہ ان تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جوامع اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو نہیں پاسکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں ان میں جب جدید نصاب کو جاری کردیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں، جدید علوم وفنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کے لئے مدرسین ان مدارس میں ایسے منتخب کیے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں کا کرتے ہوں۔ بحمد للہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہو چکی ہے۔ تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سردست نہ بھی ملیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے غیر اقوام کے اہل علم کا تقرر کر کے ہم خود اپنے یہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو آگے چل کر خود ہمارے قدیم مدارس میں جدید علوم وفنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دھرمی معلموں کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے، اس کا پیش کرنا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیئے، لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیئے کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کیا جائے اور اسی طرح آشنا کیا جائے کہ جیسے اس وقت تک کیا جاتا ہے، پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے جیسے اب تک رواج ہے۔ قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خطِ

نستعلیق(۱) سے بھی ان کو آشنا کیا جائے۔ یعنی اردو پڑھائی جائے، اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے، آئندہ اردو کو چھڑا کر فارسی کی "آمدنامہ" اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طلبہ کو لگا دیا جائے، یہی عربی بڑھتے ہوئے بی اے تک پہنچے گی۔ اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درسِ نظامیہ والی کتب ثلثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تین کتابوں کو پڑھانا ہوگا۔

میری تجویز کا یہ اجمالی خاکہ ہے۔ رہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے۔ مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں اگر عرض کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا۔

(۱) تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقہ سے پہنچانا چاہئے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کر لیں اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو "مشکوٰۃ" یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعہ حدیث کی پڑھا دی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر لینا چاہئے جو "شرح وقایہ" اور "ہدایہ" کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع سے میں کرتا چلا آرہا ہوں ان میں سے "قرآن" کو تو بہر حال "قرآن" ہی کے ذریعہ سے پڑھانا چاہئے لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے۔ مقصود معیار کو متعین کرنا ہے۔ یعنی ان کتابوں کو پڑھ لینے کے بعد حدیث وفقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اسی کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہئے۔ املا کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے،

---

(۱) نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے جب تک طباعت کے لئے نسخ کے حروف کو اردو کے لئے تسلیم نہیں کیا گیا ہے، اگر یہ مسئلہ طے ہو گیا تو پھر اس کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہے گی، البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہئے، انگریزی میں طباعت و کتابت کے حروف کی شکل بدلی ہوئی ہے، وہی طرز عمل ہم بھی اختیار کریں گے، نسخ طباعت کے لئے اور نستعلیق کتابت کے لئے۔

اور اگر یہ خیال ہو کہ کتاب کے ذریعہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اس طریقہ کو باقی رکھا جائے جو اب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے۔

(۲) میرا خیال ہے کہ وحدتِ تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کر لیا جائے تو عربی کے عام مدارس کو مدارسِ فوقانیہ (ہائی اسکول) کی شکل میں بدل دیا جائے جن میں دینیات کی تعلیم صرف قرآن پڑھانے تک ختم ہو جائے گی، البتہ بعض بڑے تعلیمی مراکز ان کے تحتانی درجوں کو تو ہائی اسکول کی حیثیت دے دی جائے، اور ان بڑے مراکز میں سے مختلف مرکزوں کو مختلف دینی و اسلامی علوم کی تکمیل کی تعلیم گاہ بنا دی جائے، جہاں عام یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ طیلسانیوں کو دینی علوم میں سے کسی خاص علم مثلاً تفسیر یا حدیث یا فقہ یا کلام میں اعلیٰ تکمیلی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تفسیر کے لئے ندوہ کو اور حدیث کے لئے دیوبند کو مختص کر دیا جائے اور فقہ کے لئے فرنگی محل میں کوئی تکمیلی ادارہ قائم کیا جائے، کلام اور تصوف کے لئے اجمیر شریف میں انتظام کیا جائے جہاں اس وقت بھی سرکار نظام کی طرف سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہے۔

اردو کو قوی کرنے کے لئے ضرورت ہے فارسی سے مناسبت پیدا کرنے کی، اور فارسی میں قوت وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو، پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کے پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی، اور فارسی کے بعد عربی سے طلبہ کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔ یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگر بے خطا نسخہ ہو گا، بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ علومِ جدیدہ خصوصاً سائنس و کیمیا وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پر مصروف ہے۔ عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی ناممکن ہے، لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے، جہاں حکومت نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کا نظم کر رکھا ہے۔ چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں، بلکہ انگریزی مدارس کو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان بنالیا جائے۔ رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس میں جو عموماً اس وقت شہروں اور

قصبوں میں قائم ہیں۔ ان کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم و فنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لئے بنالیا جائے اور اسلامی علوم کی تکمیلی تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دے دیا جائے۔

اس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سینکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی اسکول قائم ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی اسکول ہی نہیں ہے اور جہاں کہیں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ اسکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صرف صفر کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے، اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کرلیا تو مسلمانوں کے اسکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس مناسبت سے ان کی تعداد بڑھ جائے کیوں کہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع، ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا، جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو، جدید علوم و فنون کی تعلیم کو قبول کر لینے کے بعد حکومت کا محکمہ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور ہوگا، میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چندوں سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے ان دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی اسکولوں کی شکل اختیار کرلیں گے۔ کہنے کو تو یہ ہائی اسکول کہلائیں گے لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہوں گے۔ علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چوں کہ یہ مدارس ہوں گے، اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گزرے گا۔

تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کر کے ایک ہی نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائے گا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہوگئی ہے روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی، اس کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہو رہے ہیں لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اس لئے پیدا ہو جائیں کہ مذہب کے نمائندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمائندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے۔ (لا فعله الله) میرا خیال ہے کہ ملا اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک

جلد ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم از کم میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکا جو دیا جارہا ہے کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جارہا ہے یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے، اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کر سکے، جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے انشاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہو جائے گی۔

یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن وحدیث سے واقف بنانا :

"دادن تیغ بدستے راہ زن"

کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے۔ یہ ظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے، بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیئے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانی دماغ کو منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی وصحت کے نقطہ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور اسی لئے یہ

"ہر چہ گیرد علتی علت شود"

کا خطرہ غلط نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر علت کی شکل نہ اختیار کرلے، لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیئے کہ ان ہی الجھے ہوؤں میں سے انشاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے۔ اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی انشاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہر حال مذہب اور مذہبی تعلیم کی عمومیت سے گریز میرے نزدیک وبر ہمیت ہے۔ اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اس کی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہو، اس سے نفع اٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کریں، اپنے آخری دین کی بہر حال وہ حفاظت فرمائے گا۔

واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

(معارف نمبر ۱، جلد ۵۶، مئی ۱۹۴۵ء)

# مدرسہ سسٹم، اورنگ زیب کی نظر میں

شیخ محمد اکرام

اورنگ زیب کو اپنے زمانے کے علماء اور مدرسین کے نقائص سے پوری آگاہی تھی۔ چناں چہ اس نے اپنے ایک استاد کے سامنے اس زمانے کے طرزِ تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس زمانے کے طریقہ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔

برنیر لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد جب اس کا ایک استاد کسی منصب کی ہوس میں اس کے دربار میں آیا اور درباری اُمراء سے جوڑ توڑ کر کے ایک بلند پایہ منصب لینے کے درپے ہوا تو اورنگ زیب نے ایک دن اسے تخلیے میں بلا کر ایک طویل تقریر کی اور کہا:

''مولانا! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو دربار کے اول درجہ کے امراء میں داخل کر لوں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا۔ اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے۔ لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے، جہاں سب سے بڑا بادشاہ پہلے پرتگال کا حاکم تھا پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہوا اور اب شاہ انگلستان ہے۔ فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کے متعلق آپ نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہانِ ہندوستان ان سب حکمرانوں سے بڑے ہیں۔ ان ہی میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہوتے ہیں، جو شاہانِ عظیم، فاتحانہ جہان اور بادشاہان عالم ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ایران، کاشغر، تاتار، پیگو، سیام اور چین کے حاکم شاہ ہند کا نام سن کر کانپتے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ کے علم جغرافیہ اور تاریخ دانی کا کیا کہنا! کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات سے آگاہ کر کے یہ بتاتے کہ ان ملکوں کی پیداوار اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے۔ یہ لوگ لڑتے کس ڈھب سے ہیں۔ ان کے رسم و رواج

اور مذہب و حکومت کے طریقے کیسے ہیں؟ان کی پولیٹیکل پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی و تنزل کے اسباب بتاتے۔ ان واقعات، حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرتے۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔ خیر دنیا کی تاریخ سے پوری اور گہری واقفیت دلانا تو درکنار آپ نے مجھے میرے آباؤاجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے۔

آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لئے کون سے مضامین درکار ہیں۔ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف و نحو کی بڑی مہارت چاہیئے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیئے جس کی ضرورت ایک قاضی یا فقیہ کو ہوتی ہے۔ اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کے سیکھنے کی خشک بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا۔

آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ بے شک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دل پسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیئے۔ جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم و فن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اصطلاحیں استعمال کر سکتا تھا۔ جن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں اور جن سے فلسفے کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں!

اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلب گار بناتا ہے یا مجھے وہ باتیں بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرتی ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے۔ یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز سے واقف کر دیتے یا مجھے دنیا کا، اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پورا پورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر ارسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا۔"

یہ اندراج ہم نے برنیر کے سفرنامے سے لیا ہے، جو عہدِ عالمگیری میں دیر تک اس ملک میں مقیم رہا اور بعض امراء سے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ (رودِ کوثر)

# مدارس اسلامیہ کے نصاب کی اصلاح

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

پچھلے دنوں لکھنو میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت ایک بڑا اجتماع ہوا۔ جس میں مختلف مدارس عربیہ اور متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ عربی نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں پہلے مولانا نے ایک تقریر کی اور اس کے بعد دوسرے حضرات نے اپنے اپنے خیالات وافکار کا اظہار کیا۔ باہمی گلہ و شکوہ اور بعض جزئی چیزوں میں اختلاف کے بعد سب نے بنیادی طور پر اصلاحِ نصاب اور اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ایک کمیٹی بنا دی گئی جو اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے ایک مکمل نقشہ تیار کرے گی۔

درسِ نظامی تین قسم کے علوم و فنون پر مشتمل ہے (۱) علومِ دینیہ، جیسے تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ۔ (۲) علوم آلیہ یعنی وہ علوم جس سے علومِ دینیہ کے فہم و تفہیم میں مدد لینا ناگزیر ہے جیسے صرف و نحو، ادب، معانی و بیان، فن بلاغت و بدیع۔ (۳) علوم عقلیہ، ان سے مراد وہ علوم ہیں جو نہ خود دین ہیں اور نہ جن سے علومِ دینیہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی حیثیت صرف یہ ہے کہ یہ علوم عصریہ تھے۔ علماء اسلام نے شروع شروع میں ان علوم کے پڑھنے پڑھانے کی مخالفت کی لیکن جب دیکھا کہ یہ اربابِ باطل کا ہتھیار بن گئے ہیں تو انہوں نے خود ان علوم کو پڑھا اور ان پر تنقید کر کے مسائلِ دین کے مقابلہ میں ان کی اثر آفرینی ختم کر دی۔ چناں چہ امام غزالی ؒ کی تہافت الفلاسفہ پھر علامہ ابنِ رشد المتوفی ۵۹۵ھ کی تہافت الفلاسفۃ جس میں علامہ نے اگرچہ امام غزالی ؒ سے متعدد مقامات پر اختلاف کیا ہے لیکن بہر حال خود بھی امام کی غرض و غایت کی تکمیل ہے اور اس کے بعد خواجہ زادہ (م ۸۹۳ھ) کی تہافت الفلاسفۃ جو انہوں نے سلطان محمد ؒ فاتح قسطنطنیہ کے

ایما سے لکھی تھی یہ اور ان کے علاوہ حافظ ابن تیمیہؒ کی ''الرد علی المنطقین'' اور امام رازیؒ کی شرح اشارات یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان علوم میں منطق اور فلسفہ شامل ہیں جن کو ہمارے قدیم نصاب تعلیم میں نمایاں امتیاز حاصل رہا ہے اور اب بھی مدارسِ عربیہ کے طلباء کے کئی قیمتی سال انہیں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان علوم کے علاوہ مدارس میں ہیئت اور تاریخ کی بھی دو تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اول الذکر کا مقصد محض ایک عصری فن کا جاننا اور تاریخ کا مقصد اپنے اسلاف کے کاموں اور کارناموں سے واقف ہونا تھا۔ ہمارا درسِ نظامی جو ملا نظام الدین سہالی المتوفی ۱۱۶۸ھ کی طرف منسوب ہے۔ بس انہیں مقاصد کو سامنے رکھ کر بنایا گیا تھا اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس زمانہ میں جو عمدہ سے عمدہ اور مفید کتابیں دست یاب ہو سکتی تھیں ان کو درس کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ درسِ نظامی کی اس ہیئت ترکیبی سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ علمائے کرام کے نزدیک ''دینی تعلیم'' کی اسپرٹ کیا تھی یعنی وہ صرف دین کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک عالم بننے کے لئے علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ کا مطالعہ اور ان سے واقف ہونا بھی لازمی تھا۔

اب ان مقاصدِ تعلیم کو سامنے رکھ کر درسِ نظامی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کی موجودہ ہیئت دینی اور عصری علوم دونوں کی تعلیم کے لحاظ سے سراسر ناقص اور مقاصد کے لئے غیر مفید ہے اور غیر افادیت کی وجہ جس طرح نصاب تعلیم ہے اس نصاب کا طریقہ تعلیم بھی بڑی حد تک اس کا سبب ہے کیوں کہ پہلے زمانہ میں جیسا کہ آج کل یونیورسٹیوں کی اعلیٰ کلاسوں میں ہوتا ہے طریقہ تعلیم املا تھا۔ استاد کسی مسئلہ پر فنی حیثیت سے کلام کرتا تھا اور تلامذہ اس کو قلم بند کرتے جاتے تھے اس طرح تعلیم کسی خاص ایک کتاب کی نہیں بلکہ فن کی ہوتی تھی اور طلباء کو استاذ کے لیکچروں کے ذریعہ فنی بصیرت و مہارت پیدا ہو جاتی تھی لیکن آج کل ہوتا یہ ہے کہ استاد کی تمام تر توجہ کتاب کی عبارتی پیچیدگیوں اور مصنف کے مافی الضمیر کی تشریح و تفصیل پر مرکوز رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم نحو میں کافیہ اور شرح جامی پڑھتا ہے۔ مگر اسے نحو نہیں آتی، منطق میں سلم اور ملا حسن پڑھتا ہے مگر منطق سے کورا ہی رہتا ہے۔ اصولِ فقہ میں اصول الشاشی اور نور الانوار کا درس لیتا ہے لیکن جیسا کہ اصولِ فقہ کے ایک طالب علم سے توقع کرنی چاہیئے وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وقت کا کوئی اہم مسئلہ سامنے آجائے تو وہ اصولِ احکام کی روشنی میں کوئی حکم مستنبط کر سکے۔ قس علی

ذلک۔ راقم الحروف اور اکثر رفقائے ندوۃ المصنفین نے حدیث اور منطق، فلسفہ کا درس علی الترتیب حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیریؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور مولانا رسول خان صاحب مدظلہم سے لیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک بزرگ اپنے اپنے فن کا امام تھا۔ اگرچہ کتاب ان کے سامنے بھی ہوتی تھی لیکن ان حضرات کا طریقہ درس املاہی تھا۔ کسی مسئلہ پر تقریر کے وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مسئلہ سے متعلق فنی طور پر جتنی معلومات ہو سکتی ہیں وہ سب ان حضرات کے دماغ میں موجود ہیں وہ مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے اور اس سے متعلق اکابر ائمہ فن کی آراء اور ان کے دلائل بیان کرنے کے بعد خود سب پر محاکمہ اور تبصرہ کرتے اور آخیر میں اپنی ایک قطعی رائے دلائل و براہین کے ساتھ بیان کرتے تھے، لیکن یہ طریقہ صرف انہیں حضرات کے ساتھ مخصوص تھا اب وہ بات کہاں!

بہر حال سب سے مقدم اور اہم چیز یہ ہے کہ طریقہ تعلیم کی اصلاح کی جائے۔ اس میں شک نہیں املا کے طریقہ پر درس دینے کا اہل ہر ایک مدرس نہیں ہو سکتا اور جو صاحب فن ہو گا وہ معمولی تنخواہ پر دست یاب نہیں ہو سکتا اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک میں آج کل ایسے حضرات کا قحط بھی ہے لیکن اگر واقعی مدارس عربیہ میں اصلاح کر کے انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق مفید اور کار آمد بنانا ہے تو یہ سب کچھ درس کی تکمیل کے لئے جو اسباب طبعی ہو سکتے ہیں ان کا بندوبست کرنا ہی ہوگا۔

دوسرا مسئلہ نصاب تعلیم کا ہے، اس سلسلہ میں پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف علوم وفنون کی تعلیم کے لئے جو کتابیں رائج ہیں ان کی جگہ ایسی کتابیں شاملِ درس کی جائیں جو ان علوم کی تعلیم کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد ہو سکتی ہیں اور آج کل بازار میں مل بھی سکتی ہیں۔ علاوہ بریں فنون کی تعلیم سے متعلق قدیم نقطۂ نظر کو بھی تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً اصولِ حدیث کے سلسلہ میں صرف نخبۃ الفکر پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا ہے حالاں کہ اسماء الرجال کا جاننا بھی حدیث کے ایک طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔ ادب کا حال ان سب سے بدتر ہے۔ ادب کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخِ ادب سے اور علم السنہ اور ساتھ ہی عصر جدید کی ادبی ترقیات اور اس کی لسانی تبدیلیوں سے باخبر ہو۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کا فنِ تنقید نہایت کامل و مکمل ہے لیکن ہمارے طلبہ اس سے بھی ناآشنا رہتے

ہیں۔ ضرورت ہے کہ ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں ان تمام خامیوں کو دور کیا جائے اور اس کا نصاب ایسا بنایا جائے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ایک طالب علم آج کل کی اصطلاح کے مطابق صحیح طور پر ادیب کہلایا جا سکے۔

معانی و بیان اور بدیع میں ہمارے ہاں سب سے زور فنِ بدیع پر رہتا ہے حالاں کہ اصل چیز فصاحت و بلاغت ہے فن بدیع متاخرین کی ایجاد ہے اور اس سے بسا اوقات لفظی حسن پیدا کرنے کی کوشش میں اصل معنی کا خون ہو جاتا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں کوئی ادل بدل نہیں ہو سکتا البتہ تفسیر کی مروجہ درسی کتابوں میں ادل بدل کرنا نہایت ضروری ہے اور اصولِ تفسیر کا فن ہمارے ہاں بالکل نہیں پڑھایا جاتا اس کو بھی شاملِ درس ہونا چاہیئے۔ فقہ میں کم از کم ایک کتاب ایسی ضرور ہونی چاہیئے جس سے طالب علم کو حنفی مسلک کے علاوہ دوسرے مذاہبِ فقہ اور ان کے مبادی و اصول کا علم ہو۔ پھر ہمارے طلباء تاریخِ علوم سے ناواقف رہتے ہیں اس کے لئے مقدمہ ابن خلدون کا انتخاب یا کوئی اور کتاب جو اس مقصد کے لئے مفید ہو شامل درس ہونی چاہیئے۔

اب رہی علوم عصریہ! تو کوئی بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عصر کے بدل جانے کے ساتھ اب مدارسِ عربیہ کے علوم عصریہ بھی بے وقعت ہو گئے ہیں جو چیزیں فلسفہ قدیم کی مسلمات سمجھی جاتی رہی ہیں اب وہ بدیہی البطلان بن گئی ہیں اور اب ان کا پڑھنا صرف ایک خاص زمانہ کی عقلی رفتار کے جان لینے کی حیثیت سے تو مفید ہو سکتا ہے ورنہ علمی اعتبار سے ان کا کوئی وزن نہیں۔ مدارس میں بالعموم رسالہ ملا جلال و میر زاہد کی صرف ایک یہ بحث کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کس مقولہ سے ہے؟ پورے ایک برس میں تمام ہوتی ہے اور پھر بھی دماغ میں روشنی پیدا نہیں ہوتی اس کے بالمقابل اگر کانٹ کی کتاب "تنقید عقل محض" پڑھائی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ فلسفہ کا ایک اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے بلکہ اس سے وحی اور الہام اور بعض اور مابعد الطبیعاتی حقائق کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے پھر ہمارے ہاں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ طبیعات اور الہیات دونوں کے مباحث ملے جلے ہیں اور وہ بھی جتنا کچھ پڑھایا جاتا ہے صرف جزء لا یتجزی صورت و ہیولی اور اسی قسم کے چند اور مسائل تک محدود رہتا ہے۔ موجودہ فلسفہ کا ایک اہم شعبہ فلسفہ اخلاق ہے۔ مدارس عربیہ کے طلباء کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ آخر علومِ عصریہ میں تو اور بہت سے علوم بھی شامل ہیں۔ انہیں چھوڑ کر صرف فلسفہ کو ہی نصاب میں کیوں شامل کیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ اور علوم مثلاً اقتصادیات، علم نباتات، کیمیا اور طبیعات وغیرہ علوم معاشی یا عملی علوم ہیں۔ انسانی عقائد و افکار سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ انسان کے مذہبی اور اخلاقی و روحانی افکار و عقائد پر اثرانداز ہوتا ہے۔ عام طور پر ذہنی کج روی اور گمراہی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بناء پر علماء نے جس طرح پہلے فلسفہ قدیم پڑھا اسی طرح اب ان کو فلسفہ جدید پڑھ کر فکر و نظر کی گمراہی کا سدباب کرنا چاہیئے۔

ان علوم کے علاوہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ اور جغرافیہ ان چیزوں کا بھی درسِ نظامی میں شامل ہونا نہایت ضروری ہے۔ پھر تاریخ بھی صرف اپنی نہیں بلکہ مختلف قوموں اور سلطنتوں کی دنیا کے بڑے بڑے مذاہب اور تہذیب و تمدن کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

(برہان دہلی مارچ ۱۹۴۷ء)

# مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحہ فکر

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار سے پہلے ملک میں جو طریقہ تعلیم رائج تھا اور جس کے لئے جگہ جگہ مدارس کھلے ہوئے تھے اس میں نہ قدیم و جدید کی کوئی تفریق تھی اور نہ مولوی اور غیر مولوی کا کوئی جھگڑا تھا، ملک کے تمام لوگ صرف دو ہی طبقوں پر منقسم تھے، ایک تعلیم یافتہ اور دوسرا غیر تعلیم یافتہ۔ آج کل کی طرح یہ اندھیر نہیں تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے پر بھی یہ بتانا پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے کس طبقہ اور کس گروہ سے یعنی قدیم سے یا جدید سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح آج جدید تعلیم یافتہ کے معنی بہت وسیع ہیں جس میں انجینئر، ماہر طبیعات، ڈاکٹر، وکیل غرض کہ سائنس اور آرٹ کے کسی شعبہ کے گریجویٹ سب تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہوتی ٹھیک اسی طرح مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں علوم دینیہ اور علوم و فنون غیر دینیہ سب کے جاننے والوں کو علماء کہتے تھے لیکن جس طرح مطلق تعلیم یافتہ ہونے کے بعد خاص خاص علوم و فنون میں کمال و مہارت کے اعتبار سے اس علم کی طرف نسبت کر کے ہر ایک کا جدا جدا نام ہوتا ہے مثلاً فلسفہ کے ماہر کو فلسفی (فلاسفر) منطق کے فاضل کو منطقی (لوجیشین) سائنس کے باکمال کو سائنٹسٹ کہتے ہیں اسی طرح زمانہ زیر بحث میں حدیث کے مبصر کو محدث، تفسیر کے فاضل کو مفسر، علم کلام کے ماہر کو متکلم اور تاریخ کے امام کو مؤرخ کہتے تھے۔

پھر جس طرح آج چند علوم و فنون ایسے ہیں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری ہے اور وہ وہی مضامین ہیں جو سیکنڈری ایجوکیشن تک پڑھائے جاتے ہیں اسی طرح اس زمانہ میں چند علوم و فنون تھے جن کے بغیر کوئی شخص تعلیم یافتہ ہونے کی سند حاصل ہی نہیں کر سکتا

تھا۔ان علوم وفنون میں تاریخ، جغرافیہ، حساب، مادری زبان، ریاستی زبان، دینیات اور خطاطی شامل تھے۔

غرض کہ انگریزوں کی حکومت سے پہلے ہمارے جو مدارس عربیہ تھے وہ آج کل کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے کسی طرح کم نہ تھے، ان مدارس میں تعلیم کا مقصد جس طرح دینی ہوتا تھا علمی بھی ہوتا تھا اور دنیوی بھی ہو سکتا تھا جس طرح انگلینڈ کی پرانی یونیورسٹیوں میں غیر مذہبی علوم کے ساتھ مذہبی علوم (Divinuty) کا بھی شعبہ ہوتا تھا جس کے باعث جس شخص کو پادری یا بشپ کی حیثیت سے مذہبی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی تو اسے بھی اسی یونیورسٹی سے سندِ تکمیل و فراغت حاصل کرنی ہوتی تھی، اسی طرح ہمارے مدارس میں علومِ دینیہ کے ساتھ وقت کے مروجہ علومِ غیر دینیہ بھی پڑھائے جاتے تھے اور جس طرح آج خاص خاص علوم وفنون میں مہارت و کمال پیدا کرنے کے لئے یورپ وامریکا کے دور دراز ملکوں میں خاص خاص ادارے اور یونیورسٹیاں ہیں جس کو جس کسی خاص علم یا فن میں کمال حاصل کرنا ہوتا ہے وہ وہاں کا سفر کرتا ہے اسی طرح اسلامی عہد میں ایک ایک فن اور علم کا امام خود مستقل ایک ادارہ اور درس گاہ ہوتا تھا اس علم کے مشتاق طلباء دور دراز کے ملکوں سے سفر کی صعوبت و مشقت برداشت کرکے وہاں پہنچتے تھے اور علم و تحقیق کی تشنگی بجھاتے تھے۔

ان مدارس کے فارغ التحصیل طلباء میں جہاں بعض محدث، مفسر، فقیہ اور مفتی ہوتے تھے، بعض مؤرخ، فلسفی، ماہر طبیعات، طبیب اور ماہر ریاضیات بھی ہوتے تھے ان میں سے بعض درس و تدریس اور فقہ و افتا کے مسند کی رونق بنتے تھے تو انہیں میں کچھ ہوتے تھے جو امارت و وزارت اور حکومت کے دوسرے شعبوں کی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔ پھر شاعر، ادیب اور مصنف بھی انہیں میں سے اٹھتے تھے اور مبلغ و خطیب اور کاتب بھی انہیں میں ہوتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہندو بھی ان مدارس میں مسلمانوں کے ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مدارسِ عربیہ کا مقصد وجود صرف دینی نہیں بلکہ علمی بھی ہوتا تھا اور حکومت کی ملازمت اور عہدے وغیرہ بھی انہیں مدارس میں تعلیم پانے کے بعد حاصل ہوتے تھے۔

اس موقع پر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سر رادھا کرشن یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کا ایک اقتباس ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں اس سے ہمارا مقصد اور واضح ہوگا۔

"پھر جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوستان میں علوم و فنون کی نشر و اشاعت اور ان کے درس و تعلیم کے لئے مدارس (جو اس زمانہ کے کالج تھے) مختلف شہروں مثلاً لاہور، دہلی، رام پور، لکھنو، الٰہ آباد، جون پور، اجمیر اور بے درد وغیرہ میں کھولے، شیر شاہ جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا اس نے جون پور کے مدرسہ میں ہی تعلیم پائی تھی اور وہاں اس نے جو مضامین پڑھے تھے ان میں تاریخ، فلسفہ، عربی اور فارسی ادب بھی شامل تھے، ان مدارس کا نصاب یورپ کی تعلیم گاہوں کے متوازی اور مساوی ہوتا تھا اور اس نصاب میں صرف و نحو، معانی و بلاغت، منطق، قانون، علم ہندسہ، فلسفہ، علم نجوم، جنرل سائنس، مابعد الطبیعات، دینیات یہ سب مضامین شامل ہوتے تھے۔ علاوہ بریں شعر و شاعری تو ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہر ایک ہی دل چسپی لیتا تھا۔ ان عام مدارس کے علاوہ ملک کے مختلف گوشوں میں بعض خاص مدارس تھے جہاں خاص خاص علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی اور وہ مدارس ان علوم کا مرکز سمجھے جاتے تھے مثلاً رام پور کا مدرسہ منطق اور طب کے لئے مشہور تھا۔ لکھنو کی شہرت دینی علوم و فنون کے لئے تھی اور لاہور علم نجوم اور ریاضیات میں نامور و مشہور تھا۔ ان مدارس میں ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی اور ان میں تعلیم کی خدمت جن لوگوں کے سپرد ہوتی تھی، ان میں بعض بڑے بڑے نامور علماء و ماہرین علوم و فنون ہوتے تھے۔" (جلد اول ص ۸)

برطانوی راج کے قدیم ہو جانے کے بعد مدارسِ عربیہ کے نظام میں یہ ہمہ گیری نہیں رہ سکی اور ان کا شیرازہ پراگندہ ہو گیا اس کا اثر مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر بھی پڑا۔ کیوں کہ تعلیم نہ پاسکنے کی وجہ سے وہ حکومت کے صیغوں میں کوئی عہدہ نہیں لے سکتے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے جو ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر کلکتہ میں "کلکتہ مدرسہ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جس کا سنگِ بنیاد ۱۷۸۰ء میں رکھا گیا تھا۔ اس کلکتہ مدرسہ کی غرض تاسیس کیا تھی؟ اسے خود مذکورہ بالا یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کی زبان سے سنیئے۔

"اپنی حکومت کے قیام کے بعد اہلِ برطانیہ نے سوچا کہ اب یہاں کے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے چناں چہ وارن ہیسٹنگز نے ایک شان دار کارنامہ یہ کیا کہ کلکتہ مدرسہ قائم کیا جس کا مقصد (خود وارن ہیسٹنگز کے لفظوں میں) یہ تھا کہ مسلمان شرفاء کے بچے تعلیم یافتہ ہو کر حکومت کے ذمہ دار اور بیش قرار تنخواہوں والے عہدوں پر سرفراز

ہو سکیں۔ چناں چہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے مدارس میں جو جامع اور ہمہ گیر نصاب پڑھایا جاتا تھا وہ ہی نصاب کلکتہ مدرسہ میں رائج کیا گیا، یہ نصاب علوم دینیہ اور غیر علوم دینیہ سب پر مشتمل تھا۔" (جلد اول ص ۸)

## قومی مدارس کا قیام

لیکن اس عہد میں مسلمانوں کے جو قومی مدارسِ عربیہ قائم ہوئے اور ان میں سبقت و تقدم کا سہرا دارالعلوم دیوبند کے سر ہے وہ اپنے نظام تعلیم کو پہلے زمانہ کے مدارس کی طرح زیادہ وسیع اور ہمہ گیر نہیں بنا سکے اور ادھر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے قیام کی وجہ سے ایک تعلیم جدید کا آغاز ہو گیا اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہی ہونا تھا کہ تعلیم یافتہ گروہ دو حصوں میں بٹ گیا اور یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے حلیف نہیں بلکہ حریف بن گئے۔

مدارسِ عربیہ کا نظام عمل صرف دینی اغراض تک محدود ہو کر رہ گیا اور حق یہ ہے کہ اس کے اسباب طبعی اور قدرتی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

ہندوستان میں برطانوی راج کے پاؤں جم جانے کے بعد بعض دور اندیش اور درد مند علماء نے محسوس کیا کہ اس انقلاب کا سب سے برا اثر مسلمانوں کے دین اور مذہب پر پڑ سکتا ہے۔ اب نئی حکومت کے ماتحت نئی زبان اور نئے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا سر و سامان کیا جائے گا۔ اس بناء پر اگر اس وقت مسلمانوں کے دین کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ ارتداد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ اس خطرہ کے انسداد کے لئے ان علماء نے مدارس کا اجرا کیا اور پہلے دیوبند اور مراد آباد میں اور اس کے بعد دوسرے شہروں اور قصبوں میں مدارس کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا۔

جہاں تک مدارسِ عربیہ کے قیام و تاسیس کے اس مقصد کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مقصد باحسن وجوہ حاصل ہو گیا اور علماء کرام کی مساعی بار آور ہو کر رہیں۔ چناں چہ ان مدارسِ عربیہ کا ہی یہ اثر ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں بحیثیت مجموعی جو دین داری، خدا پرستی، مذہب سے لگاؤ، اسلامی روایات و کلچر کا احترام پایا جاتا ہے۔ وہ خود حجاز کے لوگوں میں نہیں ہے۔ عراق، شام اور مصر و فلسطین کا تو ذکر ہی کیا ہے؟

لیکن ان مدارس کے قیام سے اصل مقصد چوں کہ دین کا تحفظ تھا اور انقلابِ حکومت نے

جو خطرات پیدا کر دیئے تھے ان کے پیش نظر علماء کے نزدیک اس سے زیادہ ضروری کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں کی دنیا تو خیر برباد ہی تھی کسی طرح ان کا دین بچا رہے اس بناء پر مدارسِ عربیہ سے جو علمی یا دنیوی فوائد پہلے حاصل کیے جاتے تھے اب وہ بہت مضمحل ناقابلِ اعتناء اور ناشائستہ التفات ہو گئے اور مدارسِ عربیہ کا قیام ان کے نصاب و طریقہ تعلیم ہر چیز کا مقصد صرف دین اور اس کا تحفظ ہو گیا۔ چناں چہ دینیات کے علاوہ جو اور علوم پڑھائے جاتے تھے ان کا نام علوم آلیہ رکھا گیا۔ یعنی گویا یہ ایسے علوم ہیں جن کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن چوں کہ ان کے پڑھنے پڑھانے اور درس و مطالعہ سے قرآن و حدیث کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس لئے ان کو بھی نصاب میں شامل رکھا گیا ہے۔ اس ذہنیت کا اثر بجز اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ خود مدرسہ کے وجود میں جو پھیلاؤ تھا وہ سکڑ جائے۔ اس کے مقاصد میں جو جامعیت اور ہمہ گیری تھی وہ ختم ہو جائے اور اس کے نصاب میں جو وسعت و پہنائی اور افادیت و سود مندی تھی وہ محدود ہو کر رہ جائے۔

(برہان دہلی جون ۵۴ء)

# علومِ دینیہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

## حدیث

قرآن مجید کے بعد حدیث کا مرتبہ ہے اور احکام و مسائل کے استنباط کی یہ دوسری اصل ہے۔ اس بناء پر علوم دینیہ میں اس کی اہمیت اس حد تک ہے کہ دینی تعلیم کا کوئی تصور اس کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حدیث ہے کیا؟

چوں کہ حدیث سے یہاں مراد وہ تمام روایات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صحابہ کرامؓ سے متعلق ہم تک پہنچی ہیں جن کو اصطلاحاً آثار کہتے ہیں اس بناء پر حدیث بنفسہ ایک اصلِ شریعت بھی ہے اور تاریخ بھی۔ وہ ایک مستقل حکم بھی ہے اور احکام قرآنیہ کی توضیح و تشریح بھی اوز چوں کہ اسلام ایک عالم گیر اور آخری دینِ الٰہی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر مکان کے واسطے۔ ہر گروہ اور ہر قوم کے لئے اس میں یکساں آسان اور یسیر العمل احکام موجود ہیں اس بناء پر حدیث کو ان تمام احکام کا منبع ہونا چاہیئے۔ انسانی نظر و فکر، اور انسانی مزاج و طبیعت، خواہ تہذیب و ترقی کی کسی منزل میں ہو اور انسان کی حیات اجتماعی و تمدنی سے متعلق افکار و نظریات میں خواہ کیسا ہی انقلاب و تغیر ہو لیکن اگر اسلام دینِ قیم ہے تو بے شبہ صرف اسی کا ایک نظریہ ایسا ہونا چاہیئے جو دنیا کے تمام افکار و نظریات کے بالمقابل ایک بنیانِ مرصوص کی طرح قائم رہے اور ظاہر ہے کہ یہ نظریہ قرآن میں مل سکتا ہے یا حدیث میں اور چوں کہ قرآن کی حیثیت ایک متن کی ہے اس بناء پر انسان کی حیاتِ اجتماعی سے متعلق اسلام کے افکار و نظریات کا سراغ و ضاحت اور عملی تمثیلات کے ساتھ حدیث میں ہی مل سکتا ہے۔ چناں چہ ایسا ہی ہے بھی!

حدیث کی یہ حیثیت ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حدیث کی تعلیم کی غرض و غایت کیا ہونی چاہئے یعنی یہ کہ ایک ہمہ گیر اور جامع نقطۂ نظر کے ساتھ اسلامی احکام و مسائل کے اصل سرچشمہ تک ہماری رسائی ہو سکے۔ علاوہ بریں ہم کو یہ حقیقت بھی نہ بھولنی چاہئے کہ حدیث جہاں تشریعی حیثیت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی وہ تاریخِ تشریع اور طریقِ تشریع بھی ہے یعنی اس سے جہاں خاص خاص مسائل کے متعلق احکام مستنبط ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں مدون و مرتب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آئندہ زمانہ میں کبھی کسی وقت کچھ ایسے مسائل پیش آئیں۔ جو عہدِ نبوت میں یا عہدِ صحابہ میں پیش نہیں آئے تھے تو ان کے لئے ازروئے قرآن و حدیث کیا احکام ہوں گے۔ اسی بناء پر محدثین نے، تحقیقِ مناط، تخریج مناط اور تنقیح مناط کی بحثیں کی ہیں اور استنباطِ احکام و مسائل کے جو اصول کتب اصول فقہ میں مذکور و مدون ہیں ان کی بنیاد۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے حدیث کے اسی پہلو سے ہے۔

ظاہر ہے کہ حدیث کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نظر کے ساتھ کیا جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ قرآن کے ساتھ مل کر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور مکمل قانون و نظام بن جاتی ہے کہ کوئی شعبہ حیات اس کی رہنمائی سے محروم نہیں رہ جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مدارسِ عربیہ میں حدیث کی تعلیم جس انداز پر ہوتی ہے۔ وہ اس مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ کیوں کہ اس میں حسب ذیل نقائص ہیں۔

(۱) سب سے پہلا نقص جس کی طرف شروع میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ حدیث کو بحیثیت اصلِ احکام کے نہیں پڑھایا جاتا۔ بلکہ اس کو فقہ کے تابع کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ استاذ جس مسلک فقہ کا پابند ہے وہ احادیث کی تاویل و توجیہہ اسی کے مطابق کرے گا۔

(۲) حدیث میں صرف عبادات یا ایمان و عقائد کے ابواب پر تمام زورِ تبحر و کمال خرچ کر دیا جاتا ہے اور اس کا حاصل بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ استاذ جس مسلک فقہ کا پابند ہے اس کو دوسرے مسالک پر ارجح و افضل ثابت کرے۔ عام طور پر مدارس میں صحاح ستہ ایک ہی سال میں پڑھائی جاتی ہیں، مگر اس طرح کہ سال کا ایک بڑا حصہ چند ابواب میں ختم ہو جاتا ہے اور باقی دنوں میں قرأة علی الشیخ یا قرأة الشیخ کی صورت میں تمام کتابیں ختم کر دی جاتی ہیں۔ مدارس میں حدیث کے امتحان کے جو پرچے ہوتے ہیں ان کو دیکھئے تو وہی چند لگے

بندھے سوالات ہیں جو گھوم پھر کر آگے پیچھے آتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کا سب سے عظیم نقصان یہ ہے کہ ایک عالمِ قرآن وحدیث کو اپنے تہذیب یافتہ اور ترقی پذیر دور میں جس قدر وسیع النظر، دقیقہ رس اور نکتہ شناس ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا اور بزمِ علوم وفنون میں بیٹھ کر وہ اسلام کی نمائندگی کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے۔

(۳) احادیث کے درس میں زیادہ زور کلامی مباحث پر صرف کیا جاتا ہے یا عبادات سے متعلق فقہی مسائل پر۔ مثلاً یہ کہ ایمان میں تشکیک ہوتی ہے یا نہیں، وہ زیادت اور نقصان کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔

امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہیے اور آمین بالجہر کہنی چاہیے یا نہیں؟ لیکن اجتماعی زندگی سے متعلق سینکڑوں ہزاروں نہایت اہم نفسیاتی اور اخلاقی نکتے ہیں جو نبی صادق و مصدوق کی زبانِ حق ترجمان سے ادا ہوئے ہیں ان کی طرف کوئی دھیان تو کیا دیا جاتا۔ ان کی طرف ذہن کا انتقال بھی نہیں ہوتا۔ علوم وفنون جدیدہ اور عصر حاضر کے افکار و نظریات نے اجتماعی زندگی کے ان پہلوؤں کو آج ابھار کر اس طرح دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اب بھی افکارِ انسانی سوسائٹی کے نظام حیات کی اہم بنیاد قرار پا رہے ہیں اور ان کی وجہ سے دنیا کا نقشہ ہی بدلتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے علماء کو چوں کہ انسانی فکر و شعور کے اس انقلابِ عظیم اور اس کے محرکات کی خبر ہی نہیں ہے اس بناء پر نہ یہ مسائل ان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور نہ ان کو قرآن و حدیث میں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً کارل مارکس نے سالہائے دراز کی محنت اور غور و فکر کے بعد اقتصادیات میں ایک نیا مکتبہ خیال ایجاد کیا جس کو Dynamic Economy (متحرک اقتصادیات) کہتے ہیں۔ اس فلسفہ کا جو بنیادی پس منظر ہے یعنی یہ کہ سرمایہ کی تقسیم مساویانہ ہونی چاہیے اور محنت اور سرمایہ کے معاوضہ میں توازن ہونا چاہیے ورنہ اگر ایسا نہیں ہوگا تو طبقاتیت پیدا ہوگی اور اس کی وجہ سے دنیا کا امن وامان اور انسانی زندگی کا سکون تباہ و برباد ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو خود اسلام بھی تسلیم کرتا ہے۔ کارل مارکس نے جس حقیقت کو سینکڑوں صفحات میں بیان کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے "کاد الفقر یکون کفرا" فرما کر تین چار لفظوں میں زیادہ جامعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ فقر کیا ہے؟ کفر سے کیا مراد ہے؟ اور فقر کفر پر کس طرح منتج ہوتا ہے؟ یہ تین سوالات ہیں اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں اور اقتصادیات و معاشیات کی

مروجہ زبان میں ان کا جواب دیا جائے تو ایک بہت ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ جو بلا شبہ کارل مارکس کی "کیپیٹل" سے زیادہ ٹھوس، واقعی اور نفس الامری حقائق پر مشتمل ہو گی۔ بہر حال گزارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اسلام واقعی تمام دنیا کا ایک صالح ترین نظام حیات ہے تو حدیث کے ایک طالب علم کو اپنے زمانہ کے ان تمام معاملات و مسائل کا جو اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان مسائل کا جو حل ہے ان کا علم اس طرح ہونا چاہئے کہ وہ اس حل کی فوقیت دوسرے افکار پر ثابت کر سکے اور علمی طور پر اس حل کی صداقت کا دوسروں کو یقین دلا سکے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ حدیث کے درس کا ایک جامع اور ہمہ گیر فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

(۴) ہر حدیث کے دو جزو ہوتے ہیں ایک سند اور ایک متن۔ دونوں اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن مدارس میں درسِ حدیث کا جو طریقہ مروج ہے اس میں صرف متن سے اعتناء کیا جاتا ہے اور سند کو شائستہ التفات نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ ہمارے فارغ التحصیل طلباء راویوں کے نام کے علاوہ ان کے حالات سے بالکل واقف نہیں ہوتے۔ اصولِ حدیث کی ایک دو کتابوں میں نقد و جرح کے جو اصول وہ پڑھتے ہیں ان کے استعمال کی نوبت شاذ و نادر ہی ہوتی ہو گی۔

علاوہ بریں آنحضرت ﷺ افصح العرب والعجم تھے، اوتیت جوامع الکلم، آپ کا نشانِ امتیاز تھا۔ اس بناء پر آپ کے ارشادات بھی فصاحت و بلاغت کے جواہر ریزے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ خود دلیلِ نبوت ہیں۔ لیکن درس میں احادیث کے اسی وصفِ لفظی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ ہم نے حضرتنا الاستاذ مولانا السید انور شاہؒ کو دیکھا ہے کبھی کبھی صرف ایک حدیث کے کسی ٹکڑا کی بلاغت پر گھنٹوں تقریر فرماتے تھے اور اس وقت روئے انور پر عجب وجد و کیف کا عالم ہوتا تھا بہر حال ضرورت ہے کہ

(۱) درسِ حدیث کی مدت بجائے ایک سال کے دو سال کی جائے۔

(۲) اصولِ حدیث پر کسی ایک کتاب پڑھانے کی بجائے لیکچروں کا انتظام کیا جائے جو اس موضوع کی بہت سی کتابوں کا خلاصہ ہوں۔

(۳) درس حدیث کے نصاب میں مشکوٰۃ کے بعد صحیح بخاری اور موطا امام مالک لفظاً لفظاً پوری پڑھائی جائیں، یعنی شروع سے آخر تک ان کا درس یکساں زور اور قوت کے ساتھ ہو۔

## فقہ

علومِ دینیہ میں قرآن و حدیث کے بعد تیسرا نمبر فقہ کا ہے، فقہ اس مجموعہ احکام کا نام ہے جو قرآن و حدیث یا اجماع و قیاس سے مستنبط ہوتے ہیں اگر فقہ کی تعلیم کا مقصد صرف ان احکام کا معلوم کر لینا ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ سب اس مقصد کی تحصیل میں مدد معاون ہوتی ہیں۔ لیکن اگر فقہ کی تعلیم کا مقصد ان احکام کے وجوہ استنباط اور ان کے دلائل کا علم حاصل کرنا بھی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ مقصد کماحقہ حاصل نہیں ہوتا۔ احناف پر عام اعتراض ہے کہ وہ قیاس کو روایت کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ اور ہماری کتب درسیہ میں اکثر و بیشتر جو استدلال کیا جاتا ہے اس سے اس اعتراض کی تردید تو کیا ہوتی اور کچھ تقویت ہی ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ "ھدایہ" کتب فقہ میں نہایت عظیم الشان اور بلند پایہ کتاب ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کا استاذ بجائے فقط مدرس ہونے کے وسیع النظر اور صاحبِ ذوق عالم ہو جو مسائل واحکام کے سرچشمہ استنباط پر گفتگو کر کے مسئلہ کی اصل بنیاد کو استوار کر سکے۔ علاوہ بریں فقہ کی تعلیم کا ایک مقصد تفقہ پیدا کرنا بھی ہونا چاہیئے تا کہ وہ زندگی کے نوبہ نو مسائل و معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے اور ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ امورِ ذیل کی رعایت کی جائے۔

(۱) طالب علم کسی ایک امام کے مسلکِ فقہ سے واقفیت پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ اس کو کم از کم ائمہ اربعہ کے مسالک سے مع ان کے دلائل کے واقفیت ہونی چاہیئے۔

(۲) طالب علم کو فقہ کا مطالعہ بحیثیت ایک مقلد کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک طالبِ تحقیق کے کرنا چاہیئے، اور اس وقت اس کے دماغ کو ہر قسم کی عصبیت سے آزاد ہونا چاہیئے۔

علاوہ بریں مدارس میں بجا طور پر عبادات کے حصہ پر فقہ کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ عبادات کے ساتھ معاملات کا بھی درس ہونا ضروری ہے اور بعض ابواب مثلاً کتاب العتق، یا کتاب الحدود آج کل ان کی ضرورت نہیں ہوتی اگر ان ابواب کو مختصر کر دیا جائے جس سے طالب علم کو ان مسائل کا بھی کچھ علم ہو جائے تو مناسب ہوگا۔

## اصولِ فقہ

علومِ دینیہ میں اگرچہ اس کا نمبر چوتھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت اہم علم ہے اور اس سے واقفیت اور اس میں کمال و مہارت پر ہی ایک عالم دین کی مذہبی رہنمائی اور

معاملات و مسائل کے کشود کار کا دارومدار ہے۔ اس علم کی تدریس کے لئے جو کتابیں درسِ نظامی میں شامل ہیں ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ ایک عالم دین میں اجتہادی صلاحیت اور شریعت سے متعلق ایک وسیع نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لئے صرف اس فن کا پڑھا دینا کافی نہیں ہے، احکام کی دلیلیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک لمی اور ایک انی۔ اصول فقہ کی بحث دلیل انی تک محدود رہتی ہے۔ حالاں کہ استنباط احکام و مسائل کے لئے جس قدر اس کا جاننا ضروری ہے اسی طرح اسرار و رموز شرائع اور منصوص احکام شریعت محمدیہ کے اسرار و حکم کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کی حجتہ اللہ البالغہ، اگر تمام نہیں تو اس کے ابوابِ متعلقہ کا درس ضروری ہے۔

علاوہ بریں ہمارے مدارس میں صرف فقہ حنفی کے اصول پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن ایک عالم دین میں مزید بصیرت اور استخراج و استنباط احکام کی مزید صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے ضرورت ہے کہ وہ دوسرے ائمہ کے اصولِ فقہ سے واقف ہو۔ اس سلسلہ میں امام شافعی کی کتاب الام کے شروع میں ایک رسالہ ''الرسالة فی اصول الفقه للشافعی'' چھپا ہوا ہے اور اس کے علاوہ ایک اور کتاب ''منهج الاصول'' بڑے کام کی ہیں۔

## علم الکلام

یہ علم بھی دینی نصابِ درسی کا ایک اہم جز ہے لیکن اب جدید علوم و فنون اور فلسفہ کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے یہ قدیم علم کلام اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ یہ علم معتزلہ کا رد کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ لیکن اس علم کی درسی کتابوں پر اگر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ معتزلہ کے جواب میں عام طور پر جو روش اختیار کی جاتی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آخر میں معاملہ نقلی دلائل پر ہی آکر ختم ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ وہی مسائل ہیں جن پر حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، امام غزالی، علامہ ابن رشد، شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ رحمتہ واسعتہً نے کلام کیا ہے اور زیادہ قوت اور یقین انگیزی کے ساتھ کیا ہے اور ان حضرات کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ زمانہ مابعد میں فلسفہ اور سائنس کی غیر معمولی ترقی فلسفہ یونان کی جس عمارت کو منہدم کرنے والی تھی ان حضرات نے وہ کام خود اپنے زمانہ میں کر دکھایا۔ جب فلسفہ یونان کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے معتزلی افکار کے لئے سہارا ہی کیا رہ جاتا ہے۔ مثلاً اشیاء کا حسن و قبح عقلی ہے یا شرعی! خیر و شر کی

حقیقت کیا ہے؟ ذات باری کی صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات! وجود کی کیا حقیقت ہے؟ وجود واجب سے کیا مراد ہے؟ علم کسے کہتے ہیں؟ اعراض جو قائم بالغیر ہوتے ہیں کیا وہ دو زمانوں میں باقی نہیں رہ سکتے؟ اور کیا اس بناء پر ان کا وزن نہیں ہو سکتا؟ بعث و حشر کی کیا حقیقت ہے؟ کیا روح کا اعادہ بدن اول میں ہوگا؟ یا مثل بدن اول میں؟ جزا اور سزا کی کیا حقیقت ہے؟ ایمان کا عمل سے کیا تعلق ہے؟ عمل ایمان کا شرط ہے یا شطر۔ یہ اور اسی طرح کے سینکڑوں مسائل و مباحث ہیں جن پر فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں نہایت عمدہ، مؤثر اور یقین افروز گفتگو ہو سکتی ہے اور اس سے قرآن مجید کی تائید ہی ہوگی نہ کہ تردید۔

اس بناء پر علم کلام کے نصاب میں آج کل جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کو یک قلم نکال دینے کی ضرورت ہے اور ان کی جگہ امام غزالی کے رسائل مثلاً "المنقذمن الضلال"، "المضؤن به علي غير اهله" حافظ ابن تیمیہ کا رسالہ "القياس الشرعي" یا ان کے بعض اور رسالے جو ان کے "مجموعة الرسائل" میں چھپے ہوئے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ کی کتابوں کے انتخابات یا تفسیر کبیر امام رازی کے بعض خاص خاص ٹکڑے ان کا انتخاب کر کے ان کو علم کلام کے درس میں شامل کرنا چاہیئے۔ یہ انتظام اس وقت تک کے لئے کرنا ہوگا جب تک کہ جدید علم کلام مرتب نہ ہو۔ جس کی بڑی ضرورت ہے اور جس کے لئے مواد کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس جدید علم کلام میں طریقِ بحث بھی جداگانہ ہوگا اور دلائل و براہین بھی نئے۔ اسلوبِ بیان بھی اور ہوگا اور مسائل بھی بعض نئے ہوں گے جن کی پہلے زمانہ میں اگرچہ کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن آج کل ان کی بڑی اہمیت ہے اور جن کو طے کئے بغیر آج کوئی نظام زندگی بھی استوار و پائیدار نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آج وجودِ باری پر زیادہ طویل و مفصل گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سائنس کے بڑے بڑے علماء خود اس کے اقرار و اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آج ایک دین کے لئے سب سے بڑا مرحلہ یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کے روحانی اقدارِ حیات کا انسان کی مادی زندگی کے نظم و ترتیب سے کیا تعلق ہے اور وہ اقدار بجائے خود بہت اہم ہونے کے باوجود انسان کی مادی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کیا اثرات ڈالتے ہیں؟ وقت کا تقاضا ہے کہ ان مسائل پر جذباتی نہیں بلکہ علمی انداز میں گفتگو کی جائے تاکہ جس طرح ہر انسان خدا کا وجود تسلیم کرنے پر فطرتاً مجبور ہو گیا ہے اسی طرح اس خدا کے بخشے ہوئے نظامِ زندگی کو بھی ماننے پر مجبور ہو جائے۔

(برہان، دہلی، دسمبر ۵۴ء)

# دینی نظام تعلیم

پروفیسر نذیر احمد (صدر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

دینی نظام تعلیم اب ان ہی دینی مدارس کے ذریعے قائم ہے جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اوسط ہی درجے کے ہیں لیکن بعض اعلیٰ معیار کے ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جو موجودہ دانش گاہوں کے معیار کے مطابق ہیں مگر ان میں سے بیشتر منتشر اور غیر منظم صورت میں ہیں۔ تاہم ان کی اہمیت وافادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ ادارے غیر منظم صورت میں بھی مہتم بالشان خدمت انجام دے رہے ہیں اور دینی علم صرف انہیں مدارس کا صدقہ بھی ہے۔ انہیں کی وجہ سے دین کا چراغ روشن ہے۔ یہ ہی دین کے سب سے بڑے محافظ اور پاسبان ہیں۔ علاوہ بریں انہیں کے ذریعے بعض دوسری ملکی اور ملی ضرورتیں بھی رفع ہوتی ہیں۔ عربی زبان اور ادب سے متعلق سارا عملہ ان ہی دینی مدارس کا تربیت یافتہ ہے۔ یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں عربی کے اساتذہ، ریڈیو اور نشرو تبلیغ کے دوسرے اداروں کے اراکین، سفارت خانوں میں عربی کے مترجمین، ادارۂ باستان شناسی اور قومی میوزیم کے بعض عملے کی تربیت میں بھی انہیں مدارس کا ہاتھ ہے۔ غرض دینی مدارس کا فیضان دینی سطح سے بڑھ کر ملکی اور قومی سطح پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

یہ مدارس ان اداروں کی یادگار ہیں جن کی بدولت قرون وسطیٰ میں ذہنی اور فکری انقلاب آیا تھا انہیں اداروں کے تربیت یافتہ وہ اسلامی علماء ہیں جو تقریباً پانچ سو سال تک دنیا کی تمام علمی میراث کے بلاشرکت غیر کے مالک تھے۔ انہیں کی وجہ سے یورپ علم و فن سے

---

☆ پدم شری و پروفیسر نذیر احمد، سابق صدر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی و مقیم حال سرسید نگر، علی گڑھ

روشناس ہوا اور تاریک دور سے نکل سکا ہے۔ اگرچہ یہ بات عمومی طور پر کسی مزید وضاحت کی محتاج نہیں لیکن یہاں پر مشہور مؤرخ پروفیسر حتّی کا درج ذیل قول دہرانا چاہتا ہوں :

"اسلامی ہسپانیہ قرون وسطیٰ کے یورپ کی علمی تاریخ کے سب سے شان دار باب کے اضافے کا موجب ہے۔ آٹھویں صدی کے وسط سے تیرھویں صدی کی ابتداء تک عربی زبان بولنے والے تمام عالم کی تہذیب و تمدن کے عظیم ترین علم بردار رہے تھے۔ علاوہ بریں انہیں کے ذریعے سے قدیم علوم اور فلسفہ کی بازیافت اور تشکیل نو ہوئی اور انہوں نے علوم کو مغربی یورپ سے اسی طرح روشناس کرایا کہ وہاں علم و فکر کا احیاء ہوا۔"(۱)

علوم اسلامیہ کے علاوہ مسلمان فضلا نے علوم کے جملہ شعبوں کو ترقی کے جس درجے تک پہنچایا تھا، اس کی داستان تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔ ان کے دہرانے کا موقع نہیں ہے، صرف پروفیسر سارٹن کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے :

"بنی نوع انسان کے مخصوص کارناموں کی تکمیل کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ عظیم ترین فلسفی فارابی مسلمان تھا۔ عظیم ترین ماہر ریاضیات ابو کامل اور ابراہیم بن سنان مسلمان تھے اور عظیم ترین جغرافیہ داں و مؤرخ مسعودی مسلمان تھا اور عظیم ترین مؤرخ طبری بھی مسلمان تھا۔"(۲)

غرض علوم کی ترقی اور ان کے احیاء میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ نہایت روشن اور تابناک ہیں اور یہ واضح ہے کہ علماء کی تربیت کے مراکز صرف یہ مدرسے اور درس گاہیں تھیں جن میں بعض جیسے مدرسہ نظامیہ (بغداد) نہایت معروف اور مشہور ہیں۔

یہ بات نہایت درجہ اہم ہے کہ اب ہمارے مدارس کے ذریعے ایسی شان دار علمی خدمات کیوں انجام نہیں پا رہی ہیں۔ اس سوال کا جب تک خاطر خواہ جواب نہیں ملتا اور اس جواب کے نتائج مخلصانہ طور پر عمل میں نہیں لائے جاتے، ہمارے علمی انحطاط کی رو، روکی نہیں جا سکتی۔ دوسرے علوم کا کیا ذکر خود علوم اسلامیہ کے لحاظ سے ہمارا پورا معاشرہ زوال پذیر ہے۔

اگر مدارس کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع میں دینی اور شرعی ضرورت

---

۱۔Philip K. Hitti, History of the Arabs (London, 1977) p. 557

۲۔G.Sarton, Introduction to History of Sciences.

کو ایک ضابطے کے تحت لانے کی غرض سے مدرسہ کی تاسیس ہوئی تھی بعد میں بڑی بڑی درس گاہیں وجود میں آئیں اور شرعی و دینی ضرورت کے ساتھ ہی ساتھ دنیوی ضرورتیں بھی اس کے حدود میں آگئیں اور سارے علوم اور فنون کی تعلیم ان میں شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ ان ہی کے ذریعے یہ علوم و فنون ترقی کی بڑی منزل تک پہنچ گئے۔ پھر انحطاط شروع ہوا اور نصاب میں تبدیلی ہوتے ہوئے پھر مدارس کا دائرہ عمل محض دینی اور شرعی ضرورت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کے نتیجہ میں دوسرے علوم کے لئے الگ درس گاہوں کا وجود ہوا۔ مختصر یہ کہ دینی نصاب میں دنیوی علوم شامل ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، طب، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، اقتصادیات وغیرہ سے ہمارے دینی مدارس بے تعلق ہو چکے ہیں۔ اور ان کے فارغ التحصیل طلباء دنیوی علوم کی توجہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس بناء پر یہ ادارے اچھے طالب علم کی توجہ کے مرکز بھی نہیں بنتے۔ اس کی وجہ سے ان کا تعلیمی اور تدریسی معیار بھی گرتا جارہا ہے۔ پھر سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ایسا نظام تعلیم جس میں موجودہ علوم کے مبادیات کی گنجائش نہ ہو، اپنے دامن کے تمام پروردش یافتگان کو دنیوی علوم سے محرومی کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے۔ کبھی کبھی خیال بھی ہونے لگتا ہے کہ شاید نصاب کی یہ حدبندی کسی شرعی عذر کی بناء پر ہو، لیکن تاریخ کے مطالعے سے اور اصل موضوع پر تحقیق کی نظر ڈالنے سے یہ گمان رفع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں :

۱۔ موجودہ نصاب میں بعض ایسے علوم شامل ہیں جو شرعی نہیں جیسے فلسفہ اور منطق۔

۲۔ قدیم زمانے کی درس گاہوں کا نصاب شرعی اور دنیوی امور کا حامل تھا۔ ورنہ ان کے تربیت یافتگان کے ذریعے ایسی مہتم بالشان علمی خدمات جو دنیا میں علوم کے احیاء کا موجب بنیں، کیوں کر انجام پاتیں۔

۳۔ بعض ایسی تحریریں جو مستند علماء کی ہم تک پہنچی ہیں، اس بات کی بین دلیل ہیں کہ دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم اور پھر ان کے داخل درس کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں ہمارا عمل غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں حجتہ الاسلام امام محمد غزالی کی "احیاء العلوم" سے ان کے بیان کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ امام صاحب کے علمی مرتبہ کے علاوہ ان کا یہ قول اس لحاظ سے اور بھی اہم ہے کہ یہ ضمنی و ذیلی بحث نہیں بلکہ کتاب کا اصل موضوع ہے۔

امام صاحب کے نزدیک علوم شرعی چار ہیں :

۱۔ علم اصول : کتاب خدا، سنت رسول ﷺ، اجماع امت، آثار صحابہ۔
۲۔ علم فروغ : علم فقہ۔
۳۔ مقدمات : علم لغت و علم نحو
۴۔ متممات : علم قرأت و مخارج حروف، علم تفسیر، علم رجال۔ یہ علوم فرض کفایہ ہیں۔ ان کا وجوب انفرادی و اجتماعی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔

امام صاحب ہی کے بیان کے بموجب علم طب، کاشت کاری کا علم، کپڑا بننے کا علم اور حجامت و جراحی کا علم بھی فرض کفایہ میں شامل ہیں۔ تاہم علوم فرض کفایہ کے علاوہ دو قسم اور ہیں جو درج ذیل ہیں :

۱۔ علوم مباح : علم اشعار و علم تواریخ۔
۲۔ علوم مذموم : علم سحر و طلسمات، شعبدہ و تلبیسات۔

گویا امام صاحب کے نزدیک علوم مذموم جن کی تعلیم اور تعمیم جائز ہیں وہ علم سحر وغیرہ ہیں۔ بقیہ سارے علوم خواہ شرعی ہوں یا نہ ہوں ممنوع ہیں۔ ان میں بعض فرض کفایہ کے درجے تک پہنچتے ہیں اور ان کی کسی قدر تعلیم واجب ہے۔

امام غزالی نے علوم فرض کفایہ کی بڑی جامع تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے :

”ہر وہ علم جن پر دنیوی امور کا مدار ہو، جن سے بے نیازی ممکن نہ ہو، وہ فرض کفایہ کے درجے میں آتے ہیں۔ جیسے طب جو صحت بدن کا ضامن ہے۔ اگر پورے شہر میں اس علم کا جاننے والا نہ رہے گا تو تمام شہر پر اس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔“

اور علم فقہ کی توضیح کے ضمن میں لکھا ہے کہ دنیوی امور کی بجا آوری کا مدار اسی علم پر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی فرضیت ہے۔ آخرت سے اس علم کا تعلق بالواسطہ ہے۔ دنیا مزرع آخرت ہے۔ دنیا دین کا تتمہ ہے۔ ملک اور دین دو ہمزاد بھائی ہیں، دین اصل اور ملک نگہبان، جس کی اصل نہ ہو وہ ویران اور جس کا محافظ نہ ہو وہ برباد ہو جائے گا۔

فلسفہ بھی چار علم پر مشتمل ہے۔ ان میں اول علم ہندسہ و علم حساب ہیں۔ یہ دونوں مباح ہیں۔ دوم علم منطق ہے جو دلیل و حد اور ان کے شرائط سے بحث کرتا ہے اور اسی وجہ سے علم کلام میں داخل ہے۔ سوم علم الٰہیات ہے جو خدا کی ذات و صفات سے بحث کرتا ہے اور علم کلام

میں داخل ہے۔ ان امور کے عالموں میں بعض اہل بدعت ہیں اور بعض اہل کفر۔ صرف چند ہی ایسے ہیں جو دینی حدود کے اندر گفتگو کرتے ہیں اور وہی اہل حق بھی ہیں۔ درجہ چہارم پر طبیعات آتا ہے۔ ان میں جو مخالف شرع ہے وہ جہل ہے اور بعض جو مخالف شرع نہیں وہ علم ہیں اور اسی اعتبار سے مباح۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ امور جو نظام عالم کے قوام ہیں وہ عین دینی امور ہیں اور ان کا حصول فرض کفایہ ہے۔ اس اعتبار سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں ایسے علوم جن کے بغیر دنیا کا کام چل ہی نہ سکے دینی لحاظ سے ان کی تحصیل و تدریس فرض ہے۔ اگر سارے مسلمان ان کی تعلیم سے اعراض کریں تو یہ محض محرومی کے درجے میں نہیں بلکہ فرضیت کے ترک کے زمرے میں آتی ہے۔ ہمارے سارے دینی ادارے اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ ان میں کسی بھی سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصاد، تاریخ، جغرافیہ، علم جامعہ شناسی، طب وغیرہ کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ اس کی بناء پر مسلمان جو علوم میں اقوام عالم کے رہ نمارہ چکے تھے، اب سب سے پیچھے ہیں۔ دینی لحاظ سے ہمارے مدارس پر اس کی بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

امام غزالی نے اخبار و آثار اور علم وجمال کے ذیل میں صحابہ کے حالات و واقعات اور رواۃ کے احوال کا علم بھی ضروری قرار دیا ہے۔ اس سے علم تاریخ جس کا انہوں نے جداگانہ ذکر کیا ہے، کی ضرورت اور اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اقوال کی صحت و عدم صحت کی بحث علم تاریخ کا اہم موضوع ہے اور علم اسماء الرجال سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نویسی میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ رہا ہے۔ قرآن مجید سے بھی علم تاریخ و علم باستان شناسی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سورۃ حجر میں اقوام لوط و شعیب کے عذاب کی داستان کے سلسلہ کی چند آیات یہ ہیں :

**فجعلنا عاليها سافلها وامطرنا عليهم حجارة من سجيل، ان في ذلك لايت للمتوسمين، وانها لبسبيل مقيم، ان في ذلك لآية للمومنين، و ان كان اصحب الايكة لظلمين فانتقمنا منهم وانهما لبامام مبين۔**

"پس ہم نے ان بستیوں کا اوپر کا تختہ تو نیچے کردیا اور ان پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کئے، اس واقعہ میں کئی نشانیاں ہیں اہل بصیرت کے لئے، اور یہ بستیاں ایک آباد سڑک پر ملتی ہیں، ان بستیوں میں اہل ایمان کے لئے بڑی عبرت ہے، اور بن والے (قوم شعیب) بھی بڑے ظالم

تھے، سو ہم نے ان سے بھی بدلہ لیا اور ان دونوں قوموں کی بستیاں صاف سڑک پر واقع ہیں۔"

چند سال قبل دہلی کے ایک مشہور انگریزی روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" میں ایک خبر کی تفصیل آئی تھی کہ اٹلی کے باستان شناسوں نے اطراف شام میں جو کھدائی کی ہے اس سے ایک بڑی قوم کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اس کھدائی میں پچیس ہزار تختیاں بر آمد ہوئیں جن میں سے چند تختیوں سے اس دور کے رسم خط اور اس زبان کی لغت اور دستور زبان کا بھی اندازہ ہوتا ہے ان پر ابھی کام ہو رہا ہے لیکن مجموعی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ قوم سامی نسل کی تھی جس کی زبان عبرانی کے مقابلے میں عربی سے زیادہ نزدیک تھی۔ اس لئے کہ اشخاص کے نام Samuel کے بجائے اشمائیل اور Issac کے بجائے اسحاق کی شکل میں ملتے ہیں، عین ممکن ہے کہ قوم قرآن مجید میں مندرج اقوام میں سے کوئی قوم ہو، تحقیق سے ہی اس کی عقدہ کشائی ہو سکے گی۔

بہر حال اس تفصیل سے علوم تاریخ وباستان شناسی دینی مدارس میں اہم جگہ کے متقاضی ہیں، لیکن ان فنون میں کماحقہ دست گاہ حاصل کرنے کے لئے مختلف السنہ اور مختلف تہذیب کا علم بھی نہایت ضروری ہے۔ قرآن مجید حضرت آدمؑ سے لے کر حضور ﷺ تک کے انبیاء واقوام کا ذکر کرتا ہے۔ مسلمانان عالم کا فرض ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اقوام کی تاریخ وتہذیب کے مسائل سے آشنا ہوں، ظاہر ہے کہ دینی نظام تعلیم میں یہ عنصر بمنزلہ صفر کے ہے۔

علم اور دین کے وسیع نقطۂ نظر کے بعد دینی اور دنیوی تعلیم کے الگ الگ نظام کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ تعلیم کا صرف ایک ایسا نظام ہونا چاہیئے جس میں دینی اور دنیوی تعلیم یکساں اہمیت کے ساتھ درس میں شامل ہوں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر شخص خواہ اس نے علم دین میں تخصص حاصل کیا ہے یا علوم دنیا کے کسی شعبے میں، دینی علم سے رابطہ رکھتا ہوگا۔ اس طرح پورے تعلیمی نظام اور پورے معاشرہ میں دین کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ سارے عالم میں دین کی فضا چھا جائے گی۔ تسخیر عالم، عالم کی ذمہ داری ہوگی۔ وہ کائنات کے سربستہ راز کی عقیدہ کشائی کرے گا۔ یہی عالم دنیا کے سارے کاروبار کے چلانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ وہی مدبر اور وزیر ہوں گے۔ وہی امور معیشت کے گتھیوں کے

سلجھانے والے ہوں گے، تجارت اور بینکنگ کے مسائل انہیں کے واسطے سے حل ہوں گے ان میں دینی اور غیر دینی امور کی تشخیص کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی، ان کے عمل کا دائرہ دینی حدود کے اندر ہو گا۔

اسلام مکمل نظام حیات ہے۔ اس لئے اس نظام کے چلانے والوں پر فرض ہے کہ عالم کے تمام مسائل سے وابستگی پیدا کریں۔ ہمارے نظام تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ دنیوی امور کے چلانے کا کوئی ضابطہ نہیں رکھتا، اس نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے، ورنہ کائنات کی راز کشائی میں نہ ہمارا حصہ ہو گا اور نہ ہی تسخیر ارض و سماوات میں ہمارا دخل ہو گا۔ مسلمان ایک کشور کے مالک تو ہوں گے۔ لیکن اس کی باگ ڈور دوسری اقوام کے ہاتھ ہو گی۔ وہی وزیر اور مشیر ہوں گے، وہی کارخانے چلائیں گے، وہی زمین کے اندر کے خزانے نکالیں گے غرض سیاسیات واقتصادیات کی کنجیاں انہیں کے ہاتھ میں ہوں گی۔ وہی ملک کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے۔ ذہنی اور فکری پستی کے بعد ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ملکی سالمیت کا مدار علمی اور سائنسی ترقی پر ہے یہ ایسا موضوع ہے جو ہر شخص پر کھلی روشن ہے۔

میری گزارش کا مدعا یہ ہے کہ آپ سارے علوم کو اسلامی بنالیں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں اپنی ساری قوت عمل صرف کریں۔ علمی انحطاط کی رو کو روکیں اور پھر قوم و ملت میں ماضی کی شاندار روایت پیدا کرنے کی ذمہ داری قبول کریں۔ یہ موجودہ دور کا بڑا چیلنج ہے جس کو ضرور قبول کرنا ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ادارہ ہر مضمون کی تدریس کی ذمہ داری قبول کرے۔ ان میں بعض شرعی علوم کے تخصصی ادارے ہوں گے، بعض سائنس اور ٹیکنالوجی کے، بعض دوسرے اور علوم کے بہر حال یہ جزئیات کی باتیں ہیں جو بعد میں طے ہوتی رہیں گی۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ بعض ممالک میں مشترک تعلیمی نظام جس میں دینی اور دنیوی تعلیم یکساں طور پر درس میں شامل ہوں، آسانی سے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ وہاں اس نظام کو نافذ کر کے ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ اس سے خاطر خواہ نتائج مرتب ہوں گے۔ البتہ ان ممالک میں جہاں اس نظام کو نافذ کرنے میں دشواریاں حائل

ہیں، وہاں ان مسائل پر غور خوض کرانے کے لئے فضلاء کی کمیٹی کی تشکیل ہو، جس کے فرائض درج ذیل ہوں :

۱۔ نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت اور اس کی صورت پر غور و فکر۔
۲۔ مالی وسائل کی فراہمی۔
۳۔ تعلیم کے مختلف مدارج۔
۴۔ تعلیمی و تدریسی نصاب۔
۵۔ اصلی تحقیقی درس گاہوں کے قیام کی تجویز۔
۶۔ کتب خانے کی تشکیل و تنظیم۔
۷۔ تربیت یافتہ نوجوانوں کے معاشی مسائل پر غور و خوص۔

(مجلہ علوم اسلامیہ جلد ۱۴/۱، ۲، ۱۹۸۸ء)

# دینی مدارس
# غور و فکر کے نکات

حقیقت یہ ہے کہ دینی تعلیم کا یہ میدان بڑا مظلوم میدان ہے۔ دورِ استعمار اور تحریکِ آزادی میں دینی علوم و اقدار کے تحفظ اور علمی روایات کو باقی رکھنے کے لئے ان دینی اداروں نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ میں یہ تصور کر کے کانپ اٹھتا ہوں کہ مغربی استعمار کی آمد اور غلبے کے بعد اگر یہ دینی تعلیمی ادارے یہاں موجود نہ ہوتے تو مسلمانوں کا حال کیا ہوتا؟ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ آج ہر شعبے میں جو قیادت ابھر رہی ہے اور ملک کی پالیسی سازی جس رخ پر اور جس ذہن سے کی جا رہی ہے اس میں دینی تعلیم کے اثرات بڑے ہی معمولی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بڑی جستجو سے تلاش کرنا پڑتا ہے کہ کہاں کس رخ پر دینی یا اخلاقی تصورات کی جھلک موجود ہے۔ جب کہ اس امت کی یہ تمنا اور خواہش ہے کہ ان حقیقی علمی روایات کی بازیافت کی جائے جو ہمارے ملی عروج کا سبب بنیں۔

"دینی تعلیم کے مراکز دوبارہ وہ منصبی کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔ جس کے وہ ذمہ دار اور مستحق ہیں، اور جس کو اختیار کئے بغیر یہ امت کبھی صحیح رخ پر ترقی نہیں کر سکتی؟" یہ دراصل وہ سوال ہے، جو اس وقت ہمارے زیرِ غور ہے۔ ہمیں یہ جائزہ زیادہ سے زیادہ معروضی انداز میں لینا ہے تاکہ حقائق جیسے بھی ہیں ان کو متعین کر سکیں اور پھر جس منزل کی طرف ہمیں جانا ہے اس کے درمیانی فاصلے کا ادراک کریں اور یہ سوچیں کہ اس خلیج کو کس طرح پاٹا جا سکتا ہے۔ اسی بات کو سامنے رکھ کر میں نے غور و فکر کے لئے آپ کی خدمت میں نو نکات بھیجے تھے۔

ان میں ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ دینی مدارس کا اس وقت جو کردار ہے، جو حال ہے اور جن

حالات میں وہ یہ کارِ خیر انجام دے رہے ہیں اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے۔ مستقبل کے لئے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جہاں ہم اس وقت ہیں، اس کا تعین ہو جائے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ دینی مدارس کی تعلیم اپنا وہ کردار کیوں ادا نہیں کر پا رہی ہے؟ اس کے بہت سے پس منظر ہو سکتے ہیں، جن پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس میں پہلی چیز جس کا آغاز ہمیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے حکمت عملی ہو؟ اس کا تعلق مقاصد کے تعین، نصاب کی تشکیل نو اور افراد کار سے ہے۔ کس طرح موجودہ دینی تعلیمی نظام اپنے زیرِ تربیت افراد کی صلاحیتوں اور مزاج میں مثبت تغیر پیدا کرے اور وہ ایک ایسا کردار ادا کر سکیں جو انہیں ادا کرنا چاہیئے، لیکن ابھی ادا نہیں کر پا رہے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کا اجتماعی نظام بدل چکا ہے۔ ایک بالکل نیا ماحول اور نئی قیادت وجود میں آچکی ہے۔ اسی طرح ایک نیا تعلیمی نظام بلکہ ایک نئی معاشرت، نئی سیاست، نیا قانون اور نئی معیشت تشکیل پا چکی ہیں۔ نتیجہ کے طور پر یہ دنیا کے وہ مسائل ہیں جن سے ہمیں سابقہ پیش آرہا ہے۔ جب تک اس نظام تمدن کو مجموعی طور پر سمجھا نہ جائے گا اسے بدلنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس ہدف کے لئے کم از کم موجودہ دینی نظامِ تعلیم کی تشکیل جدید از بس ضروری ہے کہ جہاں سے دینی عناصر قوت حاصل کر سکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ قدیم و جدید کے اس ٹکراؤ اور فاصلے کو ختم کرنے کے لئے کون کہاں سے کیا کوششیں کر سکتا ہے۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ اگرچہ قدریں بدل چکی ہیں مگر ہم انہیں فکری اور تہذیبی سطح پر قبول نہیں کر سکتے۔ انہیں بہر حال اپنے دینی مقاصد کے مطابق ڈھالنا ہے۔ دینی عناصر اور دینی تعلیمی ادارے اس میدان میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ اس مکالمے کو بحال کرنے کی ضرورت ہے۔

اس اعتبار سے غور و فکر پر مرکزی موضوعات بنتے ہیں، معیار تعلیم کا مسئلہ، نصاب اور کتب کا مسئلہ، دینی قیادت کا مسئلہ، فن تدریس، فن تربیت اور اس سلسلے میں جو عصری تبدیلیاں ہوئی ہیں ان سے استفادہ کرنے کی حدود اور طریق کار کا مسئلہ وغیرہ۔

یہ امر واقعہ ہے کہ آج ہمارے دینی مدارس کا نصاب تعلیم اس سے بہت مختلف ہے کہ جب مسلمان حکمران تھے۔ اس وقت مسلمانوں کا نظام تعلیم معاشرت و حکومت کے عصری تقاضوں سے مربوط تھا اور جو نتائج دے رہا تھا وہ آج کا دینی نظام تعلیم نہیں دے رہا ہے۔

اس سے ہمیں یہ قرینہ بھی ملتا ہے کہ کیوں نہ دونوں نظام ہائے تعلیم کو یک جا کر دیا جائے۔ دور عروج میں دین اور دنیا کی تعلیمی ضرورتیں ایک ہی نظام تعلیم پوری کر رہا تھا، لیکن دور انحطاط اور پھر دور محکومی میں دینی ضروریات پوری کرنے والا نظام تعلیم، معاشرت و ریاست کے تقاضوں سے بے تعلق پود تیار کرنے لگا اور دنیاوی ضروریات پوری کرنے والے نظام تعلیم کو دینی تقاضوں سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ مستقبل میں پھر اسی عظیم الشان نظام تعلیم کو رائج کیا جائے، جو تعلیم کے ان دونوں دھاروں کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہا ہو۔ اس اعتبار سے یہ توقع بالکل بجا ہے کہ علماء کرام جو بھی نظام تعلیم تشکیل دیں، اس میں اس ضرورت اور تعلیمی روایت کو ملحوظ رکھیں جس کے نتیجے میں ان کا نظام تعلیم ایک طرف علماء تیار کرے، وہاں دوسری جانب زندگی کے دیگر شعبوں کو بھی متاثر کرے۔

اگر ہم اس نظام اور نصاب کے موجودہ مرحلے میں صرف چار میدان کار کو ہدف بنائیں اور اگلے دس، پندرہ، بیس اور پچیس سال میں جم کر تجربے، عمل اور ترویج کی کوشش کریں تو انشاء اللہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ مطلوبہ پالیسی جس کی جانب ہماری نگاہ بار بار اٹھتی ہے، اسے ہم نہ پالیں۔

(الف) پہلا میدان کار ایسے علماء اور فقہاء کی تیاری ہے جو فی الحقیقت دین میں درک رکھتے ہوں فہم دین سے منور ہوں، ان کے اندر صلاحیت ہو کہ وہ قرآن و سنت کو سمجھ سکیں۔ مزید یہ کہ آج ہمیں ایسے قانون دانوں، فقہا اور قاضیوں کی ضرورت پڑ رہی ہے جو بیرون ملک اور اندرون ملک پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ قومی ضروریات پورا کرنے کے لئے ایسے افراد بھی تیار کرنے چاہئیں جو شریعت اور دوسرے قوانین کی تشریح و تعبیر کر سکیں۔ اس وقت دینی مدارس سے جو تعداد پڑھ کر نکل رہی ہے اس میں بہت ہی کم افراد اس چیلنج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اگر ہم ایسے افراد کار تیار نہ کر سکے تو بحیثیت مجموعی مات کھا جائیں گے۔

(ب) دوسرا میدان کار ایسے خطیب اور امام تیار کرنا ہے جو مسلم معاشرے کی بنیادی ضرورت ہیں۔ یہ افراد ہمارے محسن ہیں اور ان ہی کے ذریعے ہم نے قرآن کو پڑھا ہے اور دین کو سیکھا ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی ایک قدم آگے بڑھائیں تو آج کی ملکی اور بیرونی ضروریات کے تحت "مبلغ اور داعی" بھی تیار کریں، جو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک خدمات

انجام دے سکیں۔ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ یورپ، افریقہ اور امریکا میں مسجدیں اور اسلامک سینٹرز موجود ہیں، مگر پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت سے جانے والے خطیب و امام ان معاشروں اور مقامی افراد کے ذہن کو نہیں سمجھ پار ہے ہیں۔ جو افراد یہاں سے جاتے ہیں ان میں سے سو میں ایک یا دو ہی انگریزی سمجھ یا بول سکتے ہیں۔ یہ ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ نو مسلم بھائیوں کو سنبھالیں اور غیر مسلم معاشروں کو اسلام سے روشناس کرائیں، اور دین اسلام کی دعوت کو پہنچائیں۔ اس اعتبار سے انگریزی کا سیکھنا کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔

(ج) تیسرا میدان اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لئے ایسے اساتذہ کی تیاری کا ہے جو عربی، فارسی اور اسلامیات کی تدریس کر سکیں۔ بلکہ میں اس سے بھی آگے بڑھوں گا کہ دینی تعلیم گاہوں کے ذہین افراد معاشیات، سیاسیات، عمرانیات اور قانون میں بھی مقام پیدا کریں۔ اگر ہم یہ ہدف بنالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اگلی اور اس کے بعد کی نسل کو یہ درس گاہیں ذہن ساز شخصیتیں دے سکیں گی۔ اس طرح بے دین شارحین اور تجدد پسندوں کے بجائے دینی تعلیم کے فارغ التحصیل ماہرین، عمرانیات کی رہنمائی کے منصب کو سنبھالیں گے اور یہ اقدام ایک دوررس انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

(د) چوتھا دائرہ صحافت، انتظامیات اور خدمت عامہ وغیرہ کا ہو سکتا ہے۔ اس میدان میں چند منتخب دینی مدارس کو منصوبہ بنا کر اپنا رول ادا کرنا چاہیئے۔ یہ بہت بڑا میدان ہے، جہاں ہزاروں افراد کو ہم بھیج سکتے ہیں اور یہ افراد یقیناً سیکولر تعلیم کے فارغ افراد سے بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ چار چیزیں اپنے سامنے رکھ کر آپ دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم پر نگاہ ڈالیں تو بڑی آسانی سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہمیں کہاں کہاں تبدیلی کی ضرورت ہے اور اس کی حکمت عملی کیا ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر پرائمری یا ابتدائی درجہ میں صورت یہ ہو کہ قرآن پاک، سنت رسول پاک ﷺ اور فقہ کا عمومی فہم حاصل ہو، عربی زبان کے لئے اس مدت میں ایسا سہل نظام تدریس اختیار کریں، جس سے ہر شخص بنیادی قواعد اور اسالیب کو سمجھ لے اور اسی کی بنیاد پر اگلے درجوں میں وہ حصول علم کر سکے۔ اس سے اگلے مرحلے میں گہرائی میں جائیں اور وہاں پر مختلف علوم کو الگ الگ کر سکتے ہیں۔ مثلاً

جن افراد کو "فقیہ" بننا ہے ان کو عربی زبان، منطق اور اصول پڑھائیں۔
جن افراد کو "مدرس یا مبلغ" بنانا ہے، ان کے لئے نصاب میں ذرا تبدیلی کریں، جس سے ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ آگے چل کر حکمت تدریس اور حکمت تبلیغ کو احسن انداز سے روبہ عمل لا سکیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں فنِ تعلیم کی سائنس اور نفسیات کے مضامین کو اسلامی فلسفہ و حکمت کے مطابق ترتیب دینا ہوگا۔ یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔

اس کے بعد تخصص (Specialization) کا مرحلہ آتا ہے۔ کچھ لوگ امام خطیب اور مدرس بن کر عملی زندگی میں داخل ہو جائیں گے یا کچھ افراد ایم اے کر لیں گے۔ لیکن کچھ افراد ایسے ضرور ہوں جنہیں درجہ تخصص میں فقیہ بنایا جا سکے۔ ان کے لئے تحقیق و تالیف کی تربیت اور بیرونی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ یہ کام سارے ادارے تو نہیں کر سکتے، لیکن بہر طور ملک کے چار پانچ دینی تعلیمی ادارے بھی اس ضمن میں منصوبہ سازی اور حکمت عملی تیار کر لیں تو حقیقی معنوں میں بہت بڑی خدمت ممکن ہو سکتی ہے۔

اس طرح اپنی تعلیمی روایت کو مجروح کئے بغیر نیا کردار بھی سامنے آ سکے گا اور نئی ضرورتوں کا کوئی حل بھی پیش ہو سکے گا۔ سوچ بچار کے لئے یہ ابتدائی نوعیت کی تجویز ہے جس کو مزید گہرائی میں جا کر عملی شکل دی جا سکتی ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ کاش اس حوالے سے کام کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھے۔

دینی مدارس کے حوالے سے کچھ مسائل کا پوری گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے :

اولاً۔ فقہی اور مسلکی اختلافات کا مسئلہ
ثانیاً۔ دو نظام ہائے تعلیم یعنی دینی اور دنیاوی نظام تعلیم کے انضمام و اشتراک کا مسئلہ اور
ثالثاً۔ دینی مدارس اور حکومت کے تعلق کا مسئلہ۔

مسلمانوں میں فروعی اور مسلکی اختلافات کا حل ہرگز کسی قوت، قانون اور حکومت کے دباؤ سے ممکن نہیں ہے۔ چوں کہ مسئلہ دین کا ہے اور ہر مسلک پر قائم فرد اسے دین کا بنیادی تقاضا سمجھ کر جما ہوا ہے۔ لیکن اگر تمام علماء خود مل کر کسی مرکزی و وفاقی بورڈ کے ذریعے متحدہ نصاب تجویز کریں اور یکساں نظام امتحان بنالیں، اور اس طرح باہم مشورہ تبادلہ خیال کی

مستقل بنیاد فراہم ہو جائے تو امکان ہے کہ آئندہ تعلیمی عمل متحد اور یکساں ہو، جس کی وجہ سے اختلاف مسالک خود بخود گھٹتا چلا جائے گا۔ ویسے اختلاف کے ضمن میں امر واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک دوسرے کو اسلام سے خارج نہ سمجھا جائے تو اصلاح ممکن ہے۔ علمی سطح کا اختلاف اور چیز ہے لیکن فرقہ بن کر دوسرے کی تکفیر کرنا الگ چیز ہے۔ بدقسمتی سے اختلاف نے کافر سازی کی جس رسم کو ہمارے ہاں گہرا کر دیا ہے، اس کا آغاز یہودی سازش سے ہوا، لیکن اس کی جدید ترین شکل ہمیں استعماری طاقتوں نے مہیا کی ہے۔ بذات خود اختلافِ تعبیر ہو تو تحقیقات ہوتی ہیں کہ کس کی رائے درست ہے اور کس بنیاد پر درست ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ تعلیمی نظم میں مشاورت، نصاب میں ہم آہنگی و یکسانیت اور اساتذہ کے باہم استفادے کے نتیجہ میں اختلاف کی شدت گھٹ جائے گی، اور فرقہ واریت کی جگہ دلیل کی بنیاد پر علمی اختلاف رائے کا باوقار انداز متعارف ہو سکے گا۔ ماضی میں بھی دراصل یہ شکل تھی کہ اختلاف تو کسی نہ کسی دائرے میں تھا۔ لیکن ایک مسلک کے فقہا اور علماء کے شاگرد دوسرے مسلک کے اساتذہ کے پاس جاکر استفادہ کرتے تھے۔ پہلے ایک سے پڑھا تو پھر دوسرے سے بھی جاکر پڑھا۔ اس اعتبار سے کتنی تابناک تعلیمی روایت ہمارے ہاں موجود رہی ہے۔ اس تعلیمی روایت کا احیاء امت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

حکومت اور دینی مدارس کے تعلقات ایک بڑا اہم بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے، جس میں نزاکتیں اور مشکلات بھی ہیں۔ سرکاری سرپرستی سے جہاں بہت سے مواقع حاصل ہوتے ہیں، وہاں اس سے بہت سی پابندیاں بھی لگ جاتی ہیں اور بہت سی زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ ماضی میں ہماری یہ روایات رہی ہیں کہ ہم نے سرکاری سرپرستی بھی حاصل کی اور اپنی آزادی کو برقرار اور محفوظ بھی رکھا۔ ہمیں آج کے بدلے ہوئے حالات میں اس مسئلے کا حل سوچنا ہے۔

اسی طرح اس وقت دو متوازی نظام ایک دینی تعلیم کے نظام اور دوسرا جدید تعلیم کے نظام کا مسئلہ ہے۔ ان دونوں کو کس طرح ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ کیا ان کے انضمام کی کوئی تدریجی پالیسی اختیار کی جائے جس کے تحت ایک خاص مدت میں یہ دونوں نظام مل جائیں، پھر جو نیا نظام ہو وہ دینی اور دنیاوی دونوں ضرورتوں کو پورا کرے۔ ابتداً ان دونوں میں کچھ اصلاحات کی جائیں، ان دونوں کے درمیان کچھ پل بنا دیئے جائیں۔ اس طرح کوئی ایسا راستہ بن سکے، جو آگے چل کر اس بعد کو دور کر سکے اور تعلیم کا ایک نیا ماڈل تیار ہو سکے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں نظام ہائے تعلیم کا اپنا ایک مزاج ہے اور اگر ان کو ایک دوسرے میں ضم کردیا جاتا ہے تو غور کرلینا چاہیئے کہ پھر اس سے کیا نفسیاتی تبدیلیاں واقع ہوں گی۔

یہ وہ سارے نازک پہلو ہیں، جن پر سوچ بچار اور باربار غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے اور پھر قوم کو کوئی ایسا راستہ دکھانے کی ضرورت ہے کہ ہم کس طرح یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ پاکستان سے باہر مسلم دنیا میں اس پہلو پر جو کوششیں ہو رہی ہیں، وہ بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہئیں۔

---

سیمینار "دینی مدارس کا نظام تعلیم" ۲۳ نومبر ۱۹۸٦ء

# علی گڑھ، ندوۃ العلماء، جامعہ عثمانیہ

مولانا عبداللطیف اعظمی

اصلاح تعلیم کی تحریک، اپنے ادبار و انحطاط کے احساس اور دوسری قوموں کے عروج و ترقی کے انفعالی اثر کا نتیجہ ہے جب لوگوں نے اپنی پستی کو محسوس کیا اور دوسروں کی ترقی کو دیکھا تو ابھرنے اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ترقی کی جب فکر ہوئی تو اپنے نقائص پر نظر پڑی، انھوں نے سوچا کہ نقائص کا دور کرنا ہی درحقیقت ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے، اس لئے اسی کی اصلاح مقدم قرار پائی، اس طرح اصلاح تعلیم کی تحریک کی بنیاد پڑی۔

ہندوستان میں اصلاح تعلیم کی تحریک کو شروع ہوئے کچھ زائد نصف صدی ہوتی ہے مگر عالم اسلامی کے دوسرے حصوں میں اس کی بنیاد اٹھارہویں صدی کے اوائل میں پڑ چکی تھی۔ نامناسب نہ ہوگا، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ہندوستان سے نکل کر عالم اسلام کے بعض حصوں کی تعلیمی تحریکوں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورا عالم اسلام خواب غفلت میں سرشار اور صید ادبار و تنزل میں اسیر تھا، غرض وہ تمام علامات جو کسی قوم کے مٹنے اور فنا ہونے کی ہو سکتی ہیں، طاری تھیں۔ لوگ اسی حالت میں تھے کہ مغرب کا سیاسی و تمدنی عروج و اقتدار کا سیلاب آیا اور اس نے تمام عالم اسلامی کو اپنی رو میں لے لیا۔ عوام سوتے رہے مگر چند ذکی الحس اور صاحب فکر اٹھے، دوسروں کو جگایا اور خطرات سے آگاہ کیا۔

ان اطباء نے امت مرحومہ کے امراض کی تشخیص کی اور ان کے علاج کے لئے نسخے لکھے، ان نسخوں میں حالات، ماحول اور تشخیص کے لحاظ سے فرق تھا، مگر سب کا مقصد ایک تھا وہ یہ کہ کھویا ہوا عروج و عزت حاصل کی جائے اور ذہنی و مادی ترقیوں کے لئے وسائل پیدا کئے

جائیں۔ان نسخوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ان میں سے ایک نسخہ وہ ہے جس کی بنیاد مغربی تہذیب و تمدن کے اختیار و تقلید پر ہے یعنی یہ کہ ادبار و تنزل سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ ترقی یافتہ قوم کی تہذیب و تمدن کو اختیار کیا جائے، ان کے علوم و فنون کو سیکھا جائے اور اس راہ میں جو مشکلات و موانع پیش آئیں، انہیں دور کیا جائے۔ اس نسخے کے طبیب حاذق تیونس کے مشہور مفکر شیخ محمد بیرم تھے۔ انہوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں اسی تخیل کے مطابق متعدد مدارس قائم کئے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جامع زیتونی میں جوازہر کے بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے، فرانسیسی زبان اور جدید علوم داخل کئے۔ آج کل مصر و ترکی کے تمام رہنما اسی نسخہ پر عمل کر رہے ہیں۔

۲۔ دوسرا نسخہ وہ تھا جس کی بنیاد مذہب پر تھی، اس میں اصلاح مذہب کو ترقی کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا اور اصلاح مذہب کے لئے تعلیم کی اصلاح ہی کامیابی کا ذریعہ تھا، اس نسخہ کے لکھنے والے سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ (رحمہما اللہ) تھے۔ اس تحریک کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ''اصلاح دینی'' کا لقب دیا ہے۔ اس کے لکھنے والوں نے دیکھا کہ بظاہر امراض بہت سے نظر آتے ہیں مگر یہ شاخیں ہیں کسی اور جڑ کی، یہ جڑ کیا ہے؟ دین کا اپنی اصلی شکل و صورت میں باقی نہ رہنا۔ تشخیص کے بعد سوال تھا طریق علاج کا۔ ان لوگوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ دین میں اس وقت رخنہ پیدا ہوا، جب صحیح علماء باقی نہ رہے، علماء کا زوال، دین کے زوال کا سبب بنا، اس لئے سب سے پہلے صحیح علماء پیدا کرنے کی فکر ہوئی، جو قوم کی اصلاح و تجدید کے فرائض کو باحسن انجام دے سکیں۔ صحیح معنی میں علماء پیدا کرنے کے لئے صحیح اور حقیقی تعلیم کی ضرورت تھی، اس لئے اس وقت کے تمام مصلحین نے طریق اور نصاب تعلیم کی اصلاح پر زور دیا۔

شیخ محمد عبدہ جو گزشتہ صدی کے مجددین و مصلحین میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، چاہتے تھے کہ ایک ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے جس کا نصاب تعلیم فضول کتابوں اور غیر مفید مباحث سے یکسر پاک ہو اور جدید حالات و جدید ضروریات کے مطابق ہو۔ انہوں نے ۱۳۰۴ھ میں لائحۃ الاصلاح والتعلیم الدینی کے نام سے ایک مبسوط اور مفصل اسکیم لکھ کر بذریعہ شیخ الاسلام، سلطان عبدالحمید کی خدمت میں پیش کی تھی، اس میں نہایت تفصیل سے

اس حقیقت کو واضح کیا گیا تھا کہ دولت عثمانیہ آخری اسلامی حکومت ہے اس لئے وہ تمام مسلمانان عالم کی اصلاح حالت کے لئے ذمہ دار ہے اس اصلاح کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کی صحیح و حقیقی دعوت و اصلاح کے وسائل پیدا کئے جائیں اور وہ ممکن نہیں، جب تک تعلیم دینی کی اصلاح و تجدید نہ ہو۔

تمہید کے بعد اس میں تعلیم کے تین درجے قرار دیئے تھے۔ ابتدائی، اوسط، اعلیٰ۔

**ابتدائی تعلیم عامہ** : مسلمین کے لئے ہونی چاہیئے اور اس کے لئے ایک جامع و سہل الفہم نصاب عقائد، فقہ اور تاریخ، اسلام و سیرت نبوی و صحابہ کا ہونا چاہیئے، جو یکسر تعلیم قرآنی سے ماخوذ اور لاحاصل مباحث جنگ و جدال سے معرا ہو۔

**تعلیم درمیانی** : اس طبقہ خواص و متوطین کے لئے ہونی چاہیئے جو مختلف ملکی و اجنبی زبانوں اور علوم و فنون جدیدہ کو حاصل کر کے مختلف مشاغل معاش و ملازمت میں مشغول ہوں۔ ان کے لئے ایک دوسرا نصاب ہونا چاہیئے جو پہلے سے وسیع تر ہو مگر تمام کتاب و سنت سے ماخوذ، اور صرف عقائد، فقہ سادہ اور تاریخ دینی و مدنی اسلام پر مشتمل ہو، البتہ ایک کتاب اس میں ایسی بھی ہونی چاہیئے جو علوم اسلامیہ اور مذہب اسلام کی تاریخ سے پوری واقفیت پیدا کرائے۔

**آخری درجہ عالی** : ان لوگوں کے لئے ہو جو قوم کے لئے مرشد و معلم اور داعی و رہبر ہوں۔ ان کے لئے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے جامع و اصلاح یافتہ نصاب تعلیم کی ضرورت ہے۔

نیز انہوں نے لکھا تھا کہ "مشکلات شدید اور کام اہم اور نازک ہے لیکن ساتھ ہی نتیجہ، فوز و فلاح ہے اس کے سوا تمام ابواب عمل مسدود ہیں۔ پس ناگزیر ہے کہ تعلیم دینی کے نظام میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جائے طریق تعلیم بھی ہمارا بہت کچھ محتاج اصلاح ہے، اساتذہ کو کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ قدیم املا جو ٹھیک ٹھیک آج کل کی یونیورسٹیوں کا طریق تدریس ہے، پھر جاری کیا جائے یہ آخر میں علما نے تجویز پیش کی تھی کہ سب سے پہلے ایک مرکزی اسلامی یونیورسٹی قسطنطنیہ میں قائم کی جائے اور اسلام کے زیر اہتمام ہو اور تمام ممالک عثمانیہ اور دوسرے اسلامی ممالک مثلاً ہندوستان، جاوا اور چین میں

اس کی شاخیں قائم کی جائیں اور تمام مدارس اور یونیورسٹیاں اپنے مرکز سے ملحق ہو۔"(۱)

ٹھیک یہی دونوں تحریکیں ہندوستان میں بھی شروع ہوئیں۔ معلوم نہیں عالم اسلامی کی گونج تھی یا اسباب و علل کی یکسانیت کی وجہ سے نتیجہ و معلول میں بھی یکسانیت تھی بہر حال دونوں میں بالکل یکساں۔ (۱) پہلی تحریک علی گڑھ کی ہے جس کے بانی و مبانی سرسید ہیں۔ (۲) اور دوسری ندوۃ العلماء کی۔ پہلے تحریک علی گڑھ کو لیجئے۔

## تحریک علی گڑھ

سرسید ہمارے تعلیمی ہراول کے پہلے جنرل ہیں۔ انہوں نے ہماری تعلیمی کشتی کی اس وقت ناخدائی کی جب وہ ساحل سے کوسوں دور اور سخت طوفانوں میں گھری ہوئی تھی۔ لوگوں کے قلم و دل آزاد ہیں، وہ سرسید کے متعلق جو چاہیں لکھیں، لیکن ان حالات میں جن میں سرسید نے قوم کی بقاء و حیات کے لئے انگریزی تعلیم و تمدن کو ضروری سمجھا اور انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کو ہندوستان کی دوسری تعلیموں پر ترجیح دی، اگر ہمارے نقادوں کو اس زمانہ کے مسئلہ تعلیم کو حل کرنا ہو تو یقین ہے کہ ان کے قلم کی سیاہی خشک اور زبان میں لکنت پیدا ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید نے جس تعلیم اور طریق تعلیم کو مسلمانوں میں رواج دیا اور ان کی حیات و بقاء کے لئے ضروری سمجھا، وہ نہ تو ہندوستان کی تمدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور نہ قومی زندگی کی اٹل ضرورتوں اور روزمرہ کی احتیاجوں کو پورا کرتا ہے لیکن اگر اس زمانہ کے حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نظام تعلیم کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، سرسید کو جس وادی سے گزرنا پڑا ہے، وہ چاروں طرف سے کانٹوں سے گھری ہوئی تھی، اس لئے یہ کہنا کہ ان کا دامن کہیں الجھا نہیں، بہت بڑی جسارت ہوگی مگر اسے طے کر لینے پر تحسین نہ کرنا بھی بہت بڑی زیادتی ہے۔

سرسید کی تعلیمی خدمات کی ابتداء مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ کے قیام سے ہوتی ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۹ء میں قائم کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی فارسی اور اردو وغیرہ کی تعلیم کے متعلق ان کی رائے بدل گئی اور انہوں نے حکومت سے سفارش کی کہ "گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھادے اور صرف انگریزی اسکول جاری رکھے۔" مگر

---

(۱) شیخ محمد عبدہ کی پوری اسکیم الہلال ۱۱ فروری ۱۹۱۳ء سے ماخوذ ہے البتہ کہیں کہیں مشکل عربی الفاظ کو آسان الفاظ میں بدل دیا گیا ہے۔

مشکل یہ تھی کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا، عیسائی ہو جانے کے مترادف ہے۔ چناں چہ ۱۸۳۵ء میں جب حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو جاری کرنا چاہا تو مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی اور اس کے حاصل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان حالات کو دیکھ کر سر سید نے ضروری سمجھا کہ انگریزی اسکول اور کالج قائم کرنے سے قبل مسلمانوں کے دل میں انگریزی زبان و علوم کی اہمیت اور اس کی علمیت جاگزیں کی جائے۔ اور انگریزی سے علمی اور تاریخی کتابیں اردو میں منتقل کر کے، ان کے دل میں مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت بٹھائی جائے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے، انہوں نے متعدد مقامات پر سوسائٹیاں قائم کیں۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ایک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا اور اس میں انگریزی کے علاوہ، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ سر سید نے بنیاد رکھتے وقت ایک مبسوط تقریر کی تھی، تقریر نہایت مؤثر اور ان کے جذبات کی پوری پوری آئینہ دار ہے، انہوں نے آخر میں فرمایا تھا کہ

”اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی ہے، تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے، بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں، جس طرف تو چاہتا ہے، پھیرتا ہے، ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دل کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا جو صرف ہمارے ہی لئے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد بھی بہت سی نسلیں آنے والی ہیں، ان کے لئے ایک روشنی ہے۔ تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا۔ اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے، تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے، تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے، اسی طرح خیر اس کا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

اس تحریر سے تعلیم کے متعلق سر سید کے خیالات کا اندازہ نہیں ہوتا مگر ان کی نیت کا خلوص اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی خواہش ہر ہر لفظ سے ٹپک رہی ہے۔

سر سید انگریزی تعلیم اور جدید طریق تربیت پر بہت زور دیتے تھے مگر خود ان کے

ذہن میں اس کا کوئی واضح خاکہ موجود نہیں تھا۔ ابھی تک انہوں نے جو اسکول قائم کیے تھے، ان میں انگریزی محض برائے نام تھی جو ان کے عزائم کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ انہوں نے سوچا کہ کسی دار العلوم یا یونیورسٹی قائم کرنے سے قبل، یورپ جا کر بچشم خود، وہاں کے نظام تعلیم اور طریق تربیت کو دیکھا جائے اور اس کے مطابق ہندوستان میں کوئی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چناں چہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں اس غرض سے یورپ روانہ ہوئے۔ جب انگلستان پہنچے تو وہاں کی دنیا ہی الگ نظر آئی، گئے تھے محض نظام تعلیم اور طریق تربیت کے مطالعہ کے لئے مگر وہاں کی ترقی اور ہماہمی کو دیکھ کر حریص طبیعت بے چین ہو گئی۔ دل نے چاہا کہ اگر یہ جنت ہندوستان میں منتقل نہیں ہو سکتی تو ایسی ہی وہاں کیوں نہ قائم کی جائے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوب صورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں۔ پوچھا کہ کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا، سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بے جا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوئی۔"

قیام کے طول کے ساتھ دل کی بے چینی بڑھتی گئی۔ جب سیل جذبات پر قابو نہ رہا تو تحریر کی صورت میں بہہ نکلے مگر سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ لوگوں کا غم و غصہ اور مشتعل ہو گیا۔

۱۷ ماہ کے بعد انگلستان سے واپس آئے، آتے ہی کالج کے قائم کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ مشکلات پہاڑ کی طرح سدراہ ہوئیں، مگر سر سید کی طبیعت کوہ کنی میں، فرہاد سے بھی بازی لے گئی۔ بالآخر انہوں نے تمام ناسازگار حالات پر قابو حاصل کر لیا اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڑھ میں کالج کی بنیاد رکھی۔

از بخت شکر دارم واز روزگار ہم

اب سر سید کی ذمہ داریاں اور ان کے مشاغل بہت زیادہ ہو گئے تھے، ملازمت کے ساتھ ساتھ انہیں انجام دینا مشکل تھا، اس لئے ملازمت سے پینشن لے لی اور کلی طور پر کالج کے

ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے کالج کو ترقی دینے اور مسلمانوں میں انگریزی کی اشاعت کرنے کے لئے جان توڑ کوششیں کیں۔ ایک منٹ بھی توقف اور غفلت میں ضائع نہیں کیا اور کرتے بھی تو کیوں کر

یاں رہ عشق ست و کج گشتن ندارد باز گشت
جرم رااین جا عقوبت ہمت را استغفار نیست

گو سر سید یورپ سے بہت زیادہ مرعوب تھے، اس کی ہر چیز کی تقلید کو ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ مغربی علوم و فنون میں پوری دست گاہ رکھیں بلکہ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ مغربی معاشرت اختیار کرلی جائے۔ اس پر انہوں نے اپنی متعدد تقریروں اور تحریروں میں زور دیا اور اس کی مخالفت پر بہت تاسف ظاہر کیا۔ لیکن اس غلو کے باوجود وہ مذہبی اور اسلامی تعلیم کو نصاب تعلیم کا ضروری جز سمجھتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اگر ایک طرف اسلامی علوم و معارف میں بہترین دست گاہ رکھتے ہوں تو دوسری طرف مغربی علوم و مغربی لٹریچر سے بھی بخوبی واقف ہوں، اگر ایک طرف قرآن و حدیث کے حامل ہوں، اور مسلمانوں کی امامت و قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں تو دسری طرف بیرسٹری اور ججی وغیرہ کی بھی صلاحیت ہو، غرض وہ ایک ایسا دار العلوم یا یونیورسٹی چاہتے تھے جس کے گریجویٹس

در کف جام شریعت، در کف سندان عشق

کی مکمل تفسیر ہوں۔ چناں چہ ۱۸۷۶ء میں مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

"یاد رکھو، سب سے سچا کلمہ لا اِلٰہ اِلاّ اللہ محمد رَسُول اللہ ہے، اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے، پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم و اسلام) کے نمونے ہو گے اور جب ہی ہماری قوم کو عزت ہو گی۔"

۱۸۸۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی تو اس کے منجملہ اور مقاصد کے

یہ مقاصد بھی بہت اہمیت رکھتے تھے۔

۱۔ انگریزی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں، ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدار عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۲۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام بطور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا وغیرہ۔

۱۸۹۴ء میں اہل پنجاب نے، جالندھر میں سرسید کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں سرسید نے ایک تقریر کی تھی جس سے ان کے نظریہ تعلیم کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، اس تقریر کا قدرے طویل ٹکڑا کسی اور مناسب جگہ آئے گا۔ اس کے چند فقرے یہاں ملاحظہ ہوں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ:

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لآ اِلٰہ اِلاّ اللہ محمد رَّسُول اللہ کا تاج سر پر۔"

سرسید مغربی تعلیم کے نتائج و اثرات سے بے خبر نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی اشاعت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات جگہ لے لیں گے۔ مذہبی عقائد کی دیواریں متزلزل ہو جائیں گی، لوگوں میں دہریت، نیچریت اور لامذہبیت کا رجحان ترقی کر جائے گا۔ اس کے انسداد کے لئے ان کی سمجھ میں، اس کے سوا کچھ بھی نہ آیا کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں، جن میں نقلاً نہیں بلکہ عقلاً اس قسم کے شبہات اور اعتراضات کو رفع کیا جائے۔ چناں چہ اس اصول کے مطابق، انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی جو امت میں ایک جدید فتنہ کی باعث ہوئی، مگر ان کی نیت قطعی صاف تھی، اسلام اور مسلمانوں کو اس سیلاب سے بچانے کے لئے جو مغرب سے آرہا تھا اور جس کے لانے میں خود بھی معاون تھے، اس کے علاوہ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی کہ اس قسم کی ایک تفسیر لکھی جائے۔ اس کے متعلق ان کی ایک طویل تقریر کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں گا، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب بد ظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی، میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصل

مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے، بلکہ یہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگادی گئی ہیں۔

میں ہر گز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ سے ان سیاہ دھبوں کی چھڑانے کا وعدہ کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں۔ یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس وباعلم لوگوں کا ہے مگر جب کہ میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں، جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک ہوسکے، صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس کہتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گناہ گار ہوں گا۔"

سر سید نے مذہبی تعلیم کی حمایت کی اور اسے نصاب تعلیم میں داخل کیا مگر عربی زبان کو نصاب میں قطعی جگہ نہیں دی گئی۔ غالباً ۱۹۰۴ء میں "احیاء علوم عربیہ" کے نام سے علی گڑھ کالج میں ایک تحریک شروع کی گئی، یہ ایک انگریزی پروفیسر کی مرہون منت تھی اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ایماء سے شروع کی گئی ہے۔ نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لئے بھی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دی جائے۔ مگر کسی صاحب نے اس کی مخالفت میں، ریڈیکل کے فرضی نام سے علی گڑھ منتھلی میں ایک مضمون لکھا اور ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ عربی علوم وفنون اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے۔ ان مخالفتوں کی وجہ سے یہ تحریک سرسبز و شاداب نہ ہوسکی۔

بہر حال سر سید نے مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی معارف کی تعلیم کو بھی ضروری جز قرار دیا تھا مگر لوگوں کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ سر سید بھی معمولی دل ودماغ کے آدمی نہیں تھے۔ ان کے ارادوں میں ذرا بھی تزلزل پیدا نہیں ہوا، مایوسیاں گھیر لیتی تھیں مگر کوشش برابر جاری تھی۔

چوں د مبدم عنایت توفیق ممکن ست
در تنگ نائے نزع نہ کوشد کے چرا؟

سر سید گو حکومت کے بڑے ہی خواہ اور خیر خواہ تھے مگر یونیورسٹی میں اس کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ ہماری تعلیم بیرونی اثرات سے بالکل آزاد ہو، جالندھر کی جس تقریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ۔

"یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اس کے ہاتھ بِکے ہوئے ہیں، جو ٹکڑا علم کا وہ دیتی ہے، اس کو لکھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں، اے دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی، جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لاَ اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ۔ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستو! میں بھی انہیں میں سے ہوں کیوں کہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم تعلیمی کمیٹی میں پیش کی تھی، اس میں بھی تصریح تھی کہ "بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانِ حال رہے، اس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیئے۔" مگر ظاہر ہے اس زمانہ میں اس قسم کے خواب کی تعبیر مشکل بلکہ ناممکن تھی۔ وہ تو وہ زمانہ تھا کہ جس سے حکومت کی نگاہ پھر گئی، اس سے ساری خدائی پھر جاتی تھی۔ ندوہ جب قائم ہوا تھا تو علماء اور امراء دونوں کی طرف سے اس کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے یکایک صوبہ کے حاکم اعلیٰ (سر انٹونی میگڈانل) کو سیاسی بدگمانیاں ہوگئیں، اس کی نظر بدلنی تھی کہ مولانا ابوالکلام کے الفاظ میں "یکایک ندوہ کا عروج محاق میں آگیا، بربادی دنیا کے تمام سامان ایک ایک کر کے فراہم ہوگئے جس قدر

امراء وارباب دل ندوہ کے ساتھ تھے اور دارالعلوم کے لئے روپیہ دینا چاہتے تھے، ان کے لئے صرف اس قدر علم ہی کافی تھا کہ صوبہ کا حاکم اعلیٰ ندوہ کو اچھا نہیں سمجھتا، انہوں نے معاً انکار و تبرا شروع کر دیا۔"

جس سے اس نے پھیری آنکھیں، رنگ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہئے

اور بالآخر اس کی حالت اس وقت سنبھلی، جب کہ حکومت کے شکوک اور سوظن کو دور کیا گیا اور نہ صرف دور کیا گیا بلکہ حکومت کی اعانت بھی قبول کی گئی اور اس کی عمارت کا سنگ بنیاد لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا۔ وہ زمانہ اور تھا کہ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج رہا تھا اور عام تعلیم کے لئے ہزاروں درس گاہیں قائم تھیں مگر حکومت سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ آج کے حالات اس زمانہ سے بالکل مختلف ہیں، آج کل خیالات کی آزادی میں بہت ترقی ہو گئی ہے، اور حکومت کے نفوذ واثر میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے مگر پھر بھی کسی آزاد ادارہ کا چلانا، مشکلات و موانع کی بہت وسیع خلیج کو عبور کرنا ہے، سرسید نے جس تعلیم کی خواہش ظاہر کی تھی یعنی ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو، اسی کے مطابق جامعہ کی تاسیس عمل میں آئی ہے مگر اسے کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اس کا اندازہ اس تعلیم گاہ کے چلانے والے ہی کر سکتے ہیں۔

سرسید اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سخت مخالف تھے، وہ کچھ اس لئے مخالف نہیں تھے کہ انہیں خدانخواستہ اردو سے کوئی بغض تھا یا وہ اردو کی ترقی کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ اردو کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں تھے، اس کے لئے انہوں نے بہت سی کوششیں بھی کی تھیں مگر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے اس لئے مخالف تھے کہ اسے وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مانع سمجھتے تھے، وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے جیسا کہ بہت سے لوگ سرسید پر اعتراض کرتے وقت کہتے ہیں کہ تھوڑی بہت انگریزی پڑھ کر کسی دفتر میں چند روپوں کی ملازمت کر لی جائے۔ اسے وہ بہت حقیر چیز سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ، بیرسٹری، انجینئری اور ڈاکٹری کی سندیں حاصل کریں، ہائی کورٹ کے جج ہوں، کونسل قانونی کے ممبر

ہوں، یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے فراغت کے بعد، انگلستان جائیں، اور آکسفورڈ اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کریں۔ جو لوگ تجارت وغیرہ کی لائن اختیار کرنا چاہیں، وہ ہندوستان ہی میں محدود نہ رہیں بلکہ ہندوستان سے نکل کر دوسرے ممالک میں جائیں اور بڑی بڑی کمپنیاں قائم کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ذریعہ تعلیم اردو ہوگی تو ہم ان صیغوں اور محکموں میں جا سکیں گے اور نہ فاتح قوم کی سی ترقی کر سکیں گے۔ چناں چہ اسی وجہ سے ۱۸۸۱ء میں جس وقت پنجاب یونیورسٹی میں پھر ۱۸۸۹ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کو ترقی دینے اور اردو میں مغربی علوم کی تعلیم دینے کی تجویز ہوئی تو سر سید نے سخت مخالفت کی اور اس کی مخالفت میں متعدد مضامین لکھے۔

سر سید نے اپنے مضامین میں ذیل کی چیزوں پر خاص طور پر زور دیا تھا۔

"قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم و زبان حاصل کرے۔ اپنے فتح مندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی ان شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں ان فتح مندوں نے کاملیت حاصل کی ہے، سوشل عادات اور علمی و عملی خیالات، اس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔۔۔۔۔۔۔"

گورنمنٹ نے ہمارے لئے سول سروس میں داخل ہونے کا رستہ، گو اس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں، ابھی تک کھلا رکھا ہے، بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلوما اور انجینئری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو، جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ (۱)۔ جانے دو مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں، ہندوستان کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ ان حقوق کو واجبی طور پر حاصل کرنے کے لئے ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی۔۔۔۔۔۔ معمولی معمولی عہد سے بھی جیسے وکالت و منصفی و سب ججی ہے (۲)۔ بغیر انگریزی کی کافی لیاقت کے ہم کو میسر نہیں آ سکتے۔

ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں، ہم بساطی کی سی دکان داری سے نکلیں، ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی "محمدن اینڈ ہندو کمپنی" کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، ایڈنبرا میں، ڈبلن میں، براسلز میں، سینٹ پیٹر برگ میں، برلن میں، ویانا میں، قسطنطنیہ میں، پیکن میں، واشنگٹن میں اور دنیااور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری وبری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں، جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو پھر کیا ہمارے مردہ علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا، صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے۔"

ان تحریروں کا کیا اثر ہوا؟ اسے علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں سنیئے۔

"پنجاب یونیورسٹی پر ان کے (سرسید) تین پرزور آرٹیکل، قلعہ شکن توپیں تھیں جن کے صدمہ نے مشرقی تعلیم چکنا چور کر دیا، الٰہ آباد یونیورسٹی جب بن رہی تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائے گی، تو سرسید نے متعدد آرٹیکل اس زور کے لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اڑ گئے۔"

سرسید نے اس کی مخالفت میں نہ صرف پرزور مضامین لکھے بلکہ انگریزی حکومت کی پروا نہ کر کے بتلا دیا کہ وہ اپنی راہ کے روڑے کے ہٹانے میں دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ "اگر ایسا ہوا (یعنی ان یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کو روکا گیا) تو ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے، استقلال، استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، کوشش، کوشش، کوشش، ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے اور خود اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سیلف اسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دیا جائے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو <u>لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے، مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں۔" خط کشیدہ عبارت کو پھر پڑھیے</u>

(۱) یہ غالباً اشارہ ہے اس کی طرف کہ انڈین سول سروس میں یونیورسٹی کی کسی ڈگری کی شرط نہیں تھی جسے سرسید پسند نہیں کرتے تھے۔

(۲) آج جن عہدوں کو قابل فخر اور مطمح زندگی سمجھا جاتا ہے، وہ سرسید کے نزدیک معمولی عہدے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی یہ الزام صحیح ہو گا کہ سرسید انگریزی تعلیم سے محض دفتروں کے لئے کلرک چاہتے تھے؟

اور دیکھئے کہ اس میں حکومت وقت کو کس قدر دھمکی دی گئی ہے۔

معلوم نہیں سر سید کی یہی رائے آخر وقت تک باقی رہی یا مرور ایام کے بعد کچھ تبدیلی ہوئی یا کم از کم شدت میں تخفیف ہوئی؟ مولانا حالی اس پر صرف اس قدر روشنی ڈالتے ہیں کہ "۳۶ برس کے تجربہ سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"

سر سید اعلیٰ تعلیم کی راہ میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کو بھی مانع سمجھتے تھے، اس لئے اس کے بھی مخالف تھے، انہوں نے اپنے مضامین میں اس کی مخالفت کی اور لکھا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے لحاظ سے ابھی ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ دماغی اور تہذیبی تعلیم سب پر مقدم ہے، جب اس کی ضرورت نہ رہے گی تو کسی اور تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

سر سید تعلیم سے زیادہ تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ انسان چاہے کتنی ہی اعلیٰ ڈگری حاصل کر لے لیکن جب تک تربیت نہ ہو محض بے کار ہے، وہ کہتے تھے کہ میں بہت سے ایسے لوگوں سے واقف ہوں کہ جنہوں نے انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کی ہے مگر خانسامہ جیسی ذلیل ملازمتیں کر رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں اچھی تربیت اور عمدہ سوسائٹی میسر نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ہوٹل سسٹم (اقامتی زندگی) کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

یہ ہے، سر سید کی تحریک اصلاح تعلیم کی تاریخ جسے ہم نے اعتراض کرنے کے بجائے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بلا شبہ ان سے بہت سی لغزشیں ہوئیں مگر اسے بھولنا نہ چاہیئے کہ انہوں نے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت بھی انجام دی ہے۔ محض برائیوں کو گننا اور اچھائیوں کو نظر انداز کر دینا انصاف نہیں ہے۔ بلکہ صلحاء کا طریقہ یہ ہے کہ اچھائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور برائیوں سے اغماض کرتے ہیں۔ کیا یہی طریقہ ہمارے لئے مناسب نہیں؟

## تحریک ندوۃ العلماء

سر سید کی تحریک کی اہمیت اور اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سر سید کے غیر معمولی دل و دماغ اور ان کا بے پایاں صبر و استقلال، مسلمانوں کے بہت آڑے وقت میں کام آیا

لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تحریک قوم کے مرض کا پورا علاج نہ تھی۔ اس سے صرف قوم کا معاشی مسئلہ اور بعض دوسرے معمولی مسائل حل ہو سکتے تھے جو جدید تمدن نے پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ قوم کے حل طلب مسائل اس سے کہیں زیادہ تھے۔

اس تحریک میں سب سے بڑا نقص یا کمی یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کا انتظام بہت کم تھا، ضرورت تھی ایسے لوگوں کی جو جدید علوم کے ساتھ مذہبی اور اسلامی علوم سے بھی پوری طرح واقف ہوں، اور علی گڑھ کالج یا کوئی انگریزی کالج ایسے تعلیم یافتہ کو پیدا کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ چناں چہ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں :

"شاید کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن وحدیث کی حفاظت ہو سکتی ہی، کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذاہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے ؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں ؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے ؟"

اس لئے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس کے قیام میں مولانا شبلی نعمانیؒ اور دوسرے علماء اکابر شریک تھے۔ مولانا حالیؒ کا بیان ہے کہ ندوہ کی تحریک پر بھی سرسید کی تحریر و تقریر کا انفعالی اثر ہے۔ علماء نے طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے اصلاح کے سلسلہ میں جو تقریریں کیں، وہ درحقیقت سرسید کی تقریروں کی گونج ہے۔ ان کی اصلی تحریر ملاحظہ ہو :

"اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں، ان میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضاء کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر اب تک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے ہرگز مناسب نہیں لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفارمر ہے، ان کی اصلاح کئے بغیر نہ رہے گا، چناں چہ ندوۃ العلماء اسی غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلہ درس کی زمانہ حال کی ضرورت کے موافق اصلاح کرے اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلماء کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لئے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا..... پہلے جو ہمارے علماء علوم

جدیدہ کے پڑھنے سے اس لئے منع کرتے تھے، کہ ان سے اصول اسلام میں شبہات پیدا ہوں گے اور الحاد و دہریت پھیلے گی، اب بر خلاف اس کے وہ بھی وہی کہنے لگے ہیں جو بیس برس سے برابر سر سید کہتے چلے آئے ہیں۔"

ممکن ہے بخیال مولانا حالی، ندوہ کی تاسیس و قیام میں سر سید کی جدو جہد کا انفعالی اثر ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ گزشتہ صدی کے انقلابی رجحان اور اصلاح کا نتیجہ ہو، جسے ہم ابتداء میں بیان کر چکے ہیں مگر اس کے منصۂ شہود پر آنے میں سب سے زیادہ دخل زمانہ کو ہے، جس کی طرف مولاناؒ نے بھی اپنی تحریر میں اشارہ کیا ہے۔

ندوۃ العلماء کے قیام کا خیال ابتدائے ۱۳۱۰ھ میں اس وقت ہوا۔ جب مدرسہ فیض عام کان پور کی دستار بندی کے وقت بہت سے مشہور علماء جمع تھے۔ اس وقت علماء کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔ تکفیر بازی اور مناظروں سے متجاوز ہو کر، مقدمہ بازی کی نوبت آگئی تھی، اس لئے علما نے ایک ایسی انجمن کے قیام کی ضرورت محسوس کی جو علماء کو ان چیزوں سے روکے۔ چناں چہ اس وقت قیام انجمن پر جو تقریریں کی گئیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانون کے باہمی جھگڑے زیادہ ہوتے جاتے ہیں، مذہبی مقدمات کے عدالتوں میں دائر ہونے سے توہین اسلام ہوتی ہی، علماء میں مخالفت کو روز افزوں ترقی ہے اور سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ جیسے مفسر، محدث، فقیہہ، فلسفی متکلم، ادیب، شاعر اور مؤرخ پہلے زمانہ کے علماء تھے، اب اس پایہ اور قابلیت کے علماء کے وجود سے زمانہ خالی ہوتا جاتا ہے اور ان سب خرابیوں کا انسداد اس وقت ہو سکتا ہے، جب کہ ایک باضابطہ مجلس ہو۔

شوال ۱۳۱۱ھ مطابق اپریل ۱۸۹۴ء میں ندوہ کا پہلا اجلاس کان پور میں ہوا۔ اس میں ندوہ کے مقاصد اور طریق کار کی تعین ہوئی۔ اہم مقاصد صرف دو قرار پائے۔ (۱) اصلاح طریق تعلیم (۲) رفع نزاع باہمی۔ ان مقاصد کی ان الفاظ میں تشریح کی گئی تھی۔

غرض اول : چوں کہ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ جو طلباء علوم عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں وہ امور انتظامی دنیا اور معیشت سے محض ناواقف ہوتے ہیں اور بوجھ زیادہ عمر صرف ہو جانے کے کچھ اور کر بھی نہیں سکتے اس لئے وہ بے موقع طور سے اہل دنیا کے محتاج ہوتے ہیں اور عام کی نظروں میں بے وقعت اور بے کار ٹھہرتے ہیں اور علوم دینیہ سے بھی جیسی کہ واقفیت ہونی چاہیئے نہیں رکھتے جو علوم دینی اس وقت کے مناسب اور دین کے معین ہیں، ان

سے وہ ناواقف رہتے ہیں۔ یہ انجمن سب باتوں پر غور کر کے اولاً سلسلہ تعلیم کو درست کرے اور بالاتفاق تمام مدارس اسلامیہ میں جاری ہونے کی کوشش کرے اور جو امور ان طلباء کی تہذیب واخلاق اور ترقی علم میں مفید سمجھے حتی الوسع ان کے اجراء میں سعی کرے۔

غرض دوم : اس وقت ہمارے علماء کی باہمیں نزاعیں سخت نقصان پہنچا رہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا بڑا فساد برپا ہوتا ہے جس سے علماء اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کے مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے۔ یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی نزاع نہ ہونے پائے۔ اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعہ طے ہو جایا کرے۔" (روداد ندوہ بابت سال اول ص ۲۴، ۲۳)

گنجائش کم ہے اس لئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، بالغ نظریں اس سے پوری کیفیت و حالت کا اندازہ کر لیں گی۔ البتہ اس وقت کے نصاب تعلیم پر ہم قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت جو نصاب تعلیم عربی مدارس میں رائج تھا اسے درس نظامیہ کہا جاتا ہے۔ یہ نصاب اب بھی بہت سے عربی مدارس میں رائج ہے، مگر اس میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو گئی ہیں، لیکن اسے بھی درس نظامیہ ہی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کی اصل روح کو باقی رکھا گیا ہے۔ درس نظامیہ، ملا نظام الدینؒ کی طرف منسوب ہے جو لکھنو سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر قصبہ سہالہ کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے بعد میں زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر فرنگی محل میں مستقل سکونت اختیار کی۔ درس نظامیہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی اور ہے، بقول علامہ شبلیؒ کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم، عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک ثابت نہ ہو جائے کہ اس نے اسی طریقہ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ اس لئے اس پر تبصرہ کرنے کے لئے بہت زیادہ علم اور تعلیمی مہارت کی ضرورت ہے۔ راقم کو اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے، اس کے علاوہ بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے، معلوم نہیں کہاں قلم پھسل پڑے اور معلوم نہیں کس جگہ دامن الجھ جائے، اس لئے محفوظ راہ یہی ہے کہ اس کام کو ضرور کیا جائے۔ البتہ علامہ شبلیؒ علوم اسلامیہ کے بہت بڑے واقف کار تھے۔ خدا نے جہاں انہیں اور بہت سی صلاحیتیں عطا کی تھیں وہاں تعلیمی مہارت سے بھی بہرہ اندوز کیا تھا، اس لئے اس کے متعلق ان کی رائے بہت زیادہ وقیع اور قابل قدر ہو گی۔

مرحوم نے اپنے رسالہ الندوہ میں تعلیمی اصلاح کے متعلق کئی مضامین لکھے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک مضمون درس نظامیہ کے متعلق بھی تھا۔ اس سے ہم ذیل میں اقتباس پیش کرتے ہیں۔ پہلے درس نظامیہ کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ہے کیا؟

"درس نظامیہ میں اصول ذیل ملحوظ رکھے گئے۔"

۱۔ اختصار یعنی ہر فن کی ایک دو مختصر کتابیں لے لی گئیں۔

۲۔ اختصار کے اصول پر اکثر کتابیں، ناتمام درس میں رکھی گئیں یعنی صرف اس قدر حصہ لیا گیا جو ضروری خیال کیا گیا مثلاً میر زاہد، ملا جلال، صدرا، الشمس بازغہ، مسلم، تلویح ان سب کتابوں کے کچھ کچھ حصے درس میں داخل ہیں۔

۳۔ ہر فن میں وہی کتاب رکھی گئی ہے جو اس فن کی سب سے مشکل کتاب ہے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ غور کی قوت پیدا ہو جائے کہ پھر جس کتاب کو چاہے دیکھ کر سمجھ سکے۔

۴۔ منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی یعنی اس میں کسی اور فن کی آمیزش نہ تھی، ملا محب اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملا دیئے اور اس کا عام انداز بدل دیا، یہ کتاب ملا نظام الدین صاحب نے درس میں داخل کی پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں اور ان میں فلسفہ کا اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوتی گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج منطق کی بہت سی کتابیں پڑھ کر بھی منطق نہیں آتی کیوں کہ جس کو منطق سمجھتے ہیں وہ منطق نہیں بلکہ فلسفہ ہے......... اصول فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا ملا محب اللہ نے اس میں بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا اور اب اصول بھی گویا فلسفہ ہے۔"

اب آیئے اس پر علامہ شبلی کی تنقید ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے۔ یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بے کار ہو جائیں۔ مثلاً شمسیہ میں یہ عبارت تھی کہ **العلم اما تصور فقط وھوالخ** قطبی میں اس کے متعلق ایک بڑی بحث اس بناء پر چھیڑ دی گئی ہو کہ "ھو" کی ضمیر "تصور" کی طرف پھرتی ہے یا تصور فقط کی طرف۔ اس بحث میں قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہو گئے لیکن اگر مصنف، ضمیر کے بجائے خود مرجع کا ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثیں رائیگاں جاتیں، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل

مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے مصنف کے ایک خاص لفظ اور اس کے منشاء پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

نصاب موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں، ان کے قریب بلکہ ان سے زیادہ فضول لفظی مسائل ہیں۔

اس موقع پر یہ بات بتادینا بھی ضروری ہے کہ قدما کے زمانہ میں شرح اور حاشیہ کا طریقہ نہ تھا، بو علی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا لیکن اس وقت تک شرح میں بھی مصنف کی خاص عبارت اور الفاظ سے بحث نہیں کرتے تھے، بلکہ اصل مسئلہ کی توضیح و تشریح کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چنداں غرض نہیں رہی کہ تمام تر توجہ اس پر صرف ہوتی تھی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے ؟ کس لفظ سے کیا خاص فائدہ ہے ؟ کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے ؟ مصنف کی عبارت کا اوروں نے جو مطلب سمجھا ہے غلط ہے، فلاں جگہ مصنف نے رفع دخل مقدر کیا ہے، مصنف کی عبارت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ جس وقت سے یہ طریقہ جاری ہوا وہ علمی تنزل کا پہلا دن تھا۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں ایک مضمون لکھا ہے .......... اس مضمون کا ماحصل یہی ہے چناں چہ وہ مثالاً فن فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لکھ کر لکھتے ہیں۔ "یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں اور مطلب ایک ہے اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے، اور عمر ایک ہی کے محفوظ رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے، اس لئے اگر مدرسین صرف مسائل مذہبی پر اکتفا کرتے تو تعلیم نہایت سہل ہوتی اور بہت کم زمانہ صرف ہوتا۔"

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے زمانہ میں بھی وہی حالت تھی جواب ہے یعنی باوجود اس طریقے کی خرابی کے لوگ اس کو ترک نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ طریقہ لوگوں کے لئے بجائے طبیعت ثانیہ کے ہو گیا تھا، چناں چہ علامہ موصوف عبارت مذکورہ کے بعد لکھتے ہیں۔ "لیکن یہ ایک مرض بن گیا ہے جو دفع نہیں ہو سکتا، کیوں کہ معمولِ عام ہو جانے کی وجہ سے وہ بجائے طبیعت کے ہو گیا ہے۔"

۲۔ سب سے بڑی خرابی نصاب موجودہ کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں داخل ہیں، جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب علم کا ذہن پریشان ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے۔ ملا حسن،

حمد اللہ، قاضی مبارک منطق کی کتابیں ہیں لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور مابعد الطبیعہ کے ہیں مثلاً علم باری جعل بسیط، جعل مرکب، کلی طبیعی کا وجود نے الخارج، وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ ملا جلال فن منطق ہیں بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن جس قدر درس میں ہے اس کا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح میں ہے، جو صرف اس عبارت سے متعلق ہے، جو مصنف نے حمد و نعت میں لکھی ہے، ان کتابوں کے درس کا جو زمانہ رکھا گیا ہے اس وقت تک میبذی کے سوا فلسفہ کی اور کوئی کتاب پڑھائی نہیں جاتی اس لئے الٰہیات کے مباحث طالب العلم کو بالکل اجنبی اور سخت نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ انہیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہے مثلاً نحو، صرف، منطق، مقصود بالذات ہیں لیکن کتب درسیہ زیادہ تر انہی فنون کے متعلق ہیں، منطق کا مقصود یہ ہے کہ فلسفہ میں کام آئے لیکن منطق کی درسی کتابیں فلسفہ کے اعتبار سے اضعافاً مضاعفہ ہیں، صغریٰ، کبریٰ، میزان، منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد، حمد اللہ، قاضی مبارک یہ انبار کا انبار منطق میں ہے اور درس میں داخل ہے لیکن فلسفہ کی صرف تین کتابیں درس میں داخل ہیں، جن میں سے میبذی پوری پڑھائی جاتی ہے، باقی سب جستہ جستہ مقامات۔

اس طرح نحو و صرف میں برسوں اوقات صرف کی جاتی ہے اور جو اس کی غرض و غایت ہے یعنی علم ادب اس میں بہت کم زمانہ صرف ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سینکڑوں، ہزاروں طلبہ میں سے ایک بھی صاحب فن نہیں پیدا ہوتا۔(۱)

اس وقت کے نصاب تعلیم کی یہ خرابیاں تھیں، جنہیں مولانا شبلیؒ جیسے نقاد کے الفاظ میں آپ نے سنا۔ اب غور فرمایئے کہ ندوۃ العلماء کو کتنا کٹھن کام انجام دینا تھا۔ بالآخر دو سال کے تجربہ نے بتلا دیا کہ ندوہ کو اپنے مقاصد میں اس وقت کامیابی ہو سکتی ہے کہ اس کے ماتحت ایک دار العلوم قائم کیا جائے اور مجوزہ نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اس طرح اس کے فارغ التحصیل طلبہ سے یہ خدمت دی جا سکے گی۔ چناں چہ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں

(۱) مقالات شبلی حصہ سوم ص ۱۲۹

دارالعلوم قائم کیا گیا۔ علماء نے پذیرائی کی اور اپنی خدمات سے نوازا مگر ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اس کے مقاصد سے قطعی ناواقف تھے۔ محض خوان یغما سمجھ کر اکٹھا ہو گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے حقیقت نگار قلم نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

''ندوہ (یعنی دارالعلوم) کی بنیاد کچھ عجیب طرح سے پڑی، ایک عمارت بن گئی مگر اس طرح کہ معماروں کی نیت اور ارادے کو اس میں بہت کم دخل تھا اور بہت سے تو سمجھتے ہی نہ تھے کہ یہ جو کچھ بن رہا ہے اس سے کیا کام لیا جائے گا؟''

ندوہ کا اولین اور مقدم ترین مقصد، نصاب کی اصلاح تھا۔ جب اس کے ماتحت دارالعلوم قائم ہوا تو خود اس کا نصاب درست نہیں کیا گیا، صرف سالانہ جلسے ہو جایا کرتے تھے اور بس۔

مولانا شبلیؒ اصلاح نصاب کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھے، جس وقت دارالعلوم کے مسئلہ قیام پر غور ہو رہا تھا تو اس وقت وہ علی گڑھ میں تھے، وہاں سے جلسہ میں شریک ہوئے اور دارالعلوم کے قیام پر زور دیا۔ قائم ہونے کے بعد جب اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تو مولانا محمد علی مرحوم کو ایک اسکیم بنا کر دی جو ابتداء سے ندوہ کے ناظم تھے۔ مگر اس کے بعد ہی خزاں کا دور شروع ہو گیا اور جو لوگ چمن میں محض تفریح کے لئے آئے تھے چلے گئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بعض اسباب کی بناء پر گورنمنٹ ندوہ کو مشتبہ نگاہ سے دیکھنے لگی اور اس کی سختی سے نگرانی شروع کر دی، گورنمنٹ کی نگاہ پھرتی تھی کہ لوگ ایک ایک کر کے اس سے علیحدہ ہونے لگے۔

اس زمانہ میں علامہ شبلیؒ حیدر آباد میں تھے، وہ عرصہ سے مستقل طور پر ندوہ کو اپنا وقت دینا چاہتے تھے، مگر حالات اجازت نہ دیتے تھے، مگر جب ندوہ کی حالت اس حد تک پہنچ گئی تو ان سے نہ رہا گیا اور لکھنو چلے آئے، تاکہ ندوہ کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکیں۔ یہ ۱۸۹۶ء کا واقعہ ہے۔

صفر ۱۳۲۳ھ کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا شبلیؒ کو معتمد تعلیم و دارالعلوم بنایا گیا۔ مولانا نے جس وقت اپنے عہدہ کا چارج لیا تو اس وقت ندوہ کی حالت نہایت زبوں تھی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ ''دارالعلوم کی اس وقت کی حالت کا اگر اندازہ کرنا چاہتے ہو تو ایک مریض جاں بلب کے بستر مرگ کو دیکھو یا کسی لٹے ہوئے اور برباد قافلے کو اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر پرانی دہلی کے ان کھنڈروں کی سیر کرو، جن کی بہت سی دیواریں گر چکی ہیں اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی

عنقریب گرنے والا ہے۔ افلاس و فقر، بے نوائی و شکستہ حالی، کس مپرسی و محتاجی، خرائبہ کار اور بربادی محنت کا ایک ویرانہ تھا۔ جس کے اندر تباہی و ہلاکت کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، ایک ظاہر صورت ضرور قائم تھی، مدرسہ تھا، مدرس تھے، طالب علم تھے، لیکن نہ تو روپیہ تھا جس سے تمام کام زندہ رہتے ہیں اور نہ کوئی تعلیمی روح تھی، جو بہت سے مادی نقصانوں کی بھی تلافی کر دیا کرتی ہے۔"

علامہ شبلیؒ نے چارج لینے کے بعد نہ صرف وہاں کی مالی حالت کو درست کیا بلکہ اس کے نصاب تعلیم کو درست کیا جو ندوہ کا اولین مقصد تھا۔ لیکن اس راہ میں بہت سی مشکلات تھیں ان مشکلات کے متعلق علامہ شبلی نے الندوہ میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"اصلاح نصاب کا خیال صرف چند علماء کے دل میں پیدا ہوا تھا، باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چوں کہ فیصلہ عموماً کثرت رائے پر ہوتا ہے اس لئے ان ہی بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے وہ جدید نصاب (جس میں قدما کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی ہیں۔ ان کے بیسیوں حاشیئے موجود ہیں۔ اس لئے ان کا پڑھا لینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے لیکن جدید نصاب میں ان کے بجائے دلائل الاعجاز، عبدالقادر جرجانی رکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ فن بلاغت کی جان ہے اور مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چیں ہیں لیکن نہ ہمارے مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا نہ اس پر شرحیں اور حاشیئے موجود ہیں۔ اس لئے یہ لوگ اس کے پڑھانے سے عاجز ہیں۔ اور چوں کہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے اس لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ بہر حال سال حال میں یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے اجراء کے ساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شائع کئے جا رہے ہیں کہ جدید نصاب درس کے قابل نہیں۔ بے شبہ اس نئے راستہ کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں گی لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے تو اس کو سرے سے اصلاح نصاب کا نام لینا نہ چاہیئے۔ یہ سخت بددیانتی ہے کہ

تمام دنیا میں اصلاحِ نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔"

دارالعلوم کے جدید نصاب میں حسب ذیل چیزیں پیش نظر تھیں۔

۱۔ ایک ایسا نصاب تعلیم جس میں جدید ضرورتوں کے مطابق صحیح علوم اسلامیہ پر مشتمل ہو، غیر ضروری کتابوں اور قدیم طریق حواشی و شروح سے پاک ہو اور علوم شرعیہ میں اچھی استعداد پیدا کرے۔

۲۔ بعض جدید علوم کو شامل کیا جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ انگریزی داں علماء پیدا ہو سکیں۔

صرف نصاب ہی کی اصلاح پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تعلیم میں بعض امور پر خاص طور پر زور دیا گیا مثلاً ادب پر۔ قدیم نصاب میں زبان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے جو قرآن و حدیث کے سمجھنے کی کنجی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ادب کی مشہور کتابوں کو نصاب میں جگہ دی گئی بلکہ تحریر و تقریر کے ذریعہ عربی میں بولنے اور لکھنے کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا علماء پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ ان کی عمریں پڑھتے پڑھتے ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر نہ تو عربی کے دو جملے بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ ندوہ نے اس الزام کو دور کرنے کی کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ ندوہ کو ادب میں دوسرے تمام عربی مدارس میں امتیاز حاصل ہے۔ عرصہ ہوا مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ندوی کی ادارت میں کلکتہ سے غالباً الجامعہ کے نام سے عربی میں ایک اخبار نکلتا تھا اس کے مضمون نگاروں میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم بھی تھے۔ غالباً ندویوں کی عربی ادب کا یہ پہلا مظہر تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ندوہ سے ایک عربی رسالہ الضیاء جاری ہوا تھا مگر عدم اشاعت کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اس کے مدیر و مضمون نگار سب ندوی اور ندوہ کے طالب علم تھے۔ اس نے نہ صرف ہندوستان کے علمائے ادب سے خراج تحسین حاصل کیا بلکہ مصر اور دوسرے عربی ممالک سے بھی۔ طلبائے ندوہ کے عربی ذوق کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ جہاں اردو میں بہت سے قلمی رسالے نکلتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، وہاں عربی میں بھی نکالتے ہیں اور تقریریں بھی کرتے ہیں۔ چند سال ہوتے ہیں فلسطین سے ایک وفد آیا تھا جس میں مفتی اعظم اور علویہ باشا بھی شامل تھے۔ وفد کے یہ ارکان ندوہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت راقم وہاں موجود تھا۔ انہوں نے بچوں کی جب تقریریں

سنیں اور ان سے گفتگو کی تو بہت متعجب ہوئے اور کہا کہ ہمارے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ ہندوستان میں اس قسم کی کوئی درس گاہ ہوگی جس کے اتنے نوعمر طلبہ اس قدر فصیح اور عمدہ عربی بولتے ہوں گے۔

ادب کے بعد سب سے زیادہ زور فن تفسیر پر دیا گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ عربی تعلیم کا تمام تر مقصود قرآن اور حدیث کا سمجھنا ہے مگر عربی مدارس پر نگاہ ڈالئے تو نصابوں کی جدولیں منطق و فلسفہ اور علم کلام کی کتابوں سے بھری ملیں گی مگر اصل سرچشمۂ علم، کتاب اللہ کے متعلق جلالین جو قرآن سے بھی مختصر ہے اور بخاری شریف کے چند پارے نظر آئیں گے اور بس۔

ندوہ میں درجہ تکمیل (ایم اے) بھی قائم کیا گیا ہے تاکہ طلباء فراغت کے بعد اپنے ذوق اور مناسبت کے مطابق تفسیر، حدیث، فقہ، ادب وغیرہ جس فن میں چاہیں، مہارت حاصل کر سکیں۔ مگر اس میں ایک بہت بڑا نقص ہے جو معلوم نہیں ابتداء سے ہے یا بعد کی پیداوار ہے، وہ یہ کہ اس درجہ میں صرف مخصوص اور محدود لڑکے لئے جاتے ہیں، ہر شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ حالاں کہ اسے بالکل یونیورسٹیوں کے ایم اے اور آنرز کی طرح ہونا چاہیئے۔

ندوہ کی یہ تمام خصوصیات اس وقت تک باقی رہیں، جب تک علامہ شبلیؒ وہاں موجود تھے، مگر ان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد اس کی بہت سی خصوصیات باقی نہ رہ سکیں۔ نصاب تعلیم میں بہت سی ایسی کتابیں داخل کر دی گئیں جنہیں بے کار سمجھ کر اس وقت داخل نہیں کیا گیا تھا مگر اس کے باوجود علامہ شبلیؒ ندوہ کی در و دیوار کی ایک ایک اینٹ میں وہ روح پھونک دی تھی کہ آج بھی باوجود تنزل و انحطاط کے اس کے طلبہ میں ندوہ کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

## مدرسۃ الاصلاح

نامناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں کچھ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڑھ) کے متعلق بھی عرض کر دیا جائے۔ کیونکہ مدارس اسلامیہ کی اصلاح کے سلسلہ میں یہ بھی ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اواخر ۱۹۱۳ء میں جب علامہ شبلیؒ ندوہ سے علیحدہ ہوئے تو اپنے وطن اعظم گڑھ چلے

آئے اور اپنی پرانی تجویز یعنی دارالمصنفین کی طرف توجہ کی۔ گو وہ علمی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ مگر اس کے ساتھ مدرسہ الاصلاح کی بھی انہیں فکر تھی۔ چناں چہ مولانا فراہی کو ایک نامہ میں لکھتے ہیں :

"کیا تم چندروز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے ،اس کو "گرد کل" کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔"

(مکاتیب شبلی حصہ دوم صفحہ ۴۳)

مولانا شبلیؒ نے ندوہ میں خدام الدین کے نام سے ایک تحریک شروع کی تھی، اس تحریک کو یہاں بھی جاری کرنا چاہتے تھے، چناں چہ علامہ فراہی کو لکھتے ہیں :

"ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں کی تعلیم کا مرکز بنایا جائے۔" یہیں خدام الدین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گرد کل ہو، تم اپنی رائے لکھو........ پرنسپلی اور بیش قرار تنخواہ چندروزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔"

(مکاتیب شبلی حصہ دوم صفحہ ۴۷)

اس کے تقریباً ایک سال کے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے سوائے مدرسہ کے چند جلسوں کی شرکت کے کچھ زیادہ توجہ نہ کر سکے۔

مدرستہ الاصلاح کی اصلاح و ترقی میں سب سے زیادہ دخل مولانا حمید الدین فراہیؒ کو ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا فراہی، دارالعلوم حیدر آباد کی پرنسپلی کو چھوڑ کر مدرستہ الاصلاح میں آئے اور آخر دم تک اس کی خدمت کرتے رہے، اس درس گاہ کی سب سے بڑی خصوصیت کتابِ الٰہی کی تعلیم ہے۔

مدرسہ کی خصوصیات جو اس کے دستور العمل سے ماخوذ ہیں، حسب ذیل ہیں :

(الف)۔ قرآن و حدیث و فقہ و ادب کی طرف شدت اعتناء۔

(ب)۔ اعلیٰ علم و قابلیت کو مطمح نظر رکھنا نہ کسی محدود نصاب کو، الا قرآن مجید و متون حدیث

(ج)۔ درستی اخلاق یعنی پابندی شرائع و روحانیت اسلام۔

(د)۔ آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت۔

(ہ)۔ کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ۔

## شرح

خصوصیات الف، ب بنیادی ہیں۔ ج ان کا عملی ثمرہ ہے اور د، ہ ان کے ذرائع ہیں۔ ان کی اہمیت میں باہمی فرق مراتب، ان کی ترتیب سے سمجھنا چاہیئے۔

ذیل کی چیزیں مدرسہ کے لئے اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ مدرسہ کے اساتذہ و طلبہ غریبانہ اور مذہبی زندگی بسر کریں۔ اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں۔ کفاف پر قناعت کریں۔

۲۔ اس مدرسہ کو غربائے مسلمین کی اعانت سے چلایا جائے، سرکاری اثر سے آزاد رکھا جائے۔

۳۔ قرآن کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا نصب العین ہو، اس کے بعد حدیث و فقہ پر زور دیا جائے، منطق و فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں، ان کی جگہ پر ادب عربی کی تعلیم دی جائے۔ حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو، فقہ میں فقہ اسلامی کی تعلیم دی جائے، تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو، تکفیر و تفسیق کا ولولہ نہ ابھرے، صرف نحو کی تعلیم علمی ہو، فنون کی تعلیم میں، امہات فن پیش نظر رہیں اور لیکچرز کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دی جائے۔ حصول معاش کے لئے صنعت کی تعلیم دی جائے۔ مدت تعلیم کم سے کم ہو، اور نرخ تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔

۴۔ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہب (اسکولز) کا سنگم ہو، یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں، ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر آپس میں شیر و شکر رہیں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹادیں۔ (الاصلاح، اگست ۳۶ء)۔

## جامعہ عثمانیہ

جامعہ عثمانیہ کی تحریک، ہماری تعلیمی تحریکوں کی تیسری کڑی ہے اس کے قیام و تاسیس میں اشخاص کے علاوہ سب سے بڑا حصہ لڑکوں کی تعلیمی ترقی کا ہے، اس لئے بہتر ہوگا کہ حیدرآباد کے تعلیمی ارتقا پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

حیدرآباد میں، تعلیم و تنظیم کی ابتداء، مدرسہ دارالعلوم کے قیام سے

ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے پندرہ بیس برس پہلے ریاست کو تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ مگر یہ خیال عملاً صرف چند فنی مدارس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور تہذیبی تعلیم کا اگر کچھ انتظام تھا تو اس کے فوائد صرف مخصوص طبقہ تک محدود تھے۔ عام تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۸ مارچ ۱۸۵۶ء کو دارالعلوم کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ ۱۸۵۹ء تک اس کی حیثیت محض ایک معمولی مدرسہ کی رہی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ترقی کر کے کالج کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ دارالعلوم کا کوئی اپنا نصاب نہیں تھا۔ بلکہ یہاں کے طلبہ، پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات مثلاً منشی کامل، منشی فاضل، مولوی عالم، مولوی فاضل وغیرہ کے لئے تیار کئے جاتے تھے اور وہاں کے امتحانات میں بیٹھتے تھے، تاآنکہ غالباً ۱۹۰۷ء میں انڈین یونیورسٹیز ایکٹ کی وجہ سے یہ الحاق ٹوٹ گیا۔ تعلق کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے چھ سات سو لڑکے بالکل بے کار ہو گئے۔ انگریزی اسکول قائم تھے، مگر یہ انگریزی سے نابلد تھے یا معمولی شدبد رکھتے تھے۔ اس لئے ان میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس اچانک آفت سے ریاست اور مفکرین کو دارالعلوم کے لئے ایک نصاب تیار کرنے کی فکر ہوئی۔ جو زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہو۔ چناں چہ مولانا شبلیؒ اور مسٹر مے ہیو کو جو عرصہ سے سررشتہ تعلیمات میں ملازم تھے اور تعلیمی تجربہ رکھتے تھے، یہ خدمت سپرد کی گئی۔

اس دارالعلوم کی ترقی واصلاح میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کو بڑا دخل رہا ہے۔ نصاب میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ علوم جدیدہ کو درس میں داخل کر کے زمانہ کے مطابق بنایا۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھائے جائیں۔ سر راس مسعود مرحوم اور سر نواز جنگ حیدری نے یہ تو منظور کیا کہ علوم اردو میں پڑھائے جائیں مگر دینیات کی تعلیم کو عربی ہی میں باقی رکھا۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب کے لئے تیاری کتب اور وضع اصطلاحات میں بھی مولانا شریک تھے۔ جامعہ کے تخیل ونصب العین اور اس کی تشکیل میں بھی مولانا کے مشوروں اور رایوں کو بہت دخل رہا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی جو اس وقت صدر الصدور تھے اور جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے چانسلر مقرر ہوئے تھے۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ "جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کے ہاتھ بھی تھے۔"

دارالعلوم میں انگریزی تھی، مگر بہت کم۔ انگریزی کی تعلیم کے لئے مشینری کے چند

مدارس تھے۔ مگر عام طور پر مسلمان بلکہ ہندو بھی، اپنے لڑکوں کو ان میں تعلیم دلانے سے احتراز کرتے تھے۔ اس لئے اگر کہا جائے کہ اس وقت پوری ریاست میں انگریزی کی تعلیم نہ تھی، تو بے جا نہ ہوگا۔ حیدر آباد میں انگریزی تعلیم کا انتظام ۱۸۷۸ء میں ہوا جب کہ حیدر آباد کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ دارالعلوم اور حیدر آباد کالج نے اپنے اپنے طور پر ریاست کی تعلیم کو بہت ترقی دی تھی اور زمانہ کی طلب کو پوری کرتے رہے۔ مگر زمانہ ان سے تیز تھا، اس نے چند ہی سال میں انہیں ناکافی ثابت کر دیا۔ اب زمانہ کی طلب کو پورا کرنے کے لئے ایک یونیورسٹی کی ضرورت تھی۔ جوں جوں زمانہ ترقی کی طرف بڑھتا گیا، ضرورت کا احساس، شدید ہوتا گیا اور بالآخر ترقی کر کے، دلوں سے زبانوں پر آیا اور زبانوں سے عام جلسوں میں۔ بعض اشخاص نے یونیورسٹی کے قیام کے لئے تجویزیں بھی پیش کیں مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔ البتہ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم اور انجمن ترقی تعلیم حیدر آباد یا حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں نے، اس تخیل کو عمل سے بہت زیادہ قریب کر دیا۔ انہیں دونوں انجمنوں کی بار بار یاد دہانی کی وجہ سے، ذمہ دار حضرات نے اس کی طرف توجہ مبذول کی۔ نواب سر حیدر جنگ بہادر اس وقت معتمد تعلیم تھے۔ انہوں نے ایک عرض داشت مرتب کر کے، اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا حسب ذیل جواب دیا۔

”مجھے بھی عرض داشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے، جس میں جدید و قدیم، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام کے نقائص دور ہو کر جسمی اور دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی ہو سکے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازم گردانی جائے۔ لہذا میں خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور،

اصول محولہ عرض داشت کے مطابق ممالک محروسہ کے لئے حیدر آباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد" ہو گا۔

قیام یونیورسٹی کی منظوری اور ابتدائی امور کی انجام دہی کے بعد اگست ۱۹۰۹ء میں اس کا افتتاح ہوا، چوں کہ مجوزہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو قرار پایا تھا اور ظاہر ہے اردو میں نصاب کے لئے کتابیں تھیں۔ انہیں اس لئے مغربی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے دار التصنیف والترجمہ قائم کیا گیا اور وضع اصطلاحات کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ اس طرح تقریباً بارہ سال صرف ہو گئے اور ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی اس قابل ہوئی کہ بی اے کی تعلیم کا انتظام کر سکے۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد دار العلوم کو اس میں ضم کر دیا گیا اور اسے شعبہ دینیات کے کالج کی حیثیت دے دی گئی۔ یونیورسٹی کے ماتحت ایک میڈیکل کالج، ایک انجینئرنگ کالج، ایک مدرسہ تعلیم المعلمین، جس میں بی ٹی کی تعلیم ہوتی ہے اور ایک سائنس کا معمل (لیبارٹری) ہے۔

یونیورسٹی کا نصاب تعلیم دستیاب نہ ہو سکا، اس لئے اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا مشکل ہے۔ عبد القادر سروری صاحب نے اپنی کتاب "حیدر آباد دکن کی تعلیمی ترقی" میں اس کے متعلق مختصراً لکھا ہے جو بالکل ناکافی ہے مگر اسی پر اکتفا کرتے ہیں:

"جامعہ عثمانیہ کے نصاب تعلیم کی بڑی خصوصیات یہ ہیں کہ میٹریکولیشن میں مضامین دو گروپوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ تاکہ طلباء جو مضامین کالج میں لینا چاہیں ان میں ان کی ابتدائی تعلیم اچھی ہو۔ انٹرمیڈیٹ میں انتخاب مضامین میں بہ نسبت اور یونیورسٹیوں کے زیادہ وسعت رکھی گئی ہے اور مضامین کو اس طرح سے مرتب کیا گیا ہے کہ ایک طالب علم اپنے لئے ایک ایسا مجموعہ اختیار کر سکتا ہے جس کے مضامین ایک دوسرے سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف مجموعوں میں مضامین کی تقسیم سے یہ فائدہ ہے کہ بی اے کی جماعتوں میں ایک طالب علم کسی خاص مضمون اور اس کے متعلقات کی تعلیم مکمل طریقے پر حاصل کر سکتا ہے، انگریزی زبان اور دینیات یا اخلاقیات کے علاوہ جو لازمی مضامین ہیں، طالب علم کوئی دوسرا مضمون ایسا لے سکتا ہے، جس میں خصوصیت کے ساتھ وہ تمام و کمال عبور حاصل کرے اور پھر اسی مضمون پر تحقیق و تلاش کے کام میں مصروف ہو جائے......

دینیات یا اخلاقیات کالج کی تمام جماعتوں کے لئے لازمی ہے........ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے اس کا معیار وہی رکھا گیا ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کا ہے، اس کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کے طلبہ انگریزی بولنے والی دنیا کے خیالات سے آشنا ہو سکتے ہیں۔" ان کا دائرہ عمل جامعہ کی مطبوعہ یا مشروطہ کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے مضامین میں انگریزی کتابوں سے بھی ہر وقت استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہی امتیازی خصوصیات ہیں، جن کی بدولت جامعہ عثمانیہ نہ صرف حیدر آباد، بلکہ ہندوستان بھر میں مقبول ہوئی، اس کی پیداوار مشرق اور مغرب کا بہترین آمیزہ ہے۔ (صفحہ ۸۸)

(جامعہ، دسمبر ۱۹۳۸ء)

# دینی مدارس کے مسائل

پروفیسر محمد شریف خاں
(علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

دینی مدارس کے نصاب تعلیم، مسائل تعلیم اور مستقبل کے امکانات پر ایک سیمینار گزشتہ ماہ دہلی میں ہوا تھا، جس میں مشہور علماء دین، دینی مدارس کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی۔ راقم کو بھی شرکت کا موقع ملا۔ سیمینار میں شرکت کرنے کی بعد محسوس ہوا کہ مغربی طرز پر تعلیم یافتہ ماہرین کا ایک طبقہ ہے جو مدارس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے مگر ان کی کارکردگی سے غیر مطمئن ہے اور اس وقت تک مطمئن ہونے کے لئے تیار نہیں ہے جب تک کہ وہ دینی مدارس میں جدید علوم کی تعلیم، نصاب میں شامل نہ کرادے، بلکہ اس طبقہ میں کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو نہ صرف ان مضامین کی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے ذہن میں صرف انہیں مضامین کی اہمیت ہے۔

دوسری طرف دینی مدارس کے اساتذہ کا طبقہ ہے جو اپنے مدارس کی کارکردگی سے اتنا مطمئن ہے کہ درس نظامیہ میں کسی قسم کی ترمیم کے لئے راضی نہیں ہے اور اگر دینی مدارس کے سیمینار میں مدارس کی تنقید کی جائے تو ناراض ہو جاتا ہے، اور پوچھتا ہے کہ کیا انگریزی اسکولوں میں سب ٹھیک ٹھاک ہے، جو سارا ہدف ملامت مدارس کو بنایا جارہا ہے اور اگر اس کو یہ بتایا جائے کہ دینی مدارس کے سیمینار میں تو صرف دینی مدارس کی بات چیت ہوگی تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا۔

انگریزی داں طبقہ جب دینی مدارس کی اصلاح کی بات کرتا ہے تو اس کے ذہن میں

روزگار کا مسئلہ زیادہ رہتا ہے اور دینی مدارس کے نصاب میں کچھ پیشوں کی تعلیم کی وکالت کرتا ہے۔ شاید اس طبقہ کے ذہن میں یہ بات جاگزیں ہو گئی ہے کہ ان طلباء کو درزی کا کام، لوہار کا کام، بڑھئی کا کام، بجلی کی مرمت کا کام وغیرہ۔ سکھا دیا جائے تو وہ تعلیم سے فراغت کے بعد اس پیشہ کو اختیار کر کے اپنی گزر بسر کرے گا۔ مگر یہ طبقہ بھول جاتا ہے کہ اس سے کہیں دینی تعلیم کا مقصد ہی نہ فوت ہو جائے اور دینی مدارس میں جو حضرات خالص دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں وہ بھی دنیا کے مسائل میں پھنس کر نہ رہ جائیں اور ان مدارس کے فارغین کا بھی وہی حال ہو جو کالج اور یونیورسٹیوں کے فارغین کا ہوتا ہے۔

اسی طرح جو علماء حضرات دینی مدارس میں جدید علوم کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جدید علوم کے ذریعہ فراہم کی گئی تمام اشیاء کا جب ہم استعمال کرتے ہیں تو پھر ان جدید علوم سے معمولی واقفیت بھی ناپسند کیوں کرتے ہیں۔

دونوں طبقوں سے میری گزارش ہے کہ وہ دینی مدارس میں کسی نصابی تبدیلی لانے سے قبل مندرجہ ذیل مسائل پر توجہ دیں۔

کیا دینی مدارس میں واقعی کوئی نصاب ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ دینی مدارس کتابوں کی اس فہرست کو نصاب کہتے ہوں۔ کیوں کہ نصاب ایک وسیع اور واضح لائحہ عمل کا نام ہے جس پر عمل پیرا ہو کر اساتذہ اپنے طلباء کو تعلیم دیتے ہیں۔ یہ ایک شاہراہ ہے جس پر گامزن ہو کر طلباء اساتذہ کی رہنمائی میں اپنی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیا دینی مدارس کے تمام طلباء کی تعلیم صرف ایک پیشہ کی تیاری کے لئے ہوتی ہے یا اس کے فارغین مختلف پیشوں میں داخل ہوتے ہیں یعنی مکاتیب و مدارس کا معلم بننے کے لئے، مساجد کا مؤذن اور پیش امام بننے کے لئے، اسلام کا مبلغ بننے کے لئے، ملت اسلامیہ کی لیڈر شپ کے لئے اور اسلام کے مختلف موضوعوں پر مصنف بننے کے لئے۔

کیا دینی مدارس اپنے طلباء کو ان میں سے کسی ایک پیشہ کو سامنے رکھ کر تعلیم دیتے ہیں تاکہ اس میں مہارت حاصل کر سکے یا وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اگر قرآن و حدیث، فقہ، اصول وغیرہ پڑھ چکے ہیں تو سارے پیشے اختیار کر سکتے ہیں اور ان میں سے کسی پیشہ کو

خصوصی مہارت کی ضرورت نہیں ہے۔

کیا ہم امت کا بہترین سرمایہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کو بھیجتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اگر کسی کا ایک بچہ ذہین اور دوسرا کند ذہن ہو تو وہ ذہین بچہ کو تو انگریزی اسکول میں بھیجتا ہو اور کند ذہن کو مدرسہ میں۔ اگر میرا یہ مفروضہ صحیح ہے تو کیا امت مسلمہ کی لیڈر شپ کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہو گا؟

کیا ہندوستان کی جن ریاستوں نے دینی مدارس میں جدید علوم کو شامل کرنے کے بعد مدارس کے معاشی مسائل کا حل حکومت کے خزانوں سے حاصل کر لیا ہے، ان ریاستوں کے دینی مدارس کی تعلیم کا معیار اچھا ہوا ہے یا بد تر ہو گیا ہے؟ اور خدمت کے جذبہ اور ماحول کی جگہ ملازمت کا جذبہ اور ماحول قائم ہو گیا ہے۔

کیا جو طبقہ دینی مدارس میں جدید علوم کی تعلیم کی وکالت کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ان علوم کی اہمیت دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم سے کہیں زیادہ تو نہیں ہے یا وہ ان علوم کو اس لئے پڑھانا چاہتے ہیں کہ یہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں اور ان کے بغیر دنیوی زندگی نامکمل رہتی ہے۔ اول الذکر صورت دینی مدارس کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ جبکہ آخر الذکر صورت ان کی افادیت میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے۔

اگر دینی مدارس جدید علوم کی تعلیم کو راضی ہو جائیں تو کیا جدید علوم کے اساتذہ جن کی اپنی تعلیم انگریزی اسکول اور کالجوں میں ہوتی ہے، دینی مدارس کے ماحول کے مطابق ڈھل پائیں گے۔ کہیں یہ اندیشہ صحیح ثابت نہیں ہو گا کہ دینی مدارس کے ماحول کو بھی خراب کر دیں؟

کیا جدید علوم کے اساتذہ ان تنخواہوں اور سہولتوں پر کام کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور جو راضی ہوں گے ان کا اپنا معیار کیسا ہو گا؟ اور کیا وہ دینی مدارس جدید علوم کے ساتھ انصاف کر سکیں گے اور دینی علوم کے اساتذہ جو اپنے مضامین کے ماہرین ہیں ان کے سامنے یہ لوگ ٹک سکیں گے۔

اگر کچھ دینی مدارس جدید علوم کے اساتذہ کو بہترین تنخواہ اور سہولتیں دینے کو تیار ہوں

تو ایسا نظام قائم کرنا مدارس کے حق میں مفید ہو گا۔ کیا اس طرح دینی علوم کی حیثیت دینی مدارس میں بھی نہیں گر جائے گی؟ کیا ہم ابھی تو صرف دوہرے نظام تعلیم کی بات کرتے ہیں پھر ہم مدرسہ میں دوہرا نظام تعلیم قائم کرنے دیں گے؟

کیا ہم اس بات کے لئے تیار ہیں کہ غور کریں کہ انسانوں کے ذریعہ تصنیف شدہ کتابیں کتنے سال کے بعد Out of Date ہو جاتی ہیں۔ کیا ہم دینی مدارس میں انسانوں کے ذریعہ لکھی گئی کتابوں کو برسوں سے استعمال کر رہے ہیں اور ان کو تبدیل کرنے کی کبھی سوچتے بھی نہیں۔

اگر ان مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو شاید دینی مدارس کے حق میں بہتر ہو گا اگر اصلاح کے نام پہ ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو اس کا شدید نقصان ہو گا۔ اگر جمود طاری رہا تو اس کا انجام میں سے بھی خراب ہو گا۔

(قومی آواز، ۱۹ مئی ۱۹۹۴ء)

# ہندوستان کے دینی مدارس اور ان کے نصاب

عبدالباری
(علیگ ہمدرد نگر)

## نیا نصاب

اس نئے نصاب کی تشکیل کے سلسلے میں سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ دینی اور دنیاوی علوم کی انفرادیت ختم کر کے ایک جان کر دیا جائے۔ علوم کو دینی اور دنیوی دو الگ الگ حصوں میں بانٹنا دراصل دین اور دنیا کی تفریق کے تصور پر مبنی ہے اور یہ سراسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے وہ دنیا سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ اللہ کی ہی یہ سلطنت ہے اور ہم اللہ کی رعیت ہیں اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق ہو۔ اسی چیز کا نام دین ہے۔ اس تصور دین کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی بنادیا جائے اور نہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں اور وہ خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے خالی ہوں اور اگر کچھ دوسرے علوم دینی ہوں اور دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ پرورش پائے گا کہ دین کچھ اور ہے اور دنیا کسی اور شے کا نام ہے مثلاً تاریخ، جغرافیہ، طبیعات، حیاتیات اور دیگر علوم گر اس سے پڑھائے جاتے ہیں کہ ابتداء سے انتہا تک کہیں خدا کا نام نہیں آتا تو اس سے دنیا اور اس کی زندگی کا تصور پیدا ہوگا۔ وہ خدا کے تصور سے خالی ہوگا۔ اسلام ایسا مذہب نہیں ہے کہ ہم دنیا کا کام اپنی مرضی کے مطابق چلاتے رہیں اور اس کے ساتھ چند عقائد اور عبادات کا جوڑ لگاتے رہیں۔

## ابتدائی تعلیم

اس کی مدت خواندگی پانچ سال ہوگی۔ اس میں وہ سب مضامین پڑھائے جائیں گے جو آج پرائمری اسکول میں پڑھائے جاتے ہیں اور دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم سے متعلق جتنے تجربات کئے گئے ہیں اور مستقبل میں کئے جائیں گے ان سب سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ابتدائی تین برسوں تک بچوں کو ناظرہ قرآن، اردو، ہندی اور حساب و تختی نویسی میں مصروف رکھا جائے اس کے بعد بقیہ دو برسوں میں اردو کو قوی کرنے کے لئے فارسی اور سوشل سائنس (تاریخ جغرافیہ) کی تعلیم دی جائے۔

## ثانوی تعلیم

اس کی مدت پانچ سال ہوگی اور یہ ہائی اسکول کے مساوی ہوگا اس مرحلے میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ عربی زبان کو بطور لازمی زبان پڑھایا جائے کیوں کہ اسلام کے اصل ماخذ عربی میں ہیں۔ دوسرا لازمی مضمون قرآن مجید ہونا چاہیئے اس کے علاوہ انگریزی اور سائنس کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ انگریزی تعلیم اس لئے ضروری ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے اور اس میں علوم وفنون لطیفہ موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ابتدائی اور ثانوی نصاب تعلیم کی ترتیب میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا مناسب ہوگا :

۱۔ صرف وہی چیزیں پڑھائی جائیں جو استادوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جاسکتیں۔

۲۔ اردو میں ترقی کرنے کے لئے فارسی اور فارسی میں بچوں کو ترقی دلانے کے لئے عربی میں سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

۳۔ عربی کو قصہ کہانی کی کتابوں کے ذریعہ سکھانے کی جگہ قرآنی پاروں اور فقہی وحدیثی متون کے ذریعہ سکھایا جائے۔

۴۔ اسلامی ادبیات والی عربی کے لئے نحوی وصرفی قواعد کے طویل سلسلوں سے پرہیز کیا جائے۔

# اعلیٰ تعلیم

اس کے دو درجے ہوں گے :

۱۔ درجہ عالمیت جس کی مدت خواندگی دو سال ہو گی۔

۲۔ درجہ فضیلت، جس کی مدت خواندگی دو سال ہو گی۔

اگر مذکورہ چار امور کو سامنے رکھا جائے تو میرا خیال ہے کہ دس سال میں ہائی اسکول کی انگریزی، حساب، سوشل، سائنس (علوم عمرانیہ) اور سائنس کے ساتھ بچوں کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اعلیٰ تعلیم میں قرآن، حدیث اور فقہ کی ان تین اساسی کتابوں کو دوسرے مضامین کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیں۔ مثلاً تاریخ، معاشیات جو طلباء تاریخ لیں ان کو دنیا کی تاریخ پڑھانے کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ بھی پڑھائی جائے...... اور جو معاشیات لیں ان کو موجودہ معاشی نظام کے علاوہ اسلامی معاشیات کو بھی بتایا جائے۔

# عربی مدارس کے نصاب کا مسئلہ

مولانا مرزا محمد یوسف
(استاد عربی مدرسہ عالیہ رام پور)

آزادی کے بعد اس اسٹیٹ میں عربی تعلیم نئی منزل میں داخل ہوئی، اول تو درس نظامی اور درس عالیہ (جسے عموماً یونیورسٹی کورس کی تعلیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) کی تفریق ختم ہو گئی۔ تقریباً وہ تمام علوم و فنون اور ان کی مقررہ کتابیں جو درس نظامی میں متداول تھیں، درس عالیہ میں لے لی گئیں صرف ترتیب کا فرق رہ گیا ہے یا طریق تعلیم کا، درس عالیہ کا طالب علم اسی کتاب کو جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے، اب اس احساس ذمہ داری کے ساتھ پڑھتا ہے جو شرکت امتحان اور اس میں کامیابی وناکامی کے تصور سے پیدا ہوا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ اس اقتصادی بد حالی کے زمانے میں جب کہ چند بڑے مدارس کو چھوڑ کر عام مدارس عربیہ کے ذرائع آمدنی مسدود ہو چکے تھے، حکومت نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ ان مدارس کی امداد کی، اس نے نہ صرف پرانے مدارس ہی کی امداد کو برقرار رکھا بلکہ نئے مدارس کو بھی امداد دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند قدامت پسند مدارس کو چھوڑ کر عام مدارس نے درس عالیہ ہی کو اختیار کیا، اگرچہ محکمہ تعلیم نے درس نظامی کی تعلیم کی انتہائی فراخ دلی کے ساتھ اجازت دے دی تھی مگر بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اب اس میں نہ پہلی سی افادیت باقی رہ سکی اور نہ جاذبیت ان باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ آج یوپی کے مدارس عربیہ کی تعلیم درس عالیہ کی تعلیم کے مترادف ہے۔

دوسری چیز جو خصوصی توجہ کی مستحق ہے، درس عالیہ کا نصاب ہے، منتظمین نے اسے عملی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کی پوری کوشش کی ہے، اس غرض سے تمام مضامین

میں ان کی ضروری شاخوں کے اضافے کئے گئے ہیں، اس سلسلے میں تاریخ کے مطالعہ کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، تمام درجات میں تاریخ کا مضمون اور اس کا امتحان لازمی ہے، پھر محض اسلام کی سیاسی تاریخ پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ تمدنی وادبی اور معاشرتی تاریخ بھی ہے مثلاً درجہ منشی میں ہندوستان کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، اس کے ساتھ اردو ادب اور فارسی ادب کی تاریخ بھی لازمی ہے۔

درجہ کامل میں ہندوستان اور ایران کی سیاسی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ فارسی ادب کی تاریخ ضروری ہے اور جو طلبہ طب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کے لئے اسلامی طب کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

مولوی اور عالم کے درجات میں تاریخ اسلام تمام طلبہ کے لئے لازم ہے۔

فاضل کے ہر شعبہ میں تاریخ کا مستقل مضمون پوری جامعیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ چناں چہ فاضل ادب میں تاریخ کے مفصلہ ذیل شعبے پڑھائے جاتے ہیں:

(۱) اسلام کی سیاسی تاریخ (۲) اسلام کی تمدنی تاریخ (۳) عربی زبان اور دیگر السنہ اسلامیہ کی لسانی تاریخ اور (۴) عربی ادب کی تاریخ۔

فاضل دینیات میں مندرجہ ذیل شعبے پڑھائے جاتے ہیں:

(۱) سیرت رسول ﷺ (۲) اسلام کی سیاسی تاریخ (۳) علوم دینیہ کے ارتقاء کی تاریخ اور (۴) تاریخ ملل۔

فاضل معقولات میں مندرجہ ذیل شعبے پڑھائے جاتے ہیں:

(۱) فلسفہ کی عمومی تاریخ یعنی (الف) تاریخ فلسفہ یونان اور (ب) تاریخ فلسفہ یورپ۔

(۲) تاریخ فلسفہ اسلام یعنی (الف) فلسفہ (ب) کلام اور (ج) تصوف کے آغاز وارتقاء کی تاریخ۔

فاضل طب میں اگرچہ تاریخ کی گنجائش نہیں ہو سکتی، پھر بھی اس میں (۱) یونانی واسلامی طب کی تاریخ اور (۲) عہد حاضر میں جدید میڈیکل سائنس کے مقابلے میں طب قدیم کو جو دقتیں پیش آئی ہیں، ان کی تاریخ پڑھائی جاتی ہیں۔

عام مدارس میں جہاں درس عالیہ کا اتباع کیا جاتا ہے۔ سب سے اونچی کتاب جو پڑھائی جاتی ہے وہ ''شمسیہ'' ہے اور یہ نہ کوئی زیادہ مشکل کتاب ہے، اور نہ دقیانوسی، اس سے زیادہ

معقولات کی تعلیم اختیاری ہے جو طلبہ تشحیذ ذہن کے لئے یا اپنے ذوق کی بناء پر معقولات پڑھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے درس عالیہ میں مکمل انتظام ہے، اور اس میں بھی تعلیم کی ہر منزل میں طلبہ کی سہولت اور فطری میلان کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مثلاً

کامل کے درجہ میں جو طلبہ اسلامیات سے شناسائی بہم پہنچانے کے لئے معقولات پڑھنا چاہیں وہ مبادی معقولات پڑھتے ہیں۔ جو نہ پڑھنا چاہیں وہ طب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح مولوی، عالم اور فاضل کے درجات ہیں۔ اختیار ہے، جو طلبہ معقولات کا ذوق رکھتے ہیں وہ منطق و فلسفہ وغیرہ پڑھتے ہیں۔ جو اس کا ذوق نہیں رکھتے وہ طب یا اور کوئی مضمون پڑھتے ہیں، پھر معقولات میں بھی یہ اختیار ہے کہ مثلاً درجہ عالم میں اگر طلبہ چاہیں تو منطق و فلسفہ کے ہمراہ قدیم ریاضی و ہیئت پڑھیں یا جدید فلسفہ (یعنی نفسیات اور اخلاقیات) پڑھیں یا منطق کی تعلیم حاصل کریں۔ اس طرح نہ معقولات کی تعلیم حاصل کرنے پر طلبہ مجبور کئے جاتے ہیں اور نہ اس سے بالجبر محروم۔

لیکن اگر معقولات کے نقاد یہ چاہتے ہوں کہ قدیم فلسفہ و ہیئت کی تعلیم شجر ممنوع قرار دے دی جائے تو غالباً یہ مطالبہ کچھ منصفانہ نہ ہوگا۔ یہ ارشاد کہ ”قدیم فلسفہ اور ہیئت کے اکثر مسائل سائنس اور فلسفہ جدید کی ترقی کے بعد بیکار اور لاحاصل ہو چکے ہیں، محل نظر ہے کیوں کہ

اولاً : ان علوم کی افادی قدر و قیمت کے علاوہ ایک ملی قدر و قیمت بھی ہے۔ یہ فنون ہمارے اسلاف کی ذہنی کاوشوں کے شاہد عدل ہیں اور اس حیثیت سے ایک مقدس قومی و ملی ورثہ ہیں۔ آج دنیا کی زندہ قومیں اپنے اسلاف کی حماقتوں کو بھی کھود کھود کر اجاگر کر رہی ہیں اور ہم ہیں کہ محض دوسروں کی تقلید میں ان علوم کو برا کہتے ہیں اور ان کو بھول جانے کی کوشش میں لگے ہیں۔

ثانیاً : کوئی فکری کاوش کبھی بیکار اور لاحاصل نہیں ہو جاتی، کاش پرانے معقولات کے نقاد ہندوستان اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب پر نظر ڈالیں، ہر یونیورسٹی میں فلسفہ کے نصاب میں یونانی فلسفہ کا مضمون بھی لازمی ہے، حالاں کہ یونان کا فلسفہ حکمائے اسلام کے فلسفہ سے زیادہ فرسودہ اور مذکورہ بالا اصول کی رو سے بالکل ہی بیکار ہو چکا ہے مگر کوئی نقاد اس کے متعلق اس قسم کے اظہار خیال کی جرأت نہیں کر سکتا۔

پھر حکمائے اسلام کا جو فلسفہ عربی مدارس میں معقولات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے، وہ دراصل یونانی فلسفہ ہے، جسے اصلاح و ترقی کے ساتھ مسلمانوں نے باقی رکھا، اس یونانی الاصل اسلامی فلسفہ کے متعلق ہمارے اہل ملک ہی یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ اس کے اکثر مسائل سائنس اور فلسفہ جدید کی ترقی کے بعد بے کار ہو چکے ہیں، ورنہ یورپ کے علماء ہم جنہیں ہر بات میں اپنا مقتدیٰ سمجھتے ہیں۔ آج بھی اس فرسودہ فلسفہ اور اس کی تعلیم کی افادیت واہمیت پر زور دیتے ہیں پروفیسر تھیلی جن کی کتاب "تاریخ فلسفہ "بر صغیر پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں تاریخ فلسفہ کے موضوع پر معیاری اور معتمد علیہ کتاب کی حیثیت سے نصاب میں داخل ہے، اس کتاب میں یونانی فلسفہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

They not only laid the foundations upon which all subsequent systems of western thought have been reared, but formulated nearby all the problems and suggested all the answers with which Europeans civilization occupied itself for two thousant years.

"انہوں نے (یونانی فلاسفہ) نہ صرف اس چیز کی بنیاد ڈالی جس پر بعد کی تمام یورپی افکار کے تمام نظاموں کی عمارت قائم کی گئی بلکہ ان تمام مسائل فلسفیہ کو بھی تشکیل کیا۔ اور ان مسائل کے تمام امکانی جواب مہیا کیے۔ جن کے ساتھ دو ہزار سال سے یورپی تہذیب نے اپنے آپ کو مشغول رکھا ہے۔"

(تاریخ فلسفہ تھیلی ص ۷)

اس لئے اگر یونیورسٹیوں کے نصاب سے یونانی فلسفہ کی تعلیم کو خارج نہیں کیا جاسکتا تو پھر عربی مدارس کے نصاب سے فلسفہ و معقولات کی تعلیم ہی کو نکالنے پر کیوں اصرار کیا جائے۔

یہی حال ریاضی وہیئت کا ہے مسلمانوں نے ان علوم میں جو ترقی کی وہ اظہر من الشمس ہے، تاریخ فکر انسانی، ان کی علمی صلاحیتوں اور ان کی ذہنی کاوشوں کی مداح ہے اور ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی یورپ کے فضلا کے اعتراف کی بناء پر اپنے اسلاف کے علمی کارناموں سے آشنا ہے باایں ہمہ علوم جدیدہ بالخصوص جدید ہیئت سے اس درجہ مرعوب ہے کہ قدیم

ہیئت کو محض بے کار اور لغو سمجھتا ہے۔

لیکن یہ مسئلہ سنجیدہ غور و فکر کا مستحق ہے، ہیئت قدیم ہو یا جدید نہ تو وحی آسمانی ہے اور نہ سراسر قابل تردید، دونوں کی بنیاد و معروضوں (Hypothesis) پر ہے اور دونوں کا مقصد اجرام فلکی کی حرکات کا انضباط ہے۔

قدیم ہیئت جس کی اصلاح یافتہ شکل پچھلی صدی تک مشرق میں اور سولہویں صدی تک یورپ میں تمام ہیئت دانوں کا معمول بہ اور معتمد علیہ رہی ہے، عربی مدارس میں درس نظامی کے تحت میں پڑھائی جاتی تھی۔ بلکہ اب بھی یورپ کے عام مدارس میں درس عالیہ کے ضمن میں بطور اختیاری پڑھائی جاتی ہے، اس قدیم ہیئت کی بنیاد ابرخس (Hipparchus) اور بطلیموس (Patole my) کے نظریہ مرکزیت ارض (Geo Centrie theory) پر قائم ہے اور یہ معروضہ ایک عام انسان کے مشاہدے کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ چناں چہ ٹیکوبر ھے، کوپرنیکس، نیوٹن، کپلر اور ہرشل وغیرہ جو نظری طور پر زمین کے اپنے محور پر گھومنے اور آفتاب کے گرد حرکت عینی (Revolution) کے قائل ہوں تو ہوں لیکن عملی زندگی میں طلوع آفتاب و غروب آفتاب کا حوالہ دینا ان کے لئے بھی ناگزیر تھا۔ حالاں کہ جب زمین اپنے محور پر گھومتی ہے تو پھر طلوع آفتاب و غروب آفتاب کے کیا معنی، بہر کیف روزانہ زندگی کے لئے یہ مفروضہ ایک ٹھوس حقیقت کا وزن رکھتا ہے، اسی مفروضہ کی اساس پر ابرخس نے عموماً اور بطلیموس نے خصوصیت کے ساتھ اجرام فلکی کی حرکت کو منضبط کرنے کے لئے قوانین وضع کیے اور ان قوانین کو انہوں نے تداویر (Epicyclos) اور خوارج المرکز (Centric Circles) کی مدد سے مرتب کیا یہ دوائر، تداویر ہوں یا جوامل و خوارج محض مفروضات و ہندسی تجربات ہیں، جو محض انضباط حرکات کی سہولت کے لئے وضع کیے گئے تھے، چناں چہ ایک یورپی محقق آر تھر بیری اپنی کتاب مختصر تاریخ علم ہیئت میں لکھتا ہے۔

The circles known as deferent and epicycles arch hippar chus and hole my used. These were more geometrical abstractions which enabled the planetry motions to be represented with enabled accuracy. Each planet moved freely in space its motion being represented or described not con-

trolled by a particular geometrical arrangement of circles (Short history of Astronomy by Arthor Berry P.75)

"یہ دوائر خوارج و تداویر کے نام سے موسوم ہیں۔ جنھیں ابر خس اور بطلیموس نے استعمال کیا تھا۔ یہ محض ہندسی تجریدات تھے جنھوں نے سیارات کی حرکت کو قابل تسلیم صحت کے ساتھ منضبط کرنے میں مدد دی، ہر سیارہ فضا میں آزادی سے گردش کرتا ہے، اس کی حرکت کا ضبط و بیان چند دوائر اکی حرکت متشابہ کی مخصوص ہندسی ترتیب سے کیا جاتا ہے۔ مگر واضح رہے کہ دوائر کی یہ مخصوص ترتیب حرکت سیارات کی مدبر یا علت نہیں ہے۔" (مختصر تاریخ علم ہیئت آر تھر بیری صفحہ ۷۵)

اسی انداز پر قاضی زادہ رومی نے شرح چغمنی کے مقالہ اولیٰ کے باب ثالث کے خاتمہ پر گفتگو کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حوامل و خوارج اور تداویر کے فرض کرنے کا مقصد محض انضباط حرکات کواکب کی تسہیل ہے، اسی لئے افلاک جزیہ کی تعداد میں اختلاف ہے، شرح چغمنی میں ہے :

"للافلاك عند الجمهور من المهند سين المقتصرين على الروائر اربعة وثلاثون على اصل الخارج في الشمس و خمسة وثلاثون على اصل التدوير ۔"(۱)

اسی طرح متاخرین ہیئت دانوں میں جو ہیئت مجسمہ کے قائل ہیں، ان کی تعداد میں اختلاف ہے چناں چہ تصریح میں ہے :

"فمجوع لافلاك الكلية الجزئية اربعة وعشرون على ماهوالمشهور والمذكور في التجريد والتذكرة للمحقق الطوسي اوخمسة وعشرون على ماهوا المسطور في شرحه للعلامة القوشجي۔"(۲)

اوراس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب کی حرکت کو بعض لوگ محض مارج (Ecential Circle) کی اصل (Presposition) پر منضبط کرتے تھے اور بعض تدویر (Epicyelec) اور حامل کی اصل پر چناں چہ شرح چغمنی میں ہے : (۳)

"اعلم ان احوال الشمس تنضبط ايضاً بتدوير وحامل موافق المركز الاان ماذكره المصنف هوا المشهور وعليه الجمهور۔"

---

(۱) شرح چغمنی صفحہ ۱۴ (۲) تصریح صفحہ ۴۱، (۳) شرح چغمنی ص ۲۶۔

یہی نہیں بلکہ اس انضباط کے کے بعد بھی جو اختلافات (Anomalies) رہ جاتے ہیں۔ بعض متاخرین نے جو ہیئت مجسمہ کے قائل تھے۔ ان کی تصحیح کے لئے مزید افلاک فرض کئے۔ چناں چہ شرح چغمنی میں ہے۔(۱)

"وقد احتاج اصحاب التجسم فی ضبط الحرکات الی افلاك آخر بصر علیهم تصور اوضاعها۔"

قدیم ہیئت کے علماء و محققین کی ان تصریحات کے بعد جس کی تائید یورپ کے فضلاء بھی کررہے ہیں۔ اگر کوئی بزرگ اسے (۲) افلاک کی حقیقی ہیئت و تشکیل سمجھیں تو یہ محض ان کی "فرط ذہانت وسرعت ذکاوت ہے۔" جس کے لئے ہیئت قدیم اور اس کی کتابیں ذمہ دار نہیں ہیں، قدیم ہیئت اپنے اصول و نظریات کی تبیین میں ادعائیت و تحکمیت (Dagmation) کی مدعی نہیں ہے بلکہ محض Progmatic ہے۔ اس کے علماء اتنی کھلی ہوئی اور واضح بات کے لئے بھی کہ زمین حرکت نہیں کرتی (جیسا کہ فیثا غورثی ہیئت دانوں اور ارسطوفس کا خیال تھا) ادعا مائیت کے ساتھ دعویٰ نہیں کرتے، بلکہ کہتے ہیں کہ زمین کی حرکت وضعی (Rotation) کے بطلان پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی اس لئے زمین کے سکون مطلق کا تیقن کے ساتھ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، چناں چہ تصریح شرح تشریح میں ہے :

"ولم یقم دلیل علی بطلان تحرکها حرکة وضعیة۔"

یہ ہے قدیم ہیئت اور اس کے اصول و نظریات اور مفروضات اور اس کا انداز بحث۔

اس کے برعکس جدید ہیئت کی اساس مرکزیت شمس کے نظریئے (Helio centric theory) پر قائم ہے جس کے بانی کوپرنیکس اور ٹیکوبرھے ہیں، یہ مفروضہ ایک عام انسان کے عینی مشاہدے کے سراسر مخالف ہے، حتیٰ کہ جدید ہیئت داں بھی جب جداول فلکیہ (Astronomical Tables) تیار کرتے ہیں تو بطلیموس نظام ہی کے مطابق زمین کو مرکز عالم مان کر ثوابت وسیاروں کے طلوع و غروب کا حساب اور تسییر کواکب کا انضباط کرتے ہیں۔ بہرکیف جدید ہیئت دانوں نے مرکزیت شمس کے مفروضے کی اساس پر اور کیپلر کے قوانین حرکت کواکب (Laws of Planatary motion) کی مدد سے اجرام فلکی کی حرکت کو منضبط کیا، مگر اب یہ چیز ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کیپلر کے قوانین جتنے آسان اور عالم گیر

(۱) ایضاً ص ۵۴۔ (۲) مختلف افلاک کی ہیئت و ترکیب جو علم الہیت کی کتابوں میں مذکور ہے۔

معلوم ہوتے ہیں۔ حرکت کواکب کاانضباط اتنا آسان نہیں ہے، اور کواکب کی منضبط وضع (۱) اور واقعی وضع میں اکثر ناقابل توجیہہ اختلافات (Anomalies) پائے جاتے ہیں۔

پھر کیپلر اور نیوٹن کے عالم گیر اصول کشش ثقل کی اساس (Force) کے تصور پر قائم ہے لیکن آئینس ٹائن کی جدید تحقیقات نے اس کا امر موہوم ہونا ثابت کر دیا ہے۔ مگر محض سخن پروری کے خاطر جدید علمائے ہیئت ابھی تک کیپلر اور نیوٹن کے انداز پر ہیئتی انضباطات پر مصر ہیں۔

یہ تو ہے دونوں نظاموں کے اصولی نظریات کا فرق لیکن عملی زندگی میں جدید ہیئت نے قدیم ہیئت کے مقابلے میں بنی نوع انسان کی خدمت و نفع رسانی میں کیا ترقی کی، اس کے متعلق سر جارج کورنوال لیوس کا قول پڑھنے اور عبرت حاصل کرنے کے قابل ہے، وہ لکھتے ہیں :

The Copornion system of the universe and its subsequent completion by the Newtonian theory of universal gravition have and a purely scicentific value ad have exercised scarcely any practical influence upon the affairs of man kind. If the astronomical science of the ancients was less exact ad comprehensive than that of the modens, it had a close be a ring upon human affairs and it nearly exhausted those departments which are useful to mankind. (Historical servey of the Astronomy of the ancient by Sir George Cornwall Lewex P 254 and 255).

کوپرنیکی نظام عالم اور نیوٹن کے عالم گیر نظریہ کشش ثقل کے ذریعے اس کی بعد کی تکمیل ان چیزوں کی صرف ایک علمی قیمت ہے ورنہ بنی نوع انسان کے معاملات میں انہوں نے شاید ہی کوئی عملی اثر پیدا کیا ہو...... اگرچہ قدماء کا علم ہیئت، صحت جامعیت میں عہد حاضر کے علم ہیئت سے کم تر درجے کا تھا، پھر بھی انسانی زندگی کے (عملی) معاملات میں اس کا قریبی (اور گہرا) اثر تھا، اور تقریباً ان تمام شعبوں پر حاوی تھا جو بنی نوع انسان کے لئے مفید ہیں۔ (قدیم ہیئت کا تاریخی جائزہ۔ ص ۲۵۴، ص ۲۵۵)۔

---

(۱) Calculated position (۲) Actual position

غرض قدیم اور جدید ہیئت میں کوئی اتنا بڑا فرق نہیں ہے جس کی وجہ سے قدیم ہیئت کو دقیانوسیت کا مترادف قرار دیا جائے۔ بالخصوص جہاں تک عملی زندگی میں ان کی افادیت کا تعلق ہے، اصولاً یہ فرق بمنزلہ صفر ہے جیسا کہ سر جارج کورنوال لیوس کا قول اوپر مذکور ہوا۔ مگر جہاں تک امر واقع کا تعلق ہے ہم نہایت سنجیدگی کے ساتھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، کہ قدیم ہیئت زیادہ مفید تھی اس کی تفصیل یہ ہے۔

قدیم ہیئتی نظام میں معمولی مشاہدات کے لئے عموماً ایک اضطرلاب کی ضرورت پڑا کرتی تھی جو اپنے زمانہ میں کتنا ہی قیمتی کیوں نہ رہا ہو، لیکن عہد حاضر کے معمولی آلات رصد مثلاً ٹیلی اسکوپ اور سیکسٹینٹ (Sextent) وغیرہ کے مقابلہ میں کہیں ارزاں ہوتا تھا اس کا نتیجہ ہے کہ آج کے آلات صد افراد تو درکنار اداروں میں بھی کم یاب ہیں، جس زمانہ میں عربی مدارس میں ہیئت کی تعلیم ہوتی تھی، تو کرہ اور اصطرلاب اکثر طلبہ کے پاس ہوتے تھے اور اساتذہ کے پاس تو ان کا ہونا ضروری تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ افراد ہیئتی حسابات و مشاہدات کے لئے نہ ان لوگوں کے محتاج تھے اور نہ ہیئت دانوں سے استصواب کے چناں چہ الف لیلہ میں بغداد کے ایک حجام کے قصے میں لکھا ہے کہ اس کے پاس آلاتِ حجامت کے ساتھ ساتھ ایک اصطرلاب بھی رہتا تھا تاکہ وہ اپنے کام کے لئے سعد و نحس دریافت کر سکے، بہر حال یہ تو ایک قصہ ہے، مگر اس سے کم سے کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس آسان اور ارزاں طریقِ عمل نے علم ہیئت کو خواص سے لے کر عوام تک سب کے لئے قابل دسترس بنا دیا تھا۔

اور آج ؟ کروڑوں کی آبادی میں کتنے لوگ ہیئتی اعمال و مشاہدات سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ یونیورسٹیوں کے ہزاروں لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کتنے ہیئت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں یا اس سے دل چسپی رکھتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں آج بھی یوپی میں صورت حال یہ ہے کہ قدامت پسند مدارس کو چھوڑ کر جہاں ہیئت کی تعلیم اب عملاً ختم ہو گئی ہے۔ عام مدارس میں جو انتہائی غربت و افلاس کے عالم میں چل رہے ہیں کم و بیش ہر سال سو طالب علم جو یوپی بورڈ کے امتحان عالم کے لئے تیاری کرتے ہیں، تصریح پڑھ کر وہ ہیئت کے مبادی سے تو کم از کم واقف ہو جاتے ہیں، اگر

اس کے ساتھ اس چیز کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ ان مدارس کو ہیئت کی تعلیم کے لئے کتنا کم خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے، اور ان میں کس ذہانت کے طلبہ داخلہ لیتے ہیں، تو اسے باآسانی اندازہ ہو سکے گا کہ یوپی کے مدارس ایک مٹتے ہوئے فن کو زندہ رکھنے میں کیا خدمت انجام دے رہے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ مدارسِ عربیہ میں ہیئت کی تعلیم کے لئے خاص اساتذہ مقرر نہیں کئے جاتے، بلکہ عام اساتذہ ہی کے سپرد ہیئت کی تعلیم بھی رہتی ہے اور عموماً وہ طلبہ جو انگریزی تعلیم کے لئے ناکارہ سمجھے جاتے ہیں عربی مدارس میں بھیجے جاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بعض ذہن بالخصوص جن کا ادب اور شعریت کی طرف رجحان ہوتا ہے، وہ معقولات ریاضی اور ہیئت کی دقتِ نظر سے ابا کرتے ہیں لیکن یہ بڑا ظلم ہو گا کہ محض بعض طبائع کی نامناسبت کی وجہ سے ایک فن کو بالکل ہی دفن کر دیا جائے، اس میں شک نہیں کہ اکثر طلبہ منطق کے زوائد ثلاثہ کو نہیں سمجھ پاتے اور اس سے انہیں الجھن ہوتی ہے مگر اس میں شبہہ نہیں ہے کہ ہیگل کی Pexemenology کو بھی فلسفہ کے بڑے بڑے اساتذہ نہیں سمجھ پاتے بایں ہمہ کسی نے اسے مردود و ملعون قرار دینے کی کوشش نہیں کی۔

(الف) جامعیت مضامین نصاب میں تنوع کی مقتضی ہے، ہر شعبہ ایک خصوصی استاد کو چاہتا ہے، جس نے اپنے مضمون میں تخصص (Specialization) کیا ہوا جس کے معنی اساتذہ کی تعداد اور ان کے مشاہروں میں اضافے کے ہیں جس سے عہدہ برآ ہونے کی ان کے محدود وسائل آمدنی طاقت نہیں رکھتے اور ان کی آمدنی کے ذرائع روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں، ان حالات میں بھی عربی مدارس کے ذریعہ جو خدمت ہو رہی ہے وہ حد درجہ قابلِ ستائش ہے نہ کہ قابل مذمت۔

(ب) معیار کی بلندی، آئیڈیل کی بلندی کے تابع ہے۔ لیکن جہاں کوئی آئیڈیل سے نہ ہو وہاں بلندی معیار کا سوال کیا؟ اس اعتبار سے بھی اربابِ مدارس کی وفاداری بشرط استواری قابلِ صد ہزار آفرین ہے کہ کسی متعین آئیڈیل اور نصب العین کے فقدان کے باوجود وہ علومِ اسلامیہ کی مشعل کو روشن کئے ہوئے ہیں اور موانع کی باد تند کے باوجود اسے بجھنے نہیں دیتے۔

پھر معیار کی بلندی کا کوئی پیمانہ بھی ہونا چاہئے، اگر اس کے لئے یونیورسٹیوں کی تعلیم ہی کو پیمانہ مان لیا ہے تو خود یونیورسٹیوں میں عربی اور نام نہاد اسلامک اسٹیڈیز کی تعلیم بھی کچھ زیادہ معیاری نہ ملے گی۔

کیا ان یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان اور اس کے علوم کی تعلیم کا جو معیار ہے، وہی عربی زبان اور اس کے علوم کی تعلیم کا ہے، اس کو کوئی واقف کار کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، جب یونیورسٹیوں میں ہر طرح کی سہولتوں کے باوجود عربی علوم کی تعلیم کا وہ معیار نہیں ہے، تو نیم جان عربی مدارس سے اس کا مطالبہ کہاں تک جائز ہے۔

(معارف نمبر ۵، جلد ۷۷، مئی ۱۹۵۶ء)

# علومِ قدیمہ کا تحفظ

**مولانا مرزا محمد یوسف**
(استاذ عربی گورنمنٹ مدرسہ عالیہ رام پور)

مدارس عربیہ کی اصلاح اور ان کے نصاب پر نظر ثانی کا مسئلہ عرصے سے بہی خواہانِ ملت کا موضوع فکر بنا ہوا ہے۔ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ اصلاح ہوتی ہی رہی ہے۔ آخر "درس نظامی" کی ابتداء بھی تو ملا نظام الدین کے ایک اصلاحی اقدام ہی کا نتیجہ تھی۔ہاں یہ ضرور ہے کہ آج کل کی اصلاح قدیم اصلاحوں سے بنیادی طور پر مختلف ہوگی۔ پہلے زمانے میں ملک کے عام تعلیمی نظام میں مدارس عربیہ ہی کی ریاست تھی۔ آج یہ کیفیت بدل گئی ہے، یہاں تک کہ بعض مصلحین کے نزدیک تو یہ ایک دقیاسی نظام ہے جسے بدلے ہوئے حالات میں ختم ہو جانا چاہیئے (حالاں کہ یہ مایوسی بھی اتنی ہی غلط ہے جتنی گزشتہ صدی کی ہٹ دھرمی)اس کی وجہ حسب ذیل ہے۔

تعلیم معاشرتی نظام کے تابع ہوا کرتی ہے بالخصوص عمومی تعلیم ملک کی سیاسی و اقتصادی تنظیم میں رئیس نہیں بلکہ مرؤس ہوا کرتی ہے، مسلمانوں کو اپنے عہد حکومت میں اپنی حکومتی مشینری چلانے کے لئے خاص قسم کے کاری گر درکار تھے۔ سماجی نظام اسلامی تھا اور اس کی مخصوص اقدارِ حیات تھیں اس لئے تعلیم اور نصاب کا ایک خاص انداز رہا۔ آخری مغل تاج داروں کے عہد میں طوائف الملوکی اور انتشار نے ملک کا جو معاشرتی مزاج بنا دیا تھا اس کے لئے قدیم نظامِ تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت تھی، وہ ملا نظام الدین نے پوری کی۔ انگریزوں کے زمانے میں حکمرانوں کو ایک خاص قسم کے کل پرزے درکار تھے لہٰذا اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں اسی نہج پر بنیں اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس مخصوص نظام کو

چلانے میں حکمرانوں کا بہت اچھی طرح ہاتھ بٹایا۔ آزادی کے بعد معاشی و معاشرتی رجحانات بدل گئے ہیں اس لئے تعلیم کے متعلق بنیادی نظریات بھی بدل رہے ہیں اور ان بنیادی تبدیلیوں کا اثر تعلیمی نظام اور نصاب پر بھی پڑنا ناگزیر ہے اس کی تفصیل کا میں اہل نہیں اور نہ یہ میرے موضوع کے تحت آتی ہیں۔

انگریزوں کے عہد میں اگرچہ غدر نے مسلمانوں کی کمر ہمت توڑ دی تھی پھر بھی ان کی حمیتِ قومی نے اپنی قدیم تہذیب و ثقافت کے برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ پچھلی صدی میں قدامت وجدت کی کش مکش اور انگریزی تعلیم کی حرمت اور اس کے باوجود اس کی مقبولیت اسی جذبہ کا نتیجہ تھیں۔ اس کشاکش میں مدارس عربیہ نے وجود ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ وہ اس پر بھی مصر رہے کہ ملک کی عام تعلیمی ضرورتوں کے پورا کرنے کے ہم ذمہ دار ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے یہاں نئی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام نہیں کیا البتہ نئی ضرورتوں کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اس میں ان کو کہاں تک کامیابی ہو سکتی تھی۔

بیسویں صدی شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ عربی مدارس نے اپنی ہزیمت کو محسوس کیا، جنگ عظیم اور جنگ اعظم نے اس احساس میں شدت پیدا کی اور پچھلی صدی کے افراط کے رد عمل کے نتیجے میں ایک "نومیدی ومایوسئ جاوید" کی کیفیت پیدا ہونے لگی، اس کیفیت کا اظہار کہیں مصلحین کے اندر عربی مدارس سے بے زاری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کہیں ان کے اندر انقلابی تبدیلیوں کے مطالبے کی صورت میں لیکن نہ پچھلی صدی کا اصرار بے جا مستحسن تھا اور یہ قنوطیت و تشاؤم پسندی ہی قابل ستائش ہے۔

اس سلسلے میں ایک اصولی حقیقت عموماً نظر انداز کر دی جاتی ہے ہر چند کہ معاشرتی ہیئت ترکیبی کے نتیجے میں عمومی تعلیم کا ایک خاص نظام پیدا ہونا فطری ہے مگر ایک ترقی یافتہ ملک کے لئے عمومی تعلیم کے علاوہ اپنے افقِ ذہنی میں وسعت پیدا کرنا بھی ضروری ہے یعنی ملک کا ہر قسم کی معلومات سے آشنا رہنا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ملک کا ہر متعلم تمام عمومی و خصوصی مضامین سے واقف ہو۔ تمام خصوصی مضامین سے آشنائی تو درکنار تمام عمومی مضامین سے واقفیت بھی تکلیف مالا یطاق ہے۔ یورپ اتنا ترقی یافتہ ہے پھر بھی وہاں سب طالب علم بی ایس سی نہیں ہوتے بہت سے بی اے ہوتے ہیں یعنی سائنس جو یورپ کے مخصوص حالات کے پیش نظر وہاں عمومیت کا درجہ رکھتی ہے، اس سے اکثر طلبہ ناآشنا رہتے

ہیں یا اتنے آشنا نہیں ہوتے جتنے ان کے بی ایس سی ہم جماعت۔ جب تمام عمومی مضامین سے آشنائی ہر متعلم کے لئے ناگزیر و لابدی نہیں قرار دی جاسکتی، تو جملہ خصوصی مضامین سے ان کی واقفیت کا کیا سوال۔ لہذا خصوصی مضامین سے آشنائی صرف مخصوص طبقہ تک رہنا ضروری ہے۔ ہم اپنی اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ترقی یافتہ ملک کے لئے ہر خصوصی مضمون سے آشنائی فرض کفایہ ہے۔

مضامین تعلیم کے اس امتیاز کے بعد عربی مدارس کی حالیہ تاریخ پر پھر ایک نظر ڈالئے زندگی کی اس دوڑ میں انہیں جو ہزیمت ہوئی اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو مضامین مدارسِ عربیہ میں پڑھائے جاتے ہیں آج ان کی نوعیت "خصوصی مضامین" کی ہے۔

لیکن چوں کہ ہمارا ملک ایک ترقی یافتہ ملک ہے اس لئے اس میں ان خصوصی مضامین کی تعلیم کا انتظام رہنا چاہیے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اس انتظام کی کیا شکل ہونا چاہیے یہ خصوصی مضامین کی نوعیت پر موقوف ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

خصوصی مضامین کی مختلف نوعیتیں ہیں۔

اولاً وہ خصوصی مضامین جن کی سماج کو من حیث الکل ضرورت ہے لیکن ہر فرد اس میں کمال حاصل نہیں کر سکتا جیسے پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے استعمال کے سلسلے میں تحقیقات یا جن کی سماج کی اکثریت میں قدر ہے اگرچہ ہر فرد سے اس میں تبحر کی توقع نہیں کی جاتی مثلاً فوٹوگرافی۔

دوسرے وہ خصوصی مضامین جن کی سماج میں حیث الکل کو ضرورت نہیں ہے صرف، اس کا ایک حصہ اس کا حاجت مند ہے مثلاً دینیات یا دھرم شاستر کی تعلیم، اول الذکر صرف مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے۔

تیسرے وہ خصوصی مضامین جو تاریخ کے کسی دور میں بہت مقبول تھے اور بہ نظر عزت دیکھے جاتے تھے انہیں بھی ذہنی جستجو کی تشفی کے لئے برقرار رہنا چاہیئے۔ اگرچہ ان کے متخصصین کی تعداد بھی کم ہوگی۔ ان تیسرے قسم کے مضامین کی چند قسمیں ہیں۔

(الف) وہ مضامین جو سوسائٹی کے لئے مضر ہیں مثلاً سحر جادو کہانت وغیرہ۔

(ب) وہ مضامین جو سوسائٹی کے لئے مضر تو نہیں ہیں مگر ان کی ضرورت بھی نہیں ہے مثلاً امم بائدہ کی لسانیات۔

(ج) وہ مضامین جو کسی زمانے میں مفید تھے مگر جنہوں نے ترقی کر کے اب موجودہ عمومی مضامین کی شکل اختیار کر لی ہے مثلاً یونان کی ریاضی و ہیئت مسلمانوں کا فلسفہ وغیرہ عربی مدارس کے زیرِ درس مضامین تینوں قسموں کے تحت میں آتے ہیں، کیوں کہ درسِ نظامی کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

لسانیات، دینیات، معقولات۔

ا۔ ہندوستان جیسے ملک کو جو بین الاقوامی سیاسی توازن میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے باہر کے ہر ملک سے بالخصوص مشرق وسطیٰ سے ثقافتی تعلقات کے علاوہ ڈپلومیٹک تعلقات رکھنا ناگزیر ہیں۔ اس کے لئے ان ممالک کی زبان، کلچر اور قدیم تاریخ سے آشنائی ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کاشت کار اور مشین کار کے لئے سفارتی اداروں میں جانا ضروری نہیں ہے اس لئے چالیس کروڑ کی آبادی کو مصر و شام کی زبان، کلچر اور تاریخ کے مطالعے کی نہ ضرورت ہے نہ فرصت۔ لیکن بہر حال ملکی انتظام اور قومی وقار کے لئے ضروری ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ہمارے سفارت خانے زیادہ سے زیادہ عظیم الشان پیمانے پر قائم ہوں اور انہیں چلانے کے لئے ہمیں ایسے افراد پیدا کرنا ہیں جو عربی زبان مسلمانی کلچر اور اسلامی تاریخ کے خصوصی ماہر ہوں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان خصوصی مضامین میں زیادہ مہارت تامہ رکھتے ہوں بہ مقابلہ ملک کی درس گاہوں کے عمومی مضامین کے کیوں کہ جن اہم فرائض کی ادائیگی کے لئے وہ وہاں بھیجے جاتے ہیں ان کی تکمیل بغیر ان خصوصی مضامین کے ناممکن ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مصر میں ہندوستان قونصل خانہ کا ایک فرد حساب و ہندسہ سے ناآشنا ہو یا ہندی میں کچا ہو اور پھر بھی وہ اپنے فرائض مفوضہ کو ادا کر سکے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ عربی زبان سے ناآشنا ہو (ورنہ وہ وہاں کے باشندوں کی بات نہیں سمجھ سکے گا) یا مسلم کلچر سے ناواقف ہو (ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کو شریعت اسلامیہ پر عمل کرتے دیکھ کر استعجاب یا ازدراء کا اظہار کرے اور اس طرح مودت کے بجائے منافرت کا موجب بن جائے) یا اسلامی تاریخ پر عبور نہ رکھتا ہو (ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں کوئی مضحکہ خیزبات کہہ دے اور اس طرح ہماری قومی جہالت کے طعنہ کا سبب بن جائے)۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اس قسم کے اہم فرائض کی ادائیگی کے لئے عربی مدارس کے طلبہ زیادہ خوش سلیقہ ثابت ہو سکتے ہیں اگر چہ وہ عمومی مضامین سے زیادہ واقف نہ ہوں۔

۲۔ ہندوستانی سماج کے ایک اہم طبقے کو جو ہر چند کہ اقلیت میں ہے لیکن بہر حال ایک اہم اقلیت ہے اپنے بچوں کو دینی تعلیم ضرور دلواتا ہے۔ یہ تعلیم اس کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی سماج من حیث الکل کے لئے عمومی مضامین کی۔ اس لئے ایسے افراد کی تربیت ضروری ہے جو اس فریضے سے کماحقہ عہدہ برآ ہو سکیں۔ ظاہر ہے یہ مقدس فریضہ صرف عربی مدارس کے طلبہ ہی انجام دے سکتے ہیں۔

۳۔ تیسری قسم کے خصوصی مضامین میں سے جہاں تک (الف) کا تعلق ہے عربی مدارس کے نصاب میں اس قسم کا کوئی مضمون ہی نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں تک (ب) کا تعلق ہے ان کے یہاں "قرون خالیہ" کی "السنہ" کی مد میں سے کچھ نہیں ہے ہاں جہاں تک (ج) کا تعلق ہے متداول درس کا ایک اہم حصہ اس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے اس سلسلے میں پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں اس قسم کے مضامین کی تعلیم و تخصص کا کیا طریقہ ہے۔ عموماً وہاں ان مضامین کی تعلیم یا تو عام تعلیمی درس گاہوں میں ہوتی ہے یا خصوصی مدارس میں عام تعلیمی درس گاہوں کے ابتدائی مدارج میں طالب علم صرف عمومی مضامین ہی پڑھتا ہے۔ جامعی تعلیم کے ابتدائی سالوں میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے کسی خصوصی مضمون (مثلاً اسلامیات) کے مبادی کو لے لیتا ہے، بیچ کے سالوں (ایم اے) میں اس کا مستقل مطالعہ کرتا ہے اور آخری سالوں (ڈاکٹریٹ) میں اس کے کسی مخصوص پہلو پر تخصص کرتا ہے خصوصی مدارس عموماً تعلیم کے آخری مراحل پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں وہی طالب علم داخل ہو سکتے ہیں جنہوں نے عمومی مضامین میں ثانوی تعلیم حاصل کی ہو۔ باقی تشکیل عمومی درس گاہوں کی سی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں بعض یونیورسٹیوں نے (ج) کا بعنوان اسلامیات انتظام کیا ہے مگر بلاخوف لومتہ لائم کہا جا سکتا ہے کہ ان کے متخصصین میں وسعت ہو تو ہو گہرائی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے مثلاً جو لوگ عربی کا متداول نصاب پڑھے نہیں ہوتے اور یونیورسٹیوں میں بی اے یا ایم اے مسلم فلاسفی میں کرتے ہیں وہ فلسفہ اور دیگر علوم میں تو ماہر ہوتے ہیں لیکن اسلامی فلسفہ میں مدارس عربیہ کے طلباء کے ہم پایہ نہیں ہوتے۔ تاریخ فلسفہ اسلام سے وہ بھلے واقف ہوں مگر مسائلِ فلسفیہ سے زیادہ واقف نہیں ہوتے اور اگر ہم اس بات کو بھی

ملحوظ رکھیں کہ مدارس عربیہ کے طلبہ کی اوسط ذہانت ان جامعی طلبہ کی ذہانت سے بدرجہا پست ہوتی ہے (جن وجوہ سے بھی ہو) تو یہ فرق اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے مضامین کا ہے مثلاً فقہ کے ضمن میں ایک کامیاب وکیل ہائی کورٹ کے نظائر سے زیادہ واقف ہوتا ہے مگر فقہاء کے اختلافات اور وجوہ استدلال سے نہیں۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ مدارس عربیہ کے پاس جادو کی چھڑی ہوتی ہے کہ جہاں چھلایا اور طالب علم بحر العلوم ہو گیا۔ نہیں اصل وجہ "کار بکثرت" ہے۔ ان کے نظام تعلیم میں انہیں مضامین پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے مثلاً منطق ابتدائی درجات ہی سے شروع ہوتی ہے اور پھر صغریٰ سے لے کر حمد اللہ اور قاضی مبارک تک طوعاً و کرہاً پڑھنا ہی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

گر نستانی بستم می رسد

طالب علم خواہی نخواہی بہت سی ایسی باتوں سے واقف ہو جاتا ہے جو مسلم فلاسفی کے ایم اے کو بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کہ وہ تین چار سال سے زیادہ ان مضامین پر صرف نہیں کرتا۔ اس کی معکوس مثال انگریزی اور ریاضی وغیرہ ہیں۔ بعض عربی مدارس میں منتہی طلبہ انگریزی پڑھتے ہیں مگر ان میں یقیناً وہ لیاقت نہیں آتی جو ایک جونیئر اسکول کے معمولی طالب علم میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ تکمیلِ نصاب کے سلسلے میں بعض طلباء خلاصۃ الحساب پڑھتے ہیں مگر وہ تبحر حاصل نہیں ہوتا جو پرائمری اسکول کے طالب علم کو ہوتا ہے۔

اس لئے اگر عربی مدارس اسلامیات میں تفوق کا دعویٰ کریں تو اس سے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہیے یہ تو "کار بکثرت" کا فطری نتیجہ ہے۔

بہر حال ایک ترقی یافتہ اور بین الاقوامی وقار کے مستحق ملک کی حیثیت سے ہمارے ملک کو عربی زبان کلچر اور تاریخ کی تعلیم کے لئے عربی مدارس کا قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ اسی طرح ان علوم کو برقرار رکھنے کے لئے جنہوں نے ترقی کر کے جدید سائنس و فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے ان مدارس کا وجود ناگزیر ہے اور یہ ایسا خیال ہے جس پر غور و فکر کرنے والے ذہن کو جلد یا بدیر پہنچنا ہے پھر جہاں تک مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا تعلق ہے ان مدارس سے بے اعتنائی یا بے زاری قومی خودکشی کے مترادف ہوگی۔

## چند متعلقہ مسئلے

جب یہ امر ثابت و متحقق ہو گیا کہ ہر نقطۂ نظر سے مدارس عربیہ کی بقاء ضروری ہے تو چند اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

ا۔ **متعلمین کا مستقبل** : یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ ان مدارس کا اور ان کے طلبہ کا ہماری سماجی زندگی میں کیا مقام ہے۔ بد قسمتی سے معاشرتی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور اقدارِ حیات ابھی تک متعین نہیں ہو پائیں۔ اس کے نتیجہ میں بہت سی باتیں ایک غیر متیقن حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ پھر بھی اس مسئلے کو حل کرنا ہی ہوگا۔

میں نے کہا تھا کہ ان مدارس کی تین حیثیتوں سے ضرورت ہے۔ سماج کے لئے انتظامی امور کے واسطے، مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم کے واسطے، ملک کے لئے تثقیف اور افق ذہنی کی وسعت کے واسطے۔

پہلی غرض سے ان کی نگہداشت سماج میں من حیث الکل اور حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت مختلف قسم کے تعلیمی ادارے محض حکومتی اغراض کے لئے چلاتی ہے جن کے مصارف محض خزانہ عامرہ ہی سے پورے کئے جاتے ہیں اور جن کے فارغ التحصیل متعلمین کے معاشی مستقبل کی ضمانت حکومت اپنے ذمہ لے لیتی ہے یہی اصول یہاں بھی کارفرما ہونا چاہیئے۔ فرق اتنا ہے کہ مروجہ خصوصی درس گاہوں میں صرف اتنے ہی طلبہ کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے جن کی حکومت کو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے ضرورت ہوتی ہے، یہاں طلبہ کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی اس لئے اصول یہ ہونا چاہیئے کہ حکومت مشرق وسطیٰ کے لئے سفارتی اغراض کے واسطے اہلکاروں کا انتخاب مدارس عربیہ کے طلبہ ہی میں سے کرے یا یہاں کے منتخبین کا ایک کوٹا مقرر ہونا چاہیئے۔ آخر انتظامی ملازمتوں کے لئے بھی تو اہلکاروں کا انتخاب جامعات ہی کے طلبہ سے ہوتا ہے۔

دوسری غرض سے ان مدارس کی نگہداشت صرف مسلمانوں ہی کے ذمہ ہے۔ انہیں اپنے بچوں کو دینی تعلیم ضرور دلوانا ہے۔ اس لئے ایسے افراد کی تربیت کی ضرورت ہے جو اس فریضہ سے کماحقہ عہدہ بر آ ہو سکیں۔ لہذا ایسے اداروں کی بھی ضرورت ہے جو ایسے افراد تیار کر سکیں۔ اس مسئلے کو دو نقاطِ نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔

اولاً : جو افراد عربی مدارس سے فارغ ہو کر نکلیں ان کے لئے روزگار مہیا کرنے کے لئے مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کا دھندا تلاش کریں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مصنوعی تنفس کے ساتھ مدارس عربیہ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اصول زیادہ عرصے نہیں چل سکتا۔

ثانیاً سماج کے ایک اہم طبقہ کی مخصوص تعلیم کے لئے معلمین کی تیاری کے واسطے چند خصوصی اداروں کی ضرورت ہے اس طرح عربی مدارس خود اپنے افادی استحقاق کی بناء پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اگرچہ سوال یہاں بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ان متعلمین کا مستقبل کیا ہوگا مگر اب "طلب اور رسد" کے اصول پر اسے حل ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے پہلے احساسِ طلب میں شدت پیدا ہونا چاہیئے یعنی سماج کے ایک اہم طبقے کی تعلیم کے لئے ایک مخصوص نوع معلمین کی ضرورت ہے۔ اگر یہ شدتِ احساس پیدا ہو جاتی ہے تو خود سماج کو ان کا کفیل ہونا پڑے گا۔ براہِ راست یا بتوسط نمائندہ حکومت۔

تیسری غرض سے یہ امر مسلم ہے کہ ان علوم قدیمہ کو برقرار رہنا ہے جن کی ترقی یافتہ شکل موجودہ سائنس اور فلاسفی ہیں۔ اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک ملی دوسری ثقافتی۔

۔ ملی حیثیت سے ان کی نگہداشت اس ملت کا فرض ہے جس کے اسلاف نے ان علوم و فنون کی ترقی میں خون پسینہ ایک کیا ہو۔

ثقافتی حیثیت سے ملک کی نمائندہ حکومت کا فرض ہے کہ ایک ترقی یافتہ ملک میں جہاں جملہ علوم و فنون کی سرپرستی کی جاتی ہے ان علوم کی بھی سرپرستی کرے اور ان کے تحفظ وبقاء کے لئے ٹرسٹ قائم کرے۔

**۲۔ مدارس عربیہ کی نگہداشت :** یہ مسئلہ اوپر حل ہو گیا۔ بعض حیثیتوں سے ان کی نگہداشت کی ذمہ داری کلیتاً حکومت پر ہے اور بعض جہتوں سے صرف مسلمانوں پر اور بعض حیثیتوں سے دونوں پر۔ اس لئے ہر چند کہ ان کی ذمہ داری کلیتاً حکومت پر عائد نہیں ہوتی لیکن پھر بھی حکومت کو فراخ دلی سے ان کی مالی مشکلات میں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

**۳۔ مدارس کا انتظام :** باوجود ان مدارس کی دنیوی افادیت کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس پر اصرار کرے گا کہ یہ مدارس خالصتاً لوجہ اللہ خدمت کرتے رہیں اور اسی جذبے کے

ماتحت انہیں باقی رہنا چاہیئے۔ یہ جذبہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہے اور جو مدارس اس جذبے کے تحت چلنا چاہتے ہیں اور اپنے مخصوص مصالح یا دیرینہ روایات کے ماتحت حکومت کی امداد سے مستغنی رہنا چاہتے ہیں وہ حسب سابق آزادانہ چلتے رہیں۔

لیکن بدلے ہوئے حالات میں سب مدارس تو حکومتی اعانت سے مستغنی نہیں رہ سکتے۔ اکثریت حکومتی امداد کی خواہاں ہے بالخصوص جب کہ ملک میں اپنی ہی حکومت قائم ہے اور حکومتی امداد ٹیکس دہندوں ہی کی بالواسطہ اعانت ہے۔ اس لئے ان کے نظم وضبط کارکردگی اور حساب کتاب کی نگہداشت کے لئے مقامی ذمہ داروں کی مشترکہ ذمہ داری ہونی چاہیئے اور اس کے لئے حکومت کی بالادستی ضروری ہے اس لئے نہیں کہ حکومت اس بالادستی کے توسط سے ان مدارس کی پالیسی میں مداخلت کر سکے بلکہ اس لئے کہ بصورت فساد وانتشار اس کا ازالہ کیا جا سکے نیز ان کی جائز ضرورتیں حکومت سے پوری کرائی جا سکیں۔

۴۔ **نصاب کی اصلاح** : موجودہ نصاب میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ بنیادی تبدیلی سے میری مراد یہ ہے کہ بعض علوم کو عملاً نصاب سے محض اس بناء پر خارج کر دیا جائے کہ ان کی افادیت ان سے زیادہ ترقی یافتہ علوم کے پیش نظر ختم ہو چکی ہے۔ اس قسم کا "مبنی بر افادیت" اصول تو عمومی درس گاہوں کی تنظیم جدید کے سلسلے میں ملحوظ رہنا چاہیئے۔ یہاں اصولی مسئلہ عملی زندگی کے لئے مفید نصاب بنانے کا نہیں ہے بلکہ اصل الاصول علومِ قدیمہ کا تحفظ ہے جو ہمارے اسلاف کی ذہنی و فکری کاوشوں کا ایک بیش قیمت ورثہ ہیں۔

اس کے ساتھ متداول درس میں چند فنون اور بڑھانے ہوں گے۔ لسانیات کے سلسلے میں طلبہ کو جدید عربی سے آشنا کرانا ہے جو اس وقت ممالک عربیہ میں مستعمل ہے جو طلبہ اس کے اہل اور شائق ہوں ان میں جدید عربی بولنے اور لکھنے کی مشق اور تاریخ ادب کے سلسلے میں ممالک عربیہ کی انیسویں بیسویں صدی مسیحی کی ادبی و ثقافتی تحریکات سے واقفیت ضروری ہے۔

دینیات کے سلسلے میں عہدِ حاضر کی لادینی و ملحدانہ نیز دیگر معاشی و معاشرتی تحریکات کا کم از کم سرسری مطالعہ ضروری ہے تاکہ اس پس منظر میں اسلام کی افادیت و مقبولیت کو سمجھا

اور سمجھایا جا سکے۔ اس طرح ایک نئے علم کلام کی ضرورت بھی پوری ہو سکے گی۔

معقولات کے سلسلے میں اور اسی طرح جملہ علوم کے سلسلے میں اس پس منظر کے واضح کرنے کی ضرورت ہے جس کے اندر یہ علوم و فنون ظہور میں آئے۔ سماج کی خدمات انجام دیتے رہے اور ترقی پا کر موجودہ سائنس اور فلسفہ کی شکل میں منتقل ہوئے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

اولاً: تاریخی تعارف کے لئے عمومی تاریخ اور ہر مضمون سے متعلق اس کی خصوصی تاریخ کا اضافہ ہونا چاہیئے۔

ثانیاً: موجودہ درس نظامی اس دور کا ساختہ و تیار کردہ ہے جب کہ اسے افادی حیثیت سے بنایا گیا تھا اور اس لئے متاخرین کی شروح و متون داخلِ درس کی گئی تھیں۔ اب چوں کہ بنیادی نقطۂ نظر ہی بدل رہا ہے اور اس نصاب کے ایک معتد بہ حصے کی حیثیت افادی کے بجائے تاریخی و ثقافتی قرار دی جا رہی ہے تو متاخرین کی شروح و متون کے ساتھ ساتھ متقدمین کی مصنفات ہی مناسب مقام پر داخل درس کی جائیں مثلاً فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعدیہ اور میبذی و صدرا کے ساتھ ساتھ شیخ بو علی سینا اور فارابی وغیرہ کی مصنفات بھی شامل کی جائیں ریاضی میں تصریح و شرح چغمنی کے ساتھ ساتھ شرح تذکرہ مجسطی، قانون مسعودی اور صور الکواکب وغیرہ شامل کئے جائیں۔ اسی طرح اصول فقہ میں نور الانوار، توضیح تلویح اور مسلم الثبوت کے ساتھ جو آٹھویں صدی کے بعد کی تصانیف ہیں تحریر، اصول بزدوی، اصول سرخسی بھی مناسب مقام پر شامل کی جائیں کلام میں شرح عقائد نسفی کے ساتھ طوالع، محصل، التمہید للباقلانی وغیرہ داخل کی جائیں۔

لیکن اس اضافے کے ساتھ یہ اصول ملحوظ رہے کہ موجودہ درس نظامی ہر چند کہ اپنی افادیت کھو چکا ہو پر بھی کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے اور جس اضافہ کی میں تجویز کر رہا ہوں اس کی افادیت مشکوک ہے لہذا موجودہ درس کو سر دست علی حالہ لازمی رہنے دیا جائے اور اضافہ مجوزہ کو بطور اختیاری مضمون داخلِ درس کیا جائے۔ دونوں کی اضافی افادیت کو زمانہ آگے چل کر متعین کر دے گا فیصلے کی روشنی میں نیا نصاب متعین ہو گا۔

(برہان دہلی، جون ۱۹۵۸ء)

# مدارس کے نصاب میں تاریخ اسلام کا مطالعہ

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (ایم اے، پی ایچ ڈی، لندن)
(صدر شعبہ عربی و اسلامیات، گورنمنٹ کالج، لاہور)

قومی فلاح اور ملی مفاد کا تقاضا ہے کہ اس بارے میں علمائے کرام اپنا فرض پہچانیں اور جس طرح وہ دیگر دینی اور دنیوی معاملات میں قوم کی رہنمائی کرتے ہیں اسی تاریخ اسلام کے متعلق بھی ابنائے ملت کی رہنمائی کریں اور ان کو صحیح راستہ دکھائیں۔ علمائے کرام نے اس بارے میں جو غفلت برتی ہے اس کا نتیجہ نہ صرف یہ نکلا ہے کہ یہ فن شریف نااہل لوگوں کے قبضہ تصرف میں چلا گیا ہے۔ بلکہ اس نے بعض حلقوں میں صریح طور پر افسانہ کی صورت اختیار کر لی ہے اور اگر ان کے تغافل کی یہی حالت رہی جواب ہے تو قوی اندیشہ ہے کہ فن تاریخ کی صورت بالکل مسخ ہو جائے گی اور یہ علم اس سرزمین سے بالکل مٹ جائے گا۔ زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اس فن پر اپنی گرامی توجہ بیش از بیش مرکوز کریں اور نہ صرف درس و تدریس کے ذریعہ مدارس کے طلبہ میں اس فن کا شوق اور صحیح ذوق پیدا کریں بلکہ تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف سے بھی عامۃ الناس کی معلومات میں اضافہ کریں اور اپنی تالیفات کا اسلوب بیان ایسا رکھیں جس سے ناظرین میں تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ تاریخی بصیرت بھی پیدا ہو اور تدبر و تفکر کی طرف ان کا میلان اور رجحان بڑھے۔

و علوم و فنون آج کل ہمارے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ وہ سب کم و بیش افادی حیثیت رکھتے ہیں، مگر اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم میں تاریخ اسلام کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے جگہ دی جائے۔ آپ نے درس نظامی کی شہرت سنی ہو گی۔ اس کو اٹھا کر دیکھئے اس میں کم از کم نصف کتابیں قدیم فلسفہ اور ہیئت کی ہیں جن کے اکثر مسائل

سائنس اور فلسفہ، جدید کی ترقی کے بعد بے کار اور لاحاصل ہو چکے ہیں مگر اس میں تاریخ کی کتاب نام کو بھی نہیں۔ بعض جدید قسم کے مدارس میں جو زمانہ حال ہی میں قائم ہوئے ہیں، سیرت کی ایک آدھ کتاب داخل نصاب کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس نصاب میں معیار کی وہ بلندی اور جامعیت نہیں، جو ہمیں مطلوب ہے۔

ہمارے مدارس کی یہ حالت ایک مدت دراز سے چلی آرہی ہے اور باجود تنبیہ کے ان میں کما ینبغی اصلاح نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر جی لائٹنر (G.Leitner) نے گذشتہ صدی میں جب پنجاب میں مشرقی علوم کی تدریس کو سرکاری طور پر منظم کیا اور لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کالج کی بناڈالی تو انہوں نے بھی اس کمی کو شدت سے محسوس کیا تھا اور اسے پورا کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی ضمن میں ایک تاریخی کتاب "سنین اسلام" کے نام سے ۱۸۷۰ء میں دو جلدوں میں شائع کی تھی۔ اس کے انگریزی دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

"مجھے چند مولوی صاحبان کا امتحان لینے کا اتفاق ہوا، جو سرکاری وظائف کے امیدوار تھے، میں نے دیکھا کہ دیگر مقامات کی طرح پنجاب میں بھی وہ حضرات صرف و نحو کی جزئیات کا تو اس حد تک عمیق علم رکھتے تھے جس کا مغرب کے مستشرقین کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، مگر جہاں تک عربی تاریخ اور ادبیات کا تعلق ہے وہ کم وبیش بالکل کورے تھے، اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لئے میں نے پہلے ایک خاکہ تاریخ عرب کا تیار کیا اور پھر ایک خاکہ ادب عربی کا، کیوں کہ مولوی صاحبان کو اس امر سے آگاہ کرنا ضروری تھا کہ تاریخ عرب کا ایک معلوم اور معین تسلسل ہے اور ان کا ادب قرآن کی تفاسیر اور صرف و نحو کی چند کتابوں تک محدود نہیں ہے بلکہ عربی زبان میں ریاضیات، تاریخ، طب وغیرہ علوم کے ذخیرے ہیں اور عربوں کی تاریخ، تاریخ عالم کا ایک اہم جز ہے۔"

مگر افسوس کہ ڈاکٹر لائٹنر کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، کیوں کہ وہ کتاب یعنی سنین اسلام جو انہوں نے خاص طور پر دیسی مدارس کی ضروریات کے پیش نظر تیار کی تھی، جلد ہی لوگوں کے ذہن سے اتر گئی اور کالج کا نصاب تعلیم جلد ہی اس سے بالکل معرا ہو گیا۔

تاریخ اسلام کو صرف نصاب میں داخل کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی تدریس و تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ مقرر کئے جائیں جن کو اس فن میں تخصص کا درجہ حاصل ہو اور وہ اس فن کی تعلیم کا حق ادا کر سکیں۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت

اوران کے طرز تعلیم میں ایسی خوبی اور دل کشی ہو۔ جس سے نہ صرف طلبہ کی تاریخ معلومات بڑھیں بلکہ ان میں فن تاریخ کا صحیح ذوق پیدا ہو، اور انہیں تاریخی مسائل پر غور و فکر کرنے کا ملکہ حاصل ہو۔ دیوبند اور دوسرے اعلیٰ مدارس میں جہاں استاد التفسیر اور استاد الحدیث ہیں وہاں استاد التاریخ بھی ہونے چاہئیں۔ تاکہ طلبہ تاریخی معلومات کو مستند لوگوں سے حاصل کریں۔ مگر یہ بات بہت کم سننے میں آئی ہے کہ کسی معروف اور مستند مؤرخ کا تعلق ہمارے کسی تعلیمی ادارے کے ساتھ رہا ہو۔

اساتذہ کے انتخاب میں بڑی احتیاط لازم ہے۔ بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی مضمون کی کرسی دراست (Chair) قائم کرنے سے جو حقیقی مقصد تھا، وہ غلط انتخاب سے فوت ہو گیا۔ میں اپنے مطلب کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے تقریباً پچیس برس پہلے علی گڑھ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹیڈیز (Islamic Studies) کی پروفیسر شپ قائم ہوئی تھی مگر اس پر مسٹر کرنکو (Krankow) کا تقرر عمل میں آیا۔ جو اس لحاظ سے ناموزوں تھا کہ موصوف کا علم بیشتر جاہلی شعر و شاعری تک محدود تھا۔ وہ علی گڑھ میں سال ڈیڑھ سال تک رہے اور اس عرصہ میں اسی بات پر بحث ہوتی رہی کہ اسلامک اسٹیڈیز کا موضوع بحث کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں۔ قیام علی گڑھ کے بعد مسٹر کرنکو نے بھری مجلس میں کہا کہ "میں جب علی گڑھ میں تھا تو ایک دوسرے شخص کے ساتھ مل کر میں نے قانون مسعودی کو ایڈٹ کرنے کی کوشش کی، مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، کیوں کہ میں علم ہیئت سے ایسا ہی نابلد تھا۔ جیسا کہ میرے ساتھی عربی زبان سے کورے تھے۔"

جب صاحب مذکور کو علی گڑھ کی آب و ہوا راس نہ آئی اور انہوں نے اس علمی مرکز کو خیر باد کہا تو ان کے رخصت ہونے کے بعد ان کا منصب یعنی اسلامک اسٹیڈیز کی پروفیسر شپ بھی اس بناء پر معرض تخفیف میں آگئی کہ اسلامک اسٹیڈیز کو بطور ایک امتحانی مضمون کے اختیار کرنے والے طلبہ کی تعداد بہت قلیل تھی اور فاضل موصوف کے درس میں حاضر باش طلبہ کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی، اور یہ امر ہمارے لئے قطعاً باعثِ تعجب نہیں کیوں کہ موصوف کی علمی دل چسپی کا مرکز جاہلی شعراء تھے اور وہ اسلامیات جیسے وسیع مضمون کی تدریس کا حق ادا کرنے سے قاصر تھے جس میں علم دینیہ شرعیہ کا عنصر غالب ہونا چاہیے۔ ان کی ناکامی خصوصاً ایسے حالات میں باعث حیرت نہیں جب کہ اس جدید مضمون کے حدود

بھی ابھی تک ان کے اپنے ذہن میں اور ارباب یونیورسٹی کے ذہن میں واضح طور پر معین نہیں ہوئے تھے۔

دوسرے علمی مرکزوں میں بھی بعض "کرسیوں" اور ان کے متعلقہ علوم کا ایسا ہی افسوس ناک انجام ہوا ہے مگر اس کی تفصیل کے لئے یہاں گنجائش نہیں، ان امور میں قومی انحطاط کے اسباب پر غور کرنے والوں کے لئے بڑا سرمایہ عبرت موجود ہے۔ خلاصہ کلام، قومی شعور کی بیداری اور پائیداری اور احساس ملی کی استواری کے لئے قومی تاریخ کا علم نہایت ضروری ہے۔ تاریخ اسلام کی ملی اور قومی اہمیت کے پیشِ نظر یہ بات دانش مندی سے بہت دور ہے کہ اس فن کو نااہل لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے، علماء کرام کا فرض ہے کہ وہ قومی تاریخ کے بارے میں ابناء ملت کی صحیح رہنمائی کریں۔ تاریخ اسلام کو ہمارے مدارس اور دارالعلوموں کے تقریباً ہر درجہ کے نصاب میں داخل ہونا چاہیئے تاکہ ابنائے قوم میں ابتداء ہی سے تاریخ کا صحیح ذوق پیدا ہو اور تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ انہیں تاریخی بصیرت بھی حاصل ہو۔ نیز اس مضمون کی تدریس کے لئے ایسے اساتذہ کا تقرر ہونا چاہیئے جن کو اس فن کے ساتھ طبعی مناسبت ہو اور وہ نہ صرف تدریس و تعلیم سے اس فن کو زندہ رکھیں۔ بلکہ ہمارے شاندار ماضی کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے ہمارے تاریخی ادب کو بھی مالا مال کر دیں۔ جس سے موجودہ نسل مستفید ہو اور وہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی سرمایہ خرد ثابت ہو۔

(معارف نمبر ۲، جلد ۷۷، فروری ۱۹۵۶ء)

# دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں چند اہم رائیں اور مشورے

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

دارالعلوم سبیل السلام کے نصاب پر غور و خوض کے لئے مورخہ ۲۳، ۲۴، ۲۵ رجب ۱۴۱۰ھ کو جامعہ ھذا کے اساتذہ و ذمہ داران کی نشستیں ہوئیں۔ اسی موقع سے یہ رپورٹ پیش کی گئی، اس کا تعلق گو خاص جامعہ ھذا سے ہے، لیکن علماء کی جو رائیں جمع کی گئی ہیں وہ تمام ہی دینی درس گاہوں کے لئے نشانِ راہ ہیں، اس لئے "صفا" کے صفحات میں عمومی افادہ کے لئے طبع کی جا رہی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کی اصلاح کا تعلق صرف نصاب سے نہیں، بلکہ اساتذہ کے طریقہ تدریس، ان کی شخصی دلچسپی اور توجہ اور جس فن کی کتاب وہ پڑھا رہے ہوں، اس فن سے مناسبت سے بھی معیار تعلیم کا گہرا ربط ہے، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تعلیمی استعداد کے سلسلہ میں ایک اہم ترین عامل نصاب تعلیم بھی ہے اور وہی اساتذہ اور طلبہ کے لئے محنت کی اصل اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے ....... اب کہ دارالعلوم سبیل السلام میں ابتدائی جماعت سے لے کر دورۂ حدیث، بلکہ "تخصص فی الفقہ" تک تعلیم ہو رہی ہے، اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مدرسہ کے نظامِ تعلیم اور نصاب تعلیم کا پھر سے جائزہ لیا جائے، جو کمی ہو اس کو دور کیا جائے اور کوئی نئی چیز قابلِ اخذ و قبول ہو تو اس سے اعراض بھی نہ کیا جائے کہ یہی سلف صالحین اور ہمارے بزرگوں کا توارث ہے۔

نظامِ تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہر ادارہ کا اپنا مخصوص مسئلہ ہوتا ہے اور حالات و مقامات کے

لحاظ سے اس کے منہج میں فرق بھی ضروری ہوتا ہے، اس لئے اس پر تو خود مدرسہ کے اساتذہ اور ذمہ داران بیٹھ کر غور کریں گے اور یہ بات مناسب ہوگی کہ شوال ۱۴۱۰ھ میں ہم لوگ ایک بار پھر اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بیٹھیں اور مکمل نقشہ کار تیار کریں اور اسے نافذ بھی کریں۔

نصابِ تعلیم کا مسئلہ ایک ایسا عمومی مسئلہ ہے جس میں مختلف دینی مدارس باہم مربوط بھی ہیں، اور یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کے لئے اساتذہ سے زیادہ اہلِ علم، ماہرین تدریس اور مختلف مکاتبِ تعلیم کی آراء کو سامنے رکھ کر ان سے استفادہ کیا جائے اور اس باب میں وسیع الفکری اور بے تعصبی کو اپنایا جائے، البتہ خواہ مخواہ آزمودہ ڈگر سے انحراف کی راہ بھی اختیار نہ کی جائے، چناں چہ مسئلہ کی اسی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے ۲۵ محرم ۱۴۱۰ھ کو مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی نے اپنی ایک تحریر کے ذریعہ آپ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی اور راقم الحروف کو اس کا کنوینر مقرر کیا، چناں چہ راقم سطور نے مدرسہ ہٰذا کے تمام اساتذہ کے علاوہ ریاست اور ملک کے ممتاز علماء اور ماہرین تدریس کو اس سلسلے میں خطوط لکھے، مدرسہ کا جاریہ نصاب بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اپنی گراں قدر رایوں سے استفادہ کا موقع دیں، چناں چہ ملک کے مختلف اہلِ علم نے نہ صرف اپنی رائیں بھیجیں، بلکہ اس طریقہ کار کی تحسین بھی فرمائی، اب تک جو رائیں موصول ہوئی ہیں وہ مولانا سید انظر شاہ کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم (وقف) دیوبند، مولانا شمس الحق صاحب، شیخ الحدیث جامعہ رحمانی مونگیر (بہار)، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری شیخ الجامعہ سلفیہ بنارس، مولانا کبیر الدین صاحب شیخ الحدیث جامعہ دار السلام عمر آباد، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیخ الحدیث دار العلوم حیدر آباد مولانا سلیمان حسنی ندوی، استاذِ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو، مولانا افضال الحق قاسمی شیخ الحدیث مدرسہ ریاض العلوم گرینی جون پور، مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری شیخ الحدیث مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ (بہار) مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی جامعہ دار السلام مالیر کوٹلہ پنجاب مولانا خلیل الرحمٰن اعظمی جامعہ دار السلام عمر آباد، مفتی محمد یحییٰ صاحب دار العلوم حیدر آباد، مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی استاذ جامعہ رحمانی مونگیر، مولانا مسعود عالم قاسمی، ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، جواہر لال یونیورسٹی دہلی، مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ صاحب مختاری، معہد احسانی رائے چوٹی، مولانا صدر

الحسن ندوی استاذ جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم اورنگ آباد، مفتی امان اللہ قاسمی، ناظم مدرسہ مدینۃ العلوم مریال گوڑہ، نلگنڈہ، مولانا عبدالستار صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ سراج العلوم گنٹور (آندھرا پردیش) اور مولانا خورشید انور ندوی اعظمی کے علاوہ خود دارالعلوم سبیل السلام کے اساتذہ میں مولانا زبیر احمد قاسمی شیخ الحدیث، مولانا عتیق الرحمٰن قاسمی، مولانا فضل الرحمٰن قاسمی، مولانا برکت اللہ قاسمی، مولانا نور العین اعظمی (اساتذہ حدیث) اور مولانا عباس صاحب قاسمی ہیں۔

ذیل میں ان حضرات کی آراء کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جن سے آپ حضرات کو غور وفکر اور فیصلہ میں سہولت ہوگی.......... میں فن وار ان حضرات کی رائیں درج کر رہا ہوں تاکہ ایک نظر میں ایک فن سے متعلق مجوزہ کتب آجائیں۔

## ۱۔ تفسیر واصولِ تفسیر

مولانا سید انظر شاہ صاحب کی رائے ہے کہ تفسیر میں زمخشری اور اصولِ تفسیر میں البرہان اور الاتقان سے فائدہ اٹھایا جائے، مولانا مسعود عالم قاسمی کا خیال ہے کہ سالِ ہفتم میں تفسیر کو خصوصی اہمیت دی جائے اور الاتقان کے ضروری مباحث پڑھادیئے جائیں، مولانا شمس الحق صاحب کی رائے ہے کہ الفوز الکبیر کی جگہ الاتقان پڑھائی جائی، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے میں الفوز الکبیر پنجم عربی میں پڑھائی جائے اور ششم عربی میں تلخیص الاتقان یا اصولِ تفسیر کی کوئی اور کتاب رکھی جائے، مولانا محمد قاسم مظفر پوری کا خیال ہے کہ تیسر القرآن مرتبہ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کو داخلِ درس کئے جانے پر ضرور غور کیا جائے، مولانا محسن عثمانی ندوی کی رائے ہے کہ جلالین کے بجائے مختصر تفسیر ابن کثیر (شیخ ادریس صابونی) زیادہ مناسب ہے، مولانا خورشید انور ندوی نے بیضاوی کے ساتھ ابن کثیر اور کشاف کے کچھ حصوں کے پڑھانے کا مشورہ دیا ہے، نیز یہ کہ جلالین کے ساتھ "اعلاء ما من بہ الرحمٰن" کا کچھ حصہ بھی ضرور پڑھایا جائے۔

## ۲۔ حدیث واصولِ حدیث

اصولِ حدیث میں مولانا انظر شاہ کی رائے ہے کہ مقدمہ ابن صلاح داخلِ نصاب کی جائے، نیز سخاوی کی فتح المغیث اور سیوطی کی تدریب الراوی بھی مہمات میں سے ہیں،

مولانا کی رائے ہے کہ خود دورہ میں بھی صحاحِ ستہ کا انتخاب ہی پڑھایا جائے، مثلاً ابن ماجہ سے اتباعِ سنت کا باب، بخاری سے بدء الوحی، ایمان اور علم، مسلم کا مقدمہ اور کتاب الایمان پڑھایا جائے، ابوداؤد کی سند پر توجہ دی جائے۔ مولانا نیاز احمد رحمانی نے لکھا ہے کہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور طحاوی سبقاً سبقاً پڑھائی جائے، احادیث کی تمام کتابوں کا رکھنا کیا ضروری ہے؟ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی کی رائے ہے کہ دورۂ حدیث میں شیخ محمود طحان کی کتاب ''مصطلح الحدیث'' مناسب ہوگی۔ مولانا مسعود عالم قاسمی نے لکھا ہے کہ دورۂ حدیث میں ابوداؤد، نسائی، طحاوی اور ابن ماجہ کے منتخب ابواب کافی ہیں، البتہ مقدمہ ابن الصلاح، کتاب الکفایہ، تدریب الراوی، العلل المتناہیہ، المنار المنیف اور معرفۃ علوم الحدیث کے منتخب حصے پڑھادیئے جائیں، ہفتہ میں ایک گھنٹہ تخریج احادیث اور استنباط احکام کی مشق کرائی جائے، نیز حدیث کی انتیس انواع میں سے کسی ایک پر یا رجال پر، یا کسی محدث کے علمی کام پر ایک مفصل مقالہ لکھوایا جائے، مولانا صدر الحسن ندوی نے دورۂ حدیث میں ڈاکٹر مصطفیٰ صادق رافعی کی ''السنۃ مکانتھا فی التشریع الاسلامی'' ڈاکٹر عجاج الخطیب کی ''السنۃ قبل التدوین'' اور ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی دراسات فی حدیث النبوی میں سے کسی کتاب کو خارجی مطالعہ کے لئے متعین کرنے کا مشورہ دیا ہے اور یہ بھی کہ جرح وتعدیل کے فن پر کوئی مختصر سی کتاب بھی اس جماعت میں شریکِ نصاب کی جائے، البتہ آپ کا خیال ہے کہ ہفتم عربی میں ''نخبۃ الفکر'' کے ساتھ ''مقدمہ شیخ عبدالحق'' کی ضرورت نہیں۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ دورۂ حدیث کے اندر صحیحین، ترمذی اور ابوداؤد کی تکمیل کا انتظام ہو، نیز شریکِ درس دیگر کتابوں کا بھی معتدبہ حصہ پڑھایا جائے، مؤطائین اور شمائل ایک ہی گھنٹہ میں سال کے مختلف تین حصوں میں پڑھائی جائیں، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ طحاوی اور موطا امام محمد مکمل روایۃً نہیں بلکہ درایۃً ہی پڑھائی جائے۔

## ۳۔ فقہ اور اصولِ فقہ

مولانا انظر شاہ صاحب کی رائے ہے کہ کنز کے بجائے ''ملتقی الابحر'' اور ''شرح وقایہ'' کی جگہ ''شرح نقایہ'' داخلِ نصاب کی جائے، مولانا نیاز احمد رحمانی کی رائے ہے کہ ''نور الایضاح''، ''الفقہ المیسر'' سے زیادہ مناسب ہے اور اس میں مسائل زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر محسن

عثمانی کی رائے ہے کہ عام عربی میں سراجی کی جگہ "فوائد فی علم الفرائض" تالیف محمد عبدالرحیم جادبدرالدین زیادہ موزوں ہے۔ مولانا مسعود عالم قاسمی نے ششم عربی میں ابن رشد کی "بدایۃ المجتہد" کے مختلف حصوں کے اضافہ کی رائے دی ہے۔ مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے "سراجی" کی جگہ "قوانین الارث فی الاسلام" کو زیادہ موزوں قرار دیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے "کنز" کی جگہ "شرح نقایہ" کو داخلِ نصاب کرنے کی رائے دی ہے اور لکھا ہے کہ قدوری مکمل پڑھائی جائے، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ "ہدایہ جلد اول" مکمل پڑھائی جائے، مولانا خورشید انور ندوی کی رائے ہے کہ "کنز الدقائق" کی بجائے "قدوری" کے بعد بالترتیب "ہدایہ اولین، آخرین" اور ہفتم میں "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" داخلِ نصاب کی جائے۔

اصولِ فقہ میں مولانا انظر شاہ نے "تاسیس النظر" کا مشورہ دیا ہے اور اس پر خصوصی توجہ دینے کو کہا ہے۔ مولانا محسن عثمانی نے نورالانوار کی جگہ "المدخل الیٰ علم اصول الفقہ" (از ڈاکٹر معروف دوالیبی) یا "علم اصول الفقہ" (از شیخ عبدالوہاب خلاف) کی رائے دی ہے، مولانا کبیر الدین صاحب نے بھی "علم اصول الفقہ" کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا صدرالحسن ندوی نے بھی بجائے "حسامی" کے اسی کتاب کو ترجیح دی ہے۔ مولانا مسعود عالم قاسمی نے سال ششم میں "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کا مشورہ بھی ہے، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ اصول الشاشی اور حسامی کے علاوہ دو سال میں مکمل "نور الانوار" پڑھادی جائے۔ یا کسی ایک ایسی نسبتاً مختصر کتاب کا انتخاب کیا جائے جس میں قیاس واستحسان کی بحثیں آجائیں، مولانا قاسم صاحب مظفر پوری کے نزدیک بھی عبدالوہاب خلاف کی "علم اصول الفقہ" داخل نصاب کئے جانے کے لائق ہے۔ مولانا نورالعین صاحب رائے ہے کہ "حسامی" سے سنت، اجماع اور قیاس کی بحثیں پڑھائی جائیں، یہی رائے مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی کی بھی ہے، یا "حسامی" کی جگہ "علم اصول الفقہ" رکھ دی جائے۔ مولانا انظر شاہ کی رائے ہے کہ قواعد فقہ میں "الاشباہ والنظائر" بھی داخلِ نصاب ہو۔

## ۴۔ عقائد

مولانا انظر شاہ صاحب کی رائے ہے کہ عقائد میں "شاطبی" داخلِ نصاب کی جائے،

مولانا محسن عثمانی کی رائے ہے کہ عقائد میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ''العقیدۃ الحسنہ'' مناسب ہے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے ''العقیدہ السنیہ'' شرح مولانا اویس صاحب ندوی کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ شرح عقائد میں عذابِ قبر سے اخیر تک کے مباحث زیادہ ضروری ہیں، مولانا نورالعین صاحب کی رائے ہے کہ شرح عقائد کے بجائے ''العقیدۃ السنیہ'' یا عقیدۃ الطحاوی داخلِ نصاب ہو، ورنہ ''شرح عقائد میں''، ''الکلام صفۃ ازلیۃ'' سے اختتام کتاب تک داخلِ نصاب ہو۔ مولانا صدر الحسن ندوی نے ''عقیدۃ الطحاوی'' مع شرح ابو المعز حنفی کا مشورہ دیا ہے، مولانا خورشید انور ندوی کی رائے ہے کہ ''عقید الطحاوی'' (متن) تنہا عقائد کے موضوع میں کافی ہے۔

## ۵۔ نحو و صرف

مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی نے ''معلم الصرف'' تبویب الصرف ''تعلیمات صرف'' اور ''معلم النحو'' کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ صرف میں ''پنج گنج'' اور ''کتاب الصرف'' یا اس طرح کی کوئی اور کتاب داخلِ درس ہو، ''تسہیل الصرف'' میں بہت طول ہے۔ اس لئے اسے نہ رکھا جائے، نحو میں بھی ''مفتاح النحو'' کی جگہ کسی اور کتاب کا انتخاب ہو، مولانا نورالعین صاحب کی رائے ہے کہ ''شرح مایۃ عامل'' کی تدریسی نوعیت میں تبدیلی کی جائے۔ نیز نحو میں پنجم عربی میں ''شرح شذور الذہب'' داخلِ نصاب کی جائے۔ مولانا زبیر احمد صاحب نے اصولی رائے دی ہے کہ ابتدائی صرف و نحو کی ایسی کتابیں ہوں، جن میں قواعد کے اجراء اور مشرق و تمرین کا حصہ غالب ہو، مولانا محسن عثمانی نے ''تمرین النحو'' اور ''تمرین الصرف'' اور ''کتاب النحو'' و ''کتاب الصرف'' میں سے کسی ایک کا مشورہ دیا ہے اور ''ہدایۃ النحو'' کی جگہ ''درس اللغۃ العربیہ'' (شیخ مصطفیٰ غلاییني'' کی رائے دی ہے۔ مولانا خورشید انور ندوی نے ''ہدایۃ النحو'' کے بعد ''شرح شذور الذہب'' کو نحو کی آخری کتاب کی حیثیت سے پڑھانے کا مشورہ دیا ہے، مفتی امان اللہ صاحب نے تسہیل الصرف (سوم) کی جگہ ''علم الصیغہ'' کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے۔

## ۶۔ ادب عربی

مولانا محسن عثمانی کی رائے ہے کہ منہاج العربیہ کی جگہ ''القراءۃ الواضحہ'' دوم عربی میں

"قصص النبیین" اول و دوم، سوم عربی میں "القراۃ الراشدہ" اول کے ساتھ قصص النبیین سوم چہارم عربی میں "القراۃ الراشدہ" دوم کے ساتھ "قصص النبیین" کا آخری حصہ خاتم النبیین داخلِ نصاب ہو۔ مولانا شمس الحق صاحب نے لکھا ہے کہ "مقاماتِ حریری" غرائب کا مجموعہ ہے، اس کی جگہ "اخوان الصفا" یا "مستطرف" یا "منثورات" (از رابع ندوی) داخلِ درس کی جائے۔ مولانا صدر الحسن ندوی کے نزدیک بھی "مقامات" کی تدریس چنداں مفید نہیں۔ نظم میں آپ نے "متنبی" اور "حماسہ" کا مشورہ دیا ہے، تاریخ ادب کی کسی مختصر کتاب اور ششم و ہفتم کی جماعتوں میں انشاء کے لئے مستقل گھنٹوں کی رائے دی ہے۔ ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری نے ادب عربی میں بعض کتابیں عرب مصنفین کی داخل کرنے کی رائے دی ہے۔ البتہ اس کی تعیین نہیں کی ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے "مقامات" کے بجائے "حماسہ" کا مشورہ دیا ہے مولانا قاسم مظفر پوری نے "دیوان متنبی" پر "حماسہ" کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ کم از کم پانچ سو اشعار حماسہ، مراثی اور ادب کے پڑھائے جائیں، مولانا کبیر الدین صاحب نے بھی "حماسہ" سے اشعار کے انتخاب کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا نور العین صاحب نے "متنبی" کو داخلِ نصاب کئے جانے کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا انظر شاہ نے "متنبی" اور "حماسہ" دونوں کے منتخب حصے داخلِ نصاب کرنے کو کہا ہے۔

## ۷۔ بلاغت

مولانا کبیر الدین صاحب اور مولانا محسن عثمانی اور مولانا صدر الحسن صاحب ندوی اور مفتی امان اللہ صاحب نے "البلاغۃ الواضحہ" کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے بھی "مختصر المعانی" کی جگہ "تذکرۃ البلاغۃ" یا "دروس البلاغۃ" کی رائے دی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مختصر المعانی سے پہلے "دروس البلاغۃ" کی رائے دی ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ "تلخیص المفتاح" اور "البلاغۃ الواضحہ" داخلِ نصاب ہو۔ مولانا قاسم مظفر پوری نے "البلاغۃ الواضحہ" پر تلخیص المفتاح کو ترجیح دی ہے۔ مولانا نور العین صاحب کا مشورہ مختصر المعانی کی جگہ "البلاغۃ الواضحہ" کا ہے۔ مولانا برکت اللہ صاحب کا خیال ہے کہ پنجم عربی میں "البلاغۃ الواضحہ" اور ششم عربی میں "مختصر المعانی" رکھی جائے۔

## ۸۔ منطق و فلسفہ

مولانا شمس الحق صاحب نے لکھا ہے کہ "مرقات" پڑھانے کے بعد "قطبی" کے "معرف" اور "قیاس" کی بحث کیوں نہ پڑھائی جائے؟ مولانا افضال الحق صاحب کی رائے ہے کہ "تیسر المنطق"، "مرقات" اور "شرح تہذیب" ناکافی ہے۔ "سلم" تک منطق کی تعلیم ہو۔ مولانا برکت اللہ صاحب کی رائے ہے کہ تیسر المنطق سوم عربی رکھی جائے تو مرقات کے سمجھنے میں سہولت ہوگی اور "ہدایۃ الحکمۃ" ششم عربی میں مناسب ہے۔ مولانا نور العین صاحب کا خیال ہے کہ "شرح تہذیب" کے بجائے "ہدایۃ الحکمۃ" ہونی چاہیے، مولانا صدر الحسن صاحب کی رائے ہے کہ منطقی اصطلاحات کے لئے صرف "تیسر المنطق" ہی کافی ہے اور اس کو بھی جماعت پنجم میں رکھا جائے۔

## ۹۔ علومِ عصریہ

اکثر حضرات دینی مدارس میں علومِ عصریہ کے داخل کئے جانے کے حق میں ہیں مولانا شمس الحق صاحب نے تاریخ، جغرافیہ اور انگریزی کے داخلِ نصاب کرنے پر زور دیا ہے۔ مولانا انظر شاہ صاحب نے سائنس، مدنیت اور تاریخ میں "تاریخِ اسلام"، "تاریخِ ہند" اور "تاریخ عالم" کو بھی اہمیت دینے کی رائے دی ہے۔ مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی نے خاص طور پر اکبر شاہ نجیب آبادی کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ مولانا سعود عالم قاسمی نے فلسفہ جدیدہ پر کسی مناسب کتاب کے اضافہ کی رائے دی ہے۔ سال پنجم میں موصوف کی رائے ہے کہ پولیٹیکل سائنس پر کوئی تعارفی کتاب رکھی جائے، نیز سالِ چہارم میں سیرت کی کتاب اور سالِ سوم میں تاریخِ اسلام کی کوئی کتاب داخلِ نصاب ہو، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ سائنس اور جغرافیہ کی تعلیم اس حد تک ضرور دی جائے کہ جس سے مبادیات اور اصطلاحات سے واقفیت ہو جائے۔ مولانا قاسم صاحب مظفرپوری کی رائے میں معاشیات، تمدن اور طبیعات کو مستقل طور پر داخل نصاب نہ کیا جائے، بلکہ اس کے ضروری عنوانات پر محاضرات ہوں، اور اس کا باضابطہ امتحان ہو، البتہ انگریزی کی ابتدائی ایک دو کتابیں پڑھادی جائیں، مولانا صدر الحسن ندوی نے بھی انگریزی کے علاوہ دوسری عصری فنون میں صرف محاضرات ہی کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی اور مفتی محمد یحیٰ صاحب علومِ

عصریہ کے داخل کیے جانے کے حق میں نہیں ہیں، جب کہ مولانا عباس صاحب قاسمی کی رائے ہے کہ انگریزی کو ابتدائی درجات تک محدود نہ رکھا جائے، مفتی امان اللہ صاحب قاسمی کا خیال ہے کہ آندھرا پردیش میں تلگو زبان بھی ضرور داخلِ نصاب کی جائے۔

## ۱۰۔ خارجی مطالعہ

خارجی مطالعہ کے مجوزہ نصاب کی عام طور پر تحسین کی گئی ہے۔ مولانا محسن عثمانی ندوی نے جماعت چہارم میں "تاریخ اسلام" (شاہ معین الدین ندوی) تاریخ دعوت و عزیمت دوم اور سوم، ششم عربی میں تاریخ دعوت و عزیمت، چہارم و پنجم، ہفتم عربی میں سیرت سید احمد شہید اول، دوم اور استاد محمود شاکری کی "حاضر العالم الاسلامی"، دورۂ حدیث میں نبی رحمت کے بجائے اصل کتاب "السیرۃ النبویہ" اور "اسلام اور جدید شبہات" کی جگہ "شبہات ماحول الاسلام" رکھنے کی رائے دی ہے۔ جدید علم کلام پر موصوف نے "مذہب اور سائنس"، "اسلام و جدید معاشی نظام"، "سود"، "پردہ" اور "تنقیحات" کو شامل کرنے کی رائے دی ہے۔ مولانا مسعود عالم قاسمی کی رائے ہے کہ دورۂ حدیث میں السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی "تدوینِ حدیث"، "سنت کی آئینی حیثیت"، "الحدیث والمحدثون" سال ہفتم میں "ارض القرآن"، "امثال القرآن"، "اعجاز القرآن"، "التفسیر و المفسرون" سالِ ششم میں "مصادر التشریع الاسلامی فیمالانص فیہ"، "فقہ الزکوۃ"، "جدید فقہی مسائل" سالِ پنجم میں "السیرۃ النبویہ"، "الدعوۃ النبویہ"، "غزوۃ النبی" سال چہارم میں "تاریخ الخلفاء"، "تاریخ تمدنِ اسلامی"، "تاریخ اسلامی ہند"، "تاریخ اندلس" اور سالِ سوم میں "عبرات والنظرات" کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے لکھا ہے کہ خارجی مطالعہ میں اردو نظم و نثر ہونی چاہیے، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ البتہ مطالعہ کو آزاد نہ رکھا جائے، بلکہ ہر جماعت کو کسی استاذ سے مربوط کیا جائے اور امتحانِ سالانہ میں اس کا مستقل پرچہ ہو، مولانا قاسم صاحب نے سال چہارم میں "آئینہ تاریخ ہند" (جناب افضل حسین صاحب) کی رہنمائی کی ہے۔ چہارم عربی میں مولانا نور العین صاحب نے "مختصر تاریخ ہند" (مولانا ابو ظفر ندوی) کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ سوم عربی میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" معیار اور علمی سطح سے اونچی کتاب ہے۔

## فارسی

مولانا برکت اللہ صاحب نے اول عربی میں "آمد نامہ" اور "کریما" اور بغرض سہولت "فارسی اول" دوم عربی میں "فارسی کا حصہ دوم" اور "گلزار دبستاں" کا نصف حصہ اور سوم عربی میں "گلستاں" رکھنے کی رائے دی ہے۔

## تخصص فی الفقہ

تخصص فی الفقہ کے نصاب کی عام طور پر تحسین کی گئی ہے، اس نصاب کے بارے میں مولانا سلمان صاحب ندوی نے لکھا کہ سوائے تحسین کے اور کچھ نہیں کہتا۔ مولانا صدر الحسن ندوی کی رائے ہے کہ "نصاب اچھا اور معیاری ہے۔" البتہ آپ کا مشورہ ہے کہ دو سال کی مدت میں صرف ایک ہی تحقیقی مقالہ طلبہ سے لکھوایا جائے۔ مولانا افضال الحق صاحب کی رائے ہے کہ مولانا عبدالحئی، مولانا گنگوہیؒ اور مفتی کفایت اللہؒ کے فتاویٰ کا مطالعہ کرایا جائے اور تدوینِ فقہ کی اب تک کی تاریخ، تدریج اور ترتیب پر تحقیقات کرائی جائیں۔ مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی نے "اسلامی قانون" (اردو) کو داخلِ نصاب کرنے کی رائے دی۔ مولانا قاسم صاحب کی رائے ہے کہ سورۂ بقرہ، نساء، نور، احزاب، طلاق، مجادلہ، وغیرہ سورتیں جن میں آیات احکام زیادہ ہیں کا "احکام القرآن للجصاص" کے ساتھ مطالعہ کرایا جائے، نیز فقہ کی کسی کتاب کا از ابتداء تا انتہا مطالعہ کرایا جائے تاکہ جملہ ابواب کا مسلسل مطالعہ ہو جائے۔ مولانا نور العین صاحب کی رائے ہے کہ "شرح رسم المفتی" کے ساتھ "شرح مہذب للنووی" کے مقدمہ اور آداب المفتی کا حصہ پڑھایا جائے۔ مولانا مفتی یحییٰ صاحب کی رائے ہے کہ تخصص کے طلبہ میں ایسی استعداد پیدا کی جائے کہ متقدمین اور متاخرین کی کتابوں سے مسائل کا استخراج کر سکیں۔

## مختصر مدتی عالم کورس

اس کورس میں مولانا محسن عثمانی نے "معلم الانشاء" حصہ اول ودوم اور "منہاج العربیہ" کی جگہ "القراءۃ الواضحہ" نیز "قصص النبیین" اول تا پنجم داخل کرنے کی رائے دی ہے۔ مولانا سلمان صاحب کی رائے ہے کہ اس کورس میں "ہدایہ" و "بخاری" نہ رکھی جائے۔ بلکہ قرآن

پاک، ترجمہ، مختصر تفسیر، مشکوٰۃ شریف اور "قدوری" پڑھائی جائے۔ نصاب تین سالہ ہو اور اس کورس کے لئے "عالم" کی اصطلاح استعمال نہ کی جائے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے بھی اس کورس میں قرآن شریف کے مکمل ترجمہ اور کورس کو مختصر و آسان کرنے کی رائے دی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاب نے مشورہ دیا ہے کہ موجودہ زمانہ کے طلبہ کی ذہنی سطح و صلاحیت کو سامنے رکھ کر نصاب کا تعین کیا جائے اور مولانا قاسم صاحب نے بھی لکھا ہے کہ "جلالین" کے بجائے "ترجمہ قرآن" پر اکتفا کیا جائے۔ مولانا عبدالستار قاسمی گنٹور نے مختصر مدتی عالم کورس کے نصاب کو کافی قرار دیا ہے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے عالم کورس کالنصاب مرتب کیا ہے۔ اس کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے "اللغۃ العربیہ لغیر الناطقین بہا" (ڈاکٹر عبدالرحیم مدیر شعبہ لغت عربیہ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) کے تین حصوں کو دو سال میں پڑھانے کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا صدر الحسن ندوی نے چار سالہ نصاب تجویز کیا ہے، اور آپ کی رائے ہے کہ اصولِ فقہ کی کسی کتاب کی اس شعبہ میں ضرورت نہیں۔

## متفرق لیکن اہم رائیں :

نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کی عمدگی کے سلسلہ میں مختلف اہلِ علم کی تحریروں میں بعض مفید آراء آگئی ہیں، ان کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ مولانا انظر شاہ کشمیری کی رائے ہے کہ تمرین وریاضت، اردو عربی تقریر اور عربی زبان میں باہمی گفتگو پر زور دیا جائے۔

☆ مولانا محسن عثمانی کی رائے ہے کہ مطلوبہ کتب دستیاب نہ ہوں تو فوٹو اسٹیٹ سے فائدہ اٹھایا جائے۔

☆ مولانا سلمان ندوی کی رائے ہے کہ جماعت حفظ ہی سے ہلکی پھلکی عربی زبان پڑھائی جائے۔ تجوید، تلفظ اور عربی لہجہ پر زور دیا جائے اور ابتدائی دو تین سال میں قواعد کا بوجھ کم ہی رکھا جائے.......... نیز یہ کہ نصاب کے دو درجات کئے جائیں، نصابِ ضروری اور نصابِ فضل۔ نصابِ ضروری پنجم عربی پر مکمل ہو اور نصابِ فضل دورۂ حدیث پر مکمل ہو۔

☆ مولانا سعود عالم صاحب قاسمی نے سالانہ "تدریب المعلمین" ہفتہ منعقد کرنے کی رائے دی ہے۔ جس میں دینی و عصری مدارس کے ماہرین شریک ہوں اور تعلیم کے نظام، طریقہ و

نفسیات وغیرہ پر مذاکرہ وتبادلہ خیال کریں۔

☆ ہندوبیرون ہند کے کسی ممتاز عالم ودانش دریاماہرین کا توسیعی خطبہ ہو اور اونچے درجات کے طلبہ کے گروپ بنادیئے جائیں۔ ایک گروپ مواد اور حوالے کا تجزیہ کرے، دوسرا اسلوب اور طرزبیان کا اور تیسرا تقریر میں پیش کئے گئے نکات کا۔ پھر یہ اپنا حاصلِ تجزیہ کسی ذمہ دار استاذ کے سامنے پیش کرے۔

☆ مولانا افضال الحق صاحب نے بھی اہلِ فن کو بلانے اور ان کے خطبات کے اہتمام پر زور دیا ہے۔

☆ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ ابتدائی چند سالوں میں اردو املا نویسی اور انشاء پردازی کے گھنٹے بھی ہوں ......... مولانا نور العین صاحب نے بھی اسی نوع کا مشورہ دیا ہے.........اور مولانا عباس صاحب نے بھی۔

☆ مولانا برکت اللہ صاحب نے تجوید بہ روایت حفص کو ضروری قرار دینے کا مشورہ دیا ہے اور مولانا عباس صاحب نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے۔

☆ نصابِ تعلیم کے رہنما خطوط کی نشان دہی کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد یحیٰی صاحب نے لکھا ہے کہ علومِ آلیہ کی کتابیں کم رکھی جائیں، علومِ عالیہ میں جو ابواب مشترک ہوں وہ کم از کم دو کتابوں میں درایۃً ہوں اور بقیہ میں روایۃً۔

☆ مولانا زبیر احمد صاحب نے بحیثیت مجموعی ایسی کتابوں کے انتخاب کا مشورہ دیا ہے جن کا طرزبیان سہل، اسلوب شگفتہ اور فن پر زیادہ حاوی ہو۔

☆ مولانا موصوف اور مولانا قاسم صاحب مظفر پوری نے فنون کی کثرت، مضامین کے تنوع اور زبان کے بوجھ کو کم سے کم رکھنے کی تلقین کی ہے۔

☆ مولانا افضال الحق صاحب نے "تخصص فی القرآن" اور مولانا برکت اللہ صاحب نے انگریزی اور عربی زبان میں تخصص کی رائے دی ہے۔

☆ مولانا صبغت اللہ صاحب بختاری نے اکابر سے ربط اور تصوف کے علمی و عملی پہلوؤں پر توجہ دینے کو کہا ہے۔

اہلِ علم کی جو رائیں موصول ہوئی ہیں، ان کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ غور وفکر میں سہولت ہو، بنیادی طور پر ہمیں ان امور پر بھی غور کرنا ہوگا کہ مدتِ تعلیم کیا

ہو؟ تعلیم بہر حال دورۂ حدیث ہی پر منتہی ہو، یا کم صلاحیت اور کم وقت طلبہ کے لئے درمیان میں بھی عالم یا مولوی کا کوئی درجہ رکھا جاسکتا ہے؟ علومِ عصریہ کو کس حد تک داخلِ نصاب کیا جائے، کہ علومِ مقصودہ کی تعلیم پر اثر نہ پڑے، خارجی مطالعہ کو جو کتابیں ہیں ان کا مناسب انتخاب ہو اور اس کو مفید بنانے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ واضح ہو کہ خارجی مطالعہ کا موجودہ نصاب دارالعلوم سبیل السلام کے زیر اہتمام تعلیمی موضوعات پر منعقدہ ایک مذاکرہ کے موقع پر طے پایا تھا جس کے لئے ایک مستقل کمیٹی مقرر ہوئی تھی اور مولانا سید اکبر الدین قاسمی، نائب ناظم مجلس علمیہ اس کے کنوینر تھے۔ اس مذاکرہ میں ریاست آندھرا پردیش کے تقریباً تمام دینی مدارس کے نمائندے شریک تھے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ طلبہ کی نحو وصرف کس طرح بہتر ہو؟ اور عربی زبان وادب کا ذوق ان میں کس طور پیدا کیا جائے؟ نحو وصرف کی ابتدائی کتاب کون سی پڑھائی جائے۔ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ کیا کوئی ایسا موضوع ہے جس پر نصابی نقطۂ نظر سے مستقل تحریر مرتب کرنے کی ضرورت ہے؟ اور مدرسہ کے مختلف اساتذہ کو اس کا کام سونپا جائے، جس کو وہ تجربہ کار اساتذہ کے مشورہ سے انجام دیں اور بیاض ہی کی صورت میں چند سال اس پر تجربہ کیا جائے، دورۂ حدیث کی کتابوں کے سلسلہ میں یہ بات خصوصیت سے لائقِ توجہ ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمام کتابیں یعنی صحاحِ ستہ داخلِ نصاب رکھ کر مختلف کتب میں درایۃً اور روایۃً تدریس کے حصے مقرر کردیئے جائیں، نیز کیا یہ بات مناسب ہوگی کہ مختلف دوسرے اسلامی علوم میں "تخصص" کا نصاب مقرر کردیا جائے، تاکہ جب بھی حالات موزوں ہوں اس نقشہ میں رنگ بھرا جاسکے......... امید ہے کہ ان گوشوں پر آپ حضرات پورے عمق اور وسیع الفکری کے ساتھ غور فرمائیں گے............ نہ ہمارے لئے یہ مناسب ہے کہ ہم اپنے قدیم سرمایہ کو محض اس لئے کم قابلِ اعتنا سمجھیں کہ وہ قدیم ہے اور نہ ہر جدید کو اس لئے رد کردیں کہ اس کا دامن قدامت کے تقدس سے سرفراز نہیں، خواہ وہ کسی قدر بھی مفید اور نافع ہو۔

اخیر میں ہم حضرت ناظم صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس اہم معاملہ کی طرف توجہ فرمائی اور ہمیں غور وفکر کی دعوت دی، اور آپ حضرات کا بھی سپاس گزار ہوں کہ آپ نے موضوع کی اہمیت کا احساس کیا اور اس کے لئے غور وفکر کی زحمت فرمائی.........

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

(خالد سیف اللہ رحمانی۔ ۲۲رجب ۱۴۱۰ھ)

چناں چہ اس رپورٹ کو سامنے رکھتے ہوئے دارالعلوم سبیل السلام کے جاریہ نصاب پر غور کیا گیا اور بعض مفید ترمیم اور اضافے تجویز کیئے گئے۔ اس میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ جہاں مناسب ترمیم اور اضافے کو قبول کیا جائے وہیں ہندوستان کے دینی مدارس کے مروج نصاب و نظام سے ممکن حد تک انحراف سے بچا جائے، جو نصاب مقرر کیا جائے اس میں دینی مدارس کے موجودہ طلبہ کی استعداد اور صلاحیت کی عام سطح کو بھی ملحوظ رکھا جائے، علومِ عصریہ کی اہمیت کا احساس کیا جائے مگر توازن و اعتدال کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور عربی ادب و انشاء کی اسلامی علوم کے لئے جو اہمیت ہے اس کو نظر انداز بھی نہ کیا جائے۔ لیکن ادب کو علومِ شرعیہ پر غالب کرنے کی بے ادبی بھی نہ کی جائے............ طے شدہ ترمیمات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ دورۂ حدیث میں مکمل صحاحِ ستہ، مؤطین اور طحاوی اور شمائل ترمذی کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے، کیوں کہ اخذ حدیث میں "نفس روایت الفاظ" کی بھی اہمیت ہے۔ البتہ طے پایا کہ بخاری اور ترمذی مکمل درایۃً پڑھائی جائے، طحاوی کے لئے پورے سال ایک مستقل گھنٹہ رکھا جائے اور معتدبہ حصہ پڑھایا جائے۔ دوسری کتابوں میں درایۃً اسباق کے لئے مختلف ابواب کی اس طرح تقسیم کردی جائے کہ علاوہ بخاری و ترمذی کے کم از کم ایک جگہ ہر اہم بحث بالتفصیل آجائے، نیز "مشکوٰۃ" سے پہلے اور "ریاض الصالحین" کے بعد آثار السنن تجویز کی جائے۔

۲۔ تفسیر میں بیضاوی کے ساتھ کچھ حصے کشاف کے پڑھائے جائیں اور متن قرآن کے ترجمے سے پہلے مفردات وتراکیب قرآن پر دو سال میں مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی تیسرا القرآن داخلِ نصاب کی جائے، نیز اصولِ تفسیر میں الفوز الکبیر کے ساتھ تلخیص الاتقان بھی پڑھائی جائے۔

۳۔ فقہ میں موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے "قدوری" میں "کتاب البیوع" سے تا ختم پڑھائی جائے تاکہ فقہ کے تمام ابواب ایک نظر میں آجائیں۔

۴۔ ادب میں نثر کی آخری کتاب کی حیثیت سے مختارات اول و دوم اور نظم میں متنبی اور

حماسہ کے پانچ سو اشعار کا انتخاب پڑھایا جائے۔

۵۔ اصول فقہ میں مروجہ کتابوں کو رکھتے ہوئے "علم اصول الفقہ" (عبدالوہاب خلاف) اور "اصول الشاشی" سے پہلے مولانا صدیق صاحب باندوی کا مختصر رسالہ "تسہیل اصولِ فقہ" پڑھائی جائے۔

۶۔ نحو میں ابتدائی جماعت میں قواعد کے اجراء کے لئے "تمرین النحو" بھی شامل کی گئی ہے اس کے علاوہ نحو میر، ہدایۃ النحو، کافیہ اور شرح شذور الذہب پڑھائی جائے۔

۷۔ صرف میں قدیم نصاب کے مطابق "میزان الصرف"، "پنج گنج" اور "علم الصیغہ" ہی کی تدریس کو زیادہ مناسب تصور کیا گیا۔

۸۔ بلاغت میں مختصر المعانی کی جگہ "البلاغۃ الواضحہ" اور اس سے پہلے "تلخیص المفتاح" داخلِ نصاب کی گئی۔

۹۔ منطق میں تیسیر المنطق، مرقات اور شرح تہذیب اور فلسفہ میں صرف ہدایۃ الحکمہ رکھا جانا طے پایا ہے۔

۱۰۔ عقائد میں بجائے شرح عقائد کے شرح فقہ اکبر کا انتخاب کیا گیا۔

۱۱۔ علوم عصریہ میں پانچویں جماعت تک انگریزی کے گھنٹے رکھے جانے کے علاوہ جغرافیہ، تاریخِ ہند، تاریخِ اسلام اور حساب کی بھی ایک ایک کتاب مختلف جماعتوں میں داخلِ نصاب کی گئی، اور طے پایا کہ سماجی علم، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ کی اصطلاحات و مبادیات پر محاضرات رکھے جائیں۔

۱۲۔ تجوید و قرأت کو بھی موجودہ نصاب میں اہمیت دی گئی ہے۔

۱۳۔ اردو زبان میں عبور و مہارت کی غرض سے فارسی زبان کو بھی خصوصی اہمیت دیتے ہوئے اعدادیہ کی جماعت میں فارسی ہی غالب رکھی گئی ہے۔

۱۴۔ متوسط جماعتوں میں انشاء اور تمرین عربی کے لئے مستقل گھنٹہ رکھا گیا ہے اور اس پر خاص زور دیا گیا ہے۔

۱۵۔ اساتذہ کے زیر نگرانی خارجی مطالعہ کے لئے پنجم عربی میں "ارض القرآن" (علامہ سید سلیمان ندویؒ) اور "علوم القرآن" (مولانا محمد تقی عثمانی) اور ششم عربی میں "جواہر الفقہ" اور "جدید فقہی مسائل" ہفتم عربی میں "تدوین حدیث" (مولانا گیلانیؒ) اور مقدمہ "ترجمان

السنۃ "اور دورۂ حدیث میں "علم جدید کا چیلنج" (مولانا وحید الدین خان) اور "شبہات حول الاسلام" (سید قطبؒ) رکھی گئی جس کا باضابطہ امتحان ہوا کرے گا۔

۱۶۔ پنجم، ششم، ہفتم کی جماعتوں کی سند کے لئے قرآن پاک کی منتخب سورتوں اور احادیث کے حفظ کا ایک نصاب مرتب کیا گیا ہے جن کی تکمیل ضروری ہے۔

۱۷۔ اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ کوئی طالب علم ششم عربی کی کتابوں کے ساتھ "البلاغۃ الواضحہ "اور "متنبّی وحماسہ" کے بجائے ترمذی اول دوم کے اسباق میں شرکت کرے تو اسے عالمیت کی سند دی جائے گی اور دورۂ حدیث کی تکمیل پر فضیلت کی سند دی جائے گی۔

۱۸۔ مختصر مدتی عالم کورس کا نصاب پانچ سالہ بر قرار رکھا گیا اور اس کو کافی سہل کر دیا گیا ہے۔ اب فقہ کی آخری کتاب قدوری ہو گی، متن قرآن کا ترجمہ پڑھا دیا جائے گا۔ صرف "ریاض الصالحین "حدیث میں پڑھائی جائے گی اور اس کی تکمیل کرنے والوں کو "عالمیت" کے بجائے "عالم دینیات "کی سند دی جائے گی۔

دار العلوم کا مکمل نصاب زیرِ طبع ہے جو حضرات چاہیں طلب کر سکتے ہیں۔ خدا کرے یہ تبدیلیاں اور اضافے مفید ثابت ہوں۔

# دَورِ مغلیہ کا نصابِ تعلیم

پروفیسر محمد شفیع مرزا
(ادارۂ تعلیم و تحقیق، لاہور)

ہندوستان کے مسلم مدارس میں اسلامی نظامِ تعلیم رائج تھا۔ جس کی وجہ سے نصابی کتب بھی ایسی تجویز کی جاتی تھیں جن میں اسلامی نظام کی واضح جھلک نظر آتی تھی۔ اس قسم کی مطالعاتی کتب میں مدتوں کے بعد معمولی تبدیلی آتی تھی۔ اس کا احساس ذیل میں دی گئی مختلف نصابی کتب سے ہوتا ہے جنہیں مختلف مضامین کے لئے شامل کیا گیا تھا۔ یہ کتب کم و بیش ساتویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک برصغیر کے مسلم مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ مغلیہ دور میں اس نصاب میں ردوبدل کیا گیا۔

(۱) صرف : ارشاد الصرف
(۲) نحو : مصباح، لب للباب، کافیہ
(۳) اصول فقہ : منار، اس کی شرح جامی
(۴) فقہ : کنزالدقائق، شرح وقایہ، ہدایہ
(۵) تفسیر : مدارک، بیضاوی، کشاف (مختلف مقامات)
(۶) حدیث : مشارق الانوار، مصابیح السنۃ (متن مشکوٰۃ)
(۷) کلام : شرح، صحائف
(۸) منطق : شرح شمسیہ یعنی قطبی
(۹) تصوف : عوارف المعارف، فصوص الحکم
(۱۰) عربی ادب : مقاماتِ حریری، ۴۰ مقامات

مغلوں کے عہدِ حکومت میں بر صغیر کی سرکاری اور مراسلتی زبان فارسی تھی۔ لہذا مسلم مدارس میں تعلیم کی ابتداء بھی فارسی زبان ہی کی تعلیم سے کی جاتی تھی تاکہ مسلمان طلبہ، فارغ التحصیل ہونے کے بعد حکومت کے مختلف عہدوں پر خوش اسلوبی کے ساتھ خدمت انجام دے سکیں۔ اس عہد میں عربی گویا اعلیٰ تعلیم کی حیثیت رکھتی تھی۔ جب کہ ابتدائی تعلیم یا اسکول کی زبان فارسی تھی۔ اس دور میں فارسی زبان کا نصابِ تعلیم حسبِ ذیل تھا :

## نصاب نثر

نسخہ تعلیمیہ، تعلیم عزیزی، دستور البیان، انشائے مادھورام، انشائے فائق، انشائے خلیفہ، رقعات عالم گیری، گلستان، ابوالفضل، بہار دانش، انوارِ سہیلی، سہ نثر ظہوری، وقائع نعمت علی خان۔

## نصابِ نظم و شعر

کریما، مامقیان، خالق باری، یوسف زلیخا، تحفۃ الاحرار، نزہتہ الابرار از ملا جامی، سکندر نامہ، مخزن اسرار ہفت پیکر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں از مولانا جامی، قران السعدین، مطلع الانوار، اعجاز خسروی از امیر خسرو دہلوی، دیوان شمس تبریز، دیوان ظہیر فاریابی، بوستان، دیوان سعدی، دیوان حافظ، قصائد عرفی، قصائد انوری، قصائد خاقانی، عقائد عفی، دیوان فیضی، قصائد بدر چاچ، دیوان صائب۔

## نصاب افسانہ و حکایات

نسخہ طوطی نامہ نخشی، انوار سہیلی تصنیف مولانا حسینی واعظ کاشفی، عیار دانش از شیخ ابوالفضل، بہار دانش از شیخ عنایت اللہ۔

## نصاب تاریخ

شاہنامہ فردوسی، ظفر نامہ از شرف الدین علی ترمذی، مسمن فتوحات تیموری، اکبر نامہ مشتمل بر احوال اکبر بادشاہ، اقبالی نامہ جہانگیری، تاریخ فیروز شاہی، رزم نامہ ترجمہ مہا بھارت۔

## نصاب تزکیہ نفس و فنِ اخلاق

اخلاق ناصری، اخلاق جلالی، مکاتبات سید شاہ شرف الدین یحییٰ منیری، ہشتہ الارواح، مثنوی مولوی معنوی، حدیقہ حکیم سنائی۔

## نصاب انشاء

بدائع الانشاء مشہور بہ انشائے یوسفی، رقومات ملا جامی و ملا منیر، مکتوبات ابوالفضل، گلدستہ شیخ عنایت اللہ منشی شاہ جہاں، بہار سخن از شیخ محمد صالح، رقعات عالم گیری، مکتوبات ملا منیر، منشأت شید او ملا ظفرا، کارنامہ لعل چند، کتاب لیلاوتی مترجمہ شیخ فیضی۔

اکبری عہد میں لوازمہ نصاب زبان دانی کے بعد حساب، جیومیٹری، اخلاقیات، زراعت، فلکیات، علم قیافہ، معاشیات، شہریت، منطق اور طب پر مشتمل تھا۔ یہ نصاب ہر طالب علم کے لئے ضروری تھا۔ علوم علیہ دو اقسام میں منقسم تھے۔ اول علوم الہیہ و ریاضی (بشمول فلکیات، طبیعیات، موسیقی) دوم علوم طبعیہ، تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

اس زمانے میں مدرسوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، ان کا ذکر ابوالفضل اور ان کے معاصرین کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ان میں مطول، ہدایہ، منار، بزدوی، حاشیہ مطالع، جامی، شاطبی، مختصر (اس کا پورا نام مختصر المطول علی تلخیص المفتاح ہے) وقایہ، شرح شمسیہ شامل تھیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب "اخبار الاخیار" مولفہ ۹۹۹ھ میں میزان الصرف، مصباح، کافیہ، مختصر النحو، لب، ارشاد، مختصر، شرح شمسیہ، شرح عقائد نسفی، مطول، گلستان و بوستان سعدی اور دیوانِ حافظ کا ذکر کیا ہے جب کہ عبدالقادر بدایونی فقہ میں شرح وقایہ، علم کلام میں شرح صحائف، منطق میں شرح شمسیہ، کافیہ لب الالباب، ارشاد (صرف و نحو)، ہدایہ (فقہ)، منار، اصول بزدوی (اصول فقہ)، مدارک، بیضاوی، کشاف (تفسیر) مشارق الانوار، مصابیح السنہ (حدیث)، عوارف المعارف، فصوص الحکم، لمعات، نقد النصوص (تصوف)، مقامات حریری (ادب عربی)، شرح شمسیہ (منطق) اور شرح صحائف (علم الکلام)، آٹھویں صدی ہجری کے نصاب کا حصہ تھیں۔

اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں ایک فرمان جاری کیا تھا کہ ہر لڑکے کو اخلاقیات پر کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ اس کے علاوہ حساب اور اس کی مخصوص علامات، زراعت، مساحت،

فلکیات، علم قیافہ، امور خانہ داری، قواعد حکومت، طب، منطق، طبیعیات، ریاضی، الٰہیات، سائنس اور تاریخ سب علوم بتدریج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ نصاب کی اس وسعت کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نصاب اس وقت کے تقاضوں کے مطابق تھا اور سول سروس کی جملہ ضروریات کی کفالت کرتا تھا۔

دورِ اکبری میں میر فتح اللہ شیرازی نے روایتی تعلیم کے علاوہ سائنسی تعلیم کو بھی نصاب میں شامل کیا۔ اس نے نصابِ تعلیم میں جو تبدیلیاں کی تھیں اور ماہرینِ تعلیم نے ان کو قبول کر لیا۔ شاہ ولی اللہ کی روایت کے مطابق تبدیل شدہ نصاب درج ذیل تھا:

| | | |
|---|---|---|
| نحو | : | کافیہ، شرح جامی |
| فقہ | : | شرح وقایہ (مکمل) |
| تفسیر | : | مدارک مصاحب |
| تصوف و سلوک | : | عوارف، رسائل نقش بندیہ، شرح و رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد الفصوص |
| فلسفہ | : | شرح ہدایت الحکمہ |
| خطابت | : | مکسر، مطول |
| فلکیات و ریاضی | : | متعدد رسالے |
| منطق | : | شرح شمسیہ، شرح متعلی |
| اصولِ فقہ | : | حسامی اور توضیح و تلویح کے منتخب حصے |
| حدیث | : | شمائل ترمذی اور صحیح بخاری کا ایک حصہ |
| کلام | : | شرح عقائد نسفی مع حواشی و تبصرہ خیالی، شرح موقف |
| طب | : | موجز القانون (ابن سینا کی قانون کا ملخص) |

غرض نصابِ تعلیم میں مضامین کا تنوع تھا۔ دورِ حاضر کے تخصص کے برخلاف ہر مفید علم و فن سے روشناس کرانا مقصدِ نصاب تھا۔ گو دینیات اور مابعد الطبیعیات پر زور دیا جاتا تھا۔ تاہم تاریخ، ریاضی، انشاء نگاری اور خطاطی بھی پسندیدہ مضامین کی حیثیت رکھتے تھے۔ فارسی درباری زبان تھی۔ لہٰذا اس کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ فن قانون، دینیات، اخلاقیات، فلسفے اور عمرانیات کو صوفیا اور مقدس لوگوں میں پسندیدہ مضامین کی حیثیت حاصل

تھی۔

برنیئر نے اپنے سفر نامے میں اورنگ زیب سے اس کے کسی سابق استاد ملا صالح کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس ملاقات کی موقع پر اورنگ زیب نے اپنے استاد سے شکایت کی کہ اس نے اسے صحیح تعلیم نہیں دی۔ برنیئر کوئی معتبر مؤرخ تو نہیں بہر حال اس کی روایت میں اورنگ زیب کے تعلیمی تصورات کی جو واضح جھلک نظر آتی ہے اس سے درج ذیل لوازمہ نصاب کی نشاندہی ہوتی ہے :

(۱) دنیا کی اقوام کی خصوصیات، ان کے وسائل، قوت، طرزِ جنگ، رسوم، مذہب، طرزِ حکومت اور مفادات۔

(۲) سلطنتوں کا آغاز، عروج و زوال اور وہ واقعات و حادثات اور غلطیاں جو اتنے بڑے انقلابات کا باعث ہیں۔

(۳) گردونواح کی اقوام کی زبانیں۔

(۴) فلسفہ

فلسفے کی نصاب میں اہمیت بیان کرتے ہوئے اورنگ زیب اپنے استاد سے کہتا ہے کہ اگر آپ نے غور و فکر کی تربیت کرنے والے فلسفے کی تعلیم مجھے دی ہوتی تو میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر آپ کا ممنون ہوتا جتنا کہ سکندر، ارسطو کا تھا۔

ایک بادشاہ کے منصب کے حوالے سے اورنگ زیب کے نزدیک نصاب میں بادشاہ اور رعایا کے باہمی حقوق و فرائض کا علم بھی ہونا چاہیئے۔ جنگ کے طریقے (مثلاً محاصرہ کیسے کرنا ہے اور فوجوں کی صف بندی کیسے کی جائے) ایک شہزادے کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیئے۔ اس دور میں جب حکومت و سیاست پر کسی خاندان کی اجارہ داری نہیں رہی تو اورنگ زیب کے مجوزہ علوم و فنون کو عمومی نصاب کا حصہ بنانے پر غور کیا جا سکتا ہے۔

دورِ مغلیہ کے نصاب کے علمی پہلو کے ساتھ ساتھ اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ اس دور کی تعلیم میں تن سازی اور جسمانی ریاضت کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی۔

مغلیہ دورِ زوال میں تعلیمی سرگرمی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اس دور میں تعلیمی میدان میں بہتر ترقیات کی شہادت ملتی ہے۔ مثال کے طور سے درسِ نظامی کو مغلیہ دور زوال کے سب سے نمایاں نصابی تجربے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نصاب ملا نظام الدین کا تشکیل

کردہ تھا لیکن جلد ہی پورے بر صغیر میں مقبول ہو گیا۔ درسِ نظامی کے لوازمے کی تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) صرف : میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ۔
(۲) نحو : نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی
(۳) منطق : صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم۔
(۴) حکمت : میبذی، صدرا، شمس بازغہ
(۵) ریاضی : خلاصہ الحساب، تحریر اقلیدس (مقالہ اولیٰ)، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی (باب اول)۔
(۶) بلاغت : مختصر المعانی، مطول (ماانا قلت تک)
(۷) فقہ : شرح وقایہ (اولین)، ہدایہ (اخیرین)
(۸) اصولِ فقہ : نور الانوار، توضیح التلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)
(۹) کلام : شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔
(۱۰) تفسیر : جلالین، بیضاوی
(۱۱) حدیث : مشکوٰۃ المصابیح۔

درس نظامی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں استاد کی قدر کتابوں سے زیادہ تھی۔ اس نصاب کی سب سے اہم صفت اس کی جامعیت تھی۔ چناں چہ اس میں دینی اور دنیوی علوم کو یک جا کر دیا گیا تھا۔ ہر فن کی مشکل ترین کتابیں منتخب کی گئی تھیں تاکہ طلبہ کو سمجھنے کے لئے زیادہ محنت کرنی پڑے اور طلبہ کی فکر کی پرواز بلند ہو، نظر گہری اور قوتِ فہم بڑھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نصاب کا فارغ التحصیل علمی مشکلات کے حل کے لئے خود اعتقادی کے جوہر سے مزین ہو جاتا تھا۔ چناں چہ اس نصاب سے متوازن اور جامع شخصیت کے لوگ پیدا ہوتے تھے جنہوں نے علم کے میدان میں اپنا لوہا منوایا۔

علامہ شبلی نے درسِ نظامی کی درج ذیل خصوصیات بیان کی ہیں :

(۱) نصاب میں ہندوستان کے علماء کی تصانیف کو شامل کیا گیا۔
(۲) ہر فن کی وہ کتابیں لی گئیں جن سے زیادہ مشکل کتاب اس فن میں موجود نہ ہو۔

(۳) منطق و فلسفہ کی کتابوں کو دوسرے تمام علوم کی نسبت زیادہ مقدار میں رکھا گیا۔
(۴) حدیث کی کتاب مشکوٰۃ شریف کو شامل نصاب کیا گیا۔
(۵) ادب کی بہت کم کتب کو شامل نصاب کیا گیا۔

پروفیسر سید محمد سلیم درس نظامیہ کی جامعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں دینی اور دنیوی علوم کو اس طرح یک جا کر دیا گیا ہے کہ اس میں منقولات اور معقولات دونوں شامل تھے۔ اس نصاب کی جامعیت کی وجہ سے متوازن اور جامع شخصیت کے لوگ پیدا ہوتے تھے، جو عمل کے ہر میدان میں اپنا لوہا منواتے تھے۔ اس نظامِ تعلیم کی وجہ سے ایسی شخصیات میدان عمل میں آئیں جن کی شخصیت اور علمیت کے حوالے سے ہنری ہیر نگٹن ٹامس اور ولیم ہنٹر جیسے برطانوی مصنفین نے بھی دورِ مغلیہ کے نظامِ تعلیم کی برتری کا اعتراف کیا ہے۔

درس نظامیہ کی خوبیوں کے ساتھ اس کی بعض خامیوں کی نشان دہی بھی ضروری ہے مثلاً :

(۱) اس نصاب میں وسائل پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ طلبہ مقصد کو بھلا کر انہی کو مقصود بالذات سمجھ لیتے ہیں، صرف و نحو، زبان سیکھنے اور اس کی صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، لیکن ان کی پندرہ کتابیں درس میں شامل کر لینا کسی طرح احسن نہیں، جب کہ ادب کی کل چار کتابیں داخلِ نصاب ہیں۔ اسی طرح منطق سوچنے اور غور و فکر کرنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کی پندرہ سے زیادہ کتابیں شامل کر کے اس مضمون پر اس طرح زور دیا گیا ہے گویا منطق ہی مقصود بالذات ہے۔ اس کے علاوہ منطق کی جو کتابیں داخل درس ہیں، ان میں بہت غلط مبحث ہے۔

(۲) اس نصاب میں کتب و رسائل کی اس قدر بہتات ہے کہ ان تمام پر خاطر خواہ عبور حاصل کرنا ناممکن ہے۔ جب کہ تفسیر، حدیث اور ادب پر جو کہ بے حد ضروری علوم ہیں، بہت کم توجہ دی گئی ہے، نیز تاریخ، جغرافیہ، علم اعجاز القرآن، علم البلاد، طبقات الارض وغیرہ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔

دورِ مغلیہ ہی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے نصاب کی اصلاح کے لئے بڑی قابلِ قدر خدمت انجام دی۔ شاہ صاحب کا تشکیل کردہ نصاب حسب ذیل ہے :

گرامر (نحو) : کافیہ، شرح جامی

بلاغت : مختصر، مطول

فلسفہ (حکمت) : شرح ہدایۃ الحکمہ

منطق : شرح شمسیہ، شرح متعالی

کلام : شرح عقائد نسفی، شرح خیالی، شرح مواقف۔

فقہ : شرح وقایہ، ہدایہ

اصول فقہ : حسامی، توضیح تلویح

فلکیات وریاضی : متعدد رسالے

طب : بو علی سینا کی کتاب القانون کا خلاصہ (موجز القانون)

حدیث : مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی، صحیح البخاری (ایک حصہ)۔

تفسیر : تفسیر مدارک، تفسیر بیضاوی

تصوف : عوارف، رسائل نقش بندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح معات، مقدمہ نقد النصوص، مفتی انتظام اللہ شہابی نے صراحت کی ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے نصابِ تعلیم میں حجاز سے لوٹنے کے بعد حدیث میں "صحاح ستہ" کا اضافہ کر دیا تھا۔

شاہ ولی اللہ نے نصاب میں ترتیب و تدریج کا بھی اہتمام کیا تھا۔ اس کے اہم نکات حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ پہلے صرف و نحو کے تین تین یا چار چار مختصر رسالے پڑھائے جائیں۔

۲۔ تاریخ کی کوئی کتاب پڑھائی جائے۔ اس سے عربی رواں پڑھنے کی مشق بھی ہو جائے گی۔

۳۔ حدیث : موطا امام مالک بہ روایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی ضرور پڑھائی جائے اس کے اندر بڑی برکت ہے۔

۴۔ قرآن مجید : صرف رواں ترجمہ مکمل پڑھایا جائے۔

۵۔ تفسیر : جلالین بعد نصاب درس پڑھائی جائے۔

۶۔ پھر کئی علوم کی کتابیں بیک وقت شروع کرا دی جائیں۔

۷۔ حدیث : صحیحین میں سے ایک کتاب رواں پڑھائی جائے۔

۸۔ تصوف : کوئی متوسط کتاب پڑھائی جائے۔

۹۔ عقائد : کوئی متوسط کتاب پڑھائی جائے۔
۱۰۔ تصوف : کوئی متوسط کتاب پڑھائی جائے۔
۱۱۔ معقولات : شرح ملا جامی تا قطبی تک کتابیں پڑھائی جائیں۔
۱۲۔ پھر ممکن ہو تو ایک روز مشکوٰۃ شریف اور دوسرے روز اس کی شرح طیبی اسی کے بقدر پڑھائی جائے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ لوازمہ نصاب کے سلسلے میں شاہ صاحب کے نزدیک قرآن و سنت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم کو وہ مفسرین کی آراء کے حوالے کے بجائے براہِ راست سمجھنے سمجھانے کے قائل ہیں۔ ان کی دعوت تھی کہ پہلے صرف و نحو کے دو تین چھوٹے رسالے جو طالب علم کے ذہن کے مطابق ہوں پڑھائے جائیں اور اس کے بعد کوئی تاریخ یا اخلاقی کتاب جو عربی زبان میں ہو پڑھائی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو کچھ لغوی مشکلات ہوں ان سے اس کو مطلع کیا جائے۔ جب اس کو عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو اس کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھایا جائے۔ جس میں کسی بھی تفسیر کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ خیال رکھا جائے کہ جہاں قرآن کا مطلب شانِ نزول کے بیان یا نحوی ترکیب بتائے بغیر واضح نہ ہو سکے وہاں پر بقدر ضرورت بحث کی جائے اور درسِ قرآن سے فارغ ہونے کے بعد "تفسیر جلالین" پڑھائی جائے۔ چناں چہ شاہ صاحب صحاح ستہ کے درس سے پہلے دورہ قرآن کر لیا کرتے تھے۔

شاہ صاحب نے قرآن و حدیث کی زبان کی حیثیت سے عربی زبان اور "برہان" کی اصلاح کے لئے فلسفہ و منطق کو لوازمہ نصاب میں شامل کیا جانا ضروری قرار دیا۔ وجدان کی اصلاح کے لئے تصوف و سلوک اور معاملات دنیوی کے لئے انہوں نے فن آداب معاش، فن تدبیر منزل، فن معاملات، زراعت، سیاسیات مع بین الاقوامی سیاست، صنعت و حرفت، تجارت، فن ملازمت، حساب، طب، تاریخ اور جغرافیئے کو لوازمہ نصاب کا حصہ قرار دیا۔

حافظ نذر احمد شاہ ولی اللہ کے نصاب تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ درسِ نظامی سے تقابل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ولی اللّٰہی نصاب میں تصوف و سلوک کے مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن دیگر کئی وجوہ سے درسِ نظامی زیادہ وسیع معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً درسِ

نظامی میں صرف عروض، عربی ادب، تاریخ، ہندسہ، مناظرہ، اصول حدیث اور اصولِ تفسیر کے مضامین بھی شامل تھے جو ولی اللہی نصاب میں شامل نہیں۔

بہ حیثیت مجموعی، دورِ مغلیہ کا نصاب بہت حد تک جامع تھا۔ اس میں علمی اور عملی دونوں پہلوؤں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ عربی کی تعلیم تمام مدارس میں لازمی تھی۔ جس کے تحت صرف، نحو، بلاغت، ادب، منطق، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، تصوف اور فلسفہ دین کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ نصاب میں ایسے مضامین بھی شامل کیے گئے تھے کہ طالب علم تحصیل علم کے بعد ایک اچھا اور مفید شہری بن سکے۔ معاشرتی آداب کو اسلامی طرزِ زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ لہذا نصاب میں ان آداب کی عملی تربیت کو اساسی حیثیت دی جاتی تھی۔

(آموزگار، اکتوبر ۱۹۹۲ء)

# تعلیم بالغان کی اہمیت
# اور
# ہندوستان کے دینی مدارس کا کردار

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکبر رحمانی (جل گاؤں)

تعلیم بالغان اور دینی مدارس کے کردار کے حوالے سے ہندوستان میں تحریر کیا جانے والا مقالہ، جسے ہم پاکستان میں تعلیم بالغان کی اہمیت اور دینی مدارس کے کردار کے تناظر سے دیکھ سکتے ہیں اور اپنے ملک کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ مدارس کے مہتمم صاحبان، مدرسین واساتذہ، فارغ التحصیل طلباء و علماء کے لئے فکر انگیز تحریر، جس پر عمل کر کے مملکت خداداد پاکستان میں تعلیمی و فکری انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ (حقانی)

## تعلیم کی فضیلت اور اہمیت

قرآن واحادیث میں جابجا علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں درج حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ امامت وخلافت کا دامن علم سے وابستہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے علم سے نوازا اور پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ انہیں سجدہ کریں دراصل یہ سجدہ آدم علیہ السلام کے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے لئے تھا۔ علم کی بدولت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر برتری حاصل ہوئی اور وہ "خلیفۃ الارض" کے منصب سے سرفراز کیے گئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کو

علم، دولت اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا ان کی بصیرت افروز نگاہ انتخاب "علم" پر پڑی اور تاریخ نے دیکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو دولت اور سلطنت بھی علم کے دامن سے وابستہ ہاتھ آئی۔ اپنے آس پاس اور دنیا پر ایک سرسری نگاہ بھی آپ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہی افراد، وہی قومیں اور وہی ملک دولت اور اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں، ترقی کر رہے ہیں اور عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جو علم اور ہنر کی دولت سے مالا مال ہیں اس دنیا میں ہمیں یہ دردناک منظر بھی دکھائی دے گا کہ ذلت ورسوائی، پستی و بداخلاقی ان قوموں کے حصے میں آئی ہے جو تعلیم سے بے بہرہ اور سخت غافل ہیں۔

ابن مبارک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں : "مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے جو علم حاصل نہیں کرتا، اس کے باوجود اپنے کو عزت کئے جانے کا مستحق سمجھتا ہے۔"

آج کے دور میں تو تعلیم انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت بن گئی ہے، جس طرح غذا، لباس، مکان وغیرہ انسانی زندگی کی لازمی اور بنیادی ضرورتیں ہیں اسی طرح تعلیم کو بھی ایک بنیادی ضرورت سمجھا جانے لگا ہے، بہت سے ملکوں نے تو اپنے آئین میں تعلیم کو ایک بنیادی حق کا درجہ دے رکھا ہے اور تمام لوگوں کو تعلیم فراہم کرنا مملکت کا فرض قرار دیا ہے۔

موجودہ دور میں تعلیم کی اہمیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ جمہوریت کا دور ہے۔ جمہوریت کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ عوام پڑھے لکھے ہوں تاکہ جمہوری طرز حکومت اور جمہوری اداروں میں سمجھ بوجھ کے ساتھ حصہ لیں دوسری وجہ یہ ہے کہ مادی ترقی و خوش حالی، تمدنی ترقی اور صنعتی وزرعی پیداوار کی ترقی کے لئے عوام کا تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہونا ازحد ضروری ہے۔ تعلیم کو نظر انداز کر کے کوئی قوم یا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے تمام ملکوں میں اپنے شہریوں کو خواندہ اور تعلیم یافتہ بنانے پر خاص توجہ دی جارہی ہے وہ ممالک جو غربت اور پس ماندگی کا شکار ہیں وہاں تو خواندگی نے عوامی شکل اختیار کر لی ہے وہ لوگ نہایت بدقسمت ہیں جو علم سے محروم ہیں۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ۸۵ کروڑ افراد ناخواندہ ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں چھ افراد میں سے ایک ان پڑھ ہے۔ ناخواندہ افراد کی سب سے زیادہ تعداد برا عظم ایشیاء اور افریقہ کے ملکوں میں ہے۔ ہندوستان اور بیشتر اسلامی ممالک ان ہی دو برا عظموں میں واقع ہیں۔

۳۹ اسلامی ملکوں میں ۱۴ میں خواندگی کی شرح ۱۰ سے ۳۰ فی صد اور دس میں ۳۰ سے

۵۰ فی صد ہے۔بقیہ دس ملکوں میں ۵۱ سے ۷۵ فی صد اور پانچ میں ۷۵ سے ۹۵ فی صد ہے۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی ملکوں میں تعلیمی صورت حال کس قدر خراب ہے۔

## ہندوستان میں خواندگی

ہندوستان کی تعلیمی حالت اسلامی ملکوں ہی کی طرح خراب و خستہ ہے۔ دنیا میں جتنے ناخواندہ افراد ہیں ان میں سے نصف کے قریب ہندوستان میں ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں ہندوستان میں خواندگی کی شرح ۴ء۵ فی صد تھی، یعنی ۱۱۰ میں سے صرف ۵ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں خواندگی کی شرح ۱ء۶ فی صد ہو گئی۔ یعنی ۵۰ سال کے عرصے میں ۱۰۰ میں سے ۱۶ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی حکومت نے ناخواندگی کے خاتمہ کے لئے کئی منصوبے اور پروگرام بنائے جس کے نتیجے میں فی صد شرح خواندگی میں مسلسل اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں خواندہ افراد کی تعداد میں ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ دو ہزار تھی جو ۱۹۸۶ء میں بڑھ کر ۲۰ لاکھ چھ ہزار، ۱۹۷۱ء میں ۱۵ کروڑ ستر لاکھ، ۱۹۸۱ء میں ۲۴ کروڑ ۱۰ لاکھ اور ۱۹۹۱ء میں ۳۵ کروڑ ۲۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ مگر اس ترقی کا تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ ناخواندہ اور ان پڑھ افراد کی تعداد گھٹنے کے بجائے مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ۲۹ کروڑ، ۸۰ لاکھ افراد ناخواندہ تھے۔ ۱۹۶۱ء میں ناخواندہ کی تعداد ۳۳ کروڑ ۴۰ لاکھ، ۱۹۷۱ء میں ۳۸ کروڑ ۶۰ لاکھ، ۱۹۸۱ء میں ۴۳ کروڑ ۷۰ لاکھ اور ۱۹۹۱ء میں ۴۹ کروڑ تک پہنچ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان کی ۸۴ کروڑ کی آبادی میں سے نصف سے زائد ان پڑھ ہیں سب سے زیادہ ناخواندہ جاہل افراد دیہاتوں میں ہیں۔

عمر کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو دس سے ۱۹ سال کی عمر کے بچوں میں خواندگی کی شرح فی صد سب سے زیادہ ہے۔ وہ بچے جن کی عمر ۵ سے ۹ سال ہیں اور وہ بالغ جن کی عمر ۲۰ سے ۳۵ سال ہے، ان میں خواندگی کی شرح سب سے کم ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق خواندہ افراد میں قریب ۶۲ فی صد چوتھی جماعت یا اس سے کم پڑھے ہوئے تھے۔ دسویں اور بارہویں تک پڑھے ہوئے ۳ء۱۶ فی صد اور گریجویٹ کی تعداد ۶ء۳ فی صد تھی۔

# مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

دنیا میں اور ہندوستان میں کوئی قوم تعلیمی لحاظ سے سب سے زیادہ پس ماندہ ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے بھی مجھے ندامت ہو رہی ہے جس کے نبی ﷺ نے ہر مسلمان مرد و عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض قرار دیا ہو، جس کے نبی ﷺ نے تحصیل علم کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ علم جہاں ملے وہاں سے حاصل کرو چاہے اس کے لئے چین جانا پڑے، جس کے نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہو کہ "ایک عالم کی مجلس کی حاضری ایک ہزار رکعت نمازوں، ایک ہزار مریضوں کی عیادت اور ایک ہزار جنازوں کی شرکت سے افضل ہے۔" آج اسی کے نام لیوا اور ماننے والے علم سے غافل ہیں۔

جب تک انگریز اس ملک میں حکمراں تھے ان کے عہد کی مردم شماری کی رپورٹوں سے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہوتا تھا لیکن آزادی کے بعد اب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہیں یا ترقی کر رہے ہیں؟ بعض دردمند مسلم رہنماؤں نے حکومت سے مطالبہ بھی کیا کہ مردم شماری کی رپورٹوں میں مسلمانوں کی خواندگی سے متعلق اعداد و شمار بھی شائع کئے جائیں تاکہ ناخواندگی کے خاتمے کے لئے مناسب اقدامات کئے جاسکیں کسی قوم یا فرقے کا تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ ہونا ملک و قوم کی مجموعی ترقی پر خراب اثر ڈالتا ہے لیکن حکومت نے ان رہنماؤں کے جائز اور منصفانہ مطالبے کو تسلیم نہ کیا۔

۱۹۸۷ء میں جب حکومتِ ہند نے نئی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء (NPE) کا عملی پروگرام پارلیمنٹ کی توثیق کے بعد شائع کیا تو "اقلیتوں کی تعلیم" کے باب میں صفحہ ۱۱۶ پر پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ :

**Ministry of home affairs have indentified Muslims and new-Budhists as educationally backword at National Level.**

یعنی وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق قومی سطح پر تعلیمی لحاظ سے سب سے زیادہ پسماندہ قومیں مسلمان اور نو بودھ ہیں۔

یہ سرکاری بیان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق اعداد و شمار موجود ہوتے ہوئے بھی حکومت نہیں چھپاتی رہی اور قصداً چھپاتی رہی حکومت نے ایسا کیوں

کیا؟ کیا مصلحت تھی؟ یہ وہی جانے مگر ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اس قسم کے تعلیمی سروے کے لئے مسلمانوں کو حکومت پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے خدا کا فضل ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسی تنظیمیں، جماعتیں اور انجمنیں ہیں جو تعلیمی و معاشی سروے جیسے ٹھوس اور مثبت کام بہ حسن وخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور یوپی رابطہ کمیٹی علی گڑھ نے اس کام کو ہاتھ میں لیا ہے اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسری جماعتیں، ادارے اور تنظیمیں اس کام میں تعاون کریں۔

## تعلیمی سروے

ملت اسلامیہ ہند کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کی اشد ضرورت ہے سب سے پہلا اور بنیادی کام یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا تعلیمی سروے کیا جائے مسلمانوں میں خواندگی کا تناسب کیا ہے؟ مردوں اور عورتوں میں، دیہی علاقوں اور شہری علاقوں میں اس کا تناسب کیا ہے؟ ناخواندگی کے اسباب کیا ہیں؟ ناخواندہ بالغوں اور نوجوانوں کی کیا ضرورت ہیں؟ عورتوں میں ناخواندگی کے اسباب کیا ہیں؟، تحصیل علم کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں ہیں؟ ناخواندہ بالغ مرد اور عورتوں کی فارغ وقت کی سرگرمیاں کیا ہیں؟ پڑھنے کے ترجیحی اوقات کیا ہیں؟ گاؤں یا محلے میں کون کون سی تعلیمی سہولیات حاصل ہیں؟ اس طرح کا وسیع سروے وقت کی اہم ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس اس کام میں نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ دینی مدارس کے طلبہ چھوٹے چھوٹے گاؤں، بستیوں اور شہروں سے آتے ہیں اگر یہ اپنے اپنے مقام یا اپنی درس گاہ کے آس پاس کی بستیوں کا تعلیمی سروے کریں تو ان علاقوں کی تعلیمی پس ماندگی اور جہالت کو دور کرنے کے لئے لائحہ عمل بنانے میں بڑی آسانی ہوگی۔ ملک و ملت کی تعمیر میں دینی مدارس کا یہ کارنامہ تاریخ کا جزو بن جائے گا اور اسے کبھی فراموش نہ کیا جائے گا اس قسم کی تعمیری سرگرمیاں طلبہ اور نوجوانوں کی عملی جدوجہد کو بامقصد بناتی ہیں، اور انہیں منصوبہ بند طریقے سے کام کرنا سکھاتی ہیں۔

## تعلیم بالغاں کی ضرورت اور اہمیت

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تعلیم آج کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ علم

کے بغیر انسانی زندگی ترقی نہیں کر سکتی۔ آج سائنس، صنعت و حرفت، تمدن اور دیگر میدانوں میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ علم کا نتیجہ ہے۔ علم کی اہمیت وافادیت جاننے کے باوجود بہت سے لوگ خانگی ماحول، اقتصادی مجبوریوں اور معاشرتی حالات کی وجہ سے علم سے محروم رہ جاتے ہیں یا وہ تعلیم کی ابتدائی منزل ہی پر بھٹک جاتے ہیں ایسے ہی لوگوں کی تعلیم "تعلیم بالغاں" کہلاتی ہے۔

تعلیم بالغاں کی اہمیت بچوں کی تعلیم سے کئی گنا زیادہ ہے اگر بالغ پڑھا لکھا ہوگا اور باشعور ہوگا تو اس خاندان میں تعلیم سے لگن پیدا ہوگی اس کے افراد کبھی جاہل نہیں ہوں گے اور تعلیم کے میدان میں وہ خاندان ہمیشہ ترقی کرتا رہے گا۔ اگر عورت پڑھی لکھی ہوگی تو وہ خاندان پشتوں تک تعلیم یافتہ نکلے گا۔ تعلیم بالغاں میں ۱۵ سے ۳۵ سال یا اسے زائد عمر کے بالغوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ تمام مفکروں اور ماہرین تعلیم نے بالغوں کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے ان کے خیال میں یہ وہ لوگ ہیں جو صنعتی و زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور قومی و ملی زندگی کے ہر شعبے میں فعال حیثیت سے حصہ لینے کے اہل ہوتے ہیں۔ کسی ملک و قوم کی ہمہ گیر تعمیر و ترقی میں یہ بالغ افراد کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ قوم و ملک کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر ان کی توانائیوں کو ملک و قوم کے بہترین مفاد میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان بالغوں کی اگر اسلامی خطوط پر تعلیم و تربیت ہو تو یہ اقامت دین اور اسلامی معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے تعلیم بالغاں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مملکت، معاشرہ اور تعلیم یافتہ طبقے کا فرض ہے کہ وہ تعلیم بالغاں پر خصوصی توجہ دیں اور جہالت کے خاتمہ کے لئے مشترکہ اور منظم طور پر جدوجہد کریں۔

اسلام نے بھی تعلیم بالغاں کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے مسجد نبوی ﷺ پہلی درس گاہ تھی جہاں بالغوں اور بزرگوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی سب سے پہلی اقامتی درس گاہ صفہ تھی اس درس گاہ کے تمام طلبہ بالغ افراد تھے یہ واقعہ بھی تاریخوں میں درج ہے کہ غزوہ بدر کے چند قیدیوں کو اس شرط پر رہائی ملی کہ بطور فدیہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ مسجدوں اور علماء کے مکانوں پر بالغوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔

تعلیم بالغاں کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہندوستان نے پہلے پنج سالہ منصوبے میں سماجی

ترقی اور توسیعی خدمات کے پروگراموں میں اسے بھی شامل کیا۔ ۶۶۔۱۹۶۴ء کے تعلیمی کمیشن نے بھی تعلیم بالغاں پر زور دیتے ہوئے اسے عوامی تحریک بنانے کا مشورہ دیا۔ ۱۹۷۸ء میں گاندھی جینتی کے موقع پر (National Programme of adult Education) یعنی تعلیم بالغاں کا قومی پروگرام شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کی خصوصیت یہ تھی کہ حکومت نے رضاکار تنظیموں اور خدمت کمیٹیوں کو مالی امداد، کتابیں، بیاضیں، تدریسی لٹریچر اور دیگر تعلیمی سہولیات فراہم کیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور طلبہ کو بھی اس مہم میں شامل کیا گیا۔ مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم بالغاں کے شعبے قائم ہوئے۔ تعلیم بالغاں کے موضوع پر سیمینار، اساتذہ کی تربیت اور تحقیقاتی کام انجام دیئے۔ نئی پالیسی ۱۹۸۶ء کی مؤثر عمل آوری کے لئے جو عملی پروگرام بنایا گیا۔ اس میں ۱۹۹۵ء تک دس کروڑ ناخواندہ بالغوں کو خواندہ بنانے کا نشانہ مقرر کیا گیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ریاستی سطح سے لے کر ضلعی سطح تک محکمہ تعلیمات میں تعلیم بالغاں کا ایک علیحدہ شعبہ قائم ہے جس کا کام تعلیم بالغاں کے مراکز کی نگرانی اور دیکھ بھال کے علاوہ اس سے متعلق رکاوٹوں اور مسائل کو حل کرنا ہے۔

تعلیم بالغاں کے قومی پروگرام کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اردو داں طبقہ یا مسلمان جو کہ تعلیمی لحاظ سے سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں وہ اب تک اس کے فائدوں سے محروم ہیں آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ انجمن ترقی اردو ہند نے اردو زبان میں تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کرنے کی درخواست دی تو اسے قابل اعتنا نہ سمجھا گیا آج بھی مسلمان اور اردو دان طبقہ اس پروگرام کے فائدوں سے محروم ہیں۔ اردو میڈیم کے تعلیم بالغاں کے مراکز پورے ملک میں انگلیوں پر شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ اردو داں طبقے اور مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے اس امتیازی سلوک کے خلاف ہم نے اب تک کوئی مؤثر احتجاج نہیں کیا ہے۔

## خواندگی کا معیار

ہر ملک و قوم میں خواندگی کا معیار مختلف ہوتا ہے اس معیار کا تعلق اس قوم کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی سے ہوتا ہے۔ مثلاً امریکا میں ایسے فرد کو خواندہ تصور کیا جاتا ہے جو پانچویں جماعت پاس طالب علم کے معیار کے مطابق عبارت پڑھ سکے، اس کے مفہوم کو سمجھ سکے اور

اپنے خیالات لکھ کر بیان کر سکے۔ اب خواندگی کے مفہوم میں اس امر کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے کہ ہر خواندہ فرد ابتدائی حساب سے بھی واقف ہو کیوں کہ جمع و تفریق اور حسابی ہندسے بھی خواندگی کی علامت ہیں۔

اقوام متحدہ کی متعین کردہ تعریف کے مطابق اگر کوئی شخص کوئی بھی زبان کسی بھی کمیونٹی میں پڑھ سکتا ہے، بول سکتا ہے، جمع تفریق اور ضرب وغیرہ کا حساب کر سکتا ہے تو وہ خواندہ ہے۔

ہمارے یہاں عام طور پر خواندگی سے افراد کے پڑھنے لکھنے کی ابتدائی صلاحیت مراد ہوتی ہے۔ یعنی اگر ایک شخص تحریر کردہ الفاظ پڑھ سکتا ہے اور انہیں اپنے ہاتھ سے لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اسے خواندہ کہا جاتا ہے مردم شماری کی رپورٹوں میں بھی خواندگی کی یہی تعریف کی گئی ہے۔

**The ability to read and write with understanding in any language.**

اس کے لئے کسی مدرسہ میں باضابطہ تعلیم حاصل کرنا یا کوئی درجہ پاس کرنا ضروری نہیں۔ ان سرکاری رپورٹوں میں یہ بھی وضاحت موجود ہے کہ ایسے شخص کو ہم Literate نہیں کہہ سکتے جو صرف پڑھ سکتا ہو مگر لکھ نہیں سکتا ہو، اسی طرح ۵ سال سے کم عمر کے بچے بھی ناخواندہ شمار کئے جاتے ہیں۔

## تعلیم بالغاں کے مقاصد

تعلیم بالغاں کا بنیادی مقصد ناخواندگی دور کرنا ہے۔ یعنی بالغوں کو لکھنا، پڑھنا سکھانا ہے تاکہ آئندہ ان کی زندگی پر سکون گزرے اور تعلیم سے محرومی کا احساس ان کے دلوں سے چلا جائے، لیکن خواندگی کے ساتھ ان بالغوں میں سماجی شعور بھی بیدار کرنا تعلیم بالغاں کا مقصد ہے۔ وہ اپنے حقوق و فرائض جان لیں، سماجی اور اخلاقی برائیوں سے وہ واقف ہو جائیں اور مسلم ان پڑھ بالغوں کو ان کے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے واقف کرانا بھی تعلیم بالغاں کا اہم مقصد ہونا چاہیے۔

۱۹۶۸ء کی قومی تعلیمی پالیسی نے کاروباری خواندگی Functional literacy پر زور دیا

تھا اس قسم کی خواندگی کا مقصد بالغ جو کچھ پڑھے وہ اس کے لئے مفید ثابت ہو، اسے ایسے ہنر سکھانا جس سے وہ روزی کما سکے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تربیت اس کا مقصد تھا مگر کوئی بالغ کھیتی باڑی کرتا ہے تو اسے ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ اسے زرعی پیداوار کے بڑھانے کے کام میں لا سکے اگر وہ تجارتی یا صنعتی کاروبار میں لگا ہوا ہے تو خواندگی کی بدولت اس کام کو فروغ دے سکے۔ اس طرح تعلیم بالغاں کو سماجی و معاشی ترقی سے مربوط کر دیا گیا تھا۔ آج تعلیم بالغاں کا یہی مفید اور عملی تصور ہمارے یہاں رائج ہے۔

## دینی مدارس کا کردار

اب آیئے اس بات پر غور کریں کہ ملت اسلامیہ ہند کی بڑھتی ہوئی ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے میں دینی مدارس کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

انگریزوں کے دور استعماریت میں دینی مدارس نے اسلامی اقدار کے تحفظ اور اسلامی علوم وروایات کی شمع روشن رکھنے کے لئے جو غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ آج مسلمانون کا اپنے دین سے جیسا کچھ رشتہ ہے وہ ان ہی دینی مدارس کی وجہ سے ہے آج بھی یہ دینی مدارس اسلامی تعلیم و ثقافت اسلامی تہذیب و تمدن کے مستحکم قلعے ہیں۔ اگر یہ دینی تعلیمی ادارے یہاں موجود نہ ہوتے تو مسلمانوں کا کیا حال ہوتا۔ اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں ان مدارس نے عصری تقاضوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے آپ کو مقررہ نظام و نصاب اور روایات میں جکڑے رکھا لیکن اب وہ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھ رہے ہیں اور ان میں بھی انقلابی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ یہاں یہ واضح کردوں کہ ماضی میں دینی مدارس نے جو نظام اپنا رکھا تھا وہ اسلامی معاشرے کے تقاضوں کے مطابق تھا یہ مدرسے رائج الوقت معاشرے کی دینی ضروریات کو پورا کرتے تھے اس لئے ان اداروں کو دقیانوسی، قدامت پرست، جامد، روح عصر سے خالی کہہ کر ان کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہیئے۔

آج ہندوستان کے چھوٹے بڑے دینی مدرسوں میں تقریباً ۱۵ لاکھ طلبہ و اساتذہ کا ایک زبردست گروہ ہے یہ وہ گروہ عظیم ہے جس نے اپنے آپ کو مذہب اسلام کے لئے وقف کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر مادہ پرستانہ نہیں بلکہ خدا پرستانہ ہے

ان کی نظر دنیوی آسائشوں اور راحتوں سے زیادہ آخرت کی زندگی پر ہے مساجد کے ذریعے ان کا عوام سے بھی گہرا رابطہ ہے۔ اس طرح یہ دینی مدارس اسلامی معاشرے پر اثر انداز ہونے والی ایک زبردست قوت ہے۔ مگر افسوس کہ ان مدارس کے بیشتر رہنماؤں اور اساتذہ نے حالات کا صحیح ادراک نہ کیا اور طلبہ کو ملی بہبود، اسلام کے غلبہ اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے کی جانے والی عملی جدوجہد میں شرکت سے باز رکھا۔

بہت سے دینی مدرسوں نے اپنی طرز فکر و عمل سے یہ تاثر دیا کہ دین الگ ہے اور دنیا الگ اسی طرح دینی تعلیم اور عصری تعلیم کا کوئی جوڑ نہیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ اور جہالت کے خاتمہ کے لئے کوئی منظم تحریک شروع نہ ہو سکی حالاں کہ دینی مدارس کے طلبہ پر علم کی اشاعت و تبلیغ اور معاشرے کی اصلاح بدرجہ اولیٰ فرض تھی اب بھی وقت نہیں گزرا آج بھی دینی مدارس کے طلبہ متحد و منظم ہو کر عملی میدان میں اتر پڑیں تو مسلمانوں کے معاشرے کی برائیاں ختم ہو سکتی ہیں اور ایک زبردست تعلیمی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

آج ہندوستان کے مسلمان اپنی تاریخ کے نہایت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کی زیست سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ خطرہ ان کے دین و ایمان اور اسلامی تشخص کو ہے نہ جانے ابھی اور کتنے زخم کھانا ہیں، اور کتنے گھاؤ لگنا ہیں۔ ان حالات میں امید کا سہارا یہی دینی مدارس ہیں اگر یہی مدارس غفلت کا شکار ہو جائیں، اختلافی مسلکوں میں مقید ہو جائیں، فروعی مسائل میں الجھ کر رہ جائیں، ٹھوس، تعمیری اور مثبت سرگرمیوں کے بجائے منفی سرگرمیاں اپنا لیں تو اس کا اندیشہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے تشخص کو کھو بیٹھیں اور قومی دھارے میں مدغم ہو جائیں اور یہ ملک اسلام دشمنوں کے نرغے میں چلا جائے اس صورت میں مجھے ڈر ہے کہ یہاں کے علماء اور مدارس کا بھی وہی حشر نہ ہو جو سمرقند اور بخارا میں ہوا تھا اس لئے یہ وقت خواب غفلت سے بیدار ہونے اور عمل کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کا ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

# تعلیم بالغاں کے لئے لائحہ عمل

امت مسلمہ کی جہالت اور ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے اب میں چند عملی تجاویز پیش کروں گا۔ دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ ان پر غور و فکر کر کے ایک لائحہ عمل بنا سکتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلا کام جو دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کو کرنا ہے، وہ مسلم معاشرے کا تعلیمی سروے ہے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اس قسم کے سروے سے ہماری کوششوں کو جہت و سمت ملتی ہے اور منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے میں سہولت ہوتی ہے ہر محلے، گاؤں اور شہر کا تعلیمی سروے ہو گا تو عوام سے آپ کا رابطہ ہو گا۔ ان کے خیالات اور احساسات سے واقفیت ہو گی اور آئندہ کے عملی پروگراموں میں عوام کا تعاون اور اشتراک بھی آپ کو حاصل ہو گا۔ تعلیم بالغاں کے لئے ان کی آمادگی اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے بھی آپ واقف ہوں گے۔ سروے کا خاکہ اور طریقہ کار کیا ہو اس سلسلہ میں اساتذہ اور مقامی دانش ور حضرات رہنمائی کر سکتے ہیں یا ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی سے تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے اس کام میں شامل ہونے والے طلبہ کو زائد مارکس دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔

(۲) تعلیم بالغاں کا سب سے اہم مسئلہ انہیں تعلیم کی طرف مائل کرنا ہے، اور یہ بالغ اس وقت تک مائل نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ تعلیم کی اہمیت اور اس کے افادی پہلو کے قائل نہ ہو جائیں اس کے لئے گھر گھر جا کر، کارنر، میٹنگیں اور اجتماعات کے ذریعے لوگوں پر تعلیم کی اہمیت کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کی اہمیت اور افادیت سے متعلق پمفلٹ اور پوسٹرز کی اشاعت ضروری ہے۔ قرآن واحادیث میں علم کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے، یوپی رابطہ کمیٹی نے تعلیمی کارواں نکال کر ایک مثال قائم کی ہے اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کارواں گاؤں اور محلوں میں ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔

(۳) مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے تعلیم بالغاں کے فروغ کے لئے جو اسکیمیں شروع کی ہیں ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس معاملے میں اردو داں حضرات کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے لیکن ہمیں مایوس ہونے اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ بعض مقامات پر برادران وطن کے تعاون اور منصف مزاج افسران کی مدد سے مسلمانوں میں تعلیم

بالغاں کا پروگرام کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ حکومت کی ان اسکیموں کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور پھر اس کے مطابق جدوجہد کریں۔ حکومت کے امتیازی اور غیر منصفانہ رویئے کے خلاف شکایت اور احتجاج بھی کرنا چاہیئے اور اس کے لئے سیکولر، اور منصف مزاج غیر مسلموں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ حکومت ہی پر تکیہ کرنے لگیں، آپ کو اسلاف کے بتائے ہوئے "اپنی مدد آپ" کے اصول پر عمل کرنا چاہیئے چوں کہ آپ اس جمہوری ملک کے شہری بھی ہیں اس لئے اپنے حقوق کا گاہے بہ گاہے استعمال بھی کرتے رہنا چاہیئے۔

(۴) ہمارے یہاں سب سے سنگین مسئلہ عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا ہے۔ ایک مرد اگر تعلیم یافتہ ہوتا ہے تو اس کی ذات کو اس کا فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن ایک عورت کا تعلیم یافتہ ہونا یہ پورے خاندان اور پوری نسل کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم نسواں کو اکثر نظر انداز کیا گیا ہے۔ عورت ایک اچھی دختر، ایک اچھی بہن، ایک اچھی ماں، ایک اچھی بیوی ثابت ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ اب لڑکیاں بھی دینی مدرسوں میں ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ یہ جان کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ یہاں دینی جامعات میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تعلیم و تربیت حاصل کر رہی ہیں۔ تاہم آج بھی ناخواندہ بالغ عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ دینی مدارس کی طالبات اگر اپنے ہی خاندان، پڑوس اور محلے کی ناخواندہ بالغ عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو یہ ایک تاریخ ساز کارنامہ ہوگا۔ میری تجویز یہ ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں ہر طالبہ کو دو یا پانچ ناخواندہ عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا لازمی قرار دیا جائے یہ ایک طرح کا عملی پروجیکٹ ہے۔ جس کے لئے علیحدہ مارکس بھی مقرر کئے جا سکتے ہیں تاکہ طالبات اس کی طرف راغب ہوں۔

(۵) دینی تعلیمی کونسل کی طرز پر ہر ریاست میں "تعلیم بالغاں کونسل" یا "کونسل برائے فروغ تعلیم" قائم کی جائے جو دینی مدارس کے نمائندوں اور عصری علوم کے ماہرین پر مشتمل ہو اس میں ہر جماعت اور مسلک کی نمائندگی ضروری ہے یہ کونسل پوری ریاست کا تعلیمی سروے کرنے کے بعد ناخواندگی کے خاتمہ کے لئے مرحلہ وار نشانہ (Target) مقرر کرے۔ نشانہ محدود وسائل کے پیشِ نظر متعین کیا جائے نہ زیادہ نہ بہت کم، ریاستی کونسل،

ماہرین تعلیم، تجربہ کار اساتذہ اور دانش وروں کے تعاون سے مندرجہ ذیل شعبے قائم کرے۔
(۱) اساتذہ کی تربیت کا شعبہ (۲) نصاب سازی اور تعلیمی و تدریسی لٹریچر کی تیاری اور فراہمی کا شعبہ (۳) شعبہ تحقیق (۴) پیشہ ورانہ تربیت کا شعبہ اور (۵) تعلیم بالغاں مراکز کی نگرانی کرنے والا عملہ یا مجلس منتظمہ۔ کام حسن و خوبی انجام پائے اس کے لئے مزید شعبے اور کمیٹیاں قائم کی جاسکتی ہیں۔

(۶) ضلع، تعلقہ، اور دیہی پنچایت سطح پر بھی تعلیم بالغاں کمیٹیاں تشکیل دی جائیں لیکن ان سب میں Co-ordination رابطہ ہو رضاکاروں (والنٹیئرس) کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ نا خواندہ، بالغ مرد و عورت کو مرکز تعلیم میں حاضری کا پابند بنا سکے۔

(۷) تعلیم بالغاں مرکز چلانے کے لئے تختہ سیاہ، کاپیاں، درسی کتاب، ضروری فرنیچر اور دیگر اشیاء کی خریداری ضروری ہے۔ پھر اساتذہ کو کچھ نہ کچھ مشاہرہ بھی دینا چاہیئے۔ مرکز کے لئے جگہ بھی ضروری ہے خدا کے فضل میں ہماری امت میں مخیر حضرات کی کمی نہیں ہے۔ کمی ہے تو مخلص اور ایمان دار ورکروں کی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ تمام تعلیمی ضرورتیں مقامی طور پر آسانی سے پوری کی جاسکتی ہیں۔ جہاں پوری نہ ہو سکے وہاں ضلعی اور ریاستی کونسل کو تعاون کرنا چاہیئے۔

(۸) تعلیم بالغاں مراکز کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے کے لئے نگراں عملہ (Inspecting Staff) بھی ضروری ہے یہ عملہ لائق، دیانت دار، تجربے کار اور تعلیمی و تدریسی مہارت رکھتا ہو۔

(۹) نصاب ایسا تیار کیا جائے کہ لکھنا پڑھنا سکھانے کے ساتھ انہیں دین کی بنیادی معلومات بھی حاصل ہو ان کے اخلاق و کردار کے سنوارنے پر بھی توجہ دی جائے اور انہیں سماجی برائیوں اور فضول رسومات کے خلاف بھی نفرت دلائی جائے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی اسلامی تربیت بھی ہو انہیں چند ہنر اور پیشے بھی سکھائے جائیں تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

ملک کے تمام دینی مدارس متحد و منظم ہو کر تعلیم بالغاں کی تحریک شروع کریں تو ایک تعلیمی انقلاب [illegible] صرف مسلمانوں کے لئے مستقبل کو روشن کرے گا بلکہ ملک کی ترقی کی رفتار کو بھی تیز تر کرے گا۔ (انشاءاللہ)

(ماہنامہ تعمیر افکار کراچی۔ جنوری ۲۰۰۱ء)

بانی درسِ نظامی ملا نظام الدین ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کی طرف منسوب ''درسِ نظامی'' دینی مدارس کا وہ نصابِ تعلیم ہے، جو مختلف تبدیلیوں اور ترامیم کے ساتھ کوئی ڈھائی سو برسوں سے برصغیر میں رائج ہے، اور علومِ دینیہ کی ترویج واشاعت کا واحد تسلیم شدہ نصاب ہے، جسے ہر طبقے میں بلاتفریقِ مسلک پذیرائی اور قبولیتِ عامہ حاصل ہے۔ دینی مدارس کا یہ نصاب ونظامِ تعلیم عرصۂ دراز سے پورے برصغیر میں مختلف پہلوؤں سے، مختلف اسباب کی بنا پر موضوعِ بحث بنا ہوا ہے، اس میں ترمیم کی بات کی جاتی ہے، جس میں اصلاح پر گفتگو ہوتی ہے، نئے موضوعات اور مضامین کے اضافے کا مطالبہ ہوتا ہے، اور کبھی اسے بالکل فرسودہ قرار دے دیا جاتا ہے، ترمیم، اضافوں اور اصلاح پر تو گفتگو ہو سکتی ہے، اور گزشتہ ساٹھ ستر برسوں سے تواتر کے ساتھ ہو رہی ہے، جس کے نتیجے میں اس نصاب میں متعدد بار ترمیم بھی ہو چکی ہے، بہت سے مضامین اور کتب خارج ہوئیں، اور نئی کتب اور موضوعات کا اضافہ ہوا، مگر اس کی اصل روح اور اصل مقصد کو برقرار رکھا گیا، لیکن ایسے نصاب کو فرسودہ قرار دے دینا حد سے تجاوز ہی کہلائے گا، جس کے پروردہ اور تربیت یافتہ صرف برصغیر میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے بیشتر مقامات پر علومِ نبویؐ کی شمعیں فروزاں کرنے میں گزشتہ ڈھائی صدیوں سے مصروفِ عمل ہیں، لیکن یہ امر بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ابھی مزید ترامیم، نئے عصری مضامین کے اضافے اور اس منہج کو زیادہ مؤثر بنانے نیز اُسے عصری تقاضوں سے مزید ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

زیرِ نظر کتاب بھی ان ہی موضوعات پر مختلف اہلِ علم کے مضامین ومباحث کا مجموعہ ہے، کتاب کے مطالعے سے قاری ایک ہی وقت میں اصحابِ علم وفضل کے پیش کردہ علمی نکات وعملی تجاویز، اساتذہ کے تجربے، اپنوں کی تجاویز، غیروں کے مطالبے، حکومتوں کی خواہشات اور علماء کے تحفظات وغیرہ سے متعارف اور واقف ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ مقالات ہندوستان میں پیش کیے گئے، مگر چونکہ مدارس کا موقف، نصاب کی یکسانیت، علماء کے خیالات، حکومتوں کا رویہ اور اہلِ دانش کی تجاویز، زمان ومکان کے اختلاف سے قطعِ نظر، دونوں ممالک میں یکساں ہیں، اس لیے یہ بعدِ مکانی ان مقالات کی اہمیت اور حیثیت کو متاثر نہیں کرتا، بلکہ حالیہ دنوں میں دینی مدارس کے حوالے سے ہونے والی گفتگو اور مباحثوں کی روشنی میں اس کتاب کا مطالعہ ہم سب کے لیے یکساں اعتبار سے مفید، نئی معلومات کے حصول کا ذریعہ اور اصل صورتِ حال کی تفہیم کے لیے سودمند ثابت ہوگا، اور اس لحاظ سے کتاب کے فاضل مرتب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کر کے علمی محاذ پر فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔

**مولانا، قاری محمد حنیف جالندھری**
(ناظمِ اعلیٰ، وفاق المدارس العربیہ، پاکستان)

ISBN 969-441-112-2

Rs. 295/-